



ڈاکٹر اکبر علی خان



ڈاکٹر قریشی



احمد شیر



اشفاق احمد



بالو قیس



ڈاکٹر اکبر علی خان



گلزار



ڈاکٹر خالد سبیل



سید امیر رازی



خالد توفیق



ڈاکٹر شیر احمد



پروین ماغف



ڈاکٹر انور سدید



افتاب تہیں



محمد سالم



ڈاکٹر علی احمد علی



شفیق موزک



علی رازی



ڈاکٹر افتخار



نایم احمد



باص سلطان



سید موزک



مہتاب خان



ڈاکٹر شمس الدین



انوار خان



فیردوس قریشی



سید علی



سلطان خان



رازا خان



ڈاکٹر خالد سبیل



فیصل خان



ڈاکٹر خالد سبیل



سید موزک



اکبر علی خان



سید علی



شاہد علی خان



شاریت علی خان



سید موزک



ڈاکٹر خالد سبیل



ڈاکٹر خالد سبیل



سید موزک



اکبر علی خان



سید علی



شاہد علی خان



شاریت علی خان



سید موزک



ڈاکٹر خالد سبیل



ڈاکٹر خالد سبیل



# ساقی از باب حقوق

**PDF BOOK COMPANY**

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:

**Muhammad Husnain Siyalvi**

**0305-6406067**

**Sidrah Tahir**

**0334-0120123**

**Muhammad Saqib Riyaz**

**0344-7227224**





## شریک گفتنی دوم ڈاکٹر سہیل مسعود



یہ ڈاکٹر سہیل مسعود ہیں۔ امریکہ اور پاکستان کے مابین تازہ سہوت۔ انسانی بھلائی کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہنے والے۔ 1998ء میں انہیں لاس اینجلس امریکہ کے انگریزی ماہنامہ ”دی پاکستان فرنٹ لائن“ کی جانب سے ان کی سماجی بھلائی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر

”مین آف دی ایئر (Man of the Year)“ کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر سہیل مسعود 28 اگست 1963ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج سول لائسنز سے ایف ایس سی کیا۔ ڈاکٹری کی ڈگری فارمیسی میں لی۔ 1981ء تک لاہور میں رہے۔ ستمبر 81ء میں امریکہ آئے اور 1992ء میں کریسٹن ہیلتھ کیئر (Crescent Health Care) کے نام سے اپنا ذاتی کاروباری ادارہ قائم کیا۔ ان کی شریک حیات مونا مسعود بھی ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر سہیل کے ہمراہ کاروبار میں شریک ہیں۔

ڈاکٹر سہیل کے والد مسعود حسین کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور انگریزی میں ایم اے کیا۔ قائد اعظم کے والہانہ شیدائی تھے۔ ڈاکٹر سہیل کی والدہ محترمہ سلطان جہاں بیگم کا تعلق رام پور سے ہے۔ والدین خود لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ مطالعہ کا شوق ڈاکٹر سہیل کو ورثہ میں ملا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی کو پڑھ لیا تھا۔ مشتاق احمد یوسفی ان کے پسندیدہ ترین ادیب ہیں۔ ڈاکٹر سہیل کے محبوب موضوعات تاریخ اور سوانح ہیں۔ ابتداء میں انہیں شاعری سے بھی شوق تھا مگر مصروفیت کے باعث شعر گوئی کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ 1978ء کی بات ہے جب انہوں نے غزلیں اور نظمیں کہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

وحشت کی آندھیوں میں گھرتا رہا ہمیشہ  
اونچائیوں سے اوپر اڑتا رہا ہمیشہ

ڈاکٹر سہیل مسعود کو معاشرتی فلاح و بہبود کے کاموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اورینٹل کالج کی مسجد میں توسیع کے لیے انہوں نے عملی طور پر معاونت کی۔ دیگر فلاحی اداروں کی معاونت بھی کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ’کیئر (Cair)‘ کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سہیل مسعود نے بتایا کہ مسلمان چالیس پچاس سال سے امریکہ میں ہیں۔ مگر کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ امریکن سیاسی پالیسیوں میں حصہ لے کر انہیں احساس دلایا جائے کہ جو مسلمان امریکہ میں موجود ہیں وہ امریکی معیشت کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جب ہمیں امریکہ میں رہنا ہے تو انہیں باور بھی کرانا ہے کہ ہم مسلمانوں



کی اہمیت کیا ہے اور ان کی کون سی پالیسیاں ہمارے لیے بہتر ہیں  
ڈاکٹر سہیل مسعود نے اسی مقصد کے حصول کے لیے 2001ء میں لاس اینجلس  
کے سٹی انارنی جیمز ہارن (James Harn) کو لاس اینجلس کے میئر کے افسانے میں سپورٹ  
کیا۔ ان کا کہنا ہے۔ ابتدا میں ہمیں ریاستی سطح پر امریکی سیاست میں داخل ہو کر پالیسی سازوں  
کے ہمراہ کام کرنا ہے اور اپنے لیے سر اٹھا کر چلنے کی جگہ پیدا کرنا ہے۔ تاکہ امریکی پالیسی ساز جو  
یکطرفہ فیصلے کرتے چلے آ رہے ہیں وہ اس پر غور کریں۔

ڈاکٹر سہیل مسعود نے ”پاکستان امریکن چیمبر آف کامرس“ کی بنیاد بھی ڈالی ہے  
تاکہ مقامی بزنس مین اور پاکستانی بزنس میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ انہوں نے نومبر 2001ء میں  
”ٹی وی پاکستان“ قائم کرنے میں مدد کی جس کے تحت لاس اینجلس میں آدھے گھنٹے کے پروگرام  
میں مسلم موقف بھی پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل مسعود نے کہا ہم ہمارے پیغمبر کی تعلیمات کے مطابق برابری کی سطح پر  
سب سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ کی تعلیمات کو امریکیوں تک پہنچانے کے لیے انہوں نے  
”پروفیٹ محمد“ (Prophet Mohammad) کے نام سے ایک ڈاکو مینٹری فلم کی تیاری میں  
بھی معاونت کی۔ اس تمام جدوجہد کا مقصد ہے کہ مسلمانوں کی سماجی زندگی ایک نمونہ بنے۔ ان کا  
یقین ہے کہ

”دوستی برابری کی سطح پر ہو سکتی ہے، سر جھکا کر نہیں۔“

انہوں نے صدر پاکستان پرویز مشرف کی کوششوں کو سراہا اور کہا ہمیں بحیثیت  
پاکستانی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیوں کہ کسی بھی ملک کی پالیسیوں میں تبدیلی راتوں رات نہیں  
آتی ہمیں ان تبدیلیوں کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہنا ہے۔

ڈاکٹر سہیل مسعود نے کہا کہ ہماری جدوجہد کے مقاصد یہ ہیں.....

- ہمیں امن چاہیے اور امن حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔ ہم اسی  
کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔
- ہم مسلمانوں کو تعلیم کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ دوسری اقوام ہم سے تعلیم میں بہت  
آگے ہیں۔ تعلیم کی کمی نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے بچے  
یہاں آ کر محنت کر کے اپنی روزی بھی کماتے ہیں اور تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔
- ہمیں صحت کی جانب بھی توجہ دینی ہے۔ کمزور دماغ اور کمزور جسم مقابلے میں ناکام رہ جاتے  
ہیں۔ ہمیں صحت کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر مسابقت کی دوڑ جیتی ہے۔
- ہمیں ”اتحاد“ کے جذبے سے کام کرنا ہے۔ ہم متحد نہ ہوں گے تو کبھی بھی کامیابی کی منزل  
تک نہیں پہنچ سکتے۔ وقتی اختلافات دوسری بات ہے مگر جب ہمارے مسائل کی بات ہوگی یا  
اسلام کا مسئلہ سامنے آئے گا تو ہمیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے  
جدوجہد کرنا ہے۔



● جس طرح ہم نے ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر ایک جہتی کا جذبہ پیدا کیا ہے اس اسپرٹ کو برقرار رکھنا ہے۔ ہندوستان میں بھی تقریباً دو سو ملین مسلمان ہیں۔ دشمنی برقرار رکھ کر کبھی بھی مسائل حل نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر سہیل مسعود انہی مقاصد کے پیش نظر مضامین بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کے انگریزی مضامین مقامی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ وہ مغربی میڈیا کے اس تصور میں تبدیلی چاہتے ہیں جو مسلمانوں کو دہشت گرد بنا کر پیش کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے ہمیں میڈیا کے ذریعے چاہیے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرونک۔ امریکہ کو باور کرانا ہے کہ اسلام امن کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمان امن پسند ہیں۔ قرآنی تعلیمات کو ہمیں عام کرنا ہے۔ اسلام وہ نہیں جو مغربی میڈیا پیش کرتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک طویل جدوجہد کرنا ہے اور صبر آزما مقامات سے گزرنا ہے۔

ڈاکٹر سہیل مسعود کے عزائم بلند اور پختہ ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

ڈاکٹر سہیل مسعود اب خود شعر نہیں کہتے مگر شاعری کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔ غالب ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں۔

اور کتنی دور ہیں ساغرِ عدم کی منزلیں  
زندگی سے پوچھ لوں گا راستے میں گر ملی  
(ساغر صدیقی)

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگِ علاج  
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک  
(غالب)

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ  
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہرے ہونے تک  
(غالب)



# گفتنی

حصہ دوم

نثر نگاروں کا تذکرہ

تصنیف و تالیف

سلطانہ مہر

مہر بک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ

MEHER BOOK FOUNDATION

20873 East Walnut, Canyon Road,

Walnut, CA 91789 USA

E-mail: sultanameher38@hotmail.com



## جملہ حقوق بحق مصنف و مولف محفوظ

نام کتاب: گفتنی حصہ دوم (نثر نگاروں کا تذکرہ)

مصنف و مولف: سلطانہ مہر

سن اشاعت: بار اول 2004ء

ناشر: مہربک فاؤنڈیشن،

لاس اینجلس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ

طباعت: اے بی سی پرنٹرز، کراچی

قیمت: 400 روپے (پاکستان میں)

25 امریکی ڈالر، 15 پاؤنڈ

اشاکسٹ:

ویلم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مین اردو بازار، کراچی - پاکستان

فون: 021-2639581/2633151

فیکس: 021-2638086

ای میل: wbp@welbooks.com

ویب سائٹ: www.welbooks.com



# انتساب

یہ میری ادبی کاوش ”گفتنی دوم“  
اس کے نام ہے۔ جو ایک معتبر  
افسانہ نگار، شاعر، میرا شریک سفر  
اور شریک حیات بھی ہے۔ نام ہے اس کا  
جاوید اختر چودھری



## اظہار تشکر

میرے اس طویل ادبی سفر میں مجھے بہت پیارے، مہربان اور کرم فرم احباب ملے۔ جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی نے مجھے سکون کی بہت سی ساعتیں فراہم کیں۔ ان میں سے چند نام سخن ورنجتم کے انتساب کے صفحے پر درج ہیں۔ چند جو اس وقت یاد آ رہے ہیں وہ ہیں:

حسن چشتی، مجتبیٰ حسین، حمایت علی شاعر، غوثیہ سلطانہ، سید جعفر امیر، جاوید زیدی، ناصر خان ناصر، سید یونس اعجاز، خالد خواجہ، انور خواجہ، فرحت خواجہ، عرفان مرتضیٰ، عینی اختر، ریحانہ قمر، تنویر کرمانی، نیلوفر کرمانی، ڈاکٹر فیروز عالم، قاضی اسد، آصف الرحمن طارق، نازنین محمود، شاہد ہاشمی، سیما ہاشمی، پرویز چوہدری، پروین پرویز، نواز صاحب، کنیر نواز، کلثوم اختر، مرزا علی اصغر، طیبہ اصغر، اماں، حمیرا، کمیرا، صائمہ، حلیمہ، خرم، قمر، عامر، نرگس، آصف ملک، ارشد ملک، فرزاتہ، زاہد حسین، ثمنینہ زاہد، قدیر خان صاحب، عائشہ قدیر خان، جاوید قدیر، پیاری بشری (چوچو) اور سلمان رب کریم فضلی



## فہرست مضمولات ..... گفتنی حصہ دوم

- ۱۔ دور حاضر کے شعرا کا تذکرہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، کراچی پاکستان 9
- ۲۔ پڑھول انسانیت اور تلمیذ ابتدائی سے دور۔ ایک ناگزیر تذکرہ قیصر تمکین، برمنگھم برطانیہ 12
- ۳۔ جو میں نے دیکھا جاوید اختر چوہدری، برمنگھم برطانیہ 15
- ۴۔ تذکرہ سلطانہ مہر۔ بحوالہ گفتنی اول مجتبیٰ حسین، دہلی ہندوستان 21
- ۵۔ ہمہ جود و ہمہ جہت شخصیت اکرام بریلوی، مسی ساگا کینیڈا 25
- ۶۔ سلطانہ مہر اور ان کی دو تازہ تخلیقات مختار زمن مرحوم، کراچی پاکستان 27
- ۷۔ گفتنی اول۔ ایک دلچسپ دستاویز بشری رحمن، لاہور پاکستان 31
- ۸۔ سلطانہ مہر ایک پورا ادارہ انور خواجہ، لاس اینجلس امریکہ 33
- ۹۔ گفتنی۔ ایک یادگار ادبی کارنامہ تاج سعید مرحوم، پشاور پاکستان 35
- ۱۰۔ منظوم خراج محبت ضیاء خان، لاس اینجلس امریکہ 39
- ۱۱۔ جو گذری — گذر گئی سلطانہ مہر، برمنگھم برطانیہ اور لاس اینجلس امریکہ 40

| شمار | نام                             | صفحہ | شمار | نام                                   | صفحہ |
|------|---------------------------------|------|------|---------------------------------------|------|
| ۱    |                                 |      | ۹    | اقبال متین۔ نظام آباد ہندوستان        | 103  |
| ۱    | ڈاکٹر ابن کنول۔ دہلی ہندوستان   | 44   | ۱۰   | محمد الیاس۔ میرپور آزاد کشمیر پاکستان | 110  |
| ۲    | احمد بشیر۔ لاہور پاکستان        | 53   | ۱۱   | ڈاکٹر الہی بخش اعوان۔ لندن برطانیہ    | 116  |
| ۳    | احمد زین الدین۔ کراچی پاکستان   | 61   | ۱۲   | امجد علی مرزا۔ لندن برطانیہ           | 121  |
| ۴    | ادیب سہیل۔ کراچی پاکستان        | 66   | ۱۳   | انور خان مرحوم۔ ممبئی ہندوستان        | 129  |
| ۵    | اشفاق احمد۔ لاہور پاکستان       | 71   | ۱۴   | ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور پاکستان        | 142  |
| ۶    | اطہر رضوی۔ ٹورنٹو کینیڈا        | 81   | ۱۵   | سید انور سعید۔ ملی گڑھ ہندوستان       | 152  |
| ۷    | انگبار اثر۔ دہلی ہندوستان       | 91   | ۱۶   | اس۔ امیر النساء۔ ملویشرم،             | 157  |
| ۸    | ڈاکٹر افتخار نسیم شکاگو، امریکہ | 97   |      | جامل ناڈو، ہندوستان                   |      |



| صفحہ | شمار | نام  | صفحہ | شمار | نام   |
|------|------|--|------|------|---|
|      |      | <b>ب</b>                                   |      |      | <b>ب</b>                                      |
| 161  | ۱۷   | ناصر سلطان کاظمی - چیئرمین برطانیہ         | 256  | ۳۲   | حمید قیصر - بریڈ فورڈ برطانیہ                 |
| 166  | ۱۸   | بانو قدسیہ - لاہور پاکستان                 |      |      | <b>خ</b>                                      |
| 183  | ۱۹   | سید بشیر حسین جعفری - اسلام آباد پاکستان   | 262  | ۳۳   | خالہ خواجہ - ایس اینجلس امریکہ                |
| 188  | ۲۰   | بنقیس جہاں - بھوپال ہندوستان               | 265  | ۳۴   | ڈاکٹر خالد سہیل - ٹورانٹو کینیڈا              |
| 191  | ۲۱   | ڈاکٹر بیدار بخت، ٹورانٹو، کینیڈا           |      |      | <b>د</b>                                      |
|      |      | <b>پ</b>                                   | 271  | ۳۵   | ویکٹ بڈکی - بڑودہ، ہندوستان                   |
| 200  | ۲۱   | پروین عاطف - لاہور پاکستان                 |      |      | <b>ڈ</b>                                      |
| 207  | ۲۲   | پروین لاشاری - لندن برطانیہ                | 276  | ۳۶   | ڈاکٹر ڈیوڈ میٹھور - لندن برطانیہ              |
|      |      | <b>ت</b>                                   |      |      | <b>د</b>                                      |
| 211  | ۲۳   | تبسم محسن علوی - جدہ سعودی عرب             | 282  | ۳۷   | ڈاکٹر راحت سلطانہ - حیدرآباد دکن ہندوستان     |
| 216  | ۲۴   | ترنم ریاض - دہلی ہندوستان                  | 285  | ۳۸   | راشد آذر - حیدرآباد ہندوستان                  |
| 220  | ۲۵   | تسلیم الہی زلفی - ٹورانٹو کینیڈا           | 290  | ۳۹   | رضا علی غابدی - لندن برطانیہ                  |
| 225  | ۲۶   | محمد توفیق خان - سروج ہندوستان             | 301  | ۴۰   | ڈاکٹر رضیہ حامد - بھوپال ہندوستان             |
|      |      | <b>ث</b>                                   |      |      | <b>س</b>                                      |
| 229  | ۲۷   | ثریا انعام - سان فرانسسکو امریکہ           | 305  | ۴۱   | محمد سالم - نیو جرسی امریکہ                   |
|      |      | <b>ج</b>                                   | 311  | ۴۲   | سعدیہ سیٹھی - نوٹنگھم برطانیہ                 |
| 235  | ۲۸   | جاوید اختر پاشا - نیویارک امریکہ           | 320  | ۴۳   | سلطان جمیل نسیم - کراچی پاکستان               |
| 239  | ۲۹   | سید جعفر امیر - ٹیکساس امریکہ              | 324  | ۴۴   | سلطان محمود - برمنگھم برطانیہ                 |
| 246  | ۳۰   | ڈاکٹر جمال الدین جمال - کیلیفورنیا، امریکہ | 330  | ۴۵   | پروفیسر سلیمان اطہر جاوید - حیدرآباد ہندوستان |
| 250  | ۳۱   | جمشید مرزا - لندن برطانیہ                  | 335  | ۴۶   | بچے گوڈ بولے - پونے ہندوستان                  |

| شمار نام  | صفحہ | شمار نام                                      | صفحہ |
|---|------|---|------|
| ش   |      |   |      |
| ۳۷ - شاہد احمد - لندن برطانیہ                       | 342  | ۶۲ - عرفان ترمین شہنم - فورٹ، وانم ہاڑی، 419  |      |
| ۳۸ - شاہد بیگم - ناروے                              | 346  | تامل ناڈو، ہندوستان                           |      |
| ۳۹ - شاہدہ انیس - ہسٹنگش، لانگ آئی لینڈ، امریکہ     | 350  | ۶۳ - سید عاشور کاظمی - برمنگھم برطانیہ        | 422  |
| ۵۰ - ڈاکٹر شبیر احمد بن عید الرحمن - فلوریڈا امریکہ | 356  | ۶۴ - ڈاکٹر علی احمد فاطمی - الہ آباد ہندوستان | 428  |
| ۵۱ - شرف الدین شرف کمالی - کولہاپور ہندوستان        | 364  | ۶۵ - سید علی امام نقوی - ممبئی ہندوستان       | 432  |
| ۵۲ - ڈاکٹر شعائر اللہ خان - رام پور ہندوستان        | 369  | ۶۶ - علی ایم شمس - ممبئی ہندوستان             | 437  |
| ۵۳ - ڈاکٹر شیخ افروز زیدی - دہلی ہندوستان           | 373  | ف   |      |
| ۵۴ - شمیم طارق - ممبئی ہندوستان                     | 378  | ۶۷ - ف۔ س۔ اعجاز - کولکتہ ہندوستان            | 441  |
| ۵۵ - شوکت مرزا - لندن برطانیہ                       | 382  | ۶۸ - فیروز الدین احمد فریدی - کراچی پاکستان   | 447  |
| ۵۶ - ڈاکٹر شہناز منزل - لاہور پاکستان               | 386  | ۶۹ - فیصل نواز چوہدری - ناروے                 | 454  |
| ص   |      | ق   |      |
| ۵۷ - صابر ارشاد عثمانی - لندن برطانیہ               | 391  | ۷۰ - پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس - دہلی ہندوستان   | 458  |
| ۵۸ - صبیحہ علوی - برمنگھم برطانیہ                   | 397  | ک   |      |
| ۵۹ - ڈاکٹر صفات علوی - بریڈ فورڈ برطانیہ            | 400  | ۷۱ - کرامت غوری - ٹورانٹو کینیڈا              | 463  |
| ط   |      | گ   |      |
| ۶۰ - ڈاکٹر طاہر تونسوی - ملتان پاکستان              | 408  | ۷۲ - گلزار - ممبئی ہندوستان                   | 470  |
| ع   |      | م   |      |
| ۶۱ - ڈاکٹر طاہر مز - ریاض سعودی عرب                 | 414  | ۷۳ - مبارک کاپڑی - ممبئی ہندوستان             | 477  |
|   |      | ۷۴ - مجید سلیم - دمام سعودی عرب               | 485  |
|   |      | ۷۵ - حافظ حیدر مرحوم - ممبئی ہندوستان         | 493  |
|   |      | ۷۶ - ڈاکٹر مختار الدین احمد - شی فیلڈ برطانیہ | 502  |
|   |      | ۷۷ - پروفیسر منظور حسین یاد - لاہور پاکستان   | 507  |



| شمار نام                               | صفحہ | شمار نام                       | صفحہ |
|--|------|--------------------------------|------|
| ۵۸۔ پرو فیسر منیر احمد بڑوائی۔ میرپور  | 513  | ۸۵۔ واجد ندیم۔ شکاگو امریکہ    | 543  |
| آزاد کشمیر پاکستان                     |      |                                |      |
| ن                                      |      | ی                              |      |
| ۷۹۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی۔            | 517  | ۸۶۔ یوسف ناظم۔ ممبئی ہندوستان  | 549  |
| دہلی ہندوستان                          |      | محبوبوں کا سفیر محمد شفیق موڑک | 554  |
| ۸۰۔ نجمہ عثمان۔ لندن برطانیہ           | 521  | آعارف: مبارک کا پڑی، ممبئی     |      |
| ۸۱۔ نذیر فتح پوری۔ پونے ہندوستان       | 526  | یہ گفتنی کا چمن، ضیا خان       | 556  |
| ۸۲۔ ڈاکٹر نگار عظیم۔ دہلی ہندوستان     | 531  | فہرست سابقہ کتب                | 557  |
| ۸۳۔ نور شہزادی عالم۔ پشیر برو، انگلینڈ | 535  |                                |      |
| ۸۴۔ نیلم احمد بشیر۔ لاہور پاکستان      | 538  |                                |      |

ڈاکٹر محمد علی صدیقی  
کراچی، پاکستان

## دورِ حاضر کے شعرا کا تذکرہ

ان خاتون صحافیوں کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے سلطانہ مہر کے طرح اردو ادب کی جانب توجہ کی ہے۔ صحافت کا پیشہ اس قدر وقت طلب ہوتا ہے کہ خواتین کے لئے اپنی مصروفیات سے عہدہ برآ ہونا بھی شاذ و نادر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ لہذا زیادہ تر صحافی خواتین بالآخر اپنے پیشے کو خیر باد کہتے ہوئے گھربار سنبھال لیتی ہیں۔

سلطانہ مہر نے اگرچہ بہت عرصے پہلے ہی صحافت سے دستبرداری اختیار کر لی تھی لیکن ادب سے جو ان کا رویہ رہا ہے، اُس سے وہ اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی ان تھک مولف ثابت ہوئیں۔

ان کی پیدائش ممبئی کے ایک ٹھیٹ کاروباری میمن خاندان میں ہوئی۔ بہت عرصہ پہلے انہوں نے اپنے شوہر سعید رضا کے ساتھ، جو ایک مصروف اردو ادیب، شاعر اور صحافی رہے ہیں، پاکستان کی راہ لی۔ سلطانہ مہر نے صحافت میں ایم اے کی ڈگری کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی صحافتی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۶۵ء میں کراچی کے روزنامے ”انجام“ سے ہوا۔ دو سال بعد وہ پاکستان کے ایک مشہور روزنامے

نوٹ: انگریزی مضمون سے ترجمہ رفعت صدیقی



”جنگ“ سے وابستہ ہو گئیں اور مختلف شعبوں میں ۱۹۷۹ء تک کام کرتی رہیں۔ بعد میں کئی برسوں تک انہوں نے اپنے جریدے ”روپ“ کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ پھر وہ امریکا منتقل ہو گئیں۔ جس بات نے ان کو شاعروں اور ادیبوں سے انٹرویو لینے اور چھپوانے پر مائل کیا وہ تھی ان کی افسانہ نگاری۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار ان کی کہانی روزنامہ ”انقلاب“ میں شائع ہوئی۔ وہ اور ان کے شوہر ممبئی کی ادبی اور ثقافتی پیش منظر کا ایک جزو تھے۔ اس لئے وقت کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی دلچسپی اردو ادب سے بڑھتی ہی گئی۔

ان کا پہلا ناول ”داغ دل“ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے کئی ناول منظر عام پر آ گئے۔ ان کے دوسرے ناول یہ ہیں ”تاجور“ (۱۹۸۹ء)، اک کرن اُجالے کی (۱۹۶۹ء) اور جب بسنت رُت آئی (۱۹۷۲ء)۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں ”بند سپیاں“ (۱۹۷۶ء)، دل کی آبروریزی (۱۹۸۸ء)۔ سلطانہ مہر ایک مستحکم نظریاتی بنیاد کی حامل ہیں اور افسانہ نگاری میں ترقی پسند ادب کی علم بردار رہی ہیں۔ یعنی ان کے افسانوں میں مظلوم افراد کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے، خصوصاً ان لوگوں کی جو میٹروپولیٹن شہروں میں رہتے ہیں اور روایتی زندگی سے بھی انحراف کو ضابطہ اخلاق کے خلاف گردانتے ہیں۔ اس طبقے کے چند افراد تو جدیدیت سے نہ صرف حقارت روا رکھتے ہیں بلکہ اسے روایتی طرز زندگی کے لئے خطرہ بھی قرار دیتے ہیں۔ سلطانہ مہر نے جن کا تعلق سماج کے متوسط طبقے سے رہا ہے اسی طبقے کے کرداروں کے بارے میں چند چونکا دینے والی کہانیاں تحریر کی ہیں۔ جن افراد نے روایتی انداز فکر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا وہ ان سے ہمیشہ ہمدردی کرتی رہی ہیں۔ چوں کہ وہ خود بہت آزاد خیال اور موڈرن شخصیت رکھتی ہیں اس لئے ان کی کہانیوں اور ناولوں میں ترقی پسند افسانہ نگاری کا پرتو نظر آتا ہے۔

دور حاضر کی شاعرات کے بارے میں ان کی تالیف ۱۹۷۴ء میں ”آج کی شاعرات“ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ایک سو زیادہ شاعرات کا تذکرہ ہے۔ اسی کی پزیرائی سے حوصلہ پا کر انہوں نے تذکرہ تالیفات کی ضمن میں ”سنخوڑ“ سلسلے کی کتابوں میں پہلی کتاب میں پاکستان کے اردو شاعروں کے بارے میں مکمل تفصیلات اکٹھا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

یہ کتاب جس میں سلطانہ مہر کی جانب سے کیئے جانے والے سوالات کے جواب مختلف شاعروں نے دیئے ہیں، صداقت پر مبنی مواد فراہم کرتی ہے۔ اس سلسلے کے تحت پہلی کتاب ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی جس میں پاکستان کے بہتر (۷۲) شعرا کا احاطہ کیا گیا تھا۔ دوسری جلد میں اٹھاسی (۸۸) شعرا کا تذکرہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں چھپی تھی۔ تیسری اور چوتھی جلدوں میں جو بالترتیب ۱۹۹۸ء اور ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی تھیں، ایک سو بیاسی (۱۸۲) اور اٹھاسی (۸۸) شعرا کو پیش کیا گیا۔ آخر الذکر دونوں جلدوں میں برصغیر ہند کے علاوہ دوسرے ممالک کے شعرا کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اس طرح یہ بات پورے وثوق سے کہ جا سکتی ہے کہ سلطانہ مہر نے ہم عصر اردو شعرا کی تاریخ مرتب



کرنے کے معاملے میں اپنے سب سے زیادہ اصول پسند اور قابل بھروسہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔  
 انہوں نے اردو کے چار سو اکتالیس (۲۴۱) شاعروں کے بارے میں بنیادی تفصیلات یک جا  
 کی ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال پچھلی صدی کی ایک معرکہ آرا تذکرے سے ہی دی  
 جاسکتی ہے وہ ہے مولانا عبدالحی کی کتاب ”گل رعنا“۔

سلطانہ مہر کے لئے اب یہ امر حد درجہ طمانیت بخش ہے کہ ان کی کاوشیں کسی بھی ریسرچ  
 اسکالر کے ضرور کام آئیں گی جسے پاکستان کی اردو شاعری اور نثر کے بارے میں تحقیق کی ضرورت لاحق  
 ہوگی۔ انہوں نے ایسی زرین معلومات جن چار جلدوں کے لئے اکٹھا کی ہیں انہیں اس کام کے لئے  
 خاصے عرصے یعنی ۱۹۶۹ء سے سال رواں (۲۰۰۷ء) تک، یعنی کہ بتیس (۳۲) برس ازاحد محنت کرنی  
 پڑی ہے۔ اس طرح یہ ان کی زندگی بھر کا نچوڑ کہی جاسکتی ہیں۔

امریکہ میں لاس اینجلس مقیم سلطانہ مہر اب تک اپنی تخلیقی ادبی سرگرمیوں میں ڈوبی ہوئی  
 ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطانہ مہر اپنے غیر معمولی کارناموں کے لئے بجا طور پر از حد تعریف و  
 تحسین کی مستحق ہیں۔ انہوں نے ہر کس و ناکس پر ظاہر کر دیا ہے کہ کیسے جوش اور لگن اور بھرپور عزم  
 کے ذریعے دشوار سے دشوار کاموں کو بھی آسان بنایا جاسکتا ہے۔

ان کے دورِ حاضر کے شعرا کے تذکرے ”سنخور“ حصہ اول سے لے کر حصہ چہارم تک اور  
 نثر نگاروں کا تذکرہ ”گفتنی“ حصہ اول کی اردو دنیا میں جس طرح پزیرائی ہوئی ہے وہ اس میدان کے  
 دیگر ادیبوں کے لئے ہمت افزائی کا موجب ہونا چاہئے۔

سلطانہ مہر نے جس ذمہ داری اور عرق ریزی کے ساتھ اس اہم کام کو انجام دیا ہے وہ انہیں  
 ناقابل فراموش تذکرہ نویس اور ادیبہ کی حیثیت دینے کے لئے کافی ہے۔ میں ایک عرصے سے سلطانہ مہر  
 کی ریاضت اور خلوص کا قائل ہوں اور اب کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کچھ یوں کہوں کہ  
 ”سلطانہ مہر یہ کام تم ہی کر سکتی ہو“



قیصر تمکین  
برمنگھم، برطانیہ

## پُر ہول انسانیت..... اور تکبر ابتدائی سے دور ایک ناگزیر تذکرہ

یہ تو ممکن ہے کہ اردو دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوں جنہوں نے سلطانہ مہر کا نام نہ سنا ہو مگر ایسا کوئی قابل ذکر شاعر و ادیب غالباً نہ ہوگا جس کے بارے میں سلطانہ مہر پوری تفصیلات سے واقف نہ ہوں۔ اردو اہل قلم خواتین و حضرات کے بارے میں سلطانہ مہر کی حیثیت قاسمی نوعیت کی حامل ہے۔ زیادہ تر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ سلطانہ تقریباً ہر صاحب قلم سے براہ راست روابط رکھتی ہیں، لیکن وہ لوگ بھی جو ان کے دائرہ معلومات سے الگ ہوں ان سے بھی سلطانہ اچھی جان پہچان رکھتی ہیں۔ ان سب کے بارے میں وہ ایک معقول رائے رکھتی ہیں۔ بیشتر یہ رائے منصفانہ، شائستہ اور حدود و ادب و تہذیب میں رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کے بارے میں سلطانہ مہر کی رائے مختلف ہو لیکن اپنی اس رائے کو وہ دوسروں پر ٹھونسے اور ”نافذ“ کرنے کا تاثر نہیں دیتی ہیں۔

ادبی دنیا میں ایک سقم ایسا ہے جو تقریباً ہر زمانے میں نمایاں رہا ہے۔ سقم یہ ہے کہ کوئی فرد اگر



ذرا بھی کام کرتا ہے تو اسے عظیم الشان ثابت کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ دعویٰ تخریبیاسب ہی یہ کرتے ہیں کہ ”جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا“۔ معمولی معمولی تحریروں کو عشائے ربانی کا درجہ دینے کے طلب گار سب ہی ادیب و شاعر رہتے ہیں۔ کسی بھی معمولی شاعر کا وابیات سے وابیات شعر سنیے، تو قیاس اس کی یہ ہی ہوگی کہ اس مہمل شعر کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں۔ یہ خوبی صرف سلطانہ مہر کی ہے کہ بہت کام کرتی ہیں، ہر وقت کسی نہ کسی ادبی خدمت میں مصروف رہتی ہیں لیکن اس کی اشاعت کے لئے عالمگیر شہرت کی طالب نہیں ہوتی ہیں۔

ادیبوں سے کام کی بات لکھوانا کتنا مشکل کام ہے، انہیں سنجیدگی سے کسی مسئلے پر اظہار رائے کے لئے آمادہ کرنا کتنا جان جوکھوں کا کام ہے، یہ بات معمولی سے معمولی رسالے کے مدیر بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن کسی دستاویزی نوعیت کی تصنیف کے لئے قلم کاروں سے برابر رابطہ رکھنا، ان کے تازہ نگرے برداشت کرنا، ان کے سوانح، حدود اور مجبوریوں کا احساس کرنا ہاشما کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بارے میں قدرت نے سلطانہ مہر کو زبردست قوت برداشت سے نوازا ہے۔

ایک معاملے میں تو سلطانہ بالکل ہی منفرد شخصیت کی حامل ہے۔ وہ تذکرہ نگار ہی نہیں ہیں، دوسروں کے قابل قدر کاموں کا اعتراف ہی نہیں کرتیں ہیں، ان سے منت سماجت کر کے دستاویزی نوعیت کی نگارشات ہی نہیں حاصل کرتیں ہیں، بلکہ واقعتاً جو انفرادی خصوصیت ہے وہ یہ کہ وہ خود بھی تجربہ کار، حساس، صاحب طرز ادیبہ ہیں۔ شاعر عام طور پر یہ سوچتے ہیں کہ کوئی ہمارا ہمسرنہ ہو، افسانہ نگار بھی خواہاں اسی بات کے ہوتے ہیں کہ ان ہی کی تعریف و توصیف ہو۔ بہ الفاظ دیگر ہر قلم کار یہ ہی چاہتا ہے کہ اس کے مقابل کسی کا چراغ نہ جل سکے۔ یہ خوبی جہاں تک مجھے علم ہے سلطانہ مہر کی ہے کہ اچھی شاعری کرتی ہیں، اثر انگیز کہانیاں لکھتی ہیں، نقد و نظر کے میدان میں بھی سرگرم تنگ و تاز رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود دوسروں کی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اعتراف میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیتی ہیں۔ سلطانہ مہر کی شاعری دور حاضر کے مذاق سے مناسبت رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تخلیقی کاوشوں کو ادارتی، انتظامی ترتیب و تنظیم سے الگ رکھتی ہیں۔

اس موقع پر ایک مثال بے محل نہ ہوگی۔ جب بھی کوئی ادیب، شاعر یا افسانہ نگار کسی ادارے کی ذمہ داری سنبھالتا ہے، کوئی رسالہ نکالتا ہے یا کسی انجمن کی صالح و فلاح میں مصروف ہوتا ہے تو پھر اس کی اپنی تخلیقی سرگرمیاں پس پشت چلی جاتی ہیں۔ مرحوم صاحب لکھنوی تو اپنے رسالے ”افکار“ کے لئے ایسے دل و جان سے مصروف رہتے تھے کہ آج بہت سے لوگوں کو شاید یہ علم بھی نہ ہو کہ وہ واقعی ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ یہ اعزاز، جہاں تک ہمیں علم ہے، صرف احمد ندیم قاسمی ہی کو حاصل ہے کہ پوری ایمان داری، غیر جانب داری اور سرتاسر جمہوریت پسندی کے ساتھ ادارتی و صحافتی سرگرمیوں میں ہمہ وقت مصروف رہنے کے باوجود اپنی تخلیقی کاوشوں سے غافل نہیں رہتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا رتبہ اقبال اور یگور کے برابر ہے کیوں کہ برصغیر ہند میں صرف یہ ہی دو جید حضرات ایسے تھے جن کی فکر و فن



کے دھارے بند نہیں ہوئے۔ ان ہی کی طرح قلمی صاحب بھی ہمہ جہت ادیب، دانشور ہیں اور ان کے تخلیق کے سوتے کسی زمانے میں (الحمد للہ) خشک نہیں ہوئے۔

بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی روش یہ رہی ہے کہ وہ اگر کسی کو فیض رساں ادارے سے متعلق ہو جاتے ہیں تو اپنی سرکاری یا نوکری شاہی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور ادبی دنیا میں ”بہ اعتبار عہدہ“ جگہیں حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ ہمیں ذاتی طور پر ایسے سرکاری ادیبوں اور شاعروں کا علم ہے جو اپنے ماتحتوں سے ’عرضی نوپسی‘ کا کام لیتے ہیں۔ حکومت ہند کی مرکزی وزارت اطلاعات سے متعلق ایک شاعر ہر سرکاری پریس نوٹ اور تصویریں اور خبرناموں کے ساتھ اپنا کلام بھی بھیج دیتے تھے (سرکاری خرچ پر)، جب رسائل و اخبارات کو وزارت تعلقات عامہ سے کام ہوتا تھا وہ اس شاعر کا کلام نمایاں کر کے شائع کرتے تھے۔

شطنج کا ایک اصول ہے کہ کوئی پیادہ اگر پٹے بغیر چپ چاپ آگے بڑھتا ہے تو مخالف مربع میں پہنچ کر وہ فرزین بن جاتا ہے۔ آج اردو شعر و ادب کی دنیا میں متعدد ایسے حضرات ہیں جو تھے تو پیادے لیکن شاطروں کا دھیان دوسری طرف ہونے کی وجہ سے اب مخالف مربعوں میں پہنچ کر حیثیت فرزین کی اختیار کر چکے ہیں۔ سلطانہ مہر نے متعدد اچھے عہدوں یا اداروں سے تعلق رکھا لیکن اپنی اس ”مفید“ حیثیت کو ادبی سیڑھیوں کی طرح استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ غالباً یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی نگارشات کے قارئین کسی طنز و استہزاء سے کام لینے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس وقت تک سلطانہ کئی کتابوں کی مصنف بن چکی ہیں لیکن ان کے لہجے میں وہ ”پرہول“ انانیت یا تکبر ابتدائی نہیں ہے جو تقریباً ہر دور میں دو چار ادیبوں کا نشان امتیاز رہا ہے۔

سلطانہ مہر کی ادبی خدمات کی تفصیلی محاکمے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ وہ ابھی عمر کی اس زرخیز منزل میں ہیں جب قلم بے محابا اور مختلف سمتوں میں رواں رہتا ہے۔ فی الحال تو یہ چند سطریں محض ایک اعتراف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نئے نئے لوگ آئیں گے اور اپنے اپنے مطالعے کی روشنی میں سلطانہ مہر صاحبہ کی خدمات پر تفصیل سے بحث کریں گے۔ انہوں نے اتنی کم عمری پر ہی اتنا کچھ تخلیقی اندوختہ جمع کر لیا ہے کہ ادب و شعر کی محفلوں میں ان کا نام نہ لینا محض تعصب و لاعلمی کا سبب سمجھا جاسکتا ہے۔ ہم تو فی الوقت یہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک نئی صدی کی ابتدا تک سلطانہ مہر ہمارے ادبی تذکروں میں ایک ”ناگزیر تذکرہ“ بن چکی ہیں۔

## جاوید اختر چودھری برمنگھم، برطانیہ

### جو میں نے دیکھا

یہ ۱۹۹۹ء کی بات ہے جب مجھے ”گفتنی حصہ اول“ کے تحریری انٹرویو کے لئے سوال نامہ ملا تھا۔ سوال نامہ اتنا دل چسپ تھا کہ اس نے میرے ذہن کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کتاب کی خریداری کے لئے ایڈوانس بکنگ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ برصغیر پاک و ہند سے دور سات سمندر پار، امریکہ میں بیٹھی ایک خاتون کو کیا پڑی جو ہم جیسے ادیبوں کو دنیا کے ادب میں متعارف کراتی پھرے۔ میں نے سلطانہ مہر کا نام کسی سے تو سنا تھا لیکن ان کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ سوال نامے کے جوابات اپنے پہلے شعری مجموعے ”حصار ذات“ کے ساتھ ان کی خدمت میں روانہ کر دیئے۔

ادھر چوں کہ میری کتاب کسی نامور ادیب یا نقاد کے پیش لفظ، تقریظ اور فلیپ سے محروم تھی، اس لئے میرے خیال میں یہ توقع عبث تھی کہ سلطانہ مہر میرے بارے میں کچھ لکھیں گی۔ ادھر دوسری طرف سے بھی بھیجے ہوئے جوابات پہنچنے کی کوئی رسید نہ ملی۔ کوفت سے بچنے کے لئے انٹرویو کے جوابات دے کر بھول جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔ ۲۰۰۰ء میں معلوم ہوا کہ ان کی کتاب ”گفتنی حصہ اول“ منظر عام پر آگئی ہے۔ میں نے کتاب خریدی۔ اور اس کتاب کے مطالعے کے بعد خوشی اور حیرت کے



جذبات سے مفلوب تھا۔ جیت یہ تھی کہ سلطانہ مہر نے تحریری انٹرویو کو اس خوب صورتی اور سلیقے سے لکھا تھا جیسے ہم نے بالمشافہ گفتگو کی ہو۔ میرا انٹرویو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا، جب کہ ان کے سوال نامے کے جواب میں، میں نے زیادہ سے زیادہ چار صفحے لکھے تھے۔ جیسا کہ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ سوال نامے کے جواب دیتے وقت نہ صرف اپنی کتابیں روانہ کرتے ہیں بلکہ ان کتابوں پر تبصرے اور خبروں کے تراشے بھی بھیجتے ہیں۔ اس سے سلطانہ مہر کو لکھنے کے لئے مواد بہ افراط مل جاتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب کے ساتھ کسی کا تبصرہ یا تنقیدی مضمون نہیں بھیجا تھا کیوں کہ اس وقت سرے سے میرے پاس ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ سلطانہ مہر نے صرف میرے اپنے لکھے ہوئے دیباچے سے استفادہ کیا۔ میں نے اس دیباچے میں سینئر ادیبوں اور نقادوں کے تنک مزاج رویوں کی بھرپور شکایت کی تھی۔

ایک مقامی سینئر ادیب کو شاید کسی ان کی اپنی ذاتی مصلحت کے تحت میں کہ ایک گم نام لکھاڑی بہت عزیز تھا۔ انہوں نے شروع میں کتاب کا تعارف لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے عین وقت پر یہ کہہ کر دکھ دیا کہ وہ ایرے غیروں نھو خیروں کی کتاب پر دیباچے نہیں لکھتے جب کہ میری جان کاری میں حقیقت اس کے خلاف تھی۔ لیکن وہ دکھ وقتی تھا جو گزر گیا۔ اب خوشی حقیقت یہ تھی کہ ایک ایسی شخصیت نے جس سے کبھی کوئی تحریری یا زبانی کسی قسم کا رابطہ نہ تھا، اس نے ایک بھرپور انٹرویو لکھا۔ اب جب مجھے بحیثیت شریک حیات ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع ملا تو میں نے انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے ”سنخور حصہ پنجم“ اور ”گفتنی حصہ دوم“ پر کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور دیکھا کہ ان کا یہ خلوص اور دیانت داری صرف میرے لئے ہی نہ تھی بلکہ ان کا رویہ ہر شاعر اور ہنر کار کے ساتھ یکساں ہے۔ وہ ایک ادارے کا کام خود تنہا انجام دے رہی ہیں۔ وہ ایک ایک اپنے جان پہچان کے شاعر، شاعرہ، ہنر نگار سے، رسائل اور جرائد سے ناواقف ادیبوں کے پتے لے کر ان سے رابطہ کرتی ہیں۔ احباب سے نجی محفل میں بھی کسی شاعر، شاعرہ یا ہنر کار کا نام سنتی ہیں تو اس کا ٹیلی فون نمبر اور پتہ لیتی ہیں۔ اس طرح حاصل کردہ ناموں کے پتے پر سوال نامے کے ساتھ ذاتی خط ارسال کرتی ہیں۔ اس کے بعد یہاں سے ان کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے نام، جو اپنی پہلی فرصت میں اور بغیر کسی یاد دہانی کے سوال نامے کا جواب معہ مطلوبہ لوازم بھیج دیتے ہیں، گفنے کے لئے ایک ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی زیادہ پڑتی ہیں۔ ورنہ تو بقول کسے ان کی شاعرانہ یا ادیبانہ بے نیازی، جو دراصل ان کی غیر ذمہ داری اور کوتاہ بینی یا یوں کہیے ان کی اپنے آپ میں کچھ ہونے کا گھمنڈ ہے جس کی وجہ سے ایسے لوگوں سے معلومات حاصل کرنا ٹیل صراط پر سے گزرنے کا عمل ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے ہفتوں اور مہینوں کے طویل انتظار کے بعد یاد دہانی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سلطانہ مہر یاد دہانی کے لئے خط لکھتی ہیں، ٹیلی فون کرتی ہیں، فیکس اور ای میل بھیجتی ہیں۔ احباب سے سفارشی کرواتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ موصوف یا موصوفہ سے سوال نامہ کہیں رُل گیا۔ تصویر شامل کرنا بھول گئے۔ عکس تحریر سیاہ روشنائی سے لکھنے کا خیال نہیں رہا وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں میرا مشاہدہ ہے کہ یہ حرکتیں بڑے اور مستند ادیبوں سے سرزد نہیں ہوتیں۔ اور



ایک بار دستک دینے پر دروازہ ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر جیکٹ کی اہمیت کے پیش نظر ہر ممکن اعانت و مدد دینے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ ان میں محترم اشفاق احمد، محترمہ بانو قدسیہ، ڈاکٹر صفری مہدی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر صفات علوی، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر رفیق خان، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، محترم جوگندر پال، ڈاکٹر خلیق انجم، محترمہ جیلانی بانو، ڈاکٹر وزیر آغا، محترم احمد ندیم قاسمی، محترم اقبال متین، محترم حسن چشتی اور بہت سے دوسرے احباب اردو ادب بھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی تو سلطانہ مہر کے پاس کراچی میں جہاں وہ مقیم تھیں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور انٹرویو ریکارڈ کرایا، اور یہ کہہ کر حوصلہ بڑھایا..... ”سلطانہ مہر یہ کام تم ہی کر سکتی تھیں“۔ محترمہ قرۃ العین حیدر کے تعاون اور پیار کا تذکرہ سلطانہ مہر خود کرتی ہیں کہ کس طرح وہ ڈاکٹر صفری مہدی کے گھر اپنے آپ تشریف لائیں اور سلطانہ مہر سے ڈیڑھ دو گھنٹے گفتگو کی۔

بلاشبہ سلطانہ مہر بڑے صبر و تحمل اور حوصلے سے نہ صرف اپنی انامیں ذقن ذقن ڈوبے ادیبوں سے ان کے بارے میں متعلقہ معلومات اکٹھا کرتی ہیں بلکہ ان کی کتابوں اور دیگر فرستادہ مواد کا مطالعہ بھی کرتی ہیں۔ انہیں باقاعدہ دفتری سہولتیں بھی دستیاب نہیں جہاں انہیں ٹیلی فون کرنے، خطوط کی ترسیل، فوٹو کاپی کرنے، فیکس بھیجنے، اسٹیشنری کی فراہمی اور کلریکل سپورٹ (clerical support) محرری تعاون) میسر ہو کہ یہ سب لوازمات تو حکومتی یا بڑے قومی یا بین الاقوامی سطح کے نجی اداروں کے پاس ہوتے ہیں۔ اور یہ سارے کام وہ اپنے ذاتی اخراجات برداشت کر کے کرتی ہیں۔ آہنی ارادوں کی یہ خاتون ان مذکورہ سہولتوں کی غیر موجودگی سے پیدا ہونے والی دقتوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور اپنی دھن میں مگن تذکرہ نگاری کے اونچے نیچے سنگلاخ میدان میں رواں دواں ہے۔ جب کہ اچھے اچھوں نے تذکرہ نگاری کے میدان میں پڑے بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا ہے۔

ایک اور بات جو اس مضمون کو لکھنے کا باعث بنی وہ ہے کچھ لوگوں کا یہ اعتراض کہ سلطانہ مہر نے معروف اور غیر معروف شاعروں اور ادیبوں کو ایک ہی کتاب میں جمع کر کے معروف حضرات کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک دانش وار (?) کا کہنا ہے۔ ”سلطانہ مہر نے گدھے اور گھوڑے کو ایک ہی اصطبل میں باندھ دیا ہے“۔ ایک معتبر شاعر نے تھوڑی نرمی برتی اور ارشاد فرمایا، ”تم نے گلاب اور گیندے کو ایک ہی گلدان میں سجا دیا“۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ گیندے کا پھول تو پوتر ہے جو پوجا میں استعمال ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مثبت رائے، آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہے اور جو ”سنخور حصہ دوم“ میں صفحہ ۱۲ پر موجود ہے۔

”سنخور حصہ دوم میں شامل شعرا و شاعرات ایک مدت سے پاکستان سے باہر ہیں۔ ان کے حسی

تجربے، ذہنی رویے، جذباتی لہریں، مشاہداتی منظر نامے۔ مطالعاتی افق اور انکھاری اسالیب پاکستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے شاعروں اور ادیبوں سے بہت مختلف ہیں اتنے مختلف، اتنے نئے اور اتنے فکر انگیز ہیں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ان تخلیقات سے پورا لطف بھی نہیں اٹھا سکتے۔ ظلم یہ ہے کہ جو لوگ لطف



نہیں اٹھا سکتے وہ اپنی ذہنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے بجائے بیرون ملک قلم کاروں کو زبان و اسلوب کے اعتبار سے کھر دری اور فکر و نظر سے بے معنی قرار دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نئی اسالیب اور جدید حسی تجربوں سے روشناس کرانا آسان نہیں۔ ان کے بارے میں غالب کے لفظوں میں صرف یہ کہہ سکتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو مئے و غم کو یہ اندوہ رہا کہتے ہیں

ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اردو کے جو شاعر و ادیب اس وقت پاکستان سے باہر ہیں ان میں سے بیشتر بہت اچھے شعر کہہ رہے ہیں اور بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ ان کی سوچ اور ان کی تحریروں میں اپنی ثقافت و تہذیب سے جڑے رہنے اور مشرقیت کو اپنی شناخت بنائے رکھنے کے عناصر بھی ہیں اور ان عناصر کو عالمی ادب کے افق پر اُجاگر رکھنے کی وہ کاوشیں بھی ہیں جو پاکستان اور پورے مشرق کے لئے فال نیک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فال نیک اس معنی میں کہ ان کی فکری جدوجہد اور ان کی تخلیقی امتلیں ہر قسم کی تنگ نظری اور معصیت سے عموماً پاک ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کو فکر و نظر کے عالمی افق پر جگمگ کرتے ہوئے دیکھنے اور دکھانے کے متمنی ہیں۔

سلطانہ مہراں کی ان ہی تمناؤں کو سنخورد حصہ دوم کے نام سے منظر عام پر لا رہی ہیں اور اردو کے رشتے سے پاکستان کو دور دراز کے ملکوں سے جوڑے رکھنے کی کوشش و سر جوئی میں مگن ہیں۔ اللہ تعالیٰ سلطانہ مہر کو ہمیشہ خوش رکھے اور ان کے قلم کو زیادہ سے زیادہ معتبر اور باوقار بنائے۔ آمین۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ رائے اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ اس میں نہ صرف بیرون پاکستان کے شعرا اور نثر نگاران کی تخلیقی کاوشوں کو مثبت نظریے سے دیکھا گیا ہے بلکہ اندرون پاکستان ذہنی طور پر مفلس ادیبوں اور نقادوں کے لئے وسیع النظر ہونے کی دعوت بھی موجود ہے۔

پاکستانی ادیبوں اور نقادوں کے ایسے رویے کے خلاف خفتہ احتجاج ڈیلاس، ٹیکساس، امریکہ کے مسعود مکی الدین قاضی کے انٹرویو (جو سنخورد حصہ پنجم میں شامل ہے) میں اس ریمارک سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ ہم جیسے غریب الوطن اردو کے لکھاڑیوں کے دل کی آواز بھی ہے۔

”آپ کا یہ احسان نہ صرف اردو زبان پر ہے بلکہ ہم جیسے شعرا پر بھی ہے کہ غیر معروف شعرا کو معروف شعرا کے ساتھ لوگ ہمارا نام بھی پڑھ لیتے ہیں اور یوں ہمیں جان جاتے ہیں، ہم سے متعارف ہو جاتے ہیں۔“

قاضی صاحب کے فقرے سے جہاں انگسار و غمز کے ساتھ ساتھ ممنونیت و احسان مندی کا جذبہ مترشح ہے وہیں متشخص ہونے کی امید اور اس سے خوشی کا احساس جھلک رہا ہے۔

میرے خیال میں سلطانہ مہر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی گل دان میں رنگ برنگ پھولوں کو سجایا ہے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ یہ جو آج اپنے آپ کو معروف شاعر اور نثر نگارانے پر مصر ہیں وہ اپنے اوائل ادبی زندگی میں کیا تھے؟ زمیندار ذہنیت کی طرح کیا ادبی شہرت انہیں کسی وراثت میں ملی ہے؟ کیا یہ خود کبھی غیر معروف نہ تھے؟ جب انہوں نے خود بتدریج و حقیقی ارتقائی منازل طے کی ہیں تو اب نئے لکھنے والوں سے تعصب کیوں؟ اگر اردو ادب کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو بہت



سارے ایسے شاعر اور نثر نگار مل جائیں گے جو پی آر کے فن سے نابلد ہیں لیکن گوشہ تنہائی و گم نامی میں بیٹھے اعلیٰ ادب کی تخلیق میں مصروف ہیں۔

اب میں پاکستان کے ایک اور معتبر محقق کی رائے کا حوالہ دوں گا۔ جناب مشفق خواجہ کا نام اردو ادب میں جانا پہچانا بڑا نام ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے محقق ہیں، صفحہ اول کے نقاد ہیں، مزاح نگاری میں ان کا اسلوب منفرد ہے۔ انہوں نے تذکرہ نگاری کے حوالے سے ”سخنور حصہ دوم“ میں اپنے مضمون میں چار کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱) تذکرہ شعرائے حجاز، مرتب امداد صابری، سن اشاعت ۱۹۶۹ء۔ (۲) جنوبی افریقہ کے اردو شاعر، مرتب امداد صابری، سن اشاعت ۱۹۷۸ء۔ (۳) دھوپ کے شاعر، مرتب باقی احمد پوری، سن اشاعت ۱۹۸۱ء اور (۴) مشرق وسطیٰ میں اردو، مرتب سید قمر حیدر قمر اور تمین ساتھی۔ آگے وہ لکھتے ہیں.....

”یہ سب کتابیں، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، مختلف علاقوں کے بارے میں ہیں۔ اب تک ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں دنیا کے تمام خطوں کے شعرائے اردو کا ذکر ہو۔ سلطانہ مہر نے اس کمی کو نہایت عمدگی سے پورا کیا ہے۔ زیر نظر کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں اردو کے شاعر موجود نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ سلطانہ مہر کو اس کا دعویٰ نہیں ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے دنیا بھر کے تمام شاعروں کا احاطہ کر لیا ہے اور ایسا دعویٰ کیا بھی نہیں جاسکتا۔ تاہم شاعروں کی ایک خاصی تعداد کے کوائف اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ اور جن میں سے بعض شاعر ایسے ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ نہیں ملتا۔“

بلاشبہ مشفق خواجہ نے کھلے دل سے سلطانہ مہر کی اردو ادب میں تذکرہ نگاری کی تحسین کی ہے۔ مشفق خواجہ کی رائے بحیثیت ایک محقق بلا کسی لاگ پلیٹ کے صائب ہوتی ہے۔

سلطانہ مہر ایک بے قرار روح ہے۔ انہوں نے براعظموں کی خاک چھانی ہے۔ انہوں نے شہر شہر، ملک ملک گھوم کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اردو ادب کے بکھرے ہوئے انمول موتیوں کو ایک مالا میں پرو دیا ہے جسے ”سخنور“ اور ”گفتنی“ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سلطانہ مہر تذکرہ نگاری کے دوران جس عذاب اور جاں کنی سے گزری ہیں اور اب تک گزر رہی ہیں اس کا مجھے اچھی طرح ادراک ہے جو بلاشبہ تخلیقی کرب سے کسی طرح کم نہیں۔

سلطانہ مہر کی کتابوں کی اہمیت عام تذکروں کے نفس مضمون سے بھی بڑھ گئی ہے۔ سلطانہ مہر نے ”سخنور“ اور ”گفتنی“ میں شامل ادیبوں، دانشوروں اور ماہرین لسانیات کے ساتھ اردو رسم الخط کی تبدیلی کا سوال اٹھایا ہے۔ اردو دشمنی کے سلسلے میں یہ فتنہ وقفے وقفے سے سر اٹھاتا رہا ہے۔ اب یہ کام حکومت سے متعلق اردو اداروں کا ہے کہ ”سخنور“ اور ”گفتنی“ میں درج شدہ مستند اہل قلم کی آراء اور مشوروں کی روشنی میں رسم الخط کے فتنے کا ہمیشہ ہمیش کے لئے سدباب کریں۔

منتقدین شعر اور نثر نگاروں کی تحریریں پڑھ کر اکثر یہ خیال آتا ہے کہ نجانے وہ لوگ کس شکل صورت اور وضع قلم کے ہوں گے، ان کی لکھائی کیسی ہوگی۔ کوئی کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں



گزری جس میں ان باتوں کا اندراج ہو۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگلے وقتوں میں نو گرائی کا رواج نہ تھا۔ لیکن (جدید) آج کے دور میں جدید ترین سہولتیں میسر ہونے کے باوجود اور بے شمار کتابوں کے دھڑا دھڑ شائع ہونے کے باوصف شاعروں اور نثر نگاروں کو سلطانہ مہر والے مخصوص فارمیٹ میں منظر عام پر نہیں لایا گیا ہے۔

سلطانہ مہر کی کتابیں اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ ان کا مطالعہ کرتے وقت لوگوں کی تحریری کاوشوں کے ساتھ ساتھ ان کی شکل و صورت اور ذاتی پس منظر سے کسی حد تک آگاہی ہو جاتی ہے۔ میری نظر سے اردو تذکرہ نگاری میں ابھی تک ایسی کوئی مثال نہیں گزری ہے۔ گو چند احباب نے ان کے نقش قدم پر چل کر ”سنخور“ اور ”گفتنی“ کے حوالے دے کر بھی اس کام آگے بڑھایا ہے جیسے محترم عاشور کاظمی نے ”بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں“ کے عنوان سے نثر نگاروں کے تذکرے مرتب کیے ہیں۔

سلطانہ مہر نے ”سنخور حصہ پنجم“ کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے تذکرہ نگاری کے سلسلے میں آٹھ کتابیں لکھ کر اپنے حصے کا چراغ روشن کر دیا ہے اور اب وہ تخلیقی کاموں پر توجہ دینا چاہتی ہیں۔ وہ افسانے لکھنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ پی ایچ ڈی کریں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے مقاصد میں کامیاب کرے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کے گلشن میں جو پودے لگائے ہیں وہ مستقبل میں یقیناً تناور درخت کا روپ دھاریں گے اور اردو ادب کے شیدائیوں پر گھنٹی ٹھنڈی چھاؤں چھترائیں گے۔

سلطانہ مہر زندہ باد

Mr. Javed Akhtar Choudhry,

2 Birchtrees Croft, Birmingham, B26 1EF UK.

مجتبیٰ حسین

دہلی، ہندوستان

## تذکرہ سلطانہ مہر کا بحوالہ گفتنی حصہ اول

سلطانہ مہر بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، صحافی ہونے کے علاوہ ایک معتبر اور مستند تذکرہ نگار بھی ہیں، گویا فائیو ان ون (Five in One) قسم کی چیز ہیں۔ باسٹھ (۶۲) برس پہلے ہندوستان کے شہر ممبئی میں پیدا ہوئیں۔ شادی کے بعد پاکستان چلی گئیں، جہاں کئی برسوں تک ادبی، صحافتی اور سماجی میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد امریکہ منتقل ہو گئیں۔ پچھلے دس بارہ برسوں سے وہ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں رہتی ہیں۔ گویا اب ایک بین الاقوامی شہری بن چکی ہیں۔ اکثر ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کرنے کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک کا سفر کرتی رہتی ہیں۔ اگرچہ شعر بھی کہتی ہیں اور افسانے بھی لکھتی ہیں لیکن اب ان کی توجہ ”تذکرہ نگاری“ پر زیادہ تر ہو گئی ہے۔ اب تک ان کی سولہ (۱۶) تصانیف چھپ چکی ہیں، جن میں سے چھ (۶) تصانیف تذکرہ نگاری کے بارے میں ہیں۔ سلطانہ مہر ایک عرصہ تک روزنامہ ”انجام“ کراچی میں بحیثیت اسٹنٹ ایڈیٹر خواتین کا صفحہ مرتب کیا کرتی تھیں۔ بعد میں بارہ (۱۲) برسوں تک پاکستان کے سب سے بڑے اخبار ”جنگ“ میں خواتین کا صفحہ مرتب کرنے لگیں۔ ایک عرصہ تک اپنے ذاتی ماہنامے ”روپ“ کراچی کی مدیرہ اعلیٰ بھی رہ چکی ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ سلطانہ مہر بے حد محنتی، فعال اور کارکردہ خاتون ہیں اور



زندہ رہنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہنے کو ضروری سمجھتی ہیں۔

سلطانہ مہر کی کہانیاں اور شعر تو ہم عرصے سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں، ۱۹۷۱ء میں جب ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کا انتقال ہوا تو ہم نے پاکستان کے ایک رسالے میں جلیس صاحب کے بارے میں سلطانہ مہر کا ایک مضمون پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ابراہیم جلیس جب ۱۹۶۵ء میں ”انجام“ کے مدیر بنے تو سلطانہ مہر وہاں پہلے سے اسٹنٹ ایڈیٹر تھیں۔ بعد میں ”جنگ“ میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ سلطانہ مہر نے جس عقیدت اور خلوص کے ساتھ اپنے مضمون میں ابراہیم جلیس کا ذکر کیا تھا وہ ہمارے دل میں نقش ہو گیا۔ دس بارہ برس پہلے وہ دہلی آئیں تو انہوں نے افسانہ نگار انور نہایت کی معرفت ہم سے رابطہ پیدا کیا۔ سچ پوچھیے تو ان سے ملنے کا ہمیں بھی بڑا اشتیاق تھا۔ اس وقت تک وہ ”تذکرہ نگاری“ کے میدان میں قدم جما چکی تھیں اور شعرا کے بارے میں ان کا پہلا تذکرہ ”سنخور، حصہ اول“ شائع ہو چکا تھا۔ پہلی ملاقات میں اندازہ ہو گیا کہ صحافی ہونے کے ناطے سلطانہ مہر نہایت منظم، کارکرد اور فعال خاتون ہیں۔ ان کی ڈائری میں ہندوستان کے کئی ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کے پتے درج تھے جن سے وہ ملنے کی مشتاق تھیں۔ اس کے بعد سے جب بھی وہ دہلی آئیں ان سے ملاقات ضرور ہوئی (چاہے مختصر ہی کیوں نہ ہو)۔ پچھلے سال ہم اس اجلاس گئے تو یہ وہاں موجود نہیں تھیں، پاکستان اور ہندوستان کے دورے پر نکلی ہوئی تھیں۔ ”کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے“ والی کیفیت تھی۔ میر تقی میر کی ”نکات الشعراء“ سے لے کر سلطانہ مہر کی ”سنخور حصہ اول تا چہارم“ اور ”گفتنی حصہ اول“ تک اردو میں تذکرہ نگاری سے متعلق تصانیف کی کمی نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میدان میں کوئی قابل لحاظ اور معتبر خاتون تذکرہ نگار نظر نہیں آتی۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کی بعض خاتون اساتذہ نے طلبہ کی سہولت کے لئے ایسے مشاہیر کے تذکرے ضرور لکھے ہیں جو اب بقید حیات نہیں اور جن کے تذکروں کی ایک تدوین کی اہمیت ہے۔ سلطانہ مہر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے بقید حیات اردو شاعروں اور ادیبوں کے حالات زندگی اکٹھا کیے ہیں۔ واضح ہو کہ تذکرہ نگاری کے سلسلے میں ہمارے بیشتر تذکرہ نگاروں کا زور مرحومین کے حالات زندگی کو اکٹھا کرنے پر رہا ہے گویا گڑے مردوں کو اکھاڑنے کا کام کرتے رہے ہیں (اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ سلطانہ مہر نے زندہ کو گاڑنے کا کام کیا ہے)۔ ہمارے ہاں اس طرح کے کام آنے والے مورخ اور محقق کے بھروسے پر چھوڑے جاتے ہیں۔ بے شک ایک زمانے میں اردو میں ”آنے والا مورخ“ آیا بھی کرتا تھا لیکن اب اس کا آنا بھی مشکوک سا ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی شاعر یا ادیب کے گزر جانے کے سو دو سو برس بعد کوئی مورخ آتا ہے اور اس فن کار کی صحیح تاریخ پیدائش کو معلوم کرنے کا بیڑہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں بعض اسکالروں کو اسی بات پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی مل جاتی ہیں۔ آنے والے مورخ کے انتظار میں نہ جانے کتنے فن کار اپنے مخطوطات کو طبع کرائے بغیر اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اردو اکیڈمیاں بن گئی ہیں جن کی وجہ سے کئی ناقابل اشاعت کتابوں کی اشاعت کا



بندوبست ہو گیا ہے۔ لوگ آنے والے مورخ کا انتظار کیے بغیر اب ادب کے ”ادبی خانہ“ کو اپنی مطبوعات سے لبالب بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو تذکرہ نگاری بڑا مشکل کام ہے۔ یوں بھی اردو کے بیشتر ادیبوں کی ”حالت زندگی“ کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس میں ”حالات زندگی“ کے بہتر ہونے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ”حالات زندگی“ کو جمع کرنا دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ اردو کے مشہور محقق آنجہانی مالک رام ہمارے کرم فرما تھے۔ تذکرہ نگاری سے انہیں خصوصی دل چسپی تھی اور ”تذکرہ معاصرین“ کے عنوان سے کتابیں مرتب کر کے چھپواتے رہتے تھے۔ انہوں نے حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہمیں ازراہ کرم ”بنیادی ماخذ“ کی حیثیت عطا کر رکھی تھی۔ چنانچہ حیدرآباد میں جب کسی ادیب یا شاعر کا انتقال ہوتا تو فوراً ان کا فون ہمارے پاس آ جاتا تھا کہ میاں ذرا ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالو۔ یقین مانئے جب بھی ان کا فون ہمارے پاس آتا تھا تو اچانک دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی کہ پتا نہیں اب کس حیدرآبادی دوست کی باری آئی ہے۔ ہم نے ایک بار اس بات کا ذکر ان سے کیا تو بعد میں جب بھی ہمیں فون کرتے تو حفظ ماتقدم یہ کہہ دیتے کہ اس فون کا ”وفات“ یا ”تذکرہ معاصرین“ سے کوئی تعلق نہیں ہے تاکہ ہماری صحت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ آنجہانی مالک رام کی اس لگن کو دیکھتے ہوئے ہم نے بھی حفظ ماتقدم کئی حیدرآبادی احباب کے حالات زندگی ان کے جیتے جی پہلے ہی سے اکٹھا کر کے رکھ لیے تھے کہ جوں ہی وہ مریں ان کے حالات مالک رام صاحب کے حوالے کر دیں۔ گویا ایک زمانے میں ہم بھی سلطانہ مہر کی طرح، چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، زندوں کے حالات زندگی جمع کرتے رہے ہیں مگر قبل اس کے کہ ہم ان حالات کو مالک رام کے حوالے کرتے وہ خود ”تذکرہ معاصرین“ کا حصہ بن گئے۔

ہمارا خیال ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کے صحیح حالات کو اکٹھا کرنا ایک درد سر ہے کیوں کہ بعض ادیب اور شاعر اپنے حالات بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ ”ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ“ والا معاملہ ہوتا ہے۔ بعض ادیب جنہیں اپنی کم مائیگی اور اپنی اصلیت کا صحیح ادراک ہوتا ہے وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تذکرہ نگاروں سے تعاون نہیں کرتے۔ ہمارا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں تذکرہ نگار کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ادیب کا تعاقب کرے اور سلطانہ مہر تعاقب کرنے کا گڑ بھی خوب جانتی ہیں۔ انہوں نے پہلے ہمیں ایک طویل سوال نامہ روانہ کیا۔ پھر دو مرتبہ یاد دہانی کرائی۔ اس کے بعد بھی ہم ٹس سے مس نہیں ہوئے تو انہوں نے ہمارے دوست حسن چشتی کے ذریعے ہی سے سوال نامہ اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا کہ ہم اس کے جوابات فوراً روانہ کر دیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد ہمیں حکم کی تعمیل کرنی ہی پڑی۔ تعاقب کرنے پر ایک لطیفہ یاد آ گیا تو اسے بھی سن لیں۔ ایک اسٹینوگرافر ایک دن دیر سے دفتر پہنچی تو اس کے باس (Boss) نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ اس پر اسٹینوگرافر نے کہا: ”سر! میں کیا کر سکتی ہوں، جو نو جوان آج میرا تعاقب کر رہا تھا وہ نہایت ست رفتار تھا۔“



”گفتنی حصہ اول“ میں اردو کے ایک سو (۱۰۰) ایسے نثر نگاروں کے حالات موجود ہیں جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں جمع کرنے میں سلطانہ مہر کو جو تک و دو کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ ادیبوں کو جو سوال نامہ روانہ کیا گیا تھا ان کے جوابات کی روشنی میں جہاں کسی ادیب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں وہیں اس کے نظریہ فن کا پتا بھی چل جاتا ہے۔ یہ ایک مسبووط تذکرہ ہے جو چھ سو پچیس (۶۲۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ ادیبوں کے تذکروں کے نیچے ان کے پتے بھی درج کیئے گئے ہیں، جن کی مدد سے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ادیب ایک دوسرے سے ربط پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ سلطانہ مہر نے نثر نگاروں کے تذکرے کی اشاعت کو ضروری جانا ورنہ ہمارے ہاں بیشتر تذکرے صرف شاعروں سے متعلق ہوتے ہیں اور نثر نگاروں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اگرچہ کہ اس تذکرے میں بعض اہم نام شامل نہیں ہیں لیکن ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو ”گفتنی حصہ دوم“ بھی تو ہونی ہے۔ ”گفتنی حصہ اول“ میں شامل بعض اہم نثر نگاروں کے نام یہ ہیں:

قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر شان الحق حقی، جوگندر پال، رالف رسل، لطف اللہ خان، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، ڈاکٹر خیر النساء مہدی، رضیہ فصیح احمد وغیرہ۔

حیدر آباد میں مقیم جن نثر نگاروں کا تذکرہ اس کتاب میں شامل ہے ان کے نام یہ ہیں:

جیلانی بانو، رفیعہ منظور الامین، سیدہ جعفر اور منظور الامین۔ دکن کے ممتاز اور مایہ ناز افسانہ نگار اقبال مسین کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے (۱)۔

آخر میں سلطانہ مہر کے بارے میں ایک بات اور بتادیں کہ ان کی مادری زبان گجراتی ہے لیکن ان کا عملی اور بنیادی سروکار اردو سے ہے۔ سلطانہ مہر قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ کیلیفورنیا کی ممتاز سماجی اور ادبی شخصیت سید محمد حسن بھی لائق تحسین ہیں جنہوں نے اس کتاب یعنی گفتنی حصہ اول کی اشاعت میں عملی تعاون کیا۔ سلطانہ مہر کا پتا ذیل ہے (۲)۔

Mrs. Sultana Meher,

20873 East Walnut Cannon Road, Walnut, CA 91789, USA

۱۔ ”گفتنی حصہ دوم“ میں الحمد للہ ان کا تذکرہ موجود ہے۔

۲۔ اب میرا قیام برطانیہ کے شہر برمنگھم میں بھی ہے اور پتہ ذیل ہے

2 Birchtrees Croft, South Yardley, Birmingham, B26 1 EF, UK.

(Sultana Meher)



اکرام بریلوی

مس سی ساگا، انٹاریو، کنیڈا

## ہمہ جو وہمہ جہت شخصیت

میں آپ حضرات کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا اگرچہ حکایت لذیذ اور دراز تر گفتن کا بھرپور امکان رکھتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ بڑا جواز رکھتی ہے کہ دوسروں کی سننا بڑا صبر آزما کام ہے۔ چنانچہ سلطانہ مہر کے کارناموں اور ادبی کاموں کا ذکر کرتے ہوئے میں اختصار سے کام لوں گا۔

سو بات کچھ اس طرح سے ہے کہ سلطانہ مہر کو جو نیوکلیئر انرجی (nuclear energy) جوہری توانائی) اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اُسے وہ تعمیری اور مثبت مشاغل میں صرف کر رہی ہیں۔ خدا نخواستہ اگر آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں تو ”گفتنی حصہ اول“ کے آخر میں شامل ابراہیم جلیس مرحوم کا مرقوم تعارف پڑھنے کی زحمت گوارا کر کے خود فیصلہ کر لیں۔ اس سے قطع نظر، پہلے میرے حوالے سے ایک دو باتیں سماعت فرمائیں۔

سلطانہ مہر کو خاندان کے بڑوں کا دنیا ہوا نام ”فاطمہ“ ہے۔ اُن کی مادری بولی ”میمن گجراتی“ ہے۔ اور پڑھنے لکھنے کی زبان اردو۔ اُن کا تعلق میمن فرقے سے ہے اور وہ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی پیدائش کا سال میں ہرگز نہیں بھول سکتا کہ یہ میرے ادبی سفر کا آغاز کا سال ہے۔ ۱۹۵۳ء میں اُن کا پہلا افسانہ روزنامہ ”انقلاب ممبئی“ میں شائع ہوا جس کے چار سال بعد میرا دوسرا ناول ”گردش“



اشاعت پزیر ہوا۔ اس سے مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ سلطانہ مہر ۱۹۵۳ء سے سرگرم سفر ہیں۔

اس سفر میں انہوں نے کیا کچھ ”حوالے“ کا کام کیا ہے اور کتنا کچھ ”تخلیقی“ کام سرانجام دیا ہے اس کی تفصیل کے لئے تو بڑا وقت چاہیئے۔ ”حوالے“ کے کاموں کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی و شافی ہے کہ یہ ایک شخص کے بس کا کام نہیں۔ ایسے کام تو انجمن ترقی اردو بورڈ، قومی ادبیات، مقتدرہ یا دوسرے ادبی اور سماجی اداروں کو سزاوار ہے۔ مگر ان اداروں کو اتنی فرصت و مہلت کہاں! چنانچہ سلطانہ مہر اس کام کو بڑی تندہی سے تنہا انجام دے رہی ہیں۔ وہ یہ سب کام اپنے ذاتی وسائل سے کر رہی ہیں۔ یہ کام سرمائے کے علاوہ انتھک محنت بھی چاہتا ہے اور غیر معمولی لگن کے ساتھ قوت ارادی بھی۔ سو یہ کام وہ بڑی خاموشی اور خوش اسلوبی سے کرتی رہی ہیں کہ وہ جوہری توانائی سے مالا مال ہیں اور صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہیں۔ یہ میرا خالی خولی دعویٰ نہیں۔ ”آج کی شاعرات“، ”اقبال دور جدید کی آواز“، ”سخنور حصص اول (حصہ اول کی تین طباعتیں)، دوم، سوم اور چہارم“، ”گفتنی حصہ اول“ اور ”ساحر کافن اور شخصیت“ اس کا بین ثبوت ہیں۔

میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بیسویں صدی میں تذکرہ نگاری کا باقاعدہ اور باضابطہ آغاز سلطانہ مہر ہی نے کیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ جس طرح میر نے ”نکات الشعراء“ میں اپنے معاصر و پیش رو شعرا پر تنقیدی اشارے دے کر تذکرے میں تنقیدی روایت کی بنیاد ڈالی، بالکل اسی طرح سلطانہ مہر نے ”سخنور“ اور ”گفتنی“ میں تنقیدی حاشیوں سے اپنے تذکروں کو حوالے کے کام سے آگے بڑھا کر ان کے سرے تنقید سے جوڑ دیئے ہیں اور یہ بلاشبہ ان کی تخلیقی نفس (creativity) کا برملا ثبوت ہیں۔ بات کو سمیٹتے ہوئے آخر میں اتنا کہوں گا کہ سلطانہ مہر ”ہمہ جو وہمہ جہت“ شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ بیک وقت صحافی، شاعر، ناول نویس، سوانح و سیر نگار اور مقبول و معروف افسانہ طراز ہیں۔ ”رو میں ہے رخس عمر...“ اللہ ان کا حوصلہ اور ہمت بلند رکھے اور وہ تادیر اسی تیز رفتاری سے لکھتی رہیں۔ آمین!

میں انہیں ان کے کارہائے نمایاں پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور آپ حضرات سے درخواست گزار ہوں کہ آپ تالیفوں کی گونج میں ان کی پزیرائی اور حوصلہ افزائی فرمائیں اور زور دے کر کہیں کہ اس طرح ادبی کام کیئے جاتے ہیں۔ شکریہ!

۲۲ / اپریل ۲۰۰۲ء

مس سی ساگا، انٹاریو، کینیڈا

Mr. Ikram Brelvi,

5700 Prairee Circle, Mississauga, Ont., L5N 6B6, Canada

نوٹ: یہ مضمون ۱۷ / اگست ۲۰۰۲ء بروز شنبہ جناب شاہد ہاشمی صدر کین پاک چیئرمین کی جانب سے دی ہوئی تقریب میں پڑھا گیا۔ اس تقریب میں محترمہ ادا جعفری، سلطانہ مہر، نسیم سید، نرہت صدیقی، بشکیلہ رفیق، عابدہ کرامت اور درخشان صدیقی کو ادبی خدمات انجام دینے کے سلسلے میں لائف اچیومنٹ ایوارڈ (Life Achievement Award) دیئے گئے۔



## مختار زمن

کراچی، پاکستان

## سلطانہ مہراوران کی دو تازہ تخلیقات

برسوں گزرے ایک دفعہ کراچی یونین آف جرنلسٹز نے ہڑتال کی۔ میں یونین کا عہدہ دار تو نہیں تھا، محض معمولی رکن تھا، لیکن یونین کے خصوصی بلاوے پر اس کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کر لیا کرتا تھا اس لئے کہ ہڑتال کا مسئلہ پیش تھا۔ کمیٹی نے طے کیا کہ ہم چند اراکین اخباروں کے دفتر میں جا کر کارکن صحافیوں سے ذاتی طور پر ملیں اور فردا فردا تعاون کی درخواست کریں۔ چنانچہ ہم ایک روز نامے کے دفتر پہنچے اور صحافیوں سے ملے۔ میں نے دیکھا کہ دفتر کے کونے میں ایک صاحب سیاہ زمین پر چھپے ہوئے گہرے سرخ پھولوں والے کپڑے کی شلواری قمیض پہنے، چشمہ لگائے، بے حد سنجیدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ مردوں سے بھرے دفتر میں واحد خاتون نظر آئیں۔ ہم نے ان سے بھی درخواست کی کہ آپ بھی ہڑتال میں حصہ لیں۔ ہمیں خیال تھا کہ شاید وہ بہت لیت و لعل سے کام لیں۔ شاید کہیں... میں عورت ذات ان چکروں میں نہیں پڑتی۔ لیکن انہوں نے فوراً تعاون کی ہامی بھر لی۔ ہمیں خوش گوار حیرت ہوئی۔ معلوم ہوا ان کا نام سلطانہ مہر ہے۔ وہ ان دنوں خواتین کے صفحے کی انچارج تھیں اور میں انہیں ایک عرصے تک خواتین کے صفحے کا انچارج ہی سمجھتا رہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بنیادی طور پر وہ ایک نہایت کامیاب ادیبہ ہیں اور ان کے قلم کے ادب پاروں اور افسانوں کا آبشار رواں ہونے والا ہے۔



وقت گزرتا رہا۔ اور پھر ایک زمانے میں خاکسار کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں ایم اے کی کلاس کو پڑھانے لگا یا پڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ چشمہ لگائے، بے حد سنجیدہ صورت بنائے، کلاس میں پیچھے کی سیٹ پر سلطانہ مہر بھی بیٹھی ہیں۔ میں نے کہا: ”آپ؟“  
بولیں: ”جی میں! صحافت میں ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔“

ارادوں کو عملی جامہ پہنانا ان کی عادت ہے۔ انہوں نے صحافت میں ایم اے کیا، اخباروں میں ملازمت کی، اپنا رسالہ ”روپ“ جاری کیا، بچے پال پوس کر بڑے کیئے، ان کی شادیاں کیں لیکن ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ تقریباً درجن بھر کتابیں بھی تصنیف و تالیف کر ڈالیں۔ میں سلطانہ مہر کی بہت قدر کرتا ہوں اس لئے کہ وہ بہت مخنتی، بردبار، سمجھ دار، ارادے کی پختہ، ادب پرست اور فعال شخصیت ہیں۔ اخبار نویس کے دوران ان پر کڑے وقت آئے مگر وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتی رہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ ہماری اکثر خواتین کتنی باصلاحیت ہیں اور جو انہیں کم تر سمجھتے ہیں جھک مارتے ہیں۔

سلطانہ مہر جن کا اصلی نام فاطمہ ہے ممبئی کی مہمن برادری سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی مادری زبان گجراتی ہے لیکن وہ اردو اس طرح بولتی ہیں اور لکھتی ہیں جیسے یہ ہی ان کی گھنٹی میں پلائی گئی تھی۔ یہ گجرات والے بھی غضب کے لوگ ہیں۔ پہلے انہوں نے ولی کو پیدا کیا۔ ولی نے اردو غزل کو آبرو بخشی۔ اردو پھیلتی رہی اور ہم نے اپنے دور میں اسی کراچی میں قاضی اختر میاں جو ناگدھی کو دیکھا۔ ایسے جید عالم کم نظر آتے ہیں۔ شاید سلطانہ مہر بھی اردو دان اور اردو پرستی کی اسی عظیم روایت کا حصہ ہیں۔

سلطانہ مہر افسانہ نگار ہیں۔ مگر وہ صرف افسانہ نگار نہیں ہیں، عجب طرفہ طبیعت لے کر آئیں ہیں کہ اخبار نویس کرتے کرتے، افسانہ لکھ ڈالا، افسانہ نویس کرتے کرتے ناول نگاری کا ڈول ڈالا۔ ناول تصنیف ہو رہے تھے کہ منہ کا مزاج بدلنے کو جی چاہا اور شاعرات کا تذکرہ لکھنا شروع کر دیا۔ شعر و سخن کا ذکر ہوا اور اقبال کا ذکر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ اقبال پر خامہ فرسائی ہونے لگی۔ پھر شعرا کا تذکرہ لکھنے بیٹھ گئیں۔ اور اس دوران ایک نیم ادبی، نیم سماجی رسالہ بھی جاری کر دیا۔ بعض وقت شبہ ہوتا ہے کہ شعر بھی ضرور کہتی ہوں گی مگر کبھی سنائے نہیں، ورنہ یہ تخلص نما ”مہر“ کا لاحقہ کیا معنی؟ کیا یہ صرف ادب سے مہر و محبت کا ہی قصہ ہے؟۔ ناول نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔

اس وقت میرے پاس ان کی دو تازہ ترین تصنیفات ہیں: ”دل کی آبروریزی“، و افسانوں کا مجموعہ ہے اور ”ساحر کا فن اور شخصیت“۔ عادت کے مطابق قلم بہ یک وقت دو راستوں پر چل رہا ہے۔ ایک طرف ان کا تخیل کہانی کا تانا بانا بٹنارہتا ہے اور دوسری طرف تحقیق کا شوق اور واقعات ادب کی تسبیح کے دانے پر و تارہتا ہے۔

”دل کی آبروریزی“ عام ڈگر سے ہٹ کر ذرا انوکھا عنوان ہے۔ پیش لفظ میں انہوں نے اسی عنوان کی وجہ تخلیق کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہانی سے پہلے وہ ضرور پڑھ لیجئے گا۔ ادب اگر واقعی زندگی کا آئینہ ہے تو سلطانہ مہر یہ آئینہ دکھانا خوب جانتی ہیں۔ وہ کراچی میں رہتی ہیں۔ کراچی جو کبھی روشنیوں کا



شہر تھا، عجیب مزاج کا شہر ہے۔ اس کے بازو سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر زبان، ہر کچھڑ، ہر قسم کے آدمی موجود ہیں۔ یہ رت جگہوں کا شہر تھا، رات کو بھی سوتا نہ تھا۔ لیکن پھر کسی کی ایسی نظر لگی کہ قتل، خون، آگ، اغوا، موت اور خوف کے گہرے سائے پڑنے لگے۔ سلطانہ کے اکثر افسانے انہیں مسائل کے گرد گھومتے ہیں۔ اس شہر میں ایک نہیں کئی واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ درندوں نے معصوم خواتین کو اغوا کر کے بھیانک انجام کو پہنچا دیا۔ دل کی آبروریزی بھی اسی قسم کا موضوع ہے۔ سلطانہ ایک دردمند دل کی مالک ہیں۔ غربت، استحضال، نا انصافی، دھاندلی سے جب ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو ان کے قلم سے خون کے آنسوؤں کا سیلاب نکل کر کاغذ پر پھیل جاتا ہے۔ لوگ اُسے کہانی کہتے ہیں۔ غریب مزدور نے اپنے بچپن میں عید کے نئے جوڑے کی خواہش کی تھی۔ وہ پوری نہیں ہوئی۔ بالکل یہ ہی خواہش اس کے بچے نے کی۔ اسی کو پورا کرنے کے لئے جب وہ گارے کا تغار لے کر سیڑھی پر چڑھ رہا تھا کہ سیڑھی ٹوٹ گئی۔ جب نئے کپڑے کے کفن میں اس کی لاش لائی گئی تو اس کے معصوم بچے نے کہا: "اماں! ابا تو مر گئے۔ انہیں کپڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ اسے اتار لو۔ ابا کے سفید کپڑوں سے میرا عید کا جوڑا بن جائے گا۔" ماں نے بچے کے زور سے تھپڑ کھینچ مارا اور بچے کو سینے سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ لیکن غربت کی پوری داستان، نفسیات کے تمام نکات اس ایک فقرے میں پورے ہو گئے۔

سلطانہ کے افسانوں میں ابہام نہیں، ابلاغ ہی ابلاغ ہے۔ میں زیادہ مثالیں دے کر اس مختصر مضمون کو طویل نہیں دینا چاہتا۔ یہ 'مشتے نمونہ از فردا رے تھا'۔ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیں۔ اخبار نویس روزانہ کے واقعات کو قلم بند کرتا ہے۔ مورخ ان کی چھان پھٹک کر کے اہم معاملات کے بیان اور ان کے پس منظر و پیش منظر سے بحث کرتا ہے لیکن ادیب؟... ادیب کا قلم بے جان، بے حس کاغذ پر چھپے ہوئے لفظوں میں جان ڈال کر حساس دلوں اور ذہنوں کو چونکا دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ قلم مہر کی گرفت میں ہے۔

افسانوں کے علاوہ مہر نے جو تذکرے لکھے ہیں وہ مفصل نہ سہی آنے والے محققین کے لئے کافی مواد فراہم کرتے ہیں۔ "ساحر کافن اور شخصیت" اس لئے اہم ہے کہ انہوں نے ساحر کے متعلق ایسے خواتین و حضرات کے مضامین، انٹرویو اور آراء ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں جو ساحر جیسے اہم شاعر کو ذاتی طور پر اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کتاب کے صفحات پر ساحر لدھیانوی مرحوم زندہ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، سگرٹ کا دھواں اڑاتے، قہقہے لگاتے اور کبھی شعر سناتے نظر آتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ امرتا پریم ساحر کی مسکورتین دوست بھی ہیں اور مشہور ترین بھی۔ سلطانہ مہر ان سے ملیں۔ انہیں کے ذکر سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ ان کا مضمون بھی اس میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ ترقی پسند مصنفین میں سے ساحر کے اکثر دوستوں اور چاہنے والوں کے مضامین اس میں شامل ہیں۔ تقریباً سب ہی مضامین دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں۔ واجدہ تبسم کا مضمون بڑا دلکش معلوم ہوا۔ بہت سے مضامین تاثراتی اور تعریفی ہیں مگر کتاب محض قصیدہ بخصور حضرت ساحر لدھیانوی نہیں ہے بلکہ نڈا فاضلی کے مضمون میں



ساحر کے فن پر ناقدانہ پہلوؤں سے نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ سب مضامین بڑے بڑے اہل قلم حضرات نے لکھے ہیں مثلاً خواجہ احمد عباس، سعید رضا سعید، کشمیری لال ذاکر، نریش کمار شاد، علی سردار جعفری، قمر اجنالوی، یوسف کاظم، ظ۔ انصاری، ابراہیم جلیس، ڈاکٹر معصوم رضا راسی وغیرہ۔ لیکن ساحر کی جو دلکش اور اپنائیت سے بھرپور تصویریں ساحر کی بہنوں انور اور سرور نے کھینچی ہیں وہ سلطان مہر کی تیار کردہ الجہم کی خاص زینت ہیں۔

میں ساحر لدھیانوی سے کبھی نہیں ملا۔ صرف ان کے اشعار پڑھے ہیں۔ لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ اُس مرحوم کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں، لمبے قد، اونچی ناک والا شاعر میری آنکھوں کے سامنے چل پھر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد آپ کو بھی یہی محسوس ہوگا اور یہی کتاب کی کامیابی ہے۔

Mr. Mukhtar Zaman,

1/2, Nazimabad, Karachi, Pakistan

نوٹ: مجھے یاد ہے کہ مختار زمن صاحب نے یہ مضمون مجھے اپریل ۱۹۹۱ء کو میری امریکہ کی روانگی سے قبل گھر آ کر مجھے عنایت کیا تھا۔ مجھے مشورہ بھی دیا تھا کہ میں امریکہ جا کر قلم سے رابطہ برقرار رکھوں۔ وہ میرے استاد تھے اور ہم عصر ادیب بھی۔ ان کا تعارف ”گفتنی حصہ اول“ کے ص ۵۲۸ پر موجود ہے۔ ان سے آخری ملاقات ۲۰۰۰ء میں محترم لطف اللہ خان صاحب کے گھر ”سلسلہ“ کی ایک دعوت میں ہوئی تھی۔ اور بس پھر خبر ملی کہ وہ ایک دن دنیا سے منہ موڑ گئے۔ ان کو جانا تھا مگر ان کی شگفتہ یادیں منہ نہیں موڑ سکتیں۔ یہ مضمون بھی ان کی ایک یادگار ہے جو اب ”گفتنی حصہ دوم“ میں محفوظ ہے۔ سلطانہ مہر



بشری رحمن

لاہور، پاکستان

## گفتنی حصہ اول ..... ایک دل چسپ دستاویز

دنیا میں وہ لوگ ایک جگہ بیٹھے کوئی خوب صورت کام کر رہے ہوتے ہیں، زمانہ کتنی ہی کروٹیں لے، انقلابات آئیں یا نہ آئیں، ایسے لوگ ہر زمین اور ہر زبان میں مل جاتے ہیں۔ ان کی کارکردگی دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناحق شور مچانے والے اور مایوسی کی بساط بچھانے والے خود نا اہل ہوتے ہیں۔ ایک عرصے سے ہمارے بعض دانشوروں کو افسانہ سرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ناول بے جان ہو چکا ہے اور شاعری تھڑوں پر جا بیٹھی ہے۔ یعنی ان کے خیال ہے کہ شاعری اور نثری ادب میں کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ ابھی ابھی اس منکیم (millennium ہزار سالہ / الف سنین) کی دو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ایک تو سلطانہ مہر کی تصنیف ”گفتنی، حصہ اول“ ہے۔ نمبر ۱۱ میں پہلے سلطانہ مہر کا آپ سے تعارف کرا دوں۔ سلطانہ مہر افسانہ نگار، صحافی اور شاعرہ ہیں۔ کچھ عرصے پہلے کراچی سے ایک دیدہ زیب ماہنامہ ”روپ“ نکالتی تھیں۔ آج کل اس انجیلس میں مقیم ہیں۔ اس وقت ان کا شمار تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے وطن سے دور بیٹھ کر اہل قلم کے لئے وہ کام کیا ہے کہ آنے والی صدی بھی شکر گزار رہے گی۔ اپنی بات کرنا، اپنے آپ کو منوانا اور اپنے آپ بارے میں لکھوانا بہت نوٹ: یہ مضمون نوائے وقت، لاہور، ۲۳ / فروری ۲۰۰۱ء کو چادر چادر داری اور چاندنی کے مستقل کالم کے تحت چھپا تھا



آسان ہے لیکن دنیا بھر میں بکھرے ہوئے اردو زبان کے شاعروں اور ادیبوں کو کتابوں اور تذکروں میں بسا دینا کسی ظریف والے کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ پہلے انہوں نے اردو زبان کے شاعروں کے حالات زندگی اور کوائف اکٹھے کیے اور ”سنحور“ کے نام سے چار جلدیں ترتیب دیں۔ ضروری نہیں کہ وہ دنیا بھر میں بسنے والے تمام شاعروں اور شاعرات کے تذکرے سمیٹ سکی ہوں۔ چار جلدیں ترتیب دینا بھی بہت بڑا کام ہے اور ممکن ہے کہ وہ پانچویں جلد بھی ترتیب دے رہی ہوں۔ مگر حال ہی میں ان نئی کتاب ”گفتنی، حصہ اول“ منظر پر آئی ہے۔ اس میں نناوے (۹۹) اہل قلم خواتین و حضرات کے تذکرے شامل ہیں۔ اس تذکرے میں نقاد، محقق، ماہر لسانیات، افسانہ نگار، ناول نویس، ڈرامہ نگار، صحافی اور مزاح نگار بھی شامل ہیں۔ اس میں پاکستانی اور ہندوستانی نثر نگاروں کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، بنگلہ دیش، سعودی عرب، جرمنی، سویڈن، کینیڈا، ناروے، بحرین اور دیگر خطی ریاستوں کے اردو نثر نگار شامل ہیں۔ ان تذکروں کو انہوں نے دس نہایت اہم اور دلچسپ سوالوں سے سنوارا ہے، جو انہوں نے ہر ادیب کو بھیجے تھے اور ہر ادیب نے ان کا سیر حاصل جواب بھی دیا ہے مثلاً

۱۔ شاعری ہو یا نثر، معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں؟

۲۔ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ نہ عملی ترقی ہو رہی ہے نہ نظریاتی

۳۔ موجودہ صدی میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر ادیب اور شاعر نے اپنے اپنے نظریے کے مطابق ان سوالات کے تفصیلی جواب دیے ہیں، جس نے ”گفتنی“ کو بہت اہم، بہت دلچسپ دستاویز بنا دیا ہے۔ تذکرہ نگاری کوئی آسان کام نہیں۔ سلطانہ مہرچوں کہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، اس لئے انہوں نے ادیبوں کے تذکرے لکھنے میں اس فن کا سہارا لیا ہے۔ آپ ایک نشست میں اتنے تذکرے پڑھتے ہیں اور دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ مزید پڑھنے کا دل چاہتا ہے۔ ہر دانشور نے ان سوالات کے جوابات بھرپور انداز سے دیے ہیں۔ یہ جوابات بجائے خود ایک تحقیقی کتاب کی مانند ہیں۔ سلطانہ مہر پاکستان کی وہ واحد خاتون ہیں جو تذکرہ نگاروں کی صف اول میں جا بیٹھی ہیں۔ اور امریکہ میں رہتے ہوئے برابر اردو کی خدمت کر رہی ہیں۔



انور خواجہ  
لاس اینجلس، امریکہ

## سلطانہ مہر..... ایک پورا ادارہ

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں  
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ سلطانہ مہر جیسی خاتون ہر عہد میں دو چار ہی پیدا ہوتی ہیں۔ سلطانوں نے ماضی میں عورتوں کو تعلیم سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ ایسی صورت حال میں سلطانہ کا طلوع ہونا ایک معجزہ ہے۔ سلطانہ کی طرح ایک دوسری خاتون کا نام میرے ذہن میں آتا ہے بیگم شائستہ اکرام اللہ جو ایک اعلیٰ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک سماجی کارکن بھی تھیں۔ لیکن دونوں خواتین کے حالات مختلف تھے۔ بیگم شائستہ کو اپنی منزل حاصل کرنے میں بہت آسانی ہوئی۔ گھر کا ماحول سازگار تھا اور پھر ایک سفیر سے ان کی شادی ہوئی اور ان کو دنیا کو دیکھنے کے جو موقع ملے اسے انہوں نے ان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس کے برعکس سلطانہ نے ایک اخبار نویس کی زندگی اختیار کی جن کے ڈانڈے غربت کے سنسار سے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی توانائی اور تخلیقی حسن سے افسانے، ناول، نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ اس طرح روزمرہ کے دوسرے مسائل کو بھی کامیابی سے سرانجام دیا۔ سلطانہ کی ادبی تخلیقات کا احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ لیکن آج ہم ان کی ایک بالکل مختلف قسم کی تصانیف کے افتتاح



کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے ہیں۔

اردو ادب میں تذکرہ نگاری کی تاریخ تقریباً دو سو (۲۰۰) سال پرانی ہے۔ کئی مشہور شاعروں، میر اور سودا نے اپنے اور دیگر شاعروں کے حالات لکھے لیکن تذکرہ نگاری کا شاہکار محمد حسین آزاد کا تذکرہ ”آب حیات“ ہے جو اپنے دلکش اسلوب اور زبان کی شیرینی کی وجہ سے آج بھی مقبول ہے۔ لیکن سلطانہ مہر نے اردو ادب میں ایک نئی طرز کی تذکرہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ ان کے سوالوں کے جواب میں شاعروں نے خود اپنے حالات، خیالات اور نظریات کو بیان کیے۔ انہوں نے دنیا کے کونے کونے سے شاعروں کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ ایک پورے ادارے کا کام تھا جو ایک اکیلی عورت نے سرانجام دیا۔ میں ان کو ان کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور بڑی کتاب ”گفتنی“ پیش کی جو اردو نثر نگاروں کا تذکرہ ہے۔ نثر کے بغیر کوئی زبان اور ادب مکمل نہیں ہو سکتا۔ نثر کے ذریعے ہی مذہب، فلسفہ اور سائنس کے علوم کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ سلطانہ مہر کو اس بات کا پوری طرح احساس ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں نثر نگاروں کے اس تذکرے میں شامل ہوں۔ میں ایک دفعہ پھر سلطانہ مہر کو اس عظیم کارنامہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔

انور خواجہ  
لاس اینجلس

نوٹ: یہ مضمون ۲/ فروری ۲۰۰۲ء کو لاس اینجلس میں ”سخنور، حصہ چہارم“، ”گفتنی، حصہ اول“ اور ”سخنور حصہ اول“ کی طباعت دوم کے اجراء کے موقع پر پڑھا گیا۔ سلطانہ مہر



تاج سعید

پشاور، پاکستان

## گفتنی... ایک یادگار ادبی کارنامہ

سلطانہ مہر شاعرہ ہے، افسانہ نگار ہے، صحافت سے بھی اس کا تعلق رہا ہے، وہ کئی مشہور اخبارات کے خواتین کے صفحات کی مدیرہ بھی رہ چکی ہے۔ ایک بہت ہی معیاری میگزین ”روپ“ کی ایڈیٹر رہی ہے اور اس کے جتنے شمارے بھی اس کی ادارت میں شائع ہوئے ہیں ان پر سلطانہ مہر کی صلاحیتوں کی چھاپ نمایاں تھی۔ آج کل وہ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں رہائش پزیر ہے۔ کبھی کبھار پاکستان کا چکر بھی لگاتی ہے کہ کراچی کے ساتھ اس کی بہت ساری یادیں وابستہ ہیں۔ کئی دوست، عزیز واقارب کی رہائش بھی یہیں ہے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی وہ فارغ نہیں بیٹھی، کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ وہاں سے کئی ادبی رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ لیکن سلطانہ مہر نے اب کسی رسالے کا جھنجھٹ نہیں پالا، بلکہ اب وہ ہر سال کسی نئے موضوع پر ایک کتاب مرتب کر کے شائع کر دیتی ہے۔ اور یوں اپنے آپ کو مصروف بھی رکھتی ہے اور ادبی حلقوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس نے ادب میں بڑا نام کمایا ہے۔ اس کے چار (۴) ناول، افسانوں کے چار (۴) مجموعے اور سات (۷) تالیفات اور ایک مجموعہ کلام، یعنی سولہ (۱۶) شائع شدہ کتابوں کی تعداد نظر عام پر آچکی ہے۔ اور ان کے موضوعات اتنے اہم ہیں کہ اسے ساری زندگی زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن وہ



جو کسی نے کہا ہے کہ آدمی میں لگن ہو تو اس کے لئے دنیا میں ہزاروں کام ہیں۔ پناہ منجھ مہر نے اب جس کام میں ہاتھ ڈالا ہے وہ ختم ہونے والا نہیں۔ اس نے پہلے ”آج کی شاعرات“ کا تذکرہ لکھا۔ بعد میں ”سخنور“ کے نام سے ساری دنیا میں بکھرے ہوئے شاعروں کی زندگی اور فن کے بارے میں تین کتابیں مرتب کیں۔ جب وہ ان سے فارغ ہوئی تو اب اس نے ”گفتنی“ کے نام سے نثر نگاروں کی زندگی اور ان کے فن کے بارے میں کتابیں مرتب کرنا شروع کر دیں ہیں۔ ”گفتنی“ کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ چھ صد (۶۰۰) صفحات کی اس کتاب میں ننانوے (۹۹) نثر نگاروں کا تذکرہ ہے، جسے سلطانہ مہر نے اپنی ہنرمندی اور ادبی تجربے کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ ادب اور صحافت میں اس نے اپنی شناخت اس فن کے ساتھ وابستہ دلچسپی اور محنت سے حاصل کی ہے۔ اور جب یہ شناخت کسی کو حاصل ہو جائے تو اس کی خوشی دیدنی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سلطانہ مہر خود بتاتی ہیں...

”ایک دن کا ذکر ہے میں جامع کلاتھ مارکٹ پر ٹھیلے سے امرود خریدتی ہوئی پکڑی گئی۔ وہاں ایک اور خاتون بھی امرود خرید رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتے ہوئے قریب آئیں اور پوچھا: ”آپ سلطانہ مہر ہیں؟“ جی میں نے سچ بولا۔ ان کا چہرہ بجھ گیا، کہنے لگیں: ”لو جی! ہم تو آپ کو دیکھنے کو ترستے ہیں اور آپ یہاں...“ وہ کسمکسا کے بولیں: ”ٹھیلے پر موجود ہیں۔“ کچھ دیر تو مجھے ان جانی سی شرمندگی ہوئی، کاش میں کسی نو یونایا مرسڈیز میں بیٹھی اپنے ڈرائیور یا ملازم سے امرود خریدوا رہی ہوتی۔ لیکن ایسا میں نے چوں کہ کبھی سوچا نہ تھا لہذا وہ ملال زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ ہاں بیک وقت خوشی بہت ہوئی۔ یہ مسرت اور سرشاری آج تک قائم ہے اور اس کی خوش بو میں ہر دم بسی رہتی ہوں اور جینے کا حوصلہ پاتی ہوں۔ ایک آرزو تھی کہ لوگ مجھے میری تحریروں سے شناخت کریں، میری کوئی ادبی حیثیت ہو اور جس طرح مجھے کبھی کرشن چندر یا ساحر لدھیانوی سے مل کر بے پناہ مسرت ہوتی تھی اسی طرح لوگ مجھ سے ملنے کو ایک واقعہ سمجھیں۔“ اور ٹھیلے پر کھڑی امرود خریدنے والی سلطانہ مہر کو وہ شناخت مل چکی تھی۔ سلطانہ مہر جس زمانے میں ”روپ“ کی ادارت کر رہی تھیں ہمارا تعلق بھی اسی زمانے سے اس کے ساتھ ہے۔ اس زمانے کی طرف جب میں نظر دوڑاتا ہوں تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ تیس برس کا عرصہ کس طرح سے گزر گیا۔ اس کے بعد سلطانہ مہر جہاں جہاں بھی رہیں اس کا یہ تعلق خاطر جاری رہا۔ کوئی دو برس پہلے اس کا کراچی سے فون آیا تھا کہ ”جریدہ“ کا احمد فراز نمبر درکار ہے۔ اتفاق سے یہ نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ یہ بتانے کے لئے میں نے کراچی دوبارہ فون کیا تو وہ گھر پر نہیں تھیں۔ امریکہ سے کوئی مہمان آجائے تو کراچی والے اس کے اعزاز میں تقریبات منعقد کرتے ہیں اور دعوتوں پر بھی بلاتے ہیں۔ گزشتہ جون میں جب میں کراچی گیا تو ایک دن ”سب رنگ“ کے ایڈیٹر شکیل عادل زاوہ کے دفتر کے فون کیا تو اس نے بتایا کہ میرے پاس سلطانہ مہر بیٹھی ہوئی ہیں، بات کر لیں۔ صاحب سلامت کے بعد اس نے بتایا کہ احمد فراز نمبر مل گیا تھا لیکن وہ مجھے اپنی نئی کتاب ”گفتنی“ دینا چاہتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ شکیل کے پاس کتاب رکھوا دیں، کتاب مجھ تک پہنچ جائے گی۔ پھر چند دنوں بعد پشاور



آگیا۔ یہاں سے تکیل کو جو خط لکھا اس میں اسے تاکید کی کی اگر ”گفتنی“ مل جائے تو مجھے ڈاک سے بھجوا دے۔ لیکن کتاب نہ آئی اور میں بھول بھال گیا۔

ابھی چند دن ہوئے پروفیسر محسن احسان صاحب کا فون آیا کہ سلطانہ مہر کی کتاب کراچی سے کوئی لے کر آیا تھا، ان کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اب خود ہی اندازہ لگائیے کہ سلطانہ مہر نے اپنی کتاب بھجوانے کے لئے کیسا ذریعہ تلاش کیا۔ یہ سب اس کی محبت اور اس کے خلوص کا کرشمہ ہے جو وہ اپنے ادیب اور شاعر دوستوں کے ساتھ روا رکھتی ہے، اور انہیں نہ صرف یاد رکھتی ہے بلکہ ان کا شمار اپنے قریب ترین احباب میں کر کے خوشی محسوس کرتی ہے۔ سلطانہ مہر کی کاریگری اگر دیکھنی ہو تو ”گفتنی“ کا مطالعہ کیجئے۔ آپ حیران ہوں گے کہ کس طرح سے اس نے ننانوے (۹۹) نثر نگاروں کے حالات زندگی، ان کی ادبی سرگرمیوں اور ان کے افکار و خیالات تک رسائی حاصل کی ہے۔ یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ آج کے زمانے میں تو لوگ کسی کے خط کا جواب تک نہیں دیتے، پھر کس طرح اس نے اپنا سوال نامہ ان ننانوے (۹۹) لوگوں تک پہنچایا۔ جن سے بالمشافہ مل سکنے کی امید تھی، ان کے پاس خود چل کر گئی اور جن تک پہنچ نہیں سکتی تھی ان کو خط کے ذریعے مخاطب کر کے اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کیا۔ یہ سارا کام اس نے کراچی کے اخبارات کے زمانے میں ہی سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ ابراہیم جلیس مرحوم نے اس کے بارے میں لکھا ہے: ”ایک بار کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر کوئی خاتون بیک وقت صاحب طرز ادیبہ، گل فشاں شاعرہ، شعلہ ریز مقررہ اور بڑی اصول پرست صحافی ہو تو اسے کیا کہہ کر پکارا جائے کہ اس کی چاروں حیثیتیں صرف ایک نام سے ظاہر ہو جائیں؟۔ تو میں نے جواب دیا تھا ”میرے علم اور مشاہدے میں ابھی تک ایک جامع حیثیات کی شخصیت کا نام سلطانہ مہر ہی ہے۔ آگے کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ سلطانہ مہر ایک اچھی ادیبہ ہونے کے علاوہ سیاسی طور پر بڑی باشعور، باضمیر اور بڑے مضبوط کردار کی خاتون ہیں۔ صرف ایک اچھا انسان ہی اچھا ادیب، اچھا شاعر، اچھا صحافی اور فنکار ہو سکتا ہے۔ میں تو جب بھی سلطانہ مہر سے ملتا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بیک وقت کوئی مرصع غزل پڑھ لی ہے، کسی معیاری ناول کا مطالعہ کیا ہے، کوئی انشاؤ انگیز کالم میری نظر سے گزرا ہے یا کوئی اثر انگیز افسانہ میرے دل میں اتر گیا ہے۔ بچپن میں سو منات کے بت دیکھنے والی لڑکی ادب کے مندر میں اب خود ایک دیوی بن گئی ہے۔“ سلطانہ مہر کے بارے میں ابراہیم جلیس کی یہ طویل تحریر کا اقتباس اس کے اپنے فن سے لگن اور محبت کی عمدہ مثال ہے اور اس نے جلیس صاحب کے ارشادات کی روشنی میں اپنے فن کو مزید نکھارا ہے اور اسے مزید خوب صورتی عطا کی ہے۔ اگر جلیس صاحب زندہ ہوتے تو اس تحریر میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیتے کہ موجودہ صورت میں سلطانہ مہر کے کارناموں کی داد دینے کے لئے اس سے بھی کچھ زیادہ کلمات درکار ہیں۔ ”گفتنی“ میں ننانوے (۹۹) نثر نگاروں کے حالات زندگی، ادبی سرگرمیاں اور ان کے افکار و خیالات کو بڑے ہی خوب صورت انداز میں سلطانہ مہر نے تحریر کیا ہے۔ ان ننانوے (۹۹) نثر نگاروں میں سمندر پار بسنے والے ادیب بھی ہیں پاکستان اور ہندوستان کے بھی



ہیں۔ یہ ایک ایسی خوب صورت کتاب ہے جس میں ادیبوں کے بارے میں ایسی زندہ اور متحرک تحریریں ہیں جن کے مطالعے سے نہ صرف ان کے کام سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے بلکہ ان کے حالات کے بعض ٹکڑوں میں کسی افسانے کی سی نفاست اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کئی ادیبوں سے پہلی بار متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کی جدوجہد، ان کے رویوں کے احوال سے سلطانہ مہر نے اپنے سوالات سے ایسی کہکشاں سجائی ہے جو ”گفتنی“ کی تازگی بھی برقرار رکھے گی اور آنے والے دور میں نئے اذہان اس سے استفادہ بھی کر سکیں گے۔ یہ ایک طرح کی ریفرنس بک (reference book) حوالہ جاتی کتاب ہے اور اپنے خیال کو سلطانہ مہر نے جس عمدگی سے مجسم کیا ہے یہ ان ہی کا کمال ہے۔ ننانوے (۹۹) ادیبوں کی تصاویر کتاب کے اندر بھی ہیں اور کتاب کے سرورق کو بھی ان ہی سے سجایا گیا ہے۔ ہر ادیب نے اپنے ہینڈ رائٹنگ (handwriting خط) سے اپنا ایک پسندیدہ شعر یا نثر کو کوئی ٹکڑا بھی لکھا ہے جو یادگار کا درجہ رکھتا ہے۔ ”گفتنی“ کی یہ جلد اول ہے۔ ظاہر ہے کہ پوری دنیا کے نثر نگاروں کو ایک جلد میں تو نہیں سمایا جاسکتا تھا۔ آئندہ اس کی دوسری جلد میں جو ادیب حصہ لیں گے ان سے متعارف ہونے کے لئے ہمیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا (۱)۔ یہ کتاب یادگار درجہ رکھتی ہے۔ اسے ہر لائبریری میں ہونا چاہیئے۔

تاج سعید  
پشاور، پاکستان

۱۔ یہ دیکھ زندگی بھر رہے گا کہ باوجود کوشش بسیار تاج سعید بھائی اپنی دل کے عارضے کی وجہ سے ”گفتنی حصہ اول“ کے لئے اپنا تعارف ہمیں نہ بھیج سکے۔ ”گفتنی حصہ دوم“ کے سوال نامے کی وصولی کی اطلاع تو ہمیں دی لیکن جوابات دینے سے پہلے ہی ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر راہ عدم کو سدھارے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین! سلطانہ مہر نوٹ: یہ مضمون ”اردو ناٹکس“ مہینہ مہوریہ ۵ / دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔



# بنام سلطانہ مہر

ضیاء خان

فروغ شعر و ادب کا پیام سلطانہ  
دیار غیر میں اردو کا نام سلطانہ

نگاہ اہل ادب میں، تمام دنیا میں  
بہت بلند ہے تیرا مقام سلطانہ

کسی حوالے سے دیکھوں، کمال لگتا ہے  
کہ کارنامہ ہے تیرا یہ کام سلطانہ

یہ نظم و نثر سے ہم کو قریب رکھنے کا  
غضب کا تو نے کیا اہتمام سلطانہ

ضیاء کے دل سے نکلتی ہے، یہ دعائیں لے  
خدا بنائے ترے سارے کام سلطانہ



## جو گذری۔ گذر گئی

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو  
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

جب میں نے روزنامہ جنگ کراچی کے صفحہ خواتین پر کچھ نیا، کچھ انوکھا کام کرنے کی اُمنگ میں شعراء اور شاعرات سے بذاتِ خود مل کر ان کے تعارف شائع کرنا شروع کیے تو ذہن کے کسی گوشے میں محترم مخدوم نجی الدین کا یہ شعر موجود ضرور تھا، کیونکہ میرے تعارف میں شعراء سے کیے گئے سوالات حالاتِ حاضرہ اور ادب کے حوالے سے بھی تھے اور ان کا ”عکسِ تحریر“ بھی لازمی تھا کہ ماضی میں اُردو ادب کے قارئین کے سامنے ان کے پسندیدہ شاعر یا شاعرہ کا خط بھی اس کی تصویر کے ہمراہ سامنے ہو۔ یوں میں جس کا تعارف لکھتی تھی ان کے ساتھ ان کے مداحوں اور عام قارئین کو بھی ساتھ ساتھ لیے چلتی تھی۔

یہی سلسلہ سخن و راوِل سے لے کر زیرِ مطالعہ ”سخن و رنجِ خم“ تک اور نثر نگاروں کا تذکرہ ”گفتنی اوّل و دوم“ میں بھی موجود رہا اور ہے۔

ان سوالات کے ذریعے اس تذکرے میں شریک قارئین شعرا کی فکر اور سوچ تک رسائی حاصل کرتے ہیں کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ”گفتنی دوم“ میں رسم الخط کے حوالے سے کئی



معلومات سامنے آئی ہیں۔ ادیبوں کی گروپ بندی کے حوالے سے بھی انکشافات ہوئے ہیں۔ اردو کی بقاء کے سلسلے میں ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ بالخصوص امریکہ، یورپ اور برطانیہ کے ساتھ پاک و ہند میں بھی اردو کی بقاء کے لیے اردو زبان کے شیدائیوں کو عملی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر مجھے کسی اہم واقعے کی اطلاع ملی تو میں نے تعارف لکھنے کے دوران کہیں نہ کہیں اس کا حوالہ بھی دیا۔ اس ضمن میں ایک مثال یاد آ رہی ہے کہ ہمارے پیارے شاعر جون ایلیا کی رحلت کی خبر مجھے کیلگری کینیڈا سے جناب اقبال حیدر کی معرفت ملی اور نہ جانے کس حوالے سے (جواب مجھے یاد نہیں) میں نے جناب یونس اعجاز (مقیم ڈیلاس امریکہ) کے تعارف میں اس کا ذکر کر دیا ہے۔

اسی طرح ٹورنٹو کینیڈا کے سخن فہم شاہد ہاشمی کا ذکر آٹوا کینیڈا کے شاعر ولی عالم شاہین کے تعارف میں اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ذکر محترمہ ادا جعفری کے تعارف میں موجود ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان پر مقالہ لکھ کر ایک تقریب میں پڑھا تھا۔

لندن کے جناب مصطفیٰ شہاب کے تعارف میں محترم ساقی فاروقی کا ذکر ہے۔ غرض کہ یہ کتابیں چاہے شعرا کا تذکرہ سخن و ریختم ہو یا نثر نگاروں کا تذکرہ ”گفتنی دوم“ میں نے ہر تعارف کو نہ صرف نئے زاویے اور نئے انداز سے لکھا بلکہ اس تعارف میں افسانوی رنگ بھی پیدا کیا اور قاری کو محسوس کرایا کہ میں ان سب سے دو بدو ملی ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں ان میں سے چند ایک سے ہی ملی ہوں گی۔

میں نے اپنے کام سے ہمیشہ دیانت برتی، کبھی پرکھی نہیں ماری اور یہاں وہاں سے مسالہ اور مواد جمع کر کے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے نہیں رکھ دیا جیسا کہ ماضی میں تذکرہ نگاروں نے کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ میں نے تذکروں کی کئی کتابیں دیکھی ہیں جو شائع ہوئی ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ میری کتابیں لکھنے والوں کے لیے حوالے کے طور پر کام آتی ہیں اور کئی ایک نے ان سے استفادہ کیا ہے اور حوالے کے طور پر ”سخن و ریختم“ کا نام بھی دیا ہے جبکہ ایسے کرم فرما بھی سامنے آئے ہیں جنہوں نے میرے لکھے تعارف میں معمولی سی ترمیم کر کے وہ تعارف اسی تصویر کے ہمراہ جو میری کتاب میں شائع ہوئی ہے اپنے نام سے شائع بھی کر دیا اور جب میرے علم میں آیا اور میں نے رابطہ کیا تو انہوں نے معافی مانگ لی۔ قصہ ختم۔ لیکن تعریفوں کے ساتھ میں نے اپنے ہی دانشوروں کے ہاتھوں خاصے دکھ اٹھائے اور ان کے عدم تعاون کا شکار بھی ہوئی۔

ایسے ہی ایک واقعے کی وجہ سے برمنگھم میں منعقد ہونے والی اردو کانفرنس میں شریک جناب ڈاکٹر سعادت سعید کے تعارف کو میں ”گفتنی دوم“ میں شامل نہ کر سکی۔ بات تھی صرف ان کے لکھے مقالے سے دو پیرا گراف لینے کی۔ جو انہوں نے ترکی میں اردو کے موضوع پر کانفرنس میں پڑھا تھا اور میں اس کے ایک دو پیرا گراف کا حوالہ ان کے تعارف میں دینا چاہتی تھی مگر انہیں یہ مقالہ مجھے دینے سے منع کر دیا گیا۔ بات جب میرے علم میں آئی تو میں اس رویے کو منافقت کا نام ہی دے سکتی تھی، چونکہ



میں ایسی کئی منافقتوں کا شکار ہو چکی ہوں لہذا اپنے آنسو خود ہی پونچھ کر چسکی ہو گئی۔ مگر تین دن تک قلم نہ اٹھا سکی اور جب ”گفتنی دوم“ کا آخری انٹرویو جو جناب بیدار بخت کا تھا لکھنے بیٹھی تو اس میں اس کا مختصر سا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

ایسا ہی کچھ ”خن ورنجیم“ میں محترم جگن ناتھ آزاد کے انٹرویو کے وقت بھی ہوا۔ بقول جناب جگن ناتھ آزاد، انھوں نے پاکستان کا پہلا ترانہ لکھا تھا اور جو ۱۴ اگست ۷۳ء کی رات لاہور سے براڈ کاسٹ بھی ہوا۔ میں اس کی تلاش میں تھی۔ میرے ایک کرم فرما جو مجھے بہن کہتے رہے تھے انھوں نے وہ ترانہ دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے غم نہ ہوا کہ وہ ان کی ملکیت تھا۔ عنایت کر دیتے تو ان کے ادبی خزانے میں کوئی کمی بھی واقع نہ ہوتی۔ لیکن وہ جو ایک مثل ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا مددگار ہے اور شکر خوروں کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ مجھے بھی میری دوست ڈاکٹر نگار عظیم کے تعاون سے اس ترانہ کے چند بند مل گئے۔ معلوم نہیں کہ مجھے وہ ترانہ مکمل ملا ہے یا چند بند۔ لیکن وہ بہر حال خن ورنجیم میں جناب جگن ناتھ آزاد کے تعارف کے حوالے سے کتاب کے آخری صفحات میں درج ہے۔

مجھ سے کسی نے پوچھا کہ امریکہ اور برطانیہ کی ادبی فضا میں، میں نے کیا فرق پایا؟ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ لندن اور برمنگھم جو اردو زبان کے مرکز کہلائے جاتے ہیں۔ ”گندی ادبی سیاست“ کا شکار ہیں۔ کوئی کسی کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ خوب خوب بھینے ادھیڑے جاتے ہیں یہ بھی سنا ہے کہ یہاں کتابیں خرید کر پڑھنے کا رواج نہیں جبکہ امریکہ میں صورت حال میں نے بہت مختلف پائی۔ میں لاس اینجلس میں رہی۔ نیویارک، شکاگو، ہیوسٹن، ڈیلاس اور کئی دیگر ریاستوں میں گئی۔ کینیڈا میں بھی جانا ہوا۔ وہاں صورت حال بالکل برعکس ہے۔ گوادلی گروپ بندیاں وہاں بھی ہیں مگر اردو کے ادیب اور قارئین ”دریادل“ ہیں۔ وہاں میں نے بڑی محبت پائی۔ چنانچہ اب میں اپنے رب کے حضور دعا گو ہوں کہ مجھے وہی محبت یہاں بھی ملے جہاں اب میں مقیم ہوں۔ برطانیہ کے ادیب اور دانشور بھی تعاون کرنا سیکھیں کہ یہ دنیا بہت چھوٹی ہے اور زندگی بہت مختصر...

میں سمجھتی ہوں کہ میں نے ”خن ورنجیم“ کی پانچ جلدیں اور ”گفتنی“ کی دو جلدوں کے علاوہ شاعرات کا تذکرہ بعنوان ”آج کی شاعرات“ لکھ کر اردو زبان و ادب کی راہ پر اپنے حصے کا چراغ جلا کر رکھ دیا ہے۔ اب اس سلسلے کا مزید کام وہ کریں گے جنہیں خدا تو فیق دے گا۔

آخر میں جناب ڈاکٹر صفات علوی اور اپنے شریک سفر جناب جاوید اختر چوہدری کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ دونوں صاحبان نے کتب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں میرے ساتھ معاونت کی ہے اور ویکلم بک پورٹ کے جناب سید اصغر زیدی کا بطور خاص شکریہ کہ انھوں نے دونوں کتابوں کی ہی نہیں بلکہ جناب جاوید اختر چوہدری کے تازہ افسانوی مجموعہ ”حرف دعا“ کی بھی طباعت کا کام اپنے ذمے لے کر مجھے ان مشکلات سے بچا لیا جن کا میں نے ماضی میں سامنا کیا اور دعائیں مانگ مانگ کر



رہائی پائی۔ اور اب ”نخن ورنجھم“ کے ساتھ ”گفتنی دوم“ کی ”فلاپیز“ نہ کھلنے کے باعث چند دن جس بولناک عذاب اور نا اُمیدی کا شکار رہی۔ اس تازہ واردات سے بھی جناب اصغر زیدی اور اقبال صاحب نے ہی نجات دلائی۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے اور ان کو نیکیوں کا صلہ بھی، کہ میں تو صرف دعائیں ہی دے سکتی ہوں۔

سلطانہ مہر

۱۴ مارچ ۲۰۰۴ء

2, Birchtrees croft

Birmingham B26-1EF UK

Email: sultanameher38@hotmail.com





”تم تین سو تیرہ سے زیادہ ہو کیا تم تین سو تیرہ کی فتح نہ  
 مارے میں نہیں جانے۔ وہ سب بھی یہ یاد رکھو دیکھا دیکھا“  
 (مذہبیں دنیا کے لوگ)

۳۳  
 اہلسنہ

## ڈاکٹر ابن کنول

دہلی، ہندوستان

ماں یا باپ سے متاثر ہونا مشرق کی تہذیبی روایت ہے۔ بیٹا ہو یا بیٹی... دونوں کے لیے  
 کبھی باپ اور کبھی ماں ”رول ماڈل“ ہوتے ہیں اور مشرق کے لوگ اس کا فخر یہ اظہار بھی بُرا نہیں  
 سمجھتے جبکہ مغرب میں ماں کی خوبیوں کو گنوانے والا تشکیک کے ساتھ ”Mamma's Child“  
 کہلاتا ہے۔ لیکن ابن کنول ”باپ کا سپوت“ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ کہ وہ مشرقی  
 اقدار کے پرستار ہیں۔

اردو ادب میں آج کے ایک نامور افسانہ نگار ڈاکٹر ابن کنول (جو کبھی شاعر بھی تھے)  
 پہلے ناصر محمود کمال تھے۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ جائے پیدائش  
 بھونائی (مراد آباد) ہے۔ بچپن کے دس برس انھوں نے گنور (بدایوں) میں گزارے۔ مسلم یونیورسٹی  
 علی گڑھ سے ایم اے کیا۔ پھر ایم فل اور پی ایچ ڈی دہلی یونیورسٹی سے اردو ادب میں کیا۔ ان  
 کے مقالے کا عنوان تھا، ”ہندوستانی تہذیب، بوستان خیال کے تناظر میں“... جو کتابی صورت میں  
 شائع ہو چکی ہے۔

ناصر محمود کمال سے ابن کنول تک پہنچنے کا سفر بھی ایک کہانی سے کم نہیں۔ ان کا کہنا ہے

اؤں اکثر ان سے پوچھتے ہیں کہ انھوں نے ابن کنول نام کیوں اختیار کیا۔ آدھا عربی آدھا ہندی... ترکیب ہی غلط ہے۔ اب اعتراض جنہیں کرنا ہے وہ تو بے بات بھی اعتراض کرتے ہیں۔ انھیں اعتراض کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ہر شخص کی اپنی ایک سوچ، ایک ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے ابن کنول کو اپنے والد کے احترام اور محبت کی ضرورت تھی۔ ان کے والد مرحوم قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی ایک محقق اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا تخلص کنول ڈبائیوی تھا۔ چنانچہ ناصر محمود کمال نے اپنے پیارے ابو کو ہمیشہ اپنے آس پاس محسوس کرنے کے لیے خود کو ”ابن کنول“ کہلانا پسند کیا۔ یہ ۲۷، ۲۸ برس پہلے کی بات ہے۔

ابن کنول نے طالب علمی کے زمانے سے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے کہ یہ ہنر انھیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد محترم جدوجہد آزادی میں شریک رہے اور شعر و ادب کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ شدت کے ساتھ موجود رہا۔ انھیں بھی اردو زبان و ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ ابن کنول نے ابتداء میں شعر کہے اور ساتھ ہی نثر نگاری کے طور پر چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ گنور میں اس زمانے میں خاصے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ابن کنول، کنول ڈبائیوی صاحب کے ساتھ ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے، پھر اعلیٰ گڑھ کے ماحول نے بھی ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ نثر نگاری ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہے چنانچہ شاعری کا ذائقہ بدلنے کے لیے افسانے اور کہانیاں لکھنا شروع کیں... کہ شاعری میں پڑتی ہے محنت زیادہ... مصرعہ سن کر ابن کنول ہنسے..

”نہیں جناب! محنت تو ہر اس تخلیق میں زیادہ کرنی پڑتی ہے جسے معیاری تخلیق کہا جائے...“

بات ان کی درست تھی۔ ابن کنول نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ”علی گڑھ یونیورسٹی کی ادبی محفلوں میں اکثر میں افسانے سنایا کرتا تھا۔ میں نے ان دنوں بہت افسانے لکھے۔ آج بھی جب کبھی میں ماضی کے سفر پر نکلتا ہوں تو علی گڑھ کے شب و روز میرے ہم سفر بن جاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی تخلیقی گنگناہٹ کے دوران وہ لمحے میرے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی طرح اردو زبان و ادب کے فروغ میں دبستان علی گڑھ کا بھی ایک اہم رول رہا ہے۔“

میں سن رہی تھی۔ میں لکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اللہ میاں کبھی مجھ سے چپکے سے پوچھ لیں کہ ”بتا تیری خواہش کیا ہے؟ تو میں کہوں کہ ”ایک بار دلی، ایک بار لکھنؤ اور ایک بار علی گڑھ میں بھی پیدا کر دیں تاکہ میں سارے دبستانوں سے علم کا خزانہ سمیٹ لوں۔“

میں پوچھنے کو تھی کہ اس دور میں آپ کے پسندیدہ ادیب کون رہے؟ مگر میرے پوچھنے



سے قبل ابن کنول نے بتا دیا کہ جب وہ علی گڑھ میں طالب علم تھے تب مجاز، رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالستار کی تحریروں نے انھیں خاصا متاثر کیا۔ خصوصاً قاضی عبدالستار کی رفاقت اور استادانہ شفقت ہمیشہ ان کے ہمراہ رہی۔ قاضی صاحب کا اسلوب اور موضوعات انھیں لکھنے پر اکساتے رہے۔“

”آپ کے افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ اور کتابوں کے نام؟“

”میرے افسانوں کے دو مجموعے ”تیسری دنیا کے لوگ“ ۱۹۸۳ء میں اور ”بندر استے“ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئے۔ میں نے اس مدت کے درمیان اور بھی کام کئے۔ مثلاً ۱۹۹۰ء میں تحقیق و تدوین پر مبنی ناول ”ریاض دلربا“ (۱۹۹۰ء میں)، آوازِ اردو سیکھیں (۱۹۹۳ء میں)، سیرت مسیح (تدوین ۱۹۹۸ء میں) اور داستان سے ناول تک“ (تنقید ۲۰۰۱ء میں) کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ ان کتب پر دہلی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعامات مل چکے ہیں۔ ویسے ۱۹۷۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ادبی سوسائٹی سے میرے افسانے پر انعام ملا تھا۔ دہلی یونیورسٹی کی طرف ۱۹۷۹ء میں افسانوں پر ”ہریش چندر کٹھپالیا“ ایوارڈ بھی ملا اور ۲۰۰۰ء میں بہترین فکشن رائٹر کے طور پر سرسید ملٹینیم ایوارڈ بھی عنایت کیا گیا۔

میں نے گزشتہ ۲۵ برسوں میں سو سے زائد افسانے، ڈرامے، فیچر اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔“

”آپ کی کتاب ”داستان سے ناول تک“ تنقیدی و تحقیقی کتاب ہے۔ آپ کے افسانوں پر داستانوں کے اثرات بھی ہیں اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے آپ نے تنقید کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ کس وجہ سے؟ ابن کنول نے اس سوال کا تفصیلی جواب یوں دیا:

”ہمارا عہد میر اور غالب کا عہد نہیں کہ اس دور میں ادیب یا شاعر کی شناخت اس کی تخلیق کے ذریعے ہوتی تھی اور یہ حقیقت کہ ایک معیاری تخلیق ہی اس کے خالق کو زندہ رکھتی ہے لیکن موجودہ دور میں تخلیق کار کی حیثیت درجہ دوم کی ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کا دور ناقدین کے لیے خیر و برکت کا دور ہے جبکہ تخلیق کے بغیر ناقد کی حیثیت صفر ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے ہمارے اردو ادیبوں میں خود نمائی کا چلن اس قدر پیدا ہو گیا ہے کہ ہر شخص اپنے بارے میں کتابیں تیار کروا رہا ہے۔ اقبال نے خودی کو بلند کرنے کے لیے کہا تھا لیکن لوگ خود کو بلند کرنے میں لگ گئے ہیں... بعض ادیبوں پر ان کے وظیفہ خوار ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھنے لگے ہیں اور عہد حاضر میں چند رائج الوقت سکہ بند ادیبوں نے درجنوں کتابیں اپنے نام سے وابستہ کر لی ہیں جنہیں حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کتابوں کو انھوں نے مرتب کیا ہے اور اپنا ایک آدھ مضمون اس میں شامل کر لیا ہے اور دوسروں کی تحریروں پر مبنی کتاب پر اپنا نام ڈال کر خود مالک بن



بیٹھے ہیں۔ یعنی دوسروں کی محنت انھیں ”صاحبِ کتاب“ بنا گئی ہے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ”مرتب“ لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں اور جناب ایسے ہی لوگ جوڑ توڑ کر کے ”کامیاب“ ادیب کہلائے جاتے ہیں... لہذا میں نے اسی حوالے سے تنقید و تحقیق کی ہے۔ میرا ادارہ یا اشاریہ ”خود پرست ادیب“ اسی موضوع پر ہے جو مئی ۲۰۰۲ء کے ”کتاب نماد ملی“ میں شائع ہوا ہے۔

ابن کنول نے کچھ دیر ٹھہر کر سلسلہ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”آپ نے میری کتاب ”داستان سے ناول تک“ کا حوالہ دیا ہے۔ اس ضمن میں عرض کرنا ہے کہ دراصل داستانیں ہی ہمارے افسانوی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ ہماری تہذیب کی عکاس ہیں اور ان کے اندر الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ زبان کے استعمال کا سلیقہ بھی ہمیں یہی داستانیں سکھاتی ہیں۔ میں نے خود داستانیں پڑھ کر لکھنا سیکھا ہے۔ ”بوستان خیال“ جیسی ضخیم داستان میں نے لفظ بہ لفظ پڑھی ہے۔ اردو کی سبھی معروف داستانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ داستانوں کے ذریعے میں کہانی بیان کرنے کا ہنر سیکھا ہے، داستانوں کی طرح کہانی میں کہانی پیدا کر کے میں افسانے کا پلاٹ تیار کرتا ہوں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ میں نے انتظار حسین سے متاثر ہو کر یہ انداز اختیار کیا ہے، ایسا نہیں ہے۔ میں نے براہ راست داستانوں کا اثر قبول کیا ہے۔ داستانوی انداز میں لکھنا متروک نہیں ہے۔ آج کا لکھنے والا سو فیصد اس انداز کو نہیں اپناتا بلکہ معاصرانہ جدت سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے موضوعات اور مسائل آج کے ہیں۔ اس کی تخلیق عصری تقاضوں سے مالا مال ہے۔ داستانوی بیانیہ اسلوب میں لکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آج کے بہت سے فکشن نگار داستانوی انداز بیاں کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔“

اب گفتگو اردو کے مستقبل کے حوالے سے ہو رہی تھی۔

ابن کنول نے کہا ”مجھے اردو کے مستقبل سے مایوسی نہیں۔ جو زبان عوام میں مقبول ہوتی ہے وہ ختم نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اس زبان کا مستقبل شاندار ہی ہوتا اگر اس کا قومی نام ہندی یا ہندوی باقی رہتا۔ ویسے مطالعے سے عدم دلچسپی ہماری بد نصیبی ہے۔ اب ہمیں اپنی زبان کی طرف لوگوں کو راغب کرنا ہو گا۔ ہمارا ادب دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ پاورفل اور پُرکشش ہے اور لوگوں میں زبان سیکھنے کی خواہش بھی ہے۔ ہمیں ہی اپنے ذاتی مفادات اور اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دلچسپی لینی ہو گی۔ اردو زبان کو سیکھنے اور چاہنے والوں کی نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک میں بھی کمی نہیں ہے۔ میں گزشتہ سال امریکہ میں کافی دن رہا۔ وہاں اردو سے محبت کرنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ میں نے دیکھا کہ امریکہ جیسے مصروف ترین ملک میں لوگ اردو کے لیے وقت اور پیسہ دونوں خرچ کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ہر بڑے شہر سے اردو کا اخبار نکلتا ہے۔ وہاں ہندوستان کی طرح اردو والوں کی انجمنیں قائم ہیں جن کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں زبان یار ریڈر شپ کو لے کر مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے فروغ میں دلچسپی



یعنی چاہیے۔“

”موجودہ دور میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟“

اچھا بُرا ادب تو ہر زمانے میں لکھا جاتا ہے آج بھی اچھا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اب ہر شاعر میر، غالب یا فیض نہیں ہو سکتا یا ہر افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر، عصمت، منٹو یا قرۃ العین حیدر نہیں ہو سکتا، لیکن جو تخلیق کار آج کل لکھ رہے ہیں۔ ان کا الگ مقام ہے۔ ان کی ایک الگ شناخت ہے۔ ہو سکتا ہے آج جس ادب کو کسی وجہ سے اعلیٰ درجہ کا نہیں سمجھا جا رہا، کل کا ناقد اسے اعلیٰ ادب تسلیم کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کا مشہور افسانہ ”گرم کوٹ“ جب ایک رسالے کو انھوں نے چھپنے کے لیے بھیجا تھا تو ایڈیٹر نے اسے واپس کر دیا تھا۔“

اردو کے رسم الخط میں تبدیلی کے حوالے سے انھوں نے کہا

”رسم الخط بدلنے سے یہ زبان ختم ہو جائے گی۔ اس کی شناخت، کشش اور شیرینی اس کے رسم الخط میں پوشیدہ ہے اور اسے اسی شکل میں باقی رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔“

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایک مشہور ادیب و ناقد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ابن کنول کے افسانوں پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”تیسری دنیا کے لوگ“ موضوع کے اعتبار سے بھی نہایت اہم افسانہ ہے۔ اس کا انداز بیانیہ ہے لیکن کہیں کہیں تلمیحات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس سے وہ جا بجا اپنی کہانیوں میں کام لیتے ہیں۔

”تم ایسا نہیں کر سکو گے کہ تم تعداد میں بہتر (۷۲) بھی نہیں۔“

”تم تین سو تیرہ سے زیادہ ہو، کیا تم تین سو تیرہ کی فتح کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ سب بھی بے یار و مددگار تھے۔“

یہاں قرآنی تعلیمات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کا مدعا یہ ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ ابن کنول کی کہانیوں کی خاص شناخت ان کا داستانوی رنگ و آہنگ ہے۔ زبان بھی جا بجا قصہ نویسی کے طرز کی ہے۔“

محترم پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس کا تبصرہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ انھوں نے اردو کی ”محبوب متاع گمشدہ“ کے حوالے سے لکھا ہے۔

”آٹھویں دہائی نے اردو کو اس کی محبوب متاع گمشدہ یعنی افسانہ کو واپس کر دیا تھا۔ نام نہاد جدیدیت نے افسانے کو چیتا بن کر ان ہزاروں قارئین سے اسے چھین لیا تھا جو افسانے میں انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار سے مانوس تھے اور اسی کو افسانے کا فسوس جانتے تھے۔ اردو میں افسانے کی اس بحالی میں بعض ممتاز ادیبوں کے علاوہ آٹھویں دہائی کے جن نو عمر اور



نوجوان ادیبوں کا نمایاں حصہ رہا ہے ان میں ڈاکٹر ابن کنول کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو کی داستانوں کے تہذیبی کردار پر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔ اس لیے اردو میں افسانہ کی روایت کا شعور وہ اپنے ہم سنوں سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔ انھوں نے متعدد کہانیوں میں تکنیک کے جو تجربے کیے ہیں ان میں داستانی اثرات کی شناخت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

دوسرے نوجوان ادیبوں کی طرح ابن کنول کا مسئلہ بھی آج کی، ان کے اپنے عہد کی وہ پیچیدہ زندگی ہے جو کرناک محرمیوں، بے چینیوں، جبر و تشدد اور عدم تحفظ کے آئینی احساس سے اندر اندر سلگ رہی ہے۔ جو بہشت کی آرزو میں تگ و دو کرتی جہنم کے دہانے پر آکھڑی ہوئی ہے لیکن ابن کنول اس صورت حال سے ہراساں اور مایوس نہیں ہیں۔ پہلا آدمی جب دار پر چڑھایا جاتا ہے اور وہ بھیڑ میں لوگوں کو اپنی ہی طرح بے زار اور برہم دیکھتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آتی ہے۔ تیسری دنیا کے لوگ بھی مایوسیوں کے بے کراں سمندر میں خود کو غرق کرنے کے بجائے آخر میں اپنی چھینی ہوئی زمین، چھینی ہوئی خوشیوں کو واپس لینے کا عزم کرتے ہیں لیکن یہ رجائی انداز کسی فارمولے کی طرح ان کی کہانیوں میں نہیں ابھرتا۔ ”خواب“ اور ”شام ہونے سے پہلے“ میں وہ جن مسائل کو لے کر چلے ہیں ان کی دہشت، شدت اور معنویت کو وہ بڑے مؤثر انداز سے قاری کے دل میں بٹھاتے ہیں اور ان کا کوئی حل بتانے پر اصرار نہیں کرتے۔“

اب آپ ابن کنول کا ایک مختصر مگر پُر اثر و دل گداز افسانہ ”نیا عہد... نیا درندہ“ پڑھ لیں تو آپ کا جی چاہے گا کہ ان کی اور کہانیاں بھی ضرور پڑھی جائیں۔

### نیا عہد... نیا درندہ

اپنے ساتھی بچوں کو ڈراتے ڈراتے اُس کی عادت سی بن گئی تھی، وہ ہر روز جنگل سے گاؤں کی طرف یہ کہتا ہوا دوڑا چلا آتا تھا۔

”شیر آیا... شیر آیا“

وہ گڈریئے کا لڑکا تھا اور اس نے گڈریئے کے لڑکے کی کہانی سن رکھی تھی جو برسوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ وہ اپنی بکریوں کے ساتھ دن بھر جنگل میں رہتا تھا۔ جنگلی جانوروں کا خوف اس کے دل سے محو ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب شیر کبھی نہیں آئے گا۔ سارے شیر بوڑھے ہو چکے ہیں یا چڑیا گھروں میں قید ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ سب کو ڈرانا چاہتا تھا۔ اس کی آواز سن کر اکثر لوگ اس کا مذاق بناتے تھے وہ پھر بھی پُر امید تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو گا۔ ایک مرتبہ اُس کی آواز سن کر احمد حسین نے اپنے بچوں سے کہا:

”یہ لونڈا بھی پاگل ہو گیا ہے۔ ایسے چلاتا ہے جیسے شیر اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اب



کہاں شیر؟ اب تو شیر کا بچہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ شیر تو انگریز بہادر کے زمانے میں تھے۔  
 ”کیسے ہوتے تھے وہ شیر؟“ احمد حسین کا لڑکا پوچھتا۔

”ہوتے کیسے؟ جیسے ہوتے ہیں۔ ایک بار خبر ملی کہ پاس کے جنگل میں شیر آ گیا ہے۔  
 انگریز بہادر نے ہمارے دادا کو بلایا۔ ہمارے دادا کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ اپنی تلوار لے کر پہنچ گئے۔  
 ”تلوار سے مارتے تھے شیر کو؟ آپ کے دادا کیا شیر شاہ سوری تھے؟“ دوسرا لڑکا سوال کرتا۔

”ہاں! ہمارے دادا تلوار ہی سے شیر کا شکار کرتے تھے۔ انگریز بہادر کے پاس بندوق بھی تھی۔ آٹھ دس آدمی گئے۔ شیر کو مار لائے اور پھر اس کے پاس کھڑے ہو کر تصویر کھینچوائی۔  
 ”مردہ شیر کے ساتھ کیا تصویر کھینچوانا! زندہ شیر کے ساتھ تصویر کھینچواتے تو بات تھی“ لڑکا طنز کرتا۔

”ابے زندہ ہوتا تو کھا نہیں جاتا۔ آج کل کے شیروں کی طرح تھوڑے ہی تھے وہ شیر جو آدمی سے ڈرتے ہیں“

”آدمی سے تو کبھی جانور ڈرتے ہیں۔ سرکس میں دیکھا نہیں، کس طرح شیر، چیتے، بھالو، ہاتھی آدمی کے سامنے گھسکیاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔“ لڑکا بات کی بات کو آگے بڑھاتا ہے۔ باپ اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے:

”ہاں یہ بات تو ہے، پہلے لوگ جنگل میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ آج کل شہر میں جاتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں“ گڈریے کا لڑکا بھی کبھی کسی پہاڑی پر چڑھ کر چلاتا اور کبھی کسی پیڑ پر بیٹھ کر چیختا:

”بھیڑیا آ گیا... بھیڑیا آ گیا... بچاؤ... بچاؤ...“

وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید بھیڑیے کے نام سے لوگ سہم جائیں گے لیکن جو لوگ اس کی چیخ کے اس طرح عادی ہو گئے تھے جیسے رات کو چوکیدار کے ”جاگتے رہو، جاگتے رہو“ چلانے کے باوجود سوتے رہتے ہیں۔ کوئی مرد، کوئی عورت، کوئی بچہ گڈریے کے لڑکے کی آواز سن کر گھر کے اندر نہیں بھاگتا، دروازے کھلے رہتے تھے، کھڑکیاں بند نہیں ہوتی تھیں، دکانیں کھلی رہتیں، لوگ معمول کے مطابق سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ عبداللہ کی دادی کہتی:

”یہ لڑکا بھی پگلا ہے۔ اگر کسی دن سچ مچ شیر یا بھیڑیا آ گیا تو سب چلانا بھول جائے گا۔ کہانی والا حال ہوگا۔“

”دادی اماں آپ نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟“ عبداللہ پوچھتا

”ہاں! کئی بار... لیکن بچپن میں... جب ہم چھوٹے تھے، تمھاری طرح... گاؤں میں اکثر بھیڑیا آ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بچوں کو اٹھا کر لے جایا کرتا تھا“



”لوگ اسے مارتے نہیں تھے؟“ عبداللہ دریافت کرتا۔

”ہاں! مارتے کیوں نہیں تھے۔ ہمارے گاؤں میں اس وقت کسی کے پاس بندوق نہیں

تھی... لائچی اور بلم ہی سے مارتے تھے۔“

”لوگوں کو ڈر نہیں لگتا تھا؟“ عبداللہ پھر کہتا

”ڈر بھی لگتا تھا لیکن اپنی حفاظت بھی تو ضروری تھی۔“

”دادی اماں اب بھیڑیا، کیوں نہیں آتا؟“

دادی اماں ہنس کر کہتیں

”اب تم سے ڈرتا ہے اور اب تو ہر طرف بھیڑیے موجود ہیں۔ اس لیے اب اس کی

ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ عبداللہ حیرانی ظاہر کرتا۔

”آہستہ آہستہ تم سب سمجھ جاؤ گے۔ خدا تمہیں ان بھیڑیوں سے سلامت رکھے۔“

دادی بڑی پُر درد آواز میں کہتیں،

عبداللہ دادی کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے کرتے سو جاتا۔

گڈرے کا لڑکا گھاس کے میدان میں بکریوں کو چھوڑ کر کھیت کی منڈیر پر چلاتا ہوا

دوڑ رہا تھا۔

”بھاگو... بھاگو... لکڑ بگھا آ گیا... بھاگو...“

اس نے سوچا شاید لکڑ بگھے کا نام سن کر لوگ بھاگیں گے لیکن کوئی نہیں بھاگا۔ سب یونہی

کام کرتے رہے۔ لکڑ بگھے کا خوف دل سے دور ہو چکا تھا۔ سب جانتے تھے کہ لکڑ بگھا کتنا خطرناک

جانور ہے لیکن اب ڈرنا کوئی نہیں تھا۔ لوگ اس کتے نما جانور کو محض کتا سمجھنے لگے تھے۔ عمر نے اپنی

ماں سے کہا:

”ماں! لکڑ بگھے کے تو بہت سے قصے مشہور ہیں۔“

”ہاں یہ جانور بڑی خاموشی سے حملہ کرتا ہے۔ آدمی کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلتا

رہتا ہے لیکن آدمی سے بھلا کون جیت پایا ہے۔ کچھ دن پہلے ایک لکڑ بگھا غلطی سے گاؤں آ گیا

تھا۔ یہاں آ کر اپنی سب حیوانیت بھول گیا اور اپنی چھوٹی سی دم دبا کر بھاگ لیا۔“

گڈرے کا لڑکا چلاتے چلاتے اکثر سوچتا تھا کہ کیا بات ہے جو شیر، بھیڑیے اور

لکڑ بگھے کے نام سے بھی لوگ خوفزدہ نہیں ہوتے۔ کہانیوں میں تو بتایا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی

ہے کہ یہ جانور بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے ان کا ڈر نکل گیا

ہے۔ وہ روزانہ گاؤں والوں کو ڈرانے کی کوشش کرتا تھا لیکن لوگ اس کے چیخنے کو اس کا پاگل پن

سمجھتے تھے... پھر ایک دن ہوا یوں کہ بکریاں چراتے چراتے وہ بہت تیزی سے چلاتا ہوا گاؤں کی



طرف بھاگا:

”بھاگو... بھاگو... بلوائی آگئے... دنگائی آگئے... بھاگو“

”اس کی یہ آواز جیسے ہی لوگوں کے کانوں سے نکرائی پورے گاؤں میں پھیل مچ گئی۔  
لوگ بے تحاشا اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ پلک جھپکتے ہی گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے  
بند ہو گئے۔ لوگ اپنی بہو، بیٹیوں اور بچوں کو محفوظ جگہوں پر چھپانے لگے۔ بازار بند ہو گئے۔ ذرا  
سی دیر میں چاروں طرف سناٹا ہو گیا۔ دہشت اور وحشت سڑکوں پر منڈلانے لگی۔ گڈریئے کا لڑکا  
ایک گوشے میں خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

Dr. Ibne Kanwal

36 III-Floor, Lane No. 2

Noor Nagar Exth. Jamia Nagar, New Delhi 110025 INDIA

E mail: ibnekanwal@yahoo.com.





کریا ہے اہل نظر تازہ بستیاں آباد  
میری نگاہ ہیں سوئے کونہ و بغداد

احمد بشیر

پہر نومبر ۲۰۰۳

احمد بشیر

لاہور، پاکستان

جب میں عامل صحافی (working journalist) اورنگ جرنلسٹ) تھی تب بھی اور جب میں نے خود اپنا ذاتی ماہنامہ ”روپ“ کراچی سے شائع کرنا شروع کیا اس وقت بھی ایک صحافی احمد بشیر کا ذکر بہت سنا، خصوصاً ہمارے ادارے سے وابستہ لاہور کے نامور فنوٹو گرافر کاشف کی زبانی ان کی بہت تعریف سنی۔ ان کے ساتھ ہی اکثر حسن ثار کا ذکر بھی آتا تھا۔ مگر کیا بد نصیبی رہی کہ چاہنے کے باوجود احمد بشیر صاحب سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ لیکن جب میں نے پڑھا..... ”میں ایک کونے میں پڑا اخبار پڑھ رہا تھا کہ روزنامہ پاکستان کے صفحہ اول پر نظر پڑی۔ لاہور کے بڑے علمائے مجھرو سیاہ کو مرتد اور کافر قرار دے کر واجب القتل ٹھہرا دیا تھا۔ یہ ان کی اسلامی بصیرت کا حاصل تھا۔ کہا گیا تھا کہ اگر احمد بشیر توبہ بھی کرے تو کوڑے تو اُسے ضرور مارے جائیں۔ یہ فتویٰ میری کتاب جو ملے تھے راستے میں پر جاری ہوا تھا۔ تب ان سے ملنے کو خواہش دوبارہ جاگی۔

اب یہ تحریر ”پیش لفظ“ کے عنوان سے احمد بشیر جی کے لکھے خاکوں کی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں موجود ہے جو ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی ہے اور اسے کتابی صورت میں لانے کا سہرا مشہور ڈرامہ نویس اور افسانہ نگار یونس جاوید کے سر ہے، جنہوں نے بقول احمد بشیر پچاس برس کے رسائل اور



اخبارات کو کھنگال کر کتاب کا مواد جمع کیا تھا۔

اس کتاب میں ایسا کیا ہے کہ مولوی صاحبان نے احمد بشیر کو واجب القتل قرار دے دیا۔ چنانچہ میں نے پوری کتاب پڑھی اور احمد بشیر کی مرید بن گئی۔ مگر مجھ سے پہلے جاوید اختر چودہری نے مرید بننے کی رسم ڈالی۔ انہوں نے کتاب میرے پڑھنے سے پہلے پڑھ ڈالی اور وہ مجھ سے زیادہ احمد بشیر کے (دیوانگی کی حد تک) گرویدہ ہو گئے۔ ان کی صاحبزادی اور میری پیاری سہیلی نیلم بشیر جب برمنگھم میں آئیں تو جاوید صاحب احمد بشیر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے بے چین رہتے۔ پھر انہوں نے طے کر لیا کہ اس سال ۲۰۰۴ء میں یعنی اب سے (آج فروری کی چھ تاریخ ہے) دو ماہ بعد جب وہ پاکستان میں اپنے گاؤں سوہاؤہ جائیں گے تو پہلی فرصت میں لاہور جا کر احمد بشیر جی سے ملیں گے۔

ایک میں اور جاوید صاحب کا کیا ذکر، احمد بشیر کی تحریروں کے شیدائی دنیا کے ہر خطے میں ملیں گے۔ مگر ہم جیسے قدردان ان کے قدموں میں صرف محبت و عقیدت کے پھول بچھا سکتے ہیں لیکن دوسرا سکھ اور مالی آسودگی تو انہیں ارباب اقتدار و اختیار ہی دے سکتے ہیں۔ مگر وہ کیوں دیں؟ وہ جس کو نوازتے بھی ہیں تو اپنی غرض اور ضرورت کے تحت اور جب چاہیں ان سے نظریں بھی پھیر لیتے ہیں، جیسا آج کل پاکستان کے مایہ ناز سائنس دان عبدالقدیر خان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں نے ٹی وی کی خبروں میں دیکھا کہ عبدالقدیر خان صدر پاکستان کے ساتھ بیٹھے ہیں اور نیوز کاسٹر (newscaster) کہہ رہا ہے کہ انہوں نے معافی مانگ لی اور صاحب صدر نے انہیں معاف کر دیا۔ مگر عبدالقدیر خان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے والوں سے کچھ اور کہہ رہے ہیں، وہ ہی جو ہمارے ایک محترم صحافی عبدالقادر حسن نے ۵ فروری ۲۰۰۴ء کے کالم (روزنامہ ”جنگ“ لندن) میں لکھا ہے کہ فون پر عبدالقدیر خان نے ان سے کہا کہ انہوں نے اپنا کیس اللہ کی عدالت کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے ہیں جیسے احمد بشیر نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب دیتے ہوئے وہ کئی وجوہ گناتے ہیں۔ ”لکھوانے والوں نے پیسے نہیں دیئے۔ ایک اور وجہ یہ بھی کہ آخر کیوں لکھوں؟ علم و ادب کی خدمت کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ میری بیوی کو صرف میری باقاعدہ تنخواہ سے مطلب ہے۔ اخبار میں کام کروں، رسالے کی ایڈیٹری کروں یا کراچی میں سقہ گیری کروں، اسے صرف مہینے کی پہلی کو تنخواہ چاہیئے۔“

خدا جانے احمد بشیر نے زندگی کیسے گزاری۔ مگر بس گزار ہی لی۔ احمد بشیر کی خاتون اول اور خاتون خاندانہ جو بھی تھیں ساوتری سے کم نہ ہوں گی، اس لئے جیتے جی احمد بشیر کی محبت میں سستی ہو گئیں مگر احمد بشیر سے پھر بھی جڑی رہیں اور جڑی ہوئی ہیں۔ میں نے ان کے بیٹیوں میں سے بشری انصاری اور نیلم بشیر کو دیکھا ہے۔ دوسری بیٹیوں کی تعریف سنی ہے۔ ایک بیٹا بھی ہے ہمایوں شیخ جو امریکہ میں ہے اور جس کی گڑیا کوئل شیخ کے نام احمد بشیر نے اپنا نیا ناول یا سوانح حیات ”دل بھٹکے گا“ منسوب کیا ہے۔ ان بچوں کو دونوں میاں بیوی نے مل کر پالا ہے مگر میرے نزدیک زیادہ کریڈٹ (credit) ماں کو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ”بیوی“ کو بھی جاننا چاہیئے کہ وہ ”احمد بشیر“ کی بیوی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس لئے کہ



احمد بشیر ایک اچھا انسان ہی نہیں ایک عالم، دانش ور اور پائے کا ادیب بھی ہے۔ بقول ایمرسن ”ادب بہترین خیالات کا ریکارڈ ہے“، جان مورلے کے الفاظ میں ”ادب دانش ورانہ افکار اور سچے جذبوں کا اظہار ہے“۔ اور یہ بات غلط یوں نہیں کہ کسی بھی تخلیق کی پیش کش میں ایک فکر، احساسات کی گہرائی و گہرائی اور ایک تخلیقی شعور و جذبہ کا فرما ہوتا ہے۔ گوئے کے بقول ”کسی فن پارے کو سمجھنے کے لئے اس کے عہد کا سمجھنا از بس ضروری ہے“۔ چنانچہ احمد بشیر کی تحریریں بھی اس کے عہد کا تمام تر پس منظر لیے ہوئے ہیں۔ چاہے ان کے خاکے پڑھے جائیں، ان کے کالم یا ان کا سوانحی ناول، سب ہی میں ان کا عہد گویا ہے۔

میں نے انہیں ”گفتنی“ حصہ دوم کا سوال نامہ بھیجا تو ان کا جواب آیا۔ میراجی چاہتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے جوابات کو جوں کا توں قارئین تک پہنچا دوں کہ ان میں بشیر احمد کی بانی کی ایک جداگانہ چاشنی ہے۔ ملاحظہ ہو:

محترمہ سلطانہ مہر! اس غریب شہر کو آپ نے کہاں بیٹھ کر یاد کیا۔ اس پر میرا شکر یہ قبول کیجئے۔ ہم کہاں کے دانا تھے مگر آپ کا حکم ہے تو جوابات حاضر ہیں۔

نام۔ احمد بشیر؛ ولادت۔ موضع ایمن آباد، ضلع گوجران والا (تاریخ پیدائش وہ خود لکھنا بھول گئے تاہم ان کی بیٹی نیلم بشیر کے ای میل کے مطابق ان کا سنہ پیدائش مارچ ۱۹۲۲ء ہے)؛ ابتدائی تعلیم اپنے قصبے میں پائی، کریجویشن سری نگر کشمیر سے کیا۔ فلم میں ایم اے کی سند لاس انجلس سے لی۔

بہت لوگوں نے مجھ عاجز کو سر فراز کیا۔ پہلوان گاماں امام بخش میرے دوست تھے۔ مگر روشن آرا بیگم، بڑے غلام علی خان اور استاد بندو خان بھی میرے کرم فرما تھے۔ مہاراجہ پیالہ، نواب پنودی، ہندو محمد، انور حسین، گلو وغیرہ کے ساتھ کرکٹ کھیلی۔ ممبئی میں کرشن چندر کے گھر میراجی اور ممتاز مفتی کے ساتھ ایک کمرے میں رہا اور ہندوستان کے بڑے ترقی پسند ادیبوں سے تعلقات رہے۔ منٹو سے گہری چھٹی تھی۔

صحافت۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ”امروز“ سے زندگی شروع کی اب یاد نہیں کہ کون کون سے جریدے سے وابستہ رہا۔ اتفاقاً اس پیشے میں آیا، اور چوں کہ ابھی میں نے ڈرنا نہیں سیکھا تھا اسی لئے شوخی میرے لئے دروازہ کھول گئی۔

میں متاثر اپنے استاد مولانا چراغ حسن حسرت سے ہوا۔ مگر ظفر علی کو بڑا اخبار نویس سمجھتا ہوں۔ مولانا غلام رسول مہر بھی بھاری بھر کم آدمی تھے مگر بنیادی طور پر وہ محقق تھے۔ ہاں ایک میرا کارنامہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو صحافت میں فیچر رائٹنگ (feature writing) کی ابتدا میں نے کی۔ بس ہوگئی۔ پھر میں نے چند برس انگریزی صحافت کی اور اردو انگریزی ملا کر میں پاکستان کے تقریباً تمام بڑے اخبارات سے نکالا گیا کیوں کہ اخبار کی پالیسی کے بجائے اپنے نظریات کے مطابق لکھتا ہوں اور لکھتا تھا۔ ایک ضیاء الحق نے اپنے گیارہ سالہ دور میں مجھے گیارہ مرتبہ اخبارات سے نکلوایا۔ میں نے اس کے زمانے میں چار مختلف ناموں سے لکھا، بلے شاہ، شاہ عنایت اور احمد کھرل خان مگر ٹھپ نہ سکا۔



جی ہاں میں سائنٹفک سوشلسٹ ہوں۔ مادی جدلیات پر یقین رکھتا ہوں اور ساری عمر معاملات پر اسی نظریے سے نگاہ ڈالی۔ میں کوئی عملی تبدیلی نہیں لاسکا اور اس پر کوئی افسوس بھی نہیں لگتا ہے کہ میری زندگی اکارت گئی مگر بے مزہ نہیں گزری۔

ہمیشہ ناسازگار حالات سے واسطہ رہا۔ بھوکا، بے روزگار رہا مگر نہ جھکا نہ بکا (کیا یہ بہت اچھی بات ہے؟)۔

آج کا میں ”جنگ“ اور ”ڈان“ پڑھتا ہوں جنگ کے کالم نویس اپنی ذاتی ڈائری لکھ رہے ہیں زیادہ تر جاہل اور بے علم ہیں۔ غیر ملکی اخبارات بہت مہنگے ہیں۔ کبھی مفت مل جائیں تو پڑھ لیتا ہوں۔ مگر ہندوستان سے ہمارے انگریزی اخبارات اچھے ہیں۔

جی نہیں اخبارات معلم کا کردار ادا نہیں کرتے بعض صحافی کرتے ہیں۔ اخبارات تو حاضرو موجود یا ماضی پرستی یا روایت پرستی فروخت کرتے ہیں۔

اردو صحافت subjective ہوتی ہے اور فقرے بازی پر چلتی ہے۔ اس میں تحقیق نہیں ہوتی۔ زبان بھی درست نہیں ہوتی۔ انگریزی میں لوگ بالعموم پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ذمہ داری بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اردو صحافت میں ”میں“ کا صیغہ بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ میں میں میں! ہمارے زمانے میں یہ لفظ فحاشی میں شمار ہوتا تھا۔ مجھے اپنی کوئی تحریر پسند نہیں۔ موضوع کے اعتبار سے مجھے اپنی کتاب ’جو ملے تھے راستے میں‘ کا دیباچہ پسند ہے۔ وہ بھوادوں گا۔ کوئی تصویر ملی تو بھوادوں گا مگر میں نے اپنی تصویر شائع نہیں کرائی اب آپ کہتی ہیں تو شاید۔ کیوں کہ اب میں بہت بوڑھا، بد شکل اور بہت بیوقوف ہو چکا ہوں۔ تمہارا احمد بشیر۔

احمد بشیر صاحب نے اپنا عکس تحریر نہیں بھیجا تھا۔ میں نے انہیں دوبار خط لکھا۔ انہیں یقیناً زحمت ہوئی ہوگی مگر ان کی ایک اور سچی اور کھری تحریر مجھے ملی۔ ملاحظہ ہو:

سلطانہ تو آپ ہیں اس لئے جب آپ کا حکم پہنچا تو تعمیل کرنا پڑی۔

مجھے ظہیر کا شمیری کا یہ شعر بہت پسند ہے

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

مگر اس رجائیت کے آثار نظر نہیں آتے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے مگر نام فریم تو ہمارے بس کی بات نہیں۔ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن اس کا فیوڈل کلچر ہے اور یہ ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے مگر اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی۔ اگر ہم ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں اب زیادہ زوال پزیر ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری قسمت خراب ہے اس کی وجہ ہمارا پہلے سے بدتر نظام تقسیم دولت ہے۔ اسی زوال کو برقرار رکھنے کے لئے ملازم، سول اینڈ ملٹری بیورو کریسی اور فیوڈل ازم کا اتحاد ملا ہے۔ اور ۱۹۷۳ء کا آئین ہماری ترقی کی راہ میں دیوار چین ہے۔ جب بھی کوئی تبدیلی آئے گی اس کو توڑ کر آئے گی۔ فی الحال کوئی اس کے خلاف بات نہیں کرتا۔ بد خطی کی معافی۔ آپ کا احمد بشیر ۳۰/ اگست ۲۰۰۳ء



میں نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ مولوی صاحبان نے ان کے لئے کفر کا فتویٰ جاری کرتے ہوئے ان کو ان کی کتاب کے حوالے سے واجب القتل کیوں ٹھہرایا تھا؟

انہوں نے بتایا (۱)، مولانا عبدالقادر آزاد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا عبدالملک، مولانا عبدالرحمن اشرفی، ڈاکٹر مولانا مرتضیٰ ملک، مولانا عبدالقادر روپڑی، قاضی عبدالقدیر خاموش اور حافظ عبدالقدوس جنہوں نے مجھے واجب القتل اور کوڑے مارنے کی سزا کے لئے عوام کو اکسایا، ان میں سے کسی نے میری کتاب نہیں پڑھی۔ کسی نے شہادت کو نہیں دیکھا۔ یہ طریقہ غیر اسلامی اور غیر شرعی بھی تھا۔ اس کتاب میں کفر و الحاد، ارتداد یا اللہ اور رسول سے بغاوت کی کوئی بات نہیں میں اللہ کے فضل سے مسلمان ہوں گرچہ گناہ گار ہوں۔ میں نے کسی کا مال نہیں کھایا، کسی پر ظلم نہیں کیا، کسی حکومت کی غلامی کا مجرم نہیں ہوا، میری شہرت بطور صحافی اور انسان بہت اچھی ہے۔ اڑتالیس (۴۸) برس کے کیریئر میں مجھ پر کوئی الزام آیا تو نظام سے بغاوت کا آیا۔ میری کوئی جائیداد بھی نہیں۔ میں اپنی حلال کی کمائی میں مکان کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اس لئے اپنے داماد کے گھر کے ایک کمرے میں رہتا ہوں۔ کوئی حسرت بھی نہیں کوئی پشیمانی بھی نہیں، کسی خوف کا شکار بھی نہیں۔ پھر کیا ہوا۔ کیوں لاہور کے بڑے مولوی جو اپنی سیاسی دیانت اور اپنی بصیرت کا ڈھول بجاتے نہیں تھکتے، میری جان کے دشمن ہو گئے؟

بات صرف اتنی تھی کہ میں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ آج سے اڑتالیس (۴۸) سال قبل میں روزنامہ امروز میں بطور صحافی ملازم ہونے کے لئے مولانا چراغ حسن حسرت سے انٹرویو کے لئے گیا۔ یہ انٹرویو تقریباً چھ گھنٹے پر محیط تھا۔ اور اس میں انہوں نے ہر رنگ میں میری شخصیت کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں صحافی بننا آسان نہ تھا۔ شاگردوں کے انتخاب میں ان کی طبیعت، تعلیم، تہذیبی پس منظر اور مطالعے، معلومات عامہ اور ذہنی رجحان کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے اپنے انٹرویو کی روداد میں من و عن بیان کر دیا تھا۔ نہ اس میں فخر و مباہات کی کوئی بات تھی، نہ ہی اس میں کسی کو شراب پینے کی ترغیب دی تھی نہ کسی سے کہا تھا کہ وہ بلو بائی کے چو بارے پر جائے اور راگ دیس سنے۔

وہاں تو اب کچھ رکھا ہی نہیں کوئی پینتالیس (۴۵) سال پہلے میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن کہ پھر وہاں کلاسیکل موسیقی گانے والی کوئی خاتون نہ رہی تھی۔ اگر کسی نے مجھے ہیرا منڈی میں دیکھا ہو تو بولے۔ مولانا صاحبان تو شہادت نہیں دے سکتے کیوں کہ وہ بالعموم شراب نہیں پیتے اور ہیرا منڈی سے گزرتے ہیں تو شاہی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ مجھ گناہ گار نے تو شاہی مسجد میں کبھی نماز بھی نہیں پڑھی۔

مگر میں نے دیکھا ہے کہ بھائی دروازے میں سے سویرے سویرے بعض مولوی صاحبان ہیرا منڈی کی طرف جاتے ہیں۔ صبح نماز یا ناچ گانا تو نہیں ہوتا، وہ مولوی صاحبان گانے والیوں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن شریف پڑھانے اور نماز سکھانے کے لئے جاتے ہیں اور اس خدمت کے عوض کچھ معاوضہ بھی

۱۔ میرے سوال کے جواب میں محترم احمد بشیر نے ”جو ملے تھے راستے میں“ ایڈیشن دوم کا ”پیش لفظ“ ارسال کیا تھا۔

یہاں سے آخر تک یہ طویل اقتباس اس کے صفحے ۲۲ سے ۲۷ تک مختلف مقامات سے لیا گیا ہے۔ سلطان مہر



وصول کرتے ہیں۔ یہ مولوی صاحبان مولانا عبد القادر آزاد، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مرتضیٰ ملک کی طرح بے فکرے اور خوش خیال نہیں، غریب محنت کش ہیں اور ان کو روزی کمائی پر ہتی ہے۔

میں نے بعض مولوی صاحبان کو شام ڈھلے بھائی دروازے سے ہیرامنڈی کی طرف جاتے بھی دیکھا ہے، مگر وہ ہتھکے پائے کھانے جاتے ہیں اور ہتھکے پائے کھانے پر شرعی حد نہیں جاری ہو سکتی۔ پائے تو مولانا عبد القادر آزاد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا مرتضیٰ ملک اور دیگر علما کو، جن کی بغیر محنت کی کمائی کے خمیر سے ان کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں، بھی پسند ہیں، مگر وہ ہیرامنڈی نہیں جاتے۔ وہ اپنے شاگردوں کے ذریعے بھری بھرائی دیکھیاں گھروں پر منگوا لیتے ہیں۔ ان کی دیگر خدمات کا ذکر نہیں کرتے۔

جس زمانے کا میں نے ذکر کیا یعنی ۱۹۴۸ء کا، اس زمانے میں مولوی خاموش تھے۔ احرار، خاکسار، جمعیت علمائے ہند اور جماعت اسلامی کے مولویوں نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کے قومی وطن کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ اسلام ہی کے نام پر انہوں نے ایک ہندو اکثریت والے متحدہ ہندوستان کی حمایت کی تھی، مگر پاکستان تو ان کے شرعی حد کے اجراء کے باوجود معرض وجود میں آئی گیا۔

ابھی یعنی ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم زندہ تھے۔ قرارداد مقاصد بھی نافذ نہ ہوئی تھی اور مولوی کسمپاسے تھے کہ پاکستان کی مخالفت کا داغ کیسے دھوئیں اور کس طرح اس ملک پر قبضہ کریں۔ ابھی ملک کو ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوئی تحریک نہ اٹھی تھی۔ ابھی مولویوں نے پاکستان کو اپنی ذاتی تحریک نہیں سمجھا تھا۔ ابھی وہ اللہ کی نیابت کے دعویدار نہ ہوئے تھے۔ ابھی پاکستان کے عوام کو شہری آزادیاں حاصل تھیں۔ ابھی لب آزاد تھے۔ ابھی کچھ لوگ چھپ چھپا کر پی لیتے تھے اور ہیرامنڈی میں راگ داری ہی ہوتی تھی۔ ان معمولی تفریحات کو ارتداد، کفر اور اللہ اور رسول سے بغاوت نہ سمجھا جاتا تھا اور ان کو تابیوں کی وجہ سے کسی کو واجب القتل قرار نہیں دیا جاتا تھا۔ جو گند رناتھ منڈل وزیر قانون تھا۔ بنگال کے چنوپا دھیائے حزب اختلاف کے لیڈر تھے اور قادیانی ظفر اللہ پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ یہ ایک مسلمان اکثریت والی قومی ریاست تھی جس میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق حاصل تھے۔ یہ ہی قائد اعظم کا پاکستان تھا۔

اس زمانے میں شراب پینے پر پابندی عائد نہ تھی۔ مجرا سننے کا بھی، جو اس کی استطاعت رکھتے تھے، عام رواج تھا۔ ہمارے سب سے بڑے شاعر اور مفکر کے پوتے نے، جن سے پاکستان کا خواب منسوب ہے، اپریل ۱۹۹۶ء کے اخباری بیان میں اشارہ کیا کہ میرے دادا پیتے بھی تھے اور مجرا بھی ہمارے کلچر کا حصہ تھا۔ اس پر مولوی صاحبان نے بغلیں جھانگی ہوں گی، مگر کوئی بولا نہیں۔ انہیں بہت پہلے کافر قرار دیا جا چکا تھا مگر شراب پینے یا مجرا دیکھنے پر نہیں بلکہ اس پر کہ انہوں نے اللہ میاں سے شکوہ کیا تھا کہ ہم مقہور و مظلوم کیوں ہیں جب کہ تیرے نام لیوا ہیں۔ مگر کفر کا فتویٰ تو قائد اعظم کو بھی دیا گیا تھا بلکہ انہیں تو ان ہی مولوی صاحبان نے کافر اعظم کہا تھا، اس لئے نہیں کہ ان پر شراب پینے یا مجرا دیکھنے کا الزام تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک قومی وطن کا مطالبہ کرتے تھے اور ہندوستان سے الگ ہونا چاہتے تھے۔

قومیت یا قوم پرستی مولویوں کے لئے ناقابل برداشت ہے وہ اسے اللہ اور رسول سے بغاوت کے



مترادف قرار دیتے ہیں۔ اصل میں وہ ملکیت پر اٹکے ہوئے ہیں، جب ملکوں اور قوموں کی سرحدیں پامال کرنا اور لوٹ مار کرنا جائز تھا، جب فاتحین کو قتل الہی کہا جاتا تھا۔

آٹھ سو (۸۰۰) سال قبل بغداد کی تباہی کے بعد جب ان ہی مولویوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے اللہ اور رسولؐ سے بغاوت کی اور مسلمانوں کو جہالت اور ماضی پرستی کے اندھے کنویں میں ہمیشہ کے لئے بند کر دیا، اسلام کی تخلیقی زندگی گندے جوہر کی صورت اختیار کر گئی، مولوی جس پر بدبودار کائی کی طرح جسے بیٹھے ہیں۔ آج تک کوئی مولوی قائد اعظم کے مزار پر نہیں گیا کیوں کہ کافر اعظم کے مزار پر کوئی دیندار نہیں جاتا، چاہے وہ کسی مسلمان ریاست کا خالق ہی کیوں نہ ہو۔ کسی فتوے دینے اور غریب مسلمانوں کو واجب القتل قرار دینے والے نے ان کے مدد و جہت اور محسن کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھی کیوں کہ اس نے ایک قومی ریاست قائم کی۔ اس کی وفات کے بعد انہوں نے سول اور فوجی افسروں اور جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر کے منصوبہ بنایا کہ پاکستان پر قبضہ کر لیں۔ مگر یہ مولوی صاحبان ہیں کون؟ یہ وہ ہی تو ہیں جنہوں نے یزید کو فتویٰ دیا تھا کہ قتل حسین جائز ہے، جنہوں نے مامون الرشید کے استفسار پر فتویٰ دیا تھا قرآن حادث ہے قدیم نہیں، یعنی یہ تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے اور فانی بھی ہے جیسے دیگر مخلوقات۔ یہ وہ ہی تو ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہؒ کو کوڑے لگوائے تھے۔ یہ وہ ہی تو ہیں جنہوں نے تمام بنیادی سائنسوں کے بانیوں اور اسلام کے فکری انقلاب کے داعیان کو چین چین کر قتل کروایا اور ان کتابیں جلوائیں تھیں۔ یہ وہی تو ہیں جنہوں نے ہلاکو خان کو، جب وہ بغداد کے در و دیوار کو خون مسلم سے رنگین کر چکا تھا، بادشاہ عادل کا خطاب دیا تھا۔ یہ وہ ہی تو ہیں جنہوں نے منصور حلاج کو سولی پر لٹکایا تھا۔ سرمد شہید کی گردن کاٹی، شاہ حسین کو کافر کہا، بلجے شاہ کو پتھر مارے۔ یہ وہ ہی تو ہیں جنہوں نے اکبر بادشاہ کو مجتہد قرار دے کر اپنی شریعت ایجاد کرنے کا اختیار دیا تھا جس کے بعد اس نے دین الہی تصنیف کیا تھا۔ اس کا مصنف بھی ملا مبارک نامی ایک عالم دین ہی تھا۔ یہ وہی تو ہیں جنہوں نے دہلی کی تباہی پر انگریزوں کے ہاتھ چومے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک فتوے کی روشنی میں حکم دیا تھا کہ وہ انگریزوں کی اطاعت کریں کیوں کہ وہ اہل کتاب ہیں۔

بات میری سلامتی کی نہیں، بات اصول کی ہے۔ قتل کے فتوے دینے کا رواج ہو چلا ہے وہ بھی ایک طرف۔ پچھلے کئی ہفتوں میں جن لوگوں کے خلاف فتوے دیئے گئے ہیں، ان میں رعنا شیخ، عاصمہ جہانگیر، وفاقی وزراء، جنہوں نے عورت کی پھانسی مخاف کرنے کا بل بنایا اور احمد فراز واجب القتل ہو چکے ہیں یا ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔

مولوی صاحبان کے پاس اسلام کے نام پر دینے کے لئے کچھ نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اسلام تو اونچ نیچ کو ہموار کرنے کا نصاب ہے اور اس کا مقصد انسان ہے مگر مولوی صاحبان مصر ہیں کہ یہ ایک قتل کرنے والا اور کوڑے مارنے والا خوں خوار مذہب ہے۔ یہ ہی تو مغرب کہتا ہے۔

ملک میں بھٹونے گرے ہوئے مولوی کو نیکد لگا کے بیدار کیا اور نہ تو وہ ایک نیم مردہ سانپ کی طرح کونے میں پڑا تھا۔ بالآخر یہ سانپ اس کو بھی زندہ کھا گیا۔



اس مولوی کو ضیاء الحق نے نہ خاک کا سانپ بنا دیا۔

ضیاء الحق نے ان بار لیش سانیوں کو پاکستان کے غریب مسلمانوں کا مغز کھانے کی عادت ڈال دی اور اخبارات کو ان کی تھالیاں دھونے پر لگا دیا۔

پاکستان میں پولیس، سیاستدان، غنڈے اور مولوی کا اتحاد ہے۔ پولیس، سیاستدان اور غنڈے تو کبھی کبھار گرفت میں آ جاتے ہیں مگر مولوی پر کبھی کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ مجھے بھی بہت لوگوں نے منع کیا کہ چپ رہو، باہر نہ نکلو، ٹیلی فون مت سنو کیوں کہ مولوی کے پاس قاتلوں کے لشکر ہیں۔ پولیس تمہاری مدد نہ کرے گی اور اخبارات تمہاری فریاد شائع نہ کریں گے۔

جس معاشرے میں امریکی ڈالر آئے گا، اس میں برگر، کوکا کولا، بریک ڈانس، اجنبیت، جنسی بے راہ روی، شراب نوشی اور تشدد پسندی اور جرم بھی زور پکڑے گا۔ جس معاشرے میں اقتصادی بے انصافی اور ظلم ہوگا وہاں کفر بھی ہوگا۔ احمد بشیر کے قتل سے اس بہاء کورو کا نہیں جاسکتا۔ مگر مولویوں کو کچھ معلوم نہیں۔ انہوں نے معاشی انصاف کا کبھی مطالبہ ہی نہیں کیا۔ وہ تو فقط کوڑے مارتے ہیں اور قتل کرتے ہیں۔

اور اب تو حالات بہت ہی خطرناک رخ اختیار کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے قبل سرگودھا کا کمشنر قتل ہوا۔ دوسرے دن مولانا عبدالکریم مشتاق جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تیسرے دن امامیہ کا لونی میں قتل عام ہوا۔ یہ سب مذہبی جنونیوں کے کارنامے تھے۔ میں نے فتوے باز مولویوں کے خلاف رپورٹ اس لئے درج کرانی چاہی تھی کہ مذہبی جنونیوں کو روکا جائے۔ کچھ خود مجھے عمر خضر مطلوب نہ تھی۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے مگر میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری عدلیہ جنون کی حامی ہے۔ مگر ضیاء الحق کے دور سے نیم خواندہ مولوی، جو اپنے آپ کو علمائے کرام کہلاتے ہیں، ایک زبردست پریشر گروپ بن گئے ہیں۔ مسجدوں کے ممبر اور اخبارات کے دفتر ان کی کمین گاہیں ہیں۔ انتخابات میں انہیں تین فیصد ووٹ ملتے ہیں مگر ان کی قوت اور شہرت بے پناہ ہے۔ پولیس والے بھی ان سے ڈرتے ہیں، جج بھی ڈرتے ہیں۔ یہ جس کو چاہیں اسے کیونٹ، مرتد اور کافر قرار دے کر اس پر اپنے فقہی ہاتھ بول دیں، سوئڈ سے اٹھا کر پھینچ دیں، پیروں کے نیچے کچل دیں۔

میرے وجوب قتل کے فتوے پر کسی اخبار نے کچھ نہ لکھا، کوئی نہ بولا۔ سب کے دفاتروں پر حملے ہو چکے ہیں۔ سب مفتوحہ ہیں۔ سب چپ ہیں اور

پھر رہا ہے شہر میں ”مٹلا“ کھلا

Mr. Ahmed Basheer,

30. E-1, Gulberg, 3, Lahore, 54660, Pakistan





ہر حق سے افسانہ بارشہ نظر آئے  
کہ ہم الہامی نسل دیرینہ نظر آئے  
محمد زین الدین

احمد زین الدین

کراچی، پاکستان

محمد حسین آزاد نے ”آب حیات“ میں یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ میر تقی میر ایک بار اپنے سفر کے دوران بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ایک ہمسفر نے ان سے ان کی ”بے زبانی“ کا شکوہ کیا تو، ”بولے کہ آپ کا کیا جائے گا میری زبان خراب ہو جائے گی۔“

افسانہ نگار احمد زین الدین سے جب میں ملی تو ان کی گفتگو سن کر اور پھر پروفیسر علی حیدر ملک کی رائے پڑھ کر، جو ان کے افسانوں کے مجموعے ”دریچے میں بھی حیرانی“ میں درج ہے، سوچنے لگی کہ اگر احمد زین الدین میر تقی میر کے ہمسفر ہوتے آج میر تقی میر کے حوالے سے بھی کئی اور کہانیاں ملتیں کیوں کہ پروفیسر علی حیدر ملک نے لکھا ہے، ”احمد زین الدین کی کہانیوں میں جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں افسانہ نگار نے بڑی حد تک شاعرانہ زبان کی پیروی کی ہے جب کہ ان کے ہمعصر دوسرے افسانہ نگاروں نے نثر کو روایتی آرائشوں سے الگ کر کے اسے خالص نثر بنانے کی کوشش کی ہے۔“

پروفیسر حنیف فوق (سیکریٹری اور چیف ایڈیٹر اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی) نے احمد زین الدین کی کتاب ہذا میں شامل افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے، ”اس مجموعے میں ان کے کئے افسانے سابق مشرقی پاکستان سے منسلک ہیں۔ وہاں کی روایات میں زمین اور انسان سے تعلق کی جو



گہری چھاپ تھی وہ اس سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ افسانہ وہ شجر تھا موسم درد کا صرف عنوان ہی شاعرانہ نہیں اس کے بیان کی شعریت زندگی کے حزن کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ افسانہ پاکستان کے شمالی علاقے کا سہی لیکن اس میں سابق مشرقی پاکستان سے حاصل کردہ نغمہ درد کی محبت اور آج کے شہروں کی عطا کردہ مغائرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ’زرد موسم کی صلیب پرندے کی صورت میں ایک آزاد روح کا افسانہ ہے جو ہجرت خیمہ بستی اور بارود کے غذا یوں سے گزرتے ہوئے جب آدم زادوں کے اعمال سے خود ان کی دنیا ان کے لئے تنگ ہو جاتی ہے تب وہ نئی فضاؤں میں اپنا راستہ بناتا ہے۔ ’درد کی بازگشت، وادی کشمیر کے حریت پسندوں کی الم ناک کہانی ہے جس میں درد ناک واقعات کے علاوہ انسانی حقوق کے دعوے اور انسانی حقوق کی پامالی کے تضاد سے ایک غم ناک تاثر ابھرتا ہے۔“

احمد زین الدین کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں، ”احمد زین الدین کے افسانوں کی فنی بخت اور احساس انگیز اظہار، جو احمد علی، احمد ندیم قاسمی اور مرزا ادیب کی یاد دلاتا ہے لیکن ان سے مختلف بھی ہے، لائق توجہ ہے۔ اس وقت جب بعض افسانہ نگار تعلقات عامہ کے بل بوتے پر شہرت حاصل کرتے ہیں، اپنی نارسیدہ کاوشوں کو بڑے اہتمام سے آگے بڑھاتے ہیں اور ادب کی تاریخ میں ان کا نام رہے یا نہ رہے، اعلیٰ رابطوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر اپنے آپ کو منواتے ہیں، احمد زین الدین کی یہ ریاضت گوشہ نشینی مبارک باد کی مستحق ہے۔ انہوں نے ادب کو انسانی تہذیب کا ایک حصہ جانا ہے اور انسانی تہذیب کا ارتقا علمی خزانوں کے فروغ، جمالیاتی صورتوں کی پیش روی اور معاشرتی ترقی سے وابستہ ہے۔“

آئیے اب اسی حساس افسانہ نگار، احمد زین الدین سے ملتے ہیں جس نے اپنی کہانیوں کے مجموعے میں لکھا ہے، ”باشعور اور حساس انسان کی ایک بڑی مجبوری تو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر کے کہرام کو بیان بھی نہیں کر سکتا۔ اس کربلا کی صعوبتیں کسی کو سنا بھی نہیں سکتا جو اندر کی دنیا کو تہ وبالا کیئے رکھتی ہیں۔ ہر لمحہ کچھ سنتا ہے مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ کیسا عذاب ہے یا رو! جو جسم و جاں سے ہر لمحہ نبرد آزما رہتا ہے۔“

”گفتنی، حصہ اول، ۲۰۰۰ء“ میں احمد زین الدین کا تعارف شامل ہونا چاہیے تھا۔ سوالات ان سے وہی کیئے گئے تھے اور اسی حوالے سے انہوں نے جواب دیئے تھے مگر کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے ”گفتنی اول“ ان کے تذکرے سے محروم رہی۔

۲۲ / جولائی ۱۹۳۹ء تاریخ پیدائش ہے اور شاید صحیح بھی کہ ان کے بڑے بھائی محی الدین صدیقی نے ۱۹۵۲ء میں ان کے اسکول کے داخلہ فارم میں اندازے سے یہ ہی تاریخ لکھ دی تھی۔ اس زمانے میں تاریخ پیدائش کو محفوظ رکھنے کا ویسے بھی کوئی اہتمام نہ کرتا تھا۔ جائے پیدائش قصبہ بھیتری تحصیل سید پور (سید میں ”ی“ غیر مشدد)، ضلع غازی پور، یوپی، ہندوستان ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء میں نواب پور گورنمنٹ ہائی اسکول، ڈھاکہ (حالیہ بنگلہ دیش) سے میٹرک کیا۔ قائد اعظم کالج، ڈھاکہ سے ۱۹۶۳ء میں بی اے اور ۱۹۶۵ء میں اردو ادبیات میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے اور ۱۹۷۱ء



میں کراچی یونیورسٹی سے اردو ادبیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے مقابلے کا امتحان پاس کیا اور بحیثیت اکاؤنٹنٹ ٹیلیفون ریویو آفس، کراچی میں ملازمت کی اور اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے ۲۸/ فروری ۱۹۹۸ء کو گولڈن ہینڈ شیک کے تحت ریٹائر ہوئے۔

احمد زین الدین کا گھرانہ زمینداروں کا تھا۔ سینکڑوں بیگہ زمین اور کئی گاؤں کے کاشت کاروں پر مشتمل زمین دارانہ نظام ۱۹۳۷ء کی آزادی کے بعد ختم ہوا تو ان کے خاندان کے لوگوں کو بھی ملازمت کرنا پڑی۔ سابق مشرقی پاکستان جب ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش بنا تو ایک اور ہجرت ان کا مقدر ہوئی۔ ان کی والدہ کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا اور وہ گاؤں کے آبائی قبرستان میں دفن ہوئیں۔ ان کے والد، مولوی عبدالستار نے ۱۹۷۳ء میں وفات پائی اور کراچی میں تدفین ہوئی۔ احمد زین الدین کی پانچ بہنیں ہیں جن میں سے ایک، انوری بیگم ضلع غازی پور میں اپنے بچوں کے ساتھ ہیں۔ باقی خاندان اور رشتہ دار بھی ہندوستان میں ہیں۔ بھائی محی الدین صدیقی کا انتقال ہو چکا ہے۔

”آپ نے افسانے کب لکھنا شروع کیے؟“ میں نے پوچھا تو کہنے لگے، ”اس کی تفصیلی داستان میرے افسانوں کے مجموعے ’دریچے میں بجی حیرانی‘ میں موجود ہے جو ایک کچی پتا بھی ہے اور اپنے دور کی کہانی بھی۔ جس میں میری ابتدائی زندگی اور جدوجہد کی کہانی بھی درج ہے۔ ماضی کے ان تکلیف دہ حالات اور کرب مسلسل نے مجھ میں سوچ اور فکر کی ایک نئی دنیا آباد کی اور میں ’کہانی کار‘ بن گیا۔ اب جیسا بھی ہوں اس کا اندازہ اور تعین وقت کرے گا۔“

احمد زین الدین نے نہ صرف افسانوں کے چراغ روشن کر کے عام آدمیوں تک روشنی پہنچائی ہے بلکہ اس میں اضافہ کرتے ہوئے انہوں نے ’روشنائی‘ کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا ہے۔ نکتہ بریلوی ان کے ساتھ ہیں۔ تین سال سے یہ پرچہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

احمد زین الدین کی رائے میں اردو ادب کی تاریخ میں موجودہ اور زندہ رہ جانے والے ادیبوں کی تعداد یوں تو خاصی ہے جن میں اکابرین اور مشاہیرین ادب بھی شامل ہیں لیکن نثر نگاری اور افسانے کی دنیا جن کے نام ان کی نظر میں ہمیشہ تابندہ رہیں گے اور جنہوں نے انہیں متاثر کیا ہے وہ ہیں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، علی عباس حسینی، رتن سنگھ، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، خالدہ حسین، رشید امجد، منشا یاد، جیلانی بانو، مرزا ادیب، ممتاز مفتی، خواجہ احمد عباس، اے حمید، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، اقبال مجید، نجم الحسن رضوی، غلام محمد مرحوم، اور بھی کئی نام ہیں جن سے فہرست طویل ہو جائے گی۔

”جدید ادب کہاں تک اپنے زمینی مسائل کا احاطہ کرتا ہے؟“ اس سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے، ”فلکشن ایک لطیف آرٹ ہے۔ جدیدیت ایک رویہ ہے جس نے ادب میں نئی معنویت کو جنم دیا اور انداز فکر میں تبدیلی کا موجب بنا۔ اس نے ادب کو نکھارا مگر علامتوں کی بے معنویت اور عدم تفہیم نے الجھنیں پیدا کیں۔ ادب کو سماج کے مسائل سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہیں۔ فرد کی ذات کے



دکھ بھی اپنی معنویت رکھتے ہیں اور ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مگر ادب ’کل کا نام ہے‘ جزو کا نہیں۔ انسان اور اس کے مسائل اور دکھ زیادہ محترم ہیں۔ اور پھر آج کا ادیب بلاشبہ ذہنی اور نفسیاتی، داخلی اور خارجی الجھنوں میں خود بھی مبتلا ہے۔ اقتدار تیزی سے بدل رہی ہیں۔ سائنس کی ایجادات نے حیرت کے نئے نئے باب کھول دیئے ہیں۔ مادہ پرستی نے انسان کو انسان کے دکھ اور مسائل سے الگ کر دیا ہے۔ وہ خود مرکز پسندی کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام فکر کی تلاش میں ہے جس کے ذریعے اُسے سکون اور معاشی اطمینان حاصل ہو سکے۔ لہذا جب تک کسی معاشرے میں مساوات، بھائی چارہ اور معاشی استحکام پیدا نہیں ہوگا وہ بہتر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اُسے ایک ایسے ہی معاشرے کی جستجو میں مصروف رہنا چاہیے جہاں امن و سکون اور بنیادی ضرورتوں کا حصول آسانی سے ممکن ہو۔

موجودہ دور کا اردو افسانہ پرانی روایت سے ہٹ کر کہاں تک آگے آیا اور کیا مزاحمتی افسانے سیاسی اور سماجی شعور کو بالیدگی عطا کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں احمد زین الدین کہنے لگے.....

”موجودہ دور میں جو افسانے لکھے جا رہے ہیں اُن میں پرانے موضوعات کو بھی نیا پیرایہ اظہار دیا جا رہا ہے اس لئے کہ دنیا کی کوئی بھی چیز نئی نہیں۔ موضوعات بھی بہت نئے نہیں۔ صرف بیان کا انداز ہی ان میں جان ڈالتا ہے۔ دہرانے کی کیفیت کم کم ہو سکتی ہے اس لئے کہ مسائل حیات میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ اور سوچنے سمجھنے کا انداز بدل گیا ہے۔ لکھنے والا اپنے طور پر نئی معنویت کے ساتھ مختلف انداز بیان کے ذریعے اپنی بات کہنے کی کوشش کرتا ہے جب ہی اُسے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو مسرت بھی ہوتی ہے۔ اور میری رائے میں مزاحمتی ادب کو علامتوں نے ہی سہارا دیا ہے۔ اس کے بغیر اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ پاکستان میں جبر کا دور خاصا طویل رہا لیکن مزاحمتی تحریروں کے ذریعے کبھی انقلاب نہیں آیا۔ ہمارے ہاں عوام میں وہ سیاسی شعور آج تک بیدار نہیں ہو سکا جس سے کسی تبدیلی کی توقع کی جاسکتی۔ ہم ہر حال میں راضی بہ رضا کے قائل رہے ہیں۔ نو دہائیوں نے اس آزادانہ شعور کو کبھی بیدار نہیں ہونے دیا۔ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا رہا ہے۔ سماجی مساوات نام کو بھی نہیں۔ ہر شخص اپنے ڈھب سے جیسے تیے زندگی گزار رہا ہے اور بس۔“

”پاکستان میں خواندگی میں اضافے کے لئے ادیبوں نے کیا کردار ادا کیا؟“ میں نے سوال کیا۔ احمد زین الدین کہنے لگے، ”پچھلے پچاس برسوں میں خواندگی کی شرح بڑھانے کے لئے ادیبوں نے صحیح معنوں میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ اس لئے ہمارے معاشرے میں ادیب و شاعر کا کوئی مقام نہیں۔ اور نہ حکومت وقت نے ادیبوں کو ان کا جائز مقام دیا۔ جس معاشرے میں کتابوں اور رسائل کی کوئی پزیرائی نہ ہو، پڑھنے والوں کی تعداد محدود ہو اور مال دار اشخاص اور ادارے ادب کے فروغ کے لئے کوئی مدد نہ کرتے ہوں تو ادیب ایسی صورت میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ وہ خود مفلوک الحال ہے۔ اُس کے بچے مناسب تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ تو وہ کیا کردار ادا کرے گا۔“

ادب کی دنیا میں خواتین کی تعداد کے ضمن میں وجوہ بیان کرتے ہوئے وہ کہہ رہے



تھے، ”ادب کی دنیا میں عورتوں کی تعداد اتنی کم بھی نہیں، صد فی صد تو ہو بھی نہیں سکتی۔ اس کی وجہ غالباً ہمارا ناقص نظام تعلیم ہے۔ کالجوں اور دانش گاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ صرف نصابی اور محدود ہے۔ ادب کی طرف توجہ بچوں کو ابتدا سے نہیں دلائی جاتی۔ لڑکیوں کو بی اے یا ایم اے کے بعد اپنے گھر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ ان ہی میں سے چند ایسی ہوتی ہیں جو اپنے شوق مطالعہ اور ماحول کے زیر اثر ادب کی طرف اپنے ذہنی رجحان کے سبب مائل ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کی خاطر خواہ ہمت افزائی بھی نہیں ہوتی۔ کیا لکھیں، کہاں چھپیں، کون رسالہ ان کی ہمت افزائی کرے؟ یہ ساری رکاوٹیں ہی تو ہیں۔ مگر شکر ہے کہ ادب میں جو قد آور خواتین ہیں ان کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

اپنی زندگی کے کسی اہم واقعے کے حوالے سے انہوں نے کہا، ”غریب کی زندگی میں غربت و افلاس کے سوا کوئی ایسا چوڑا دینے والا واقعہ کبھی پیش نہیں آتا۔ لہذا میری زندگی میں بھی ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ سادہ سی، معصوم زندگی گزاردی ہے۔ نہ بہت زیادہ سفر کیا نہ دنیا دیکھی۔ بس اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست رہا۔ نہ خوشی کی تمنا نہ غم کی پروا، بس احساس کی دولت ہے جو کافی ہے۔“

دور، حاضر میں تنقیدی ادب کی کمیابی سے احمد زین الدین بھی متاثر ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے، ”اردو ادب میں واقعی تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ نقادوں نے اپنی ذمہ داری کو بڑی حد تک فراموش کر دیا ہے۔ شاید ان کا خیال یہ ہو کہ اعلیٰ پائے کی چیزیں جو انہیں سوچ اور فکر پر مجبور کریں، لکھی نہیں جا رہی ہیں۔ نظریاتی تنقید اس لئے نہیں لکھی جا رہی ہے کہ ہر ادیب اور نقاد کا نظریہ بڑی حد تک تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ازم والی بات کہاں رہ گئی ہے۔ اب تو مغربی ادب سے مستعار لیا ہوا نقطہ نظر رواج پا رہا ہے۔ ہمارے نقاد ان ہی کا حوالہ دے کر خوش ہوتے ہیں۔ گویا ہمارے ادب میں کچھ رہا ہی نہیں۔ حالاں کہ یہ روش بڑی افسوس ناک ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ہمارے ادب کا مسبوطہ تجزیہ یا تنقید پیش نہیں کی گئی۔ معیار کا تعین بھی نہیں ہوا۔ بس پرانوں کا نام لے کر کام چل جاتا ہے۔“

اسی طرح تراجم بھی نہیں ہو رہے ہیں۔ کیوں ترجمہ کو اہمیت نہیں دی جاتی اور اُسے تخلیق کا درجہ کیوں نہیں ملتا؟ حالاں کہ اچھا ترجمہ تخلیق سے کم درجہ نہیں رکھتا، بلکہ وہ تخلیق سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مگر نقادان ادب نہیں مانتے۔

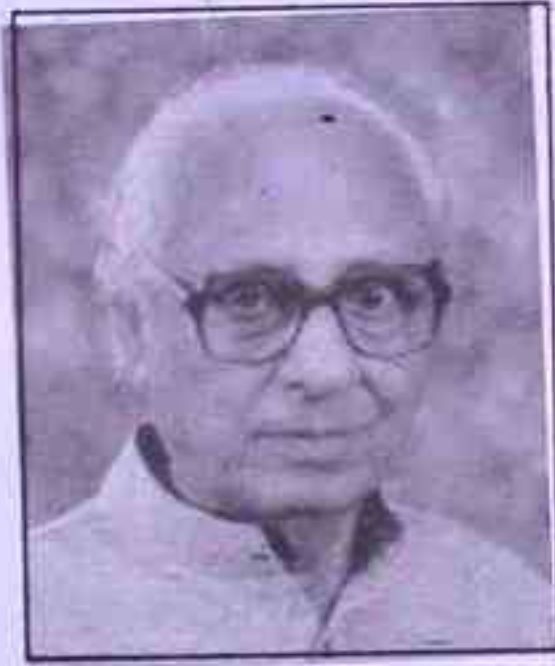
ہماری علاقائی زبانوں کے ادب کے ترجمے بھی اُس تو اتر سے نہیں ہو رہے ہیں، لہذا اردو زبان کا ادب ان کی فکر سے نابلد ہے۔ اور پکا نگت بھی نہیں پیدا ہو رہی ہے۔ مگر ان کی بڑی اہمیت اور ضرورت ہے اور اعلیٰ سطح پر ان مسائل کے بارے میں غور کرنا ضروری ہے۔“

Mr. Ahmed Zian-ud-din,

A-8 Nadeem Corner, Block "N", North Nazimabad, Karachi, 74700,  
Pakistan



اس نظر نے سرانگشت بہار  
عالم مرگِ حنا دکھایا ہے



ادیب سہیل

16/5/2001

ادیب سہیل

کراچی، پاکستان

چوارہ ضلع مولگیر، صوبہ بہار، ہندوستان میں ۲۲ / جون ۱۹۲۷ء کے دن ایک بچہ سید محمد ظہور الحق پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۴۳ء میں میٹرک کر کے کلکتہ جا کر آئی کام (I Com انٹرکامرس) کرنا چاہا۔ مگر کلکتہ میں جاپانیوں کی شدید بمباری کی وجہ سے اُسے ۱۹۴۴ء کے اوائل میں دلی جانا پڑا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ وہاں سے مارچ ۱۹۴۶ء میں پھر وطن واپس آنا پڑا۔ ابا نے طے کر لیا تھا چنانچہ ظہور الحق کے بڑے چچا کی صاحبزادی عارفہ خاتون سے ان کا عقد کر دیا گیا۔ بڑے چچا اور ان کے اہل خاندان کی بود و باش ضلع ”گیا“ کے گاؤں ”کوسی“ میں تھی۔ اب ظہور الحق چھتر (۷۶) برس کے ہو گئے ہیں۔ ان کی پانچ بیٹیاں..... نرہت، رباب، ترانہ، حنا اور گیتی ہیں اور دو بیٹے..... آفتاب عالم اور انتخاب عارف رومی ہیں۔ آفتاب ان دنوں ریڈیو پاکستان کراچی میں انجینیئر کے عہدے پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ ہی ظہور الحق آج اردو ادب میں ادیب سہیل کے قلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ادیب سہیل نے جوانی میں ترقی اردو پاکستان، کراچی میں شعبہ تحقیق سے وابستہ ہیں ایک عمر اردو ادب کے پودے کو شجر بنانے کی آبیاری میں صرف کر دی ہے۔ انہوں نے کس صنف میں نہیں لکھا..... افسانہ نگار ہیں، شاعر اور ڈرامہ نویس ہیں۔ ڈرامہ نویسی میں تو انہوں نے تحقیقی کام کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے



لئے اس شعبے میں اتنی قندیلیں روشن کی ہیں کہ دو چار جملوں میں انہیں خراج تحسین پیش کرنا ان کے ساتھ نا انصافی کرنا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار ان جیسے ادب کے زعماء کو ڈھونڈ نکالیں۔ انہیں عزت و خلعت کے ساتھ وہ سہولتیں فراہم کریں کہ ان کے جلائے ہوئے چراغوں سے اگلے چراغ روشن ہوتے چلے جائیں۔ اکاڈمیوں کے سربراہان اگر اپنے حجرے سے باہر نکلیں اور باہر نکلنے کی انہیں فرصت نہ ہو تو اپنی کھڑکی سے باہر جھانک لیں تو ان کے اپنے سورج کی روشنی میں بھی یہ روشن فانوس انہیں نظر آ ہی جائیں گے۔

میں جناب سہیل ادیب سے ۲۰۰۷ء میں ملی تھی جب میری دو کتابیں ”سنخور حصہ چہارم“ اور ”گفتنی حصہ اول“ طباعت کے مراحل میں تھیں ورنہ بہت پہلے ان کے قدموں میں اپنی عقیدت کے پھول بچھا دیتی۔ اور اب یہی کہہ کر اپنی شرمندگی کم کر لوں۔ کہ دیر آید درست آید۔

تو میں اب آپ کو سہیل ادیب سے ملوا رہی ہوں جو بتا رہے تھے..... ”میری ادبی زندگی کا آغاز اُس وقت ہوا جب میں ابھی آٹھویں یا نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ ایک فلمی پرچہ ذوق نکلتا تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ ابتدا افسانہ نگاری سے کی اور یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء تک چلتا رہا۔ گاہے گاہے اب بھی افسانہ لکھتا ہوں۔ میرے ابتدائی افسانے ’انجام ویکلی‘ دہلی میں ذکی چواروی کے نام سے، اس کے بعد سہیل ادیب یا ادیب سہیل کے نام سے ’خیابان‘ اور ’نظام‘ ممبئی، ’جدید اردو‘ کلکتہ اور ’دل ربا‘ ڈھاکہ میں شائع ہوئے۔“

”آپ شاعر بھی تو ہیں“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں،“ وہ مسکرائے۔ ”۱۹۴۸ء سے باقاعدہ شاعری کی طرف آ گیا تھا۔ ابتدا میری غزلیں اور نظمیں ماہنامہ ’افکار‘ کراچی میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۳ء سے تاحال اردو کا کوئی ایسا موقر جریدہ: فنون، سیپ، قند، اکادمی ادبیات، ماہ نو، افکار، مکالمہ، تسطیر، علامت (کراچی)، آئندہ، روشنائی، کہکشاں، سفیر اردو، لفظ، لوگ (اسلام آباد) نہیں جن میں ایک تسلسل سے میرا کلام شائع نہ ہوا ہو۔ ان اعداد و شمار کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی بھی معاصر شاعر سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں لکھا۔ تقریباً اکثر اہم انتھالوجی (anthology) میں میری تخلیقات شامل ہیں۔“

”آپ نے موسیقی اور ڈرامے پر بھی کام کیا ہے۔ کچھ ان موضوعات کے بارے میں بتائیے۔“

”موسیقی کے حوالے سے لکھی گئی نثر و نظم کے بارے میں یہاں مختصراً یہ ہی کہوں گا کہ اس موضوع پر پچاس (۵۰) برسوں سے مسلسل مضامین لکھتا آ رہا ہوں، اس عرصے میں ’فنون‘ لاہور اور ’سیپ‘ اور ’علامت‘ کراچی اور ’تحریر‘ میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس حوالے سے میری تحریروں کو اختصاص حاصل ہے۔

ڈراموں پر میرا کام تحقیقی نوعیت کا ہے۔ میں نے پہلی بار پنڈت کیشورام بھٹ کے ڈرامے



’اندھوں کو آنکھ‘ (۱۸۸۰ء) کو اردو میں متعارف کرایا جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی ’اردو‘ (۱۹۸۵ء) میں بعنوان ’تاریخ اردو ڈرامہ کی ایک گم شدہ کڑی‘۔ اندھوں کو آنکھ شائع ہو چکا ہے۔ ڈرامے کے موضوع پر اس کے علاوہ بھی کئی مضامین ’اردو ڈرامہ‘ کے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ’اکادمی ادبیات پاکستان‘، ’اسلام آباد‘، ’سیپ‘ اور ’آئندہ‘ کراچی کو اختصاص حاصل ہے۔

میں نے فنِ رقص پر بھی ایک تسلسل سے مضامین لکھے ہیں ان موضوعات میں بھرت تائیم، آرڈریسی، کتھک، کتھاکلی، کچی پڈی، موہنی اتھ، منی پوری اور اورینٹل اسکول آف ڈانس سے متعلق مضامین ہیں۔ یہ سب کے سب ’سیپ‘، ’علامت‘، کراچی اور ’تخریر‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ریڈیو پر لاتعداد پروگرام ادب کے حوالے سے کیئے ہیں۔ فی وہ پر ’پاکستانی ادب سال بہ سال‘ (۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۳ء) کے عنوان سے تقریباً ایک سال تک ماہ بہ ماہ ایک گھنٹے کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوتا رہا۔ اس کے لئے اسکرپٹ میں نے لکھے۔ جن لوگوں نے اس پروگرام کو دیکھا وہ اس کی افادیت و اہمیت کو جانتے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن کے ایک پروگرام ’ساز کہتے ہیں‘ کے لئے ہر ہفتہ آلات موسیقی کے حوالے سے ایک فیچر تقریباً ایک سال تک لکھا۔ اس کے بعد ’سر کا سفر‘ کے عنوان سے مشاہیر موسیقی پر فیچر نشر ہوتے رہے۔

فی وی کراچی سے جب محترمہ حسینہ معین کا سیریل ’ڈرامہ‘ میاں تان سین‘ پیش کیا گیا تو ریسرچر (researcher) کی حیثیت سے میرا نام سر فہرست تھا۔ حسینہ معین صاحبہ نے بڑی فراخ دلی سے میری معاونت کا اعتراف اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ یہ ان کی بڑائی ہے۔

یہ ہی نہیں سید پور (سابق مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش کا ایک شہر) میں ڈرامے اسٹیج کیئے جانے کے لئے آرٹ سنٹر کے نام سے جب ایک ادارہ قائم کیا گیا تو اس کے سکریٹری معروف افسانہ نگار احمد سعدی مرحوم تھے اور میں نائب صدر تھا۔ آرٹ سنٹر کے پلیٹ فارم سے ’سراج الدولہ‘، ’ٹیپو سلطان‘ وغیرہ ڈرامے پیش کیئے گئے۔ آرٹ سنٹر کے ڈراموں کی پیشکش کی خصوصیت یہ تھی کہ دونوں میں ایک دن ڈرامہ اردو میں اور ایک دن بنگلہ زبان میں کھیلا جاتا تھا۔

شاعری کے سلسلے میں عرض ہے کہ ’بکھراؤ کا حرف آخر‘ دست میرا واحد مجموعہ کلام ہے جس میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے وقتوں پر نظمیں شامل ہیں۔ ناقدین کے مطابق سانچہ ستون ڈھاکہ پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔

سلطان صاحبہ! میں نے پچاس (۵۰) برسوں میں جتنی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں ان کے کئی مجموعے آسانی سے تیار ہو سکتے ہیں جو ابھی طباعت کے منتظر ہیں۔ ان ہی نظموں میں ایک طویل خود نوشت ’غم زمانہ بھی سہل گزرا‘ بذاتِ خود ایک مکمل کتاب کی ضخامت رکھتی ہے۔ موسیقی کے حوالے سے بہت سی خوب صورت راگنیوں پر نظمیں ہیں جن میں ’بھیرویں‘، ’گن کلی‘، ’اساوری‘، ’ٹوڑی‘، ’ایکین‘، ’کدارا‘ اور



بہاگ ہیں۔ ان نظموں کا ایک مجموعہ بھی ایک کتاب کی ضخامت رکھتا ہے۔

میں نے انگریزی، یورپی اور امریکی اور مصری مشاہیر شاعر و ادیب پر بطور خاص مضامین کی صورت میں کام کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر نو بل انعام یافتہ ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے جریدے 'اوراق' میں مسلسل جن شاعر و ادیب پر مضامین لکھے ان میں بورکا، پیلونزو دوا، اوکناویو پاز، ہرمن ہیے، کمیو، سارتر، ایرن کریمیر، گریگوری کورسو، سمونیل بیکٹ، نڈائین گوڈائمر، نٹ ہمسن، ناظم حکمت اور نجیب محفوظ ہیں۔ تراجم کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اب یہ کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔

میں نے پوچھا، ”ادیبوں کی گروپ بندی کا شکار تو آپ نہیں ہوئے؟“

کہنے لگے..... ”ادیبوں کی گروپ بندی کسی نہ کسی عنوان سے ہر زمانے میں پائی گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ادبی معرکے کیسے وجود میں آتے۔ ادب کی تاریخ اس طرح کی معرکہ آرائیوں سے بھری پڑی ہے۔ اب بھی مختلف ادبی اداروں اور تحریکات کے نام پر گروپ بندیاں ہی تو سامنے آتی ہیں۔ اگر مختلف گروپ میں مسابقت کی سطح پر کام ہوتے رہیں تو مثبت ہے۔ لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تو منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ادیبوں کے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بننے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے درمیان اب ایسی کوئی تحریک ادب فعال نہیں جسے عرف عام میں ’مین اسٹریم‘ (main stream) خاص دھارا کا درجہ حاصل تھا۔

اور پھر میں نے ادب کے کاموں میں غیر ضروری شہرت اور مالی منفعت کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ میرے نزدیک ادب کرنا اور زندگی کرنا ایک طرح کی ریاضت ہے۔ آج کی روش کے مطابق شہرت کے پیچھے بگ بگنا اور ترجیحی مقام دینا، میری طبیعت کو اس نہیں آیا۔“

اردو کے مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کہا..... ”برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں جہاں تک یاد پڑتا ہے اب سے پہلے کبھی اردو سرکاری زبان نہیں رہی۔ یہ عوام الناس کے درمیان مقبول رہی اور آج اردو زبان جو کچھ ہے اپنی اسی روش کی وجہ سے ہے۔ پاکستان نے تو خیر سے آئین ۱۹۷۳ء میں اسے قومی زبان کا درجہ دے دیا ہے جس سے اسے ایک طرح کا تحفظ فراہم ہو گیا ہے۔

اردو کی بقا کو کوئی خطرہ نہیں۔ کل بھی عوام الناس کے درمیان رہ کر یہ پلتی، بڑھتی اور پھولتی پھلتی رہی ہے اور آج بھی یہ اندرون ملک اور بیرون ملک پھیل رہی ہے۔ اگر یہ پھیل اور بڑھ نہیں رہی ہے تو پھر کیوں کر دنیا بھر کی زبانوں میں یہ تیسرے نمبر پر ہے؟“

اگلے سوال کے جواب میں جناب ادیب سہیل صاحب نے کہا..... ”اردو کے رسم الخط بدلنے کا قضیہ بہت پرانا ہو چکا ہے اور اپنی موت آپ مر چکا ہے۔ اب اسے اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر عربوں نے عربی رسم الخط اور ایرانیوں نے فارسی کا رسم الخط بدلنے کا نہیں سوچا، پھر اردو کے بارے میں اس طرح سوچنے کی ضرورت کیا ہے؟ ترکی نے اپنے اوپر جذباتی طور پر یہ ظلم کیا۔ لیکن معاملہ



آدھاتیتر آدھاتیتر ہو کر رہ گیا۔ شاید ایسے موقع کے لئے یہ محاورہ زباں زد ہو۔۔۔۔۔ کو اچلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔“

وہ اپنے پسندیدہ ادیب و شاعر کے بارے میں کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔ ”اردو کے میر، غالب، اقبال، یگانہ اور فیض میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ فارسی شعرا میں حافظ، امیر خسرو، بیدل، غالب اور اقبال سرفہرست ہیں مغربی شعرا میں بورکا، پیلو، نرودا، ناظم حکمت، اوکتاویو پاز، ایرین کریم، گریگوری کورسو وغیرہ، بنگالی زبان کے نیگور اور نذر الاسلام اور کوئی جسیم الدین کو بھی جم کر پڑھا ہے۔ چینی ادیب لوہسوں، مصری ادیب نجیب محفوظ اور پنجابی ادیب امرتا پریتم کی تخلیقات جہاں مل جائیں بہ اشتیاق پڑھتا ہوں۔“

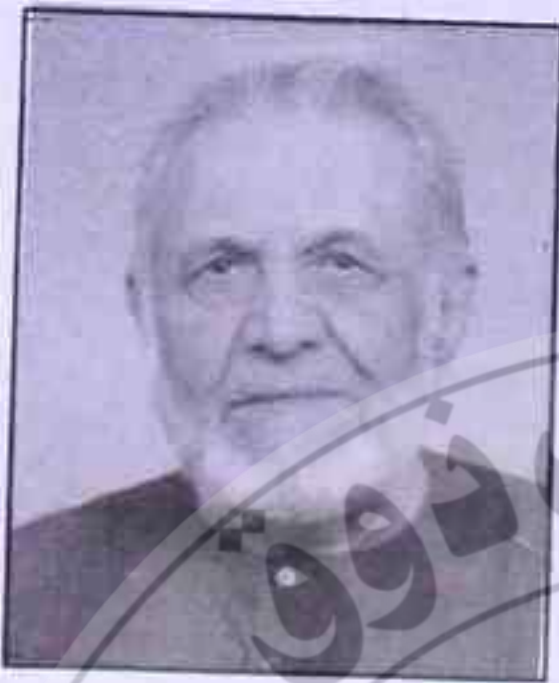
میں نے چائے پیتے ہوئے ان سے کہا۔ ”اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائیں۔“  
ہنس کر کہنے لگے۔۔۔۔۔ ”ہوایوں کہ شادی کے بعد پہلی عید منانے کے لئے بڑے رنگ اور منصوبے کے ساتھ سسرال گیا۔ عید سے ایک دن پہلے سر شام اپنے رفیق (بعد میں ہم زلف) یوسف امام کے ساتھ چاند دیکھنے کے لئے گھر کے سامنے والی خالی پڑی زمین کی طرف نکل گیا۔ چاند دیکھنے کے بعد جیسے ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے میں کسی تیز نوکیلی شے کے چبھنے کا احساس ہوا۔ دیکھا سانپ کاٹ کر تیزی سے گزر رہا ہے۔ میں نے یوسف سے آستین والی قمیص اُتروائی۔ اور خود انگوٹھے سے قدرے آگے کے حصے کو مضبوطی سے گرفت میں لے لیا۔ یوسف سے کہا کی قمیص کی آستین کو پوری طاقت سے نخنے سے گھٹنے تک پوری پنڈلی میں لپیٹ دیں۔ پھر یوسف کے سہارے تیز تیز گھر پہنچے۔ پوری بستی میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ خویش واقارب کے چہروں پر ایک تشویش کی لہر نمایاں ہو گئی۔ فوراً ہی اوجھا بلوایا گیا جو سانپ کا زہر اُتارتا ہے۔ مجھے کھلی پیٹھ ایک تخت پر بٹھایا گیا۔ اوجھا نے کوئی منتر پڑھ کر میری پیٹھ پر پیتل کی تھالی چپکائی۔ پھر ذرا ہٹ کر وہ منتر پڑھتا جاتا اور تھالی پر کنکر مارتا جاتا۔ جب تھالی زمین پر گر گئی تو اُس نے بڑی تلخ سی شے پانی میں ملا کر پینے کو دی اور پھر گھر کی بڑی بوڑھیوں نے ٹوکے کے طور پر نہ جانے کتنے تلخ مشروب پلوادے۔ میں بے حیل و حجت، جان پر پڑی تھی اس تلخ ترشے کو پیئے جاتا تھا۔ تمام رات وقفے وقفے سے اسی عنوان کی چیزیں پلائی جاتی رہیں۔ پاس کے سرکاری اسپتال سے ایک ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ انہوں نے زہر کی کاٹ کے لئے ایک انجکشن دیا۔ رات بھر مجھے جگائے رکھا گیا۔ اوجھا کہہ گیا تھا کہ بابو جی کو نیند نہ آنے پائے۔

عید آئی اور گزر گئی۔ شادی کے بعد کی پہلی عید کے منصوبے کے رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا اور میری ترنگمیں سہم کر زنگاہوں کے چھجے پر جا بیٹھی تھیں۔ مگر میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ جسے باقی رکھنا چاہتا ہے اُسے کون مار سکتا ہے۔ اللہ کو مجھ سے کچھ اہم کام کرانے تھے سو میں نے کیئے۔“

Mr Adib Suhail,

D-159, Block 7, Gulshan-e-Iqbal, Karachi, 75300, Pakistan.





بچھو دے اندر کس عمل کے لئے بچھا ہے  
موت پڑھنے پڑھانے کے لئے نہیں۔ جو لوگ پڑھنے پڑھانے کو  
عمل سمجھتے ہیں وہ عمل کے لئے دیا گیا وقت بھرتل میں صاف  
کر دیتے ہیں۔

مری تحریریں مفرے اک صورتِ خرابی کی  
میدانِ برقِ خیزن کا ہے خونِ گرمِ دستان کا  
غائب

اشفاق احمد

لاہور، پاکستان

جناب اشفاق صاحب کا تعارف لکھنے سے قبل میں ان کے الفاظ میں ”صوفیا کے تیسرے  
راستے“ کی وضاحت کر دوں کیوں کہ لوگ اشفاق احمد صاحب کو صوفی کہتے ہیں۔ اور صوفی اشفاق احمد  
فیض احمد فیض کو ”ملا متی صوفی“ کہتے ہیں۔  
”میرا اور فیض صاحب کا نظریاتی اختلاف ہے (۱)۔ میں ایک شرعی آدمی ہوں اور فیض  
صاحب ایک ملا متی صوفی ہیں۔ تاریخ میں ڈھونڈنے سے آپ کو کئی ایک مثالیں مل جائیں گی جہاں ایک  
شرعی اور صوفی کی دوستی ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آخری منزل میں ملے  
کیں۔ لیکن ایک شرعی آدمی کی کسی ملا متی سے دوستی نہیں ہوئی۔ فیض صاحب نے صوفی ازم کا اکتساب کسی  
سلسلے میں بیعت کر کے نہیں کیا۔ انہوں نے صوفیا کا ایک تیسرا راستہ اختیار کیا ہے جو مجاہد سے پر محیط ہے۔  
اسے بزرگانِ دین و ادب ”تواضع“ کا نام دیتے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب مہاجر کی فرماتے ہیں کہ ایک دم ولایت حاصل کرنے کے لئے ادب  
اور خدمت کو اختیار کرنا چاہیے۔ طریقِ تصوف کے طالب کو چاہیے کہ ادب ظاہری اور باطنی نگاہ میں

۱۔ ماہنامہ ”بیاض“ لاہور، شمارہ فروری ۱۹۹۹ء، ص ۸۷



رکھے۔ ادب ظاہری یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ محسن ادب و کمال تواضع و اخلاق سے پیش آئے اور ادب باطنی یہ ہے کہ تمام اوقات و احوال و مقامات پر با حق رہے۔

یہ ادب، یہ صبر ایسا دھیمہ پین، اس قدر درگزر، کم خنی اور احتجاج سے گریز یہ صوفیوں کے کام ہیں۔ ان سب کو فیض صاحب نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اوپر سے ملا متی رنگ یہ اختیار کیا ہے کہ اشتراکیت کا گھنٹہ بجاتے پھرتے ہیں کہ کوئی قریب نہ آئے اور محبوب کا راز نہ کھل جائے۔

اشفاق احمد آگے لکھتے ہیں: ”میرا تعلق چوں کہ اونچے خانوادے سے ہے اور میں مسلمان بادشاہوں کا پرستار ہوں اور ملوکیت ہی کو اسلام سمجھتا ہوں اس لئے میری اور بابائیل کی نہیں بن سکتی۔ لیکن کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموش اور چپ چاپ میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضور سرور کائنات کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلام ہوتے۔ جب بھی کسی بد زبان، تند خو، بد اندیش یہودی کی دراز دستی کی خبر پہنچتی تو حضور کبھی کبھی ضرور فرماتے، آج فیض کو بھیجو۔ یہ بھی دھیمہ ہے، صابر ہے، بردبار ہے اور احتجاج نہیں کرتا۔ پتھر بھی کھا لیتا ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔“

سبحان اللہ۔ آفرین ہے اشفاق احمد صاحب پر اور ان کی تحریر پر۔ کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود انہوں نے فیض صاحب کے لئے بڑے خلوص سے اپنی محبتوں کے پھول ان کی نذر کیئے۔ اور اسی صوفی ازم کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے اور محترمہ بانو قدسیہ نے میرے سوال نامے کے جواب میں ننوت اور تکبر کرنے کے بجائے مجھے اپنی محبت و شفقت سے نوازا۔

میں نے جناب اشفاق احمد صاحب کی کہانیاں پڑھی ہیں ان کی سن ۵۲-۱۹۵۱ میں لکھی ہوئی کہانیاں بھی جن میں مجھے کہانی ”داؤ“ بہت پسند آئی۔ یہ کہانی پنجاب کے اردو میٹرک کورس میں دو سال تک پڑھائی بھی گئی۔ اور پھر بقول اشفاق احمد صاحب، ”زبان کے سقم کی وجہ سے اسے نصاب سے خارج کر دیا گیا۔“ یہ کہانی اس تعارف کے آخر میں موجود ہے۔ اس میں زبان کا کوئی سقم ہو تو مجھے بھی بتائیں، مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا۔ لیکن میرا دل ایک جواری کے لئے اتھاہ محبت کے جذبے سے بھر گیا کہ وہ مجھ سے زیادہ سچا مسلمان نکلا۔

جب میں پاکستان میں تھی تو اس وقت میں نے اشفاق احمد صاحب کے ٹیلی ویژن ڈرامے بھی دیکھے ہیں۔ لیکن ان کا لکھا ”تلقین شاہ“ نہ تو ریڈیو پرسن سکی اور نہ ہی ٹی وی پر دیکھ سکی۔ میں نے پڑھا ہے کہ ”تلقین شاہ“ ریڈیو کا کامیاب ترین پروگرام تھا لیکن ٹی وی پر کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس کی وجہ اشفاق صاحب کی کیمرے کے آگے جھجک تھی۔ یہ شرمیلے مزاج کے آدمی ہیں، کیمرے کا سامنا نہ کر سکے۔

ٹیلی ویژن کے لئے ان کے لکھے ابوائے ڈرامے اور سیریل بے حد کامیاب ہوئے جن میں ”توتا کہانی“، ”سفر مینا“، ”ایک محبت سو افسانے“، ”کاروان سرائے“، ”ایک محبت سو ڈرامے“، ”حیرت کدہ“، ”من چلے کا سودا“، ”بندگلی“، ”اچھے برج لاہور دے“ اور ”ناہلی دے تھلے“ اس وقت یاد ہیں۔ آخری الذکر دونوں سیریل پنجابی زبان میں تھے۔ اور آج پنجابی کے کلاسک ڈراموں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔



اشفاق احمد کے دوست اے حمید نے لکھا ہے: ”ٹیلی ویژن کے لئے اشفاق احمد نے پونے چار سو چار سو کے قریب فیچر ڈرامے لکھے۔ اشفاق احمد نے اپنا آدھے سے زیادہ ادبی ٹیلنٹ (talent) ریڈیو، ٹی وی کی نذر کر دیا۔ ہماری ایک نسل ان ڈراموں کو ضرور یاد رکھے گی۔ اس کے بعد کی نسل اس سے محروم ہو جائے گی۔ اگر اشفاق ڈرامے لکھنے کے بجائے ناول یا افسانہ لکھتا اور اگر وہ ’ملقین شاہ‘ کے کردار کو ایک ناول کی شکل میں بیان کرتا اس کا درجہ جدید اردو ادب میں ’فسانہ عجائب‘ سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔“

جب میں اپنے ذاتی ماہنامہ ”روپ“ کی طرف سے پاکستان ٹیلی ویژن کی سالانہ تقریب انعامات کے موقع پر اسلام آباد گئی تھی وہاں میں جناب اشفاق احمد صاحب اور محترمہ بانو قدسیہ سے ملی ہوں۔ اس مدبر افسانوی جوڑے کو دیکھ کر اور ان سے گفتگو کر کے محبت کے حصول کی تشنہ کامی کو یک گونہ سیرابی ملی۔

میرے سوال نامے کے جواب میں اشفاق احمد صاحب لکھتے ہیں: ”میرا پورا نام اشفاق احمد خان ہے۔ ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب کے قصبے مکتسر میں ۲۲ / اگست ۱۹۲۵ء کے دن پیدا ہوا۔ وہیں سے ۱۹۴۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اردو میں ایم اے کیا۔ روم یونیورسٹی، اٹلی سے اطالوی زبان میں ڈپلوما لیا۔ اور گرینوئل یونیورسٹی پیرس، فرانس سے فرانسیسی زبان میں ڈپلوما لیا۔ براڈ کاسٹنگ کی ٹریننگ نیویارک یونیورسٹی، امریکہ میں حاصل کی۔“

قیام پاکستان کے فوراً بعد وہ فیروز پور سے لاہور آ گئے۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہوا جب ان کا پہلا افسانہ ”توبہ“ مولانا صلاح الدین کے جریدے ”ادبی دنیا“ میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے: ”میں نے پنجابی زبان میں شاعری بھی کی ہے اور میرے مجموعہ کلام کا نام ’کھٹیاوٹیا‘ ہے۔ ویسے بنیادی طور پر میں نثر (فکشن) کا آدمی ہوں۔ اور میرے افسانوں، ڈراموں اور ناولوں پر مشتمل اب تک بائیس (۲۲) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔“

انہوں نے ”داستان گو“ کے نام سے بانو قدسیہ کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ نکالا تھا۔ اس میں ”حیرت کدہ“ کے نام سے وہ ایک فیچر نما مضمون بھی لکھتے تھے۔ یہ ایسے سچے آئینی واقعات پر مشتمل مضامین ہوتے تھے جو کسی نہ کسی کے ساتھ گزرے ہوتے تھے۔ بعد میں اشفاق صاحب نے اسی عنوان سے ٹیلی ویژن پر ڈراموں کی ایک سیریز بھی لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک فلم بھی بنائی۔ کہانی اور ہدایت کاری بھی ان کی اپنی تھی۔ مگر آرٹ فلمیں پاکستان میں کہاں کامیاب ہوتی ہیں۔ سوان کی فلم بھی کامیابی کا زینہ طے نہ کر سکی۔ مگر ان کی تخلیقی سرگرمیوں نے ان کا نام زندہ رکھا۔ وہ خود کو اسی زمانے سے منوا چکے تھے جب انہوں نے افسانہ ”گڈ ریا“ لکھا تھا۔ اس افسانے نے مقبولیت کی سند حاصل کر لی تھی۔ سعادت حسن منٹو نے بھی یہ افسانہ ممبئی کے دوران قیام میں پڑھ لیا تھا۔ جب وہ لاہور آئے تو انہوں نے اشفاق احمد کے سامنے اس افسانے کی بہت تعریف کی۔ بقول اے حمید، ”اشفاق شرما گئے۔ منٹو صاحب نے عقابی آنکھوں سے گھور کر اشفاق کی طرف دیکھا اور بولے: ”شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے اچھا افسانہ لکھا ہے اور بس۔“



اشفاق احمد نے سفر نامے بھی لکھے ہیں لیکن بہت کم۔ اگر وہ لکھتے تو بڑے دل چسپ سفر نامے لکھ سکتے تھے۔ اٹلی کے قیام کے واقعات پر ان کا سفر نامہ بعنوان 'سواد رومۃ الکبریٰ' تھا۔ دوسرا سفر نامہ ایک مضمون کی شکل میں لکھا تھا جو کسی رسالے میں چھپا تھا۔ اس میں نیویارک میں قیام کے زمانے کا حال تھا۔ اس حوالے سے جناب اے حمید نے اپنی مرتب کردہ کتاب "اشفاق احمد... شخصیت اور فن" (۱) میں لکھا ہے، "اٹلی کے سفر نامے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک تخلیق کار مکمل ادیب کے سفر نامے میں ہوتی ہیں۔ نیویارک پر کس نے سفر نامہ نہیں لکھا۔ اس شہر پر تو ایسے لوگوں نے بھی لکھا ہے جو وہاں نہیں گئے یا صرف اتنی دیر تک کے لئے گئے ہیں کہ ایک جہاز سے اتر کر کچھ وقت ٹرانزٹ لاؤنج (transit lounge) میں گزارا، اور پھر دوسری فلائٹ (flight) پکڑ کر وہاں سے نکل گئے۔ لیکن جو لوگ نیویارک میں باقاعدہ رہے، وہاں زندگی کا کچھ عرصہ گزارا، ان لوگوں کے سفر ناموں میں بھی ہمیں وہ منظر اور تصویریں نظر نہیں آئیں جو اشفاق احمد نے اپنے قیام نیویارک والے مضمون میں ہمیں دکھائی ہیں اور جو اس شہر کی حقیقی اور سچی تصویریں ہیں۔ میں اس کبوتر جتنے موٹے چوہے کو نہیں بھول سکتا جو اشفاق احمد کو اپنے نیویارک کے اپارٹمنٹ کے کچن میں ملا تھا۔ کیا نقشہ کھینچا ہے اس نے نیویارک کے ان خستہ حال اپارٹمنٹوں کا جو نیویارک کی حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں، جن میں نیویارک کی ننانوے (۹۹) فی صد آبادی زندگی بسر کرتی ہے۔"

"سفر و سفر" بھی اشفاق احمد کا سفر نامہ ہے جو پاکستان کے شمالی پہاڑی علاقوں میں سیاحت کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ مسعود قریشی اور ممتاز مفتی بھی تھے۔ یہ سفر نامہ وہاں کے حسین مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے ایک رپورٹاژ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔

اے حمید لکھتے ہیں، "کہتے ہیں سفر میں ایک آدمی کی خامیاں اور خوبیاں بڑی واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ میں نے اشفاق احمد کے ساتھ ایک دو سفر کئے ہیں۔ دوران سفر بھی میں نے اسے ویسا ہی شگفتہ مزاج، ہمدرد دوست اور خوب صورت دل چسپ باتیں کرنے والا پایا ہے جیسا وہ عام زندگی میں ہے۔ میں اس کے لئے کبھی وبال جان بھی بن گیا ہوں لیکن اشفاق کی خوش مزاجی دوران سفر اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے برقرار رہی..."

اس سے پہلے کہ اشفاق احمد صاحب کے جوابات برائے سوال نامہ "گفتنی حصہ دوم" آپ تک پہنچاؤں میں آپ کو بتاتی چلوں کہ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کے طالب علم تھے ان دنوں بانو قد سید ان کی ہم جماعت تھیں۔ بانو قد سید بھی فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ ان کا بچپن اور لڑکپن وہیں گزرا۔ انہوں نے بھی شادی سے پہلے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی مگر اشفاق احمد کی رفاقت نے انہیں ایک آسودہ ماحول فراہم کیا اور ان کی فنی بصیرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

۱۔ "اشفاق احمد... شخصیت اور فن"۔ پاکستانی ادب کے معمار سر سید، تہذیب اور محمد شاہد حمید، ناشر اکادمی

ادبیات پاکستان، اسلام آباد



ان کا ایک خوب صورت گھر وندا ہے جس کا نام ”داستان سرائے“ ہے۔ داستان سرائے کے گیٹ (gate) سے آپ داخل ہوں تو ڈرائنگ روم ملے گا جس کے ساتھ چھوٹا کھانے کا کمرہ اور اس کمرے کے ساتھ کوریڈور (corridor) سے گزر کر فرشی نشست والا کمرہ ہے جو اشفاق احمد اور بانو آپا کی آرام گاہ اور گوشہ عافیت بھی ہے۔ اس کمرے میں کتابوں سے بھری الماریاں ہیں۔ اس کمرے میں کتابوں کی خوشبو کے ساتھ ساتھ ان دونوں محبت کرنے والے جوڑے کے خلوص کی خوشبو بھی رچی بسی ہے۔ دونوں ہی دوسروں کے سکھ دکھ بانٹتے ہیں۔ مگر سنا ہے کہ اب اشفاق احمد صاحب صرف تصوف کی دنیا میں خود کو محدود کر کے خوش ہیں۔ اب وہ افسانہ لکھنے سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور شاعری؟ شاعری سے بھی ناٹھ توڑ چکے ہیں۔ ان کی ایک آزاد پنجابی نظم پڑھتے چلے۔ نظم کا ترجمہ معروف شاعر محمد خالد احمد، مدیر ماہنامہ ”بیاض“ لاہور نے کیا ہے۔

اردو (ترجمہ)

پنجابی

|                         |                                   |
|-------------------------|-----------------------------------|
| بندیاں نوں کیہ کہنا     | کیا بندوں سے کہئے                 |
| کا بد اغصہ کرنا         | غصہ کس پر کیجئے                   |
| میرے نال نے چونک دی ہتی | مجھ سے چوک کی ہتی تک              |
| کردی نت دھرو            | کرتی ہے فریب کمال                 |
| جذروں وی لنگھن لگاں     | جب بھی گزرنے لگتا ہوں، کر لیتی ہے |
| رتی کر لئے او           | آنکھیں کر لیتی ہے لال گال         |

میرا سوال تھا، ”اردو ادب سے ناٹھ جوڑ کر کیسا لگا؟“

”بہت اچھا۔ فخر ہے مجھے۔ اردو ادب اپنا کر ہی تو میں نے شہرت حاصل کی ہے اور اسی کے سہارے اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کی ہے۔“

ادیبوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں کہتے ہیں۔ ”ادیبوں کی گروہ بندی نے دنیا کی ہر زبان کے ادب کو بے پناہ فائدہ پہنچایا ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان زبانوں کے قلم بردار سپاہیوں نے ادب کے میدان میں ایک دوسرے پر بھرپور حملے کر کے اپنی اپنی زبان کو معلومات، محاورات، ذخیرہ الفاظ اور تلمیحات سے مالا مال کر دیا۔ اسی طرح اردو ادب کے جنگجو نو پسندگان نے ایک دوسرے کی ججیوں، ملا متیں اور شیخیاں رقم کر کے زبان اور بیان کو بڑی وسعتیں عطا کیں۔ مزاج میں طعن، تشنیع، طنز اور شخصوں نے بڑی رنگینیاں پیدا کیں۔ یہ ساری نعمتیں گروہ بندی کی بدولت حاصل ہوئیں۔“

اردو کے مستقبل اور رسم الخط کی تبدیلی کے حوالے سے انہوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ ”اردو کا مستقبل ہندوستان میں ضرور تاریک ہے بلکہ وہاں پر تو اس کا حال بھی تاریک ہو گیا ہے۔ لیکن پاکستان، امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں اس کی پزیرائی میں اضافہ ہوگا۔ یہ بڑی منہلی زبان ہے۔ اس کا کوئی مستقل گھر نہیں ہے۔ لیکن یہ سارے دلوں کی رانی بن کر حکم رانی کرنے لگی ہے۔ اور کوئی



اسے اپنی راجہ حسانی کی رانی جان کر اس کے آگے سیس نوانے لگ جاتا ہے۔

اردو رسم الخط بدلنے کا خیال آپ کے ذہن میں کدھر سے آ گیا۔ تعجب!! اگر ہم اردو کا رسم الخط تبدیل کر کے انگریزی، جاپانی، چینی، گورکھی کے رسم الخط میں منتقل کر دیں تو کیا اردو ایک طاقت ور زبان بن جائے گی؟ یا اس کی تدریس میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی؟ رسم الخط بدلنے کی صورت تو کچھ ایسی ہوگی جیسے کوئی عورت اپنی سہیلی سے کہے کہ میں نے اپنے خاوند کا لباس اور اس کی شکل و صورت اس طرح تبدیل کر دی ہے کہ اب وہ میرے خاوند ہی نہیں لگتے۔ ہر کوئی مجھے روک کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کے ساتھ گھوم رہی ہو؟ ترکی نے اپنی زبان کا رسم الخط تبدیل کیا تھا ان کو ائیر میل (air mail) خط لکھ کر پوچھ لیں کہ بھائی ترک صاحب رسم الخط تبدیل کرنے کے بعد آپ نے کس قدر ترقی کی اور کون کون سی ایجادات و اختراعات کر کے دنیا میں مقام بلند حاصل کیا اور اس تبدیلی کی وجہ سے شرح خواندگی میں کتنا اضافہ کیا؟ اور کیا اپنی زبان کی یورپی شہادت کی وجہ سے یورپیٹین یونین نے ترکی کو اپنے ممبر کے طور پر قبول کر لیا ہے؟ حیران ہوں کہ یہ خیال آپ کے ذہن میں کیوں کر آیا؟ کیا امریکہ کی آب و ہوا کا اثر ہے؟

”جی محترم اشفاق احمد صاحب“ میں نے وضاحت کی، ”یہ امریکہ کی آب و ہوا کا اثر نہیں۔ اس المیہ کی بازگشت تو برطانیہ اور ہندوستان میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ اس پر مذاکرے ہوئے ہیں اس پر سمینار منعقد ہوئے ہیں۔ مجھے بھی ایک پروفارما (proforma) لندن برطانیہ سے بھیجا گیا تھا تب ہی میں نے اپنی دونوں کتب، ”سنخور حصہ پنجم“..... شعرا و شاعرات کا تذکرہ اور ”گفتنی حصہ دوم“..... نثر نگاروں کا تذکرہ میں یہ سوال بھی شامل کیا ہے۔ اور اب آپ ان دونوں کتب میں اس سوال کے جواب میں نوے (۹۰) فی صد جواب نفی میں پائیں گے اور اس ضمن میں کیا ہو رہا ہے اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے گا۔“

میں نے ان سے ان کے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں پوچھا جن کی تحریریں وہ چاہتے پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا..... ”اردو نثر میں رفیق حسین، پھر مصنف تذکرہ غوثیہ پھر محمد خالد اختر؛ شاعری میں اقبال، غالب، نظیر اکبر آبادی؛ غیر ملکی مصنفوں میں دستو فسکی، ژولگ، سلما نگراف (سوڈن) اور میل ول (امریکی) کی تحریریں اور کلام مجھے پسند ہے۔“

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا..... ”میری زندگی کا یادگار اور حیران کن واقعہ یہ ہے کہ میں ہوں اور پوری طاقت کے ساتھ ہوں۔ پھر میں نہیں ہوں گا اور اپنی پوری طاقت اور صلاحیت کے ساتھ نہیں ہوں گا۔“

اشفاق احمد نے خود کو ہمیشہ مصروف رکھا۔ افسانے لکھنے کے علاوہ انہوں نے تراجم بھی کیئے۔ ارنسٹ ہیمنگ وے (Ernest Hemingway) کے ناول ”اے فیرویل ٹو آرمز (A Farewell to Arms)“ کا بعنوان ”وداع جنگ“ اردو میں ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں شائع ہوا۔ انہوں نے ازرتاشی کے ناول ”داگولڈن ہاکس (The Golden Hawks)“ کا ترجمہ ”چنگیز خان کے سنہرے شاہین“ کے نام سے کیا۔ ہیلن سیکٹر کی تراسی صفحات کی کتاب ”گیٹنگ اے لانگ ودھ اورس



(Getting Along With Others) کا ترجمہ ”دوسروں سے نباہ“ کے عنوان سے کیا اور اس کے ترجمے کا حق ادا کر دیا۔

وہ کئی ایک اداروں کے اعزازی رکن ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں حکومت پاکستان نے پاکستان کے سب سے بڑے سول اعزاز ”تمغہ حسن کارکردگی“ سے ۱۹۷۹ء میں نوازا۔ مگر ان کا سب سا بڑا اعزاز یہ ہے کہ یہ پڑھے لکھے طبقے میں ایک معتبر اور دانش ور کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی بات کو دھیان سے سنا جاتا ہے اور اس پر توجہ دی جاتی ہے۔

Mr. Ashfaq Ahmed,

Dastan serai, Feeders of Mass Media, 121-C, Model Colony,

Lahore, 54702, Pakistan.

داؤ

تائی کس دیس کی رہنے والی تھی، کدھر سے آئی تھی اور اس کا نام کیا تھا، اس کے بارے میں گاؤں کا کوئی آدمی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا اسے تائی کہہ کر بلاتا اور تائی کہہ کر ہی ہاک مارتا اور چوکیدار کی کتاب میں بھی اس کا نام تائی بہت نگینہ درج تھا۔

مسجد کے نال کچے کوٹھے میں وہ سلائی دھاگالے کر سارے دن گرتے سیا کرتی۔ شام کو شہر سے محمد دین درزی سائیکل پر سوار آتا، کرت لے جاتا اور چھ آنے دے جاتا۔ خیراں ناکین کے گھر سے دونوں وقت تائی کو دو آنے کی روٹی پہنچ جاتی اور باقی چار آنے اللہ کی راہ میں خیرات کر دیتی۔

پہلے پہل تو وہ مسجد میں تیل ڈالتی رہی۔ لڑکے لڑکیوں کو کھیل بتا شے لے کر دیتی رہی اور اڑے تھڑے وقت پر عورت کی مدد کرتی رہی۔ پر جب موجیوں کا لڑکا عہد و مدرسے بیٹھا تھا، تائی چار آنوں کا زیادہ حصہ عہد و کے باپ کو لڑکے کی قلم و دوات اور تختی کھریا کے لئے دیتی گئی۔

وہ عورتیں جو تائی سے کبھی کبھار چند نکلے ٹھگ لیا کرتی تھیں، موجیوں کے مہر سے خار کھانے لگی تھیں اور ان کو عہد و زہر لگنے لگا تھا۔ پھاتاں بھرا نین اکثر تائی سے کہتی۔ ”لے تائی یہ بھی کوئی دان پن کی جگہ ہے۔ عہد و کا پچا مرے ذہور کی چمڑی سے سونا بناتا ہے۔ تیرے پیسوں سے کوئی مولنا ہو جائے گا۔ پر دنیا لو بھی ہے نا، ہر کوئی یہ ہی چاہتا ہے کہ جو آجائے سوا چھا۔“

تائی فس کر کہتی۔ ”تیرے گھر والے بھی تو مرے ذہور کا چمڑا بھا کر سونا بناتا ہے۔ دھیے! تو آنے دوئی سے کون سی شاہ ہو جائے گی۔ عہد و بال ہے، اسے پڑھنے کا چاؤ ہے۔ پیسہ دو پیسے لے کر اس کی روح راضی ہو جاتی ہے، میرا جی خوش ہو جاتا ہے۔“

پھاتاں اٹھ کر پلہ جھٹکتی اور کہتی۔ ”لے تائی پھر تیری دونوں سے تو وہ حاکم نہیں بننا انشا اللہ۔“



اور تائی ہو لے سے کہتی۔ ”عبدالحمید نے بنے نہ ہی، کالی کھیلے والے کے دربار کی میں تو گولی بن جاؤں گی۔“  
 کسی کسی دن ملا اسماعیل بھی وارچی کو مہندی لگا کر اور دھوئے کھدر کی پگڑی باندھ کر تائی کے پاس آتا اور  
 کہتا۔ ”تائی شہر چلا ہوں۔ مسجد میں نہ لوٹا ہے نہ سواک۔ آج چوٹی اللہ کے گھر کے لئے بھی نکال دے، تو تو مسجد کو بھول  
 ہی گئی ہے۔“

تائی دوپٹے کی گرہ کھولتے ہوئے کہتی۔ ”صدقے صدقے جاؤں اللہ رسول کے گھر پر۔ چوٹی کیا اس گھر  
 پر تو میری جان بھی قربان۔ میں دوزخی دنی بے نصیبی! اور اللہ رسول کے گھر کی اونچی شان۔ مولا تیرے صدقے میری  
 قسمت! میری قسمت!!“

اور ملا چوٹی لے کر چلا جاتا۔

الو، سکندر اور مہستی کے کھیت ساتھ ساتھ تھے۔ قینوں یاردن بحر باجرے کے کھیت سے چڑیاں اڑایا کرتے  
 اور ایک دوسرے کو بولیاں سنایا کرتے۔

سکندر نے کہا۔ ”یار پے گا گا کر تو گلا ادھوڑی کا کھونٹا بن گیا ہے۔ کوئی کھیل کھیلو۔“  
 مہستی بولا۔ ”شاباش بچو! اوت مہستی جو صلاح دے گا، گھر گھائے والی دے گا۔ ادھر کھیل کھیلو ادھر چڑیاں  
 باجرے کو پلیدہ لگا دیں۔ دانہ ختم سوکھے ڈنڈے حاضر۔“  
 سکندر نے کہا۔ ”لے اولا لو یہ بھی کہے گا میں گھگھولوں گا۔ کنجر کی کھوپڑی میں پہاڑ چڑھنے والا گیدڑ کا روائی  
 کر گیا ہے۔“

الو نے ہنس کر کہا۔ ”یہ بیچارہ بھی کیا کرے۔ تو جانتا ہے کہ اس کا باپ بڑا سور ہے۔ چڑیاں ایک دانہ  
 چک گئی تو کانوں میں سرگردے گا۔ پھر بتا تیری ماں کو ماسی آکھے گا۔“  
 سکندر نے کہا۔ ”اچھا بچو یاروں کے ساتھ بھی مسخری کرتے ہو۔ میں کبڈی کشتی کی بات نہیں کرتا، بیرری  
 بیٹھ بیٹھ کر کھیلنے والی کھیل کی کہتا ہوں۔“

”تو پھر باراں بنی کھیلو مہستی نے خوش ہو کر کہا۔

”باراں بنی بھی کوئی کھیل ہے“ سکندر بولا۔

الو نے پوچھا۔ ”اوئے تاش کے ارادے تو نہیں یاروں کے؟“

اور سکندر بولا۔ ”صدقے جنامن کی بات بوجھ لی۔“

اب مشکل یہ تھی کہ تاش کہاں سے لی جائے۔ سارے گاؤں میں نمبردار کے گھر ایک تاش تھی۔ وہ کسی کو دینا  
 نہیں تھا۔ نئی خریدنے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ سوچ سوچ کر ان کی نظر تائی پر پڑی اور سکندر اور اولا مسکین  
 شکلیں بنا کر تائی کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ”تائی سارا دن کھیت پر گزارتے ہیں اور نماز پڑھنے  
 کے لیے نہ مصلی نہ لوٹا۔ چاچے سے کہتے ہیں لے دو، تو وہ الٹا کہتا ہے کہ نماز پڑھو گے کہ چڑیاں اڑاؤ گے۔ آج تیرے  
 ...“

تائی نے سوئی روک کر کہا۔ ”توبہ توبہ، بے نماز کتے آپ تو اللہ کا نام لیتے نہیں دوسروں کو بھی روکتے ہیں،  
 توبہ توبہ۔“



اور تائی نے ساڑھے پانچ آنے نکال کر انہیں دے دیئے۔

کماں جواری ٹھیکیدار کے آوے پر انٹیں پکاتا تھا اور وہیں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہتا تھا۔ لڑکا جب سے پیدا ہوا تھا اس نے مید شرب برات پر بھی کرتا نہ دیکھا اور خود کماں بھی اپنی زندگی کے چالیس برس لنگوٹی میں بسر کر گیا تھا۔ مہینے کے مہینے جو کچھ ملتا جوئے میں ہار دیتا۔ اس کے بعد گڑوا، پرات گڑوی رکھ کے جی بہلاتا اور جب وہ بھی ہار جاتا تو مٹی بھی رتے کسائی کے پاس رکھ آتا۔ قسمت سے داؤ سیدھا پڑتا تو چیزیں واپس آ جاتیں، نہیں تو مہینہ بھر زمین پر سونا پڑتا اور تغاری میں آنا گوند جتنا پڑتا۔

کسی دن جب جواریوں کی چاریاری وقت مقرر کر کے اسے ”گھستی یا“ کھیلنے پر مجبور کرتی تو وہ جی کڑا کر کے اپنے نٹے بچے کو کندھے پر بٹھا کرتائی کے پاس پہنچتا اور اسی طرح سواری بنایا کر کہتا۔ ”تائی روز اللہ کی راہ میں دیتی ہو ایک دن شیطان کی راہ میں بھی خیرات کر دو“۔

اور تائی خفا ہو کر کہتی۔ ”تو بہ استغفار کر کمیاں استغفار اتیرے ہاتھ روز قیامت کو گواہی دیں گے کہ کماں ہمیں جو کھلاتا تھا۔ تیرا رواں رواں تیرے برخلاف شہادت دے گا پھر کس کو مدد کے لئے بلائے گا؟“

کماں کہتا۔ ”تائی مدد کے لئے نہ آج کسی کو بلاتا ہوں نہ اس دن بلاؤں گا۔ دھرتی پر ٹھیکیدار کی انٹیں پکا پکا کر لو ہا لاکھا ہو گیا۔ آسمان پر فرشتے جس بھٹی پر لگا دیں گے لگ جاؤں گا۔ یاروں کا کیا ہے۔“

تائی بات کا نٹی۔ ”نہ ایسا کفر مت بول کمیاں۔ کوڑا سودا نہ کر، سچا بچ کر سچا۔ پیسے نکلے کا جو انہ کھیل، جی جان کی بازی لگا شیر! جی جان کی۔“

کماں کہتا۔ ”میں تیری طرح کماں نہیں تائی، بھلا روز چار آنے گنوا کر تجھے کیا ملتا ہے؟“

”گنوا کر۔“ تائی حیران ہو کر کہتی۔ ”یہ گنوانا ہے بے عقلا؟ یہ تو میرا نکل بنا رہے ہیں۔ اونچی ماڑی تیار کر رہے ہیں، ایسی ماڑی۔۔۔“

”محل“ کماں بچے کو کندھے سے اتار کر پوچھتا۔ ”کس دیس میں تائی، کس ملک میں؟“

اور تائی آسمان کی طرف سوئی اٹھا کر کہتی۔ ”اس دیس میں، اللہ مولا کی بادشاہی میں۔“

کماں دانت نکال کر کہتا۔ ”اچھا تائی اس محل میں ایک کوٹھری کماں کے بال بچوں کو بھی دے دینا۔“

اور تائی آرام سے کہتی۔ ”اس دیس میں کوئی مالک نہیں، کوئی مختار نہیں۔ اس سرکار میں بس نیک کرم ہی مالک ہیں اور بھیلے کام ہی مختار ہیں۔“

کماں ذرا بے چین ہو کر کہتا۔ ”تائی آج چونی دے دے، کل سے میں بھی اونچی ماڑی کی بندر کھدوں گا۔“

”آج کیوں نہیں بھلا؟“ تائی پوچھتی

اور کماں اپنے لڑکے کو گود میں بٹھا کر کہتا۔ ”آج دن اچھا نہیں تائی۔ سویرے سویرے ایک چڑی میری گھر والی کے سر پر بیٹھ گئی تھی۔“

تائی کہتی۔ ”چڑی بیٹھے چاہے کہوتر، کمیاں جو دم گزر گیا پھر نہیں آیا۔ آنے نکلے کے داؤ چھوڑ کر بڑا داؤ لگا بڑا۔“

اور کماں مایوس ہو کر کہتا۔ ”آہ تو ملتا نہیں بڑا داؤ کدھر لگاؤں۔“

تائی ہولے سے کہنے لگتی۔ ”جی جان کا داؤ بڑی سرکار سے لگا۔ چکی سرکار سے کھیل۔“



کماں اٹھتے ہوئے کہتا۔۔۔ "لے تائی! میری جھولی ہر بار تیرے سامنے خالی آئی خالی گئی۔ تیرے برکت والے پیسوں سے ایک داؤ لگ جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے پر خیر، صبر، شکر۔"

اور گلی میں چلتے ہوئے وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا، "بڑا داؤ لگا کمیاں بڑا داؤ۔ آنے نکلے کا داؤ بھی کوئی داؤ ہے۔" اور پھر وہ ہولے سے اپنے آپ کو سمجھاتا، "اچھا خیر، اگلے مہینے کی ساری تنخواہ اور منجی پر ات ایک دم رجمے کسائی کے پاس رکھ دوں گا۔ پھر لگا دوں گا بڑا داؤ۔۔۔ شاہ پاش میرے! بڑا داؤ۔"

مہینے آتے رہے اور جاتے رہے پر کماں بڑا داؤ نہ لگا سکا۔ تنخواہ کے کچھ روپے گروہ چیزیں جھڑانے میں لگ جاتے، ایک دو کا آنا آ جاتا اور باقی "کھستی یا" میں برابر ہو جاتے۔ گاؤں میں کماں جد بھی تائی کے دروازے پر اسے سلام کرنے آتا تو تائی یہی کہتی۔۔۔ "لگا دے شیر اسب کچھ لگا دے ایک دن سب کچھ لگا دے۔" اور کماں منہ ہی منہ میں تائی کی یہ بات دھراتا آگے نکل جاتا۔

ایک بار جب اسے تنخواہ ملی تو اتفاق سے اس کی کوئی چیز گروہ نہ تھی۔ اس نے روپے ڈب میں رکھ لیے۔ اور گھر سے پر ات کو سر پر رکھ کر، منجی کو اوپر ڈال کر اور گڑوا ہاتھ میں پکڑ کر چل نکلا۔ بھینڈی مراٹھی اس کو رجمے کسائی کی دکان پر ہی مل گیا اور کماں اسے ایک طرف لے جا کر آکھن لگا۔۔۔ "لے پھر آج کالو جھڑوں کو لے کر شام کے وقت آجا۔ یہ دیکھ انھارہ ہیں پورے۔ اس بہن کے یار کو کہنا کہ کماں کہتا تھا کہ انھارہ ہیں انھارہ۔" پھر اس نے بھینڈی کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا، "تو بھی آجا ماں بچ کے!"

جب کماں تائی کو سلام کرنے اور اس کو بڑے داؤ کی بات بتانے اس کے کوٹھے کی طرف گیا تو گاؤں کے بہت سے آدمی اور عورتیں تائی کے دروازے پر جمع تھے اور ان میں کماں کی گھر والی بھی تھی۔

ملا کہہ رہا تھا۔۔۔ "سبحان اللہ کیا بہشتی بی بی ہے۔ نماز پڑھتے پڑھتے بڑے دربار میں جا پہنچی، سبحان اللہ۔"

عبدو کے باپ نے نمبردار کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ "چودھری دی کفن۔۔۔ کفن تو۔۔۔"

اور ملانے ٹوک کر کہا۔۔۔ "تو بہ تو بہ ایسی بی بی کو کفن کی کیا ضرورت۔۔۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!! بیشتوں کی حور

کو دنیا کے کپڑوں سے کیا مطلب۔"

بھراکین بولی۔۔۔ "کھدر کے کفن پر بھی پندرہ بیس لگ جائیں گے۔"

عبدو کا باپ خفا ہو کر بولا۔۔۔ "بہن۔۔۔ ملاجی کی بات سنی نہیں، بہشتی حور کو کفن کی کیا ضرورت۔۔۔ اللہ کے

پیارے سجدے میں۔۔۔ سبحان اللہ! داؤ داؤ سبحان اللہ!!"

کماں تائی کو اس طرح لینے دیکھ کر کبیرا سا ہو گیا اور ہاتھ ہلا کر بولا۔۔۔ "نہ نہ ایسا کام نہ کرنا، یہ تو اپنی تائی تھی

۔۔۔ سارے گاؤں کی تائی۔۔۔"

عبدو کے باپ اور چودھری نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے تارڑا اور ملانے جھڑک کر کہا۔۔۔ "بے عقلا!

خمش ہو جا۔"

مگر کماں اسی طرح ہاتھ ہلاتا رہا۔۔۔ "نہ نہ ملاجی، یہ تو اپنی تائی تھی۔۔۔" پھر اس نے گھر والی سے کہا۔۔۔ تو

یہاں ٹھہر میں شیر سے منوں میں کفن لاتا ہوں۔۔۔"

اور بھیڑ چھوڑ کر کماں یوں بھاگا جیسے اسے دو مہینے کی اکٹھی تنخواہ دینے کے لئے آواز پڑی ہو۔





سفر یہ زندگی بھر کا بند تھا  
سفر جو زندگی بھر میں کیا ہے!

لیکھنؤ

۱۳ جنوری  
انوار کی دوپہر ۱۱:۳۰

اطہر رضوی

ٹورنٹو، کنیڈا

ایک زمانہ تھا کہ برصغیر سے باہر اردو دنیا میں لندن کو اردو کا سب سے بڑا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ عابدی صاحب کی سرپرستی میں یہاں ”اردو مرکز“ کا قیام ہوا تھا۔ ان دنوں جو بھی اردو دان یا اردو دوست لندن سے گزرتا، اس کا اردو مرکز جانا، اور وہاں بیٹھے ہوئے اردو دوستوں سے ملاقات کرنا ضروری ہوتا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد شمالی امریکہ خصوصاً کنیڈا میں وہاں کے فدایان اردو نے اپنی محبوب زبان کی شمع کو جس طرح روشن کیا اور اس کی آب و تاب کو برقرار رکھا وہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک روشن اور یادگار باب ہے جسے کوئی بھی مورخ فراموش نہیں کر سکتا۔ اطہر رضوی نے ٹورنٹو کو ”شہر اردو“ کا نام دیا جس کا اظہار وہ ہر مجلس میں کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مشاعروں کے قطعہ نظر ٹورنٹو میں اعلیٰ مرتبہ اردو سیمینار میں بھی منعقد ہوئی ہیں۔ خود اطہر رضوی نے جو عالمی تقریبات (۱) منعقد کی ہیں ان کے ہم پلہ، ہم وزن مجلسیں پاک و ہند میں شاذ ہی منعقد ہوتی ہیں۔ مزید برآں وہاں سے اب کم از کم بارہ اردو کے ہفت روزہ، سہ روزہ اور آدھا درجن رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ٹی وی کے اردو پروگرام ان کے عالمی سطح پر منعقد ہونے والی اردو کی چند تقریبات جنہیں اطہر رضوی نے ترتیب دیا اور جو بہت نمایاں ہیں وہ یہ ہیں: اردو تہذیب کی قدریں؛ عالمی جوش کا نفرنس؛ عالمی میر تقی میر کا نفرنس؛ عالمی غالب سیمینار؛ عالمی انیس سیمینار



علاوہ ہیں۔ تو قریباً ہر ہفتہ شہر میں کہیں نہ کہیں ادبی محفل منعقد ہوتی ہے۔ اس طرح اردو دوست اپنی زبان کی روشنی اور اس کی عظمت کے خزانے سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

اب یاد نہیں کہ میں محترم اطہر رضوی سے پہلی بار کب ملی تھی۔ یاد تو اس وقت بھی نہ تھا جب جنوری ۲۰۰۱ء میں ان کا خط ملا بلکہ ایک طرح سے وہ خط ان کا معذرت نامہ بھی تھا۔ لکھا تھا۔  
”سلطانہ بہن!“

حسب وعدہ آپ کے دیئے ہوئے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے تو مجھے آپ سے معذرت کا اظہار کرنا ہے۔ آپ سے میرے مینار کے دوران کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے غالباً آپ کی وہ پزیرائی نہیں کی جس کی آپ مستحق تھیں۔ اس کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ میں ایک چیونسلک (chauvinistic) مزاج کا انسان ہوں اور نہ اس میں میری خود نمائی کو دخل تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے آپ کے کاموں کی پوری تفصیل کا علم نہ تھا اور آپ کی تالیف شدہ کتابوں کو پڑھنے کے بعد اس کا صحیح اندازہ ہوا ہے کہ آپ نے جو کام کیئے ہیں اور جو کر رہی ہیں وہ کتنا کٹھن اور جان لیوا ہے۔ بحیثیت ریسرچر سے منسلک مصنف کے مجھے دراصل اس کا ذاتی تجربہ ہے کہ کسی تحقیقی کام میں کتنی محنت درکار ہوتی ہے۔

بہر حال میں آپ کی جستجو، کاوش، مستقل مزاجی اور صلاحیت سے متاثر ہوا ہوں۔ خدا آپ کے مستقبل کے سارے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔“

اطہر رضوی صاحب کی دعائیں کام آئیں۔ اور آج میں ”سخنور حصہ پنجم“ مکمل کرنے کے بعد ”گفتنی حصہ دوم“ پر کام کر رہی ہوں۔

میں خود بھی اطہر رضوی صاحب کی قدردان ہوں۔ وہ برسوں سے ہر سال نہ صرف غالب اکیڈمی ٹورنٹو، کنیڈا کے تحت غالب کے کسی بھی ایک مصرعے پر طرچی مشاعرہ منعقد کرتے ہیں بلکہ بڑی محنت سے تحقیق کر کے ایک کتاب ”تاریخ کا سفر... بلکیڈیا سے باز نیا تک“ تصنیف کی اس کے لئے اطہر نے تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کیا، مشاہدات کیئے، معلومات اکٹھی کیں اور اس تاریخی سفر کو اپنے قارئین کے حوالے کیا۔ اور بقول استاد ذوق۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت یوں ”سخن و ران ادب“ کی فہرست میں معتبر محققین کے ساتھ ان کا نام بھی شامل ہو گیا۔

اطہر رضوی سخن و ران ادب میں شامل تو پہلے بھی تھے۔ ان کی تالیفات و تصنیفات میں ”بیاد غالب“، ”خدا کے منتخب بندے“، ”ہر ملک ملک ماست“، ”عالمی غالب سیمینار“، ”یاد کے موتی (شعری مجموعہ)“، ”عالمی میر سیمینار“ اور ”تاریخ کا سفر... بلکیڈیا سے باز نیا تک“ شامل ہیں۔ حال ہی میں ان کی نئی کتاب ”عبث بدنام ہوا“ شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۱/ ستمبر ۲۰۰۱ء کے نیویارک میں ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ان سے گفتگو کا آغاز ہوا اس سے پہلے اطہر رضوی سے ان کے چندہ اشعار سنتے ہیں۔ اطہر



بڑے اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے میری فرمائش پر یہ اشعار سنائے بلکہ گنگنائے۔

اب یہ حیات تیز ہواؤں کے درمیاں  
بڑے خلوص سے اک ہم نے گھر بنایا تھا  
نہ ہم گزیدہ حالات ہیں نہ اہل طلب  
پیڑ کے ننگے بدن کو دیکھ کر بد دل نہ ہو  
ہم تم جدا ہوئے تو یہ دونوں کا دوش تھا  
سفر یہ زندگی بھر کا نہیں تھا  
ان کو جس زاویے سے دیکھتا ہوں  
رات ان کے حضور کی لذت  
سحر کے بعد جیسے شام آئے بڑھاپا بن بلائے آرہا ہے

اطہر رضوی دیکھنے میں ہشاش بشاش، چاق چوبند ہیں۔ بھر بھی اپنی تاریخ پیدائش اور سن بتانا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا: ”پیدائش پر میرا نام سید اطہر حسین رضوی (برسٹل تذکرہ یہ ہی پورا نام کفّی اعظمی کا بھی ہے)، بی اے کرنے کے تک سید اطہر رضوی تھا اور پھر صرف اطہر رضوی رہ گیا جو اب تک میری پہچان ہے۔ میری پیدائش جالندہ میں ہوئی۔ جالندہ مہاراشٹر، ہندوستان (سابق اسٹیٹ حیدرآباد، دکن) میں اورنگ آباد شہر کے قریب ایک مقام ہے۔ سارا بچپن اور زندگی کی عزیز ترین یادیں اورنگ آباد سے وابستہ ہیں۔

میں نے جامعہ کراچی سے سیاسیات میں ایم اے کیا اور جرنلزم لندن سے کرنے کے بعد Acis کا امتحان ٹورنٹو سے دیا۔

بچپن سے سوچ کا مریض تھا اور ضرورت سے زیادہ حساس بھی۔ ہائی اسکول تک اشتراکی خیالات سے متاثر تھا جو اس زمانے میں ادبی رجحان رکھنے والے طلباء کی شناخت تھی۔

ذہنی نشوونما کا آغاز اورنگ آباد کی ناقابل فراموش سرزمین سے ہوا، بقول وحیدہ نسیم۔

حسین اس سرزمین نے زلف ہستی کو سنوارا ہے مجھے بھی ناز ہے میں نے یہاں بچپن گزارا ہے

اس شہر کا خصوصاً ہمارے خاندان کا ایک مخصوص سب کلچر (sub-culture ذیلی تہذیب) تھا جو لکھنؤ اور دکن کی عظیم تہذیبوں کا امتزاج تھا۔ یوپی کے چند خاندان جو ایک یا دو پشتوں قبل ہجرت کر کے اورنگ آباد آئے تھے، جو کئی ہوتے ہوئے بھی تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور روایتی اعتبار سے گز کا جمعی تہذیب کا جیتا جاگتا مرقعہ رہے اور کہلائے۔ ان خاندانوں میں ہمارا خاندان ایک ممتاز شخصیت اور مقام کا حامل تھا۔ ان چار پانچ خاندانوں میں جو ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے ان میں فرہاد زیدی اور وحید اختر مرحوم کے گھرانے شامل تھے۔

اورنگ آباد ایک چھوٹی سی پُرسکون بستی تھی۔ وہاں ہم عمر اور ہم فکر نوجوانوں کے ایک ادبی گروہ کی تشکیل ایک فطری تقاضا تھی۔ اختر الزماں ناصر مرحوم ہم سب سے سینئر تھے اور ایک طرح کے استاد بھی۔ ہمارے حلقے میں حمایت علی شاعر، عبدالروف عروج، عباس اختر، انور معظم، شمیم سروش، فرہاد



زیدی (جو اصلاً وحید زیدی ہوا کرتے تھے)، قاضی سلیم، وحید اختر مرحوم اور میں شامل تھا۔ خواتین میں وحیدہ نسیم مرحوم اور رفیعہ سلطانہ کے نام مشہور و معروف تھے۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان سے ہجرت اور پانچ سال بعد انگلستان سے ہجرت کی۔ کراچی میں طالب علمی اور نوجوانی کا دور احساسِ محرومیت، تصورِ نارسائی اور بے وجہ خود الزامی کا دور تھا۔ لندن، برطانیہ اور یورپ میں بد قسمتی سے ذہنی توازن کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ ستم نظریاتی یہ ہے کہ فکری تربیت اور ذہنی ارتقا کے لئے دنیا بھر میں لندن جیسی زرخیز زمین کہیں نہیں ہے۔ لیکن شریک کی کمزوریاں اور بوہمین (Bohemian آزاد مشرب) طبع راہ میں حائل رہیں۔ اس طرح زندگی کے اہم ترین سال، ماہِ شب و روزِ خلّاقیت سے محروم رہے جس کا مجھے ہمیشہ قلق رہے گا۔ سکونِ قلب کی خاطر تیسری ہجرت کنیڈا کی۔ اور اورنگ آباد چھوڑنے کے بعد میرے ذہن میں پہلی مرتبہ دیکھنے، سوچنے اور 'سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے' کا خیال یا جذبہ پیدا ہوا۔ اپنی زبان سے والہانہ عشق، اس کے شعروادب سے وابستگی، اس کے عظیم المرتبت دانش وروں سے بے پناہ عقیدت اور یہ احساس کہ بچپن یا جوانی میں جو کچھ تھوڑی بہت تخلیقی صلاحیتیں خدا نے عطا کی تھیں ان کا احیا کنیڈا کی برفیلی فضاؤں میں ہو سکتا ہے، اس خوش آئند امکان نے میری ادبی زندگی کو نشاۃ ثانیہ بخشی۔

پاکستانی شعرا کے پہلے شمالی امریکہ کے دورے کے منصوبے سے میری ادبی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ جس کا اہتمام و انتظام، ترتیب و پیشکش میری اپنی تھی۔ بعد ازاں جب حبیب جالب کا کنیڈا کا پہلا اور آخری دورہ، کئی بین الاقوامی مشاعرے، 'اردو تہذیب کی قد ریں'، جوش، غالب اور میر پر عالمی سیمینار، غالب اکیڈمی (ٹورنٹو، کنیڈا) کا استقرار، عالمی مشاہیر و دانش وران کے ساتھ مجالس، بیادِ غالب سترہ (۱۷) طرحی مشاعرے.... یہ میری خوش قسمتی ہے مجھے کنیڈا میں ایسی تاریخی ادبی تقریبات کرائے کا موقع ملا جو برصغیر پاک و ہند میں شاید ہی کوئی شخصی اور انفرادی سطح پر کر سکا ہو۔ ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بفضلِ خدا میری تخلیقات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

میں نے تاریخ، تحقیق اور مشاہدے کے مرکب سے غیر جانبداری اور صداقت کو اپنا محافظ بنا کر اردو میں تاریخ نویسی کو دل چسپ مطالعہ بنانے کی سعی کی ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انفرادی سطح پر میرے کاموں کی پزیرائی ضرور ہوئی۔ 'ہر ملک ملک ماست اور خدا کے منتخب بندے' پر سردار جعفری مرحوم نے اپنے خط میں لکھا: 'یہ دونوں تصانیف تاریخی شہادت اور عینی مشاہدے کا ماہر اندام متراز ہیں'۔ پروفیسر منظر ایوبی نے کہا: 'آپ کی سیاسی تحریر کے سحر نے ذہن و دل کو اس طرح اسیر کر لیا کہ ایسا کسی کا سفر نامہ شاید ہی اپنی طرف منعطف کر سکے۔ آپ نے ہماری فکر کا کعبہ ہی بدل دیا ہے'۔ شمس الرحمن فاروقی نے 'تاریخ کا سفر... بلکینیا سے باز نیا تک' پڑھ کر مجھے ای میل بھیجا: 'یہ کتاب نہیں معلومات کی کان ہے۔ میں آپ کے مطالعے اور اسکا لرشپ کی داد دیتا ہوں'۔

لیکن پاکستان کا ادبی کلچر جس حد تک لابی ازم (lobbyism) کا شکار ہے اس کی نظیر میری دانست میں دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ 'خدا کے منتخب بندے' قوم یہود اور فلسطین کی تاریخ پر اردو زبان



میں لکھی ہوئی پہلی کتاب تھی۔ ابوالحلیٰ مودودی اور حضرت سلیمان ندوی کی یہودیوں کے تعلق سے نگارشات ضرور موجود ہیں لیکن اسرائیل کا استقرار کس طرح ہوا، فلسطینی عربوں کا بعد ازاں کیا حشر ہوا اور یہودی کس طرح دنیا کی عظیم ترین چھپی ہوئی طاقت بنے، اس کی تاریخی تفصیلات صرف میری کتاب میں ہیں۔ اور پاکستان میں اس کی کیسی پزیرائی ہوئی؟ امجد اسلام امجد کے دیباچے بعنوان 'ایک نئی دیوار گریہ' کے علاوہ پاکستان کے کسی اخبار یا رسالے نے اس پر ایک حرف نہیں لکھا" (۱)۔

اطہر رضوی نے اردو کی خدمت کے حوالے سے بہت کام کیا ہے اور بدلے میں کبھی دولت کی خواہش نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے..... "اردو سے مجھے والہانہ عشق ہے۔ اس کے تعلق سے میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ دل کی لگن اور ناقابل بیان دیوانگی کا جذبہ ہے جو میری رگوں میں سمایا ہوا ہے۔ اور ادب کی خدمت اور اردو سے محبت کے بہانے پیسہ کمانے کے میں انتہائی مخالف ہوں۔ درجنوں پروجیکٹوں میں آج تک کبھی بریک ایون (break even) اخلاف و آمدن میں توازن) بھی نہیں پہنچ سکا۔ لیکن اس کے لئے مجھے شہد برابر افسوس بھی نہیں ہے۔"

اب ذکر چھڑا دیوں کی گروہ بندیوں کا۔ میرے سوال کرنے پر کہنے لگے..... "یہ سوال میرے دل و دماغ میں بہت قریب ہے لیکن احوال واقعی نوعیت کی تاریخی داستان کی تخلیق و اشاعت بھی نہیں چاہتا۔ لیکن مختصراً کہوں گا... برصغیر پاک و ہند یا مخصوص پاکستان کے ادبی حلقوں اور ان سے وابستہ دانشوروں کے اذہان میں یہ بات حتمی یا فیٹ اے کمپلی (fait accompli) فیصلہ شدہ یا قطعیت کے طور پر بیٹھی ہوئی ہے کہ شعر و ادب، حکمت و دانش، خیال اور اسلوب کی ندرت و نفاست اور اعلیٰ و عظمیٰ تخلیق کے سوتے ان کی چار دیواریوں کے اندرون ہی پھومتے ہیں یا پھوٹ سکتے ہیں۔ اور اس ملک سے باہر رہنے والے 'نوسکھیوں' کی کیا مجال اور حیثیت کہ وہ پاکستان کے عظیم المرتبت شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے سامنے اپنے فن کے چراغ روشن کرنے کی سعی کریں۔

یہ خیال بنیادی طور پر ناقص اور احمقانہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے کراچی میں ایک مہینہ گزارا۔ دوران قیام دو مشاعرے ہوئے۔ ایک 'شہر قائد' کا سالانہ مشاعرہ تھا، جہاں مجھے بحیثیت 'یکے از حاضرین' شریک ہونے کا موقع ملا۔ مشاعرہ رات بارہ کے بعد ایک بجے شروع ہوا اور صبح کے سات بجے اختتام کو پہنچا۔ مشاعرے کا زیادہ حصہ بدتمیز، بدتہذیب و بد اخلاق نوجوان سامعین کے حقارت آمیز برتاؤ کی نذر ہوا۔ ایک دودل کش ترنم کے ساتھ پڑھنے والی شاعرات اور دو تین اساتذہ شعر کو چھوڑ کر ہر شاعر کو باضابطہ، باجماعت، بانگ دہل تختہ مشق بنایا گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان شعرا کو بھی ذلیل و خوار کیا گیا۔ ہماری عظیم زبان اردو کا مشاعرہ، ہماری ثقافت کا انمول جوہر، ہماری ادبی میراث کی لافانی سوغات، جو دنیا کی کسی قوم کی کسی زبان اور ثقافت کو میسر نہیں، اس کا

۱۔ اس موضوع پر ان کا معلوماتی مضمون بعنوان "رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف!!" ان کے تعارف کے بعد اس کتاب میں شامل ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ اس کو ضرور پڑھیں گے۔ سلطانہ مہر



یہ حشر اس سرزمین کے عروس البلاد میں ہوا جہاں اردو کے 'عظیم ترین' شاعر، دانش ور اور اساتذہ موجود تھے۔ تو یہ ہے پاکستان میں اردو تہذیب کی اقدار کی ایک تصویر۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ کنیڈا اور پورے شمالی امریکہ میں ہر سال درجنوں مشاعرے ہوتے ہیں لیکن کہیں بھی اور کبھی کسی مہمان یا مقامی شاعر کو اس طرح ذلیل کرنے کے تعلق سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد گفتگو اردو کے بقا کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔ اطہر رضوی کا کہنا ہے..... "یہ خیال یا یہ خیر بد پتا نہیں کس نے پھیلائی ہے کہ اردو کا مستقبل مایوس کن ہے۔ میرے اپنے مشاہدے کے مطابق پاکستان کے ہر خطے، ہر صوبے اور ہر شہر میں رابطے اور تبادلہ خیال کا ذریعہ اور وسیلہ اردو زبان ہی ہے۔ پنجابی، سندھی، پشتو، سرائیکی مقامی طور پر آپس میں اور اندرون خانہ ضرور استعمال ہوتی ہے لیکن کوئی بھی صوبائی یا علاقائی زبان اردو کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔ صحافت اور تجارت اردو ہی میں ہوتی ہے۔ کابینہ کی میٹنگوں میں عموماً اردو استعمال ہوتی ہے۔ عوامی جلسے سارے ملک میں اردو میں منعقد ہوتے ہیں۔ صدر مملکت، وہ کوئی بھی ہو، انگریزی کے ساتھ یا صرف اردو میں قوم سے مخاطب ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، وہاں جو اردو کے لئے کام ہو رہا ہے وہ ناقابل یقین محسوس ہوتا ہے۔ کیرالہ یونیورسٹی میں طالب علم اردو میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ رسالہ 'اردو دنیا' دہلی میں اردو کی ترویج و ترقی کی جو خبریں شائع ہوتی ہیں انہیں پڑھ کر روحانی بشارت محسوس ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نوشتہ یا لکھی ہوئی اردو زبان اکثر ریاستوں میں ناپید ہو رہی ہے لیکن 'بالی وڈ' کی فلم انڈسٹری کی مروجہ زبان نوے فی صد سے زیادہ خالص اردو ہوتی ہے۔ جسے وہ ہندی کہتے ہیں۔ اسی طرح رابطے کا ذریعہ پورے برصغیر میں، کوئی مانے یا نہ مانے، اردو ہی ہے۔ ایک بات یاد رکھیے جب تک اردو ادب، شاعری، تہذیب اور اس کی میراث کے عاشق غالب و میر کی عظمت کے ماننے والے اور ان کے کلام کا جادو جگانے والے، اقبال کے مقلد، فیض و فرراز کے شیدائی، نارنگ و فرمان فتح پوری کے کمال نطق کے مداح، پریم چند سے لے کر انتظار حسین تک کے افسانوں کے پرستار دنیا کے کسی براعظم، کسی خطے، کسی سرزمین کسی شہر میں جا کر سکونت اختیار کریں گے، اردو تہذیب کا جادو، اس کے شعلے، اس کا ناشا الجیا (nostalgia) عارضہ فرقت وطن) اپنے ساتھ لیجائیں گے اور اسے برقرار رکھیں گے۔ اور پھر مجھ جیسے سر پھرے نہ صرف انگلینڈ، یورپ اور شمالی امریکہ میں ہیں بلکہ افریقہ کے تاریک خطوں میں بھی موجود ہیں۔ اردو کی بقا کے تعلق سے آپ قطعی فکر نہیں کریں۔" اطہر رضوی کا یہ حوصلہ دیکھ کر واقعی میرا حوصلہ بڑھا۔

اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلہ میں انہوں نے کہا..... "میں ہرگز ہرگز حتمی طور پر متفق نہیں۔ رسم الخط کے بدل جانے سے وہ زبان اردو کیسے کہلائی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں ہندی اس کی زندہ مثال ہے۔ میں نے مجلسوں میں ہندوستان سے آئے ہوئے بچوں کو اردو کے نوے پڑھتے ہوئے دیکھا جو ہندی یا مراٹھی یا کچھ اور ہی رسم الخط میں رقم تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے روحانی صدمہ پہنچا۔ یہ میرے لئے، چاہے اسے آپ میری جذباتیت سمجھیں، میری زبان کی موت کے مترادف ہے۔"



اپنے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں اطہر صاحب نے کہا: ”میں یہ کہہ کر کہ میں نے سارے مغرب کے مصنفوں کو پڑھا ہے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا۔ میرا مطالعہ انگریزی، فرانسیسی مصنفوں سے زیادہ روسی ادیبوں کا رہا ہے۔“ (Pushkin)، گوگول (Gogol)، دستایووسکی (Dostoevsky)، چیخوف (Chekhov)، گورگی (Gorgi)، شولوکوف (Sholokhov)، پیسٹرناک (Pasternak) اور سولزے نیشن کے بیشتر شاہکار کے انگریزی تراجم پڑھے ہیں۔ میرا پسندیدہ مصنف الیکزینڈر پشکن (Aleksandar Pushkin) ہے جسے روس میں ہمارے میر تقی میر کے ہم پلہ ’خداے سخن‘ تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے گوٹے (Goethe) اور نپٹشے (Nietzsche) کو بھی پڑھنے کی کوشش کی لیکن ان کی نگارشات میری فہم کی استطاعت سے بعید محسوس ہوئیں۔“

آخری سوال پر انہوں نے کہا: ”یوں تو زندگی میں بہت سے واقعات ایسے گزرے ہیں جو ذہن کے قریطاس پر ثبت ہو کر رہ گئے ہیں لیکن میری ادبی زندگی کے تناظر میں یہ واقعات ہمیشہ روشن رہیں گے۔“

☆ جب میں نے ۱۹۸۱ء میں پاکستانی شعراء، جمیل الدین عالی، قتیل شفائی، ضمیر جعفری، حمایت علی شاعر، صہبا اختر اور پروین فنا کو فردا فردا اسٹیج پر آنے کی دعوت دی اور اس وقت فضا میں جو برقی لہر توانائی (electricity) تھی اس کو میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا۔

☆ پھر اسی طرح جب میں نے حبیب جالب کو ان کا شعر ہمارے ذکر سے خالی نہ ہوگی بزم کوئی ہم اپنے ذہن کی وہ باس چھوڑ آئے ہیں پڑھ کر اردو کے اس عظیم ترین انقلابی و عوامی شاعر کو پکار کے بلایا تو کوئی دس منٹ تک حاضرین نے کھڑے ہو کر تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ یہ واقعہ میری یادوں کا خزانہ ہے جو تاحیات میرے ساتھ رہے گا۔“

اطہر رضوی صاحب کی نئی تحقیقی و تاریخی کتاب ”کون عبث بدنام ہوا“ ستمبر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کے نتیجے میں عالم اسلام کو دہشت گردی کے حوالے سے جن تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے، ان کا جواز اور تجزیاتی تناظر کو اطہر رضوی نے تحقیقی حوالات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جامعہ کراچی، پاکستان کے سابق وائس چانسلر اور نامور دانشور جناب پروفیسر منظور احمد نے اس کتاب کے پیش لفظ میں (ص ۳۵) لکھا ہے:۔۔۔۔۔

”آج کے مسلمان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ معاشرتی ساخت اور قوانین کا استخراجی پیراڈائم انہوں نے مقدس جان کر قبول کر رکھا ہے، اپنا مصرف پورا کر چکا ہے اور آج کی دنیا میں وہ کارآمد نہیں ہے۔ کسی زمانے میں اجتہاد اسلامی معاشروں کا اصول حرکت اور ارتقا تھا آج وہ جمود اور رجعت کا اصول بن گیا ہے۔ مسلم مفکر اگر اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تو پھر وہ دنیا کی سیادت کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور ظالم طاقتوں کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کے لئے تیار ہو جائیں۔“

خود جناب اطہر رضوی صاحب نے ”دہشت گردی“ کے عنوان کے تحت ص ۱۶۸ تا



ص۔ ۱۷۰ء اور بعنوان ”دہشت گردی کے بار غار“ ص۔ ۱۷۱ تا ص۔ ۱۹۹ جو تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ نہ صرف سے پڑھنے بلکہ اس تجزیے کی روشنی میں اپنی ایک قابل عمل راہ متعین کا ادراک بی ہوتا ہے۔ یہ کتاب ایک نفسیاتی تجزیہ بھی ہے۔ تحقیق، تاریخ اور نفسیات کے مضامین میں دل چسپی والوں کے لئے اس میں بہت کچھ ہے۔

Mr. Athar Razvi,

5164 Hidden Valley Court, Mississauga, Ontario, L5M 3P1, Canada

e-mail: arazvi@idirect.com

## رکھیں غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف !!

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ (Jesus Christ) کی اس دنیا سے رحلت صلیب (crucifixion) کے ذریعے نہیں ہوئی۔ لیکن ساری عیسائی دنیا کی یہودیوں سے دو (۲) ہزار سالہ مخالفت کی بنیاد یہودیوں کی دغا بازی اور غداری کی بدولت روم کے سپاہیوں کے ہاتھوں حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھ کر شہادت پانے کی ”تاریخی روایت“ ہے۔ یہ مخالفت ایک خود پروردہ، خود کر (built-in) بغض اور نفرت بن کر ساری دنیا کے عیسائیوں کے اعتقاد کا ایک اہم جزو بن گئی ہے۔ اور اس طرح اینٹی سمیٹیزم (anti-Semitism) کی اصطلاح وجود میں آئی ہے۔ ساری دنیا کے یہودی اسرائیل کے قیام تک اس تاریخی بغض (animosity) کا شکار ہو کر یورپ کے ہر ملک سے باہر نکالے گئے اور اس کا نقطہ عروج ہٹلر کا ”آخری حل (The Final Solution)“ کا منصوبہ تھا جو یقیناً انسانی تاریخ کا ایک بھیاٹک اور شرم ناک باب تھا۔ لیکن بقول فرانسیسی فلسفی ژاں پال سترے (Jean Paul Satre) یہ سانحہ یہودیوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا۔ مظلومیت کے تصور کو استعمال کرنے کا فن یہودیوں نے نہ صرف ایجاد کیا بلکہ اس کو درجہ تکمیل تک پہنچایا۔ اسرائیل کے قیام کے بعد اینٹی سمیٹیزم (anti-Semitism) کا لیبل انہیں علماء الدین کے طلسمی چراغ کے مانند کام آیا۔ جب بھی کسی نے اسرائیل یا یہودیوں کے خلاف ڈرتے ڈرتے انگلی اٹھائی انہوں نے چھٹ سے ان پر اینٹی سمیٹیزم (anti-Semitism) کا ”بوم رنگ (boomerang)“ پھینکا۔ ”چوں کہ تم فطری طور پر یہودی دشمن ہو تمہاری رائے اور سوچ صحیح، مناسب، راست اور غیر جانب دار ہو ہی نہیں سکتی۔“ مجھے صیہونیوں کے وسائل، ذرائع اور کلاؤٹ (clout) اور ان کے پوشیدہ خبر رسانی کے جال کا پورا علم ہے، دراصل اس کتاب کی تصنیف کی غایت اسی چھپی ہوئی طاقت کا انکشاف ہے، لہذا اس سے قبل کوئی پاکستانی، موساد کے جو شیلے ایجنٹ جو پاکستان میں موساد کے پے رول (pay-roll) پر ہوں، ”خدا کے منتخب بندے“ کو یہودیوں کے خلاف پرو پگنڈے کا نام دے کر میرا نام یورپ اور امریکہ میں اپنے آقاؤں تک پہنچائیں اور اس طرح مجھے



ایک قسم کا "مسلمان رشدی" کا ناسل مل جائے میں ان سطور کے ذریعے قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اینٹی سمیٹزم (anti-Semitism) یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک تاریخی جھگڑا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے چوں کہ میں کرویسی فیکیشن (crucifixion) پر ہی اعتقاد نہیں کرتا تو اینٹی سمیٹک (anti-Semitic) ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کتاب مستند تاریخ، حقائق، واقعات، اعداد و شمار کی قلم بندی ہے۔ میری اپنی رائے کتاب کے اختتام پر مختصر الفاظ میں ہے۔

ہر مصنف، مورخ، صحافی اور یعنی شاہد جس کا حوالہ کتاب میں دیا گیا ہے وہ یا ایک جیتی جاگتی شخصیت ہے، یا بلاشبہ قابل شناخت (identifiable) اور نامور ہے۔ ان شخصیات میں وہ جیالے منصف مزاج یہودی بھی ہیں جنہیں صداقت اور تاریخ کا صحیح احترام ہے۔

مشہور یہودی صحافی، جیکو ٹمرمن (Jacobo Timmerman) نے جب اپنی کتاب "دا لونگسٹ وار" (The Longest War) میں اسرائیلیوں کو نازیوں سے بدتر قرار دیا یا جب "اسرائیلو فلیگ از ناٹ مائی فلیگ" (Israel's Flag is not My Flag) میں لکھا کہ اخلاقیات اور انصاف کے اصولوں کے مد نظر اسرائیل کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے تو ان دانشوروں کے بیانات کو مزید استقامت کے لئے میری اعانت کی ضرورت نہیں ہے!

ہر شخص کے پوشیدہ نجی تعصبات (private biases) ہوتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میں اپنے تاثرات کو تاریخ کی صحت پر ترجیح نہ دوں۔ ہر ممکن تلخ یا خوش گوار واقعے کے تعلق سے جو میرے علم میں آیا، میں نے اپنی ذہنی تربیت، سمجھ بوجھ اور فلسفے کی روشنی میں سوچا اور ایک رائے قائم کی۔ جنوبی افریقہ کی پولیس جب "مشتبہ" لوگوں سے سر میں پھسل گھسیڑ کر یہ تعین کرتی ہے کہ آیا ان کا شمار گوروں یا کالوں کی نسل میں ہونا چاہیے تو مجھے اس وقت بھی اتنی ہی کراہت محسوس ہوتی ہے جتنی ان اسرائیلیوں کو دیکھ کر جو اپنے ملازم ہر عرب نوجوان کو محض حقیر گردان کر ان سے خود احترامی (self-respect) کو محروم کرنے کے لئے ان کے نام جانتے بوجھتے ہوئے ان کو "عہدل" کہہ کر پکارتے تھے۔

آشویتز (Auschwitz) کیمپوں میں جب گیس کی بھٹیوں میں جیجنے سے پہلے نازی سپاہی سونے کے دانت رکھنے والے یہودیوں کو بغیر کسی دھات کے دانتوں والے یہودی سے جدا کرتے تھے اور میں نے جب ان شرمناک واقعات کو پڑھا تو مجھے اتنی ہی اذیت پہنچی جب میں نے ٹی وی پر بیروت کے بچوں کے سوختہ جسم اور بریدہ لاشیں دیکھیں جو اسرائیلی فوج کی سفاکی کا نتیجہ تھے۔ پھر ۱۹۶۰ء میں امریکہ کے جنوبی اسٹیٹوں میں جب سفید فام فرقہ پرست امریکی وہاں کے مقامی کالوں پر مظالم ڈھا رہے تھے تو میرا ذہنی اور روحانی کرب انتفاضہ میں فلسطینی بچوں کی ہڈیاں اسرائیلی سپاہیوں کے ہاتھوں ٹوٹتے دیکھنے کے کرب اور اشتعال سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ظلم ظلم ہے اور خون ناحق خون ناحق ہے جو بقول آرنالڈ ٹائٹل بی ایک معصوم بچے کا ہو یا چھ ملین افراد کا۔

میری نظر میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین سانحہ واقعہ کربلا تھا اور اس کے بعد کم از کم بیسویں صدی میں فلسطین کی ٹریجڈی سے زیادہ دردناک کوئی اور ٹریجڈی نہیں ہے۔ عالمی جنگوں کے درمیان لاکھوں انسانوں کی



ہلاکتیں ہوئی ہیں یہ جنگ کی خصلت ہے۔ یہ جدال کا دستور ہے۔ لیکن امن کے دوران محض سیاست اور مصلحت کی خاطر، ایک زندہ اور متحرک اور جائز (legitimate) قوم کی تاریخی، انسانی تاریخ میں شاید پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ دنیا کی تاریخ فاتح قوموں اور سفاک حکمرانوں کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ فرعون، شداو، نمرود، یزید، چنگیز، ہلاکو، ہٹلر..... اور بیگن اور شے رُون جیسے ظالم حکمرانوں نے انسانیت کے جسم پر اپنی بربریت اور شیطانیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرعون اور ہٹلر وغیرہ کو تاریخ کی مکروہ ترین شخصیتوں میں شمار کیا جاتا ہے اور منانم بیگن کو بیروت کے قتل عام کے بعد امریکی عیسائی لیڈروں نے اعزاز کی ڈگری دی اور ریگن نے انعام کے طور پر اسرائیل سے مزید ملٹری امداد کا معاہدہ کیا۔ ارک شے رُون نے جنگ کے بعد نانم (Time) رسالے پر ہتک عزت (defamation) کا مقدمہ چلایا اور آج بھی نٹن یا ہو کی کا بیٹہ میں ایک اہم وزیر ہے۔

مجھے اگر صیہونیوں سے (عام یہودیوں سے نہیں) کوئی بغض یا شکایت ہے تو صرف اس لئے نہیں کہ انہوں نے ایک اجنبی زمین پر دنیا کے چاروں کونوں سے آکر اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے صدیوں کے رہنے والے باشندوں کو باہر نکال پھینک دیا۔ مجھے زیادہ گلہ اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنی شاطرانہ فراست سے مغرب کے دماغ اور ذہن کو ایسا مفلوج یا منجمد کر دیا ہے کہ اس سلسلے پر عاقلانہ (rationally) تدبیر کی صلاحیت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔

ختم کرنے سے پہلے اس ضمن میں چند شخصیات کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔ کنیڈا میں فلسطین کے نمائندے صالح ارشاد کا میں مشکور ہوں جنہوں نے اپنے کتب خانے سے مجھے تحقیقی مواد (research material) فراہم کیا۔ بزرگ فلسطینی دانشور اور مصنف سامی حداوی کا بے حد ممنون ہوں انہوں نے نہ صرف فلسطین کی آنکھوں دیکھی کہانی مجھے سنائی ساتھ ہی اپنی ساری تصنیفات مجھے برائے ریسرچ نذر کیں۔ اور دو اور شخصیتیں میرے بزرگ کرم فرما کر ام بریلوی صاحب جن کے مشورے پر میں نے اس مضمون کو ایک کتاب کی صورت میں چھپوانے کا فیصلہ کیا، میرے دوست مشکور حسین یاد صاحب جنہوں نے اس کتاب کی نہایت سنجیدگی سے پروف ریڈنگ کی اور آخر میں اپنی ”بہن جیسی بہن“ ثریا کا ممنون ہوں جو میرے ہر پروجیکٹ میں دستِ راست ثابت ہوئیں، جن کی معرفت یہ کتاب فکشن ہاؤس، لاہور سے شائع کروا رہا ہوں۔

اس کتاب کو پڑھ کر اگر آپ کی سوچ میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو جائے تو میں اپنی کاوش کو کامیاب تصور کروں گا۔



اگر آپ فارسی اور انگریزی زدہ اردو کے تین ناقابلِ فہم صفحات لکھ سکتے ہیں  
تو آپ آج کے بہترین نقادوں کا صف میں جگہ پا سکتے ہیں۔

اظہار اثر

۳۰ نومبر ۲۰۰۳ء



اظہار اثر

دہلی، ہندوستان

اظہار اثر کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شعر زیادہ اچھا کہتے ہیں یا ان کی نثر دل نشین ہے۔ ان کا ایک شعر تو مجھے ہمیشہ یاد رہا۔

لہو جلاؤ چراغوں میں روشنی کے لئے ہمارے دور کا سورج تو شب گزیدہ ہے  
اظہار اثر ان چند گئے چنے ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے اردو ادب میں سائنسی فکر کے چراغ روشن کیئے ہیں۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ ادب کے ہر صنف میں انہوں نے لکھا اور خوب لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، انشائیے، تنقید، شعر اور سائنس۔ ان کے دو شعری مجموعے ”بشارت“ اور ”لاشریک“ شائع ہو چکے ہیں۔ درجنوں ناول لکھے ہیں سینکڑوں افسانے لکھے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ”لاشریک“ کی نظمیں ایک نیا تجربہ ہیں۔ بیشتر نظموں میں سائنسی نظریات استعمال کر کے شاعری میں انہوں نے نئی فکر کے دریچے کھولے ہیں۔ انہیں شعر کہنے کے لئے کسی خاص تحریک اور خاص موڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دیکھیے ان کی ایک نظم ”سیارہ سورج“ (کا ایک بند.....)

کبھی میں بھی تھا اک روشن ستارہ خلا کی تیرگی کو بخشتا تھا نور میں بھی  
مگر اب تو قلیل وقت ہو کر رہ گیا ہوں مرے اندر اندھیرا بڑھ رہا ہے  
میں اپنی روشنی خود پل گیا ہوں



کچھ عرصے قبل نئی دہلی کے ایک جریدے ”آجکل“ میں ان کا ایک مضمون ”جمالیات“ شائع ہوا۔ ستمبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں ایک صاحب اسرار الحق قریشی نے لکھا کہ ایک طالب علم نے ان سے پوچھا کہ جمالیات کیا ہے تو انہوں نے اظہار اثر کے مضمون ”جمالیات“ کا حوالہ دے کر کہا کہ ”آجکل“ کا شمارہ دیکھ لیں۔ طالب علم نے مضمون پڑھنے کے بعد کہا کہ طلبہ اور ریسرچ اسکالروں کے لئے ایسے معلوماتی مضامین ضرور شائع کیئے جانے چاہئیں۔

ایک اور صاحب ایڈوکیٹ حماد انجم نے دہلی سے لکھا: ”جناب اظہار اثر صاحب نے ’جمالیات‘ پر اپنے مخصوص سائنٹفک نقطہ نظر سے بحث کی جو بے حد پسند آئی۔ نظریہ اضافیت (Rule of Relativity) مولانا رومی کی جمالیات کا واقعہ، I. Q.، نور تھ ڈائنمنشن، چھٹی حس، مونالیزا کی مسکراہٹ کو جمالیات کے افق پر کس قدر اُجاگر کیا ہے دیکھ کر حیرت و مسرت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں غالب کا شعر ’نقش فریادی ہے...‘ اپنی جمالیتی معنویت کے ساتھ نکھرا ہوا نظر آنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس شعر کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا مگر اظہار صاحب کی تشریح نے مجھ پر یک گونہ سہل کر دیا۔ اس مضمون کے لئے انہیں بہت مبارکباد۔“

اظہار اثر کی ایک کتاب ”سائنس کیا ہے“ پڑھنے سے ہی نہیں بلکہ پڑھ کر یاد رکھنے سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اس پر جناب سید حامد نے جو تبصرہ لکھا ہے وہ ”سچ“ کی منہ بولتی تصویر ہے اور مطالعے کی متقاضی ہے۔ سید حامد نہ صرف ایک آئی اے ایس افسر ہیں بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے ہیں اور آج کل جامعہ ہمدرد کے چانسلر ہیں۔ انہوں نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے۔

اظہار اثر کی کتاب ”سائنس کیا ہے“ اس نیت سے اٹھائی تھی کہ سرسری طور پر دیکھ کر، اوراق الٹ کر، کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کر لوں گا۔ اس سطحی انداز سے جس کا بہانہ مصروفیت، جو بد نظمی اوقات کا دوسرا نام ہے، فراہم کر دیتی ہے لیکن مصنف نے میرے ارادے کو بے دردی سے مسمار کر دیا۔ کتاب جب تک ختم نہ کر لی رکھ نہ سکا۔ سائنس جیسے بظاہر خشک مضمون کی کتاب جس سے مجھے مس بھی نہیں ہے اور وہ بھی اردو میں اتنی پُرکشش ہو سکتی ہے، یہ بات میرے تصور میں آنے والی نہ تھی، اس کا کیا کیجئے کہ تجربے میں آگئی۔ مصنف کو سائنس پر جو قدرت ہے اسے سائنس کا جو ذوق ہے اس نے سنگلاخ موضوعات کو پانی کر دیا ہے۔ مادہ، توانائی، ایٹم اور اس کی ترکیب، زندگی کس طرح وجود میں آئی، سالمہ، ڈی این اے، خلیہ، کروموسوم، جین، تخلیق حیات، کائنات کے راز... مصنف کے قلم نے یہ سارے اسرار بڑی رسائیت، روانی اور کشمکش کے ساتھ کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ وہ پیاس پیدا کرتا ہے اور اسے بجھاتا بھی ہے۔ ایک تشنگی، ایک جستجو دور ہوئی تو دوسری پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ کا جہنم جب وہاں اٹھتا ہے تو کتنا ہی ایندھن اُسے دیکھئے وہ مزید کا مطالبہ کرتا ہے، اور ”ہل من مزید“ کا آواز بلند کرتا ہے۔



اظہار اثر کے طرز بیان کا اندازہ اسی مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کیجئے جس کا عنوان ہے "خاموش آوازیں"۔  
کسی شاعر نے کہا۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے پیک شعلہ سالیک جائے ہے آواز تو دیکھو  
آپ نے جادو کا ذکر سنا ہوگا، لیکن کبھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ جادو کیا ہے۔ خوب صورت الفاظ، دل  
کش جملے اور نرم لوح دار آواز کے علاوہ جادو کیا ہے۔ زبان سے نرم لہجے میں چند اچھے لفظ کہہ  
کر آپ کسی کے دل میں جگہ کر سکتے ہیں اور سخت لہجے میں کوئی بات کہہ کر کسی کو اپنا دشمن بنا سکتے  
ہیں۔ کیا یہ جادو نہیں ہے۔ گویا اشعار، موسیقی اور روزمرہ کے تعلقات میں ایک شے قدر  
مستترک ہے اور وہ ہے آواز۔

"سائنس کیا ہے" کتاب کا نام پہلی نظر میں بلند بانگ لگتا ہے۔ لیکن پڑھنے پڑھنے تو  
سائنس کے بنیادی اصول اور اس کے پُر پیچ حالیہ مظاہر دونوں سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ ماہر  
مصنف نے نہ معلوم کتنی گتھیوں کو سلجھا دیا ہے، کتنی مشکلوں کو آسان کر دیا ہے۔ وہ ہماری انگی  
پکڑ کر تحقیق کی ان اقلیموں میں لے جاتا ہے جہاں علم کی سرحدیں زیر قدم آنے لگتی ہیں۔  
اظہار اثر کے اسلوب کی شگفتگی، روانی اور عام فہمی کے علاوہ ان کی تصنیف کو جس بات نے  
زندہ و تابندہ، دل کش اور دل نواز بنا دیا وہ سائنس کی صداقت پر ان کا ایمان ہے۔ قاری ان  
کی صحبت میں رہ کر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ انسان کی تحقیق اور جستجو کا یہ سلسلہ باطل ہو ہی  
نہیں سکتا۔

اب میں نے ان سے پوچھا، "اظہار صاحب! اپنے بارے میں بتائیے۔ اور یہ بھی کہ آپ  
نے سائنس کی طرف توجہ دی اس کی کوئی خاص وجہ؟"

اظہار صاحب نے بتایا: "سائنس کی جانب میری توجہ ایک طرح سے پیدائشی رجحان کہا  
جاسکتا ہے۔ جب میں پانچویں جماعت میں تھا تو انگریزی کے ٹیچر، ایوب صاحب نے سب سے پہلے  
مجھے بتایا تھا کہ مریخ سیارے پر کسی قسم کی زندگی ملنے کی امید ہے۔ بس اس کے بعد سے مجھے سائنس  
پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ میں نے اردو اور ہندی، دونوں زبانوں میں ہندی فلشن اور سائنسی مضامین  
لکھنے کی ابتدا کی ہے۔ آج کل بہت سے لوگ اردو میں سائنسی مضامین تو لکھنے لگے ہیں لیکن سائنسی  
افسانے یا ناول کسی نے نہیں لکھے۔ یہاں ساہتیہ اکادمی نے ایک انسائیکلو پیڈیا چھاپا ہے اس میں اردو  
میں سائنس پر مضمون لکھنے کی دعوت مجھے دی گئی تھی۔ میرا وہ مضمون (انگریزی میں) انسائیکلو پیڈیا میں  
شامل ہے۔ جس میں میں نے صاف لکھا ہے کہ ہندوستان میں اب تک (یعنی مضمون لکھتے وقت تک)  
میرے علاوہ کسی نے سائنس فلشن نہیں لکھا۔ اور یہ حقیقت ہے۔ میں اس سلسلے میں دہلی میں مقیم مشہور نقاد  
اور پروفیسر امیر بیس جواہر لال یونیورسٹی، جناب ڈاکٹر محمد حسن کا ذکر کرنا چاہوں گا، جنہوں نے میرے



بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا۔۔۔

اردو میں سائنسی مضامین بہت کم لکھے جاتے ہیں۔ سائنس خود ایک الگ دنیا ہے۔ اور اس کے مختلف علوم و فنون پر عام فہم زبان میں اصطلاحات سے قطع نظر کر کے لکھنا خاصا دشوار کام ہے۔ مگر جتنا دشوار ہے اتنا ہی ضروری بھی ہے۔ اردو میں یہ کام اظہار اثر اپنے مضامین کے ذریعے خوبی سے انجام دے رہے ہیں اور اس لحاظ سے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں زیادہ وسعت پیدا کریں اور ان کی کاوشوں کو اردو حلقوں میں زیادہ مقبولیت اور پزیرائی ہو۔ یہ کام آسان نہیں، اردو والوں کے مزاج کو بدلنے کا ہے مگر جتنا دشوار کام ہوتا ہے اتنا ہی ہمت اور حوصلے والوں کو اسے انجام دینے میں لطف آتا ہے۔ اظہار اثر صاحب ہمت اور حوصلے سے یہ کام کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اپنا حلقہ اور وسیع کریں گے۔ دوسرے لکھنے والوں کو اس طرف متوجہ کریں گے اور سائنسی موضوعات پر باقاعدگی سے اور سلسلے کے ساتھ اردو میں لکھنے والوں کی تہذیب و تربیت کے لئے وقت نکالیں گے۔ آج کے دور میں سب سے بڑی تخلیقی خدمت یہ ہی ہوگی کہ سائنسی مزاج کو اردو میں مروج و مقبول کیا جائے۔

اظہار اثر صاحب نے اب تک جس انداز سے اس کام کو سرانجام دیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ آئندہ بھی سائنس کے مختلف شعبوں کو وہ عام فہم بنا سکیں گے اور اردو کے عام پڑھنے والے کے لئے سائنسی موضوعات میں دل چسپی کا وافر سامان فراہم کریں گے۔ سائنس حال اور مستقبل کی کلید ہے اور جو زبان سائنس کو جس طرح اور جس آسانی سے اوڑھنا بچھونا بنا لے گی وہ دور نو کی بصیرت کو اسی قدر کامیابی کے ساتھ اپنانے میں کامیاب ہوگی۔ کام مشکل ضرور ہے مگر مجھے امید ہے کہ اظہار اثر صاحب اردو میں وہ کام کر دکھائیں گے جو ایچ جی ویلز نے انگریزی میں انجام دیا تھا۔

اب اظہار اپنے بارے میں بتانے لگے۔۔۔۔۔ ”میں کرت پور ضلع بجنور، اتر پردیش، ہندوستان میں ۱۶ / جنوری ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوا۔ پوری زندگی قلم سے روزی کمائی اور کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اللہ کے فضل سے ساری زندگی آرام سے گزری ہے اور اپنے تمام فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے نثر نگاری کو ذریعہ معاش بنایا۔ پہلا ناول ’ناگن‘ تھا جس نے ایک سال کے اندر ہی مجھے ہندوستان گیر شہرت سے نوازا دیا۔ اب تک ایک ہزار کے قریب ناول اور پانچ سو سے زیادہ افسانے لکھ چکا ہوں۔“

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔۔۔۔۔ ”ہاں میں متفق ہوں کہ ادیبوں کی گروہ بندی سے اردو کو بہت نقصان پہنچا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اردو کو ختم کرنے میں آج کے نقادوں، نام نہاد ڈاکٹروں اور پروفیسروں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی دکان چلانے کے لئے ہر



بولہوس کو ادیب یا شاعر کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں اور ان کی فہم سے بالائے تعلقات کی بے معنی کو یقین کرنے لگے۔

اردو کی بقا کے لئے میرا مشورہ ہے کہ اردو کو قائم رکھنے کے لئے اردو قاری پیدا کیئے جائیں۔ اردو زبان پڑھنے والے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ عوام میں اردو مقبول ہوگی تو اچھے ادیب اور شاعر بھی پیدا ہوں گے۔ رہ گئی بات رسم الخط کی، اگر اردو کا رسم الخط بدلا گیا تو پھر وہ اردو نہیں رہے گی کیوں کہ اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے جن کو سمجھنے کے لئے اردو رسم الخط بہت ضروری ہے۔“

اظہار صاحب کہہ رہے تھے کہ ان کے پسندیدہ ادیب اردو میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی ہیں۔ انگریزی میں موپاساں، ہیمنگوے، سومرسٹ ماہم، شیخوف، گورکی، چارلس ڈکنز وغیرہ کے ساتھ اور بہت سے نام ہیں جنہوں نے انہیں متاثر کیا ہے۔ اردو مزاجیہ ادب میں شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور مشتاق احمد یوسفی بہت پسند ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اردو میں پچھلے پچاس (۵۰) سال میں کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس نے اردو ادب میں کوئی خاص اضافہ کیا ہو۔ شمس الرحمن فاروقی نے ”شب خون“ نکال کر جدید ادب کی بنیاد ڈالی جس سے اردو ادب کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔

میرا آخری سوال تھا: ”اپنی زندگی کا کوئی یادگار اہم واقعہ سنائیں۔“

کہنے لگے: ”دراصل میری رومانی، سماجی، سائنسی کہانیاں زندگی سے بہت قریب کی کہانیاں ہیں۔ یہ عوامی کہانیاں ہیں جنہیں عوام کی اکثریت نے بڑے شوق سے پڑھا اور اپنی پسندیدگی کے بارے میں مجھے خط لکھے۔ ایک بار ٹیلی ویژن کے ایک انٹرویو میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ میں اس قدر مقبول و مشہور ادیب ہوں پھر بھی تنقید نگار میرا کہیں ذکر نہیں کرتے۔ میں نے ہنس کر جواب میں کہا تھا کہ نقاد مجھ سے خوف زدہ ہیں کیوں کہ عوام میری کہانیاں پسند کرتے ہیں اور میں خود عوام کو اپنا نقاد سمجھتا ہوں۔ میری جس کہانی پر قارئین کو کوئی کمی محسوس ہوتی ہے وہ فوراً مجھے خط لکھ کر اس خامی کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں۔ میں اپنی تعریف میں لکھے گئے بے شمار خطوط کے مقابلے میں ان خطوط کو زیادہ قابل احترام سمجھتا ہوں جو خامیوں کی نشان دہی کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی ہے۔ اس واقعہ کی شہادت میں کئی معتبر ہستیوں اور نقادوں کے نام شامل ہیں جیسے ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عتیق اللہ، جوگندر پال اور مرحوم غلام ربانی تاباں۔“

اسی حوالے سے بتا رہا ہوں کہ یہ آٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک بار ہم سب لکھنؤ ایک سیمینار میں شریک کے لئے جا رہے تھے۔ گو متی ایکسپریس میں ہم نے سیٹیں ریزرو کر لی تھیں۔ دوپہر کو دو بجے ٹرین چلی۔ ہم لوگ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اوپر کی سیٹ پر لیٹ کر سو گیا۔

کچھ دیر بعد شور و غل سے میری آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ ٹرین مراد آباد کے اسٹیشن پر کھڑی ہے اور ڈبے میں اسٹوڈنٹ قسم کے نوجوان بھر گئے ہیں۔ میں نے دیکھا یہ نوجوان ڈاکٹر عتیق اللہ اور ڈاکٹر قمر



رئیس سے بڑے تیز لہجے میں بحث کر رہے تھے۔

”آپ اگر پیسے والے ہیں اور سیٹیں ریزرو کر کے سفر کر سکتے ہیں تو آپ کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ آپ دن کے وقت ہمیں سیٹوں پر بیٹھنے کی جگہ نہ دیں۔“

میں کچھ دیر خاموشی سے یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ڈاکٹر قمر رئیس سے کہا کہ یہ کالج کے اسٹوڈینٹ ہیں، اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے اس لئے ان کو بٹھالو۔

نو جوان کافی بڑی تعداد میں تھے۔ اس لئے ڈبہ ریزور ہونے کے باوجود مصالحت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ ان کو بٹھالیا گیا۔ کچھ دیر بعد میں اوپر کی سیٹ سے اتر کر نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ٹرین چل پڑی تو ایک نو جوان تھیلے سے ایک ناول نکال کر پڑھنے لگا۔ اتفاق سے وہ میرا ناول تھا۔ میں نے ڈاکٹر عتیق اللہ کو بتایا کہ وہ نو جوان میرا ناول پڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے اس نو جوان سے سوال کیا۔ ”کیا آپ اس لیکچر کو پسند کرتے ہیں جس کا یہ ناول ہے؟“

وہ مسکرا کر بولا۔۔۔۔۔ ”انہیں میں تو کیا میرا پورا خاندان ان کے ناولوں کا دیوانہ ہے۔“

”کیا تم اس لیکچر سے کبھی ملے ہو؟“ ڈاکٹر عتیق اللہ نے دوسرا سوال کیا۔

”کبھی نہیں۔“

”ملنا پسند کرو گے؟“

”یہاں۔۔۔۔۔ ٹرین میں!“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یہیں۔“ پھر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا،

”یہ بیٹھے تمہارے مقبول لیکچر۔“

چوں کہ میری تصویریں ناولوں کی پشت پر چھپتی رہتی ہیں، حوالہ ملنے پر نو جوان نے مجھے پہچان لیا۔ اور مجھے پہچان کر جو اس کی حالت ہوئی اس کو ڈاکٹر عتیق اللہ شاید مجھ سے بہتر بتا سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ سارے اسٹوڈنٹ جو کچھ دیر پہلے لڑنے پر آمادہ تھے سیٹیں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جہاں تک سفر کیا کوشش کرتے رہے کہ ہم سب کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچا سکیں۔

اظہار مزاجاً قلندر ہیں۔ اسی لئے خوشامد درآمد سے دور رہتے ہیں۔ دوسروں کی مدد کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ منہ پھٹ بھی ہیں۔ لگی لپٹی انہیں پسند نہیں۔ اپنی کتابوں کو ایوارڈ دلوانے کے لئے انہوں نے گروہ بندی نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے، ”میں اس لئے لکھتا ہوں کہ میری تحریر سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ بس یہ ہی میرے اطمینان کا بہترین ذریعہ ہے۔“

Mr. Izhar Asar,

5-Y New Ranjitnagar, New Delhi, 110008, India





نئی ہے عمر کسی ابد و زکشتی میں  
سنو تمام ہوا اور کچھ نہیں رہ گیا

صفا دلینے

8-7-2003

## ڈاکٹر افتخار نسیم

شکاگو

میں نے اس کا ایک کالم پڑھا، ”ادب میں طوائف الملوکی“۔ اس کالم میں اس نے لکھا تھا...  
”کسی زمانے میں رواج تھا کہ عورتیں مردوں کے نام رکھ کر شاعری کرتی تھیں کیونکہ معاشرے میں  
عورتوں کو مردوں کے ہمسر نہیں سمجھا جاتا تھا جیسے پرانے یونانی معاشرے میں صرف ”میڈیم“ کو شاعری  
کی اجازت تھی۔ شریف عورتوں کو نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی شاعرات کو دیکھ کر ایسے ہی لگتا ہے  
کہ یونانی اس فیصلے میں شاید درست تھے۔ شاعرات کی ایسی ایسی ہولناک کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔  
(کچھ کے ہم بھی چشم دید گواہ ہیں) کہ خدا کی پناہ۔ پاکستان کے اردو ادب میں شاعرہ عورتوں کو مردوں  
کے برابر کھڑا کرنے، بلکہ لیٹنے کا سہرا...“

اس سے آگے لکھتا میرے نزدیک سوئے ادب ہے۔ کالم پڑھ کر میں نے افقی کو فون کیا۔  
(کیونکہ میں ایسے ہی کئی اور کالم بھی پڑھ چکی تھی) ڈاکٹر افتخار نسیم، میں نے غصے میں انھیں مخاطب کیا اور  
شکایت کی کہ کیا بغیر چھیننے اڑائے اور برچھیاں لہرائے وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ تب اس  
نے اپنا دکھ، اپنا درد میرے سامنے رکھا۔

”سلطانہ... دیکھو میں نے (امریکہ میں اپنے سے بڑوں کو بھی نام لے کر مخاطب کرنے کی



رسم ہے، گواہی مجھ سے چھوٹا ہے اور خالد خواجہ بھی اور دونوں کو میں جب موڈ میں ہوتی ہوں ڈانٹ بھی پلاتی ہوں اور دونوں شرافت میں سن بھی لیتے ہیں مگر مخاطب کرتے ہیں سلطانہ کہہ کر...

لاس اینجلس کی ایک افسانہ نگار خاتون کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا اور پھر اس نے ایسے آنکھیں پھیر لیں کہ جیسے کبھی پہچان نہ تھی... وغیرہ وغیرہ۔

افتی کا یہ ہی دکھ کیا کم تھا کہ اس کے اپنوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔ ایک ناکردہ گناہ کے جرم میں، وہ اگر ”گے“ ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ ”تم اپنے ”گے“ ہونے کا پرچار کیوں کرتے ہو۔ کیا تشہیر ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”مجھے منافقت کا سبق کیوں سکھاتی ہیں؟“ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مجھے منافقت سے نفرت ہے۔ میں جو ہوں سو ہوں۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو مجھے اسی صورت میں قبول کریں۔ میں منافقت پسند نہیں کرتا اور اسی لیے اپنے جیسے لوگوں کا ہم نوا ہوں۔ میں نے تو وصیت بھی کی ہے۔ سنو ”وصیت“۔

|                                     |                                  |
|-------------------------------------|----------------------------------|
| ”میں جب مر جاؤں تو                  | مجھے کفن مت پہنانا               |
| کہ میں نے تمام عمر                  | منافقت سے کام نہیں لیا           |
| اگر خدا ہے                          | تو اسے بھی علم ہے                |
| میں جو کچھ ہوں                      | میں کس لیے دنیا سے منہ چھپاؤں    |
| میری میت کے گرد                     | اکٹھے ہو کر                      |
| آیتیں نہ پڑھنا                      | کہ اس خالی مکان میں              |
| اب کوئی نہیں ہے                     | مجھے دفن کر دینا، جلا دینا       |
| یا دریا برد کر دینا                 | مجھے کیا                         |
| اگر مجھے دفن ہی کرنا مقصود ہو تو    | تمام دنیا کی ان مذہبی کتابوں کو  |
| جن میں دوسرے سے نفرت کی             | تلقین کی گئی ہے                  |
| میرے ساتھ دفن کر دینا               | اگر مجھ کو جلا نا ہو تو          |
| میرے ساتھ تمام انسانی نفرتوں        | اور ہتھیاروں کو                  |
| اس آگ میں جلا دینا                  | دریا برد کر دو تو                |
| میرے بدن کے ساتھ روئے زمین کی       | تمام ایٹمی غلاظتوں کو باندھ دینا |
| کہ وہ پھر سطح آب پر واپس نہ آسکیں   | میرے داہنے ہاتھ میں قلم          |
| بائیں ہاتھ میں گلاب اور             | میری قمیص کی جیب میں             |
| میرے شہر اٹل پور، کی مٹی رکھ دینا۔“ |                                  |

وہ چپ ہوا تو جیسے اس کے ساتھ سارا جہان چپ ہو گیا ہو۔ ماحول پر پُر ہول سناٹا چھایا ہوا



تھا۔ میری آنکھیں نم تھیں۔ میں نے اس کے معصوم چہرے پر نظر ڈالی اور سوچنے لگی کہ اگر... یہ المیہ... میرے اپنے بیٹے یا میرے بھائی کے ساتھ ہوا ہوتا تو؟؟؟ میں نے تصور میں اس کی پیشانی چوم لی۔ یہ اس کا اور اس کے رب کا معاملہ ہے۔ ہم اسے ملامت کرنے والے کون ہیں؟ بس اس لمحے، میں نے اس کے غم میں ایک نظم کہہ ڈالی اور اپنے خدائے ذوالجلال سے پوچھا... اے میرے رب کیسی ہے یہ تیری مصلحت؟

اور ایسے ہی کئی سوالات تھے جو میں نے اپنے آپ سے بھی پوچھے۔ مگر اس موضوع پر میرا مطالعہ محدود تھا اور محدود ہی رہا۔ لامحدود ہوتا بھی تو میں کیا کر لیتی۔ میں جانتی ہوں میں بہت امن پسند ہوں اور دوسروں کے معاملات میں فساد برپا کرنا اور نفرت کرنا تو میں جانتی ہی نہیں اور پھر اُفتی تو اندر سے ایک کھرا مسلمان ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کتنا کرب ہے اس نعت میں۔ ملاحظہ ہو۔

|                                   |                                      |
|-----------------------------------|--------------------------------------|
| اب اختتام رنج سفر چاہیے مجھے      | میں ہوں جلا وطن، کوئی گھر چاہیے مجھے |
| شب نے چلے میری آنکھوں سے سداے خوب | جاگا ہوا ہوں کب کا، سحر چاہیے مجھے   |
| امت اسی کی ہوں میں یہی فخر ہے بہت | کس نے کہا کہ لعل و گہر چاہیے مجھے    |
| سب کچھ ہے میرے پاس بفیض رسول پاک  | مانگوں میں ان سے اور اگر چاہیے مجھے  |
| ہے میرے سامنے وہ درِ مصطفیٰ نسیم  | اب تو بیان در و جگر چاہیے مجھے       |

لائل پور کی مٹی سے جنم لینے والے افتخار نسیم کو اپنی مٹی سے عشق ہے۔ پرائمری اسکول میں تھے اسی زمانے سے شاعری سے دلچسپی تھی۔ سولہ سال کی عمر سے انھوں نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ ان کے والد محترم خلیل قریشی بھی معروف شاعر تھے۔ اُفتی کو اپنے بچپن میں بہت سے شعرا سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں جگن ناتھ آزاد، حمایت علی شاعر اور سید محمد جعفری کا نام سرفہرست ہے۔ نو عمری میں علامہ اقبال اور غالب کو پڑھا اور ان کے کلام سے متاثر ہوئے اور آج بھی ہیں۔ اُفتی کہتے ہیں۔ ”میں آج بھی جب بہت ڈپر ہوں تو علامہ اقبال کا ”شکوہ“ پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ گو اقبال اور غالب کو سمجھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ مگر یہ ذہنی مطابقت کی بات ہے۔ بعض وقت ”شکوہ“ کے مطالعے سے مجھے ایک سہارا ملتا ہے جیسے میں نے ”اسمِ اعظم“ پڑھ لیا ہو۔ اسی طرح غالب کو پڑھ کر ایک سرور سا حاصل ہوتا ہے۔ نثر میں کرشن چندر، عصمت اور قرۃ العین حیدر سے بے حد متاثر رہا۔ نیکم بشیر بھی مجھے پسند ہیں۔ مغربی ادیب ہم سے زیادہ جرأت مندی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ جرأت ہمارے ہاں مفقود ہے۔ شاعری میں مجھے ریاض مجید، ظفر اقبال، عدیم ہاشمی، منیر نیازی، ناصر کاظمی، شکیب جلالی نے بہت متاثر کیا۔ جدید شعراء میں انجم سلیمی، مقصود وفا، خواجہ جعفری، اقبال نوید، شوکت خواجہ، منصور آفاق، یاسمین حبیب، صبا ست عاصم واسطی اور صابر رضا کا کلام پسند ہے۔ میں نے یعقوب نظامی کی کتابیں اور جاوید اختر چوہدری کے افسانے بھی پڑھے ہیں اور پسند کیا ہے۔ جاوید کی نئے افسانوی مجموعے ”حرفِ دعا“ کا میں منتظر ہوں۔ مزاحیہ شاعری کے حوالے سے خالد مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور انور مسعود کے نام سرفہرست ہیں۔



افتخار نسیم نے کم وقت میں بہت کچھ لکھا۔ ان کی کتابوں میں غزلوں کا مجموعہ غزال، نظموں کا مجموعہ نرمان اور نیا شعری مجموعہ آبدوز ہے۔ افتی نے افسانے بھی خوب لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے ایک تھی لڑکی اور شہری شائع ہو چکے ہیں۔

افتخار نسیم پچھلے بیس سال سے انگریزی میں بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کی انگریزی نظموں کا مجموعہ مر میکو فائل (Myrmecophile) اور Black and white Poems کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں انھیں شکاگو ہال فیم Hall of Fame کا ایوارڈ دیا گیا۔

افتی نے صحافت میں بھی اپنے کالموں کے ذریعے خاصی اتھل پتھل مچائی ہے۔ وہ نیویارک سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ”پاکستان نیوز“ میں باقاعدہ کالم لکھتے ہیں۔ ان کے کالموں کے مجموعے ”افتی نامہ“ شائع ہو چکا ہے۔ انسانی حقوق اور گے ولز بین حقوق کے حوالے سے انھیں شکاگو کی مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی مضامین پڑھنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔

اگست ۲۰۰۳ء میں ان کی کتاب ”آبدوز“ پر کاروان ادب مانچسٹر کی جانب سے پانچ سو پونڈ کا نقد انعام دیا گیا ہے۔ انھیں ورلڈ پیس اکیڈمی ڈلاور کے علاوہ World Peace Academy Delaware ایک ہندوستان تنظیم کی جانب سے راہنہ راتھ یگور ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ نیز ۱۹۹۶ء میں انھیں ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری بھی عنایت کی گئی ہے۔

لاس اینجلس میں مقیم معروف شاعر خالد خواجہ کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر افتخار نسیم کا مطالعہ بے پناہ ہے۔ وہ ہر سبیکٹ پر اس وقت اظہار خیال کرتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ اسلامی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔

نیو اور لینز امریکہ کے شاعر اور صحافی ناصر خان ناصر بھی افتی کے شیدائی ہیں۔ ان کا کہنا ہے ”افتی جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا افسانہ نگار بھی ہے۔ ان کے افسانے ”بالغ آنکھیں“ بیس ڈالر کا نوٹ، اور چڑیاں داچنبہ“ افتی کے بہترین افسانوں میں سے ہیں جو ان کے افسانوی مجموعے شہری میں شامل ہیں۔ ظالم کالم بھی غضب کے لکھتا ہے۔ میں نے افتی سے ہی کالم لکھنا سیکھا ہے۔“

ابھی دسمبر ۲۰۰۳ء میں معروف شاعر و صحافی ساحر شیوی صاحب اور جناب ارشاد عثمانی نے اپنے جریدے ماہنامہ ”پرواز“ لندن میں افتخار نسیم پر ایک گوشہ شائع کیا ہے جس میں افتی کو جناب احمد ندیم قاسمی، گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، پروفیسر نعیم سی، ایم اور ساحر شیوی نے نذرانہ محبت پیش کیا ہے۔ اس گوشے میں نعیم بشیر کا معرکتہ الاراء مضمون ”خوشیا“ جو اس نے افتی پر لکھا ہے، وہ بھی شامل ہے۔

میں نے ”گفتنی“ کے حوالے سے افتی سے چند سوالات کئے۔ انھوں نے بتایا ”میں ۱۹۷۰ء کے اوائل میں پاکستان سے امریکہ آیا۔ آنے کی وجہ ایک تو روزگار کے مسائل تھے اور دوسرے جب میں نے لاء کر لیا تو میری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ میں شادی کر کے کسی لڑکی کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں امریکہ چلا آیا۔ میں انسانی آزادی کا قائل ہوں چاہے وہ عورت ہو یا مرد۔ ہر ایک کو



اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ میری عمر کا ایک طویل حصہ اسی جدوجہد میں گزرا ہے۔

میں نے شاعری کو کبھی آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ شاعری میری ”کتھارکس“ ہے۔ میرے اندر کا جو غم ہوتا ہے وہ شاعری کے ذریعے باہر آتا ہے۔“

ادیبوں کی گروپ بندی کے حوالے سے افتخار نسیم کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہے ادب کی سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھیں۔ فیض، علی سردار جعفری، ساحر اور منٹو بھی اس کا شکار ہوئے۔ گو علی سردار جعفری کو میں شاعر نہیں مانتا انھوں نے اردو شاعری کو کچھ نہیں دیا اور پدم بھوشن کا خطاب لے لیا۔ ایسے ایوارڈیئے شعرا کی حرکتوں کی وجہ سے رد عمل کے طور پر جدید شاعری کی تحریک شروع ہوئی۔ اس میں وہ لوگ کامیاب ہوئے جو کلاسیک شاعری، ترقی پسندی کے رجحانات اور جدیدیت کو ساتھ لے کر چلے۔ اب نئی تحریک پوسٹ ماڈرن جسے ہم جدید تر کہتے ہیں کا دور ہے۔ میں نے خود افسانہ، نظم اور کالم کو ایک جگہ کر دیا ہے۔ جیسے پہلے مصرعے کی تفسیر دوسرے مصرعے میں موجود ہوتی ہے۔ میرا شعر دیکھئے:

کئی ہے عمر کسی آب دوز کشتی میں سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا

ادیبوں کی گروہ بندی کے حوالے سے انھوں نے کہا جو تحریر نفرت یا تخریب کی بنیاد پر لکھی جائے وہ پائیدار نہیں ہو سکتی۔ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے۔ اسی گروپ بندی نے اردو ادب کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بہر حال ہم کسی گروپ میں ہوں ہمیں اپنی شناخت خود کرانی ہے۔ ادب میں دہشت گردی کر کے آپ عطاء الحق قاسمی، حسن رضوی اور امجد اسلام امجد تو بن سکتے ہیں لیکن گم نام رہ جائیں گے۔ اب یہ شعراء بحیثیت شاعر مرچکے ہیں مگر اپنی تدفین کا خرچہ بچانے کے لیے مشاعروں میں بذریعہ تعلقات بلوائے جاتے ہیں۔ مجھے بھی کئی کرم فرماؤں نے گروپ بندیوں کی وجہ سے بلیک لسٹ کیا ہوا تھا اور آج آپ نے یہ سوال کیا ہے تو میں جو کہہ رہا ہوں اسے لکھنے کے لیے اگر آپ کی کوئی مصلحت آڑے نہ آئے تو آپ میری یہ آواز پڑھنے والوں تک ضرور پہنچائیں، کہ میں نے جدوجہد کر کے ان رکاوٹوں اور گروپ بندیوں کے باوجود خود کو منوایا ہے اور اپنا ایک مقام خود پیدا کیا ہے۔ جیسے زاہد فخری کو پس پشت رکھا گیا اور صابر رضا اور اقبال نوید کو بھی... میری بے باکی اور حقیقت پسندی کی وجہ سے کچھ لوگ مجھ سے تالاں ہیں مگر بقول آسکر وائلڈ:

"I would rather be hated but for what I am than to be loved for what I am not."

ادب میں گروپ بندی صحت مند جواز کے ساتھ ہو تو نقصان نہیں پہنچاتی۔ آگے بڑھنے کی تحریک دیتی ہے، مگر نقصان پہنچانے کے جذبے کے ساتھ بلاشبہ لوگوں کو بے موت بھی ماردیتی ہے۔“ گفتگو خاصی طویل ہو چکی تھی۔ میرا اگلا سوال اردو کے مستقبل کے حوالے سے تھا۔

افتخار نسیم نے کہا ”اردو کے خوشگوار مستقبل کی امید اب چھوڑیں۔ ہندوستان سے تو میں مایوس



ہوں۔ ایک دوست سریندر سور نے میری شاعری ”تین سروں والا رقص“ کے عنوان سے گورکھی میں چھاپی تو میرے پاس ہندوستان سے کئی خط آئے۔ علی گڑھ سے بھی ایک خط گورکھی میں آیا۔ اس لیٹر ہیڈ پر ہندوستانی کئی زبانوں کا نام تھا لیکن اردو کا نام نہ تھا۔ اس کے ذمہ دار ہم اردو بولنے والے ہی ہیں جو نفرت پھیلاتے ہیں۔ آج میں نے روزنامہ جنگ کے ادبی ایڈیشن میں جناب حنیف اختر کا انٹرویو پڑھا۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی ڈراموں میں لوگ ”ق“، ”کو“، ”ک“، بولتے ہیں۔ جیسے قائد اعظم، قابل قبول وغیرہ... کیا حنیف اختر صاحب کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہم نے اسی نفرت کی بناء پر ملک کا آدھا حصہ گنوا دیا۔ ہم نے اقلیت کی زبان اردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔ بنگالیوں میں محرومی کا احساس پیدا کر دیا۔ انگریزی کی مثال لیں۔ امریکہ نے اسے پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ میری کتاب "Myrmecophile" گریجویٹن کے نصاب میں شامل ہے۔ وہاں کسی نے ڈکشن اور تلفظ پر یہ نہیں کہا کہ یہ کسی اہل زبان کا نہیں ہے، لہذا اردو زبان کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں احساس برتری سے نکلنا ہو گا۔ ورنہ کل ہمیں اعتراف کرنا ہو گا کہ اردو کے قاتل ہم ہی ہیں اور جب مجھے یہ احساس ہو گا کہ میں ایک مردہ زبان میں شاعری کر رہا ہوں تو پھر میں کہوں گا کہ ”اردو کو مر ہی جانا چاہیے“۔

اس موضوع پر افتخار نسیم نے ایک کالم بھی لکھا ہے۔

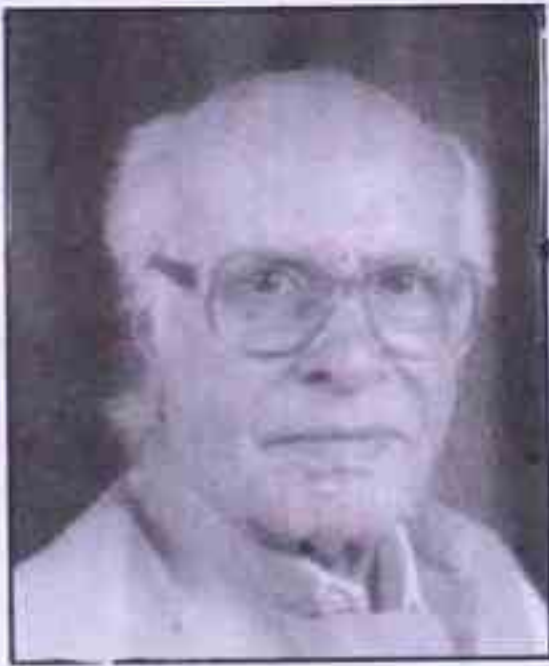
Mr. Iftikhar Nasim

President South Asian Performing Arts Council

6033 North Sheridan Road, Suite 40-J Chicago, ILL 60660  
USA.

E-mail: iftinasm@aol.com





رات خواب میں ہم نے اپنی موت دیکھی تھی  
انہی رونے والوں میں ہم نظر نہیں آتے

(جناب)

2-6-01

۲۰۰۱ء

## اقبال متین

حیدرآباد، آندھرا پردیش، ہندوستان

میں نے جب ۲۰۰۰ء میں ”گفتنی حصہ دوم“ پر کام شروع کیا تو محترم جناب حسن چشتی (مقیم شکاگو، امریکہ) کے توسط سے جناب اقبال متین صاحب کو سوال نامہ بھجوا دیا۔ ان کا جواب آیا تو اس کے ہمراہ ایک نئی خط بھی تھا جس میں انہوں نے مجھے مخاطب کیا تھا..... ”بیٹا سلطانہ مہر“ اور انہوں نے جواب کی رسید بھی مانگی تھی اور معذرت کی تھی کہ وہ ٹکٹ لگا لفافہ بھیج دیتے لیکن ہندوستان کے ٹکٹ میرے لئے بے کار تھے۔ میں سوچتی رہ گئی کہ جواب لکھوں مگر آج کل کرتے کرتے خاصا وقت گزر گیا۔ پھر محترم ناصر بغدادی کا ایک پرانا جریدہ ”بادبان“ نظر سے گزرا تو اس میں اقبال متین صاحب کی دو غزلیں پڑھیں اور میں بے چین سی ہو گئی۔ میں ان کی خطا وار تھی۔ انہیں بروقت خط کا جواب نہیں دے سکی تھی۔ میں ان کے اشعار دہراتی رہی۔

درد کے ساتھ جڑا ہوتا ہے تخلیق کا کرب  
کچھ سوا مجھ کو یہ ہنگام ہنر ملتا ہے  
جس ندیا کا بہتا پانی پاؤں تمہارے دھونے کا  
اس کے تٹ پر بیٹھا ہوں میں ہاتھ میں ایک کنکر بھی نہیں

اور



اٹھو بھی اقبال متین اس کا رستہ یہ تو نہیں ہے

تم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہو اب تو وہ منظر بھی نہیں

اور پھر دوسرے دن محترم حسن چشتی کا ٹیلی فون آیا یوں ہی خیر خیریت پوچھنے اور اقبال متین صاحب کا گلہ بھی پہنچانے کے لئے کہ میں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ میں اپنی غلطی پر بہت دکھی تھی۔ انہیں فوراً خط لکھا اور پھر اب اقبال متین میرے بھائی جان ہیں اور میں ان کی ٹالاکتی بہن۔ اور تب ہی سے میری ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اب وہ دور ہو کر بھی پاس ہیں۔ جب چاہوں ان سے گفتگو کر لوں۔

ایک دن میں نے ان سے کہا، ”اقبال بھائی اپنا کوئی پسندیدہ شعر سنائیے۔“

گھمبیر آواز میں بولے..... ”سنو بہنا!“

ہوا کا جھونکا تھا میں، اپنے باغ میں بھی متین

گزر گیا تو خاک چمن بھی ساتھ نہ تھی

ایک دن میں نے پوچھا، ”کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔ اور یہ بھی کہ آپ کا نام، کیا یہ نام

والدین نے تجویز کیا تھا؟“

سوال سن کر کہا..... ”بی بی! کیا تم واقعی تفصیل سے سننا چاہتی ہو؟ پور تو نہ ہوگی؟“

”نہیں اقبال بھائی۔ میں چاہتی ہوں آپ جیسے مشاہیر اور اہل قلم سے ان کے حالات کے

بین السطور معلومات کا انمول خزانہ بھی ہاتھ آجائے تو وہ ہماری ادبی تاریخ کا اثاثہ بن جائے کیوں کہ یہ معلومات آپ کی اپنی فراہم کردہ ہیں۔ میں نے ادھر ادھر سے جمع نہیں کیں۔ میری اس محنت اور مشقت میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔ اور میں اس کے لئے آپ کی شکر گزار ہوں۔“

انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا.....

”بی بی! آپ جو کام کر رہی ہیں وہ معمولی نہیں۔ آپ عصری ادب کی ایک تاریخ مرتب کر

رہی ہیں۔ اور آپ مجھ سے جو پوچھیں گی انشاء اللہ میں پوری سچائی سے ان سوالوں کا جواب دوں گا۔“

لمحے بھر کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا..... ”میرا تاریخی نام تو سید مسیح الدین ہے۔ عرف اقبال اور تخلص

متین ہے۔ یوں میرا ادبی نام اقبال متین ٹھہرا۔ ۲/ فروری ۱۹۲۹ء کے دن رام کوٹ، حیدر آباد دکن

ہندوستان میں پیدا ہوا۔ انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا چنانچہ بچپن ہی سے شعر

کہنے کا چسکا لگ گیا۔ بچوں کے رسالوں ’پیام تعلیم‘، ’غنجہ‘، ’ہونہار‘، ’سب رس‘ وغیرہ میں نظمیں شائع ہوئیں۔

’پیام تعلیم‘ میں چھپی نظم ’یتیم کی عید‘ نے میری بہت چاہنے والی امی کو مجھ سے خفا کر دیا کہ میں منحوس ہوں۔

’نظم لکھی نہیں۔ اور لکھی تو قیموں کی بات لے بیٹھا‘۔ اللہ نے میرے امی ابا کو بہتر (۷۲) سال سے زیادہ

عمر دی ورنہ نحویت کا یہ کاٹنا مجھے بے آرام رکھتا۔ وہ میری بچوں کے لئے پہلی نظم تھی جس پر میں نے

حضرت مفتوں اجمیری سے اصلاح لی تھی۔ پوری نظم میں انہوں نے دو لفظوں کی اصلاح کی اور پیٹھ تھپک

کر شاباشی دی تھی۔ بے وطن تھے۔ مخلص آدمی تھے۔ ابا نے تحصیلداری کے جنگلے میں رہنے کے لئے ایک



کمرہ دے دیا تھا۔ قلندر صفت آدمی تھے۔ نہ سامان نہ کتابیں۔ چادر بچھا کر پڑے رہتے۔ وطن سے بری خبر آئی اور بلاوا آنے پر بادیدہ نم اتنا سے پھر آنے کا وعدہ کر کے جدا ہوئے۔ پھر نہ آئے۔ نہ ہی خط لکھا۔ ہم سب یاد کرتے رہے آخر شہرہ یاد بن گئے۔۔۔ اُن کی ایک رہائی جو حافظے میں ہے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اُن کی یاد کو محفوظ کر سکوں۔

جو میرا نہیں اب، وہ مکان ڈھونڈتا ہوں  
رہنے کے لئے جائے اماں ڈھونڈتا ہوں  
بے وجہ نہیں چلتا ہوں جھک کر منتوں  
میں عمر گزشتہ کے نشاں ڈھونڈتا ہوں

وہ خاموش ہوئے تو میں نے پوچھا، ”آپ کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟“  
”میں نے سٹی کالج، حیدرآباد میں نویں جماعت میں تعلیم پانے کے دوران ایک کہانی ’چوڑیاں‘ لکھی تھی۔ سال بھر بعد جب پنجاب میں میٹرک کا امتحان دینے کے لئے گیا تو ’ادب لطیف‘ کے دفتر میں اپنی کہانی لے کر پہنچ گیا۔ نذیر چودھری اور احمد ندیم قاسمی صاحبان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ قاسمی صاحب نے پوچھا، ’کون ہو، کدھر سے آئے ہو۔ میں نے پس و پیش کرتے ہوئے کہا، ’جی ادب لطیف میں چھپنے کے لئے افسانہ لے آیا ہوں۔‘ سر سے پاؤں تک مجھے غور سے دیکھا۔ پوچھا، ’لاہور کیسے آنا ہوا۔ حیدرآباد کے لگتے ہو۔ میں نے بڑے ہوئے کہا، ’جی ہاں! میٹرک کا امتحان دینے آیا ہوں۔ حیرت سے پوچھا، ’عثمانیہ یونیورسٹی جیسی قابل فخر تعلیم گاہ رکھ کر یہاں آئے ہو۔ کیا نام ہے؟ میں نے بڑی برخورداری سے کہا، ’جی میرا نام اقبال متین ہے۔‘ چھوٹے ہی کہا، ’یہ آپ حیدرآباد کے لوگ‘ ق‘ کا تلفظ‘خ‘ سے کیوں کرتے ہیں؟ میں نے گستاخی کو ملحوظ رکھے بغیر فٹ سے کہہ دیا، ’جس طرح آپ پنجاب کے لوگ‘ ق‘ کا تلفظ‘ک‘ سے کرتے ہیں۔‘

مسکرائے اور کہانی جو مجھے ’لکھنے پڑھنے کے دن ہیں‘ کہہ کر لونادی تھی واپس لے لی اور کہا،  
’چھوڑ جاؤ۔‘

میٹرک کا امتحان ختم کر کے میں اپنے وطن لوٹ آنے سے پہلے دفتر ادب لطیف کے کئی چکر لگا تا رہا لیکن قاسمی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دو ماہ گزر گئے۔ میں نے سوچا کہ کہانی ضائع ہوگئی۔ ایک دن میرا دوست لطیف ساجد بڑی شتابی سے میرے گھر آیا اور یہ کہہ کر لپٹ گیا، ’تیری کہانی بڑے اہتمام سے ادب لطیف میں چھپی ہے۔ آج میرا یہ اعتماد صرف اسی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ میں اور لطیف ساجد کالج سے بھاگ کر دن دن بھر آصفیہ لائبریری میں مختلف کتابیں پڑھا کرتے تھے جن میں شعرو ادب کو فوقیت دے رکھی تھی۔ لطیف ساجد بھری جوانی میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ آج ہوتا تو شاعری کی توقیر ہوتا۔ مجھے حوصلہ ملا تو میں نے اپنی دوسری کہانیاں ادبی دنیا لاہور (مدیر صلاح الدین احمد) ’نیا دور‘ بنگلور (مدیرہ ممتاز شیریں اور مدیر صد شاہین) میں چھپوائیں۔ اس کے بعد میں اردو فکشن کاہور ہااب اردو نثر اور



شاعری دونوں ہی میرے اہلکار کا ذریعہ ہیں۔“

اپنی نثری تصنیفات کے بارے میں انہوں نے بتایا۔

- ۱۔ فسانے ”اجلی پر چھائیاں“ اشاعت ۱۹۶۰ء آندھرا پردیش ہندی سہایتہ اکادمی ایوارڈ
- ۲۔ افسانے ”نچا ہوا لہم“ اشاعت ۱۹۷۳ء اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ
- ۳۔ ناول ”چراغ تہہ داماں“ اشاعت ۱۹۷۶ء \*
- ۴۔ افسانے ”خالی پیاریوں کا مہاری“ اشاعت ۱۹۷۷ء آندھرا پردیش اردو اکادمی ایوارڈ
- ۵۔ افسانے ”آگہی کے ویرانے“ اشاعت ۱۹۸۰ء اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ
- ۶۔ افسانے ”مزلہ“ اشاعت ۱۹۸۹ء آندھرا پردیش اردو اکادمی ایوارڈ \*\*
- ۷۔ افسانے ”میں بھی فسانہ تم بھی کہانی“ اشاعت ۱۹۹۳ آندھرا پردیش اردو اکادمی ایوارڈ + اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ

۸۔ شخصیات ”سوندھی مٹی کے بت“ اشاعت ۱۹۹۵ء

\* حیدر آباد کے سرکردہ ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دانشوروں کی جانب سے ۲۵ / دسمبر ۱۹۷۷ء کو لائبریری ہال، انوار العلوم کالج، حیدر آباد میں اس کی پزیرائی ہوئی۔ خیر مقدمی چیک اور کیسہ زر کی پیش کشی ہوئی۔ اس موقع پر آندھرا پردیش کے کارپردازان اردو اکادمی اور اکیڈمی کے ارباب اقتدار کی دھاندلی پر احتجاجی تقاریر ہوئیں کہ ججوں کے بورڈ نے اس ناول کو یونیک (unique) قرار دے کر انعام اول کے لئے نام زد کیا تھا لیکن ارباب نظم و نسق نے زعم انا میں فحش قرار دے کر انعام سے محروم رکھا۔ ججوں کے پینل (panel) نے احتجاج کیا کہ وہ حضرات و اصحاب اقتدار جو ہوائی جہازوں اور ریل گاڑیوں کے فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں سفر کے وقت ادب سے تفریحاً دل بہلاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ ادب کیا ہے۔ انہیں حق نہیں ہے کہ پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے انتخاب کے بعد وہ اپنی من مانی کریں۔ لائبریری ہال انوار العلوم کالج میں عالم خوند مری (پروفیسر فلسفہ، عثمانیہ یونیورسٹی) نے احتجاجاً اردو اکیڈمی سے استعفیٰ دے دیا۔ ہندوستان گیر احتجاج مختلف ریاستوں نے اپنے رسائل و جرائد کے ذریعے کیا۔ آندھرا پردیش سے اعظم راہی مدیر، قیشہ، بہار سے کلام حیدری مدیر، مورچہ اور آہنگ، مہاراشٹر سے ’اردو بلٹن‘ کے ذریعہ حسن کمال، عزیز قیسی اور کلام حیدری نے واضح طور پر لکھا کہ ’اے پی اردو اکادمی کے دھاندلی کرنے والے کارپردازان ادب اپنے ناموں کے ساتھ سامنے آئیں۔ اقبال متین پر فحش نگاری کا مقدمہ چلایا جائے تاکہ وہ یا اکادمی میں ادب کے ٹھیکیدار مناجج کا سامنا کر سکیں۔‘ ’اردو بلٹن‘ نے چوں کہ اس دھاندلی کی تشہیر میری تصویر چھاپتے ہوئے اپنے طویل تبصرے سے کی تھی چنانچہ اکادمی کے ارباب اقتدار نے ’بلٹن‘ کی ساری کاپیاں حیدر آباد اور سکندر آباد کے بک اسٹالوں سے خرید کر چھپا دیں۔ اب پروفیسر ہوشنگ مرچنٹ اس ناول پر کام کر رہے ہیں۔

\*\* ادبی خدمات کے اعتراف میں ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی جانب سے خیر مقدمی



تقریب، تقاریر اور گزٹل قدر کی پیش کش ۱۹۸۹ء میں مہدی چٹم حیدر آباد، بھارت منعقد ہوئی۔ اس کے علاوہ مجھے ادبی ٹرسٹ کا تحفہ اعتراف خدمات دسمبر ۱۹۸۹ء میں اور اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۹۰ء میں دیا گیا۔

اب میری نثر کی پانچ کتابیں اور شاعری کا ایک مجموعہ زیر اشاعت ہے۔

اب میرا اگلا سوال ادیبوں کی گروہ بندی سے متعلق تھا۔ اس ضمن میں ان کا جواب تھا ”جی ہاں! کوئی شک نہیں کہ ادیبوں کی گروہ بندی نے اردو زبان و ادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ ادب کو نظریاتی آماج گاہ بنانے سے ادب اپنی تخلیقی بلندی سے گر جاتا ہے۔ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے۔ نہ صرف نظریاتی اختلافات نے تخلیقی اوج (urge) (گلن) سے وسیع الذہنی چھین لی اور اچھے برے کی تمیز اٹھادی تو ادھر سجادہ نشین قسم کے متعصب ناقدوں نے خاص طور پر اردو میں فکشن کو ہدف ملامت بنایا اور نظریاتی تعصبات کو ادب میں ہوا دے کر اپنی اپنی مسدیں سنبھال لیں۔ کسی کو اٹھانا تھا تو اتنا نواز کہ وہ گمراہ ہو کر تخلیق کا صحیح منصب بھول بیٹھے لیکن جب انہیں احساس ہوا کہ وہ خود اپنی شناخت کھو رہے ہیں تو خود احتسابی نے ان کی مدد کی۔ اب نہ ترقی پسندوں کے خلاف واویلا ہے جنہوں نے بلاشبہ اردو افسانے کو بام عروج پر پہنچایا نہ قاری سے بیرجس نے فیشن کو ادب ماننے سے انکار کر دیا۔

اب سب سے اہم مسئلہ اردو زبان کی ترویج و بقا کا ہے۔ ہم اپنا ورثہ کھو رہے ہیں۔ اس کی سلامتی کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو مادری زبان اردو میں ابتدائی تعلیم ہی سے پڑھائیں۔ ان میں اردو زبان کے لئے محبت اور افتخار کا جذبہ پیدا کریں۔“

اگلے سوال کے جواب میں اقبال متین کہہ رہے تھے۔ ”میں نے ادب کو مالی منفعت سے وابستہ کر کے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میں نے اردو سے اسی طرح پیار کیا ہے جس طرح بچپن میں کھیل کود سے یا کہانیوں سے کیا تھا۔ مجھے اردو زبان کا ادیب اور شاعر ہونے پر فخر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری زبانوں کے ادیب اپنی تحریروں سے پبلشر حاصل ہونے کی بنا پر اردو کے ادیب سے مالی استحکام رکھتے ہوں۔ آپ کا سوال اپنی جگہ اہم بھی ہے کیوں کہ آج اردو کی زبانوں حالی کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلے میری کتابیں لکھنو اور الہ آباد کے ناشر کتاب ترتیب دیتے ہی اشاعت کے لئے لے لیتے تھے۔ آج صورت حال مختلف ہے۔ اس لئے اردو ناشرین کو اردو کتابوں کے خریدار نہیں ملتے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار کون ہیں؟ ہمارے فیشن زدہ ایسے والدین جنہوں نے اپنی کم علمی اور جھوٹی شوکت کے لئے اپنی اولاد کو قربان کیا ہے۔ صرف ایک نسل کے تفاوت (generation gap) نے ہمارا ادب ہم سے چھین لیا ہے۔ میں مایوس نہیں ہوں اور اس لئے نہیں ہوں کہ اب سوچنے کے انداز بدل رہے ہیں۔ اردو زبان کے لئے سلطانہ مہر جیسی بینیاں پیدا ہو رہی ہیں تو ایک دن اردو بول اٹھے کہ۔۔۔

سارا جہان میرا وطن ہونا جائے اب۔۔۔

ہمارا سلسلہ گفتگو پھر اردو کے مستقبل تک جا پہنچا۔ وہ بڑے دکھ سے کہنے لگے



”میرے وطن مالوف ہندوستان میں انگریزی ذریعہ تعلیم کو اپنانے کی غلامانہ ذہنیت نے ہم سے ہمارے گھروں کے آنگن چھین لیے ہیں۔ ہماری ماں بچیں یہ بھول گئی ہیں کہ مادری زبان بھی اپنے اصلی دودھ کے ساتھ اپنے لخت جگر میں منتقل کرتا ہی اردو کی زندگی کی ضمانت ہے۔ جب تک ہمارے دلوں میں اپنی مادری زبان سے انسیت پیدا نہ ہوگی ہم اس کے ہو رہے کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ فیشن زدہ مسلم گھرانے اپنی معاشی برتری کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنی سماجی پوزیشن کا تماشا کر کے انگلش میڈیم اسکولوں کی دکانیں سجانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ ان اسکولوں میں اساتذہ کو بھی انگلش سے معمولی واقفیت رہتی ہے۔ اسکول کے پرنسپل صاحب نے یہ کاروبار انگریزی کے دو جملے صحیح نہ لکھ سکے کے باوجود شروع کیا تھا۔ آج ان کے کمروں کی چھوٹی تختی بڑے بڑے بورڈوں کے ساتھ بلڈنگوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ہمارے اردو اسکولوں کی زبوں حالی کا بنیادی سبب یہ ہی ہے کہ آج اردو والوں نے خود اپنے ہاتھوں ان کی معیشت کو تاراج کر کے مشن اسکولوں اور ان کے نقالوں کا دامن بھر دیا ہے۔ افسوس یہ یہی ہے کہ یہ حصول علم کی خاطر نہیں بلکہ والدین کی علمی بے بضاعتی کو سماجی برتری سمجھنے کی ہوسنا کی کے سبب ہو رہا ہے۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ انگلش میڈیم میں بچوں کو پڑھانا ان کی سماجی برتری کے اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ اس غلامانہ ذہنیت نے کافی حد تک نقصان ہماری معاشرت کو پہنچایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگریزی انٹرنیشنل زبان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ان کو اس بات کی پروا نہیں کہ ان کی اولاد جب کہیں کی نیشنل ہی نہیں ہو سکی تو انٹرنیشنل کا کون سا تصور ان کے ذہن میں رہے گا۔ میرے بس میں ہو تو میں سارے انگلش میڈیم اسکولوں کے نام سے کھلی ہوئی خمیر فروشی کی دکانیں بند کرادوں جو ہماری تہذیب، ہماری معاشرت، ہماری ثقافت اور ہماری معیشت کے ساتھ کھلواڑ کر کے علم کے نام پر جہل کی دکانیں سجائے ہوئے ہیں۔ کسی بھی شہر کی آبادی کے مد نظر اس میں رہنے والوں کا ان کی مادری زبان کو اولین حیثیت دے کر سروے ہونا چاہیئے تاکہ علم کی درس گاہ سے نکل کر بازار کی رونق نہ بن سکے۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اپنے دور حکومت میں سارے انگلش میڈیم اسکول بند کر دینے کا اقدام کیا تھا تا کہ قومی زبان ہندی کو ترقی دی جاسکے۔ انگلش میڈیم کا ایک آدھ اسکول وہاں کے رہنے بسنے والوں کی تعلیمی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر ان کی تعداد کے مطابق زیر غور تھا۔ اور بقول جان نثار اختر۔

ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا

کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑادی جائے

اور ہم بھی اردو کے دکھ کا حل ملائم سنگھ یادو کی طرح کا کوئی ڈھونڈ لیں۔ ساتھ ہی انگریزی میڈیم اسکولوں کے دلدادہ والدین کے سامنے اقبال کا دیا ہوا سبق بھی دھرا دیں۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار

اقبال متین اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں ہرگز نہیں۔ ان کا کہنا ہے.....



”رسم الخط اردو کا صرف لباس ہی نہیں ہے اگر اس کی تجسیم کی جائے تو اس کا رسم الخط اس کے جسم پر چمڑی اور پوست کی طرح ہے اور اس کے پوست کو تن سے جدا کرنے کی سعی نہا مشکور کے لئے میرے وطن میں چوطرف سے غیر مرئی بھالوں برچھوں سے یلغار کیا جا رہا ہے۔ دشمن دوست کے روپ میں چھپ گیا ہے اور میرے وطن کے مسلمان اپنے بچوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ سامنے والے کا مکھونا اتار کر اصلی صورت تک پہنچی بعض ناماقتب اندیش والدین جو ہندوستان کے شہروں، ضلعوں، قریوں اور قصبوں میں آباد ہیں ان کو بھی انگلش میڈیم کی دکانوں نے گمراہ کر رکھا ہے۔ بچوں کو ’نک ٹائی‘ لگا یو نیفارم ان کے ماں باپ کو اپنے اپنے گاؤں سے لے کر شہر تک معاشرے میں برتری عطا کرنے کا وسیلہ سمجھ رکھا ہے۔ بعض پڑھے لکھے حضرات اردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط کے اضافے کو اردو کی بقا کا ضامن سمجھتے ہیں۔ اس خیال کی عملی صورت گری ممکن نہیں ہے۔ ایک اردو کی کتاب کو دوسرے رسم الخط میں چھاپ کر مصنف اس قدر زیر بار ہوتا ہے کہ پھر کبھی کسی کتاب کی اشاعت کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہ برخود غلط نظر یہ اردو کی ترویج کو خیر کیا کرے گا ہاں اردو کو ہندی میں ضم کر کے اس کا وجود مٹا سکتا ہے۔“

اردو افسانے میں انہیں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، اختر اورینوی، خدیجہ مستور، غیاث الدین گدی، قاضی عبدالستار، اور صنف شاعری میں اقبال اور فیض پسند ہیں۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا: ”بی بی! آپ اردو زبان و ادب کے لیے اتنا اہم دستاویزی حیثیت کا کام کر رہی ہیں کہ دلی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ آپ کو بہن کہوں کہ بیٹی کہوں۔ میں نے تو زندگی کے ستر (۷۷) سال گنوائے۔ اللہ آپ کو بہت رکھے۔ آمین! آخر میں اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ یاد کر کے وہ آزر دہ ہو گئے۔ انہوں نے پہلے اپنا ایک شعر سنایا۔

میرے بچوں کے مزاروں پہ مجھے کل شب کو  
کوئی نم آنکھوں سے جینے کی دعا دیتا تھا

اپنے تینوں بیٹوں، فرید اقبال عمر ۱۳ سال، سدید اقبال عمر ۷ سال اور موسید اقبال عمر ۱۱ سال کی جدائی کے غم میں انہوں نے ناصر کاظمی کا یہ شعر پڑھا۔

ہم تمہیں بھول کے خوش بیٹھے ہیں  
ہم سا بے درد کوئی کیا ہوگا

Mr. Iqbal Mateen,

Atif Manzil, 20, 5-576/577, Shakar Ganj, Hyderabad, AP. 500065, India





میں کرب و الم اور دکھ درد کا  
شاہکار ہوں۔ کاتبِ لوح و قلم کا اور تصویرِ کل کا۔ وہ پارہ  
فنا ہے مثل ہے جسے صاحبِ فن لمحہ درد میں تخلیق کرے۔  
میں بے مثل ہوں۔

۲۰  
۲۰۰۳

## محمد الیاس

میرپور، آزاد کشمیر، پاکستان

اس وقت محمد الیاس کے افسانوں کے چار مجموعے میرے سامنے ہیں جن میں اُناسی (۷۹) افسانے ہیں اور معرکے کے افسانے ہیں۔ یہ چلتی پھرتی کہانیاں ہیں، ہماری آپ کی کہانیاں اور ہم ہی سے منسوب ہیں۔ ان افسانوں کے مجموعوں کے فلیپ پر کسی کی رائے نہیں۔ ابتدائی صفحات کسی حید افسانہ نگار کی رائے، پیش لفظ کے طور پر مزین نہیں۔ ان افسانوں کے مجموعوں کے فلیپ پر کسی بڑے (یا کہنے کے لئے چھوٹے) افسانہ نگار، نقاد یا دانشور کی رائے نہیں۔ کتاب کے ابتدائی صفحات کسی حید افسانہ نگار یا بخیر نقاد، بقراطی دانشور کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے مزین نہیں۔ یہ ایک خوددار افسانہ نگار کے کردار کا اظہار ہے جو ”خوگرِ ثنا“ نہیں یا یہ اس کا باغیانہ رویہ ہے جس نے اسے کسی کے سامنے ”کارہیسی برائے ذاتی توصیف“ کرنے نہیں دی۔ ان دانشوران کے اُس رویے کے خلاف جو، باوجود اس کے کہ الیاس کے افسانے پاکستان کے موقر جرائد مثلاً اوراق، البلاغ، بصیر، اقدار، رابطہ، تخلیق اور تجدید نو میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں، اپنے علاوہ کسی دوسرے ادیب کو درخور اعتنا نہیں گردانتے یا اپنے جیسے ہمعصروں کے گٹھ بندھن بنا کر انجمن ستائش باہمی کے نظریہ پر کاربند ہیں اور کسی باہر کے ادیب کی تعریف میں بخل کرتے ہیں۔ اس نے ایک بار اپنے ایک افسانہ نگار دوست جاوید اختر چودھری سے، جنہوں نے اس کے افسانوں کی تعریف کی تھی، پوچھا ضرور تھا،



”کیا میری کہانیاں اس لائق نہ تھیں کہ میرے ملک کے ”عظیم نقاد“ ان پر چند سطروں میں اپنی رائے ظاہر کرتے، چاہے وہ تعریف میں نہ ہوتیں، تنقیدی مشعل کے لئے ہی ہوتیں۔ کسی ادبی تذکرے میں میرا ذکر ہوتا، ان کہانیوں کا ذکر ہوتا۔“ الیاس کے دوست کو بھی پتا تھا کہ اس کے لئے ایک خاص ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے جسے ”خود اشتہاری“ کہتے ہیں۔ یہ ہنرمندی الیاس میں نہ تھی اور نہ کبھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے الیاس کو صبر کر لینا چاہیے۔ یا اخباروں کے ادبی مدیروں سے رابطہ کر کے اپنے انٹرویو کرانے چاہئیں اور اپنی کتابوں کی ”رومائیوں“ کی تقاریب منعقد کرنے یا کروانے اور کچھ نہیں تو چند ”مقتدر دانشوروں“ سے ”علیک سلیک“ تو رکھنی چاہیے، کہ یہ ہی زمانے کا تقاضہ ہے۔

الیاس کو دنیا داری نہیں آتی۔ روپیہ کمانے کا ”گر“ نہیں آتا کیوں کہ اس کی ذہنی تربیت ہی ایسی ہوئی ہے۔ اس قلندر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ملاحظہ ہو:

الیاس نے بتایا، ”کان کنی کاروج رواں میں خود تھا۔ تاہم چند مخلص اور جاں نثار دوست بھی شریک تھے۔ بزنس آفس (business office) کاروباری دفتر) اسلام آباد اور معدنی ذخائر دور دراز پہاڑی علاقوں میں واقع تھے۔ ہم نے ایک ادنیٰ صنعتی معدن کے لئے حکومت سے ایک ایریا (area قطعہ زمین) لیز (lease) پر لے رکھا تھا جس سے معقول روزی مل رہی تھی۔ میں ہر پندرہ روز کے بعد اسلام آباد سے پہاڑ پر جایا کرتا تھا۔ کان سے نکاسی جاری تھی۔ میرے دوست اور بزنس پارٹنر (business partner) کاروبار کے ساجھی (saint) (site جائے وقوع) سے چند میل دور ایک قصبے میں رہائش پذیر تھے جہاں سے وہ کام کی نگرانی، نکاسی اور ترسیل کا کام کر رہے تھے۔ میرے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے انتظار میں گھڑیاں گنا کرتے تھے اور جب میں سائٹ آفس پہنچتا تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہتا۔ عملاً میرے جوتے سیدھا کیا کرتے۔ دیگر عملے کا رویہ بھی والہانہ اور محبت آمیز تھا۔ اسی اثنا میں نکاسی کرتے ہوئے مائن (mine کان) کے اندر ایک قیمتی معدن کا بڑا ذخیرہ سامنے آ گیا۔ اب ہماری آمدنی ہزاروں سے لاکھوں میں ہونے کے امکانات روشن ہو گئے۔ ہم نے قانون کے مطابق حکومت سے اس نئے معدنی ذخیرے کی لیز بھی حاصل کر لی چوں کہ اس پر ہمارا اولین استحقاق تھا۔ پیشتر اس کے کہ خزانے پر باقاعدہ کام کا آغاز کیا جاتا، میں نے دیکھا کہ میرے دوستوں کے رویے بدل گئے ہیں اور ان کی آنکھوں سے وہ محبت مفقود ہو گئی ہے جو میرے لئے وافر ہوا کرتی تھی۔ عملہ چوں کہ براہ راست دوستوں کے زیر اثر تھا اس لئے وہ بھی سر دمہری سے پیش آنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہم کسی الف لیوی داستان کے کردار ہیں اور جو خزانہ قدرت کی فیاضی کے طفیل دریافت ہوا تھا اس پر ایک زہریلا شیش ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کی سوچوں میں سرسراتی حرص و طمع کی پھنکار سن لی تو کنارہ کش ہونے کا ارادہ کر لیا۔ روپنڈی/اسلام آباد کے کچھ بااثر شناساؤں نے پیشکش کی کہ اگر انہیں ساتھ ملا لوں تو ضلعی انتظامیہ اور پولیس کی مدد سے مائن پر قبضہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے اس مائن سے خون کی بو آنے لگی ہے اس لئے دوبارہ وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ معدنی دولت سراسر اللہ کی دین ہوتی ہے اور کیا خبر کہ آج جو قیمتی معدن کی موٹی رگ دکھائی



وہ رہی ہے، چند دن نکالنے کے بعد سامنے پتھر کی دیوار آجائے اور ہم کل اثاثہ بیچ کر بھی دوبارہ اسے کھود نہ پائیں۔ چوں کہ بیٹوں میں خلل در آیا ہے لہذا حرص و ہوس کا ناگ خزانے پر بیٹھ گیا ہے۔ نہ جانے کس لمحے وہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ پڑے۔

دب لفظوں میں مجھے بزدلی کے طعنے دیئے گئے لیکن میں سب چھوڑ چھاڑ کر آزاد کشمیر چلا آیا۔ اگلے چند ماہ کے اندر اندر اسی مائن پر گولیاں چلیں۔ کچھ زخمی ہوئے، ایک شخص قتل ہو گیا۔ میرے سابقہ پارٹنر اور دوست جیل چلے گئے اور میری بھابیوں کی اپیلیں حاکم وقت کے نام اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ کسی بھی مائن پر جھگڑا ہو جائے تو حکومت لیز کینسل (cancel مغسوخ) کر دیتی ہے۔ سوشل بلڈ کے تحت وہ نیلام ہوئی اور علاقہ غیر کے کچھ قبائلی سرداروں نے سب سے زیادہ بولی دے کر مائن حاصل کر لی لیکن بعد ازاں چند مقامی با اثر لوگوں کے ساتھ پھر قضیہ کھڑا ہو گیا۔ میں تو پھر وہاں لوٹ کر کبھی نہیں گیا۔ شنید ہے کہ کسی کو وہاں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ غالباً گزشتہ برس شدید بارشوں کے باعث بہت بڑے پیمانہ پر لینڈ سلائیڈ (landslide) ہوئے (ریزش زمین) ہوا اور معدنی خزانہ لاکھوں ٹن بلے تلے دب گیا۔ میں نے ان اس تمام عرصے میں کبھی رتی بھر ملال محسوس نہیں کیا بلکہ مطمئن رہا چوں کہ میں جانتا تھا کہ ایک رات بھی مجھے حوالات میں رہنا پڑ جاتا تو میری ماں اکلوتے بیٹے کے بارے میں خبر سنتے ہی دم توڑ دیتی، میری رفیقہ حیات، میری تزکین سوائے اس کے کہ مریم کو گود میں لیے بیٹھی آنسو بہایا کرتی اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ میں نے تصور کی آنکھ سے قبل از وقت جو منظر اپنی مائن پر دیکھا وہ بہت جلد حقیقت میں وقوع پذیر ہو گیا۔

اس واقعے کو سننے کے بعد سکوت سا چھا گیا۔ اور دکھ کے سنائے سے نکلنے کے بعد میں نے کہا کہ اب وہ اپنے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔ کہنے لگے، ”میں نے ۲۲ / دسمبر ۱۹۴۶ء کی ایک انتہائی سرد رات میں نوشہرہ (گجرات) اپنے ننھیال میں جنم لیا۔ محمد الیاس نام رکھا گیا۔ شاید یہ اسی نام کا اثر ہے کہ کرب و الم اور تنہائی کا احساس زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ تعلیم بی اے تک حاصل کی۔ راجپوتانہ سے جھنگ میں آئے ہوئے میرے پرکھوں میں سے ایک بزرگ سرداری سے محروم ہوئے تو جان بچانے کے لئے روپوش ہو کر گجرات کے نزدیک چناب کے کنارے آباد ہو گئے۔ اسی گم نام خاندان کے فرد مراد بخش سیال کے سلسلے کی ایک کڑی جہرتوں کے دکھ اٹھائے، بے چین روح میری صورت میں متشکل ہوئی۔ کم سنی کا اولین دور جو استان کی سحر طراز چاندنی راتوں اور افق تا افق پھیلے بے آب و گیاہ ریگزاروں پر زندگی کے تجریدی روپ کا مشاہدہ کرتے ہوئے گزرا۔ یہاں سے ایک اور ہجرت مجھے کوہستان نمک کے دامن میں بچھے تھلے پہلے میں لے آئی، جہاں بیک وقت فطرت کے جوہر جفا اور جود و سخا کے مظاہر دیکھے۔ لڑکپن کا بیشتر حصہ وسطیٰ پنجاب کے بڑے چھوٹے شہروں کی گلیوں اور بازاروں میں کہیں کھو گیا یا مضافات کے سرسبز و شاداب نظاروں اور پتہ پتہ پگڈنڈیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ یہاں سے پھر ایک بار جنوبی پنجاب کی طرف سفر کیا اور ولیوں کے شہر چلا آیا جہاں کے اصل و سنیوں (بسنے والوں / باسیوں) کی شاعری جیسی میٹھی بولی آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے۔ ایک حسین یاد باز گشت کی صورت میں تعاقب کرتی رہی، میرے من کی وسعتوں میں پھیلے لقمے و



دق صحرا میں ایک حیات افروز نخلستان کی مانند۔ لیکن میں نے وہاں پڑاؤ ختم کیا۔ میرے کوچ کے بہت بعد بھی لوٹ آنے کی صدا سنائی دیتی رہی لیکن مقدر کی جن بھول جھلیوں میں بھٹک رہا تھا وہاں سے پلٹ کر دیکھنا لا حاصل تھا۔ ایک اور مسافت پر میرے انتظار کی تھکن غالب آنے لگی تھی۔ مجھے ساحلوں کی ریت پر بٹے بگڑتے نقوش کی گواہی دینا تھی۔ انسانوں کی طرح بولتی اور چلتی پھرتی مشینوں کے اس سمندر شہر نے مجھے قبول نہیں کیا تو نفسا نفسی کی ان گنت تلخیاں دامن میں سمیٹ کر آبلہ پا لوٹ آیا۔ جب پونھوار کے دل فریب مرغزاروں نے مجھے پناہ دی تو جدید و قدیم کے حسین امتزاج جزواں شہروں میں مقتدر ایوانوں سے دور الگ تھلگ ایک گم نام شخص کی طرح سکونت اختیار کر لی۔ ملکہ کوہسار کے دامن میں پنہاں کوہ قاف کی ایک پری سے نسبت ہوئی لیکن وہی صدیوں پرانی داستان ڈبرائی گئی۔ خالص اور سچے جذبے تو نگری کے مقابل ماٹھ کھا گئے۔ دل کے نہاں خانوں میں مختصر دورانیے کے لئے آباد ہونے والی محبت کی بستی اجڑ گئی۔ حاکموں کے اس شہر میں میری ادھوری تعلیم مکمل ہوئی اور حصول رزق کے لئے کان کنی کا پیشہ اختیار کیا تو پنجاب، سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے بلند و بالا پہاڑوں میں سرگرداں رہا جب کہ خام معدنیات کی سوداگری کے لئے لاہور اور کراچی جیسے میٹرو پولیٹن شہروں کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں قائم صنعتی علاقوں کی جانب تسلسل سے سفر کرتا رہا۔ مارگلہ کے پہلو میں صدیوں سے جاری فیضان کا نور نہ جانے کہاں سمٹ گیا اور کروڑوں انسانوں کی امنگوں کے مرکز اس حسین شہر پر استحصالی قوتوں نے استبدادی پنچے گاڑے تو یاس کی گہری تاریکی ملک کے طول و عرض تک پھیل گئی۔ تاہم زندگی کا سفر کسی طور پر جاری رہا۔

ترکین تاباں کا انتخاب، میری شریک حیات کے طور پر میری ماں نے کیا تو اسی شہر میں عمر بھر رفاقت نبھانے کے عہد و پیمان ہوئے۔

میری روح کی بخت میں بنی گہری ادا سی شاید عمر بھر مجھے پہاڑوں اور بیابانوں سے ہی وابستہ رکھتی اور میں کسی پہاڑی چٹان سے لڑھک کر گہری کھائی میں یا پھرے ہوئے دریا کی موجوں کی نذر ہو گیا ہوتا اور یوں ایک گم نام شخص اپنے تمام تر داخلی درد و الم کے ساتھ ہمیشہ کے لئے دنیا کی نظر سے اوجھل ہو گیا ہوتا لیکن ابھی کچھ اور دکھ جھیلنے تھے۔

آبائی طور پر شہروں اور قصبوں کا باسی ہونے کے باوجود میرے دل کی دنیا میں تاحد نگاہ اجاڑ نیلے، خشک دریا اور لقا و دق صحرا دکھائی دیتے ہیں اور میں کسی نخلستان کی جستجو میں بے کارواں سراب در سراب ہجرتوں کے سفر پر گامزن ہوں۔ کبھی ریت کا سمندر عبور کر بھی لیا تو خود کو بلند و بالا پہاڑوں کے رخ بستہ اُداس برفزاروں میں تنہا پایا، تب میں اپنے ہی نقش پا پر واپسی کے سفر پر نکل پڑا۔

چونکہ ابھی ایک اور ہجرت نہ جانے کب سے گھات لگائے بیٹھی تھی، میں بھری جوانی میں اچھا بھلا کاروبار تیاگ کر آزاد کشمیر چلا آیا اور بھیدوں بھری منگلا جھیل کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے سکون اور خوب صورت شہر میرپور میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں کچھ خوشیاں اور بڑے صدے منتظر تھے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اس قیام کو ثبات حاصل ہے یا مقدر میں لکھا ہے کہ مجھے کہیں اور کوچ کر جانا



ہے۔ بلاشبہ میری زندگی کی کٹھن مسافت میں تزنین نے صبر و استقامت سے میرا ساتھ نبھایا ہے۔ میری بیٹیوں مریم اور ماریہ اور بیٹے پیو کا وجود میرے زندہ رہنے کا جواز ہے جو ہماری رفاقت کا ثمر ہے۔

آپ نے پوچھا ہے میں نے ادبی سفر کب شروع کیا۔ ہوش سنبھالتے ہی آرٹ سے وابستگی کے سیمٹم (symptoms) ظاہر ہو گئے تھے۔ کم عمری میں تصویریں اور مٹی سے مجسمے بنانے میں خاصی مہارت حاصل ہوئی۔ نویں و سویرں جماعت میں افسانے لکھے جو شمع، کراچی، لاہور اور اسی قبیل کے دیگر فلمی پرچوں میں شائع ہوئے۔ اسی عرصے میں وقت کے بہت بڑے شاعر کی خستہ حالی کا مشاہدہ اور زندگی کے تلخ حقائق کا ادراک ہوا تو ادب سے تائب ہو گیا۔ ۱۹۹۰ء میں کچھ ایسے صدمے وارد ہوئے کہ میرے باطن کی دنیا تہہ وبالا ہو گئی۔ اور میں اپنے دکھوں کو سینے سے لگائے اپنی ہی ذات کے کسی ویران گوشے میں سمٹ کر رہ گیا۔ قلم اٹھایا تو درد و الم کے مناظر پینٹ ہوتے چلے گئے جنہیں قسط پر دیکھ کر مجھے حزن و ملال میں تخفیف محسوس ہوئی۔ تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔ اشعار بھی موزوں کیئے۔ لیکن میری شناخت میری کہانیوں سے ہے۔

میرے افسانوں کے مجموعے 'لوح ازل پر لکھی کہانیاں' (۱۹۹۵ء)، 'مور پتکھ پر لکھی کہانیاں' (۱۹۹۷ء)، 'صدیوں پر محیط ایک سفر' (۱۹۹۸ء) اور 'منظر پس غبار' (۲۰۰۰ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ 'دوزخ میں ایک پہرہ رواں سال کے وسط میں منظر عام پر آجائے گا۔ آزاد کشمیر کا سفر نامہ 'چنار وادی' کے عنوان سے ماہنامہ 'رابطہ' میں پہلے قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک متمول شخص کی سوانح عمری کو تخلیقی روپ دیا ہے جو 'فرد حقیقت' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں زیر طبع ہے۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں الیاس نے کہا، "اردو ادب نے مجھے زندگی عطا کی ہے۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ میری ریزہ ریزہ ہستی از سر نو یک جا ہوئی ہے۔ شہرت میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اور مالی خسارے کو میں اپنی ذات پر کیوں ترجیح دوں؟ اور پھر اردو ادب کے طفیل مجھے اُن گنت چاہنے والے ملے۔ بے شمار اُن دیکھی محبتیں میرے دامن میں سمٹ آئی ہیں۔"

الیاس بھی ادیبوں کی گروہ بندی سے تالاں ہیں اور اپنے ملک کے نقادان ادب کے رویوں سے بھی۔ ان کا کہنا ہے، "ادیبوں کی جتنا بندیوں سے مجھے کیا لینا دینا۔ تاہم اس مسابقت میں بھی کام ہوا ہے۔ لیکن بڑے بڑے نامور گروپ ادبی بددیانتیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان ہی دھڑا بندیوں کا شاخسانہ ہے کہ بقا کی خاطر چھوٹے چھوٹے گروپ تشکیل پا گئے ہیں جن میں سے بیشتر جینوئین (genuine) کھرے اور مخلص اہل قلم پر مشتمل ہیں اور ادب کے فروغ کے لئے بہت کام کر رہے ہیں۔ بڑے گروہوں کے پنج ہزاری اور دس ہزاری منصب داروں نے اپنے اپنے ظل سبحانی کو ایک طرح سے یرغمال بنا رکھے ہیں اور ذاتی بد اعمالیوں کے سیاہی سے ان بھولے بادشاہوں کے نامہ اعمال کے مستحسن مندرجات بھی مسخ کر ڈالے ہیں۔ ۱۹۹۶ء کا ادبی جائزہ ملاحظہ فرمائیں اس میں ایسے افسانہ نگاروں کی نگارشات کا بھی ذکر ہے جنہوں نے ادبی کریئر (career زندگی) کا پہلا افسانہ لکھا۔ اسی سال فقیر کے سترہ افسانے 'اوراق، ابلاغ، صریر، اقدار، رابطہ، تخلیق، تجدید نو، اردو ادب، انتخاب، پید



بیضا جیسے معروف اور اکاد کا علاقائی پرچوں میں شائع ہوئے جب کہ چودہ مطبوعہ افسانے ڈائجسٹوں کی زینت بنے۔ لیکن فاضل جائزہ نگار نے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا اللہ اللہ خیر سلا۔

بلاشبہ میرا قصور اتنا ہے کہ میں گوشہ نشین فقیر ہوں اور کسی ادبی دربار میں حاضر ہو کر بے جا تحسین و خوشامد کا خراج ادا نہیں کرتا۔ لیکن میرے قارئین نے مجھے ایسی محبتوں سے سرفراز کیا کہ میری روح میں حقیقی راحت سرایت کر گئی۔ ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آنے والے بیشتر افسانوں کی داد تحسین کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ ایک مثال کافی ہے کہ ۱۹۹۶ء میں 'اوراق' ہی کے ایک شمارے میں آنجہانی رام لعل نے یوں تبصرہ کیا..... افسانوں کے حصے میں محمد الیاس کا 'بوسہ وداع' سید ہادل میں اتر گیا۔ ایک باپ کے خوابوں کی اتنی واضح تصویر کی مثال شاید ہی اردو افسانوں میں کوئی دوسری مل سکے۔

الیاس کہہ رہے تھے، "اردو زبان جتنی خوب صورت ہے اتنی ہی بدنصیب بھی ہے۔ اس پر اپنے اور پرانے ستم ڈھاتے رہتے ہیں۔ بھارت میں اس کے ساتھ اچھوتوں والا سلوک ہوا ہے تو بات پلے پڑتی ہے۔ لیکن پاکستان کے بالادست طبقات جس طرح اردو کے ساتھ بے وفائی کر رہے ہیں سراسر بے انصافی اور ظلم ہے۔ حالاں کہ ذرا غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اس خطے کے لوگوں کو بیک وقت دو سختے عطا ہوئے، وطن کے ساتھ ساتھ ایک ایسی زبان جو یک جہتی کی علامت ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارا وطن بڑے ظالم، تجرّد و لے اور بدترین قسم کے استحصالی طبقے کے قبضے میں آچکا ہے جو یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اردو رائج ہونے کی صورت میں شعور اور آگاہی کی روشنی سے عام آدمی کا ذہن منور ہو سکتا ہے۔ تاہم میرا یقان ہے (یا شاید خواہش بھری سوچ ہو) کہ اردو ایک توانا زبان ہونے کے باوصف بہر طور زندہ رہے گی اور ہر طرح کا ظلم و ستم سبہ کر بھی ترقی کرے گی۔ یہ اردو کا وصف ہے کہ گوگوں کو زبان عطا کرتی ہے۔ ایک آن پڑھ اجنبی افغان مہاجر بھی چند ہفتوں کے اندر ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے لگتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں اردو جیسی خوبیاں نہیں پائی جاتیں۔ اس کی ناقدری کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتی ہے۔ مغربی ممالک میں مقیم اردو کا ادیب وفا کے تقاضے پورے کر رہا ہے تاہم پاکستان میں رہنے والے اہل قلم کو مہد کرنا چاہیے کہ وہ اردو سے عشق میں ثابت قدم رہتے ہوئے اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے تاکہ اس بے مثل زبان کی اہمیت کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کروایا جائے۔ اسی طرح بالادست طبقات کے مذموم مقاصد کو ناکام کرنے کی سعی ہو سکتی ہے۔ اور میری رائے میں اردو کا حسن اس کے رسم الخط میں بھی مضمر ہے۔ اسے بدلنے سے مستقبل میں اردو کے طالب علم کے لئے صحیح تلفظ کی ادائیگی ممکن نہیں رہے گی۔ اور رفتہ رفتہ زبان کی ہیئت ہی بدل جائے گی۔"

الیاس کو پریم چند، قرۃ العین حیدر اور میکسم گورکھی نے متاثر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ بہت سے اردو کے ادیب ہیں (بشمول ہمعصر) جن کی بعض زندہ جاوید تخلیقات اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔

Mr. Mohammad Ilyas,

Naqsh-e-Kheyaal, 9/A, B/3-II, Mirpur, A. K, Pakistan



ساری دنیا کو میٹھا نہ سمجھئے اختر  
کوئی اپنا بھی نکل آتا میٹھا لال میں

اختر اعوان  
۲۸ اکتوبر ۲۰۰۳ء



## ڈاکٹر الہی بخش اعوان

لندن، برطانیہ

”سائنس کی تعریف بڑی وسیع ہے۔ لسانیات بھی ایک جدید حکمت یعنی سائنس ہے اور اس دور میں جو سائنس سے بے نیاز رہے گا بہت پیچھے رہ جائے گا۔ علمی اور عملی طور پر بھی۔“

ڈاکٹر الہی بخش بھی اس نکتے کی معنی آفرینی سے واقف ہیں۔ لہذا انھوں نے لسانیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کا تعارف یہ ہے کہ ۲۰ جون ۱۹۳۴ء کے دن انبالہ (مشرقی پنجاب ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے آئے تھے کیونکہ یہی ان کا آبائی شہر تھا۔ ویسے ساتویں جماعت تک مسلم ہائی اسکول انبالہ میں تعلیم پائی تھی۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۵۰ء میں پشاور میں پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اسی زمانے میں ملازمت بھی کر لی اور مختلف سرکاری محکموں میں قسمت آزمائی کے ساتھ ساتھ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا۔ ۱۹۵۷ء میں پشاور یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۰ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم اے فارسی اور ایم اے اردو کی سند لی۔ قسمت کی خوبی تھی کہ ۱۹۶۱ء میں ہی گورنمنٹ کالج مردان صوبہ سرحد میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ایم اے پشتو کے سال اول کا امتحان پاس کیا۔ مگر اگلے ہی سال انگلستان آنے کی وجہ سے سال آخر کا امتحان نہ دے سکے مگر پڑھنے کی لگن انھیں اکساتی رہی لہذا ۱۹۷۴ء میں لندن یونیورسٹی سے



لسانیات میں پی ایچ ڈی کی۔ جون ۱۹۹۴ء میں گورنمنٹ سپریمز سائنس کالج پشاور سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوئے۔

لسانیات میں ان کے پی ایچ ڈی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تدریس کے میدان میں طالب علموں کے ساتھ دیانت دار تھے۔ خود محنت پر یقین رکھتے تھے لہذا ان کے طالب علم بھی جی جان لگا کر محنت کرتے تھے۔ (یہاں چند نالائق طالب علموں کا ذکر نہیں ہے) انھوں نے کہا کہ ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ جدید علوم کو سیکھے انھیں کام میں لائے اور اپنے طالب علموں کے لیے ترقی کی منزلوں تک پہنچنے کی راہیں ہموار کرے۔ کمپیوٹر نے آج جدید تدریسی طریقے کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ہم دوسری زبانوں کی طرح اس میدان میں اسی وقت آگے جاسکتے ہیں جب اپنی قومی اور علاقائی زبانوں کا سائنسی طریقے سے مطالعہ اور تجزیہ کریں۔

ان کی اسی لگن اور محنت نے انھیں یہ مقام عطا کیا کہ انھیں ہندکو زبان میں تحقیقی مقالہ لکھنے پر تحقیق کا گولڈ میڈل ملا۔ لندن یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات سے علمی مہمان نوازی اور شعبہ سے وابستگی ملی۔ ۲۰۰۲ء میں انھیں امریکن بائیوگرافیکل انسٹیٹیوٹ (یو ایس اے) سے ”مین آف دی ایئر“ (Man of the year) کا خطاب ملا۔ معاصر کون کون ہے (Contemporary Who's Who 2003) کے ایڈیشن میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا اور برطانیہ کے ادارہ ماہرین لسانیات (Institute of Linguists) نے انھیں ادارے کے ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے نوازا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر الہی بخش نے شاعری سے بھی ناتہ جوڑا۔ کہتے ہیں ”یوں تو میں نے سب سے پہلی نظم ۱۹۵۰ء میں لکھی ان دنوں میٹرک میں پڑھتا تھا لیکن باقاعدہ تصنیف و تالیف کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا جب میں ایم اے فارسی کا طالب علم تھا۔ ۱۹۶۰ء میں میری پہلی کتاب علامہ اقبال کی مثنوی ”پس چہ باید کرداے اقوام شرق“ اور مثنوی ”مسافر“ کی شرح و تنقید شائع ہوئی۔ میں ضرورتاً شعر بھی کہہ لیتا ہوں لیکن ابھی تک کوئی شعری مجموعہ نہیں چھپا۔ نثری کتب اور مقالات لکھے ہیں جو ۷۷ کے قریب ہیں۔ میری مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ فعلی فقرہ کا ساختہائی تجزیہ، ۲۔ ہندکو زبان میں سرتی، ۳۔ ہندکو افعال کا ساختہائی تجزیہ، ۴۔ ہندکو زبان میں لحن، ۵۔ پشتو افعال کا ساختہائی تجزیہ، ۶۔ پشتو ہندکو لسانی روابط، ۷۔ کشاف اصطلاحات، لسانیات و صوتیات، ۸۔ قومی انگریزی اردو لغت (بال اشتراک)، ۹۔ قانونی لغت (بال اشتراک)، ۱۰۔ مطالعاتی مواد کی پہنچ، دستیابی، تقسیم، قیمت، نفس مضمون اور ترتیب و ترتیم، ۱۱۔ عرفان رضا، ۱۲۔ نقد گرامر، ۱۳۔ گنجینہ اردو، ۱۴۔ شرح گل نغمہ، ۱۵۔ شرح مثنوی پس چہ باید کرد، ۱۶۔ شرح مثنوی مسافر، ۱۷۔ تدوین، ترجمہ و تنقید اخلاق جلالی، ۱۸۔ تدوین و تنقید دیوان گھائل۔

ادیبوں کی گروپ بندی کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے، ”گروہ بندی سے اگر آپ کی مراد ذاتی اختلافات کی بناء پر ادیبوں کے مختلف گروہوں میں بننے سے ہے تو یقیناً یہ بات ہر اعتبار سے بُری ہے۔



لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نظریاتی اعتبار سے گروہ بندی نے کبھی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس نے مسابقت کو تقویت دی اور اردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچایا۔“

اردو کے مستقبل سے ڈاکٹر اعوان قطعی مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے ”میں فطرتاً رنجائی واقع ہوا ہوں۔ میرے خیال میں اردو کا مستقبل کہیں بھی تاریک نہیں ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ہمیں علاقائی یا ملکی تعصبات سے بالاتر ہو کر اپنے گھروں میں اردو کو زندہ رکھنا چاہیے۔ علاقائی زبانوں کا اپنا مقام ہے ان کو بھرپور توجہ دینا ضروری ہے لیکن انہیں اردو کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے کے بجائے اردو کا معاون گردانا چاہیے۔ ذاتی اور اجتماعی سطح پر اردو کی ترویج کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ پاکستان میں اردو کی سرکاری اور تعلیمی حیثیت منوانے کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ یورپ اور امریکہ میں جہاں اردو کو پہلے ہی سے جدید زبانوں کے نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے وہاں نگرانی کی جائے کہ اردو کے پڑھانے کا بندوبست بھی کیا گیا ہے اور جہاں ابھی تک اسے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے وہاں اس کی شمولیت کے لیے جدوجہد کی جائے لیکن میں اردو کے رسم الخط بدلنے کا سخت مخالف ہوں۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو اپنے ادبی اور ثقافتی ورثے سے محروم کر دیں گے اور اس تبدیلی سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔“

ڈاکٹر اعوان نے کہا کہ انھیں حسن عسکری اور انگریزی کے George Orwell جن کی خودنوشت "Homage to Catalonia" مطبوعہ ۱۹۳۸ء نے بہت متاثر کیا، وہی ان کے پسندیدہ ادیب بھی ہیں۔

ڈاکٹر اعوان کی کتاب ”ہندکو زبان میں لحن“ (The Phonology of the Verbal phrase in Hindko) میں نے پوچھا ”جب آپ کی مادری زبان پشتو ہے تو آپ نے ہندکو پر اتنا کام کیوں کیا؟“

انھوں نے کہا ”میری مادری زبان پشتو نہیں ہے ہندکو ہے۔ جب میں ایم اے کا طالب علم تھا تو اس وقت میری ساری توجہ فارسی اور اردو زبان پر تھی۔ علاوہ ازیں اس وقت تک ہندکو میں کوئی ادب تحریری طور پر موجود نہ تھا۔ پھر بھی میں نے ۱۹۵۹ء میں بزم شعور ہندکو کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے تحت ادبی محفلوں اور مشاعروں کا اہتمام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں ایک بزرگ شاعر استاد غلام گھائل کا ہندکو دیوان شائع کیا یہ کسی ہندکو شاعر کا پہلا دیوان تھا جو شائع ہوا۔ اس دیوان کی اشاعت میں بے پناہ دشواریاں پیش آئیں کیونکہ کوئی ناشر بھی اس زبان کی کسی کتاب میں سرمایہ لگانے کو تیار نہ تھا۔ میں نے اردو کو ہمیشہ اولیت دی اسی لیے اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ البتہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندکو میں شاعری ضروری۔ جب بھی مناسب موقع ملا ہندکو کی مقبولیت کے لیے کام کیا۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے ہندکو ہی کو منتخب کیا اور اس طرح اسے بین الاقوامی سطح پر روشناس کروایا۔ ہندکو صوتیات پر میں نے اردو میں ایک مقالہ لکھا ہے جس کا ہندکو ترجمہ عنقریب شائع ہونے والا



ہے۔ میں نے ہر تراجم کی طرف اس لیے توجہ نہ دی کہ اب ہندو کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد اس طرف مائل ہو چکی ہے اس لیے میں تراجم کے بجائے اس کام کی طرف متوجہ ہوں جو دوسرے لوگ اس وقت کرنے کے قابل نہیں یعنی لسانیات و صوتیات پر۔

”اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائیں۔“ میرے کہنے پر انھوں نے بتایا

”۱۹۴۵ء میں میری زندگی میں ایک عجیب انقلاب آیا۔“

بارشوں کا موسم شروع ہوتا تو بانسوں کا کارخانہ بند ہو جاتا کچے بانسوں کو زمین میں بڑے بڑے گڑھوں میں دفن کر دیا جاتا کیونکہ اس موسم میں کھلی ہوا سے انھیں گھن لگنے کا ڈر ہوتا۔ بے کاری کے اس زمانے میں والد صاحب تقریباً ہر سال پشاور آیا کرتے تھے۔ وہ یہاں سے پشاور اور افغانستان کے پھل کرینوں میں بند کروا کے انبالہ بھیجتے جہاں ان کا آڑھتی ساتھی نیلام کرتا اور اس طرح منافع دونوں باہم تقسیم کر لیتے۔ کبھی کبھی ہم سب بھی ان کے ساتھ پشاور آتے یہاں اکثر رشتے دار اور والد صاحب کے دوست ہماری بڑی خاطر مدارت کرتے۔ جتنے روز یہاں رہتے ضیافتیں ہوتی رہتیں۔ بڑا لطف آتا۔ ۱۹۴۵ء میں ہم پشاور آئے تو واپسی پر امرتسر کے۔ وہاں ہمارا ایک رشتے دار رہتا تھا نام تو مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا کبھی انہیں دھننا کہتے تھے اور میں چچا۔ چند روز ان کے وہاں قیام رہا اس عرصے میں انھوں نے میرے والدین سے مجھے مانگ لیا۔ ان کی یہ بات قبول کر لی گئی اور مجھے ان کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ یہ معاملہ آج تک حل نہیں ہوا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ میں اکثر سوچتا کہ مجھے گھر سے نکالنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کیا میں ضدی، لڑاکا یا نالائق تھا کہ انھوں نے تنگ آ کر مجھ سے پیچھا چھڑا لیا؟ نہیں... کیا والدین کے معاشی حالات ایسے تھے کہ وہ ایک مزید بچے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے؟ ایسی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیا اس گھرانے کے معاشی اور معاشرتی حالات ہمارے گھرانے سے بہتر تھے؟ ایسا بھی نہ تھا۔ وہ شادی شدہ نہ تھے۔ گھر میں نہ کوئی خاتون تھی نہ کوئی بچہ نہ ملازم۔ معاشرتی اعتبار سے وہ گھر ہمارے گھر سے بدتر تھا۔ ان کا بانسوں والے بازار میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا اور اسی بازار میں ایک فلیٹ۔ لہذا مالی لحاظ سے بھی وہ ہمارے گھرانے سے چنداں بہتر نہ تھے۔ اگر کسی کو گھر سے نکالنا تھا تو پھر مجھی کو کیوں نکالا گیا۔ شروع میں تو میں اداس ہوا پھر میری تنہائی پسندی نے اس تنہائی کو قبول کر لیا۔ وہاں اسلامیہ اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ مل گیا۔ ہمارے قریب ہی سکھوں کا مشہور گوردوارہ گولڈن ٹمپل تھا۔ کبھی کبھار چھٹی کے دن اس کی سیر کو چلا جاتا۔ اس کے علاوہ کہیں آنا جانا نہیں تھا۔ چپ چاپ زندگی گزارنے لگا لیکن یہ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھتا تھا کہ مجھے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے جدا کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس صورت حال کے ذمہ دار ہمارے وہ رشتے دار ہیں اس لیے مجھے ان سے نفرت ہونے لگی جس کا اظہار میں طرح طرح سے ضد کر کے کرنے لگا۔ وہ جس قدر میرا خیال رکھتے ہیں اسی قدر ان سے متنفر ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو کر پختہ ہونے لگا کہ حالات کے سامنے جھکوں گا نہیں بلکہ دوسروں سے آگے بڑھوں گا۔ یہ خیال ہمیشہ میرے قلب و ذہن



پر چھایا رہا جس کا اظہار میری عملی زندگی میں بھی ہوتا رہا اور اس قسم کے اشعار میں بھی:

مری گردن جھکے، حالات کے آگے، یہ ناممکن جبیں قسمت کی چوکھٹ پر دھروں، یہ ہونہیں سکتا  
بتان آذری سے کم نہیں یہ بت زمانے کے مرے ہدم انھیں سجدہ کروں، یہ ہونہیں سکتا  
خوش قسمتی یہ ہوئی کہ اگلے سال بڑی بہن کی پشاور میں شادی ہوئی تھی چنانچہ سب گھر والے  
جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب واپس انبالہ جانے لگے تو میں نے امرتسر جانے سے صاف  
انکار کر دیا۔ انبالہ آکر ساتویں میں داخلہ لے لیا۔ ریاضی اور فارسی کے استاد کریم الدین صاحب تھے  
بڑے سخت مزاج، باقاعدگی سے کلاس میں آنے والے۔ سنا تھا کہ انھوں نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ ایک  
مرتبہ وہ اتنے بیمار ہو گئے کہ بستر سے اٹھنا مشکل تھا۔ چار پائی اٹھوا کر اسکول آتے اور لیٹے لیٹے  
پڑھتے۔ بہت محنت اور دلچسپی سے پڑھتے۔ ان کا تکیہ کلام تھا، ہشت نالائق بے دال کا بودم۔ کسی کی  
سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آتا تھا۔ ڈر کے مارے ان سے پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ بہت سرکھپایا۔ الفاظ  
کے معانی تو معلوم تھے۔ ہشت کو ہم خشت سمجھے۔ یہ لفظ ریاضی کے سوالوں میں آتا تھا اس لیے ہم سمجھ  
گئے کہ یہ اینٹ ہے۔ نالائق کے معنی بھی جانتے تھے۔ بودم کا مطلب پتہ تھا یعنی ”میں تھا“، یہ بھی جانتے  
تھے کہ دال کھانے کی چیز ہے۔ پورے جملے کا مطلب کچھ یوں بنتا تھا، اینٹ نالائق بغیر دال کا میں تھا،  
جملے میں نالائق کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ وہ یہ جملہ اپنے بارے میں تو نہیں کہتے ہوں گے لیکن میں تھا  
جملہ متکلم کی علامت تھا۔ یہ معمہ اس وقت حل ہوا جب آگے چل کر ہم نے لفظ ”بوم“ پڑھا جس کے معنی  
ہیں ”آلو۔ بودم میں سے“ نکال دیں تو بوم رہ جاتا ہے۔ یعنی ”آلو“... پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ہشت لفظ  
ندا ہے جو کسی برے انداز میں مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عقدہ یوں کھلا ”ارے نالائق  
آلو...“

ڈاکٹر الہی بخش اعوان کی خودنوشت سوانح ”تار نفس“ کے ذکر کے بغیر بات نامکمل رہے گی۔  
ان کی یہ سوانح مارچ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے خوبصورت اور  
واقعاتی پیرائے میں اپنی آپ بیتی (مع جگ بیتی) لکھی ہے۔ اس میں کچھ محیر العقول واقعات بھی درج  
ہیں۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر اعوان کو تصوف سے بھی دلچسپی تھی اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھیں کئی  
مقامات پر غائبانہ تائید ایزدی حاصل رہی۔ محض ایک دو واقعات کے ذکر سے یہاں کتاب کا حق ادا نہ ہو  
گا۔ ڈاکٹر صاحب کی اولوالعزمی کی کہانی پڑھنی ہو تو ”تار نفس“ کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

Prof. Dr. E B A, Awan

78 Abotts Road.

South Hall, Middle Sex UB1, 1H4 Uk.





میرزا علی مرزا صاحب  
میرزا علی مرزا صاحب  
میرزا علی مرزا صاحب

## امجد علی مرزا

لندن، برطانیہ

کہانی کیا ہے؟ افسانہ کیا ہے؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اور ہر کہانی اور افسانہ لکھنے والا ان جوابات کو جانتا ہے۔۔۔۔۔ میں کہانی کی تشریح کروں تو کہوں گی۔۔۔۔۔ ایک واردات، جو مجھ پر یا کسی اور پر گزری اور میں نے اسے بیان کیا یا اسے قلم بند کیا۔ بظاہر ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ ہمارے ادب کا ایک حصہ ہے۔ ایک معرکہ آرا کہانی وجود میں آئی تو وہ 'کلاسیک ادب' کا حصہ بن گئی ورنہ تو بے شمار کہانیاں روزمرہ لکھی جا رہی ہیں اور شائع ہوتی ہیں۔ اور پھر وہ کاغذ ریزی کا حصہ بن جاتے ہیں، کیوں؟ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اور ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ ان کئی وجوہ میں ایک یہ بھی ہے کہ مطالعے کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ قاری کی زندگی کی دوسری مصروفیات اسے مطالعے سے محروم رکھتی ہیں۔ برصغیر ہند و پاک سے باہر مغرب کا اردو قلم کار تو اس لیے کا بھی شکار ہے کہ اسے اچھی راہ نمائندگی مفیلیں بھی نہیں ملتیں کہ وہ ادبی بحث و مباحثہ میں حصہ لے اور اپنے علم میں وسعت پیدا کر سکے۔ مقامی طور پر یہاں وہ جرائد بھی عنقا ہیں جن میں علمی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہاں برصغیر ہند و پاک سے جاری جرائد یہاں آسمان سے باتیں کرتی قیمتوں پر میسر ہیں۔ چنانچہ جو جریدہ وہاں نہیں، کچیس یا پچاس روپے میں فروخت ہوتا ہے لیکن امریکہ یا یورپ میں آکر وہ ایک سو ماہی جریدہ بھی تین چار سو روپے میں پڑتا ہے



جب کہ اس پر ڈاک خرچ بمشکل بیس پچیس روپے ہی آتا ہے، شاید اس لئے کہ وہاں رہنے والوں کا یہ خیال ہے کہ ان ممالک میں ڈالر، پونڈ، مارک اور فرینک جھڑبیری کی خود رو جھاڑیوں سے جھڑتے ہیں اور فسوس وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جھڑبیری کانٹوں بھری بھی ہوتی ہے۔

اس ایسے کے پس منظر میں جب میں ”گفتنی حصہ دوم“ کے تعارف لکھ رہی ہوں۔ آج ۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۳ء ہے۔ میں لندن میں رہنے والے افسانہ نگار امجد علی مرزا کا تعارف لکھنے لگی تو پہلے میں نے ان کے افسانوں کے مجموعے ”دوریاں“ سے کچھ افسانے پڑھے اور ایک افسانہ ”آم کی پیٹی“ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے برطانیہ کے چند صف اول کے اردو کے ناقدین ادب سے رجوع کیا اور معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا انہوں نے امجد علی مرزا کو پڑھا ہے۔ ایک نقاد نے نفی میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ امجد علی مرزا نے اپنی کتاب انہیں بھیجی ہی نہیں۔ ایک اور نے فرمایا کہ ان کے پاس اول ہی کتابوں کا ڈھیر پڑا ہے (ملاحظہ ہو کتابیں نہ ہوئی کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہوا جو پڑا ہوا ہے)۔ تیسرے صاحب نے جواب دیا، ”ارے بی بی! میں تو اپنی ہی کہانیوں کا اور مضامین کا، مگر ریزی میں ترجمہ کرانے میں مصروف ہوں۔ اور ان پر تو صفی مضامین بھی لکھوانے ہیں۔ میرے پاس وقت کہاں جو دوسرے درجے کے ادیبوں کو پڑھوں۔ لکھنا ہی ہے تو جیلانی بانو پر نہ لکھوں، بانو قدسیہ پر نہ لکھوں کہ کچھ نام تو ہوگا۔“ اب آگے کہنے کی گنجائش ہے کیا؟

امجد مرزا کے افسانے ہمارے آپ کے گرد پھیلے ہوئے واقعات سے ہی اخذ کردہ ہیں۔ لیکن ”گفتنی“ کے قارئین سے گزارش کروں گی کہ آپ امجد مرزا کی کہانی ”آم کی پیٹی“ ضرور پڑھیں۔ یہ ایک ایسی موثر کہانی ہے جو ان کے افسانوں کے مجموعے ”دوریاں“ میں شامل ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار، سعید بونس کی رقم ملنے پر ڈھائی سو روپے میں اپنے لئے آم کی پیٹی خریدتا ہے۔ مگر بیوی کے مشورے پر وہ یہ پیٹی اپنے منیجر، خواجہ کونڈر کرتا ہے اور منیجر سے یہ کہا جاتا ہے کہ سعید کا سالانہ اپنے مالک کے پرائیوٹ بانغ کے یہ آم انہیں ہر سال بھیجتا ہے۔ اس کے بعد ان آموں کے گشت کی کہانی ہے کہ کس طرح آموں کی یہ پیٹی ڈاکٹر زیدی کے گھر پہنچتی ہے اور وہاں سے نوکر، اسلم کے گھر۔ کہانی کے بیچ میں بیگم زیدی کی بیگم خواجہ کے بارے پس پشت اظہار خیال اور بیگم خواجہ کا بیگم زیدی کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے کا بیان کہانی میں قاری کے لئے خاصے کا فائدہ مہیا کرتا ہے۔ لیکن آپ جب پڑھتے ہوئے اس پیرا گراف پر پہنچیں جہاں اسلم کی بیوی رضیہ اسے مشورہ دیتی ہے کہ وہ آم کی پیٹی بازار جا کر فروخت کر آئے اور اپنے لئے ان پیسوں میں سے ایک کلو آم لے آئے۔ تو آپ کچھ دیر کے لئے یہ کتاب بند کر دیں اور سوچیں کہ آپ اگر کہانی کا رہتے تو اس کہانی کو کیا موڑ دیتے۔ اس کہانی کا انجام کیا ہوتا۔ یا ایک عام قاری کی حیثیت ہی سے سہی سوچیں کہ آپ کے خیال میں افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے، کیا جتنا چاہتا ہے۔ اور جب آپ اپنے تخیل میں کسی نتیجے پر پہنچ جائیں تو پھر افسانہ کا بقیہ حصہ اختتام تک پڑھیں اور دیکھیں کہ مغرب میں رہنے والے افسانہ نگار کا مشاہدہ کیا کہتا ہے!



امجد علی مرزا کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ کہانی کی بنت پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اور پھر سیدھے سادھے الفاظ میں ان کا انداز بیان، ان کا اپنا ہے۔

امجد علی مرزا کی اپنی کہانی یوں ہے کہ پاکستان میں ضلع چکوال کے ایک قصبہ ماہال مغلاں میں ۲۸ / اگست ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ پانچ چھ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ جہلم چلے گئے۔ میٹرک تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر چند ناگزیر حالات انہیں ۱۹۶۰ء میں انگلینڈ لے آئے۔ اٹھائیس (۲۸) سال بعد ۱۹۸۸ء میں امجد اپنے دو بچوں کے ساتھ مستقل رہائش کی نیت سے واپس پاکستان گئے۔ آٹھ سال تک قیام کیا۔ مگر پھر ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو لے کر واپس برطانیہ آ گئے۔ اور اب نو (۹) سال سے یہیں مقیم ہیں۔ شریک حیات ہم خیال ہے۔ گھریلو ماحول شروع سے مذہبی، علمی اور ادبی تھا۔ امجد نے دوبارہ لندن واپسی کے بعد مکمل طور پر اپنی شہر نگاری کی طرف توجہ دی۔ اب تک ایک سو ساٹھ (۱۶۰) سے اوپر کہانیاں لکھی ہیں جو پاکستان اور برطانیہ کے اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”کانچ کے رشتے“ ۲۰۰۰ء میں، دوسرا ”سونے کی صلیب“ ۲۰۰۱ء میں اور تیسرا ”دوریاں“ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ ان کتابوں کی کمپوزنگ امجد نے خود کی۔ آخری دونوں کتابوں کے سرورق ان کے صاحب زادے عاکف عباد مرزا نے بنائے۔ کتابوں کی طباعت پاکستان میں ہوئی کیوں کہ یہاں کی مہنگی طباعت ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جنوری ۲۰۰۳ء سے امجد پنجابی زبان کا ادبی ماہنامہ ”سوریا“ بھی شائع کرتے ہیں جو یہاں مقبول ہو رہا ہے۔ ان کی چوتھی کتاب پنجابی زبان میں افسانوں کی زیر طبع ہے۔ اردو افسانوں کا چوتھا مجموعہ تیار ہو رہا ہے۔

امجد علی مرزا بنیادی طور پر شہر نگار ہیں۔ ”شہر نگاروں کی محفلیں منعقد نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو مشاعروں کی طرح کامیاب نہیں ہوتیں“، امجد کہہ رہے تھے، ”کئی کئی مہینے کسی شہر نگار کو کچھ سنانے کا موقع نہیں ملتا۔ دھڑے بندی کا یہ عالم ہے کہ گروہ بندی کی وجہ سے اپنے اپنے گروپ کے لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ اس بخل اور کم ظرفی کی وجہ سے کئی ادیب گوشہ نشین ہو گئے کہ وہ خوشامد پسند نہیں۔ خود میں آٹھ (۸) سال تک ایک کونے میں بیٹھا لکھتا رہا۔ بہت لکھا اور میری کہانیاں شائع بھی ہوئیں۔ مگر پھر سوچا کہ باہر نکلے بغیر چارہ نہیں۔ لہذا انٹر کے ساتھ ساتھ پنجابی اور اردو مزاحیہ شاعری بھی شروع کر دی۔ اس لئے کہ سامعین میں بے وقوفوں کی طرح منہ بند کر کے مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ میں نے مرزا نکلے اختیار کیا ہے۔“

امجد اردو کے مستقبل سے قطعی پر امید نہیں۔ کہتے ہیں، ”مجھے افسوس ہے کہ ہم میں احساس کمتری کے جراثیم خون کے سرخ ذرات سے بھی زیادہ ہیں۔ خود ہمارے ملک پاکستان میں حکومتی شعبوں میں فارم تک انگریزی میں ہیں۔ جہاں انگریزی بول کر اپنا قد بڑھایا جاتا ہے وہاں قومی زبان پاؤں تلے پستی رہتی ہے۔ یہ اگر پاکستان میں بھی زندہ رہی تو اس طرح کہ بچے کچھے لاوارث بوڑھے اور ناخواندہ چھوٹی کلاس کے لوگ ہوں گے میں جو مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں دیکھ کر پنجابی اور اردو بول اور سمجھ رہے



ہیں۔ مجھے اردو کی بے بسی پر دکھ ہے۔ اردو زبان نے مجھے علم دیا، شعور بخشا۔ پنجابی میری ماں بولی ہے جس کی انگی پکڑ کر میں جوان ہوا ہوں۔ یہ مجھے ماں کے دودھ کے ساتھ ملی اور میرے خون کا حصہ بن گئی۔ اسی لئے میں ان دونوں زبانوں کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر افسوس کہ میری طرح یہاں ہر شخص تیسری نسل کو یہ زبان منتقل کرنے سے قاصر ہے۔ مگر کوشش ترک کر دینا بھی ناقابل معافی جرم ہے۔“

امجد نے اپنی زندگی سے دو یادگار واقعات سنائے۔ یہ دونوں واقعات ہماری بے بسی اور دوغلی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ جس طرح ان کے افسانے ”آم کی بیٹی“ میں ہمارا دوغلا معاشرتی کردار نمایاں ہے اسی طرح ان واقعات میں پاکستان کے کرتا دھرتا لوگوں کا چلن وہاں کے عام باسی کے کردار میں بھی در آیا ہے۔ امجد کہہ رہے تھے۔ ”میں نے نو سال کی عمر میں اسکول سے آکر باپ کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا اور ساٹھ (۶۰) کی عمر تک یہ ہی کر رہا ہوں۔ اتنے طویل عرصے میں کتنے ہی یادگار واقعات زندگی اپنی سلیٹ پر لکھ لیتی ہے۔ کئی ایسے جو مشعل راہ بن جاتے ہیں تو کئی راستے کا پتھر بن کر زیست کے دریا کا رخ موڑ دیتے ہیں، کوئی پھول بن کر زندگی کو مہکا دیتے ہیں تو کئی ساری عمر ناسور بن کر رستے رہتے ہیں۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جب میں جہلم سے اپنے گھر اسلام آباد آ رہا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے علاوہ ایک رشتہ دار میان بیوی بھی کار میں ساتھ تھے۔ رات کا وقت تھا۔ ایک چھوٹا سا شہر روات کر اس کیا تو ہیڈ لائٹ میں دو سڑک کے کنارے کوئی شخص پڑا ہوا دکھائی دیا۔ جوں جوں ہم اس کے قریب پہنچتے گئے ہم سب چوکنے ہو کر اسے دیکھتے گئے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ زخمی ہے یا مرا ہوا ہے۔ مگر ایک ویران سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا ہوا انسان انسانی اخلاق کے ناطے مدد کا حق دار تھا۔ اور اسی جذبہ کے تحت میں نے اپنی کار کی رفتار کو آہستہ کرنا شروع کر دیا تو پیچھے بیٹھے ہوئے میاں بیوی چیخے کہ یہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں اور خدا را میں کار مت روکوں۔ میں نے کہا کہ بھئی وہ ایک انسان پڑا ہوا ہے۔ پتا نہیں وہ زخمی ہو اور بروقت مدد سے اس کی جان بچ جائے۔ اور اگر مر بھی گیا تو ایک مسلمان کے ناتے اس کے لئے کچھ تو کیا جاسکتا ہے۔ تو اس جوڑے نے کہا کہ میں وہاں بنایا گیا ہوا ہوں اور یہ ثواب کسی اور وقت کے لئے بچا رکھوں اور وہاں گاڑی نہ روکوں ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مجھ سے یہ کوئی نہیں کہے گا کہ میں نے ثواب کا کام کیا ہے بلکہ اسے زخمی کرنے کے الزام میں الٹا مجھے ملزم ٹھہرایا جائے گا۔ اور اگر وہ مرا ہوا ہو تو اس سے بھی بڑی مصیبت آسکتی ہے۔ مزید اس رات کی تاریکی میں ویران جگہ، کیا خبر وہ بہانہ ہو اور اس کے ساتھی کسی جھاڑی کی اوٹ میں چھپے مجھ جیسے نیکی کماؤ کی تاک میں بیٹھے ہوں اور وہ فریب سے لینا ہوا اٹھ کر مجھ پر پستول تان لے اور کار لے کر فوچر ہو جائے۔ ایسے واقعات وہاں اکثر ہوتے ہیں اس لئے میں کار نہ روکوں اور گاڑی کی رفتار تیز کر کے چلتا ہوں۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ ایک دو مزید کاریں بھی گزریں اور لازمی انہوں نے بھی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے آدمی کو دیکھا ہوگا مگر کوئی بھی نہیں رکا۔ اور میں دل میں ندامت لیئے رفتار تیز کر کے وہاں سے گزر گیا۔ پاس سے گزرتے ہوئے میں نے پھر سے سڑک پر پڑے ہوئے آدمی کو غور سے دیکھا۔“



وہ لازمی مرا ہوا تھا یا مرنے والا تھا۔ اور پھر شاید وہ مر بھی گیا ہو۔۔۔۔۔ افسوس کہ ملک میں اندھے قانون کی وجہ سے لوگ عدم تحفظ کے کیچڑ میں لت پت اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر کسی دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں اور اس طرح کئی لوگ سڑکوں پر پڑے زخمی، بھوکے اور پیاسے مر جاتے ہیں۔ یہ واقعہ میرے پاکستان جانے کے کچھ ماہ بعد کا تھا۔

اور پھر ایک سال بعد میں اپنی بیٹی کو اسلام آباد سے راولپنڈی، پشاور روڈ پر ایک لڑکیوں کے کالج چھوڑنے گیا۔ واپسی پر پشاور روڈ کی تنگ سڑک جو اسلام آباد جاتی ہے پر موٹر سائیکل پر جا رہا تھا سامنے سے دوڑک ریس لگاتے دکھائی دیئے۔ میں نے بہت اشارے کیئے، لائیٹ ماری مگر وہ تیز رفتار ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی ضد میں دندناتے چلے آ رہے تھے۔ فاصلہ اتنا رہ گیا کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ بھی جاتے تو مجھے کچلتے ہوئے گزر جاتے۔ میں نے موٹر سائیکل کو کچے میں اتارا۔ بارش کی وجہ سے زمین سخت ناہموار تھی۔ میری بھی رفتار اتنی تھی کہ میں موٹر سائیکل کا رخ فوری کنٹرول نہ کر سکا اور سڑک سے نیچے کئی فٹ گہرائی میں جا گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ نہ جانے مجھے کب ہوش آیا۔ موٹر سائیکل میری ٹانگوں پر پڑا تھا اور میرے سر اور کان کی او سے خون بہہ رہا تھا۔ کمزوری، چوٹ اور حادثے کے شاک کی وجہ سے میں موٹر سائیکل کو اپنی ٹانگوں پر سے اٹھانہ سکا اور کسی مدد کے انتظار میں بے بس ہو کر لیٹ گیا کہ اتنے میں باتوں کی آوازیں آئیں۔ میں مدد کے لئے چیخا۔ اوپر اونچائی سے دو آدمیوں نے جھانکا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، بھائی صاحب میں گر گیا ہوں۔ خدا کے لئے ذرا نیچے آ کر میری مدد کیجئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔ ایک اوجھل ہو گیا۔ دوسرا کچھ مروت کر گیا اور کہا، ہمت کرو جی ہمت کرو۔۔۔ خیر ہو سی۔۔۔ تھوڑی دیر سستا کر پھر زور لگانا۔ اللہ کرے گا اٹھ جاؤ گے۔۔۔ یہ کہہ کر وہ بھی اوجھل ہو گیا۔ خود ترسی سے میرے آنسو بہہ نکلے۔ اور میں پھر لیٹ گیا اس انتظار میں کہ اتنے بڑے ملک میں کوئی ایک دو تو ایسے بے وقوف ہوں گے جو پرانی روایات کو سینے سے لگائے زندہ ہوں گے اور پولیس کیس بننے کے ڈر سے بے خوف ہو کر انسانی محبت کا جذبہ رکھ کر میری مدد کو نیچے اتر پڑیں گے۔ مجھے ایک سال پہلے سڑک کے کنارے پڑا ہوا وہ آدمی یاد آ گیا جو شاید ہمارے ٹھہر جانے سے بچ جاتا یا پھر اس کا مردہ جسم ہی سڑک پر چلتی ہوئی گاڑیوں کے ٹائیروں سے کھلنے سے بچ جاتا۔ ندامت سے میرے آنسو بہہ نکلے۔ احساس کا چابک میرے ضمیر کی پیٹھ کو لہو لہان کر رہا تھا اور میں مکافات عمل کی تصویر بنا کسی مسیحا کا انتظار کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دو جوان لڑکے آئے اور انہوں نے مجھے اس کھائی سے نکالا۔ اپنے کپڑوں سے میرا خون صاف کیا اور گھر تک چھوڑ گئے۔ میں اب بھی اپنے کان کی پٹی کو چھوٹا ہوں تو بے اختیار میرے منہ سے تو یہ بھی نکلتی ہے اور اندھیرے میں سڑک پر پڑا ہوا ایک انسان خاک میں لپٹا مجھے سرزنش کرتا ہے۔ مجھے میرے اشرف المخلوقات ہونے پر طعنہ دیتا ہے۔ میرے مسلمان ہونے پر شرم دلاتا ہے۔ اس واقعے کے بعد میں نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا اور باقی سات سال جو وہاں (پاکستان) میں رہا اپنے آپ کو سوشل کاموں



اور خدمتِ خلق کے لئے وقف کیئے رکھا۔ معذور بچوں کے ایک گھر کے لئے کئی سال تک اپنے آپ کو وقف کیئے رکھا۔ اسلام آباد ویلفیئر سوسائٹی بنائی جس نے جی ٹاؤن فور (G 9/4) میں بے شمار کام کیئے۔ مسجد کمیٹی کا ممبر رہا۔ علاقے میں باقاعدہ چوکیدار رکھ کر گشت کا انتظام کیا جو بہت عرصے کا میاں بی سے چلتا رہا۔ ایسے بہت سے کام تھے جن کے لئے روزانہ چھ سات گھنٹے مختص کر رکھے کہ شاید جس داغ نے میرے ضمیر کی چادر کو داغ دار کیا دھل جائے۔“

Mr. Amjad Ali Mirza,

36 Hazelwood Road, London, E17 7AL, UK

آم کی بیٹی:

”اری! یہ خاص قسم کے آم ہیں جو...“

”بس مجھے پتا ہے جو یہ خاص قسم کے آم ہیں۔ یہ بیٹی نہیں کھلے گی۔ کل کلو دو کلو آم اپنے لئے آنا، اور یہ بیٹی خواجہ نذیر صاحب کے ہاں دے آئیں گے۔ آپ کے منجر ہیں۔ ذرا خوش ہو جائیں گے۔“

اور سعید کی بیوی نے بیٹی اٹھا کر اسکوٹر کے کیریر پر رکھ دی۔ کھانے سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی خواجہ نذیر صاحب کے گھر گئے۔

سعید کو بیٹی اٹھائے دیکھ کر خواجہ صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو سعید کی بیوی فوراً بولی، ”خواجہ صاحب کل ہی میرے بھائی نے ملتان سے دو پیٹیاں آموں کی بھجوائی تھیں۔ وہ وہاں ایک بڑے دؤیرے کی فرم میں منجر

ہے۔ ہر سال ہی اپنے مالک کے پرائیوٹ باغ سے ہمارے لئے آم بھجواتا ہے۔ اس بار ہم نے سوچا آپ بھی کچھ چکھیں۔ ہم بھلا دو آدمی اتنے سارے آم کیسے ختم کرتے۔ یہ بڑے ہی اسپیشل قسم کے آم ہیں جو مارکٹ میں دستیاب نہیں ہوتے۔“

مسٹر اور مسز خواجہ بہت ممنون ہوئے اور سعید اور اس کی بیوی کے جانے کے بعد خواجہ صاحب نے بیٹی کو کھولنا چاہا تو مسز خواجہ نے انہیں روک دیا۔

”کیا کرنے لگے ہیں۔ پہلے ہی آپ کی شوگر کنٹرول نہیں ہو پا رہی ہے اوپر سے یہ پوری بیٹی آموں کی کھول رہے ہیں۔ اسے اسی طرح بند ہی رہنے دیں۔“

ارے کمال ہے بھائی! وہ بے چارہ آم دے گیا ہمارے لئے تو پھر انہیں کون کھائے گا؟“ خواجہ صاحب نے اپنے گنبجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”ابھی چلتے ہیں زیدی صاحب کے ہاں۔ آپ کے ڈائریکٹر ہیں۔ آپ انہیں یہ بیٹی گفٹ کر دیں۔ وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔ بڑے کام آنے والے آدمی ہیں۔ مسز زیدی سے بھی مجھے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔“

تیار ہو کر دونوں میاں بیوی زیدی صاحب کے بنگلے میں جا پہنچے۔ نوکر کو کہہ کر کار میں سے آموں کی بیٹی نکلائی اور



ڈرائنگ روم میں ہی رکھ دی۔

”ارے خواجہ یار! یہ کیا اٹھا لائے تم دونوں... لگتا ہے آم ہیں۔“ زیدی صاحب نے اپنے منیجر سے کہا۔ مگر مسز خواجہ فوراً بول پڑیں، ”دیکھانا... ان کی مہک ہی نرالی ہے۔ میرے ابو کے بہت پرانے دوست ہیں ملتان میں۔ اور وہ ہر سال ہی اپنے ذاتی باغ سے تین چار پیٹیاں پختے ہوئے آموں کی ہمیں بھجوا دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب تو ذیابیطس کے مریض ہیں۔ ہم نے ایک چینی بیٹی مرینہ کو لاہور بھجوا دی۔ ایک کھولی تھی جو یہ بک لے گئے اپنے اسٹاف کے لئے۔ ایک آپ کے لئے حاضر ہے۔ میں نے تو بمشکل ایک کھایا اور جی بھر گیا۔ ایسے آم مارکٹ میں نہیں آتے۔ یہ تو ان وڈیروں کے ذاتی باغ میں پیدا کیے جاتے ہیں۔“

دونوں میاں بیوی کچھ دیر بیٹھے اور ملتان والے انکل کے باغات کے قصے سنا کر مرعوب کرتے رہے اور پھر اجازت چاہی۔

ان کے جاتے ہی مسز زیدی غصے سے انھیں اور نوکر کو آواز دی۔ وہ گھبرایا ہوا حاضر ہوا۔

”اسلم یہ بیٹی اٹھاؤ اور اپنی سائیکل پر رکھو۔ جب گھر جاؤ تو اسے لے جانا۔“

اسلم نے دھڑکتے دل کے ساتھ ممنونیت سے اپنی مالکن کو دیکھا۔ وہ سُن چکا تھا کہ یہ بیٹی مسز خواجہ کے کسی انکل نے ملتان سے اپنے ذاتی باغ سے پختے ہوئے آموں سے بھر کر بھیجی ہے جو وہ زیدی صاحب کے لئے لائے... مگر... آگے کی بات اسے سمجھ نہ آرہی تھی۔ وہ بیٹی اٹھا کر باہر لے گیا اور اپنی سائیکل کے کیریئر پر رکھ کر باندھ دی۔ اور پھر گھر کے سارے کام ختم کر کے بارہ بجے حسب معمول اپنے گھر روانہ ہوا جو تین میل دور کسی غریب کچی بستی میں تھا۔

”بیگم! تمہاری یہ منطق سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے اچھے آم تھے اور تم نے پوری کی پوری بیٹی نوکر کو سوپ دی۔“ رات کو سوتے وقت زیدی صاحب نے بیگم سے پوچھا۔

”یہ آپ کے منیجر کی بیوی تو مجھے زہر لگتی ہے۔ اس کے ہاتھوں کے آم میرے فریج میں کیسے جاتے۔ ہمارے کتے آم نہیں

کھاتے ورنہ میں انہیں کھاتی۔“

”ارے ایسی کیا بات ہو گئی اس بے چاری سے کہ تم اس قدر ناراض ہو۔“ میاں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”تو بہ کرو، بڑی چنڈال ہے یہ خواجہ جن... یاد ہے دو ماہ قبل شاہ صاحب کی بیٹی کی شادی پر گئے تھے۔ یہ بھی وہیں تھی۔ اور میرے کچھ دوستوں کے سامنے اس نے کہا، ہائے مسز زیدی، یہ وہی سیٹ ہے نا جو میری مرینہ کی شادی پر آپ نے پچھلے سال پہنا ہوا تھا۔ سچی میرا دل کرتا تھا کہ اسے شوٹ کر دوں۔ بڑی بے عزتی ہوئی میری اس دن۔ اور آج پتا نہیں کہاں سے سڑے ہوئے آم لے کر آ گئی کہ ملتان کے وڈیرے کے خاص باغ کے ہیں۔ بکواس کرتی ہے۔ رشوت دینے کے طریقے ہیں یہ سب۔“

ادھر اسلم سائیکل چلاتا، خوشی سے جھومتا اپنی رضیہ کے پاس گیا۔ لکڑی کی ویلیز سے سائیکل اٹھا کر گزارنے میں زور لگا مگر کیریئر پر رکھی آموں کی پوری بیٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اس کے دل کی دھڑکن کو اور



تیز کر رہی تھی۔ اپنے گھر کے چیموئے سے صحن میں پہنچتے ہی اس نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں بیوی کو بلایا۔  
 ”رضیہ! رضیہ! کہاں ہو؟ ساتھ ہی وہ اپنی سائیکل کمرے کے اندر لے گیا اور زور لگا کر اسے کھینچ کر  
 اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ رضیہ اپنی سال کی بیٹی کو تھپکی دے کر پریشان سی ہو کر اٹھی۔

”یہ دیکھنا! بیگم صاحبہ نے پورے آموں کی بیٹی مجھے دے دی۔ پتا ہے.....“ اس کا سانس پھول رہا تھا، خوشی کے  
 جذبات سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے، ”یہ خاص قسم کے آم ہیں جو بازاروں میں نہیں بکتے۔ بیگم صاحبہ کے ملنے  
 والوں کو ملتان کے کسی وڈیرے نے اپنے ذاتی باغ سے توڑ کے بھیجے ہیں۔“ ساتھ ہی اس نے کانپتے ہاتھوں سے  
 رسی کھولنا شروع کی۔

رضیہ نے ایک نظر بیٹی کو دیکھا اور پھر اسلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اسلم! ہم غریب لوگ اتنے قیمتی آم اور پھر یہ پوری بیٹی کھائیں گے کیا۔ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمہارا!!“  
 بیوی نے گہری سانس لی۔

اسلم خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی بیوی کی ان کہی بات سمجھ آرہی تھی۔

”دیکھ بیڑیا!“ رضیہ نے پیار سے کہا، ”کل دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے آ جانا اور اسے لے جا کر بازار میں کسی  
 دکان دار کو دے آنا۔ خاص قسم کے آم ہیں اچھے پیسے دے جائیں گے۔ اپنے لئے ایک کلو آم بھی لے آنا۔ باقی  
 کے پیسے کسی دوسرے کام آجائیں گے۔“

بات معقول تھی۔ اسلم نے بیوی کو بڑے پیار سے دیکھا۔ ساری رات آموں کی مہک میں اسلم اور  
 رضیہ کو آم کے درختوں سے نوٹ گرتے نظر آتے رہے۔ دوسرے دن اسلم دوپہر کو کسی بہانے گھر آیا اور بیٹی کو  
 بازار لے گیا۔ بہت سے دکان داروں سے پوچھتا بھاؤ چکا تا مایوس سا کھڑا سوچنے لگا کہ ہر دکان دار اتنی کم قیمت  
 لگاتا ہے جو ان آموں کی تو ہیں ہے۔ اس نے دو عورتوں کو آم کے بھاؤ کرتے دیکھا۔ جب ان کا بھاؤ نہ بنا تو وہ  
 چل کر دوسری دکان کی طرف بڑھیں۔ اسلم بھاگ کر ان کی طرف گیا۔ ”معاف کرنا جی!“ اس نے بڑی لجاجت  
 سے کہا، ”میرے پاس بڑی اعلیٰ قسم کے آم ہیں جو میرے صاحب کو کسی نے اپنے خاص باغ سے اترا کر بھیجے  
 ہیں۔ ہمارے صاحب بیمار ہیں۔ لہذا آج مجھے دے دیئے ہیں غریب آدمی ہوں اگر آپ یہ آم خرید لیں تو یہ پیسے  
 میری بچی کے کام آجائیں گے۔“

دونوں بیگمات نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں سے اشارے ہوئے اور سائیکل کے پیچھے پڑی بیٹی  
 کو کھلو کر آم چیک کیئے۔ دونوں نے کانٹا پھوسی کی اور آدھے آدھے آم کر کے اپنے اپنے بیگوں میں ڈال لئے۔ اور  
 ایک سو روپیہ اسلم کو دیا۔ بہت بک بک کے بعد بیس اور دیئے اور ایک غریب کی مدد میں سرشار گھر چلی گئیں۔

شام کو سعید کام سے تھکا ہوا گھر واپس آیا تو اس کی بیوی نے فریق سے ٹھنڈے ٹھنڈے آم نکال کر  
 کانٹے شروع کیئے اور ساتھ ہی بتانے لگی کہ کس طرح بارہ روپے کلو آم کا سودا نہ ہوا اور اس نے اپنی پڑوسن کے  
 ساتھ کسی صاحب کے نوکر سے پندرہ سولہ کلو کی پوری بیٹی بہترین آموں کی ایک سو بیس روپے میں خرید لی اور  
 آدھی آدھی بانٹ لی۔





اگر کسی نے کائنات کو دیکھا اور ہم نے بھی جواب  
دی کائنات کو دیا تو کائنات سے کائنات سے ہو جائیگا  
— نظام الدین اولیاء جو ائمہ الزوال  
النور خان

۶ مارچ ۲۰۰۱

## انور خان مرحوم

سابق مقیم ممبئی، ہندوستان

دسمبر ۱۹۹۹ء میں، میں ممبئی میں تھی۔ ایک شام مکتبہ جامعہ واقع محمد علی روڈ، کی روزہ افطار کی دعوت میں جناب عبدالاحد ساز مجھے لے گئے۔ کئی ادیب اور دانشور مدعو تھے۔ وہیں میری ملاقات افسانہ نگار انور خان مرحوم سے بھی ہوئی تھی۔ ۲۰۰۰ء میں ”گفتنی حصہ اول“ سے فراغت پا کر ۲۰۰۱ء میں، میں نے انور خان کے لئے ”گفتنی حصہ دوم“ کا سوال نامہ بھجوا دیا تھا۔ انہوں نے بلا تاخیر جواب دیا۔ گفتنی حصہ دوم کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہو گئی مگر انور خان کا تعارف میرے پاس محفوظ تھا جسے ”گفتنی حصہ دوم“ میں شامل کر کے مجھے ایک گونہ خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ان کا خط اور تعارف ملنے کے بعد میں سوچ رہی تھی کہ ان سے جب دوبارہ ملاقات ہوگی تو ”جدید افسانے“ کے موضوع پر طویل گفتگو ہوگی۔ مگر ستمبر ۲۰۰۱ء میں اطلاع ملی کہ انور خان نے جانے میں بہت جلدی کی۔ اس دوران میں ان کی بیماری کی اطلاع ایک بار ملی تھی۔

کیم مارچ ۱۹۳۲ء کو انور خان ممبئی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اس ذہین نوجوان نے انگریزی ادب، تاریخ اور فلسفے کے مضامین لے کر ۱۹۶۶ء میں بی اے کی سند لی اور پھر ۱۹۷۰ء میں اردو میں ایم اے کیا۔



دوران گفتگو انہوں نے بتایا تھا (میں نے اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا تھا) ان کا پہلا افسانہ ماہنامہ ”کتاب“ لکھنؤ میں ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کی کہانیاں ماہنامہ شاعر، ممبئی؛ شمع، دہلی؛ کتاب، لکھنؤ؛ اور آج کل، دہلی اور کراچی پاکستان کے جریدے آج، مکالمہ اور بادبان میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

انور خان نے صنف شاعری میں کبھی طبع آزمائی نہیں کی لیکن نثر جم کر لکھی اور کم عرصے میں معتبر افسانہ نگاروں کی صف اول میں اپنے لئے جگہ بنالی۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”راستے اور کھڑکیاں“ فروری ۱۹۷۱ء میں بار اول اور جولائی ۱۹۷۱ء میں بار دوم شائع ہوا۔ افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”فن کاری“ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں اور تیسرا مجموعہ ”یاد بیرے“ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئے۔ ان کا ناول ”پھول جیسے لوگ“ دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ان کا آخری افسانہ ”آئینوں کی نگری“ تھا جو ماہنامہ شاعر کے جون ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

ان کے چند افسانے اپنی انفرادیت کی بنا پر بہت مشہور ہوئے۔ ان میں ”کوؤں سے ڈھکا آسمان“، ”انتظار“، ”بھیریں“، ”شاندار موت کے لئے“، ”فن کاری“، ”کتاب ور کا خواب“، ”بوڑھا فریم سے نکل گیا“، ”اپنا بیت“، ”پوز“، ”شام رنگ“، ”مسرت حاصل“ وغیرہ شامل ہیں۔ انور خان کے فن پر ماہنامہ ”کتاب“ لکھنؤ، ”شاعر“ ممبئی، ”سہ ماہی“ تریپل، ممبئی اور ”سہ ماہی“ نیاسر“ الہ آباد نے گوشے شائع کئے ہیں۔

ان کے غیر مطبوعہ اور غیر مکمل ناول میں ان کا ناول ”گزران“ ہے جس کا ایک باب ماہنامہ ”شاعر“ ممبئی میں ان کی برسی کے موقع پر شائع ہوا۔ اور ہم یہاں بشکریہ ماہنامہ ”شاعر“ اس کے کچھ حصے شامل کر رہے ہیں۔ اس سے ممبئی شہر کا پس منظر، وہاں کی زندگی اور وہاں بولی جانے والی زبان کا اندازہ ہوگا۔ خود انور خان نے اس ناول کا تعارف اس طرح کرایا۔

”ناول لکھنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ مجھے تو بس ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا ہے، کوشش سمجھنے کی، خود کو سمجھنے

کی، اپنے عہد کو سمجھنے کی، آج ہمارا عمل کیا ہے؟ اور لوگ اس سے کیا سمجھ سکتے ہیں؟ میرے نزدیک یہ ناول ایک آئینہ ہے اگر اس میں ہمارے چہرے کچھ مختلف نظر آئیں، ان کھوٹوں سے جو ہم نے لگا رکھے ہیں کیوں کہ وہ ہماری سماجی، تہذیبی ضرورت ہیں تو ہمیں جز بزد نہ ہونا چاہیے کیوں کہ جب ہم ناول لکھتے ہیں تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی شعوری کوشش بھی نہیں کہ ایسا ہی لکھا جائے بلکہ جب ہم لکھتے ہیں تو بہت ساری باتوں کا از خود اظہار ہوتا ہے جس پر ہمارا کوئی قابو نہیں ہوتا اور لکھنے کے بعد ہم ان کی نفی نہیں کر سکتے۔

آج ہم کمزور سماج میں جی رہے ہیں اور اس سماج نے ہمارے ظاہر و باطن کو، ہمارے قریب ترین رشتوں کو اور سماج میں ہمارے تفاعل کو کس طرح بدلا ہے۔ یہ ہی اس ناول کا موضوع ہے۔ (الف خ)۔

انور خان نے اپنے تحریری تعارف میں اپنی کہانوں کے ایک مجموعے کا نام ”عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں“ کا نام شامل کیا ہے اور پبلشر کا نام صرف ”ملکتیہ جامعہ لکھا ہے۔



انور خان کی کہانیاں اس کے ارد گرد ہونے والے واقعات اور پیش آنے والے حالات کی کہانیاں ہیں۔ اس کے قاری ان کہانیوں میں ایک قربت اور ایک وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ انور خان نے خود ایک محنت کش کی زندگی ایک بے رحم ماحول میں گزاری تھی۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں اس کے گردے قفل ہو گئے تھے۔ انور کی کہانیاں اس کے اپنے تجربات کا انچوڑ ہیں۔

عبدالاحد سارنے اس کی کہانیاں پڑھ کر لکھا ”انور کی بیشتر کہانیوں میں ممبئی کے ان علاقوں کا پس منظر ملتا ہے جہاں کے ایک ایسے ہی علاقے میں، میں بھی رہائش پزیر ہوں۔ ان گلیوں میں چلتے پھرتے، ان کے ٹکڑوں پر منڈلاتے اور ان مکانوں میں چڑھتے اترتے جن پر سرسری نظر جایا کرتی تھی ان کے افسانوں کی فضا اور ان کی کردار نگاری کے توسط سے مرتکز اور مختص ہو گئے۔ بعض مرتبہ بخدا ایسا ہی ہوا کہ کسی دوپہر کو انور خان کا ممبئی سے جڑا ہوا افسانہ پڑھا اور جب شام کے وقت محلوں میں نکلے تو اس افسانے کے کردار جا بجا ملتی جلتی شکلیں لیے ہوئے نمودار ہو گئے۔ ایسی بعض شاہیں میں نے گویا غائبانہ طور پر انور خان کے ساتھ ہی گزاریں۔“

انور خان کو ادیبوں کی گروہ بندی کا تلخ تجربہ تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا..... ”جی ہاں۔ ادیبوں کی گروہ بندی نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ترقی پسند ادیب جدید ادیبوں کی کبھی دل کھول کر تعریف نہیں کر سکے۔ بعض شہروں میں ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے ادیبوں کا کبھی نام تک زبان پر نہیں لاتے۔ تنقیدی کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ اختر الایمان کہتے تھے نجی محفلوں میں احتشام حسین ہمیشہ ان کی شاعری کی تعریف کرتے تھے لیکن جب تنقید لکھتے تھے تو ان کا نام بھول جاتے تھے۔“

اردو ادیبوں کو ایک دوسرے کی تخلیقات پر کھل کر گفتگو کرنی چاہیے اور جو پسند آئیں انہیں سراہنا چاہیے۔ اس طرح ایک اچھی فضا، ایک اچھا تاثر قائم ہوتا ہے جو ادب کے لئے سازگار ہوگا اور اس میں مختلف علاقوں اور زبانوں کی وسعت پیدا ہوگی۔“

انور خان اردو کے رسم الخط کو بدلنے کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ”ہاں اگر بچے رومن رسم الخط یا دیوناگری لکھی جانتے ہوں تو ابتدائی مرحلوں میں ان رسم الخط میں زبان سیکھانا چاہیے تو مضائقہ نہیں۔“

انور خان کے پسندیدہ ادیب پولینڈ کے ہواب، سلاوا، استمبو رسکا، زبگنیف اور دوسرے شعرا تھے۔ کہانیوں میں انہیں ٹالسٹائی، چیخوف اور موپاساں اور ریمنڈ کارو (امریکہ) کی تحریریں پسند تھیں۔ انور خان مرحوم کے پس ماندگان میں ان کی اہلیہ قمر النساء انور، بیٹیاں صدف اور ثمر اور دو بیٹے فہیم اور محمد فیاض ہیں۔ جن کا پتہ ذیل میں ہے

A-603, Karishma Apartment, Near Hill Park, Jogeshwari (W),  
Mumbai, 102, India



## گزران... جس کو ہودین وول عزیز

شاید نرین چٹل سے باہر آیا تو نسرین کو اکیلے ہی اس کا انتظار کرتے پایا۔ شاید کاچہرہ اتر گیا۔ نیکی میں نسرین نے بتایا کہ بچوں کے امتحانات چل رہے ہیں اس لئے وہ آئے۔ شاید کو یاد آیا کہ ملازمت کے ابتدائی سالوں میں جب وہ کویت سے لوٹا تھا تو بچوں کو بے تابی سے اس کی واپسی کا انتظار ہوتا تھا۔ جس دن وہ لوٹا وہ اسکول جانے سے انکار کر دیتا۔ اور جیسے ہی وہ ایر پورٹ سے باہر آتا دڑ کر اس سے لپٹ جاتے۔ ”ابا ہماری بندوق“، اشفاق چلاتا۔ ”ابا ہمارا ویڈیو گیم“ محمود پوچھتا۔ ننھی صبیحہ گود میں چڑھ جاتی۔ ان لمحوں کی یاد اسے پورے سال تازہ دم رکھتی۔ کئی دن طرح طرح کے کھانے بنتے۔ فلمیں دیکھی جاتیں۔ ہونٹوں میں آئے دن چائیں اور کبھی ڈبہ گوشت یا بریانی کھا کر نیکی میں گھر واپس ہوتے تو شاید کو کتنا اچھا لگتا۔ وہ سب لمحے کہاں چلے گئے۔ شاید نے سوچا۔

نیکی جانے پہچانے راستوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑی شاہراہ پر پھنسے گئی۔ شاہراہ کے دونوں طرف شاندار عمارتیں دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”یہ کونسا علاقہ ہے؟“  
نسرین کو بھی اس علاقے کے بارے میں پتا نہیں تھا۔

شاہراہ عبور کر کے گاڑی پھر چھوٹی بڑی سڑکوں پر سے گزرنے لگی تو شاید نے نظریں بنالیں۔ نسرین اسے بچوں، پڑوسیوں کے بارے میں بتانے لگی لیکن بچوں کے نہ آنے سے شاید کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اس کی خاموشی سے اکتا کر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ سارا راستہ وہ خاموش ہی رہا۔

گھر پہنچے تو دونوں چھوٹے بچے صبیحہ اور اشفاق اسکول جانے کے لئے تیار تھے۔ شاید نے انہیں پیار کیا۔ بچے بھی بڑے تپاک سے ملے۔ شاید نے جب ان سے کہا کہ ہم آپ کے لئے اچھے اچھے تحفے لائے ہیں تو صبیحہ نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”تمہیںک یو پاپا۔ ہم اسکول سے آنے کے بعد اپنے تحفے دیکھیں گے۔“

شاید کو اچھا تو لگا لیکن اتنی سی چھوٹی عمر میں یہ شائستگی کہاں تک مناسب ہے۔ یہ خیال بھی آیا۔ بچے اسکول چلے گئے۔ شاید صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامنے تپائی پر اخبار رکھا تھا۔ اس اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کچھ سرخیاں پڑھیں پھر اخبار تپائی پر رکھ دیا۔ اسی وقت نسرین کی امی اس کے لئے چائے بنا کر لائیں۔ شکریہ کہہ کر اس نے کپ منہ سے لگا لیا۔ چائے پیتے ہوئے اسے اپنی بڑی بہن عائشہ بی کا خیال آیا۔ وہ اٹھا اور عائشہ بی کو فون لگایا۔ فون چودہ سالہ فوزیہ نے اٹھایا۔

”ماموں جان، آپ آگئے؟“ وہ چہکی، ”آپ گھر پر کب آرہے ہیں؟ ہم سب بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ لیجئے می سے بات کیجئے۔“

عائشہ بی بھی اس کے آنے کی اطلاع سے بہت خوش تھی۔ اور اس نے بھی یہی پوچھا کہ گھر کب آرہے ہو۔ پھر اس کے بھانجے فون پر آئے۔ اور یکے بعد دیگر اپنی فرمائشوں کے بارے میں جاننا چاہا، نعیم نے اپنی بندوق کے متعلق، سلیم نے ویڈیو گیم کے بارے میں اور بالآخر کچھ ہنسنے پڑے ہوئے فوزیہ نے بھی اپنے کمرے کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

ابھی وہ ان سے گفتگو کر ہی رہا تھا کہ اس کا لڑکا محمود اٹھا اور بے انتہائی سے سلام کر کے غسل خانے میں گھس گیا۔ کسل مندی کا احساس ابھی باقی تھا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ پہلے وہ گھر آتا تھا تو فوراً ہی تازہ دم ہو کر دوستوں کو فون کرنے لگتا تھا لیکن اس اجنبی کالونی میں اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ گھر آ گیا ہے بلکہ یوں معلوم ہوا جیسے وہ کویت سے نکل تو گیا ہے لیکن کسی اجنبی جگہ پر اسے رکتا پڑ گیا ہے جہاں وہ کسی کو نہیں جانتا اور نہ ہی کوئی اس سے واقف



ہے۔ بلکہ شاید یہاں نسرین کو بھی کوئی جاننا نہ تھا۔ بس چہرے سے لوگ سناساتھے کہ وہ اس کا لونی میں رہتے ہیں۔

نیرند اور بیداری کے درمیان مشکل سے دس منٹ رہا ہوگا کہ نسرین نے اسے جگا دیا۔

”پانی گرم ہو چکا ہے۔“ نسرین نے اس سے کہا۔ ”اور ناشتہ بھی تیار ہے۔ آپ چاہیں تو ناشتہ کر لیں یا پھر

پہلے نہالیں۔“

وہ اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نسرین نے اس کا سوٹ کیس کھولا اور اس کے کپڑے نکال کر کپ بورڈ

میں لگانے لگی۔

محمود نہا دھو کر کپڑے بدل چکا تھا اور واک مین بن رہا تھا۔ نسرین نے اسے کئی بار پکارا مگر امیر فون اس کے کانوں میں لگا ہوا تھا۔ آواز اس کے کانوں میں نہیں پہنچ پائی۔ آخر نسرین نے اسے جھنجھوڑا تو وہ چونکا اور امیر فون کانوں سے الگ کیا۔ نسرین نے اسے ساتھ ناشتہ کرنے کے لئے کہا۔

اس نے دوبارہ امیر فون کانوں سے لگا لیا اور ڈائمنگ ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد شاہد بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے کچھ باتیں کرے لیکن محمود کے کانوں سے امیر فون چپکا ہوا تھا۔ نہ ہی نسرین کو خیال آیا کہ وہ محمود سے اسے ہٹانے کے لئے کہے۔ شاہد کو برا تو لگا لیکن وہ خاموش رہا۔ ناشتہ کرتے ہی محمود اٹھا اور برش شرٹ پہنا، دو تین کتابیں ہاتھ میں لے چل چٹا تا ہوا باہر نکل گیا۔

گھنٹے بھر بعد وہ واپس آیا تو کافی جوش میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا جو شاید اس کا ہم جماعت تھا۔ محمود نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کھسر پھسری کی۔ ماں نے جیب سے کئی سو سو کے نوٹ نکالے۔ وہ خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہا۔ نہ اس نے کچھ پوچھا نہ نسرین نے اسے کچھ بتانے کی ضرورت سمجھی۔ محمود کے بشرے سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے شاہد کی موجودگی سے وہ کچھ پریشان سا ہو۔ دو گھنٹے بعد وہ پھر لوٹا۔ اس بار اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کی ایک تھیلی تھی۔ محمود نے تھیلی کھولی تو انہوں نے دیکھا کہ زیر و کس کیئے ہوئے کچھ کاغذات ہیں۔ نسرین نے اسے بتایا کہ اس بار امتحان میں یہی سوالات آنے والے ہیں۔

”اور اگر نہیں آئے تو“۔ شاہد نے کہا۔

”محمود کی مشق ہو جائے گی۔“ نسرین نے کہا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ سوالات نہیں آئے تو پیسے ضائع ہو جائیں گے۔ لیکن وہ چپ رہا۔ نسرین کے بے دردی سے پیسے خرچ کرنے کی عادت سے سب ہی واقف تھے۔ اس کی خواہ اکثر مہینہ ختم ہونے سے پہلے ختم ہو جاتی اور پھر وہ اپنی سہیلیوں سے ادھار لے کر پیسے خرچ کرنا شروع کرتی۔ اُن دنوں وہ کچھ نہیں کہہ پاتا تھا کیوں کہ بے روزگار تھا۔ فلج جانے کے بعد تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ یہاں رہتا ہی نہ تھا۔ پھر پیسوں کی تنگی بھی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن جب وہ بمبئی آتا تو دیکھتا کہ اس کے خرچ کرنے کا انداز ویسا ہی ہے۔ کئی بار اس نے فون کر کے ڈرافٹ منگوائے تھے اور شاہد نے بلا کسی تردد کے بھیج دیئے تھے۔ جب ان کا انیسر چل رہا تھا وہ محض ایک بے روزگار فوٹو گرافر تھا جسے کبھی کبھار کوئی کام مل جاتا۔ اس کے کویت جانے کے سارے انتظامات نسرین نے ہی کئے تھے۔ ان حالات میں نسرین سے خرچ کے بارے میں کچھ کہنا اس کے لئے مناسب نہیں تھا۔ اگرچہ اس کا بے دردی سے پیسہ خرچ کرنا اسے بہت کھلتا تھا۔ پھر بھی وہ یہ کہے بغیر رہ نہ سکا کہ وہ ایک میجر ہو کر بھی اپنے لڑکے کو شہر دے رہی ہے۔

”اس میں خرچ ہی کیا ہے۔“ نسرین نے خوش مزاجی سے کہا۔ ”آپ ہی سوچئے اگر یہی سوالات آئے اور دوسرے بچوں کو ایسے نمبر ملیں گے اور محمود پیچھے رہ جائے گا۔ اور اگر نہیں آئے تب بھی اس کی مشق ہوگی اور امتحان میں اضافہ ہوگا۔“



”تعلیم کے نام پر یہ اچھا تھا شاہ ہے۔“ شاہ نے کہا۔

”کیا کریں؟ سب کے ساتھ چلنا ہی پڑتا ہے۔“

سہ پہر کے بعد صبح اور اشفاق اسکول سے لوٹے تو شاہ نے دونوں کو کھلونے دیے جو وہ کوریت سے لایا تھا۔ بچے جلد ہی مل گئے۔ شاہ بھی کچھ ریٹکس ہو گیا۔ شام وہ دونوں بچوں کو لے کر ٹیبلٹ لگا اور چاکلیٹ اور ٹافیاں دلوائیں۔ حالانکہ وہ کوریت سے بھی چاکلیٹ کے کئی بکس لایا تھا۔

دو روز بعد سویرے سویرے وہ اپنی بہن عائشہ بی سے ملنے نکل گیا۔ عائشہ بی نے بڑی بہن ہو کر اُسے پالا تھا۔ وہ چھوٹا ہی تھا کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ہر ضرورت کا عائشہ بی نے خیال رکھا تھا۔ ماں کا چہرہ بھی اُسے یاد نہیں تھا۔ یہ ہی نہیں جب تک اس کی دوسری بہنوں کی شادی نہیں ہوئی عائشہ بی نے شادی نہیں کی حالانکہ مختار بھائی جو اُن کے چچا زاد بھائی بھی تھے کالج کے دنوں سے یہ تمنا لیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی صبر سے انتظار کیا اور اُس وقت تک رُکے رہے جب تک عائشہ بی کی ذمہ داریاں ختم نہ ہو گئیں۔ انہیں تو عائشہ بی کی یہی ادا بہت بھائی تھی۔ شاہ جب کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تب رشتہ داروں سے اُسے پتا چلا کہ عائشہ بی اس کی بڑی بہن ہے ورنہ تو اسے ماں ہی سمجھتا تھا۔ اور اس نے عائشہ بی کو ہمیشہ ماں ہی سمجھا۔ اور عائشہ بی کے بچوں سے اسے اتنی وابستگی تھی جتنی اسے اپنے بچوں سے بھی نہ تھی کہ وہ سرین سے زیادہ جڑے ہوئے تھے اور کوریت جا کر تو وہ ان سے بالکل کٹ سا گیا تھا۔

گاڑیوں میں زبردست رش تھا۔ بڑی مشکل سے وہ ایک گاڑی میں گھس سکا۔ اسے دروازے کے پاس ہی کھڑے رہنا پڑا۔ آہستہ آہستہ کھسکتے کھسکتے کئی اسٹیشنوں کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ دروازے سے تھوڑا اور اندر ہو کر ڈبے کی دیوار سے پشت لگا سکے۔ اس طرح اُترنے اور چڑھنے والوں کا دباؤ اس پر کافی کم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرین دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں رُک گئی اور دیر تک رُک رہی۔ پسینے سے اس کی قمیص چھوچھپانے لگی۔ جاکھوں میں خارش ہونے لگی لیکن اس کے ہاتھ ایسے پھنسے تھے کہ انہیں نیچے لانا ممکن نہ تھا۔ ایک ہاتھ سے اوپر ٹکٹا کنڈا پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے میں تھیلی تھی جس میں عائشہ بی کے بچوں کا سامان تھا جو وہ کوریت سے لایا تھا۔ میں منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ایک کی سانس دوسرے کے چہرے پر، کسی کا کولہا کسی سے بھڑا ہوا۔ ڈبے کے سارے پتکے گھوم رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پتکھا ہوا نہیں پھینک رہا۔ شاہ دروازے کے قریب تھا۔ کبھی کبھار ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرا کر بکھرتا تو اسے بڑی راحت محسوس ہوتی۔ کارخانوں، کمپنیوں میں کام کرنے والے ہزاروں لاکھوں افراد ہر روز یہ عذاب جھیلتے ہیں یہ سوچ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس عذاب سے بچا ہوا ہے۔

ہلکے سے دھچکے کے ساتھ گاڑی چلی تو سب نے چین کا سانس لیا۔ دروازے کا ڈنڈا پکڑ کر کھڑا ہوا شخص باہر کی طرف جھکا اور بل کھاتی ٹرین کو مزہ کر دیکھنے لگا جواب تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ شاید وہ زیادہ ہی آگے جھک گیا تھا۔ شاہ نے چاہا کہ اسے منع کرے لیکن تب ہی کھٹ سے اس کا سر ایک کھمبے سے ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔

”ارے!“ اس کے منہ سے نکلا۔ پاس کے کھڑے لوگوں کے کپڑے خون کے چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ شاہ نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی چند سرخ نقطے اسے اپنے قمیص پر نظر آئے۔ اس کا جسم سرد ہو گیا تھا باوجود اس قدر گرمی کے اسے کپکپی محسوس ہو رہی تھی شاید وہ اپنے پیروں کی طاقت پر نہیں بلکہ اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ گرنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ ثانیوں کے بعد آس پاس کا سارا منظر اس کی آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے حیرت سے دیکھا کہ کسی نے زنجیر کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ ڈبے کے لوگوں میں اس خاموش مفاہمت نے اسے اس قدر ذرا دیا کہ وہ پسینے میں نہا گیا۔



”چوتیا تھا سالا“۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کسی نے کہا۔

پھر سب ہی اس شخص کو لعنت ملامت کرنے لگے جو شاید تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

بایں کالہ آیا تو شاہد کسی طرح اتر گیا۔ اُسے بڑی انتہا بہت محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ پلیٹ فارم پر رکھی ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا جو قریب ہی تھی۔ اور دیر تک بیٹھا رہا۔ عائشہ بی کے گھر تک جانا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ بچے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اسے تو جانا ہی ہو گا۔

کافی دیر بعد جب اسے محسوس ہوا کہ اب وہ چل سکتا ہے وہ اٹھا۔ اسٹیشن سے باہر آیا تو اس کے سامنے ایک جانا پہچانا ماحول تھا۔ اب وہ ان گلی کوچوں میں تھا جس سے اس کے پیر بخوبی واقف تھے۔ دکائیں جانی پہچانی، مکانات مانوس یہاں تک کہ چہروں میں بھی اسے کچھ اپنائیت سی لگی۔ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی تب ہی ایک خالی ٹیکسی اس کے پاس سے گزری۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ڈرائیور نے فوراً ٹیکسی روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے مدد پورہ چلنے کے لئے کہا تو وہ ٹھٹھک گیا۔ پانچ منٹ کا تو فاصلہ تھا۔

”بیمار ہوں یار“۔ شاہد نے کہا۔

بچوں نے اُسے ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ ماموں جان آئے، ماموں جان آئے کہہ کر چلانے لگے۔ سیرچی چڑھ کر کمرے کی طرف بڑھا تو عائشہ بی دروازے میں کھڑی تھیں۔ اس نے دیکھا بالوں میں جگہ جگہ سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ سینے سے لگایا۔ شفقت سے دعائیں دیں تو وہ رو پڑا۔ عائشہ بی نے پلکوں سے گرتے آنسوؤں کو سازی کے دامن سے پونچھا اور مسکرائے لگیں۔ شاید انہیں وہ چھوٹا سا شاہد یاد آ گیا تھا جو آج اتنا بڑا ہو گیا تھا۔ شاہد ہاتھ منہ دھو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ گھراؤٹ کر آیا ہے۔ عائشہ نے فوزیہ سے چائے بنانے کے لئے کہا۔

”تیرا چہرہ اتنا اتر اہوا کیوں ہے رے؟“ عائشہ بی نے پوچھا۔

”ٹھیک تو ہے۔“ شاہد ہنسا۔ ”آپ کو تو ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے۔“

”چل رے! تو مجھ سے کیا چھپائے گا۔ برسوں کا بیمار لگ رہا ہے۔“

”ہاں ماموں جان“۔ فوزیہ بھی بول اٹھی۔ ”آپ بہت کمزور لگ رہے ہیں۔“

شاہد نے ٹرین کا واقعہ سنایا۔ سب ہی دہل گئے۔

”یہ تو اب روز کی بات ہو گئی ہے۔“ عائشہ بی نے اداسی سے کہا۔ ”روز ہی اخبار میں ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔“

کچھ دیر بعد وہ چائے کا کپ لیے گپ شپ کر رہا تھا اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دو سال باہر رہ کر آیا ہے۔

”مچھلی“، چالی میں ایک مردانہ آواز آئی۔ عائشہ بی نے باہر نکل کر مچھلی والے کو روکا۔ کمرے کے سامنے وہ

پانی رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اچھا خاصا صحت مند آدمی ہے چہرے پر داڑھی ہے۔ چہرے سے اتر پردیش کے پوربی علاقے کا لگتا تھا

”یہ بھیا لوگ کب سے مچھلی بیچنے لگے؟“ شاہد نے پوچھا۔

”آج کل یہ ہی لوگ مچھلی بیچتے ہیں، ماموں جان“۔ فوزیہ نے کہا۔

”اور کونسیں؟“

”کونسیں سونے سے پہلی ہو رہی ہیں۔“ عائشہ بی نے کہا۔ ”اب وہ بلیوں میں نہیں آتیں۔“

دیکھتے دیکھتے دوپہر ہو گئی۔ فوزیہ نے دسترخوان بچھایا۔ سب ایک ساتھ کھانے کے لئے بیٹھے۔ اتنے دنوں



بعد مائشہ بی کے ہاتھ کا کھانا کھا کر اسے کچھ ایسا اطمینان ہوا کہ وہ گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ چہرے پر دھوپ کی تمارت محسوس کر کے وہ جاگا تو شام کے چھ بج رہے تھے اور وہ تازہ دم تھا۔

شام کو وہ گلزار محمدی کی طرف چلا تو شاہد کو ایسے لگا جیسے وقت ختم گیا ہو۔ اسکول کے دن ہوں، کالج کے یا پھر بے روزگاری کے۔ اس کی زندگی کے خوش گوار ترین دن یہ ہی تھے جو دوستوں کے ساتھ گزر رہے تھے۔ یہ بے کار لمحے تھے جن کا کوئی مصروف نہ تھا۔ خواہ مخواہ سڑکوں پر بھٹکنا، آوارہ گروی کرنا یا ہوٹلوں میں گپ شپ کرنا جن میں ہلکی پھلکی غیبتیں بھی شامل ہوتیں۔ کسی سمجھدار انسان نے کہا ہے کہ کمرے کی خالی جگہ ہی اسے رہنے کے قابل بناتی ہے۔ یہ خالی لمحے بھی ایسے ہی لگتے تھے۔ ورنہ زندگی صرف فرائض کی گردان رہ جاتی۔ کویت میں اسے ان ہی لمحوں کی یاد بہت آتی تھی۔

یہ سڑک، یہ ماحول آج بھی ویسا ہی تھا۔ دو سال بعد جب وہ آتا تو یہ بات اسے بڑی تسکین پہنچاتی سوائے چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے کہ وہ انیس زیادہ شاندار ہو گئیں تھیں یا جگہ جگہ ریاض ٹراویس، فلیج ٹراویس، یا اسفریاٹ وغیرہ بورڈ لگ گئے تھے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بچپن سے پینتیس برس کی عمر کا سفر جیسے ایک سیدھی سڑک تھا جو اس ماحول میں پہنچتے ہی اسے یاد آ جاتا۔ حالاں کہ ایسا بھی نہ تھا جیسے کہا جاتا ہے کہ آپ بہتے ہوئے پانی میں پیر ڈالتے ہیں تو ہر وقت نئے پانی میں ہوتے ہیں اسی طرح زندگی ہر وقت نئی تھی اور پرانی بھی اور یہی زندگی کا لطف بھی ہے۔ ورنہ آدمی پریشان ہو جائے۔

یہ ہی سب باتیں سوچتا ہوا وہ گلزار محمدی پہنچا جو آج بھی ویسا ہی تھا جیسے وہ دو سال پہلے چھوڑ گیا تھا۔ وہی ہلکی پھلکی برقی لکڑیوں کی سیاہ کرسیاں اور سنگ مرمر کی گول میزیں، کھلے پر بیٹھا آدمی بھی وہی تھا اور ویسا ہی تھا سوائے اس کے کہ اس کے سفید بال کچھ زیادہ سفید ہو گئے تھے یا چہرے میں لکیریں کچھ بڑھ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ ہوٹل میں جگہ جگہ ٹیکے (support) بھی اسی طرح لگے تھے۔

”بلڈنگ ریویر نہیں ہوئی؟“ اس نے ٹیبل والے سے پوچھا۔

”ہوا تھا۔ دو مہینے پہلے پھر ریکال لگ گیا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ریویر بورڈ کا کام کا سالہ بلڈنگ کا لائق خلاص کر دیتا ہے۔“

”ٹھیک نہیں آیا اب تک؟“ شاہد نے پوچھا۔

”آتا جی ہو گا۔ آپ بیٹھو۔“ اس نے کہا۔

شاہد اس مخصوص میز پر بیٹھ گیا جس پر اس کے سب دوست جمع ہوتے تھے۔ پہلے شمار آیا، پھر عزیز اور اس کے بعد ماجد اور سمیل۔ شمار اور وہ بچپن کے دوست تھے۔ اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ عزیز اور سمیل کالج کے دنوں کے ساتھ تھے۔

”کافی پھول گیا ہے بے تو۔“ شمار نے کہا

”وہاں کی ہوائی ایسی ہے اور پھر بے فکری۔“

”وہاں پانی بہت پینا چاہیے۔“ عزیز نے کہا، ”ورنہ سنا ہے گردے خراب ہو جاتے ہیں۔“

”وہاں کی ہوا جس کو اس آجائے پیچانے میں نہیں آتا۔“ سمیل بھی شامل ہو گیا۔ ”میرا ایک رام پوری

دوست ہے۔ وہ جانے سے پہلے بہت دہلا تھا، گال اندر دھنسے ہوئے تھے۔ لی بی کا مریض لگتا تھا۔ ایک سال دو ہی رو کر آیا اب واقعی پٹھان لگتا ہے۔ سرخ ہو گیا ہے، چہرے کی جلد چکنی ہو گئی ہے اور اچھا موٹا ہو گیا ہے۔ واقعی مینڈم لگتا ہے۔“

”بے فکری سے بڑھ کر کوئی دنا من نہیں۔“ شمار نے کہا۔

اس کے بعد چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ اور پھر باتوں کا ایسا تاننا بندھا کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آیا۔ تب ہی

ماجد نے سڑک پر سے گزرتے کسی شخص کو آواز دی، ”یوسف۔“



یوسف نے ٹھٹھک کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر دھیمے دھیمے چلتا ہوا ان کے قریب آیا۔ یوسف ماجد کا دوست ہے لیکن اس سے سب دوست واقف ہیں۔

”آئیے چاہیے“ تجھے۔“ شاہد نے اخلاقا کہا۔

یوسف نے دوسری میز سے کرسی کھینچی اور ان کے درمیان بیٹھ گیا۔

بچی سی واڑھی، بش ٹرٹ اور پیٹ پیٹے ہوئے، بشرے سے سنجیدگی ٹپکتی ہوئی، پیروں میں چپل، اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سی کتاب تھی۔ شاہد نے کتاب کا نام پڑھا۔ خوش نما سنہرے نقش و نگار سے مزین کتاب پر خوش خط تحریر میں لکھا تھا ”بہار شریعت“۔

”دھندہ کیسا چل رہا ہے؟“ ماجد نے پوچھا۔

”بس ویسے ہی جیسے چلتا ہے۔“ یوسف مسکرایا۔

پرانے پاپ خرید کر بیچنا اس کا کام تھا۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے فورمین (Forman) بنر مندی سے جوڑ لگائے ہوئے پاپ بے جوڑ پاپ کے داموں خرید کر لے جاتے۔ اس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ فورمین کو کمیشن مل جاتا اور یوسف کو منافع۔ اس میں پرچیز منیجر (Purchase Manager) کا بھی کمیشن تھا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ عزیز نے پوچھا۔

”ذرا بیٹیں تاگ پاڑے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک جلسہ ہے۔“

”اچھا وہ جو سلمان رشدی کی کتاب پر ہو رہا ہے۔“ یوسف نے تائید میں سر کو جنبش دی۔

”لیکن وہ کتاب تو حکومت نے بین (ban) کر دی ہے۔“ عزیز نے کہا۔

”آپ نے وہ کتاب پڑھی ہے کیا؟“ سمیل نے پوچھا۔

”نہیں کتاب تو نہیں پڑھی۔“ یوسف نے کہا۔

”آپ نے کتاب نہیں پڑھی۔ حکومت نے کتاب ممنوع قرار دی ہے۔ پھر بھی آپ جا رہے ہیں؟“

یوسف نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

”کیوں؟“ ماجد نے پوچھا۔

”مذہب کا معاملہ ہے۔ جانا تو پڑے گا ہی۔“

یوسف چائے پی کر چلا گیا۔ یوسف کے جانے کے بعد اسی کی بات ہونے لگی۔ وہ بنارس کا رہنے والا تھا۔ گو کہ اس کے والدین چالیس سال سے بمبئی میں رہ رہے تھے لیکن عزیز کا خیال تھا کہ یوپی کے لوگ کچھ زیادہ ہی مذہبی ہوتے ہیں۔ ہر بات میں شریعت کا قضیہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ دراصل اب وہ سیدھے شار پر چوٹ کر رہا تھا کیوں کہ شار بھی یوپی کا تھا۔ سمیل نے فوراً عزیز کا عندیہ بھانپ لیا اور اس کی مدد پر آ گیا۔

”بمبئی میں سنی وہابی اور شیعہ سنی کے جھگڑے ان ہی دم سے چلتے ہیں“ سمیل نے کہا، ورنہ بمبئی میں کس کو فرصت ہے۔“

”مذہب کے نام پر کھیوں کی طرح جمع ہو جاتے ہیں۔“ عزیز نے کہا، شار کو مزید اکسایا۔

”مذہب کے معاملے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہوتی ہے۔“ ماجد نے اظہار شار کی حمایت کی۔ لیکن شار فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس بحث میں کودے یا نہ کودے۔

”اس معلومات کا فائدہ ہی کیا؟“ سمیل نے کہا، ”جب اس کا مقصد فتنے کھڑا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر بنانا ہو۔“



”اور اصل یہ ان کی تفریح ہے۔“ عزیز نے راست حملہ شروع کر دیا۔ ”جہاں بیٹھتے ہیں مسئلے مسائل شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ کتابوں کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ سر پھٹول تک ہو جاتی ہے۔“

”آدمی کو تفریح تو چاہیے۔“ ماجد ہنسا۔ اب وہ ٹار کو آکسانے لگا، ”بھئی آتے ہیں۔ دن رات پسینہ بہا کر پیسے کماتے ہیں۔ پسینے کی کمائی بے دردی سے تو نہیں اڑا سکتے۔ اپنے گاؤں میں زمینیں بڑھاتے ہیں۔ بھئی میں دکانیں خریدتے ہیں۔ اس سے انھی تفریح کیا ہو سکتی ہے۔ اس میں کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے سینٹھ لوگ مولویوں پر اسی لئے پیسے خرچ کرتے ہیں کہ جب وہ واپس میں لڑیں تو سب کو لطف آئے۔ سینٹھوں کے پاس فالٹو پیسا بہت ہوتا ہے۔ وہ مولویوں کو ایسے پالتے ہیں جیسے پہلے نواب شیریں پالتے تھے۔ سب خوش رہتے ہیں کیوں کہ یہ سب کچھ مذہب کے نام پر ہوتا ہے۔ سماج میں خوب دھاک جمتی ہے۔“

”لیکن یہ سب سلسلہ آخر ہے کیا؟“ شاہد نے زچ ہو کر پوچھا۔ ”اس جلسے کا آخر پلس منظر کیا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ ٹار نے کہا۔ ”ایک کتاب چھپی ہے شیطانی آیات (Satanic Verses) تو کیا ہے کہ اس میں کچھ باتیں قابل اعتراض ہیں۔ کسی نے راجیو گاندھی کو لکھا۔ کچھ ہم لوگ جا کر اس سے ملے تو اس نے کشم کے ایک قانون کے مطابق کتاب کی خرید و فروخت کو ممنوع کر دیا۔“

”بالکل،“ ٹار نے کہا، ”کشم کا ایک قانون ہے کہ کوئی کتاب اگر کسی فرقے یا گروہ کی دل آزاری کا باعث بن سکتی ہو تو احتیاطی تدابیر کے مطابق اسے ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے۔“

”پھر یہ جلسے جلوس کیوں؟“ شاہد نے پوچھا۔

”جلسے جلوس اس لئے کہ اگر یہ نہ ہوں گے تو کل نیشنل پریس کہے گا کہ مسلمانوں نے تو کوئی اعتراض ہی نہیں کیا۔ چند لوگ وزیراعظم سے ملے اور اس نے کتاب کو بین (ban) کر دیا۔“ ٹار نے کہا۔

”یہ تو بہانہ ہے۔“ عزیز نے کہا۔ ”اصل میں کچھ لوگ سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور بھئی میں ایسے لوگ بہت ہیں یوسف جیسے جو اچھے خاصے سمجھدار ہوتے ہوئے بھی مذہب کے نام پر مچل جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر کوئی جلسہ ہو، بھیا لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔“

ٹار اب خود کو روک نہ سکا۔

”یہ تم لوگ کچھ بھی کہو، یہ بھیا لوگ مذہب کے بارے میں تم سے زیادہ جانتے ہیں۔“

عزیز اسی موقع کا منتظر تھا۔ دراصل اس کا کہنا تھا کہ کوئی بات ہو جب تک کہ آپ ایک طرف نہ ہو جائیں مزا نہیں آتا۔ کرکٹ ہو یا فٹ بال کا میچ، وہ زور شور سے کسی ایک طرف ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جب لوگ کسی بات کی حمایت کر رہے ہوں وہ اس کی مخالفت میں بولنے لگتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا گویا وہ جی جان سے وہی بات کہہ رہا ہے جسے وہ حق سمجھتا ہے۔ حالاں کہ پھر وہ اس بات کو فراموش کر دیتا اور اگلے روز جب کوئی وہی بات کہہ رہا ہوتا جو وہ گزشتہ روز کہہ رہا تھا تو پھر وہ اس کی مخالفت میں دلیلیں دینے لگتا۔ سب دوست اس بات کو سمجھتے تھے اور لطف لیتے تھے۔ عزیز کا کہنا تھا کہ اس طرح کسی موضوع کے تمام پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔

”میں کب اس بات سے انکار کرتا ہوں؟“ عزیز نے کہا، ”لیکن اس بات کو تم بھی مانو گے کہ حیض و نفاس کے عالم قوموں کی امامت نہیں کر سکتے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔“

قوم کیا ہے، قوموں کی امامت کیا ہے یہ کیا جانیں بے چارے دو رکعت کے امام

”اقبال نے کون سے تیر مار لیے، اونچی اونچی باتوں کے ملاوڑ۔“ ٹار نے کہا۔ ”لیکن ان میں سچا مذہبی جذبہ



تو ہے۔ ان میں کوئی سلمان رشدی آج تک پیدا نہیں ہوا۔ سلمان رشدی ہنس سہمیں پیدا ہو سکتا تھا۔  
 ”قاول“ عزیز نے کیا۔

”تم سلمان رشدی پر بغیر پڑھے تنقید کر رہے ہو۔“ سہیل نے عزیز کی حمایت کی۔ ”دیکھو ایہ بات سمجھ لو، بھیا لوگ جیسے بھی ہوں ان میں ایمان کا جذبہ ہے اور مذہب کے لئے جان بھی دے سکتے ہیں۔“

”محض سنی سنائی بات پر بھی؟“ عزیز نے کہا۔ ”کیا یہ خطرناک نہیں کہ آدمی اپنی جان قربان کر دے اور اسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ وہ کیوں جان قربان کر رہا ہے۔“

”دیکھو اگر کوئی قابل اعتراض بات نہ ہوتی تو حکومت خواہ مخواہ کتاب کو بین (ban) نہ کرتی۔ اور نہ ہی وہ لوگ بے وقوف ہیں جنہوں نے کتاب کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کروائی۔“ ثار نے کہا۔

”یہ بات تو ثار کی صحیح ہے۔“ شاہد نے ثار کی حمایت کی۔

”پرانے لوگ کہتے تھے کہ آدمی پڑھ لکھ لیتا ہے تو منافق ہو جاتا ہے۔“ ثار نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ عزیز نے ہنستے ہوئے پوچھا، ”ہم لوگ منافق ہیں؟“

”بالکل، ثار نے کہا۔“ دیکھو پیارے ایک بات سمجھ لو، کتاب تو ایک ہی ہے اور باقی سب کتبیاں ہیں۔“

عزیز شاید بات کو اور آگے بڑھاتا لیکن سہیل کو اندیشہ تھا کہ بحث کہیں کوئی ناگوار رخ نہ اختیار کر لے۔

”بالکل ٹھیک کہتے ہو یا ر، اسی بات پر چائے کا ایک اور دور ہو جائے۔“ سہیل نے کہا۔

”بالکل، بالکل۔“ شاہد نے تائید کی۔ وہ بھی ڈر رہا تھا۔ کہیں خواہ مخواہ کوئی تماشائے کھڑا ہو جائے کیوں کہ اس

پاس کی میزوں کے لوگ بھی ان کی بحث میں دل چسپی لینے لگے تھے اور دو تین بار لیش نوجوان بحث میں کودنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ ظاہر ہے انہیں یہ بتا نہیں تھا کہ وقت گزاری کا ان کا ایک انداز یہ بھی ہے۔ عزیز کی عادت سے ناواقف وہ اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

بیرا چائے کے کپ لے آیا۔ وہ بار لیش نوجوان بھی مطمئن ہوئے کہ آخر ثار ہی حاوی رہا۔ انہیں پتا نہیں تھا

کہ عزیز اپنی عادت سے مجبور تھا اور نہ ثار کے برعکس وہ پکا نمازی تھا، تہجد بھی پڑھتا تھا۔

”اب آج تو پٹ جاتا“ ان کے جانے کے بعد ثار نے ہنس کر کہا۔

”واقعی۔“ سہیل اور شاہد بھی ہنس پڑے۔

رات کے کھانے کے بعد شاہد واپسی کی سوچ رہا تھا لیکن عائشہ بی نے یہ کہہ کر روک لیا کہ کل چلے جانا۔ اس

نے نسرین کو فون کیا۔ فون نسرین نے ہی اٹھایا۔ شاہد کی بات سن کر اس نے کہا۔

”میں خود یہ کہنے والی تھی کہ آپ صبح آئیے۔ اس وقت فرینوں میں بہت بھیڑ ہوتی ہے اور صبح اس طرف آنے

والی گاڑیاں بالکل خالی ہوتی ہیں۔“

”کس کا فون ہے؟“ پیچھے سے کسی کی آواز شاہد نے سنی، ”اس سے کہہ کہ چار پانچ دن بعد آئے جب تک

محمود کے امتحانات بھی ختم ہو جائیں گے۔“ یہ نسرین کی ماں کی آواز تھی۔ وہ سوپنے لگا دیکھیں اب نسرین کیا کہتی ہے۔

”آپ صبح اطمینان سے آئیے“ نسرین نے کہا اور جلدی سے فون رکھ دیا۔

شاہد نے سوچا ہو سکتا ہے نسرین بھی یہی چاہتی ہو لیکن کہہ نہ سکی ہو۔ نسرین کی ماں بات تو صحیح کہہ رہی تھی وہ

صبح فون کر دے گا کہ اب وہ چار پانچ روز کے بعد ہی آئے گا۔

اگلی صبح شاہد ناشتہ کر رہا تھا کہ اشوک آگیا۔ اشوک اور شاہد دونوں کوکن کے ایک ہی گاؤں شری وردھن کے



تھے۔ بچپن ساتھ گزارا تھا۔ آموں کے باغوں میں، تالاب کے کنارے۔ دوستوں کے ساتھ اکٹھے وقت گزارا تھا، کھیلے کودے تھے۔ چوتھی تک شاہد اور اشوک مراٹھی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ ماسٹر جام لیتے تو دونوں کے نام ایک ساتھ آتے کیوں کہ دونوں کا سرنام (surname) نانیک تھا۔ پھر شاہد کے ابا اسے بمبئی لے آئے تھے اور اردو اسکول میں داخلہ کروادیا تھا۔ کالج میں دونوں پھر ساتھ ہو گئے۔ اشوک اور شاہد کے والدین بھی اچھے دوست رہے تھے۔ اسی لئے ان کے خاندان کے تعلقات پڑوسی ہونے کے ناطے گاؤں میں جتنے اچھے تھے بمبئی میں بھی ویسے ہی استوار رہے تھے۔

شاہد کی مراٹھی بہت اچھی تھی۔ بمبئی آنے کے بعد بھی اشوک مراٹھی ناول اسے لاکر دیا کرتا تھا۔ شیواجی سوانت کے تاریخی ناول اشوک کو بہت پسند تھے اور اس سے لے کر شاہد نے پڑھے بھی تھے۔ اسکول کے تقریری مقابلے میں اشوک کو شیواجی سوانت کا ناول 'سوامی انعام' میں ملا تھا تو شاہد کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ کالج میں شاہد اور اشوک نے کئی مراٹھی ڈرامے اپنے اور ساتھیوں کے ساتھ دیکھے تھے ان پر تبادلہ خیال کیا تھا۔ اشوک و دیکانند اور رام کرشن پر مفس سے بہت متاثر تھا اور شاہد سے اکثر ان کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کی دل چسپی دیکھ کر شاہد نے بھی و دیکانند اور رام کرشن پر مفس کو پڑھا تھا۔ اشوک اکثر و دیکانند کی یہ بارودھراتا تھا کہ اگر نو جوان مذہبی گرتھوں سے زیادہ واقف نہ بھی ہوں تو کوئی بات نہیں لیکن انہیں بلوان ہونا چاہیے۔ ان میں دلش پریم ہونا چاہیے۔ یہ بات شاہد کو بھی اچھی لگتی تھی۔ اس نے شبلی کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق کو پڑھا تھا۔ حضرت عمرؓ اس کے آئیڈل (ideal) تھے۔ دسویں جماعت میں اسے میکسم گورکی کا ناول 'ماں' بہت پسند آیا تھا۔ اور اس نے اشوک سے اس کا مراٹھی ترجمہ پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ اور اس کے بعد اشوک اور شاہد نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر روسی ناول پڑھے تھے۔ بمبئی آنے کے بعد انہوں نے مراٹھی، انگریزی اور ہندی کے کئی ڈرامے دیکھے تھے۔ اس طرح دونوں میں کافی ہم آہنگی تھی اور برابر ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔

اشوک نے بتایا کہ ماما جی نے عائشہ بی کے لئے پورن پوری (بیسن کی روٹی) بھیجی ہے۔ آموں کی فصل اس بار بہت اچھی ہوگی ایسا گاؤں میں سب کا خیال ہے۔

ابھی وہ یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ حنیف بھائی آگئے جو دوسری منزل پر رہتے تھے۔ اور ان کے پیچھے بلڈنگ کے دو اور نو جوان کمرے میں داخل ہوئے۔ حنیف بھائی نے اشوک سے کہا کہ وہ اشوک کے آنے کی اطلاع ملتے ہی سارے کام چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان کے آنے کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اشوک نے اپنے آفس بیک سے چند کاغذات نکال کر انہیں دکھائے۔ یہ مختلف کمپنیوں کے شیئر کے فارم، یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے ماسٹر شیئر اور آئی بی آئی کے بونڈ وغیرہ کے درخواست فارم تھے۔ کافی دیر آپس میں بٹکا بٹکی کے بعد انہوں نے یونٹ ٹرسٹ کے ماسٹر شیئر خریدنے کا طے کیا۔

”یہ نیا شوق معلوم ہوتا ہے“۔ شاہد نے کہا۔

”آج کل آفسوں، کمپنیوں، کارخانوں میں شیئر خریدنے کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے“۔ اشوک نے بتایا۔

”میں بتاؤں، دراصل یہ اس زمانے کا چائنا چکن ہے“۔ عائشہ بی کے شوہر مختار نانیک نے کہا۔

”چائنا چکن کیا؟“

”ہمارے زمانے میں ایک سٹہ ہوتا تھا اس میں چکن دیا جاتا تھا۔ چکن ایک طرح کا مرغ ہوتا تھا جیسے ایک آدمی

ہیٹ پکین کر آئے گا۔ آدمی لوگ دیکھے گا سلام کرے گا، ایک آدمی بہت غصے والا ہے۔ چاقو لے کر گھومے گا، پولیس

پکڑے گا۔ خالی کھولی میں بند کروے گا، میت جائے گی۔ اس چکن میں پولیس، خالی کھولی، میت سب نمبر ہوتے تھے۔

پولیس نمبر ۹، خالی کھولی ۱۸، میت ۳۔ یہ سٹہ دن میں چار مرتبہ لکھتا تھا۔ شام ساڑھے چار بجے، پھر سات بجے، نو بجے اور



کیا رہے۔ اکثر پولیس والے، دفتر کے باہر اور کالج کے لڑکے بہت شوق سے کھیلتے تھے۔ اشوک کے پتا شوین گرام سے کھیلتے آتے تھے۔ بڑا اچھا ٹائم پاس تھا۔ اب تم لوگ شیئر خریدتے ہو۔ یہ بھی تو ایک طرح کا جوا ہی ہے۔ ہم لوگ بس دو چار آنے کھیلتے تھے ایک آنہ اس نمبر پر، دو آنے دوسرے نمبر پر، لگ گیا تو ایک آنے کے ڈیڑھ روپے ملتے تھے۔

”یہ نمبر تو بمبئی کی بونی میں شامل ہو گئے ہیں۔“ حفیظ بھائی بولے۔ ”جیسے یار، وہ تو تین نمبر ہے۔“

مطلب ہوتا ہے میت یعنی بہت مردار، کمزور، بودا۔ یا کوئی بیس اکیس سال کی عمر کی عورت جا رہی ہو تو پاس کے شناسا شخص سے کہتے تھے... دیکھ چیمیس جا رہا ہے۔ چیمیس کا مطلب تھا بڑی چھو کری۔ بوڑھا اور بوڑھی جا رہے ہوں یا پختہ عمر کا جوڑا گزر رہا ہو تو کہتے... ذرا چیمیس کو تو دیکھ۔“

”اس کی جگہ اب رتن سٹے نے لے لی ہے۔“ ایک نوجوان نے کہا۔

”اصل میں بوریت سے بچنے کے لئے بمبئی والوں کا ٹائم پاس کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے۔“ حفیظ بھائی نے کہا۔

”اور یہ شیئر بازار کیا ہے؟“ مختار بھائی ہنس کر بولے، ”یہ بھی تو ایک جوا ہے۔“

”یہ نیا ٹائم پاس ہے،“ اشوک نے کہا، ”لیکن یہاں پیسے اچھے ملتے ہیں۔“

”میں دیکھتا ہوں لوگ گھنٹوں یہ ہی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ شیئر اچھے ہیں خرید لو۔ فلاں شیئر کبھی نہ خریدنا۔ کون سے شیئر خرید رہے ہو۔ جہاں ملاقات ہو یہ ہی باتیں ہونے لگتی ہیں۔“

”ہاں! اب شیئر بازار سوشل ٹاک میں شامل ہو گیا ہے۔“ اشوک نے کہا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ شاہد نے کہا۔ ”حفیظ بھائی، ابوالکلام اور مودودی کو پڑھنے والے، تصوف کی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر خریدنے والے شیئر بازار کی طرف کیسے راغب ہو گئے؟“

سب ہنس پڑے۔

حفیظ بھائی بھی مسکرائے لیکن ان کا چہرہ پچھکا پڑ گیا۔ شاہد نے یہ بات محسوس کی اور باتوں کا رخ موڑ دیا۔

”مختار بھائی! آپ کا خیال ہے، جمعہ کو سلمان رشدی کی کتاب پر جلوس کا میاب ہوگا؟“

”بھائی جہاں ہر شخص لیڈر بن جائے وہاں کوئی لیڈر نہیں رہتا۔“ مختار بھائی نے کہا۔

سب کا خیال یہ ہی تھا کہ جلوس کی قیادت نا تجربہ کار لوگ کر رہے ہیں۔ اس لئے کامیاب نہ ہوگا۔ دل حسن نے، جو جلوس میں اعلان کرنے والے کئی لوگوں جانتا تھا، کہا تھا کہ ان میں سے کئی جاسوسی ناول بہت پڑھتے ہیں اور ابن صفی کے ناولوں کے کردار عمران سے بہت متاثر ہیں۔ عمران کو چوں کہ ’ایکس نو‘ بھی کہا جاتا ہے اس لئے ایک تنظیم کا قائد خود کو ایکس نو کہلاتا ہے۔ سب ہی مشہور ہونا چاہتے ہیں اور اس کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہیں۔

کچھ دیر بعد اشوک چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی حفیظ بھائی اور دوسرے نوجوان بھی رخصت ہو گئے۔ شاہد بچوں کو ویڈیو گیم کھیلتے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے ساتھ کئی ویڈیو کیسٹ لایا تھا اور بچے خوشی خوشی کھیل رہے تھے۔ ان کے ساتھ چال کے اور بچے بھی شامل ہو گئے تھے۔

اس نے نسرین کو فون کر کے بتایا کہ اب وہ چار پانچ روز بعد ہی آئے گا۔ نسرین بھینا سمجھ گئی ہوگی کہ شاہد نے اس کی ماں کی بات سن لی ہوگی۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر بعد شار نے آواز دی اور وہ فلم دیکھنے چلے گئے۔ سہیل اور عزیز نے تھیسٹر پر ملنے کا وعدہ کیا تھا۔





صبح و سنا کتاب و قلم سے ہیں ہم تہا  
انور سدید نے جو نزاری کے زندگی

انور سدید

## ڈاکٹر انور سدید

لاہور، پاکستان

میں نے جب ڈاکٹر انور سدید کے یہ دو بے پڑھے تو بے حد متاثر ہوئی۔ میری اپنی طبیعت  
جو گیوں جیسی ہے۔ ان کا ایک دو ہا تو یہ ہے جس کا عنوان ہے ”زندگی کا بچید“۔

جاتی رت کیا کہہ گئی اس کو تو پہچان  
سے بدلتا دیکھ کر قائم رکھ اوسان  
اپنے من میں ڈوب کر سے کا مطلب جان  
دوسرا دو ہا تھا ”آنکھیں موندلو“۔

کیوں دل بوجھل ہو گیا کیوں نم ہو گئی آنکھ  
زندہ رہنے کے لئے کہہ گئے بھگت سدید  
کیوں پلکوں پہ آگئی آنسو کی اک بوند  
سے کو بگڑا دیکھ کر، لیجئے آنکھیں موند  
ہمارے ایک معروف افسانہ نگار قیصر تمکین کا کہنا ہے کہ شاعری واعری سب فضول قسم کی چیزیں ہیں۔ میں  
ان سے بد اصرار کہتی ہوں کبھی کبھی ایک شعروہ کام کر جاتا ہے جو ڈیڑھ صفحے کا افسانہ بھی نہیں کر سکتا۔

میں نے جب کبھی ڈاکٹر انور سدید کو پڑھا تو یہ جاننے کی خواہش شدید تر ہوتی چلی گئی کہ معلوم  
کروں انہیں دنیا کے ادب میں یہ محترم مقام دلوانے میں کس خاتون کا ہاتھ ہے کیوں کہ یہ مقولہ مشہور  
ہے کہ ہر کسی بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن جب میں نے ڈاکٹر انور سدید



کی کہانی خود ان سے سنی (اور پڑھی) تو معلوم ہوا کہ ان کی مقبولیت اور کامیابی کے پیچھے ان کی اپنی کڑی محنت اور جدوجہد کی ایک طویل مسافت ہے جس نے انہیں تھکا یا نہیں بلکہ ہمیشہ توانائی بخشی۔

ڈاکٹر انور سدید بلا کے زوونویں ہیں۔ خوب لکھتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ کسی کا دل توڑنا نہیں جانتے۔ دل آزاری کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی ستائے تو پھر وہی معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ ”دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت“، تو وہ دل کو ”سنگ و خشت“ بنا لیتے ہیں کہ بنا اس کے گزارا بھی نہیں۔ مگر اپنے قلم کو زہر میں نہیں ڈبوتے۔ وہ دشمن کو تحریر کی شیرینی سے موہ لینے کا فن جانتے ہیں۔

اپنے پچھتر ویں (۷۵) یوم پیدائش ۳ / دسمبر ۲۰۰۲ء کے موقع پر انہوں نے ایک غزل کہی۔ اس کا مقطع ہے۔

وہی کرے گا اب انور سدید بخیر گری کہ جس نے میرا گریبان پھاڑ ڈالا ہے  
یہ ان کا عزم ہے کہ جس نے ان کے ”نا بھی خواہوں“ کو بھی ان کا دوست بنا دیا۔

میں نے انہیں ۳۰ / دسمبر ۲۰۰۲ء کے دن خط لکھا اور ”گفتنی، حصہ دوم“ کا سوال نامہ بھیجا۔ انہوں نے مجھے انتظار کرائے بغیر ۲۲ / جنوری ۲۰۰۳ء کے دن سوال نامے سے متعلقہ مواد بھیج دیا۔ ان کے ملفوف میں میرے نام ایک خط بھی تھا۔ انہوں نے لکھا کہ میرے سوالوں کے جواب میں انہوں نے ایک حقیقت بیان کی ہے۔ تاہم مجھے حق ہے کہ ان کی تحریر سے جو باتیں حذف کرنا چاہوں، کاٹنا چاہوں، کاٹ سکتی ہوں۔

میری دانست میں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ایک سینئر (senior) بزرگ (ادیب ہیں، صحافی ہیں، میرے پیش رو ہیں اور اپنی تحریر کے لئے خود جواب دہ بھی۔ میں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ مجھے لگا وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ اور میں ان سے بالمشافہ سوال کر رہی ہوں اور وہ سوالات کا جواب بڑی خوش اسلوبی اور تفصیل سے دے رہے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا، ”آپ کا نام انور سدید والدین کا عطا کردہ ہے یا... اور اپنی تاریخ پیدائش و جائے پیدائش بتاتے چلیے۔“

کہنے لگے۔ ”میسٹرک کے سرٹیفکیٹ میں میرا نام ’محمد انوار الدین‘ درج ہے لیکن یہ میرا اختیاری نام ہے۔ والدین نے پیدائش کے وقت میرا نام ’محمد انور زکھما‘ والد کا نام ’میاں امام الدین‘ ہے۔ بڑے دو بھائیوں کے نام ’فیروز الدین‘ اور ’معراج الدین‘ ہیں۔ میسٹرک کے امتحان میں داخلے کا فارم بھرتے وقت میں نے اپنے نام کا سلسلہ والد گرامی اور بڑے بھائیوں کے نام کے سلسلے ’الدین‘ سے منسلک کر لیا۔ بعد میں ادب کی طرف آیا تو میں نے تخلص ’تائب‘ اختیار کیا۔ لیکن اس دور طالب علمی میں ایک ناول ’بیاض سحر‘ پڑھا تو اس کی مصنفہ ’دب، سدید‘ کے نام نے مجھے متاثر کیا اور میں نے اپنا نام قلمی تشخص کے لئے ’انور سدید‘ منتخب کیا۔ یہ قرآنی آیت ’قولوا تو لا سدید‘ سے ماخوذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ ان دنوں قیوم نظر، یوسف ظفر کے مرکب نام مقبول ہو رہے تھے۔ بچوں اور قلمی



رسالوں میں میرے مضامین میٹرک تک انور میاں نوئی کے نام سے چھپتے رہے ہیں۔ گزشتہ اڑسٹھ (۶۸) برس انور سدید کے نام سے بسر کیے ہیں جو عام لوگوں کی دانست میں نہیں آتا تو میں کہتا ہوں کہ 'شدید' کے تین نقطے اڑا دیجئے، میرا نام برآمد ہو جائے گا۔

میٹرک کی سند پر پیپ انش کی تاریخ ۴ / دسمبر ۱۹۲۸ء درج ہے اور پیدائش کا مقام 'میانی' ہے جو دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر کسی زمانے میں کھیوڑہ کے نمک کی منڈی تھی۔ لیکن ہوش کی آنکھ کھولی تو سب سے پہلے شہر سرگودھا دیکھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں نہر لوہیز جہلم کے کنارے آباد کیا گیا تھا اور اس دور کا ایک جدید شہر تھا۔ چھٹی جماعت کی تعلیم سرگودھا میں حاصل کی۔ آٹھویں جماعت گورنمنٹ ہائی اسکول، ڈیرہ غازی خان سے کی جہاں میرے بڑے بھائی میاں فیروز الدین محکمہ زراعت میں کلرک تھے۔ میٹرک سرگودھا سے کیا۔ رجحان ادب کی طرف تھا لیکن والد کے حکم پر سائنس کے مضامین لینے پڑے جن میں چل نہ سکا۔ اس دور میں اسلامیہ کالج لاہور تحریک پاکستان میں عملاً شریک تھا۔ میں مسلم لیگی سرگرمیوں کی وجہ سے ایف ایس سی کا امتحان نہ دے سکا۔ امتحان میں بیٹھتا تو شاید تھرڈ کلاس ہی حاصل کرتا۔ والدین غریب تھے۔ انہوں نے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں محکمہ آب پاشی میں پینٹس (۳۵) روپے ماہوار اور ڈیڑھ روپے سالانہ ترقی پر کلرک بھرتی ہو گیا۔

یہ ملازمت کرنے پر احساس ہوا کہ زندگی کی دوڑ میں پچھڑ گیا ہوں چنانچہ انجینئرنگ اسکول (سول) میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے داخل ہو گیا۔ دوبارہ محکمہ آب پاشی میں سب انجینئر (سول) کی ملازمت اختیار کی لیکن اس ملازمت میں نا آسودگی محسوس ہوئی تو مزید ترقی کے لئے محکمہ امتحان پاس کیے۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ ڈھاکہ سے ایم آئی ای کی ڈگری لی۔ اس دوران ادیب فاضل کیا۔ ایف اے اور بی اے صرف انگریزی میں پاس کیے اور گریجویشن کے معیار کی ڈگری حاصل کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا آخری پرچہ انجینئرنگ ڈیزائن کا تھا۔ صرف ایک لازمی سوال دریافت کیا جاتا تھا۔ اگر اس نوع کا سوال طالب علم تیار کر کے امتحان میں بیٹھتا تو کامیاب ہو جاتا۔ میں نے یہ امتحان چار مرتبہ دیا۔ کم و بیش ایک سو قسم کے ڈیزائن تیار کیے لیکن ہر مرتبہ میری تیاری کے برعکس سوال آ جاتا۔ آخری مرتبہ دل برداشتہ ہو کر میں نے ایم اے اردو کرنے کا ارادہ کر لیا۔ امتحان میں صرف دو ماہ رہ گئے تھے۔ ذہل فیس دے کر داخلہ لیا اور نہ صرف پاس ہوا بلکہ یونیورسٹی میں اول آیا۔ دوسرے نمبر پر امجد اسلام امجد تھے جو پروفیسر وقار عظیم کے چہیتے بٹا گرو تھے اور انہیں اول لانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی بیرونی (پرائیویٹ) طالب علم کا اول آنا یونیورسٹی کے وقار کے خلاف تھا۔ لیکن بقول راوی امجد اسلام امجد تنقید کے پرچے میں فیمل ہو رہے تھے۔ انہیں رعایتی نمبر دے کر پاس کیا گیا تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے پندرہ بیس نمبر پیچھے تھے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے کچھ دوست مثلاً غلام حسن اظہر، سلیم اختر وغیرہ پی ایچ ڈی کرنے لگے تھے۔ میں بھی اس طرف راغب ہو گیا۔ اردو ادب کی تحریکیں کے موضوع پر مقالہ



لکھنے پر مجھے ڈگری دی گئی۔ میرے داخلی نگران ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ مختسین میں ڈاکٹر عبداللہ اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی شامل تھے۔ اپرٹل سے ایم اے تک میں ہمیشہ اول آیا۔ تین گولڈ میڈل ملے۔ اردو ادب کی تحریکیں پر ہجرہ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ الحمد للہ! الحمد للہ۔

ادب میں ابتدا افسانہ نگاری سے کی۔ فلمی رسالہ 'چتر اویں' سے مہم ادبی رسالہ 'میسویں صدی' سے گزرتا ہوا مظہر انصاری دہلوی کے دور میں 'ہمایوں' تک پہنچ گیا۔ لیکن انجینئرنگ کی ملازمت میں ادب کے فریضے سے غافل ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں سرگودھا تعیناتی ہوئی تو ڈاکٹر وزیر آغا مجھے دوبارہ ادب کی طرف لائے۔ میری زندگی ان کے فیضان کی مرہون منت ہے۔

میں دل چسپی سے یہ کہانی سن رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا، ڈاکٹر انور سدید کہانی لکھنے کے ساتھ کہانی سنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ میں نے پوچھا، "آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟"

وہ متبسم ہو کر بولے۔ "لکھنے سے پہلے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میرے بڑے بھائی، معراج الدین، نے ایک ہوم لائبریری بنا رکھی تھی جس میں دارالاشاعت پنجاب لاہور کی کتابیں دستیاب تھیں۔ یہ کہانیاں پڑھ کر مجھے بھی کہانی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلی کہانی لالہ رگھوناتھ سہائے کے رسالے 'گلدستہ' میں ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ پہلا افسانہ فلمی رسالے 'چتر' میں غالباً ۱۹۴۵ء میں چھپا۔ 'ہمایوں' میں آخری افسانہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۵ء تک مجھے انور گوندی نے ادبی دنیا میں زندہ رکھا۔ وہ میرے پرانے افسانے اپنے رسالے 'کامران' میں باقاعدگی سے چھاپتے تھے۔ پہلا قابل ذکر تنقیدی مضمون 'مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب' ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے 'اوراق' میں شائع ہوا۔ پہلی کتاب کا نام 'فکر و خیال' ہے جو 'وراق' میں چھپنے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد محکمہ آب پاشی کی ملازمت میں انجینئرنگ میرا پیشہ تھا، ادب میری عبادت بن گیا۔ میں نے اس عبادت کو داخلی سرگرمی سے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں ساٹھ (۶۰) برس کی عمر میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ مل گئی تو میں 'صحافت' کی طرف آ گیا۔ اب یہ مشقت ہی میرا پیشہ ہے۔ لیکن احساس ہوتا ہے کہ ادب کا ریاض شاید اسی لئے عمل میں آیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد قلم و قریط کی خدمت پیشہ ورانہ انداز میں ادا کرنی ناگزیر ہوگی۔ ملازمت کے دوران سب انجینئرز کے عہدے سے ایگزیکٹو انجینئرز کے عہدے تک ترقی حاصل کی۔"

"ڈاکٹر صاحب!، میں نے پوچھا، "اپنے مجموعہ کلام یا نثری کتب کے بارے میں بھی

بتائیے۔"

انہوں نے فرمایا۔ "میں نے شاعری کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی لیکن آغاز شاید شاعری ہی سے کیا تھا اور بچپن میں ہی میں افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس دور میں میرے ایک استاد مولوی عبدالکریم نے مجھے بکورا اور اوزان بھی سکھائے تھے۔ میری زیادہ توجہ نثری اسٹاف کی طرف ہی رہی۔ بعد میں اپنے اندر کے شاعر کو بھی دریافت کیا۔ لیکن یہ ایسے لمحات کی شاعری



ہے جب تنقید کے خازنار سے ذہن خیال کے نئے مرغزاروں میں نکل جاتا ہے۔ اور دل کی کوئی لطیف بات لب پہ آ جاتی ہے۔ میں شاعری کا شوقیہ فن کار ہوں اور اسے چند اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے مجموعہ کلام چھاپنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔ نہ کسی ناشر نے تقاضا کیا ہے۔ البتہ نثر کی کتابیں مسلسل چھپ رہی ہیں۔ میں یہاں چند نام گنوانے پر اکتفا کروں گا۔

الف تنقید فکر و خیال، اختلافات، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، غالب کا جہاں اور، اقبال کے کلاسیکی نقوش، میر انیس کی اقلیمِ سخن، کھر درے مضامین، برسبیل تنقید، موضوعات، اردو افسانے کی کروٹیں

ب تحقیق و تدوین اردو ادب میں انشائیہ، اردو ادب میں سفر نامہ، اردو ادب کی تحریکیں، اردو ادب کی مختصر تاریخ، پاکستانی ادبی رسائل کی تاریخ

ج شخصیات مولانا صلاح الدین، فن اور شخصیت، وزیر آغا، ایک مطالعہ، دلاور فگاریاں

د انشائیہ ذکر اس پری و ش کا، آسمان میں پتنگیں

ہ خاکے محترم چہرے، قلم کے لوگ

و سفر نامہ دلی دورہ نہیں

ز جائزے نئے ادبی جائزے، ادب کہانی ۱۹۹۶، ادب کہانی ۱۹۹۷

ح تراجم زلفی بھٹو آف پاکستان (والپورٹ)، کشمیر سر دجہنم (جگ موہن)، فریب کار (فور سائیتھ)، مون سٹون (ولکی کالنز)

اس برس (۲۰۰۲ء) میں میری چار کتابیں چھپی ہیں۔

۱۔ کچھ وقت کتابوں کے ساتھ (ایک سو کتابوں کے تجزیے)

۲۔ فریب کار (ترجمہ فور سائیتھ)

۳۔ دلاور فگاریاں (دلاور فگار پر کتاب)

۴۔ ادب کہانی ۱۹۹۷

تصنیفات و تالیفات کی تعداد ساٹھ (۶۰) سے اوپر پہنچ چکی ہے۔ الحمد للہ، الحمد للہ۔

کچھ دیر کے لئے انہوں نے توقف کیا تو میں نے اگلا سوال کیا، ”کیا زندگی کے کسی حصے میں آپ نے محسوس کیا کہ اردو ادب کو اپنا کر آپ شہرت اور مالی خسارے میں رہے۔“

ہنس کر کہا، ”کبھی نہیں۔ میں اپنے طور پر ادب کو ذہن کی عبادت تصور کرتا ہوں اور اس کا

حاصل مادی انعامات تسلیم نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے ادب کو پیشہ ورانہ انداز میں استعمال

کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ہے نہ کبھی سوچا ہے۔ شہرت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ زن فاحشہ

ہے جو اس کا تعاقب کرتا ہے اس کو انگوٹھا دکھاتی ہے اور مواصلت سے محروم رکھتی ہے جو اس کو اعتنا کی نظر



سے نہیں دیکھتا اس کے پیچھے خود بھاگتی ہے۔ مجھے جو اطف و سرور گم نامی میں حاصل ہے وہ شاید احمد ندیم قاسمی صاحب جیسی عالم گیر شہرت سے بھی حاصل نہ ہو۔ رہ گئی مالی خسارے کی بات تو میں نے اس باب میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ میری زندگی کا کفیل انجینئر نگ کا پیشہ تھا۔ اس سے میری دال روٹی باعزت طریق سے چلتی رہی اور اب صحافت اختیار کی ہے تو یہ ایک لحاظ سے مشقت ہے جس نے مجھے کبھی مالی اعتبار سے محتاج نہیں ہونے دیا۔ مجھے یہ علم نہیں کہ لوگ جسے شہرت سے موسوم کرتے ہیں وہ زن فاحشہ مجھ پر مہربان ہوئی ہے یا کہ نہیں۔ لیکن مجھے اطمینان ہے کہ مجھے ادبی دنیا میں کچھ پزیرائی جو ملی ہے وہ میری توقع سے زیادہ ہے۔ 'اردو ادب کی تحریکیں'، 'سفر نامہ اردو ادب میں'، 'اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'، 'اردو ادب میں انشائیہ'، 'پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'، 'ادب کہانی' کا سلسلہ ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۷ء وغیرہ چند ایسی کتابیں ہیں جو میری 'اولیات' شمار ہوتی ہیں۔ ان موضوعات پر شاید میں نے سب سے پہلے کام کیا۔ ایوارڈوں کی عطا یگی میں بھی مجھے بہت زیادہ نوازا گیا۔ ہر مرتبہ جب ایوارڈ ملتا تو میں حیرت زدہ ہو جاتا کہ اقربا پروری اور دوست نوازی کے اس دور میں میرا نام کیسے آگیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ شاید توجہ حاصل کرے

قصہ یوں ہوا کہ میری کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' پر مجھے 'ہجرہ ایوارڈ' دیا گیا تو اردو کے ممتاز ادیب اور کتابوں کے جج جناب احمد ندیم قاسمی نے فرمایا کہ انہوں نے جس کتاب کو چھتیسویں (۳۶) نمبر پر رکھا تھا اس پر پہلا انعام دے دیا گیا۔ عبدالعزیز خالد صاحب نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے ٹیلیفون کیا کہ اشارہ تمہاری کتاب کی طرف ہے۔ میں نے اکادمی ادبیات پاکستان کو لکھا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب اس کتاب کو چھتیسویں درجے کی ثابت کر سکیں تو میں ایوارڈ واپس کرنے کو تیار ہوں۔ قاسمی صاحب تو میری کتاب کے دس صفحات بھی پڑھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ عارف افتخار نے مجھے لکھا کہ میری کتاب کو متفقہ ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اور قاسمی صاحب صرف شاعری کی کتابوں کے منصف تھے۔ اس اعلان کے باوجود محل نظر یہ بات ہے کہ کوئی منصف اپنے جج ہونے کا اعلان اخبارات میں کر رہا ہے۔ جس میں آئندہ ادیبوں کو بلیک میل کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ ضمنی طور پر یہ لکھنا مناسب ہو کہ مجھے اللہ کے فضل سے ایم اے میں اول آنے پر دو طلائی تمغے، انجینئر نگ اسکول میں اول آنے پر ایک طلائی تمغہ مل چکا ہے۔ میری کتاب 'اقبال کے کلاسیکی نقوش' پر 'رائٹرز گلڈ ایوارڈ'، مقالہ 'اردو میں جج ناموں کی روایت' پر 'نقوش ایوارڈ'، 'اردو ادب کی تحریکیں' پر اکادمی ادبیات کا 'ہجرہ ایوارڈ' اور بہترین کالم نگاری پر 'اے پی این ایس ایوارڈ' بھی مل چکا ہے۔

ہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ ایک ایوارڈ مجھے محترم احمد ندیم قاسمی نے اپنی ایک سالگرہ کے انٹرویو میں اس جملے سے دیا تھا۔ "انور سدید کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب مجھے بہت دیکھی نظر آ رہے تھے میں نے ماحول کی تبدیلی کے لئے پوچھا، "ادیبوں کی گروپ بندی نے اردو زبان و ادب کی ترقی کو نقصان پہنچایا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق



ہیں؟ کوئی حوالہ دے سکیں تو بتائیے۔“

وہ کہنے لگے۔ ”میں اس خیال سے بالکل متفق نہیں ہوں کہ ادیبوں کی گروہ بندی سے ادب کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ ’میر کا رواں‘ اگر مخلص ہو تو وہ اپنے گروپ میں شامل لوگوں کی ادبی تربیت خالص ادب کے زاویوں سے کرتا ہے۔ اور وہ قندیل نور جو اس نے خود تھام رکھی ہے اگلی نسل کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے۔ اور یہ مثبت عمل ہے جسے جاری رہنا چاہیے۔ حوالے کے طور پر میں یہاں ۱۹۳۵ء کی دہائی کی ’ترقی پسند تحریک‘ کا ذکر کروں گا جس کی بنیادی جہت سیاسی تھی۔ لیکن سجاد ظہیر نے اس کا ادبی زاویہ بھی نکھارا اور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ پورے ہندوستان میں قائم کیا جس نے اردو کو متعدد زاویوں سے منور کیا۔ اس تحریک کے ثمرات اگرچہ شیریں نہیں لیکن اس کے عطیات سے انکار ممکن نہیں دوسری مثال ’حلقہ ارباب ذوق‘ کی ہے جس کی مرکزی شخصیت میراجی تھے۔ انہوں نے ادب کو مقصدیت کا غلام بنانے کے بجائے انسان کے داخل اور خارج کے اظہار کا وسیلہ بنایا، اپنے عہد کو متاثر کیا۔ آئندہ نسلوں کے لئے مثبت مثال قائم کی۔“

ڈاکٹر انور سدید نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”گروہ بندی کی قدیم ترین مثال شاید یونان کی اکادمی کو دی جاسکتی ہے جس کے رہنما سقراط اور افلاطون تھے۔ کسی اسکول کی ایک جماعت کو بھی گروپ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں استاد مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور طلباء کو ادب اور دیگر علوم کی تربیت دیتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی طور پر کسی گروپ کی ادبی رہنمائی پر منحصر ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو کس انداز میں خطاب کرتا ہے۔ اور ان کے ذہن و فکر کو کس سانچے میں ڈھالتا ہے۔“

پھر وہ لمحہ بھر کور کے اور کہنے لگے، ”سلطانہ مہر صاحبہ! شاید آپ کا سوال اس محدود گروپ بندی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی مبینہ اختلافات سے پیدا ہوا ہے یا معروف کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان دو ادبا نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ ان میں ذاتی نوعیت کا کوئی اختلاف نہیں۔ اگر اختلاف ادبی ہے تو ان میں گزشتہ پینتیس (۳۵) سال چار (۴) ماہ اور نو (۹) دن سے گفتگو کا رشتہ کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟ میرے خیال میں یہ اختلاف غیر ادبی اور خالصہ ذاتی نوعیت کا ہے اور یہ ہوس شہرت کا ’شاخسانہ‘ ہے۔ شاہد شیدائی صاحب ماہنامہ ’تخلیق‘ میں اس کی تاریخ لکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو شاعری کا مزاج، لکھی تو احمد ندیم قاسمی صاحب نے اس کے خلاف اپنے رسالے ’فنون‘ میں محاذ کھرا کر دیا۔ وزیر آغا صاحب نے رسالے ’اردو زبان‘ میں مدلل دفاع کیا تو قاسمی صاحب کو یہ بھی ناگوار گزرا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ میں خود اس میں ایک فریق کا معاون ہوں۔ اس لئے اس پر مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنے گروپ کے لوگوں کو شہرت، دولت، عورت اور حکومت پرستی کا عادی بنایا۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کو تو انسانی عطائیں نہیں کی۔ ان کے نیاز مندوں کا مقصد بھی ’فنون‘ میں اشاعت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پروگرام کا حصول، مشاعروں میں قاسمی صاحب کی سفارش سے شرکت اور حکومت کے انعام و اکرام تک



رسائی کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف وزیر آغا اپنے معاہدہ میں کی علمی اور ادبی تخلیقی صلاحیت میں اضافہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال میں خود ہوں۔

انجینئرنگ کے پیشے میں آنے کے بعد میں ادب کی عبادت سے غافل ہو گیا تھا۔ وزیر آغا صاحب مجھے اس عبادت گاہ میں واپس لائے۔ میرا ریاض کرانے میں میری معاونت کی۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔ اور میں متعدد مرتبہ اعتراف کر چکا ہوں کہ آغا صاحب سے ملاقات نہ ہوتی ہوتی تو میں محکمہ آب پاشی کے ایس ڈی یا ایک سی ڈی کی حیثیت ہی میں دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ قوم کو قاسمیوں کے برعکس وزیر آغاؤں کی زیادہ ضرورت ہے جو گروہ بندی کو مثبت جہت دے سکیں۔ اس مثبت گروہ بندی کی ایک روشن مثال محمد حسن عسکری ہے۔ ان کے سلسلہ ادب میں سچے ادیبوں کی ایک لمبی قطار موجود ہے۔ منفی گروہ بندی کی مثال احمد ندیم قاسمی ہیں۔ انہوں نے اپنی پچاسی (۸۵) برس کی عمر میں کم از کم چار نسلوں کو تباہ کیا۔ نو جوانوں کو شہرت، زر پرستی، افسروں کا خوشامدی اور شہوت پرست بنایا ہے۔ ادب کی سماجی تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہم نے اردو کے مستقبل کے تحفظ کے حوالے سے گفتگو کی۔ میں نے پوچھا، ”امریکہ اور یورپ چھوڑ کر پاک و ہند میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس کی بقا کے لئے آپ کیا تجویز پیش کریں گے؟“

ڈاکٹر انور سدید نے کہا: ”میں اس مفروضے سے متفق نہیں ہوں کہ پاک و ہند میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ ادب کے سالانہ جائزے لکھتے وقت میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ ادب کا مدار وسیع ہو رہا ہے۔ لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو رہی ہے۔ یہ وسطانی قسم (mediocrity) کا دور ہے۔ اس لئے ادب کے قطبی ستارے کم نظر آتے ہیں لیکن لمبی کہکشاں موجود ہے۔ شاعری میں متعدد نئی اصناف کے تجربے ہو رہے ہیں۔ غزل جیسی قدیم صنف سخن تازہ کاری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی جیسے راسخ نقاد نے پچھلے دنوں اردو افسانے میں داستان کا اسلوب رائج کیا جس کی اب تقلید ہو رہی ہے۔

اردو ادب کی ترویج اور فروغ میں پہلے اوراق، شب خون، سیپ، نیا دور، فنون، افکار، تخلیق، نیرنگ خیال، انشأ، صریر، ادب لطیف، شاعر اور سب رس جیسے رسائل خدمات انجام دے رہے تھے اب ’ذہن جدید‘ نیا سفر، پہچان، سخن ور، عبارت، آئندہ، مکالمہ، خیال، آفرینش، دنیا زاوہ، ارتقا، اقتدار، تشکیل، آثار، نیا سبق، قصے، روشنائی، سیارہ، سپوٹنگ، استعارہ اور ادب عالیہ کے علاوہ متعدد نئے رسائل اول درجے کا ادب پیش کر رہے ہیں۔ ادب کا مرکز نقل و مضافات میں منتقل ہو رہا ہے۔

اور یہ جو آپ نے اردو رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں پوچھا ہے تو میری رائے میں اردو کا موجودہ رسم الخط اردو تہذیب کا نمائندہ ہے۔ اس خط کی اپنی جمالیات ہے جو ہمارے فنون میں رچ بس گئی ہے۔ رسم الخط تبدیل کر دینے سے اس کا داخلی اور خارجی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ رسم الخط اردو



زبان اور ادب کی پہچان ہے۔ اس کی تبدیلی کا مطالبہ سیاسی نوعیت کا ہے جسے ادبی سطح پر قبول کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ اردو کا وقار اردو کے رسم الخط کے ساتھ قائم ہے۔“

میرا گلا سوال تھا، ”آپ اردو یا یورپی زبانوں کے کن ادیبوں سے متاثر رہے؟“

ان کا جواب تھا، ”میں نے اردو اور انگریزی کے ان گنت ادیبوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ میں نے اپنی کتاب ’کچھ وقت کتابوں کے ساتھ‘ میں، جو سو کتابوں کے تجزیاتی مطالعے کا مجموعہ ہے، اس کی تفصیل پیش کر دی ہے۔ میں بنیادی طور پر قاری ہوں۔ کتاب سے پہلا رشتہ چوتھی جماعت میں مولانا محمد حسین آزاد کی ’قصص الہند‘ سے قائم ہوا اور پھر کتاب کا مطالعہ وظیفہ حیات بن گیا۔ اس مطالعے کے موضوعات کو وسعت و زیر آغا نے دی۔ انگریزی ادب کی بیشتر کتابیں ’اردو ادب کی تحریکیں‘ پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے ہوئے زیر مطالعہ آئیں۔ ان سب کا ذکر اول الذکر کتاب کے تحت میں ’عرض سدید‘ میں کر چکا ہوں۔ چھپا ہوا ہر لفظ پڑھنا میری جبلت ہے۔“

میرا آخری سوال تھا، ”اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ بتائیے۔“

کچھ سوچ کر انہوں نے کہا، ”میری زندگی بڑی ہموار گزری ہے۔ میں نے زمین کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھ کر اور زمانے کی دھول میں اٹ کر، اطمینان کی زندگی بسر کی ہے۔ ادب نے مجھے طمانیت اور قناعت عطا کی۔ شاید ایک حالیہ واقعے کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔

۲۰ / اکتوبر ۲۰۰۰ء کو میں نے روزنامہ ’نوائے وقت‘ میں اپنا کالم ’ادب نامچہ‘ لکھا تو اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی بیگم کی علالت کی وجہ سے ’ادراق‘ کی اشاعت کے تعطل کا ذکر بھی کیا۔ اتفاق سے ایک روز پہلے ’آئندہ‘ کے مدیر محمود واجد اور ممتاز افسانہ نگار مرزا حامد بیگ میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ’فنون‘ کے گرے ہوئے معیار کا تذکرہ کیا تو اس کی ذمہ داری فنون کی ایگزیکٹو ایڈیٹر منصورہ احمد پر ڈال دی اور یہ بھی کہا کہ احمد ندیم قاسمی اب عمر رسیدہ ہو گئے ہیں۔ فنون کی ادبی ذمہ داری اس طرح انجام نہیں دے سکتے جس طرح ساٹھ کی دہائی میں دے رہے تھے۔ میں نے اس کا تذکرہ بھی اس کالم میں کر دیا۔ اس کالم پر قاسمی صاحب ناراض ہو گئے۔ اور ادارہ ’نوائے وقت‘ کو شکایت کا خط لکھا جس میں ارشاد فرمایا۔۔۔۔۔

خدا جانے یہ بدنام اور دشنام پیشہ ادیب (یعنی انور سدید) آپ کے نیک نام روزنامے میں کس طرح گھس آیا ہے۔۔۔ ادب سے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شخص (یعنی انور سدید) فیوڈل وزیر آغا صاحب کا زرخیز نمائندہ ہے۔۔۔ نوائے وقت میں گندگی پھیلا رہا ہے۔

انہوں نے آخر میں لکھا

میری صرف یہ التجا ہے کہ روزنامہ ’نوائے وقت‘ کو ایک بدنام شخص کی گھنیا ذہنیت سے آلودہ نہیں ہونا چاہیے۔



اس شکایت نامے کا سر سچا مفہوم یہ تھا کہ مجھے ملازمت سے فوراً نکال دیا جائے۔ ان ہی دنوں اشفاق احمد نے لکھا تھا۔۔۔ احمد ندیم قاسمی محبت کا سمندر ہیں۔ متذکرہ بالا مکتوب کی روشنی میں ایک اعلان میں نے بھی کیا کہ۔۔۔ احمد ندیم قاسمی ”واقعی“ محبت کا سمندر ہیں۔ متعدد لوگوں نے اسے میرا معافی نامہ شمار کیا اور خبر پھیل گئی کہ میں نے وزیر آغا سے تعلق توڑ ڈالا ہے اور قاسمی صاحب کے چرنوں میں بیٹھ گیا ہوں۔ میں نے اس قسم کی افواہوں کی تردید نہیں کی لیکن جب ۵ / اکتوبر ۲۰۰۲ء آیا تو میں نے متذکرہ بالا خط کی سال گرہ منائی اور لکھا۔۔۔

یہ مکتوب احمد ندیم قاسمی صاحب کی عظمت، شرافت اور انسان دوستی کا مظہر ہے۔ ایک سال بعد اس مکتوب کی سال گرہ منا رہا ہوں تو اپنے آپ کو دنیا کو ایک خوش قسمت انسان تصور کرتا ہوں جسے قاسمی صاحب جیسے کرم فرما اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائے ہیں اور میں ان کے عہد میں سانس لے رہا ہوں اور اپنی محنت اور دیانت کی اساس پر انعامات کا حق دار قرار دیا جاتا ہوں۔

واضح رہے کہ قاسمی صاحب کے ارشاد پر مجھے ملازمت سے برطرف نہیں کیا گیا بلکہ ایک سال میں دو مرتبہ میری تنخواہ میں اضافہ کیا گیا۔ اس کے برعکس قاسمی صاحب کے تربیت یافتہ عطا الحق قاسمی نوائے وقت کی نسبت کو، جو چالیس (۴۰) برس سے قائم تھی، توڑ کر اس کے مخالف ادارے میں چلے گئے۔ انہیں وہاں زیادہ تنخواہ پیش کی گئی تھی۔ اس واقعہ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یہ میری زندگی کا یادگار واقعہ ہے۔ اسی حوالے سے ایک دوہا اپنے قارئین کے نذر ہے۔

کیسا وہ بھی دور تھا، صبر تھا دل کو اس  
خالی گرچہ جیب تھی، قائم تھا وشواس  
سے نے سکھا دیا، سکھ سے ہو گئے دور  
دریا میرے پاس ہے، بڑھی ہے لیکن پیاس

Dr. Anwar Sadeed,

172 Sutlaj Block, Iqbal Town, Lahore, 54570, Pakistan



امید کے جوابوں کو مدد سے جس میں سونا  
میرہ مدد کی موسم جواب مدد میں گئے

محمد



سید انور سعید

علی گڑھ، ہندوستان

برطانیہ کے شاعر اور کالم نگار عقیل دانش نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا: ”تیکنیکی ترقی کے باوجود آج بھی یورپ اور خصوصاً برطانیہ کا لفظ سے اور کتاب سے رشتہ استوار ہے۔ کمپیوٹر کی حکومت کے باوجود برطانوی اب بھی کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ ایک جائزے یا سروے کے مطابق (۱) برطانیہ میں مطالعہ ایک سماجی سرگرمی ہے جو زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ برطانیہ کے بانوے فیصد (۹۲%) افراد اپنے دوستوں سے کتابوں کے بارے میں بات کرتے ہیں، ستانوے فیصد (۹۷%) افراد کتابوں کے مطالعے کے لئے دوسروں کا مشورہ قبول کر لیتے ہیں اور ستاسی فیصد (۸۷%) لوگ دوسروں کو خوشی سے کتاب مستعار دے دیتے ہیں۔ چھانوے فیصد (۹۶%) افراد تحفے میں کتابیں پیش کرتے ہیں اور پچانوے فیصد (۹۵%) افراد تحفے میں کتابیں لینا پسند کرتے ہیں۔ صرف انچاس فیصد (۴۹%) افراد کتاب شروع سے آخر تک پڑھتے ہیں۔ اسی ذوق مطالعے کی وجہ سے مغرب میں تصنیف و تالیف ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اگر کسی کی کوئی ا۔ یہ جائزہ انگریزی زبان کی کتابوں کے بارے میں ہے۔ کاش اردو کے شیدائی بھی کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت اپنائیں۔ سلطان مہر



ایک کتاب عوامی مقبولیت حاصل کر لے تو اس کی پوری زندگی معاشی اور اقتصادی جہل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اس جائزے کو سامنے رکھیں تو حسرت ہوتی ہے کہ اردو زبان کی مٹی اردو کے نام لیواؤں کے ہاتھوں پلید ہونے جا رہی ہے۔ سنخوڑ حصہ دوم سے لے کر سنخوڑ حصہ پنجم تک، یعنی ۱۹۹۵ء سے لے کر ۲۰۰۳ء تک، میرے سوال نامے کے ایک سوال کے جواب میں کہ ہمارے شاعر اور ادیب اردو کے مستقبل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، ستر فیصد (۷۰%) نے بڑی شد و مد سے کہا کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے اور تیس فیصد (۳۰%) نے ناامیدی ظاہر کی۔ امریکہ اور یورپ کی بات چھوڑیں، ہندوپاک میں بھی آنے والی نسل اردو زبان سے نابلد رہے گی۔ اور یہی بات درست نظر آتی ہے۔ اردو کے مستقبل سے پُر امید رہنے والوں نے اردو کی بقا کے لئے کئی مشورے بھی دیئے ہیں، جیسے جامعہ اردو علی گڑھ کے رجسٹرار جناب سید انور سعید کا مشورہ۔ لیکن پہلے میں آپ کو ان سے متعارف تو کرا دوں کہ سید انور سعید نے اپنا رشتہ اردو زبان سے نہایت مضبوطی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ وہ اپنا ایک ماہنامہ مجلہ ”جامعہ اردو علی گڑھ“ کے نام سے شائع کرتے ہیں جس میں اردو کے حوالے سے مضامین، کہانیاں، شعر و شاعری اور جامعہ اردو علی گڑھ کی سرگرمیاں رنگین تصاویر کے ساتھ اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں۔ سید انور سعید کا تخلص انور ہے۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کے دن علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور شعر کہنے کی وجہ بھی اہم ہے۔ انہوں نے بتایا: ”جب میں چھٹے یا ساتویں درجے کا طالب علم تھا، میرے والد کے انتقال کو (۲۲ / ستمبر ۱۹۶۲ء) دو سال گزر چکے تھے۔ میرا دل بچہ کر رہ گیا تھا۔ ان ہی دنوں میں اپنی بہن کے ہمراہ جے پور، راجستھان گیا ہوا تھا۔ وہاں میونسپل بورڈ کی جانب سے غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میرے بہنوئی مجھے بھی وہاں لیتے گئے۔ اس وقت مجھے نہ تو شعر و شاعری کا شعور تھا اور نہ ہی یہ پتا کہ غالب کیا چیز ہیں۔ اس مشاعرے کا آغاز غالب کی غزل۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

سے ہوا، جس کو نہایت دل کش لحن و صدا کی مالکہ ایک بے حد حسین دوشیزہ نے اس طرح پیش کیا تھا کہ سامعین مسحور ہو کر رہ گئے۔ اس غزل اور انداز پیش کش نے میرے دل پر بھی بہت اثر کیا۔ اس لڑکی کا نام غالباً نکبت تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ غزل سناتے وقت وہ تیز بخار میں تپ رہی تھی۔ مشاعرہ کافی رات گئے ختم ہوا، ہم سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ راستے میں تیز بارش شروع ہو گئی۔ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو پانی سے شرابور تھے۔

دوسرے دن ظہر کے وقت اچانک میری نگاہ ایک جنازے پر پڑی۔ لوگوں سے پوچھا کس کا جنازہ ہے؟ ایک شخص نے بتایا کہ یہ اسی لڑکی کا جنازہ ہے جس نے رات کو غالب کی صد سالہ برسی پر وہ غزل سنائی تھی۔ واپس لوٹتے وقت بخار کی حالت میں بارش میں بھیگ گئی اور نمونیہ کی تاب نہ لا کر صبح چار بجے نکبت دار فانی سے کوچ کر گئی۔ اس حادثے کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ میں قریب کی ایک پلیا پر بیٹھ



گیا۔ بچپن کا ذہن الجھ کر رہ گیا اور چٹنی چٹنی آنکھوں سے جنازے کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس دن اچانک میرے دل سے وہ پہلی غزل نکلی جس کا مطلع یہ تھا۔

چلتے چلتے تھک چکے ہیں کاروانِ زندگی      روئے روئے سوچکے ہیں مہرمانِ زندگی

تب سے اب تک سلسلہ کا ام جاری ہے۔ نثر تو میں نے بعد میں لکھی۔ اب نثر و نظم دونوں لکھ رہا ہوں۔ سید انور سعید نے نثر یا تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، ویسے ان کی پسندیدہ صنفِ سخن غزل ہے۔ ان کے کلام کے ”مجموعے“ ”اردو“ اور ”دہلی و صوبہ“ شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا زیرِ طبع ہے۔ اس کے علاوہ ایک شعری انتخاب ”مہلتے خیال“ اور نثر کی دو کتابیں ”وشتِ تمنا“ اور ”فالس ورجینیٹی“ بھی شائع ہو چکی ہیں۔ نیز جلد ہی دو ناولیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو اچا ہتی ہیں۔

اب ہم سلسلہ گفتگو اسی سوال سے جوڑتے ہیں جو اردو کے مستقبل سے متعلق ہے۔ انور کہتے ہیں: ”اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔ اردو کے مستقبل پر سوالیہ نشان قائم کرنے کے پیچھے دراصل ایک منظم سازش ہے۔ جس کا سب سے اہم پہلو اردو کے بھی خواہوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے عمل سے عاری کرنا ہے۔ ہمیں اس بات کو سمجھنا چاہیے۔ اس وقت سب سے اہم ضرورت اردو کی بقا اور تحفظ کی نہیں بلکہ اس کی ترویج و اشاعت کی ہے کیوں کہ اسے بقا اور تحفظ کا خطرہ کم اور محدود ہونے کا زیادہ ہے۔ ماضی قریب میں اردو سے عوام کی وابستگی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی سطحوں پر طلباء کی تعداد میں اضافہ اور رفتہ رفتہ ہندوستان کی ریاستوں، جیسے بہار، دہلی اور جموں و کشمیر وغیرہ میں اردو کے حقوق کا تسلیم کیا جانا اس کے مستقبل کی بتدریج بہتری کا اشارہ یہ ہے۔“

رسم الخط کے بارے میں میری رائے ہے کہ رسم الخط زبان کے تشخص کا بنیادی وسیلہ ہوتا ہے۔ یہ بات کسی اور زبان کے لئے صادق آتی ہو یا نہ آتی ہو اردو کے لئے صد فی صد درست ہے۔ اردو اور ہندی کے مابین فرق ہی رسم الخط اور لغت کا ہے۔ جملوں کی ساخت کے اعتبار سے دونوں زبانوں میں جزوی امتیاز ہے۔ اگر رسم الخط تبدیل کر دیا جائے تو اس کا وجود معدوم ہو جائے گا۔ اس لئے میں اس کے رسم الخط کو تبدیل کیئے جانے کا سخت مخالف ہوں۔ اردو کے رسم الخط کو تبدیل کیئے جانے کی وکالت کرنے والے دراصل اردو کو ختم کیئے جانے کی بات کرتے ہیں مگر شیرینی کے ساتھ۔“

سوال نمبر ۵ کے جواب میں انہوں نے کہا: ”آج... کیا معنی! اردو ادب کی جڑیں تو ہمیشہ ہی اس کی زمین میں پیوست رہی ہیں۔ ہمارے قدیم ادب کو گل و بلبل اور عاشق و معشوق کی داستانِ پارینہ اور اگلے ہوئے نوالے کہنے کی روش چھوڑ کر ہمیں اپنی فکر کا احتساب کرنا چاہیے کہ کہیں اسے سمجھنے میں ہم سے سہو تو نہیں ہوا۔“

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو      بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کے بغیر

بات یہ ہے کہ لفظوں پر پڑی نقاب کے پیچھے دیکھنے والی نظر ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لئے ہماری سہل پسند طبیعت نے اپنی بے بضاعتی پوشیدہ رکھنے کے لئے قابلِ قدر ادبی میراث کے وافر حصے کو قابلِ گردن



زونی قرار دے دیا۔ یہ ہماری ایسی غلطی ہے جس کا کفارہ ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔

پہلے بھی ہمارا ادب اپنی جڑوں سے پیوست اور اپنے عہد کا ترجمان تھا اور آج بھی ہے۔ آپ کسی معمولی سے معمولی ادیب و شاعر کی کوئی تخلیق لے لیجئے اور اس کا تجزیہ کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ فن پارہ اسی عہد کی تخلیق ہو سکتا تھا اور کسی اور میں نہیں۔ اور یہ دلیل ہے اس کے اپنے عہد سے وابستگی اور یوں ترجمانی کی۔“

سید انور سعید شاعر تو ہیں ہی لیکن نثر سے بھی ان کی وابستگی ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے ادیبوں کی گروہ بندی کے متعلق بھی رائے جاننا چاہی۔ انہوں نے کہا: ”ادیبوں کی گروپ بندی سے مراد اگر کسی نظریے سے وابستگی ہے تو ادیب کی محض کسی نظریے سے وابستگی کے سبب ادب کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور ’زبان‘ کو تو خیر پہنچ ہی نہیں سکتا۔ آپ کی نظر میں ترقی پسند مصنفین ہوں گے۔ ترقی پسندوں نے ادب میں واشگاف اظہار پر اصرار کر کے ادب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ خود خسارے میں رہے اور وہ یوں کہ ان کی اچھی بھلی نظمیں بسا اوقات صرف ’برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است‘ سے ناواقفیت کی بنا پر پروپیگنڈہ بن جاتیں۔ مجاز کی ’آوارہ‘ کا نصف آخر، فیض احمد فیض کی متعدد نظمیں اور جوش کا خاصا کلام بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سے نقصان ادب کو کم اور ان کی ذات کو زیادہ پہنچا۔ یہ تو ہوا ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ترقی پسندوں کی شدت اور بہ تو ارتقا ضے نے غیر ترقی پسند ادیبوں کو ماورائی دنیا سے مجتنب اور مادی دنیا سے زیادہ قریب ہونے پر مجبور کیا۔ مادہ پرستی اگرچہ کوئی اچھی چیز نہیں پھر بھی یہ سود و زیاں کا خوگر تو بنا دیتی ہے۔ ہم اپنے عمل کو نفع و نقصان کے پیمانے سے دیکھنے لگتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نظریے سے وابستگی ہمارے عمل کو اس نظریے کے مقصد سے دور نہیں بھٹکنے نہیں دیتی۔ مقصد کار آمد اور بے کار ہو سکتا ہے۔ گروہ سے وابستگی بحث کا موضوع نہیں بن سکتی۔ گروپ بندی صرف اس وقت نقصان دہ ہو جاتی ہے جب وہ ادعا یت کا شکار ہو۔ میں نظریے سے وابستگی کا حامی لیکن ادعا یت کا شدید مخالف ہوں۔“

سید انور سعید نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: ”حصول علم کے اعتبار سے میں انگریزی کا آدمی ہوں لیکن مجھے فخر ہے کہ میں اپنی فکر کو اردو جیسی شیریں، لطیف، دل پزیر اور روایت ساز زبان میں منظر عام پر لاتا ہوں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ آج مجھے جو شہرت اور مرتبہ ملا ہوا ہے اس میں اردو زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آج میں اردو کے مایہ ناز ادارے ’جامعہ اردو‘ علی گڑھ کا سربراہ ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں نے اردو کو اپنا کر کسی اعتبار سے خسارے کا سودا کیا ہے۔“

انہوں نے اردو زبان کی ترویج کے لئے چند مشورے بھی دیے۔

◆ اردو سے محبت کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کی ابتدائی تعلیم کا اہم گھر گھر اور محلے محلے کریں۔

◆ مدرسوں میں پرائمری سطح کی تعلیم لازماً اردو میڈیم کو اساس بنا کر دینے پر توجہ دی



جائے اور اس سے متعلق تمام مواد اردو میں مہیا کرائے کا انتظام کیا جائے۔

◆ پرائمری سطح پر اردو ذریعہ تعلیم سے علم حاصل کرنے کے بعد ثانوی اور اعلیٰ سطح پر

پہنچنے والے طلباء کو وہ تمام مواد اردو میں مہیا کرائے جائیں جن کی ان کو اس سطح پر ضرورت ہے۔ بعد ازاں  
کو روزی روٹی سے جوڑنے کے مواقع فراہم کرائے جائیں۔ اس کے لئے جو بھی حربہ استعمال کرنے  
کی ضرورت پڑے بلا دریغ کیا جائے خواہ وہ حکومت سے مطالبے کا ہو، عوامی تحریک کا ہو یا احتجاج کا۔

سید انور سعید اردو میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور انگریزی میں شیکسپیر

اور تھامس ہارڈی کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے انگریزی اور لسانیات میں

ایم اے کیا ہے۔ پی جی کالج اندور (ہندوستان) میں انگریزی کے لکچرار بھی رہے۔ صحافت کے

میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ بھی حاصل کیئے ہیں۔ جن

میں مجروح سلطان پوری ایوارڈ، عبدالحق ایوارڈ، گولڈ اسٹار ایوارڈ بذریعہ آئی بی سی کیسبرج اور انٹرنیشنل مین

آف ڈاکیمنٹیم بذریعہ اے بی آئی، یو ایس اے شامل ہیں۔

Mr. Saiyyid Anwar Saeeyd,

Jamia-e-Urdu, Aligargh, U P, 202002, India.

Tel. 0571- 700987/709662 Fax 0571- 708542



خوش مزاجی اور سحر میں روشن ہے جسے ہر مصلح میں پیدا جائے گا  
 شے، امیر المنار 30/1/03 (مختصر)

## اے امیر النساء (۱)

ملویشرم، تامل ناڈو، ہندوستان

مردوں نے بہت اور بڑے سفر نامے لکھے ہیں۔ ابن بطوطہ اور شیخ یوسف کمبل پوش سے لے کر دور حاضر کے قمر علی عباسی، مستنصر حسین تارڑ اور پھر انگلستان کے یعقوب انصاری سامنے آئے اور لوگوں کو دنیا جہاں کی سیر گھر بیٹھے کرا دی۔ میں جب بھی ان کے سفر نامے پڑھتی مجھے تشنگی ہی محسوس ہوتی۔ یہ نہیں کہ ان سفر ناموں میں دل چسپی کا مواد نہ تھا۔ نہیں جناب، ایسی بات نہیں، ان میں ساری رنگینیاں موجود تھیں۔ مجھے تشنگی یوں محسوس ہوئی کہ خواتین نے اب تک اس میدان میں قلم آزمائی کیوں نہ کی۔ صرف ایک نام بیگم اختر ریاض الدین کا سامنے آیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پروین عاطف کے سفر نامے سامنے آئے۔ نایلم بشیر نے بھی نیپال کا سفر نامہ لکھا۔ الی چودھری (مقیم لاس اینجلس) پیرس گئیں تو کلکتہ کے ماہنامہ ”انشا“ میں ان کی کٹھنی میٹھی تحریر میں سفر نامہ پڑھنے کے لئے ملا اور پتا چلا کہ بی بی بظاہر تو پیرس میں گھوم رہی تھیں مگر ان کا سراپا ہی نہیں ان کی روح بھی اپنے پنجاب کی مٹی سے گلے مل رہی تھی۔

ان سب خواتین کا تعلق پاکستان سے تھا۔ ایسے میں کلکتہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ

۱۔ محترمہ اے امیر النساء ایک پردہ نشین خاتون ہیں اور اپنا فوٹو چھپوانے سے پرہیز کرتی ہیں۔ ہم ان کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور ان کا فوٹو کتاب میں شامل نہیں کر رہے ہیں۔ سلطانہ مہر



”انشا“ میں ہندوستان کے ایک غیر اردو ملاقاتی، تامل ناڈو، سے ایک پردہ نشین خاتون اے امیر النساء کا سفر نامہ پڑھنے کے لئے ملا۔ اس سفر نامے میں عمان، بغداد، کوفہ، کربلا، بیروشلیم، قاہرہ، مکہ اور مدینہ کے سفر کا حال بڑی دل چسپ اور باسلیقہ تحریر کے ساتھ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ تب میں نے خاتون امیر النساء سے رابطہ کیا۔ امیر النساء سے گفتگو بھی اتنی ہی دل چسپ ہے جتنا ان کا سفر نامہ۔ لیکن اس کتاب میں ناروے کی افسانہ نگار محترمہ شاہدہ بیگم کا وہ خط بھی شامل ہے جو ”انشا“ میں شائع ہوا تھا اور جس میں ”یا جوج ماجوج“ کے حوالے سے دل چسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

خاتون اے امیر النساء نے اپنے سفر نامے میں اردن کے شہر عمان میں اس غار کا ذکر کیا ہے جہاں اصحاب کہف کی ہڈیاں ایک جالی میں بند ہیں۔ اصحاب کہف کا ذکر قرآن پاک کے پندرھویں پارے میں موجود ہے۔ اسی سلسلے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتی ہیں، ”حضرت ذوالقرنین سفر کرتے ہوئے ایک جگہ پہنچے جہاں دو پہاڑ ملتے ہیں اور جہاں سورج کے پیچھے کوئی آڑ نہیں، یعنی دنیا ختم ہوتی ہے۔ وہاں انہیں ایک قوم ملی جس نے ان سے یا جوج ماجوج کے مظالم کی شکایت کی۔ تب آپ نے کہا کہ سب مل کر تانبا پگھلاؤ اور خوب دھکاؤ۔ پھر آپ نے پانی کے نیچے سے تانبے کی بنیاد کھڑی کی اور پتھروں کے ساتھ بہت اونچی دیوار کھڑی کی اور وہ سورج بند کیا جہاں سے یا جوج ماجوج بستی میں آکر تباہی پھیلاتے تھے۔ آپ نے دونوں پہاڑوں کا شکاف بند کر دیا اور ہم سب جانتے ہیں کہ عین قیامت میں وہ شکاف کھل جائے گا اور یا جوج ماجوج نکل آئیں گے۔“

اس کے بعد شاہدہ بیگم لکھتی ہیں، ”میں سوچتی ہوں کہ کہیں وہ جگہ شمالی ناروے میں تو نہیں جہاں اتنی اونچی، بڑی بلکہ بالکل سیدھی دیوار ہے جسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کوئی پہاڑ اتنا سپاٹ اور سیدھا نہیں ہو سکتا۔ اُسے یہاں نارویجن زبان میں ٹرول و تچ (Troll vegg) یعنی شیطانی دیوار کہتے ہیں۔ جس کسی نے بھی ناروے کا سفر کیا ہے (یا یہاں کے بارے میں جانتا ہے) دکانوں میں یا تفریحی مقامات پر، جہاں نارویجن ثقافتی سامان ملتے ہیں، گئے ہیں وہاں اکثر جگہوں پر انہوں نے بونے جیسے لمبی لمبی ناک، چھوٹے قد کے عجیب الخلقہ مجسمے دیکھے ہوں گے۔ دوران ملازمت میں نے اپنے شیف (chef خانساں) سے پوچھا تو اُس نے بتایا تھا یہ قوم تھی جو ٹرول و تچ کے اُس پار رہتی تھی اور وہ یہاں آکر بڑی تباہی پھیلاتی تھی۔“

شاہدہ لکھتی ہیں، ”یہاں ان عجیب الخلقہ بونوں کی عجیب عجیب کہانیاں رائج ہیں، بچوں کی فلمیں ہیں۔ جس شیطانی دیوار کا میں نے تذکرہ کیا ہے کیا یہ وہی دیوار تو نہیں اور بونے یا جوج ماجوج تو نہیں تھے؟“

جی چاہتا ہے کہ ناروے جا کر اس دیوار اور یا جوج ماجوج کے بونے مجسمے دیکھے جائیں اور قیامت کا انتظار کیا جائے۔ مگر قیامت کا انتظار کیا کرنا۔ قیامت کے حالات تو آج بھی روز و شب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ قتل و غارت گری کہ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو چلا ہے، تھوڑی سی زمین کے



لئے اور تھوڑی سی طاقت کے بل پر۔

اے امیر النساء! اب سنگاپور، ملیشیا اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا سفر نامہ ”ایک ہی زمین ایک سا آسمان“ کے عنوان سے ”انشا“ میں لکھ رہی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا، ”امیر النساء اپنے بارے میں بتائیے اور اپنی تعلیم کے بارے میں بھی کیوں کہ تامل ناڈو میں رہنے والی ایک خاتون جب اردو میں لکھنے لگے تو قدرے حیرت ہوتی ہے۔“

امیر النساء مسکرائیں۔ ”حیرت تو مجھے بھی ہے سلطانہ صاحبہ۔ میری عمر چار سال کی تھی جب میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی محبت سے محروم ہو گئی۔ لیکن قدرت کا اصول ہے وہ لے لیتی ہے تو اس کا نعم البدل بھی عطا کرتی ہے۔ والدہ صاحبہ اور بھائی جان نے مجھ میں محرومی کے احساس کو پنپنے نہیں دیا۔ میں صوبہ تامل ناڈو کے شہر گڑیا تم میں ۱۳ / اپریل کو پیدا ہوئی۔ میرا گھر انا مذہبی اور متمول تھا اور ہے۔ پردے کی سخت پابندی میری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ میں طلائی قفس میں بند، چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی رہ گئی۔ گھر کی چار دیواری میں تامل، ہندی، انگریزی اور اردو کی تعلیم حاصل کی مگر عبور کسی زبان پر بھی حاصل نہ کر سکی۔ ہم کل ملا کر آٹھ بہن بھائی ہیں۔ والد کی وفات کے تیس سال بعد والدہ بھی رحلت کر گئیں۔ ہم سب بہن بھائی آسودہ حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں ہوں۔ میرے شریک حیات تاجر پیشہ ہیں اور ایک تعلیمی ادارے (جس میں نرسری سے انجینیئرنگ کالج تک شامل ہے) میں چیئر مین کے عہدے پر فائز ہیں۔“

امیر النساء بتا رہی تھیں کہ انہوں نے پندرہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا مگر امی کی اجازت نہ ہونے کے باعث اپنی تحریریں اشاعت کے لئے کہیں نہیں بھیجیں۔ پہلا افسانہ بعنوان ”مہمان“ شادی کے بعد تحریر کیا جو ”خواتین ڈائجسٹ“ میں شائع ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ دہلی کے جرائد ”بانو“، ”بیسویں صدی“ اور ”بتول“ میں کہانیاں شائع ہونے لگیں۔ بھوپال کے افسانہ نگار جناب ثناء راہی کی وساطت سے فیس اعجاز کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے ”انشا“ میں شائع ہونے کے بعد باذوق قارئین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچیں۔

امیر النساء نے شعر کبھی نہیں کہے۔ ۱۹۸۲ء میں ایک معاشرتی ناول ”غہرین“ لکھا۔ ۱۹۹۸ء میں ”بند کتاب“ کے عنوان سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اب تک تیس پینتیس افسانے لکھ چکی ہیں۔ کئی اصلاحی اور دینی مضامین اس کے علاوہ ہیں۔

امیر النساء کی رائے میں، ”ادیبوں کی گروہ بندی نے زبان اردو کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا نقصان خود ادیبوں کے حصے میں آیا۔ بتول فیس اعجاز صاحب، کوئے میوے کھارہے ہیں، یعنی علم و ادب کے نام پر جہالت پھیلانے والوں کو اعزاز و اکرام سے نوازا جا رہا ہے اور ہنرمندوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ حوصلہ شکن حالات یقیناً کھرے ادیبوں کے حوصلے پرست کر رہے ہیں۔ منفی اثرات اردو ادب کی ترقی میں یقیناً نقصان دہ ہی ثابت ہوں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادیب تنگ نظری کا



شکار ہو رہے ہیں۔ صبر آزمایا حالات میں بھی سنجیدہ ادیب پوری دیانت داری کے ساتھ بہترین ادب پیش کر رہے ہیں۔“

امیر النساء نے بتایا، ”اردو کی بقا کے لئے میں نے یہاں ادبی نشستوں میں چند تجاویز پیش کیں کہ ہمارے صوبے میں جتنے بھی ادارے اقلیتوں کے ہیں ان سب میں اردو کو لازمی قرار دیا جائے، کیوں کہ یہاں سرکاری مدارس میں علاقائی زبان کو مرکزیت حاصل ہے اور لوگ تاہل سیکھنے پر مجبور ہیں۔ یہاں اقلیتوں کے کارخانے بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اگر ان کارخانوں میں کارکنوں کو زبان اردو میں قابلیت کی بنیاد پر کام دیا جائے گا تو بلاشبہ اردو کو مرکزیت حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جب زبان روزی روٹی سے جڑ جاتی ہے تو باد صرصر کا جھونکا بھی اُسے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتا اور نہ ہی اُسے فنا کر سکتا ہے۔ مگر یہ اس وقت ممکن ہے جب سب متحد ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ زبان کی بقا کی جنگ کے لئے اپنا قیمتی وقت اور اپنی طاقت کا صحیح استعمال کریں۔“

رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں انہوں نے کہا، ”میں اس تبدیلی کے خلاف ہوں کیوں کہ زبان کی پہچان اس کا رسم الخط ہوتا ہے۔ رسم الخط میں تبدیلی نہ صرف اردو کو صفحہ قرطاس سے مٹا دے گی بلکہ اس کے تلفظ کو بھی ضرب لگائے گی۔ میرا سوال ہے کہ کیا ایک شخص کے قالب میں دوسرے شخص کی روح اپنی پہچان برقرار رکھ پائے گی؟ کوئی زبان اپنا رسم الخط کھو کر اپنی شناخت برقرار نہیں رکھ سکتی۔ ترکی میں اسلام دشمن عناصر نے مسلمانوں سے دشمنی کی بنیاد پر ترکی رسم الخط کو رومن میں تبدیل کر دیا نتیجے میں مذہب سے دوری پیدا ہو گئی اور ترکی زبان اپنے رسم الخط سے محروم ہو گئی اور عوام اپنی وراثت سے۔“

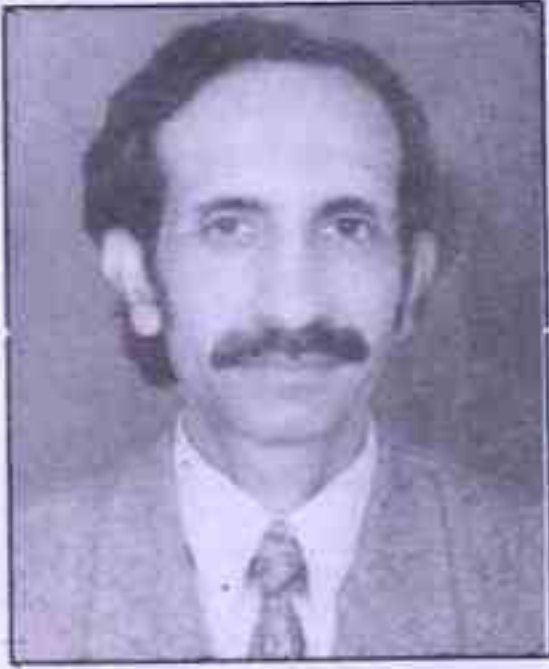
امیر النساء نے بتایا، ”یورپی زبانوں کے ادیبوں سے میرا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ اردو کے بہت سارے ادیبوں سے میں متاثر ہوں جس میں پڑوسی ملک بھی شامل ہے۔“

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا، ”میری زندگی کے یادگار واقعات اتنے ہیں کہ ہر نیا واقعہ میرے حافظے سے پرانے واقعہ کو کیلنڈر کے اوراق کی طرح تبدیل کر دیتا ہے۔ اس سال میری زندگی کا یادگار واقعہ یہ ہے کہ میں نے حرم مکہ میں عید منائی۔ عید کا دل نشین منظر جو میری آنکھوں میں سمایا ہے اُس کی مثال نہ شادی سے پہلے میں نے اپنے میکے میں پائی اور نہ شادی کے بعد سسرال میں اور نہ اب اپنے علیحدہ مکان میں۔ شاعر نے کہا ہے کہ عید تو اپنوں کی دید سے ہوتی ہے۔ مگر میں تو اپنوں سے بہت دور تھی پھر بھی عید کا خوب صورت منظر میری آنکھوں میں ٹھہر سا گیا ہے۔ عربوں کا عید منانے کا انداز اس قدر بھرپور تھا کہ اسی اجتماعی خوشی میں اپنوں اور بے گانوں کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ خوشیوں کے پھول سب کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے، میں نے عید کے دن ایک ایک لمحے سے خوشیاں کشید کیں۔“

Mrs. A. Amir-us-nisa,

13 Jameelabad, 2<sup>nd</sup> St., Malvishram, Tamilnadu, 632509, India





جنہیں ہم دیکھ کر جیتے مکتے ناہر  
وہ لوگ آنکھوں سے ادجمل ہو گئے ہیں  
باصر سلطان کاظمی

## باصر سلطان کاظمی

چیئر، برطانیہ

اپنا اپنا مزاج ہے۔ اپنا اپنا نقطہ نظر بھی ہے۔

میں جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال کی خود نوشت سوانح حیات ”اپنا گریباں چاک“ پڑھ رہی تھی جس میں انہوں نے اپنے اس کرب کا اظہار کیا ہے کہ علامہ اقبال کے صاحب زادے ہونے کے ناطے ان کی شخصیت و فن کو وہ پزیرائی نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ ایک گھنے برگد کے زیر سایہ پھلنے پھولنے والے درخت کا گلہ بھی بجا لیکن کیا اقبال کا بیٹا ہونا بذات خود ایک بڑی سعادت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کفران نعمت چند دانشوروں کی ایک ادا ہو۔

ناصر کاظمی کے خلیفہ رشید، باصر سلطان کاظمی کی سوچ کا انداز مختلف ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ وہ اپنے بزرگوار والد کے پائے کے شاعر نہیں ہیں مگر انہوں نے ناصر کاظمی بننے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی۔ چاہتے تو غالباً ناصر کاظمی سے اگلی منزل کو بھی چھو لیتے۔ مگر انہوں نے والد بزرگوار کے ان آدھے ادھورے کاموں کو مکمل کیا جسے موت نے ناصر کاظمی کو مکمل کرنے کی مہلت نہیں دی۔ ناصر مرحوم نے کلاسیکی شعرا کے انتخاب کا کام کیا تھا، جیسے میر تقی میر، ولی دکنی، نظیر اکبر آبادی وغیرہ اور ”ایوان سخن“ کے عنوان سے ایک ریڈیو فیچر میں اردو کے چار عظیم شعرا، میر، نظیر، غالب اور اقبال پر اردو شاعری



کی روایت کے حوالے سے گفتگو کی تھی۔ وہ اور اس قسم کے دیگر ادھورے کاموں کو باصر سلطان کاظمی نے پایہ تکمیل کو پہنچایا اور انہیں کتابی شکل دی۔ انہوں نے اپنے والد استاد سے آگے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کی، ایسی کوئی خواہش بھی دل میں نہیں پالی۔

باصر خود بہت اچھے ڈرامہ نویس ہیں۔ وہ ڈرامے کے نقاد کے طور پر ۱۹۸۱ء میں متعارف ہوئے جب انہوں نے اپنے والد ناصر کاظمی مرحوم کے منظوم ڈرامے ”سُر کی چھایا“ کا سیر حاصل تعارف لکھا۔ پھر ناصر مرحوم کے شعری مجموعے ”تیسری بارش“ کی تیسری طباعت پر پیش لفظ تحریر کر کے اپنی نثر کا جادو دکھایا۔ ”بساط“ باصر کا لکھا ہوا ایک طویل نثری ڈرامہ ہے جو پہلی بار مارچ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ اس ڈرامے کے ساتھ باصر کی ایک کہانی ”اجنبی“ بھی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں باصر نے اتنے سحر انگیز انداز میں بتایا ہے کہ ان سے وہ ڈرامہ کیسے تخلیق ہوا۔ ”بساط“ کی افتتاحی تقریب اپریل ۱۹۸۷ء کو لاہور میں منعقد ہوئی جس کی صدارت محترم احمد ندیم قاسمی نے کی اور اظہار خیال کرنے والوں میں اشفاق احمد، حنیف رامے، ڈاکٹر عبادت بریلوی، انتظار حسین، ڈاکٹر آغا جمیل اور اصغر ندیم سید وغیرہ تھے۔

باصر سلطان کاظمی کے شعری مجموعے کا نام ”موج خیال“ ہے، جسے انہوں نے اپنے والد جناب ناصر کاظمی کے نام منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے۔ تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی، اور صفحے کے آخر پر باصر کی تصویر کے نیچے یہ سچا شعر تحریر ہے۔

آشنا در دے ہونا تھا کسی طور ہمیں تو نہ ملتا تو کسی اور سے پھڑے ہوتے

ناصر کاظمی شطرنج کے رسیا تھے۔ باصر کو بھی شطرنج سے پیار ہے۔ چنانچہ انہوں نے ”بساط“ کا انگریزی ترجمہ بعنوان ”داجیس بورڈ (The Chess Board)“ کیا جسے یارک شائر کے ادارے ”پینائن ہنز (Pennine Pens)“ نے شائع کیا ہے۔

باصر سلطان کاظمی ۴/ اگست ۱۹۴۲ء کے دن لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۷۴ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم اے کیا۔ ۱۹۹۰ء میں برٹش کونسل کے اسکالرشپ پر برطانیہ آئے۔ یہاں ۱۹۹۱ء میں یونیورسٹی آف مانچسٹر سے تعلیمات میں ماسٹرز ڈگری (M. Ed) حاصل کی، جس کے حوالے سے ان کا مقالہ ”داجیکیشن آف ویمن ان پاکستان (The Education of Women in Pakistan)“ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ باصر بی بی سی گریٹر مانچسٹر ایشین ریڈیو کے پروگراموں میں بھی معاونت کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں انہیں ”نارتھ ویسٹ پلے رائٹس ورک شاپ، انگلینڈ (North West Playwrights Workshop, England)“ کی طرف سے ”رائٹر ان ریزیڈنس (Writer in Residence)“ کا ایوارڈ ملا۔ ان کے ڈرامے گرین روم کونٹیکٹ کلوژیم تھیٹر آکلیڈ گان مانچسٹر (Greenroom Contact Cloesium Theatre Octagon, Manchester) اور یونٹی تھیٹر لیورپول (Unity Theatre, Liverpool) میں اسٹیج ہوئے تھے۔



باصر نے ۱۹۹۵ء میں انگریزی زبان کی تدریس کے حوالے سے پوسٹ گریجویشن کورس کیا۔  
انہوں نے ۲۰۰۰ء میں ایم فل یونیورسٹی آف مانچسٹر سے کیا۔

باصر سلطان کاظمی سے اردو رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے بڑے کارآمد نکات سامنے آئے۔ انہوں نے کہا: ”جب اردو کے رسم الخط تبدیل کرنے کی بات ہوتی ہے تو رومن انگریزی استعمال کرنے کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ دلیل سمجھ میں آتی ہے۔ بے شمار لوگ ہیں جو اردو سمجھتے ہیں، بول لیتے ہیں لیکن پڑھ لکھ نہیں سکتے کیوں کہ وہ اردو رسم الخط سے واقف نہیں۔ چنانچہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ انگریزی حروف استعمال کرتے ہوئے اپنی باتیں، اپنے خیالات تحریر میں لے آئیں۔ میرے خیال میں ایسا کرنے سے کسی حد تک گزارا تو ہو سکتا ہے لیکن یہ مسئلہ کا حل نہیں۔

پاکستان میں لاکھوں لوگ پنجابی بولتے ہیں لیکن لکھنے کے لئے اردو رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت سے لفظ صحیح طور پر نہیں لکھ پاتے۔ مثلاً بڑے بھائی کے لئے پنجابی میں وہ ’بھا‘ اور ’بھا‘ کے درمیان کی آواز ہے۔ اسی طرح پانی کا ’ن‘ اور گھٹیا کا ’گھ‘ جس طرح کہے جاتے ہیں اردو میں نہیں لکھے جاسکتے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ پاکستان میں پنجابی ادب زیادہ فروغ نہیں پاسکا، اگرچہ متعدد کتابیں لکھی گئیں، رسالے اور اخبار نکالے گئے، پنجابی میں ایم اے بھی کرایا جاتا ہے لیکن پاکستانی پنجابی ادب کو عالمی سطح پر پزیرائی نہیں ملی کیوں کہ دنیا پنجابی کو مشرقی پنجاب میں استعمال ہونے والے رسم الخط کے حوالے سے ہی جانتی ہے۔

اردو انگریزی حروف کی مدد سے لکھنے کی کوشش کریں تو اسی صورت حال کا سامنا کرنے پڑے گا۔ مثلاً ’پہنچا‘ اور ’مہنگا‘ کیسے لکھیں گے؟ اب دو ایک انتہائی سادہ جملوں کی مثال لیجئے۔ ’خالد نے کھیر کھائی‘۔ پہلی بات تو یہ کہ ’نے‘ کیسے لکھیں گے ’ne‘ یا ’nay‘ اور ’کھائی‘ کیسے ’khai‘ یا ’khaai‘۔ چلیئے یہ مسئلہ طے کر لیا اور جملہ Khalid ne/nay kheer khai/khaai لیکن پڑھنے والا پہلی بار اسے یوں بھی پڑھ سکتا ہے۔ ’کھالد نے خیر خائی‘۔ اسی طرح ’غریب کا گھر ghareeb ka ghar‘، ’گھر کا غر‘ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

میں نے جو مثالیں دی ہیں چونکہ ان میں عام اور مانوس استعمال کے الفاظ شامل ہیں لہذا پڑھنے والا بہت جلد صحیح تلفظ پر پہنچ جائے گا لیکن جب نامانوس اور مشکل الفاظ کی باری آئے گی تو معاملہ پیچیدہ ہو جائے گا (۱)۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ رومن انگریزی میں اردو لکھنے والے بعد میں اپنا لکھا خود نہیں پڑھ سکتے۔

چنانچہ اردو کورومن رسم الخط میں لکھنے سے پہلے تو اسٹینڈرڈائزیشن (Standardisation) مسلمہ معیار قائم کرنا پڑے گا، یعنی ایک متفقہ رسم الخط ایجاد کرنا پڑے گا جسے سیکھنے کے لئے مشق کی ضرورت ہوگی اور سکھانے کے لئے تربیت حاصل کرنا ہوگی۔ اگر تمام مراحل سے گزر کے کامیاب بھی ہو جائیں تو ایک اور مسئلہ ہوگا۔ لاکھوں لوگ جو انگریزی نہیں جانتے اور نہ جانیں گے، اردو کا رسم الخط ا۔ شاید اسی وجہ سے خود انگریز کبھی رومن حروف میں قسطنطنیہ نہ لکھ پائے اور اس کو کانسٹنٹنوپول کر دیا یا دہلی کو دہلی نہ لکھ پائے اور اس کو دہلی کر دیا۔ سلطانہ مہر



استعمال کریں گے۔ چنانچہ اردو بیک وقت دو طریقوں سے لکھی جائے گی جس سے زبان کی شناخت کا مسئلہ پیدا ہوگا۔

ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گا۔ مجھے اپنے انگریزی میں شاعری کرنے والے دوستوں کے ہمراہ ایسی محفلوں میں اپنی غزلیں، نظمیں اور ان کے تراجم سنانے کا موقع ملتا ہے جہاں اردو سمجھنے والے نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ دوست اور سامعین کہتے ہیں کہ انہیں لکھی ہوئی اردو دیکھنا بہت پسند ہے کیوں کہ یہ خطاطی کے عمدہ نمونوں کی طرح ان کی جمالیاتی حس کو اپیل (appeal) منعطف کرتی ہے۔ میں اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط کے مستقبل کے بارے میں بھی نہایت پُر امید ہوں۔ بقول میرؔ:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہر گز تا حشر جہاں میں مراد یوان رہے گا  
باصر سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ وہ دورِ حاضر میں تخلیق ہونے والے ادب سے مطمئن ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ”اچھا ادب اپنے عہد کے ساتھ ساتھ ہر عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ ہومر سے لے کر آج تک کے شعرا کی شاعری ہم عصری وجود (simultaneous existence) رکھتی ہے۔ ناصر کاظمی میر اور لور کا کو اپنا ہم عصر کہتے تھے۔

میں نے زندگی کے کسی حصے میں بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں اردو ادب کو اپنا کر شہرت کے معاملے میں یا مالی طور پر خسارے میں رہا ہوں۔ الٹا مجھے تو ہمیشہ یہ خلش ستاتی رہی کہ میں اردو میں جتنا کام کرنا چاہتا تھا اس سے بہت کم کر پایا۔ میں نے ادب کو کبھی شہرت یا مالی فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ تخلیق کی لگن مجھ سے ایسے کام کراتی رہی جو میرے خیر خواہوں کے خیال میں مجھے نقصان پہنچاتے رہے یا کم از کم فائدے سے محروم کرتے رہے۔ میں اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جن کا کہنا تھا کہ تمام عمر ان کی یہ ہی کوشش رہی کہ فرصت کمائیں اور اس فرصت میں شعر کہیں۔ ان ہی کا ایک شعر ہے۔

ایسا گاہک کون ہے جس نے سکھ دے کر دکھ مول لیا  
میر نے کہا تھا۔

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے  
باصر نے کہا ”ڈرتے ڈرتے“ ایک شعر اپنا بھی سنا دوں۔  
چنانچہ دیدہ و دانستہ رستہ و شوار کسی مقام پہ ہم نے کیا نہیں افسوس  
ویسے نو جوانی میں یہ شعر بھی کہا تھا۔

خواہشیں ہر گھڑی یہ کہتی ہیں کام کچھ کام کا کیا ہوتا  
اور کام کے کام نہ کرنے کے نتیجے میں ایسی صورت حال پیش آئی۔  
پھر اس کے در پہ نظر آ رہے ہو باصر آج تمہارا کام ابھی تک ہوا نہیں افسوس



باصر کہہ رہے تھے۔ ”مجھے اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں نے خاص طور پر متاثر کیا وہ ہیں۔۔۔ میر تقی میر۔ نظیر اکبر آبادی، غالب، اقبال، محمد حسین آزاد، انتظار حسین، ناصر کاظمی، عبداللہ حسین، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، شفیق الرحمن اور شیخ صلاح الدین (صلاح الدین عادل)۔“

اسی شام برمنگھم کی انجمن ترقی اردو اور دیگر انجمنوں کے جانب سے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کی صدارت میں یوم آزادی پاکستان کے حوالے سے برمنگھم قونصل خانے میں تقریب مشاعرہ تھی۔ باصر کاظمی کو مدعو کیا گیا تھا۔ باصر جب پڑھنے آئے تو کہنے لگے۔ ”پہلے میں استاد محترم کی ایک غزل پیش کرتا ہوں اور اس کا ترجمہ بعنوان ’وہاٹ ہے پنڈ تو دیم‘ (What Happened to Them)۔ باصر کے بقول یہ ان کی آخری غزل تھی۔ یہ چند شعر میں نے نوٹ کر لیے تھے۔

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے      وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے  
یہ کون لوگ ہیں میرے ادھر ادھر      وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے  
اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی      ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

باصر نے اپنے استاد محترم اور پیارے ابو کے کلام کا ترجمہ ”جزیشتر آف غزل (Generations of Ghazal)“ کے عنوان سے کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر ناصر کاظمی کی تصویر اوپر ہے اور ان کے سائے تلے باصر کی تصویر ہے۔ جب باصر کو کلام سنانے کے لئے بلایا گیا تو ان کا تعارف ناصر کاظمی کے صاحب زادے کے حوالے سے کیا گیا تو باصر کا چہرہ مسرت کی ایک ایسی چمک سے معمور تھا جسے دیکھا جاسکتا ہے، محسوس کیا جاسکتا ہے، مگر رقم کرنا آسان نہیں۔ وہ دن، وہ لمحے باصر کی زندگی کے یادگار ہوں یا نہ ہوں میرے ضرور تھے۔ دل میں یہ خواہش جاگی۔ ”کاش میں بھی کسی شاعر، کسی ادیب کی بیٹی ہوتی۔“

باصر کا تعارف ختم کرنے سے پہلے میں آپ کو ان کی وہ غزل سنا دوں جو انہوں نے اپنے استاد محترم کی غزل کے بعد پیش کی تھی۔

دل خراب یہ خواہش تری عجب ہے کہ وہ      ستم بھی کم نہ کرے اور مہرباں بھی رہے  
ابھی زمین پہ جنت نہیں بنی یارو      جہاں کے قصے سناتے ہو ہم وہاں بھی رہے  
رہا ہمیشہ ہی سامان مختصر اپنا      مسافروں کی طرح ہم رہے جہاں بھی رہے  
اور مدھم لہجے، دھیمے مزاج اور محبت کے پیکر اس شاعر کا مقطع اور حاصل غزل شعر بھی ملاحظہ ہو۔  
جو ساتھ چلنے کے بھی مستحق نہ تھے باصر      کچھ ایسے لوگ یہاں میر کا رواں بھی رہے

Mr. Basir Sultan Kazmi,

22 Avonlea Road, Sale, Cheshire, M33 4HZ, UK.

نوٹ: برونیٹ یونیورسٹی پریس، لندن کے تعاون سے پاولا (Paula) نے اقلیتی یوروپین ادیبوں کی تحریروں کا ترجمہ پانچ زبانوں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور ہسپانوی میں کیا ہے دیگر ادیبوں کی ہمراہ اس ترجمے میں باصر کاظمی کی ایک غزل بھی شامل ہے جو کتاب کے ساتھ ہی ڈی میں بھی شامل ہوگی۔ سلطان مہر





اچھا انسان دہے جو نہ طمع کرنے نہ منع کرنے

بانوند سیہ 5/11/2004

بانوند سیہ

لاہور، پاکستان

مجھے جب بانو آپا کا خط ملا تو اتنی مسرت ہوئی کہ الفاظ میں اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس لحاظ سے بھی آئیڈیل (ideal) ہیں کہ ادب کی دنیا میں ان کا نام سرفہرست ہونے کے ساتھ ساتھ، ایک گھریلو خاتون، ایک مثالی بیوی اور ماں کی حیثیت سے بھی وہ نشان منزل ہیں۔

بحیثیت ادیب ان کی تعریف محترمہ قرۃ العین حیدر نے بھی کی۔ جب میں نے گفتنی حصہ اول کے سوال نامہ میں یہ سوال رکھا تھا کہ بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ادیب کون ہوں گے؟ اس کے جواب میں اسی (۸۰) فی صد ادیبوں نے قرۃ العین حیدر کا نام لیا تھا جب کہ خود محترمہ قرۃ العین حیدر نے جن ادیبوں کا نام لیا تھا ان میں جناب اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے نام شامل تھے (گفتنی، حصہ اول ص ۳۳۲)۔

بانو قدسیہ ایک آئیڈیل بیوی ہیں، یہ میں ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو ان کے بہت قریب ہیں اور انہیں جانتے ہیں۔ جانے پہچانے ادیب ممتاز مفتی اب ہم میں نہیں مگر وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اکثر میرے آس پاس ہوتے ہیں۔ جب وہ اسلام آباد میں تھے ان سے میری کئی ملاقاتیں بھی رہیں۔ انہوں نے کہا تھا..... ”بانو قدسیہ مجازی خدا پرست ہے۔ اگر اللہ میاں اپنے علاوہ کسی اور کے



آگے سجدہ جائز قرار دیتے تو بانو اشفاق کو پوجنا شروع کر دیتی۔“

میں نے بانو آپا کو اسلام آباد میں دیکھا۔ وہ اشفاق صاحب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان کے پیچھے رہتی ہیں۔

وہ اپنے تعارف میں لکھتی ہیں۔ ”۱۹۵۶ء میں جناب اشفاق احمد سے میری شادی ہوئی۔ اللہ کے فضل سے تین بیٹے، ڈاکٹر انیق احمد خان، انیس احمد خان اور اشیر احمد خان کی والدہ ہوں اور پوتے پوتیوں کے لئے اللہ کی شکر گزار ہوں۔ گھریلو زندگی بسر کرتی ہوں اور زیادہ واقعات سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتی ہوں۔“

ان کی اس بات پر مجھے عقیل احمد روبی کے لکھے ہوئے مضمون ”آل ان ون (All in One)“ سے یہ جملہ یاد آ گئے۔ ”اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نام اور کام جتنا پھیلا ہوا ہے وہ اتنے ہی سمٹ گئے ہیں۔ شخصیت کے دروازوں پر دبیز پردے تان لیے ہیں تاکہ اندر کوئی نہ جھانک سکے۔ بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ اشفاق احمد سائنس کی طرف اس لئے راغب ہیں کہ وہ ایٹم کے اختصار کا بھید جان لیں تاکہ ایٹم کی منہ زور طاقت اپنے اندر حلول کر سکیں۔ ان کے ساتھ بانو قدسیہ ہیں، خان صاحب کے پیچھے پیچھے، کیوں کہ قدم بڑھا کر برابر چلنا یا آگے بڑھنا ان کا دین دھرم ہی نہیں۔ وہ تو اشفاق احمد کی داسی ہیں، باورچن ہیں۔ پہلے انہیں کھلاتی ہیں پھر خود کھاتی ہیں۔ پہلے انہیں سلاتی ہیں پھر خود سوتی ہیں۔ کیوں کہ داسی اور باورچن کا یہ ہی دھرم ہے اور اسی میں مکتی ہے۔“

پتا نہیں، مگر ممکن ہے کہ بانو آپا کا اشفاق احمد صاحب سے اس دنیا کے ملن سے بھی پہلے ملن ہو چکا ہو۔ آسمانوں پر، اور جب اللہ تعالیٰ ارواح تشکیل کر رہے تھے تو یہ دونوں روحیں، دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے، اللہ میاں سے گزارش کر چکی ہوں کہ انہیں دنیا میں بھی ایک دوسرے کا ہم دم بنا کر بھیجا جائے۔ کیوں کہ بانو قدسیہ نے بھی اسی مٹی سے جنم لیا ہے جہاں کی مٹی سے اشفاق احمد جنمے ہیں۔ فرق صرف برسوں کا ہے۔ بانو آپا ۲۸ / نومبر ۱۹۲۸ء کو فیروز پور، مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں اور اشفاق احمد صاحب ان سے کوئی تین برس پہلے ۲۲ / اگست ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ دھرم سالہ (کا گڑھ) سے دسویں جماعت پاس کی۔ ہجرت کر کے لاہور آئیں اور کینرڈ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے اردو میں ایم اے کیا۔ اپنے کالج کے میگزین کے لئے کہانیاں اور مضامین لکھے۔

بانو آپا کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا جب انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ”واماندگی شوق“ ادب لطیف لاہور میں بھیجا اور وہ شائع ہوا۔ ادبی نام بانو قدسیہ اسی زمانے میں اختیار کیا۔ ان کا گھریلو نام ”بانو“ ہے۔

ان کے والد زمیندار تھے اور زراعت میں بی اے کیا تھا۔ بانو کے لڑکپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ کا تعلق درس و تدریس سے تھا۔ چنانچہ بانو قدسیہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل تھیں۔



انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ ”شاوی کے بعد اشفاق احمد سے انہوں نے اپنی کہانیوں کے سلسلے میں کبھی بحث و مباحثہ نہیں کیا۔ نہ ہی ان کی تحریروں اور اسلوب سے متاثر ہونے کی کوشش کی۔ ہم دونوں بغیر ایک دوسرے کے عمل دخل کے اپنا اپنا کام کرتے رہے۔ تخلیق کے معنی ہیں اولاد کو جنم دینا۔ اور اس میں دوسرے کا عمل دخل دینا درست نہیں مانا جاتا سوائے خدا کی ذات کے۔ بعینہ یہی رویہ ایک فن کار کا اپنے فن پارے کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔“

تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی بات اشفاق احمد صاحب نے بھی اپنے انٹرویو میں کہی جب حامد یزدانی صاحب نے ”بیاض لاہور“ کے لئے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”آپ بانو آپا سے زیادہ متاثر ہیں یا بانو آپا سے؟“

اشفاق احمد صاحب نے کہا۔۔۔۔۔ ”میں سمجھتا ہوں جہاں تک تھاٹ (thought) کا معاملہ ہے وہاں تو میں ان سے متاثر ہوں کیوں کہ ان کی سوچ بڑی فریش (fresh) ہے اور اس کا انداز بہت منفرد ہوتا ہے۔ بانو کو پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا لیکن صبح کے ناشتے کے ٹیبل (table) پر جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ کوئی ’القائے ربانی‘، کوئی نئی چیز...؟ اور وہ کہتی ہیں، ہاں رات ایک خیال آیا لیئے لیئے۔ پھر وہ خیال بیان کرتی ہیں تو وہ بہت مختلف اور عجیب ہوتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ بس یوں تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ اس طرح سے کچھ خیالات یاد رہ جاتے ہیں کچھ بھول جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ خیال ہماری تحریروں میں بھی آئیں۔ میں کل ہی کہہ رہا تھا کہ ان خیالات کو بھی تحریر میں آ جانا چاہیئے۔ جوتے پڑتے ہیں تو جوتے پڑیں۔ مثلاً کل میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے اسلام میں تصویر رکھنا منع ہے۔ کہنے لگیں، ہاں! بالکل منع ہے۔ میں نے پوچھا، یہ جو پاسپورٹ پر لگتی ہے تصویر...؟ کہنے لگیں یہ تصویر نہیں آپ کی شناخت کے دستخط ہیں اس کو آپ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ تصویریں جو ہماری زندگی کا احاطہ کیئے ہوئے ہیں انہوں نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ تصویریں جو پلے بولے (Playboy) پنٹ ہاؤس (Penthouse) اور کاسمو پولیٹن (Cosmopolitan) میں اور وہاں سے لے کر ہمارے پاکیزہ پاکستانی اخباروں میں شائع ہوتی ہیں، یہ تصویریں آپ کا علم نہیں بڑھاتیں۔ وہ کسی اور غدو کی انگلیخت کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ اور تصویر سے یہ سب نامناسب باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔

اور جہاں تک متاثر ہونے والی بات ہے، یہ ہمارے ہاں شروع سے رہا کہ نہ میں نے کبھی ان کی کوئی چیز دیکھی نہ اس پر تنقید کی اور نہ اس نے میری کسی تخلیق پر۔ اپنی اپنی راہیں الگ الگ ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ وقت کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آپ کی آپا بھی ایک اور رخ اختیار کر رہی ہیں... روحانیت کا۔ ویسے بھی وہ خالص دین کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں، تم ڈرو اس وقت سے جب لوگ تمہیں دو رجید کا ڈپٹی نذیر احمد کہنے لگیں گے۔ کیوں کہ پچھلے دنوں میں اس کی ایک کہانی پڑھ رہا تھا جس میں ایک ملا ہے۔ گھر کے لڑکے کنیڈا سے آئے ہوئے ماڈرن ہیں۔ شور مچاتے ہیں لڑائیاں



کرتے ہیں۔ ماں کو بھی چلانا پڑتا ہے۔ بڑا راؤڈی (rowdy) ہے۔ شیشے توڑ دیئے، موٹر گھر سے لئے گئے تو ان کا باورچی مولوی صاحب سے تعویذ لا کر پانی میں گھول کر ان لڑکوں کو پلانے کا مشورہ دیتا ہے۔ ماں کہتی ہے یہ سب فضول ہے۔ مجھے سائیکاٹرسٹ (psychiatrist) سے ملنا چاہیئے۔ وہ ملتی ہے مگر کچھ نہیں ہوتا۔ آخر باورچی کہتا ہے کہ حرج ہی کیا ہے میں مولوی صاحب کو لے آتا ہوں۔ مولوی صاحب آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ آپ تو شریف آدمی لگتے ہیں مولوی صاحب تو عام طور پر ایسے ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کہتے ہیں، جی کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں کچھ برے بھی۔ باتوں کے درمیان ایک فقرہ آیا جس پر میں چونکا۔ کہتی ہیں..... مولوی صاحب! آپ لوگ اپنی سوچ میں بہت کڑھوتے ہیں اور اپنی آواز میں بہت کڑھوتے ہیں۔ آپ اونچا بولتے ہیں اور چیختے چلاتے ہیں۔ تو مولوی صاحب کہنے لگے، بیگم صاحبہ جس گھر کے بچے نافرمان ہو جائیں وہاں ماؤں کی آوازیں اونچی ہو جاتی ہیں۔ واہ واہ کیا فقرہ تھا۔ ایسا فقرہ تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا، بانو قدسیہ! آپ کے ارادے کیا ہیں؟ تو اب ان کا رخ ایک اور طرف ہے اور وہ کہتی ہیں لکھا ہی یہ ہی جانا چاہیئے تھا جو میں اب لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

بانو قدسیہ اب ایک ناول لکھ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس ناول کا نام اپنے گوشہ عافیت کے نام پر ”داستان سرائے“ رکھیں۔ انہوں نے غالباً یہ ناول بہت پہلے شروع کیا تھا۔ اور خدا کرے وہ ان دنوں جو بھی لکھ رہی ہیں اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی رہیں۔

بانو قدسیہ نے بہت لکھا ہے، افسانے بھی اور ٹیلی ویژن سیریز اور ڈرامے بھی۔ ان کے افسانوں کے معروف مجموعے ہیں۔

(۱) بازگشت (۲) امرنیل (۳) کچھ اور نہیں (۴) آدھی بات  
(۵) دانت کا دست (۶) ناقابل ذکر سنگ میل لاہور نے ان سب کو یک جا کر کے ”توجہ کی طالب“ کے نام سے شائع کیا ہے۔

”ایک دن“، ”موم کی گلیاں“، ”شہر بے مثال“ اور ”راج گدھ“ ان کے ناول ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایک منفرد فکر کی بنیاد رکھی۔ مشرقی تہذیب کی دلدادہ اس افسانہ نگار نے نہ صرف اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے نئی نسل کو اپنی منزل کے راستوں سے آگاہ کیا بلکہ ان کے نئی وی سیریلوں اور ڈراموں نے بھی پاکستان کے عوام میں زندگی برتنے کا شعور وسیلہ پیدا کیا۔ ان ڈراموں نے پاکستان کی سرحد پار ہندوستان میں بھی اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑے اور اردو زبان کے خوب صورت الفاظ کو ہندی بولنے والوں میں مقبول کیا۔

ان کے ڈراموں میں ”تمثیل“، ”حوالے نام“ اور ”خلیج“ میں ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا احاطہ کیا گیا تھا۔

۱۹۸۶ء میں انہیں بہترین ڈرامہ نگار کا گریجویٹ ایوارڈ ملا۔ اور اسی سال انہیں بہترین



ڈرامہ نویس کی کا "تاج ایوارڈ" بھی ملا۔ پھر ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء میں بھی انہیں بہترین ڈرامے نویس کا گریجویٹ ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر محترمہ بانو قدسیہ کو ۱۹۸۳ء میں حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز برائے ادب "ستارہ امتیاز" عطا کیا گیا۔

راج گدھ ایک بے مثال فکری ناول ہے۔ جس نے بانو قدسیہ کے ادبی قد میں اضافہ کیا ہے۔ "گفتنی حصہ دوم" کے سوالوں کا جواب انہوں نے بہت توجہ سے دیئے۔ بانو قدسیہ کے پاس پریشانیوں اور ڈپریشن (depression) کو دور کرنے کا ایک نہایت آزمودہ فارمولا (formula) ہے۔ وہ کہتی ہیں، جب جسمانی پریشانیاں لاحق ہوں تو روحانی سکون کا حصول از بس ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کا شافی علاج خدا کی عبادت اور اس کی طرف کئی رجوع کرنے سے سکون ملتا ہے۔ اور اگر روحانی طور پر ایتری محسوس ہو تو جسمانی طور پر نوذ کو مصروف کر لیا جائے۔ علی الصبح اٹھ کر خدا کی نعمتوں کا غور سے مطالعہ کریں۔ کھلی ہوا میں سانس لیں، چہل قدمی کریں اور دیکھیں کتنا سکون ملتا ہے۔

میرا سوال نامہ بانو آپا کے سامنے تھا۔ وہ بتا رہی تھیں..... "مجھے شاعری سے بس اتنی دل چسپی رہی کہ کبھی کبھی انگریزی نظمیں لکھتی ہوں۔ دراصل میں نے ادبی زندگی کا آغاز انگریزی کے ایک مضمون 'اور مین (Our Men)' سے شروع کیا۔ تھا۔ پھر اس ارادے سے انگریزی میں لکھنا بند کر دیا کہ کسی غیر زبان میں لکھ کر کبھی بھی کوئی اس زبان کا ثقہ دیب نہیں بن سکتا۔ اور یقین کیجئے کہ میرا خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے نہ کبھی شہرت اور نہ ہی مالی منفعت کے پیش نظر لکھنے کی سعی کی۔ آج جب ٹیلی ویژن کی وجہ سے ہر طرف ہنس برس رہا ہے میرا قلم خشک ہے۔ جب پتھر توڑ کر چشمہ بہہ نکلے گا تو ضرور لکھوں گی۔ آپ دعا کریں کہ ناول مکمل ہو جائے۔"

ادیبوں کی گروہ بندی کے حوالے سے کہہ رہی تھیں..... "دونوں صورتیں ہیں۔ مسابقت، پر خاش کی فضا میں کبھی ادب کو آگے بڑھاتا ہے کبھی پیچھے ہٹاتا ہے۔ پارٹی کی سیاست میں کچھ ترقی بھی ہوتی ہے اور کچھ اکھاڑ پچھاڑ بھی ضروری ہے لیکن یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور زندگی کے تضادات میں ایک ہے۔ انسان تضاد کے بغیر تبدیلی لانے کا اہل ہی نہیں ہے۔"

اردو کی بقا کے تعلق سے انہوں نے کہا..... "اردو لشکری زبان ہے۔ اس میں جذب کرنے کی اتنی صلاحیت ہے کہ جس خطے میں جاتی ہے وہاں کا رنگ اپنا لیتی ہے۔ ہندوستان میں غزل کو ترجیح ملی۔ پنجاب کا افسانہ بڑھا۔ امریکہ اور یورپ میں نئے علمی و ادبی راستے کھلیں گے۔ اس کا مستقبل تاریک ضرور نظر آتا ہے لیکن رہے گا نہیں۔ اقلیت ہمیشہ اکثریت میں ضم ہونے کے لئے اپنا لباس اور زبان چھوڑا کرتی ہے لیکن یہ عمل ہمیشہ نہیں رہا۔ ایک وقت آتا ہے جب اقلیت اپنی جداگانہ شناخت کے لئے اپنا لباس، زبان اور مذہب ایک بار شد و مد سے اپنا لیتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے جس طرح چینی پانی میں ملاتے رہنے سے ایک وقت آتا ہے جب پانی مزید چینی اٹھا نہیں سکتی اور سچو ریڈ سلوشن (saturated solution) سوکھنے لگتا ہے اور ایک بار پھر کرسٹلز (crystals) میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح دیر تک اقلیت کوشش کرتی ہے کہ وہ



اکثریت میں ضم ہو جائے پھر اپنی شناخت کے پیش نظر وہ علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ میری ایک ہی تجویز ہے کہ زیادہ تجویزیں نہ کریں۔ کام وہی بہتر نکل آتے ہیں جن کے پیچھے سرکاری، نیم سرکاری یا عوامی تجویزیں نہیں ہوتیں۔ زبان، رسم و رواج اور لباس اپنے راستے بناتے ہیں، اپنی ہی منطق رکھتے ہیں۔ اس کے جیالے بھی اور طرح کے ہوتے ہیں اور آورد سے زیادہ آمد پر تکیہ کرتے ہیں۔

اب رہی رسم الخط کی بات تو ترکی نے یورپ میں ضم ہونے کی کوشش میں کئی اجتہاد کیے، رسم الخط بدلا، مذہب کی رنگت تبدیل کی۔ رومی ٹوپی چھوڑی۔ کمال اتاترک نے اپنی شناخت بھی چھوڑ دی اور آج تک ترکی یورپ کا حصہ بھی نہ بن سکا۔ یہاں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر بہت ہی تبدیلی پر اصرار ہے تو 'سنخ' کو اختیار کرنا چاہیے کہ اس سے اسلامی دنیا میں شناخت بڑھتی ہے۔ لیکن رومن رسم الخط کا جو بھی جواز ہو اس سے اردو کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

انہوں نے کہا۔۔۔۔۔ "میں ڈرامے میں شیکسپیر اور یو جین اونیل، فلکشن میں دوستوفسکی اور ڈرل اور شاعری میں رابرٹ فراسٹ سے متاثر ہوتی ہوں۔ ویسے کم پڑھتی ہوں اس لئے زیادہ لوگوں سے متاثر ہونے کا موقع نہیں ملا۔ ایک طرح سے شکر کا مقام ہے کہ بڑی جلد اثر قبول کر لیتی ہوں اور نئے لکھنے والوں کو بھی خوش آمدید کہتی ہوں اور زبان سے سبحان اللہ نکھتا رہتا ہے۔ اردو میں سید امتیاز علی تاج کی 'انارکلی'، قدرت اللہ شہاب کا 'شہاب نامہ'، مفتی جی 'لبیک' اور اشفاق احمد اور راجند سنگھ بیدی کے افسانوں نے متاثر کیا ہے۔ شاعری میں غالب کو پڑھتی ہوں اور ہمیشہ سدا بہار پاتی ہوں۔ اردو کی فہرست بہت لمبی ہے۔ فقط پہاڑ کی چوٹیاں بیان کی ہیں۔ سلسلہ طویل ہے۔"

آخری سوال کے جواب میں کہنے لگیں۔۔۔۔۔ "زندگی بذات خود ایک واقعہ ہے اس میں حادثات کو کیا گنوائیں کہ جو میرے لئے اہم ہو سکتا ہے ممکن ہے قارئین کی دل چسپی کا باعث نہ ہو۔"

Mrs. Bano Qudsiya,

Dastansera, 121-C, Model Town, Lahore, 54700, Pakistan

خوردسال

گرم کپڑوں کا ٹرنک بند کرنے کے بعد اس کا جی سردیوں کی آمد سے دوسار گیا۔ ابھی پچھلے سال بچوں کے کپڑوں پر پوری تنخواہ قضا کر گئی تھی۔ اب کے جو دھوپ لگوانے کو سویٹریں کوٹ نکالے تو بڑے سے بڑا کپڑا چھوٹے سے چھوٹے بچے پر اس طرح کس کر چڑھا کہ بے چارہ انگریزی کا "ٹی" بن کر کھڑا ہو گیا۔



سردی تھی کہ تر بال اور حے برآمدے میں کھڑی مسلسل گھنٹی بجائے جا رہی تھی۔ ادھر دل میں جو نائیلون زری کی قمیص بنانے کی حسرت تھی اسے ایک بار پھر سوتی زنبیل میں رکھ کر عابدہ نے اپنا پلاسٹک کا تھیلا اٹھایا۔ پرانے سیاہ برقعے کو اوڑھا اور پرس میں دس روپے ڈال کر پھڑپھڑا کر چلی۔

لوگوں کے پاس تو جانے کس زمانے کے دینار سرخ پڑے تھے کہ سردی کے باوجود بازاروں میں ٹاپتے پھر رہے تھے۔ بوائی پھٹے پیروں کو پائینچوں میں چھپا کر چلتی وہ سنگھاڑے والے کے پاس جا کر رک گئی۔ سیاہ جلد چیر کر بادام کی سی رنگت والی گریاں اسے بڑی بدعت پر اکسارہی تھیں۔

بالکل ایسی ہی رست تھی۔ اسی طرح کا دن تھا۔ عین عین اسی طرح کا سنگھاڑے والا ان لوگوں کے گھر کی طرف آیا کرتا تھا لیکن وہ تو بہت دنوں کی بات تھی۔ وہ پرانے پرس کو سینے سے لگا کر آگے گلی کی طرف مڑ گئی۔

تاکہ چندی اینٹوں کا راستہ گھس چس کر کسی بڑھے پھونس کی ہڈیوں جیسا چمکیلا ہو رہا تھا۔ سامنے چھوٹی چھوٹی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دکانوں کے سامنے نائیلون کے رنگین دوپٹے دائیں بائیں پھٹوں پر سوتی و گرم شالیں اور سفید مارکین کے بچھاؤ پر مختلف ملوں کی فلائین اور پرنٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ دکان دار اور عورتیں اپنے اپنے داؤ پر ایک دوسرے سے نہٹ رہے تھے۔ جو عورتیں دکانوں سے بچ کر نکل جاتیں انہیں دکان دار بہت دیر تک باجی باجی، آپاجی کی صدا سنیں دے دے کر بلاتے رہتے۔

ریشمی کپڑوں کے رنگ اور ان کی چمک مدار کی بڑھیا بن کر بار بار عابدہ کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ نہ جانے ان ریشمی کپڑوں کو خریدنے والیاں کیسے مواخذہ بری خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ دکان دار بے دریغ تھانوں کے تھان گزروں میں بانٹے جا رہے تھے۔ اور پھر اچھی بھلی تنخواہ کے باوجود ہر مہینے نائیلون زری کی قمیص خوابوں کی انگلی پر ٹنگی رہ جاتی۔

منے کے پانچا مموں کے لئے فلائین بہت ضروری تھی لیکن دکان دار کی شہ زوری سے کہیں بھی

بھاؤ نہ بنا۔

فلائین کا ارادہ چھوڑ کر وہ جمیلہ کا سوئیٹر بننے کی نیت سے جنرل مرچنٹوں کی دکانوں پر زکے لگی۔ بچوں کی بیلیٹیں، لمبے لمبے پاؤڈر کے دبے، روغنی کاغذوں میں لپیٹے ہوئے صابن، چابی سے چلنے والے کھلونے، بیٹری میں ڈالنے والے سیل، کوئی ایک ضرورت تو تھی نہیں۔ روپے روپے کے دودھ بنیا میں بیچنے والا بغیر لاؤڈ اسپیکر کے سارے بازار کو اپنے مال کی طرف بلا رہا تھا گویا روز آخر سے ڈر رہا ہو۔

کچھ دکانوں پر تو اس نے اُون اس لئے نہیں خریدی کہ وہاں اتنے زیادہ رنگ نہیں تھے۔ کچھ دکانیں اس لئے پسند نہ آئیں کہ دکان دار کا لہجہ تیزابی تھا۔ کچھ جگہ پھر فلائین کی طرح بھاؤ نہ بنا۔ ایک دو دکان دار اسے دیر تک آپاجی آپاجی کہہ کر بلاتے رہے لیکن اُن کی دکان پر وہ اس لئے نہ ٹھہری کہ جو خود بنا رہے ہیں ان کا سودا ضرور ناقص ہوگا۔



ایک جگہ اون بھی سستا تھا، رنگ بھی اتنا قابل مہندی سا بڑا ہی پیارا مل گیا۔ دکان دار بھی خویش برادری کا لگتا تھا۔ پر اسی وقت عابدہ کو خیال آیا کہ جمیلہ کی تو اگلے مہینے سا لگ رہا ہے۔ اس کے جو تھنے اکٹھے ہوں گے ان میں شاید کچھ سویر بھی ہوں۔ منے کے پاؤں میں جوتی نہیں۔ اوپر سے ساس صاحبہ صبح سارے کمروں میں ناٹ پھرہا دیتی ہیں۔ فرش باسی مولیٰ کی طرح ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ منے کا جوتا پہلے اور باقی چیزیں بہت بعد میں۔ وہ نہ ہو کہ خسر میاں انھیں اور ادھوڑی کی کھیتی جوتی بچے کے پاؤں میں لا ڈالیں۔ پھر ساری سردیاں مروت میں وہ جوتیاں چٹختا پھرے اور پاؤں میں گٹھے پڑ جائیں۔

پلاسٹک کے نیم شفاف تھیلوں میں رنگ برنگ چمپلیاں کئی کھٹیل دکان دار فٹ پاتھ پر سجائے بیٹھے تھے۔ خالہ سیکہ نہ یہیں سے کاسنی رنگ کی چمپلی لے کر گئی ہوگی..... قیمت تو سوا تین روپے نکلی لیکن خالہ اس روز ویل کم والے تکیے پر کس ٹھسے کے ساتھ چمپلوں سمیت بیٹھ گئی تھیں جیسے فجر لینے آئی ہو، کچھ نیا خرید لیں، فوراً دکانی چال عابدہ کے ہاں پہنچتی تھیں۔ پھر ساس سے لے کر چھوٹی نند اور جمیلہ تک کو بار بار اپنی خرید دکھاتیں۔ ادھر عابدہ کے منہ پر چھپکا پڑ جاتا۔ بے چاری مسکراتی حالت میں ٹک ٹک دیکھے جاتی۔

منے کی کالی اور سفید می سی پومپی ڈھائی روپے میں آتی تھی۔ لیکن پھر ایک بار عابدہ نے سوچا کہ ایک بار دس روپے کا نوٹ بھنوا لیا تو بچوں کے کچے بن کر اسی بازار کی ٹالیوں میں کھو جائیں گا۔ اسی خیال سے نہ تو پھر اس نے گنڈیریاں خریدیں نہ مونگ پھلی، نہ چلغوزے والی کی طرف دیکھا اور نہ ہی بچوں کے لئے چپس کے پیکٹ لیے۔

جب بھی پچھلے دنوں ساس صاحبہ کبھی پکاتیں، بساندھی سی خوش بو سے عابدہ کو ابکائی آنے لگتی۔ کتنے دنوں سے خیال تھا کہ اس بار قصوری میتھی کے دو چار پیکٹ ضرور لے آئے گی۔ شور بے کے لئے پیالے درکار تھے لیکن دو چار دکانوں پر گجراتی مٹی کے کٹورے اور رکابیاں بنکار کے دیکھ لینے کے بعد اس نے فیصلہ کیا یہ دس روپے بچوں کی امانت ہیں۔ ان میں سے نہ تو قصوری میتھی آئے گی نہ پیالے رکابیاں۔ اور پھر دس روپے تڑوا لیے تو بس گئے۔

گھر پہنچی تو سارے بچے ململ کے کرتے پہنے آنکھ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ساس صاحبہ ساگ کی ہنڈیا چڑھائے پیڑھی میں سمائی پرانی سویرا ڈھیز رہی تھیں۔ اس نے بچے کے ہاتھ چلا کر سارے بچوں کو گرتے بدلتے کا آرڈر دیا۔

منا بے چارہ ننگے پاؤں دھاگے میں ایک تن تنہا بٹن پر دے سیڑھیوں پر بگیر پا جا مے کے بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر ”اماں، اماں“ کہہ کر لپکا اور پلاسٹک کے لفافے سے لپٹ گیا۔

ساس نے ٹھیس لگی آواز میں پوچھا

”بڑی دیر لگا دی بازار میں۔۔۔ فلا لیں لے آئیں؟“

”دام ٹھیک نہیں تھے اماں۔ اے ہے برقعہ تو اتار لینے دو“۔ اس نے ٹک سے منے کا سر

ٹھونک کر کہا۔



پھر کیا لائی ہو خرید کر؟ انہوں نے خالی پلاسٹک کے تھیلے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
 ”کچھ بھی نہیں۔ قیمتیں بہت چڑھ گئی ہیں چیزوں کی۔“  
 جمیلہ نے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔

”اماں! چار آنے دے دو۔ لہسن اور مرچیں لانی ہیں۔“  
 ”میرے پاس کھلا نہیں۔ دس کانوٹ ہے۔“

”اچھا۔ دس ہی دے دو۔“ ساس نے کہا۔ ”میں خود ہی جاتی ہوں۔ لہسن اور مرچیں بھی لے  
 آؤں گی اور اپنے برقعے کی سلائی بھی دے آؤں گی۔ مہینے بھر سے درزی کے پاس پڑا ہے۔“  
 عابدہ نے پرس کھول کر اندر دیکھا۔

دس روپے کانوٹ باہیں اور ٹانگیں سمیٹے پلاسٹک کے ٹھنڈے پرس میں لیٹا تھا۔ اپنے اسی  
 خور و سال بچے کو جس طرح وہ بازار کی ساری آفتوں سے بچا کر گھر لائی تھی، اب اس کی آنکھوں کے  
 سامنے اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا تھا۔

عابدہ کو اس طرح ایک دم پریشان ہوتے دیکھ کر ساس نے پوچھا۔

کیا ہوا بہو؟

عابدہ نے مسکرا کر کہا..... ”سارا دن پھرنے کی وجہ سے چکر سا آ گیا ہے خالہ!“

اور پھر.....

اس نے وہ خور و سال لاشہ خاموشی سے خالہ کے حوالے کر دیا۔



## فیصلوں کے بعد ایک اور فیصلہ

اسے پکا ڈلی تک ہی تو جانا تھا۔

لیکن ہمیر اسمتھ سے پکا ڈلی کا راستہ اسے زندگی سے بھی لمبا لگ رہا تھا۔ آج وہ ٹھیک تیس (۳۰) سال اور بتیس (۲۳) دن کی ہو گئی تھی اور یہ کچھ ایسی لمبی عمر بھی نہیں لیکن فائزہ کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کئی صدیوں سے زندہ ہے اور جیتی ہی چلی جا رہی ہے اور اس کے فوسل (fossile) بھی تیار ہو چکے ہیں۔ لیکن زندگی ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔

ہمیر اسمتھ بھی عجیب نام ہے، لوہار کا ہتھوڑا... اگر پاکستان میں کسی گاؤں کا نام لوہار کا ہتھوڑا ہوتا تو اس نام پر کتنی شرم آتی پھر اسٹیشن سے آگے شپرزڈ بش تھا۔ چرواہے کی جھاڑی۔ یہ نام اردو میں بدلتے ہی کتنے چپ (cheap)، اجڈ اور غیر مہذب لگنے لگتے۔ سب سے پہلے لندن میں مستقل طور پر منتقل ہونے پر اسے اپنے لباس اور زبان پر ہی اعتراض ہوا تھا۔ یہ کیا دوناتوں والی ”ستھن“ اور چاکوں والی قمیص اوپر سے دوپٹے کا دم چھلا بھی، آدمی کتنا ان کلچرڈ (uncultured) لگتا ہے ایسے لباس میں... اوپر سے سلام علیکم سلام علیکم.....!

انگریزی میں جوں ہی گڈ مارننگ (Good-morning) کہیں دل بٹاش سا ہو جاتا ہے۔ مسکراہٹ چہرے پر آ جاتی ہے۔ فائزہ سوچنے لگی۔ اچھا ہی کیا عرب والوں نے کہ اب ٹیلی ویژن پر سلام علیکم کے بجائے صبح الخیر کہتے ہیں۔ سلام علیکم کہتے تو کتنا اولڈ فیشن (old fashion) لگتے۔

فائزہ ہمیر اسمتھ سب دے (subway) میں داخل ہوئی اور جینز (jeans) کی جیب میں سے دس دس پینی (penny) کے چار سکے نکال کر اس نے سلاٹ مشین (slot-machine) میں ڈالے۔ مشین کے پیٹ میں سے زرد رنگ کی چالیس (۴۰) پینی کی ٹکٹ برآمد ہوئی۔ سب دے کے کھلے اسٹیشن پر پکا ڈلی جانے والی ٹرین کے انتظار میں ایک بچہ بیٹھ کر تلی ہوئی موگ پھلی کھانے لگی۔ یہ موگ پھلی کا پیکٹ وہ اپنے ابا جی کی دکان سے لائی تھی۔

گلاب اسٹور ارلز کورٹ پر واقع تھا اور فائزہ دس سال سے مشین کی طرح اس اسٹور میں کام کر رہی تھی۔ اس دکان کے تین سیکشن (section) تھے۔ ایک طرف کھانے پینے کی اشیائیں جن میں طرح طرح کے بسکٹ، جام (Jam)، چیز (Cheese)، دودھ کے ڈبے، مکھن، ڈبل روٹی، پیتا بریڈ (pitta bread) اور ایسی ہی ان گنت چیزیں تھیں۔ اس سیکشن میں ایسے کھلے کیلو نیٹر بھی تھے جن میں ٹخنڈی مرغیاں اور برف آلود سبزیاں تھیں۔ اس سیکشن کی دوسری جانب تازہ سبزیوں، اور پھلوں کے ریک (rack) تھے ان کے پیچھے سارا دن اس کا بھائی آری سے حلال گوشت کا ٹارہتا تھا۔ اس کاٹ پیٹ میں ایک روز اس کے بائیں انگوٹھے میں بڑی ضرب آگئی تھی اور اس انگوٹھے کو قریبی ڈاکٹر سے پٹی



بند ہوا کر پھر گوشت کاٹنے آکھڑا ہوا تھا۔

اس علاقے میں چوں کہ عرب لوگ زیادہ رہتے تھے اس لئے سارا دن عرب خواتین اور مرد اس کی دکان سے حلال گوشت، پکا پکایا کھانا، ٹیک اوے (take-away) کھانا، ہندوستانی اچار، پاکستانی چاول اور پھل خریدنے آتے رہتے۔ ان دونوں سیکشنوں کے علاوہ دکان کے پچھلے حصے میں شراب بکتی تھی۔۔۔ اور دکان کے اس گیت سیکشن میں اس کا باپ بیٹھتا تھا۔ جس روز باپ کسی وجہ سے نہ آسکتا تھا تو فائزہ اس حصے پر بیٹھتی اور اس کی چھوٹی بہن کاؤنٹر (counter) پر بیٹھ کر حساب کتاب کرتی۔ ورنہ عام دنوں میں گلے کی پاسبانی اور کیلکولیٹر (calculator) پر حساب کتاب کرنا، پینی کو پینی سے جوڑ کر، پونڈوں کی گدیاں جوڑ جوڑ کر خوش ہونا اس نے بہت جلد سیکھ لیا تھا۔

وہ پچھلے بارہ سال سے اس دکان کی دیکھ ریکھ میں شامل تھی۔ پاکستان میں اس نے ایف اے کیا تھا اور لندن آکر وہ پڑھائی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن لندن میں صرف اولیول کرنے کے بعد اسے باپ کی دکان نے لپیٹ لیا۔ اس دکان کوہ پاکستان میں بزنس (business) کہتے تھے۔

پہلے جب ابا گلاب دین نے محنت مزدوری کر کے اور اماں نے ٹورسٹ (tourist) بسوں میں کنڈکٹر (conductor) لگ کر پیسے جمع کیے تو ان کے تینوں بچے اس جدوجہد میں شامل نہ تھے۔ پھر ابا نے ارلز کورٹ میں بڑے ٹھکانے کی جگہ سے دایموں ایک پاکستانی سے خرید لی تھی جو پاکستان جا رہا تھا۔ اب ابا اور اماں مل کر دکان چلانے لگے۔ اور اماں رات کے وقت فائزہ اور حمیرا کی مدد کے ساتھ بھنا گوشت، کالمی چنے آلو مسر سمو سے وغیرہ بناتی اور پھر انہیں ٹیک اوے ڈبوں میں بند کرتی اور اوپر اسٹیپ (stamp) کے ساتھ قیمت لکھی جاتی۔ پھر سارے دن اماں گاہکوں سے نہرتی رہتی اور باپ مال ڈھوتا۔ لیکن جلد ہی کام بڑھنے لگا۔ اور باپ نے ایک رات فیصلہ کیا کہ پاکستان سے زیادہ محبت کرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ سامنے والی دکان میں بہت سا ہندوستانی سامان بکتا تھا اور اس کی بکری خوب خوب ہوتی تھی۔ ابا گلاب دین نے بھی ہندوستانی اچار، بڑیاں، پاپڑ رکھنے شروع کر دیے اور دیکھتے دیکھتے ہی ان کی دکان چل نکلی۔

عربوں کے لئے حلال گوشت تو رکھا ہی جاتا تھا۔ ابا نے محسوس کیا کہ اس گوشت کو کاٹنے اور پیکٹ بنانے کا لیبر (labour) بہت مہنگا ہے۔ اس طرح زیر کوکالچ سے اٹھایا اور اس سیکشن کا مالک بنا دیا۔ لیکن ابھی تک فائزہ کاؤنٹر پر بیٹھنے نہیں آئی تھی۔ وہ اور حمیرا گھر پر رہ کر دکان کے لئے ہلکا پھلکا پکایا کرتی تھیں۔ لیکن جلد ہی ابا نے محسوس کیا کہ عربوں کے علاوہ انگریز، اور امریکن اور مقامی اطالوی لیبر بھی اس کی دکان پر آتے ہیں اور حلال گوشت کے علاوہ سور کا گوشت بھی بک سکتا ہے۔ کچھ دیر تو ابا گلاب دین ہچکچاتا رہا پھر اس نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی آخر ہم کوئی کھا تھوڑی رہے ہیں۔ صرف بیچنے میں کیا ہرج ہے اور پھر غیر ملک میں آئے بیٹھے ہیں جہاں ہر جگہ یہ مال بکتا ہے اور ہر چیز میں اس کی چربی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے ابا ایسے بسکٹ، کیک، پیئر اور چاکلیٹ وغیرہ بھی نہیں لاتا تھا جن میں سور کی چربی ہوتی ہو۔



وہ سودا لانے سے پہلے کئی کئی گھنٹے اس بات کی تفتیش پر صرف کرتا کہ جو بسکٹ کیک وہ خرید رہا ہے وہ صرف مکھن میں تیار ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن جب ابا کو سفید فام گاہکوں پر ترس آنے لگا کہ وہ اس کی کم نظری اور دقیانوسی خیالات کی وجہ سے مایوس اوتے ہیں تو حلال گوشت کے علاوہ دوسرے قسم کے گوشت بھی دکان پر بکنے لگے۔ ساتھ ساتھ دوسری اشیا خریدتے وقت بھی ابا نے یہ پڑھنا چھوڑ دیا کہ کن کن اشیا کے مرکب سے سامان بنا ہے۔ اب گلاب دین کا خیال تھا کہ سو کو گوشت کھانا منع ہے بیچنا منع نہیں ہے۔

جب گلاب اسٹور بہت مالدار ہونے لگا تو ابا گلاب کو خیال پیدا ہوا کہ دکان کے دو سیکشنوں کے علاوہ تیسرا سیکشن بھی ضروری ہے۔ اس سیکشن میں اس کا ارادہ شراب وغیرہ رکھنے کا تھا۔ کچھ عرصے تو اس نے اپنی بیوی اور بچوں سے یہ ارادہ چھپائے رکھا لیکن جب پچھلے سیکشن میں لکڑی کے ریک کا وائٹ بن کے شراب کے کریٹ (crate) آگئے اور سجائے گئے تو ابا گلاب دین نے محض اطلاع اپنے اپارٹمنٹ (apartment) میں یہ اطلاع دی کہ اب گلے پر بیٹھنے والا کوئی نہیں اس لئے فائزہ روز دکان پر بیٹھا کرے گی اور اماں اور چھوٹی حمیرا ٹیک اوے کھانے تیار اور پیک کریں گی۔

پتا نہیں ابا گلاب دین اماں سے ڈرتا تھا یا شاید اس کا خیال تھا کہ ایک گندمی رنگ کی بال کئی چیز پہننے والی لڑکی بیرونی کا وائٹ سنبھال سکتی ہے۔ اس لئے اس نے ڈرتے ڈرتے فائزہ سے درخواست کی کہ وہ بال کٹوا دے اور چیز پہنا کرے۔ فائزہ کو پہلے پہل تھوڑا دھکا لگا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ہر نئی تبدیلی اول اول دوسروں کو اور خود اپنے آپ کو چونکا دیتی ہے۔ اچھے ذہین لوگ وہ ہوتے ہیں جو نئے ماحول سے جلدی مناسبت پیدا کر لیتے ہیں۔

اس طرح جب اس نے شلوار قمیص چھوڑ کر اس لئے پتلون بلاؤز پہنی تھی کہ اتنی سردی میں ویسی لباس کام نہیں آتا تب کچھ دن وہ گڑ بڑائی ضرور تھی۔ پھر رفتہ رفتہ چیز کی ایسی عادی ہوئی کہ اب شلوار قمیص پہنتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ ایسے ہی وہ تمام تبدیلیاں جو شروع میں حیران کرنے والی بدظن اور بدگمان رکھنے والی تھیں اب معمول بن گئی تھیں۔ لیکن گلاب اسٹور میں شراب بھی بکے گی اس کے لئے کافی دنوں تک بدحواسی، بے چینی اور منتشر کرنے کا موجب رہی۔

فائزہ کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی ماں کے بجائے دادی کی گود میں پلتی تھی۔ اور دادی نے اسے پرانی قد ریں، اپنا چودہ سو سال پرانا مذہب اور بڑی پرانی تہذیب حوالے کی تھی۔ لندن آنے سے پہلے جب دادی نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تو فائزہ کو بہت دکھ ہوا۔

”کیوں دادی کیوں.....“

”اب میری آخری عمر ہے۔ میں چاہتی ہوں میرا انجام نیک ہو..... حسن خاتمہ کی خواہش ہے میری۔“

”کیا مطلب..... آپ وہاں ہم سب کے ساتھ ہوں گی تو وہاں انجام نیک کیوں نہ ہوگا.....؟“

”لباس، زبان، مذہب، موسم کوئی ایک فرق ہو تو بتاؤں... وہاں تو سب کچھ ہی بدلا ہوگا۔ میں



اپنی کس کس چیز کو بچاؤں گی۔“

”آپ کا خیال ہے لندن میں نیک لوگ نہیں بستے۔“

”لے لے لے لے ! الٹی کھوپڑی ہے تیری فائزہ... میں نے یہ سب کچھ کب کہا۔؟“

میں تو کہتی ہوں وہ جگہ فرق ہے۔ اگر میں تیرے ساتھ گئی تو بڑی مصیبت پڑے گی۔“

پھر کچھ دیر سوچ کر دادی بولیں۔

”میں جو وہاں گئی اور وہاں کی مخلوق مجھے مختلف نظر آئی تو وہی صورتیں ہیں۔ یا تو میں اپنے

آپ کو سچا سمجھنے کے لئے نکتہ چینی کروں گی۔“

”تو کر لینا نکتہ چینی، سب ہی کرتے ہیں سفید آدمی پر نکتہ چینی اور پھر بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔“

”ناں نآن نآن... وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ کون جانے رب کی نظر میں کون اچھا ہے۔

کون برا۔“

”پھر آپ جب اتنی لیبرل (liberal) ہیں تو دادی چلیں۔“

”یہ کیا لفظ بولا تو نے؟“

”فراخ دل دادی... بڑے حوصلے والی۔“

”ہاں بھائی میں فراخ دل ہو گئی تو دوسری صورت پیدا ہوگی کہ میں ان کی ماننے لگوں گی۔“

مروت کے ساتھ... رعب میں آکر اور پھر کون جانے کس وقت میں اپنے انجام سے بچھڑ جاؤں۔“

”تو آپ کا خیال ہے وہ غلط رہتے ہیں، غلط سوچتے ہیں، غلط ہیں۔“

”ہائے لڑکی! یہ میں نے کب کہا... جو جہاں ہے ٹھیک ہے۔ جس راستے پر ہے ٹھیک ہے۔

صرف کواہنس کی چال چلے تو اس کا حسن خاتمہ نہیں ہوتا۔“

بیمیر اسمتھ کے سب دے پر بیٹھی فائزہ سوچ رہی تھی کوؤں کے متعلق ہنسوں کی چال کے

متعلق... اور ہر بار نائیجیل اس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کی مونگ پھلی کا پیکٹ ختم

ہونے کو آ رہا تھا لیکن پکا ڈلی تک جانے والی ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔

نائیجیل کی آنکھیں اتنی ہلکی نیلی تھیں کہ کبھی کبھی بالکل زرد زردی نظر آتیں۔ اس کے ہونٹ،

رخسار، ہاتھ سب پلاسٹک کی طرح گلابی تھے۔ وہ مہذب لوگوں کی طرح بہت آہستہ بولتا تھا اور تیز چلتا

تھا۔ سب سے پہلے فائزہ کی ملاقات نائیجیل سے اس دن ہوئی جب وہ شراب خریدنے کے لئے گلاب

اسٹور میں پہلی مرتبہ آیا۔ اس دن ابا گلاب دین کسی کام کی وجہ سے باہر گیا تھا اور حمیرا بیرونی کاؤنٹر پر

تولنے، حساب کتاب رکھنے اور مسکرائے میں مشغول تھی۔

نائیجیل نے ڈھائی پونڈ کی بوتل اور چند بیر (beer) کے ڈبے خریدے پھر آہستہ سے بولا۔

”کیا آپ قیمت یہاں وصول کریں گی؟“

”نہیں، باہر میری جہن کاؤنٹر پر ہے۔“



سر کے اشارے سے نائیجیل نے بائی بائی (bye-bye) کہا اور چلنے لگا۔ پھر پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ رک کر بولا۔

”تم ایک خوب صورت ایشیائی لڑکی ہو۔ ہسپانوی رنگت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔“  
 بیس سال کی عمر میں اگر کوئی بے ساختہ بات کہہ دے تو دل میں اچانک خوشیوں کی بنیری لگ جاتی ہے اور ایسی زندگی جو بارہ سال سے روٹین کی نذر ہو یک دم ڈسکو ڈانس (disco dance) کرنے لگتی ہے۔

نائیجیل دوسرے چوتھے روز شراب لینے آتا رہا۔ اب ان دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا لین دین عام ہو گیا تھا۔ پھر بھی دونوں یک دم اس بات سے آگاہ ہو گئے تھے کہ وہ قطعی طور پر مختلف ہیں۔ جو فرق انہیں محسوس نہ ہوتے تھے وہ کھل کر سامنے آ گئے تھے اور دونوں پہلی مرتبہ کلچرل شک (cultural shock) سے خوف زدہ تھے۔ اس ری باؤنڈ (rebound) کی شکل میں وہ ایک دن الجھ گئے۔

وطن میں تو رشتہ داری، دوست داری، اقربا پروری میں حتی الوسع دل کھول کر جھوٹ بول کر وہ اچھی طرح منافق ہو چکی تھی لیکن یہاں چوں کہ رشتوں کا پاس نہ تھا اس لئے بڑی سچی اور کھر درمی ہو چکی تھی اور اس بات کا بھی اسے علم نہ تھا کہ تبدیلی اس میں کب اور کیسے آئی؟

ہوا یوں کہ نائیجیل جس وقت دکان میں داخل ہوا وہ اخبار پڑھ رہی تھی۔ نائیجیل نے اسے بلانے کی کوشش نہ کی اور وہ بھی اخبار کا بیک (back) صفحہ دیکھنے لگا۔ پھر پتا نہیں کہ دونوں کتنی دیر تک پڑھتے رہے کہ اچانک حمیرا شراب والے سیکشن میں داخل ہوئی۔

”آپا! میں ذرا ہیرا سمیٹھ جا رہی ہوں خالہ جمیلہ کے پاس... آپ باہر آ جائیں۔“  
 ”اچھا۔“

دیر تک نائیجیل ”اچھا، اچھا“ کرتا رہا اور مسکراتا رہا۔ اور پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ اس نے اخبار کا صفحہ الٹ کر فائزہ کے سامنے رکھا۔ اس صفحے پر ہیروئن اسمگل کرنے کے جرم میں ایک پاکستانی کی تصویر چھپی تھی اور ساتھ ہی کس طرح اور کیسے وہ پکڑا گیا تھا، اس کی تفصیلات درج تھیں۔

”یہ تم لوگ ہیروئن کیوں اسمگل کرتے ہو؟“

شراب کی دکان میں شراب بیچتے ہوئے وہ یک دم حیران رہ گئی۔

”اور تم لوگ جو صدیوں تھرڈ ورلڈ (Third World) کو شراب بیچتے رہے... اپنی شراب کو

خوب صورت رہنوں سے سجا کر ان کی تصویریں چھاپ کر اشتہار بازی کرتے رہے ہو وہ کچھ نہیں۔“

پہلی مرتبہ نائیجیل کی آنکھیں گہری نیلی ہو گئیں۔

”شراب تباہ کن نہیں ہے۔ ہیروئن تو مار دیتی ہے ختم کر دیتی ہے۔“

”اور وہ سب لوگ جو سب اسٹیشنوں پر شراب کے نشے میں اوندھے پڑے ہوتے ہیں وہ

روز روز مرنے والے وہ ختم نہیں ہوتے۔“



ٹائجل کے پاس سائنسی توجیحات تھیں۔ فائزہ کے پاس ایمانی تاویلیں تھیں۔ دونوں ٹھیک تھے۔ پہلے انرا می گفتگو ہوئی پھر جھگڑا ہوا اور اس کے بعد یک دم محبت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ کبھی کبھی شدید کمر اوڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنی بقا کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب ٹائجل اور فائزہ کو ایک دوسرے سے وابستگی اپنی اپنی شکل میں نظر آئی اور دونوں گلاب اسٹور سے باہر نکل کر بھی ملنے لگے۔ جیسے جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو جانا اس کے بعد انہوں نے طے کیا کہ اب انہیں شادی کر لینی چاہیے۔ لیکن جب جذبے سے پرے دنیاوی طور پر معاملات طے ہونے لگے تو سب بڑا مسئلہ مذہب کا نکل آتا ہے۔ ٹائجل اپنا دیس، زبان، لباس سب کچھ بدلنے کو تیار تھا صرف وہ اپنا مذہب بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ مذہب سوائے کرمس منانے کے اس کے کام بھی نہ آتا تھا۔ وہ چرچ، کرائسٹ اور بائبل سب کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ پھر بھی اتنی بڑی تبدیلی کے لئے اس کی روح رضا مند نہ تھی۔ دو روز پہلے جب وہ جمیلہ خالہ کے پاس ہیر اسمتھ آئی تھی تو ٹائجل اسے ملنے آیا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر نیچے جھٹکنے والی خوب صورت بیویوں کو دیکھنے لگی۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے چرچ کا چھوٹا سا باغیچہ گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں چپ تھے۔ لباس زبان مذہب کلچر موسم اتنے سارے فاصلوں کی چپ ان کے ہونٹوں پر تھی۔

بڑی دیر کے بعد ٹائجل نے کہا،

”میں تمہارے والد سے ملنا چاہتا ہوں“

”کیوں کس لئے؟“

”شاید ان میں تم سے زیادہ عقل ہو“۔ مسکرا کر ٹائجل نے کہا۔

فائزہ کے سامنے اپنا باپ آگیا جو پاکستان سے اس لئے بھاگا تھا کہ وہاں غریبی تھی اور یہاں اس لئے پھنس گیا تھا کہ یہاں امیری تھی۔

”فیصلہ تو بالآخر میرا ہی ہو گا ٹائجل“۔

”تم تو کہا کرتی ہو کہ تمہارے ملک میں شادیاں ماں باپ کی مرضی سے ہوتی ہیں“۔

”لیکن یہ ہمارا ملک نہیں ہے ٹائجل“۔ فائزہ بولی۔

”تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے“۔

”ہاں ہے“۔

”پھر تم وہ تمام حقوق انجوائے (enjoy) کر سکتی ہو جو یہاں کے کسی نیشنل (national) کے

ہیں۔“

”لیکن وہ فرائض ادا نہیں کر سکتی جو یہاں کے مقامی ادا کر سکتے ہیں“۔

وہ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر ٹائجل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”سنو فائزہ! میں مذہب تبدیل نہیں کر سکتا کیوں کہ... اس لئے نہیں کہ میں عیسائی مذہب

پر یقین رکھتا ہوں بلکہ صرف اس لئے کہ میں اسلام کو جانتا ہی نہیں“۔



# ساقی از باب حقوق

**PDF BOOK COMPANY**

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:

Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224





”آہستہ آہستہ جانے لگو گے۔“

”ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ جانے کے بعد میں سرے سے قبول کرنے سے انکار ہی کر دوں۔“

میں مذہبی آدمی نہیں ہوں فائزہ۔ میری ماں نے مجھے پرورش نہیں کیا۔ وہ ریڈی میڈ (ready made) کپڑوں کی فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ ہمیشہ اتنی تھکی ہوئی لوٹی تھی کہ اس کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی بات اس سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہم دونوں... کبھی کبھی ایک دوسرے کو محبت بھری نگاہ سے دیکھ لیتے تھے۔ اس نے مجھے تجربے سے دیکھنے سیکھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ میں نے سب کچھ بڑے مہنگے داموں سیکھا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مذہب سے متعلق کچھ نہیں سیکھوں گا۔ مذہب تو کسی گود سے سیکھا جاتا ہے اور میں کسی گود میں پلا ہی نہیں۔“

فائزہ چاہتی تھی کہ ٹائجل کا دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لے مگر وہ اس وقت مضبوط رہنا چاہتی تھی۔

”لیکن... پھر تو... شادی نہیں ہو سکے گی ٹائجل۔“

”ہم سول میرج (civil marriage) کر سکتے ہیں فائزہ۔“

جب عورت بتیس (۳۲) سال اکتیس (۳۱) دن کی ہو چکی ہو اور اس کی زندگی میں ایک عرصے سے گیت، چاندنی اور باغ بے معنی ہو گئے ہوں تو اچانک نیلی آنکھوں کا اس نہتی پر وہی اثر ہوتا ہو ہے جو فائزہ پر ہوا۔ وہ سول میرج کے لئے تیار ہو گئی۔

اسے پکا ڈلی تک ہی تو جانا تھا۔ پکا ڈلی سب دے سے تھوڑی ہی دور ٹائجل کتابوں کی دکان پر کام کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر فائزہ کو بڑی ہمت کے ساتھ آخری بار ٹائجل کو خدا حافظ کہنا تھا۔

پتا نہیں کیوں ساری رات بے قراری رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر وہ ٹائجل سے شادی کرے گی تو اس کا حسن خاتمہ ہو سکے گا۔ کوا اگر کوئے کی چال چلتا ہے تو اس کا حسن خاتمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہنس کی چال چلنے والے کوئے کا ہر انجام بے معنی ہوتا ہے۔ اسے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ اور ٹائجل تھوڑی دیر کے بعد بڑی بڑی لڑائیاں لڑنے لگیں گے اور چھوٹی چھوٹی بات پر لمبے لمبے مباحثے ہوں گے۔ بلکہ وہ جانتی تھی کہ ہر روز دن چڑھتے ہی وہ ٹائجل سے اور زیادہ پیار کرے گی۔ ہر روز پہلے دن سے زیادہ اس کے رنگ میں رنگی جائے گی۔ اسے اپنا نام مذہب ملک سب کچھ بھول جائے گا اور وہ اپنے آپ کو ٹائجل سمجھنے اور بنانے میں اتنی دور نکل جائے گی کہ حسن خاتمہ کا تصور بھی اس کے ساتھ نہ رہے گا۔

آخر بتیس (۳۲) سال بتیس دن کی عورت کے پاس اپنی روٹین (routine) سے نکلنے کا یہ ہی ایک موقع تھا۔ دور کھلے سب دے سے ٹرین کی آواز آرہی تھی۔ موٹگ پھلی کا پیکٹ ختم ہو چکا تھا۔

پکا ڈلی تک ہی تو جانا تھا آخری بار ٹائجل سے ملنے کے لئے کتابوں کی دکان پر بغیر وجہ بتائے شادی سے انکار کرنے کے لئے۔ ٹرین رکی۔ اس نے اپنے بیگ کو مضبوطی سے تھاما۔ اندر داخل ہوئی اور ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے فائزہ نے سوچا۔ ”میرے مولی! یہ بھی کیسی آزمائش بھری زندگی ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں



کہ مغرب میں زندگی آسان ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسا مغرب ہے اور یہ کیسی زندگی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ میں  
 صدیاں جی چکی ہوں۔ میرا فوکل بن چکا ہے۔ لیکن زندگی ختم ہونے کو نہیں آتی۔ میرے آقا! یہ سب کیا  
 ہے۔ وہاں غریبی دکھ تھے۔ یہاں امیری نے گلا دبا رکھا ہے۔ وہاں رسوم کی قید سے زندگی دم پخت تھی۔  
 یہاں آزادی ہر جگہ بہائے لے جاتی ہے جیسے کاغذ کا پرزہ شدید آندھیوں میں آوارہ ہو۔ یہ سب کیا ہے۔  
 یہاں وہاں کیا ہے میرے خدایا۔ حسن خاتمہ کب ہو، کہاں ہو، کیسے ہو؟





نعت سے مجھے نفرت ہے میں محبتوں خوشیوں اور  
خوشبوؤں کی وادیوں کا منلاشی اور ستیاح ہوں  
۱۱/۱۱/۵۳

## سید بشیر حسین جعفری

راولپنڈی، پاکستان

غالباً اکتوبر ۲۰۰۳ء کا آخری ہفتہ تھا جب جناب سید بشیر حسین جعفری سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک دن کے قیام کے لئے جاوید اختر چودہری صاحب کے مہمان تھے۔ پہلی ملاقات کا تاثر یہ تھا کہ شریف انفس اور تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ اچھی گفتگو کا فن جانتے ہیں۔ پھر جب انہوں نے اپنی کتاب ”زندہ باؤ“ جاوید صاحب کی نذر کی تو ساڑھے آٹھ سو صفحات کی اس ضخیم کتاب کو جستہ جستہ دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ بشیر صاحب نہ صرف اچھی گفتگو کرنے کے فن میں طاق ہیں بلکہ اچھی نثر لکھنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ”زندہ باؤ“ ان کی سوانح حیات کا پہلا حصہ ہے۔ ”پائندہ باؤ“ جو زیر تصنیف ہے وہ ان کی سوانح عمری کا دوسرا حصہ ہوگی۔

کتاب کا نام ”زندہ باؤ“ انہوں نے خود تجویز کیا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بقول سید بشیر حسین جعفری، انہوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ برتا، جو عمل کیا اس کے اب تک کے وہ خود گواہ ہیں۔ اب اگر اپنے قارئین کو بھی اس میں شامل کر لیں تو وہ بھی ان کے حالات اور واقعات کے ساتھ دیگر دنیاوی واقعات و حالات بھی جان لیں گے اور یوں سید بشیر حسین جعفری اپنے قارئین کے ذہنوں میں، لائبریریوں میں اور تاریخ ادب میں ہمیشہ کے لئے ”زندہ جاوید“ ہو جائیں گے۔

آنے والی کتاب بھی اسی نکتہ کی حامل ہے۔ مثال کے طور پر اپنی سوانح حیات ”زندہ باؤ“ میں



انہوں نے اپنے حالات درج کرتے ہوئے ایک عالمی واقعہ ہیروشیما پر ایٹم بم برسائے جانے کے واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ وہ ۶۰ / اگست ۱۹۴۵ء کا دن تھا۔ اس روز سید بشیر حسین جعفری جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ کس جنگل میں؟ اب اس سوال کا جواب بھی اگر میں دے دوں تو پھر آپ سید بشیر حسین جعفری کی سوانح حیات میں کیا پڑھیں گے؟

سید بشیر حسین جب برطانیہ سے امریکہ گئے تو وہاں سے انہوں نے خط لکھا اور بتایا کہ وہ لیک ٹاہو (Lake Tahoe) کے کنارے بیٹھ کر سفر نامہ لکھ رہے ہیں۔ انہیں قدرتی مناظر اتنے پسند ہیں کہ جھکے جھکے بادلوں کی سرگوشیوں سے ان میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور پانی کے زیر و بم کے ہلکے سُرائ کی سماعت کے سُروں کو بیدار کرتے ہیں۔

میں چوں کہ خود ان کیفیات سے گزری ہوں اور گزرتی رہتی ہوں چناں چہ میں جعفری صاحب کی ان خوبیوں کی قدر کرتی ہوں کہ موسموں نے ان کا کچھ بگاڑنے کے بجائے ہمیشہ انہیں لکھنے کی قوت بخشی اور انہوں نے خود کو کسی ایک موضوع کا قیدی نہیں بنایا۔ رنگارنگ موضوعات زیر تحریر لائے۔ اپنے اس خط میں انہوں نے لکھا: ”میں اپنے ساتھ بیسویں صدی لئے یعنی ایک لحاف اوڑھے ساغر صدیقی کی طرح اس کرۂ ارض کے فٹ پاتھ پر پڑا ہوں۔“

مگر وہ جہاں بھی پڑے رہے خالی الذہن ہو کر نہیں پڑے رہے۔ جب بھی سوچا تو اسی انداز میں سوچا

♦ سب کو جینے دو اور خود بھی اسی انداز میں جیو

♦ اپنے لئے وہی پسند کرو جو دوسروں کے لئے بھی چاہتے ہو۔

♦ میں خوش بوؤں، محبتوں اور خوشیوں کی وادیوں کا متلاشی اور سیاح ہوں

آزاد کشمیر کے ضلع باغ کے مقام سوہا وہ شریف میں ۱۵ / مئی ۱۹۳۴ء کے دن سید بشیر حسین جعفری نے جنم لیا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی و اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول راولا کوٹ، اسلامیہ کالج لاہور، اور فینل کالج اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں ایم اے اردو کیا۔ فارسی اور سیاست میں تعلیم کے حصول کے اختتام کے بعد اپنی ملازمت کا آغاز راولپنڈی میں تحصیلدار یعنی (colony officer) با اختیار مجسٹریٹ درجہ دوم ملازمت سے کیا۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد اور وفاقی حکومت پاکستان کی وزارت سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد (پاکستان سائنس فاؤنڈیشن) میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۴ء تک وابستہ رہے۔ ساٹھ برس کی عمر پوری ہونے پر جب ۱۹۹۴ء میں ریٹائر ہوئے تو پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے شعبہ ہائے فروغ سائنس، مطبوعات اور اطلاعات کے سربراہ تھے۔

ادبی زندگی کے آغاز کے سلسلے میں انہوں نے بتایا، ”میں اسکول، کالج، یونیورسٹی کے زمانے سے بھی بزم ادب قسم کی تنظیموں سے وابستہ رہا ہوں لیکن علمی، ادبی، تحقیقی کام کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا۔ متعدد قومی اخبارات (اردو و انگریزی) جرائد، ڈائجسٹوں میں برابر میری تحریریں نمایاں طور پر شائع ہوتی رہیں۔ اپنا ایک علمی و ادبی ماہنامہ ”بصیرت“ کے نام سے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۱ء تک شائع کیا۔ جس میں نثر نویسی کی ہر جہت محفوظ ہے۔



میں نے ادب کی مروجہ اور طے شدہ جہتوں تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس (جملہ موضوعات)، سب میں برابر کام کیا۔ ڈرامہ، افسانہ اور انشائیہ لکھا لیکن اسی (۸۰) فی صد کام کو علمی اور تحقیقی کہہ سکتا ہوں میں نے زرعی علوم کی لغت تیاری میں حصہ لیا۔ Agricultural and allied sciences (شعبہ زراعت، طب، طیوریات، علاج و پرورش حیوانات اور اینٹی طاقت کے پُر امن استعمال) کی متعدد شاخوں میں اردو زبان میں کتب اور تحقیقی مقالات لکھ کر چھپوا کر انعامات حاصل کئے۔ مجموعی طور پر میری پندرہ کتب چھپ چکی ہیں۔ جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

- ۱۔ تذکرہ جنگ آزادی کشمیر (تاریخ)
- ۲۔ سورج میرے پیچھے (عالمی سفر نامہ)
- ۳۔ ممالک اسلامیہ (تاریخ و سیاست)
- ۴۔ پرندوں کی موسمی نقل و حرکت (سائنس، زوالوجی)
- ۵۔ اینٹی توانائی کا پُر امن استعمال (سائنس، فزکس)
- ۶۔ عالمی مسئلہ خوراک اور سائنس (اگریکلچر)
- ۷۔ تپ دق (علامات اور علاج) (طب)
- ۸۔ کلمات جلیلہ (سوانح حیات)
- ۹۔ زندہ باد + پائندہ باد (خودنوشت سوانح حیات)
- ۱۰۔ میری مراسلت
- ۱۱۔ حرمت لفظ (علمی، ادبی مضامین کا انتخاب)
- ۱۲۔ سائنسی انشائیے (جنرل سائنس)
- ۱۳۔ تاریخ مسلم کانفرنس
- ۱۴۔ کشمیریات (پوسٹ گریجویٹ سطح کے لئے مطالعہ۔ نصاب تعلیم)

۱۵۔ Kashmiries Fight for Pakistan (in two volumes)

۱۶۔ Muslim Conference in the Great Britain (History)

سید بشیر حسین بتا رہے تھے انہیں سیاحت سے بہت دل چسپی ہے۔ بطور عالمی سیاح انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہارٹھ پول پوائنٹ (گرین لینڈ) سے بھی ہو آئے ہیں اور کرہ ارض کی چٹی surface پر دو سفر (rounds) ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء میں مکمل کیے محض اپنے ذاتی شوق، جنوں اور لگن کے سبب اور قطعاً اپنے وسائل اور اللہ کے بھروسے پر اور یہ معمولی بات نہیں سید بشیر حسین جعفری کو برٹش لائبریری لندن اور لائبریری کانگریس واشنگٹن کی افرو ایشین اسٹڈیز (Afro. Asian Studies) کے شعبے میں ان کے علمی و ادبی کام اور خاص طور سے عالمی سیاحت کے سلسلے میں ویڈیو انٹرویو (Video Interview) ریکارڈ کر کے سرکاری محفوظ خانے (Archives) میں محفوظ کیے گئے ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر کی مشہور لائبریریاں دیکھیں اور کوہ سار، مرغ زار، لالہ زار، جھیلیں، بلند عمارات، پہاڑ، دریا، آبشار، تاریخی مقامات اور ہر طرح کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔

علمی اعزازات کے حوالے سے انہوں نے بتایا، ”میری خودنوشت سوانح حیات زندہ باد (۱۰۰۰ صفحات) میں میرے اُن چالیس (۴۰) اعزازات (قومی) اور انعامات کی فہرست صفحہ ۸۵-۶۸۸ پر موجود ہے۔ اسی طرح میری کتابوں کا تذکرہ بھی صفحہ ۸۱۵ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ میں اب بھی لکھنے، پڑھنے



اور سوچنے کے عمل سے برابر گزر رہا ہوں اور تادم واپس ایسا ہی خیال ہے۔“ انشا اللہ!

بیشک ایسا حوصلہ کم لوگوں کو اللہ ودیعت کرتا ہے اور یہ ان پر اللہ کا بے پناہ کرم ہے۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شعر کہنے کی انہوں نے کبھی ہمت نہیں کی۔ کہنے لگے، ”نثر نگار

ہوں۔ شاعری بڑا مقام ہے۔ میں نے نثر میں بھی اپنے خیالات کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔“

اگلے سوال کے جواب میں کہنے لگے، ”اردو ادب یا علمی کام کے سبب خسارے“ کا احساس

کبھی نہ ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے نام کمایا، عزت پائی اور ہزاروں لوگ جانتے ہیں اور احترام دیتے

ہیں۔ دنیاوی دولت بہت لوگوں کے پاس ہے اُس کا اور علم کا موازنہ نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں

نے صحیح فیصلہ کیا۔ اکل حلال سے زندگی گزار رہا ہوں۔ الحمد للہ۔

اب رہا ادیبوں کی گروپ بندی کا سوال..... تو میرے خیال میں ادیبوں کی گروپ بندی

سے نقصان نہیں فائدہ ہوتا ہے۔ ہر لکھنے والا چوکنار بتاتا ہے۔“

اردو کے مستقبل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ”اردو نے جنم تو

ہندوستان میں لیا، مگر متعصب ہندوؤں نے نہ صرف مسلمانوں کو پاکستان بھجوا دیا بلکہ اردو کو بھی نکال باہر

کیا۔ یہ ایک المیہ ہے۔ افسوس کہ خود پاکستان میں سرکاری افسر اور بڑے لوگ اردو سے نااہل ہیں۔

ٹی وی پر ان کی گفتگو جو اردو کے کھاتے میں ڈالی جاتی ہے اسی (۸۰) فی صد انگریزی ہوتی ہے۔ جس

طرح زبانوں کی تاریخ ہے کوئی بھی زبان ایک عرصے کے بعد بدل جاتی ہے، پچاس (۵۰) یا سو (۱۰۰)

برسوں بعد اردو میں دوسری زبانوں (علاقائی اور عالمی) کے الفاظ درآئیں گے اور تین سو (۳۰۰) برس

بعد ایک نئی زبان رائج ہوگی جس طرح نظام فطرت تبدیلی کی زد میں ہے زبان اور معاشرت بھی اسی

دائرے میں آتی ہے۔ میری رائے میں جو کچھ جس طرح ہو رہا ہے اس کو ہم لگام نہیں دے سکتے۔ ہم اردو

کی خدمت کرتے رہیں اور گردش ایام اپنا کام کرتی رہے گی۔ رہا رسم الخط کا سوال..... وہ لمحے بھر کو

رُکے۔ پھر بولے..... ”اہل زبان کی ناراضگی سے ڈر لگتا ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ اردو کو عام

کرنے، بالغوں اور بچوں کو آسانی سے پڑھانے کے لئے رومن اردو کا تجربہ ۴۴-۱۹۴۰ کی جنگ عظیم

دوئم میں ہوا تھا۔ میں نے ’زندہ باد‘ میں تبصرہ کیا ہے کہ چھ ماہ کے اندر اندر ان پڑھ فوجی اپنے گھروالوں کو

رومن اردو میں خط لکھتے اور میں یہ خط پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ خود دیکھیے کہ ’س، ٹ، ص‘ کے لئے صرف ’S‘

کافی ہے، ’ے‘ ’E‘ اور ’ق‘، ’ک‘ کا مسئلہ ’K‘ سے حل ہو جاتا ہے۔ اردو میں کسی ان پڑھ کو تین سال

بعد لکھنا آئے گا اور رومن میں تین ماہ کے اندر۔ البتہ ہمارا علمی اثاثہ، دینی موضوعات (عربی، فارسی) اور

عام علوم کا تقاضا ہے کہ اردو کو ہی رکھا جائے مگر alphabets میں کوئی آسانی ضرور لانی چاہیے۔“

اپنے پسندیدہ ادیبوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ”اردو زبان کی بات الگ ہے اور

علمی جہتیں الگ ہیں مثلاً کوئی شخص بطور ادیب شہرت یافتہ نہیں مگر اس نے علمی اور تحقیقی کام کیے ہیں۔

شعر و شاعری میں بھی نصف درجن اصناف ہیں۔ شعرا سے صرف نظر کرتے ہوئے اردو زبان لکھنے والوں



میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پیر علی محمد راشدی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایسے سینئر لکھنے والوں کو شوق سے پڑھا ہے۔ آج کے دور کے بعض ادیب، کالم نگار اور علمی موضوعات پر لکھنے والے مجھے بہت پسند ہیں۔ واصف علی واصف (اب مرحوم) کی اردو تحریریں دل و دماغ میں جگہ بنا لیتی ہیں۔ میں نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں لکھنے والوں کو پڑھا ہے۔ جدید دور میں میری دل چسپی سائنس سے زیادہ ہے۔ یقینی معلومات اور ترقی کی منازل طے کرنے کے لئے سائنس سے رشتہ جوڑنا ضروری ہے۔ میں نے سائنسی انشائیے لکھ کر اردو ادب میں ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اگر میں یورپی زبانوں کے دس لکھنے والوں کو اس تحریر میں ڈال دوں تو کون مجھے ٹوک سکتا ہے۔ میں نے انگریزی لکھنے والوں کو ضرور پڑھا ہے مگر ان کے موازنے کا علم مجھ تک پہنچ نہیں سکا۔ ولیم ہزلٹ اور ایڈگر ایلن پو میرے پسندیدہ اہل قلم ہیں۔“

آخری سوال کے جواب میں اپنی زندگی کا اہم واقعہ انہوں نے سنایا، ”۱۹۳ء میں کہ میں پونچھ شہر (اب مقبوضہ کشمیر) کے اسلامیہ ہائی اسکول میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک شام کو دریائے پونچھ میں تیر رہا تھا۔ معاً پانی کا ایک بڑا ریلہ آیا۔ میں ڈوبنے لگا۔ بازو اور ہاتھ اونچے کیے یعنی میرا May-day کا مرحلہ تھا۔ دریا کے کنارے بیٹھا ایک نوجوان میری مدد کو دریا میں اُترا۔ اس نے مجھے ڈوبتے ہوئے بچایا۔ دریا کے کنارے اوندھا لٹایا۔ جب مجھے ہوش آیا تو ایک ساتھی نے بتایا یہ عبدالقیوم خان تھا اور وہی شخص پانچ بار آزاد کشمیر کا صدر اور وزیراعظم رہا۔“

## دواہم آراء

”زندہ باؤ“ پر رشید ملک، ایڈیٹر روزنامہ ”مختب“ (مظفر آباد، راولپنڈی، پشاور) لکھتے ہیں، ”سید بشیر حسین جعفری نے تاریخ کشمیر، تحریک آزادی کشمیر یا جنگ آزادی کشمیر پر بہت کام کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے سائنس کو اردو زبان میں پیش کر کے سائنس کو معاشرے میں عام کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مگر ان کی زندگی کی کہانی ’زندہ باؤ‘ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جعفری صاحب نے متعدد جہتوں میں کام کیا ہے۔ بہت لکھا ہے اور۔۔۔ لکھا ہے۔ ان کی تحریر میں ادب کی چاشنی اور مطالعے کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔“

اور ڈاکٹر سردار محمد حبیب خان، اسلام آباد سے لکھتے ہیں، ”سید بشیر حسین جعفری نے اپنی سوانح حیات ’زندہ باؤ‘ میں ریاست جموں و کشمیر کی معاشرتی زندگی کی اتنی خوب صورت عکاسی کی ہے کہ اسے Anthropology کے نصاب میں رکھا جائے۔ علمی اور سائنسی موضوعات کو آسانی اور شستہ اردو زبان میں پیش کیا ہے۔ علوم انسانی پر اس قدر وسوسہ رکھنا بہت بڑی بات ہے۔“ (مطبوعہ خط)

Mr. Syed Basheer Hussain Jafri,

B577, Sattelite Town, Rawalpindi, Pakistan





بھول اچھے لکھتے ہیں - ایسا لکھنا اچھا لکھنا ہے -  
بچے اچھے لکھتے ہیں -

بلقیس جہاں  
۲۵ جون ۲۰۰۳ء

## ڈاکٹر بلقیس جہاں

بھوپال، ہندوستان

بھوپال میں قریباً ایک صدی تک بیگمات کی حکومت رہی ہے۔ اُن کی علم پروری اور ادب نوازی سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ دی۔ قدامت پسندی کے باوجود علم دوست گھرانوں نے اپنی بچیوں کو اسکولوں میں داخل کرایا۔ یہ سلسلہ نواب حمید اللہ خان کے دور میں بھی جاری و ساری رہا۔ یہ وہی نواب حمید اللہ خان ہیں جن کے نام علامہ اقبالؒ نے اپنا مجموعہ ”ضرب کلیم“ منسوب کیا ہے۔

بھوپال کی لکھنے والیوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ایک کہکشاں ہی جی نظر آتی ہے۔ ماضی بعید کی بات چھوڑیے، ماضی قریب میں سورج کلا سہائے سرور جیسی صاحب دیوان شاعرہ، اختر جمال (۱) جیسی افسانہ نگار، شفیقہ فرحت (۲) جیسی مزاح نگار، رضیہ حامد (۳) جیسی محقق اور تو اور خود بانوارشد (۴)، زہرہ جمال اور وسیم بانو قدوائی نے بھی اسی سرزمین سے کسب نور کیا۔

(۱)۔ اب آٹواکینڈامیں ہیں۔ ان کا تعارف ”گفتنی حصہ اول“ کے صفحہ ۲۷ پر ہے۔ (۲)۔ بھوپال میں ہی مقیم ہیں اور ان کا تعارف ”گفتنی حصہ اول“ کے صفحہ ۳۳ پر ہے۔ (۳)۔ ان کا تعارف ”گفتنی حصہ دوم“ کے صفحہ پر دیکھیں (۴)۔ اب لندن، برطانیہ میں ہیں۔ ان کا تعارف بھی ”گفتنی حصہ اول“ کے صفحہ ۹۱ شامل ہے۔ سلطان مہر



بلقیس جہاں بھی بھوپال کے علمی و ادبی حلقوں کے لئے آید۔ نا پہچانا نام ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک قدیم بھوپالی خاندان میں آنکھیں کھولنے والی اس لڑکی نے کالج کے زمانے سے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ حمید یہ کالج کی بزم ادب کی وائس پریسیڈنٹ اور یونین کی ممبر رہیں۔ جی اے کرتے ہی شہر کی مشہور درس گاہ سلطانیہ اسکول میں ٹیچر ہو گئیں اور پھر بی ایڈ کیا۔ پھر فرسٹ ڈویژن میں اردو میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی ہوئیں اور پھر انگریزی ادبیات میں ایم اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۰ء میں پروفیسر آفاق احمد سے شادی ہوئی۔ ان کی رفاقت میں انہوں نے سرگرمی سے ادبی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔

’مخدوم محی الدین‘ اُن کا ڈاکٹریٹ کا موضوع تھا جس کے امتحان ممتاز ناقد ڈاکٹر شارب ردو لوی اور محققہ ڈاکٹر سیدہ جعفر تھیں، جنہوں نے اپنی رپورٹ میں اس کام کو مخدوم پردستاویری حیثیت کا کام قرار دیا تھا۔ عنقریب یہ مقالہ کتابی صورت میں منظر عام پر آنے والا ہے۔

آج کل ”انجمن ترقی اردو بھوپال شاخ“ کی صدر ہیں اور بھوپال کی سب سے قدیم ادبی انجمن ”حلقہ ارباب ادب“ کی مجلس منتظمہ کی رکن ہیں۔ آپ کے مضامین جو عام طور پر بھوپال کی گزشتہ تہذیب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اکثر آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتے ہیں۔ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ شاعری سے دل چسپی ضرور ہے مگر سننے کی حد تک۔ خود شعر گوئی سے دور ہیں۔ کئی انگریزی کہانیوں کا اردو ترجمہ کر کے شائع کرا چکی ہیں۔ اُن کی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزرا ہے۔ پہلے اسکول میں ٹیچر رہیں بعد میں بیس (۲۰) سال تک کالج میں پڑھایا۔ ۱۹۹۵ء میں پروفیسر کے عہدے تک ترقی کر کے پینشن پالی۔

امور خانہ داری میں طاق ہیں۔ آفاق صاحب کی وجہ سے اُن کا گھر بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی آماج گاہ بنا رہتا ہے۔ کبھی جذبی صاحب آرہے ہیں، کبھی جگن ناتھ آزاد مہمان ہیں، کبھی قاضی عبدالستار صاحب مقیم ہیں۔ خلیق انجم، شارب ردو لوی، سیدہ جعفر، ثریا حسین، شاہد علی خان، شمیم نکبت، خواجہ احمد فاروقی، عبدالحق، مشتاق سنگھ، قمر رئیس، عبدالغفار عزم، رفیع الدین ہاشمی غرض کس کس کا ذکر کیا جائے، انہیں اس بات پر ناز ہے کہ ان شخصیتوں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مہمان جاتا ہے وہ دوسرے مہمان کا انتظار شروع کر دیتی ہیں۔

ادیبوں کی گروپ بندی سے نالاں بلقیس جہاں کہتی ہیں۔ ”یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اکثر ہمارے ادیب اور شاعر گروپ بندی کا شکار ہیں۔ نظریاتی طور پر تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن جب یہ مخالفت شخصی بنیاد پر ہوتی ہے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اختلاف میں کوئی خرابی نہیں لیکن مخالفت میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

اردو کو اپنانے کے بارے میں انہوں نے کہا۔ ”ہمارے گھر کا اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔ میرے میاں اردو کے پروفیسر رہے۔ ادیب و شاعر ہیں۔ بہت سی انجمنوں سے وابستہ ہیں، صوبائی



”انجمن ترقی اردو“ کے صدر اور ”جن وادی لیکچرنگھ“ کے قومی نائب صدر ہیں۔ میں خود بھی اپنی بساط کے مطابق اردو کے لئے کام کرتی ہوں۔ اردو کے لئے کام کرنے میں خسارے کا کیا سوال؟“

بلقیس جہاں بارہ (۱۲) بار دنیا کا چکر لگا چکی ہیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں ہندوستان سے باہر ہیں۔ ایک بیٹی جو ڈاکٹر ہے وہ پہلے سعودی عرب میں تھی اب امریکہ میں ہے۔ بڑی بیٹی کنیڈا میں شیلٹر میں کام کرتی ہے۔ ہر سال وہ گرمیوں کا انتظار کرتی ہیں کہ کب وہ آئیں اور چار مہینے کے لئے وہ اپنی بچیوں اور نواسوں نواسیوں کے پاس پہنچیں۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں انہوں نے کہا: ”میری بچیاں کانٹونٹ میں پڑھتی تھیں۔ وہاں اردو نہیں تھی۔ میں نے قرآن شریف کے ساتھ گھر پر انہیں اردو کا بھی حرف شناس بنایا۔ دراصل بچوں کو اردو کی تعلیم دینا ماں باپ کی ذمہ داری ہے۔“ ان کا یہ بھی کہنا ہے: ”وہ لوگ جو اردو کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کی باتیں کرتے ہیں وہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ دراصل ان کے دل میں چور ہے۔ وہ خود تو اپنے بچوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے اردو پڑھاتے نہیں اور اپنی اس بے شرمی کو چھپانے کے لئے اردو کے مستقبل کا رونا روتے ہیں۔ اردو کا مستقبل اُس کے ماضی اور حال کی طرح تابناک ہوگا، انشا اللہ۔ اردو کی جہانگیری کا سکہ تو ایک عالم میں چل رہا ہے۔“

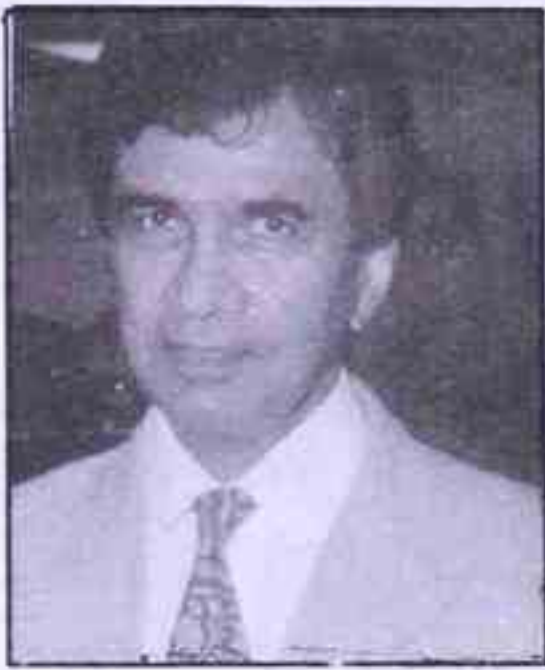
بلقیس جہاں نے دوران گفتگو ایک بڑی دل چسپ بات بتائی۔ ان کے والد کا نام بھی آفاق تھا اور ان کے میاں کا نام بھی آفاق ہے۔ وہ بولیں: ”شادی کے بعد عورتوں کا نام بدلنے کا دستور بھی عجیب ہے۔ مرد اپنے اقتدار کا ایک حصہ بنانے کے لئے یہ کرتے ہیں۔ مگر میرے میاں بالکل دوسرے قسم کے ہیں۔ وہ کہتے تھے جب تمہارے والد نے اپنا نام نہیں لگایا تو میں کون جو خواہ مخواہ تمہارے نام کو بدلوں۔ تم بلقیس جہاں ہی اچھی ہو۔“

وہ اپنی زندگی کا یادگار واقعہ اپنی شادی کو بتاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میرے میاں اور بچیوں اور نواسوں نواسیوں کے ساتھ جو پل گزرتے ہیں وہ میری زندگی کا حاصل ہیں۔ ان کے گھر کا نام ”گل کدہ“ ہے ایک پھولوں کی دنیا ان کے میسر پر آباد ہے، رنگوں اور خوش بوؤں والی! دوسری دنیا ان کے بچوں کی سنگت میں آباد رہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے: ”جب بچے پاس نہیں ہوتے تب میرے دل کے معمورہ میں ان کی باتوں اور یادوں کی خوش بو میرے سکون کے لئے کافی ہے۔“

Dr. Bilqees Jehan,

Gulkadah, 8 Idgah Hills, Bhopal, M. P., 462001, India





مجھے دے کر رہائی بندے سے  
پشیمان تھا خدا بھی نا خدا بھی  
بیہارِ موت  
۱۹ اپریل ۲۰۰۱ء  
ٹورانٹو

## ڈاکٹر بیدار بخت

ٹورانٹو، کینیڈا

باغ ہستی میں کتنی مشکل سے سرخوشی کا سراغ ملتا ہے  
پہلے اگتے ہیں اُن گنت کانٹے، جب کہیں اک پھول کھلتا ہے  
نریش کمار کے اس شعر نے مجھے بڑا سنبھالا دیا۔ ورنہ میں تو چار دن سے زخمی زخمی  
احساسات کا بوجھ لیے بولائی بولائی سی پھر رہی تھی... شاد کا یہ شعر مجھے کل ڈاکٹر بیدار بخت کے  
کاغذات میں ملا۔ یہ گفتی دوم کا آخری تعارف ہے جو میں لکھنے بیٹھی ہوں۔ چار دن پہلے، ایک  
سوئی سی کسی نے میرے نازک جذباتوں کے ریشم میں چھوئی ہی نہیں اتار دی ہے۔ محض کاغذ کے  
چند ٹکڑے مانگنے پر۔ لیکن اب چار دن تک منافقت کا کرب سہنے کے بعد میں نے خود کو بڑی حد  
تک سنبھال لیا ہے۔ سنبھالا لینے کے لیے بھی سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈاکٹر ابن کنول نے  
خوب لکھا تھا۔

”جب آنکھ کھلے وہیں سے سمجھے ”سویا“ ہے۔“

مجھے اس سویرے کی روشنی ڈاکٹر بیدار بخت کی گفتگو سے بھی ملی جو ویڈیو پر ریکارڈ کی گئی  
تھی۔ میری ان سے یہ گفتگو ۱۹ اپریل ۲۰۰۱ء بدھ کے دن ہوئی تھی اور یہ گفتگو ان کی بیگم انیتا



بیدار نے ویڈیو کے ذریعے کیسٹ میں محفوظ کر کے میرے حوالے کر دی تھی۔ اس ویڈیو کے لکھنے میں تاخیر یوں ہوئی کہ گفتی دوم کا کام چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر تاخیر سے شروع ہوا اور جو شروع ہوا تو میں نے کاغذات اور آڈیو کیسٹ پر ریکارڈ کیے ہوئے تعارف پہلے لکھ ڈالے۔ ویڈیو کیسٹ پر ریکارڈ کیا ہوا یہ انٹرویو میرے اس آڈے وقت میں کام آیا۔

یہ تکلیف وہ وقت ۱۶ فروری ۲۰۰۴ء کا دن تھا۔ اس کی تفصیل پھر کبھی بتاؤں گی ضرور۔ پچھلے دنوں میں اس دکھ میں کستی رہی۔ نہ قلم اٹھا کر لکھتے بنے، نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہے۔ جاوید صاحب دلا سے دیتے رہے۔ مگر... مگر...

پھر میری ادب سے پرانی دوستی ہی کام آئی۔ میں نے ڈاکٹر بیدار بخت کے تعارف کا لفافہ اٹھایا۔ کاغذات نکالے تو اس میں سے ان کا دیا ہوا یہ کاغذ بھی برآمد ہوا جس پر (نہ جانے خط کس کا ہے) نریش کمار شاد کا یہ شعر سامنے آیا۔ اور میرے رستے زخموں پر جیسے کسی نے کافور جیسے ٹھنڈے مرہم کا پھایا رکھ دیا ہو۔

”ارے ایک میں کیا، مجھ جیسے جانے کتنے ہی لوگ“ منافقتوں کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، اٹھو! سلطانہ مہر کہ تمہیں کام کرنا ہے۔“

پھر میں کام میں لگ گئی لیکن میری سوچ پھر بھی آوارہ ذروں کی طرح بکھری بکھری تھی۔ ویڈیو کیسٹ چل رہا تھا اور اس کے ساتھ میرا قلم بھی۔ ڈاکٹر بیدار بخت کہہ رہے تھے۔

”ہمارے زمانے میں دو آدمیوں نے تذکرے لکھے ہیں۔ ایک ڈاکٹر مالک رام نے اور دوسرے، سلطانہ مہر آپ نے... ڈاکٹر مالک رام نے ان لوگوں کے تذکرے لکھے جو مر چکے ہیں لیکن آپ کے لکھے تذکرے اس لحاظ سے اہم ہیں کہ وہ زندہ شعراء، شاعرات اور نثر نگاروں کے بارے میں ہیں۔ ایک اچھا کام آپ نے یہ کیا کہ اس میں غیر معروف اور نئے لوگوں کو شامل کر کے اسے ایک انسائیکلو پیڈیا کی شکل دے دی ہے۔ آپ نے مشہور و معروف اور غیر مشہور کی تخصیص روا نہیں رکھی۔ آپ کی تین کتابیں میرے پاس تھیں۔ دو آپ نے آج دی ہیں۔ یوں سخن اول تا چہارم اور گفتی اول میری لاہری میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ میں نے ”سخنور“ دیکھی ہیں۔ آپ کا کام مجھے اس لحاظ سے بھی اچھا لگا ہے کہ اگر مجھے کسی شاعر یا شاعرہ کا کوئی شعر پسند آتا ہے تو میں اس کا تذکرہ پڑھوں گا۔ اس کی کتابیں پڑھوں گا اور ضرورت ہوئی تو کتاب میں دیئے ہوئے پتے کی وجہ سے اس تک پہنچوں گا۔ اس طرح کی کتاب میری نظر سے دوسری نہیں گزری۔ گویا قافی طور پر تذکرے لکھے گئے ہیں۔ جیسے پٹنہ کے شعرا کا تذکرہ، خلیج کے شعرا کا تذکرہ، وغیرہ وغیرہ...“

میں نے کہا ”کچھ لوگوں کو اعتراض ہے کہ میں نے غیر معروف شعرا اور ادیبوں کو معروف کے ساتھ شامل کر کے نا انصافی کی ہے۔“

بیدار بخت نے کہا ”یہ درست نہیں، میں آپ کو حافظ کا ایک شعر سناتا ہوں، (پھر یہ



شعرا انھوں نے مجھے لکھ کر بھی دیا)

تاصد ہزار خار نمی روید از زمین از گل بنے تھے یہ گلستاں نمی رسد  
(ترجمہ: جب تک زمین سے ایک لاکھ خار نہ آئیں، شاخ سے پھول گلستاں میں پیدا نہیں ہوتا)

جناب شمس الرحمن فاروقی نے بھی غالب کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب اور میر کے دور میں بھی دوسرے تیسرے درجے کے شعرا بنیاد ہیں، ان بڑے شعرا کی شناخت میں، شمس الرحمن فاروقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالب، غالب نہ ہوتے اگر ان کے دور میں سو دوسرے تیسرے درجے کے شاعر نہ ہوتے اور غیر معروف کا ذکر ہونا یوں بھی ضروری ہے کہ ان میں سے جانے کون کل معروف شعرا اور نثار کی فہرست میں آجائے۔“

ڈاکٹر بیدار بخت نے غلط نہیں کہا بریکنگ ٹیڈ کرہ جب میں نے آج کی شاعرات کے عنوان سے ۱۹۷۴ء میں ایک سو چار شاعرات کے تعارف پر مبنی کتاب شائع کی اس وقت پروین شاکر یونیورسٹی میں طالب علم تھی۔ اس تذکرے میں کشورنا بید، فہمیدہ ریاض، سحاب قزلباش، پروین فناسید اور دیگر کئی شاعرات کا بھی ذکر ہے۔ جنہوں نے بعد میں اپنی شناخت بنائی۔

بہر حال ذکر ہے ڈاکٹر بیدار بخت کا۔ جب میں گفتنی اول پر کام کر رہی تھی۔ تب شکاگو کے کہانی نویس احمد خان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ڈاکٹر بیدار بخت سے بھی رابطہ کروں۔ انہی دنوں ایک مشاعرے کے سلسلے میں شاہد ہاشمی نے مجھے ٹورنٹو کینیڈا بلایا۔ ایک تقریب میں چائے کے دوران جناب اکرام بریلوی نے ایک صاحب سے ملوایا۔

”یہ بیدار بخت ہیں۔“

”ارے میں تو آپ کی تلاش میں تھی، آپ سے انٹرویو کرنا ہے۔“

”میں کہاں اس قابل، شکریہ۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“

یہ جملہ ادا کر کے وہ مسکرائے اور لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔ میں دیکھتی رہ گئی اور سوچنے لگی۔ صورت سے تو خاصے معقول اور معتبر لگے مگر مزاج کچھ ناساز لگتا ہے۔ خفگی میں، میں نے بھی گھاس نہیں ڈالی۔

”گفتنی اول“ (نثر نگاروں کا تذکرہ) شائع ہو گئی۔ اور پھر ایک بار ٹورنٹو میں ڈاکٹر بیدار بخت سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات تفصیلی تھی۔ تیسری ملاقات میں، میں نے ان سے کہا کہ میں ”گفتنی دوم“ میں ان کا تذکرہ شامل کرنا چاہتی ہوں۔ انھوں نے پھر انکساری دکھانا چاہی اور میں نے کہا کہ اب میں کچھ نہیں سنوں گی، یوں ملاقات کا وقت طے ہوا۔ انھوں نے اپنے گھر دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ جناب رحیم انجبان کے ہمراہ میں ان کے گھر پہنچی۔ ان کے گوشہ عافیت میں ان کی لائبریری قابل دید ہے۔ بڑے سلیقے اور ترتیب سے خوشنما الماریوں میں کتابیں چنی



ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر جی چاہے کہ خود کو بھی ان کتابوں کے آس پاس چن دیا جائے کہ کتابوں کا حسن، علم کا نور اور ان میں محفوظ الفاظ کی خوشبو تو بس قسمت والوں کا ہی مقدر ہوتی ہے۔  
دوران گفتگو میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ کتابوں کی خرید سے اکثر ان کا بجٹ بھی متاثر ہوتا ہے۔

”مگر یہ ہمارا انوسٹمنٹ“ بھی تو ہے۔“ انیتا جی نے بڑے پیار سے کہا۔ ان کے شریک حیات بیدار کے کتابوں سے عشق کے غرور کا سنہرا غارہ انیتا کے چہرے پر بکھرا ہوا ان کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔

”آپ کا نام بیدار بخت کس نے رکھا؟“ میں نے پوچھا  
”جناب خواجہ حسن نظامی نے“

اور میرا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ نام کا اثر شخصیت پر ضرور پڑتا ہے۔ بیدار بتا رہے تھے وہ ۷ فروری یا ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کے دن دہلی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ انجینئرنگ میں بی ایس سی علی گڑھ سے کیا اور ڈاکٹر آف سائنس ۱۹۹۰ء میں لندن یونیورسٹی سے کیا۔ یہ پی ایچ ڈی سے بڑی ڈگری ہے جو پہلی کیشنز اور ریسرچ ریکارڈ پر ملتی ہے۔ بیدار بخت نے علی گڑھ میں چھ سال گزارے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک طالب علم کی ذہنی تربیت کے لیے علی گڑھ کی درس گاہ سے بہتر اور کوئی جگہ میری نظر میں نہیں۔ اس لیے ہم نے اپنی بیٹی نتاشا کو ایک سال کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ ویسے میں بڑا نالائق طالب علم تھا۔ پڑھنے پڑھانے سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، لیکن انجینئرنگ کے مقابلے کے امتحان کے انٹرویو میں کامیاب ہو گیا۔“

انیتا جی درمیان میں بولیں، ”ہاں! یہ بتانا نہ بھولے گا کہ آپ ایک کامیاب انجینئر بنے اور نارتھ امریکہ میں ون آف دی ون One of the One کا اعزاز حاصل کیا ہے۔“  
ڈاکٹر بیدار مسکرا کر بتانے لگے کہ وہ انگلینڈ میں منسٹری آف ٹرانسپورٹ میں پروفیشنل انجینئر رہے اور ٹورنٹو میں منسٹری آف ٹرانسپورٹ میں پرنسپل ریسرچ انجینئر بھی رہے۔ فی الحال وہ ایڈجنکٹ پروفیسر آف سول انجینئرنگ کی حیثیت سے یونیورسٹی آف ٹورنٹو سے منسلک ہیں اور جے ایم بی ٹی اسٹرکچر ریسرچ ان کارپوریشن ٹورنٹو کے صدر بھی ہیں۔ ۱۹۷۲ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک انہیں انجینئرنگ کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے پر امریکہ اور کینیڈا سے تیرہ (۱۳) ایوارڈ مل چکے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کے ادارے Who's Who میں ان کا نام درج ہے۔

”انجینئرنگ سے اردو ادب اور ترجمے کی منزل تک پہنچنے کی وجوہ کیا رہیں؟“  
”قصہ یوں تھا کہ میں تو انجینئرنگ اور کمپیوٹس سے دلچسپی رکھتا تھا مگر طالب علمی کے دور میں فیض احمد فیض کی ”دست صبا“ ملی جو ان دنوں بھی نایاب تھی۔ فیض ان دنوں ایک رومانوی نام تھا اور نوجوانوں کا مقبول ہیرو۔ میں نے ”دست صبا“ پڑھی کیا یوں سمجھے حفظ کر لی۔ بس اردو



شاعری کی طرف میرا رجحان وہیں سے ہوا۔ جب میری تعلیم ہوئی اور ملازمت کا سلسلہ چلا۔ علی گڑھ میں رشوت کا لین دین چند محکموں میں خوب تھا۔ مگر رانچی میں ایسا نہ تھا چنانچہ میں نے رانچی میں ملازمت کو ترجیح دی وہاں میں چار سال رہا۔ انیتا جی سے میری ملاقات ۱۹۶۴ء میں رانچی میں ایک کلچرل شو میں ہوئی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۶۶ء میں لندن آ گیا اور ۱۹۶۸ء میں ہم نے لندن میں شادی کی۔ میں نے اپنے والدین سے یہ شادی مخفی رکھی۔ مگر انھیں معلوم ہو چکا تھا اور پھر جب ہم نے اطلاع دی تو انھوں نے فراخ دلی سے اسے قبول کر کے مٹھائی تقسیم کی۔

کینیڈا میں ہم ۱۹۷۷ء میں آئے۔ یہاں ادبی انجمنوں کے ذریعے تقریبات میں آنا جانا شروع ہوا۔ یہ ۱۹۷۹ء کا سال تھا جو میری زندگی کا ایک اہم واقعہ یا موڑ ثابت ہوا۔ ٹورنٹو کے ایک مشاعرے میں علی سردار جعفری اور اختر الایمان بھی آئے ہوئے تھے۔ اختر الایمان کا قیام میرے گھر میں سا۔ مجھے ان کی شاعری تو ویسے پسند ہی تھی مگر ان سے نجی ملاقاتوں میں ان کی شاعری اور شخصیت کا ایسا اسیر ہوا کہ میرے دل میں ان کی شاعری کا ایک حصہ بن جانے کی تمنا جاگ اٹھی اور میں نے طے کیا کہ میں ان کے فن پر کام کروں گا۔

بیدار کچھ دیر کے لیے یادوں میں کھو گئے تو میں نے پوچھا، ”ایسی کوئی خواہش جو پوری نہ ہو سکی ہو؟“

”جی ہاں... اکثر یہ خواہش دل میں چٹکیاں لیا کرتی تھی کہ میں ”فیض“ کی سی شاعری کرنے لگوں، شاعری کرتا تھا، لیکن مطمئن نہ تھا۔ میں نے اپنا کلام سردار جعفری صاحب اور اختر الایمان کو بھی دکھایا۔ انھوں نے حوصلہ افزائی کی۔ مگر ہمارے شمس الرحمن فاروقی صاحب نے میری غزلوں کو ری جیکٹ کر دیا۔ کہہ دیا ”ہاں بس ٹھیک ہیں، ٹھیک ہیں۔“

”آپ کی غزلیں میں نے ”اوراق“ میں دیکھیں اور آپ کی نظم ”ہاؤس پلانٹ“ بھی پڑھی جو ”اوراق“ میں شائع ہوئی تھی۔ کیا آپ مجھے اس کی کاپی دیں گے؟“

”ضرور...“ بیدار نے کہا اور نظم کی فوٹو کاپی بنا کر میرے حوالے کر دی۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ نظم گفتنی کے قارئین بھی ملاحظہ کریں۔

## ہاؤس پلانٹ

بند مکان کے اک گوشے میں

اک شگفتہ بیڑا کھڑا ہے

تنہائی میں اس کی، میری اکثر باتیں ہوتی ہیں

اک صبح جب دھوپ میں اس کی ہر پتی جگمگ کرتی تھی



میں نے اس سے رشک میں پوچھا  
 جانتے ہو، تم کتنے قسمت والے ہو؟  
 آندھی، پالے، دکھ، بیماری  
 سب سے ہی محفوظ ہو تم  
 وقت ضرورت تم کو پانی، کھانا سب مل جاتا ہے  
 مفت کی توڑا کرتے ہو،  
 تم کتنے قسمت والے ہو،  
 پیڑ ہنسا اس بات پہ میری  
 بولا تم بھی میری محرومی سے ناواقف ہو  
 شیشوں کے اُس پار ہوا کی اٹھکلی کو دیکھ کے  
 میرے جسم کی ہر ہر پور چٹنے لگتی ہے  
 میری شاخیں شوخ پرندوں کے چھونے کو  
 رات اور دن ترسا کرتی ہیں  
 باہر کے پیڑوں کو دیکھو  
 ان میں چڑیاں گھر کرتی ہیں  
 اور مسافر چھاؤں میں ان کی دم لیتے ہیں  
 اور میں، میں تو بس اچھا لگتا ہوں

”جب میں نے شاعری ترک کی تو ترجمے سے رابطہ قائم کیا۔“ بیدار کہہ رہے تھے۔  
 فیض صاحب اور اختر الایمان سے ہمارا دوستی کا رشتہ تھا۔ میں نے پہلے تو کشور ناہید کی  
 نظموں کا ترجمہ کیا کیونکہ غزل کی نسبت نظم کے ترجمے میں کلام کی روح سمیٹی جاسکتی ہے۔ میں نے  
 پروین شاکر، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، بلراج کوئل، گوپال متل، میراجی، راشد، مخدوم،  
 مجروح، اختر الایمان وغیرہ کے کلام کے ترجمے کیے۔ میں نے منیب الرحمن صاحب کے کلام کا  
 مجموعہ مرتب کیا اور اس کا تفصیلی طویل دیباچہ بھی لکھا۔ (خن درختم میں اس کا حوالہ اور تذکرہ  
 جناب منیب الرحمن کے تعارف میں شامل ہے) فیض صاحب کا نام تو مشرق سے مغرب تک ایک  
 تحریک بن چکا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا نام ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح  
 کینیڈا میں ڈاکٹر خالد سہیل، ولی عالم شاہین، فاروق حسن اور امریکہ میں محمد عمر میمن نے اردو زبان  
 و ادب کی خدمت کے لیے ایک عمر وقف کر دی ہے۔

میں نے اختر الایمان کی ایک کلیات مرتب کی ہے۔ اب میں احمد آباد ہندوستان کے  
 مشہور شاعر محمد علوی کی شاعری کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد دیکھئے کیا بنتا ہے۔ پچھلے دنوں میں



نے مدافعتی کی ایک نظم پر جی۔ بندی کے لفظ استعمال کئے گئے ہیں مگر دیکھتے کیا رچاؤ ہے ان اشعار میں، عنوان ہے ”ماں“

میں کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں  
یاد آتی ہے چوکا، باسن، چمنا، پھلنی جیسی ماں  
اور آخری شعر کا مصرعہ یاد ہے کہ

بچے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں  
گو میں نے مدت ہوئی شعر کہنا چھوڑ دیئے مگر اب پھر میں شاعری سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ گو میں اب بھی ادب کا طالب علم ہی ہوں۔“  
ڈاکٹر بیدار بخت نے اب تک کئی مقالے لکھے ہیں اور سات آٹھ کتابیں ترجمہ بھی کی ہیں اور مرتب بھی...

ایک سوال کافی دیر سے ذہن میں اٹھل پھل مچا رہا تھا۔ سو میں نے پوچھ لیا۔  
”آپ نے ساقی فاروقی صاحب کے کلام کا ترجمہ نہیں کیا؟“  
”ان کی شاعری کا ترجمہ تو ہمارے گرو گھنٹال یعنی شمس الرحمن فاروقی نے کر رکھا ہے مجھ سے انھوں نے کہا تھا کہ تم کیوں نہیں کر رہے؟ میں نے کہا کہ جب فاروقی صاحب کر چکے ہیں پھر گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو آپ کو سنا دوں۔“ انیتاجی درمیان میں بولیں ”بیدار یہ ریکارڈ ہو رہا ہے۔“  
بیدار نے کہا ”کوئی بات نہیں۔“ پھر کہنے لگے

”اختر الایمان نے آصف فرخی کو ایک بار انٹرویو دیا تھا۔ آصف نے ان سے ساقی کی شاعری کے حوالے سے پوچھا تھا تو اختر الایمان نے کہا وہ ابھی تک فن کے عروج پر نہیں پہنچے۔ (یہ بارہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے) بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اب تک ن۔م۔م۔ راشد کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں۔ تو یہ ادیبوں کی ”چھیڑ خوباں“ ہے۔ مثال کے طور پر اختر الایمان چونکہ غزل سے زیادہ نظم کے حامی تھے لہذا غالب کے ایک شعر پر انھوں نے اپنی رائے دی کہ اگر یہ شعر نظم کی صنف میں ہوتا تو پھر کیا ہی بات ہوتی اس کی!“

بیدار کہہ رہے تھے اس بات کے حوالے سے جناب مشفق خواجہ نے لکھا کہ ”اگر غالب اختر الایمان کے مشورے پر عمل کرتے تو زیادہ ہی بڑے شاعر ہوتے۔“

اس لطیفے پر ہم سب خوب ہنسے۔ پھر بیدار نے کہا ”میں نے اختر صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ نے ساقی کے لیے کیوں کہا کہ وہ راشد کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں۔“ اختر صاحب نے کہا کہ ابھی ساقی کو بہت دور جانا ہے۔ انھیں تنقید سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

اب میں نے بیدار سے سوال کیا۔ آپ جن ادیبوں اور شعرا کے ساتھ رہے ان میں



کس سے متاثر ہوئے، کون اچھا لگا؟“

”اچھے تو سب ہی لگے اور جن کا کلام اچھا لگا ان کا ترجمہ بھی کیا اور ترجمے نے جو اپنی طرف راغب کیا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے بچے اور زمانہ حال کے دوسرے بچے جو اردو نہیں پڑھ سکتے وہ انگریزی میں میری تحریریں تو ضرور پڑھیں گے اور ان شاعروں اور ادیبوں کو بھی کہ جن کی تحریریں ہمارا علمی خزانہ ہیں۔ ایک بار میں بیگم اختر الایمان کے گھر تھا تو انھوں نے کہا کہ یہ دیکھو اختر صاحب کی اتنی بیاضیں ہیں۔ ان پر کام کرو۔ میں نے ان کا کلام دیکھا۔ فوٹو کاپی بنوائیں میں تو حیران تھا کہ اس شاعر نے کہ جس کا نام اختر الایمان تھا، ایسی ایسی نظموں کو چھوڑ دیا ہے کہ بقول ان کی نظم کے ایک مصرعے کے

کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

اسی عنوان سے میں نے ایک مضمون لکھا اور ان کی کلیات جو مرتب کی اس کے آخر میں وہ مضمون شامل کر لیا۔ میں نے ان کی ادھوری نظموں کو جمع کیا۔ اختر الایمان کی شاعری کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کا حال یہ تھا کہ اپنے مجموعے کے لیے کلام جمع کیا اور راشد کو دکھایا۔ ان۔م۔ راشد نے آدھے کے قریب کاٹ پیٹ کر نکال پھینکا۔ پھر میراجی کو دکھایا۔ انھوں نے بھی چھان پھنک کر جو بچایا وہ ۲۸ یا ۲۹ نظمیں تھیں۔ وہ خود اپنے کلام سے مطمئن نہ ہوتے تو رد کر دیتے۔ اچھی اچھی نظموں کو انھوں نے رد کر دیا تھا۔ مجروح کا بھی یہی حال تھا۔ ایک مجموعہ چھپا پھر اگلا مجموعہ بھی اسی نام سے چند نظموں، غزلوں کے اضافے سے شائع ہوا۔ اب اتنی محنت اور خود احتسابی کرنے والے کم رہ گئے ہیں۔“

”آپ اردو کے مستقبل سے پُر امید ہیں؟“ میرا اگلا سوال تھا۔

”دیکھئے! ہر زبان کی اپنی ڈانٹا مکس ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی اردو کو حکومت کی سرپرستی نہیں ملی مگر یہ زبان پھلتی پھولتی رہی۔ میں زبان کے بارے میں زیادہ جذباتی نہیں ہوں۔ یہی سوچ میری رسم الخط کے سلسلے میں بھی ہے۔ ہمیں خود کچھ نہیں کرنا۔ زبان اپنا تحفظ خود کروائے گی۔ اب سے دوسو برس پہلے اردو نام کی کوئی زبان نہ تھی۔ فارسی تھی۔ مگر اب فارسی کتنے لوگ جانتے ہیں؟ اب غالب کا فارسی دیوان ڈھونڈیئے آسانی سے نہیں ملے گا۔ لہذا حالات بدلتے رہتے ہیں۔“

”آپ نے ترجمے میں کسی سے معاونت لی ہے؟“

”ہاں! بغیر معاونت کے اپنے کام سے میں مطمئن نہ تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ تقریباً بیس سال قبل علی سردار جعفری کی ایک نظم ٹورنٹو میں ہماری پڑوسن نشا ثانی نے پڑھی اور پھر ان کی شاعری کے حوالے سے ہمارے درمیان تبادلہ خیال ہوا۔ میں نے جعفری صاحب کی کچھ نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور نشا ثانی سے سنوارنے میں میری مدد کرتی رہی، لیکن عملی تحریری طور پر میرا



پہلا ترجمہ اختر الایمان کی نظم بعنوان ”نظم کی تاشی“ تھا۔ اس کے بعد جیگار Jaegar کے تعاون سے ترجمے کا سلسلہ آگے چلا، لیکن کے تحصیلین جیگار انگریزی ادب کی پروفیسر ہونے کے ناطے مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال پاتی تھیں چنانچہ میری بعد کی معاون لیزلی لے ونگ (Leslie Lavigne) رہیں۔ وہ انگریزی کی شاعرہ بھی تھیں، چنانچہ ان کے ساتھ جو کام ہوا وہ خاصا اہم رہا۔“

”بیدار... آپ تو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر دسترس رکھنے کی وجہ سے اچھے ”کماؤ پوت“ ثابت ہوئے۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ بیدار ہنسے...

”آپ کیا سمجھتی ہیں اردو کے ناشر بہت پیسہ دیتے ہیں؟ زیادہ تر تو رائٹری نہیں دیتے۔ پچیس پچاس کتابیں احسان کے طور پر دے دیتے ہیں۔ کچھ ناشر رائٹری دیتے ہیں وہ میں اس شاعر کو دے دیتا ہوں جس کا کلام ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی کتابیں سالوں میں بکتی ہیں جبکہ انگریزی ترجمے نسبتاً جلد فروخت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب سے مالی فائدہ نہیں ہوتا مگر ہاں... اردو ادب پڑھ کر میں یقیناً امیر ہو گیا ہوں۔“

بیدار بخت کا چہر ان کی امارات کے پُر غرور غازے سے معتبر اور روشن روشن ہو گیا۔ کمرے میں بھی اس نرم روشنی کی کرن کرن ہنس رہی تھی اور کتابوں کے سرورق مسکرانے لگے تھے۔ اتنے ساحرانہ ماحول میں گفتگو بد مذاقی کا ثبوت ہوتی۔ چنانچہ میں ان ہنستی مسکراتی کتابوں میں گم ہو گئی۔

Dr. Baidar Bakht  
21 White Leaf Crescent  
Scarboough, ONTARIO  
MIV 3G1 CANADA





ہرگز جانے گا ان گلیوں میں ملے کا بجائی ہوئی  
نہ زخم آسمان سارا ستارہ لٹائے تنک ہے

پروین عاطف

## پروین عاطف

لاہور، پاکستان

بہت بہت دنوں کی بات ہے جب مجھے کسی نے پروین عاطف کی کتاب ”کرن، تہلی، بگوئے“ تحفہ دے دی تھی۔ میں کراچی سے اُسے ساتھ لے آئی، امریکہ آرہی تھی سفر طویل تھا۔ چنانچہ پروین کا یہ سفر نامہ سفر کا ساتھی رہا اور ایسا ساتھی کہ میں پڑھتی چلی گئی۔ پروین کی تحریر کی خوبی یہ تھی کہ ”وہ خود کو پڑھواتی رہی“۔ میں نے کتاب سنبھال کر رکھ لی کہ پھر پڑھوں گی اور اپنی ایک دوست ثریا انعام (مقیم سان فرانسسکو) کے توسط سے پروین کو ”گفتنی حصہ دوم“ کا سوال نامہ بھجوا دیا۔ جواب میں پتا چلا کہ پروین اب بریگیڈیئر عاطف کے ساتھ نہیں ہیں۔ بریگیڈیئر عاطف نے مبینہ طور پر دوسری شادی کر لی تھی۔

ایک خنجر سا چل گیا مجھ پر..... پروین کو دیکھنے، اس سے ملنے کے لئے میں بے چین ہو رہی تھی۔ جانے اب کب پاکستان جانا ہو۔ اور پھر کراچی سے لاہور۔ اسی زمانے میں پیاری نیلم بشر سے دوستی ہوئی۔ مونا شہاب نے بتایا نیلم اپنے بچوں سے ملنے نیویارک آرہی ہے۔ نیلم نے مجھے پروین کا دوسرا سفر نامہ ”پُر واسنی“ (بمعنی خانہ بدوش) بھجوا دیا۔ کتاب کے پتے پر پروین کی تصویر دیکھ کر میں پھر بے چین ہو گئی۔ اتنی پیاری دل موہ لینے والی عورت کے ساتھ ایسی بد قسمتی کا حادثہ کیوں ہوا؟ اپنی اس کتاب کے دیباچے بعنوان ”میں“ میں پروین نے لکھا.....



”اندر سے وہی چھپکلی سے ڈرنے والی مڈل کلاس عورت ہوں جسے ڈولی میں ہنکارتے وقت اپنا جنازہ شوہر کے گھر سے اٹھوانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اور جو اپروول (approval) کی خاطر ایڑیاں گھساتی بنا کچھ قابل ذکر کیئے وقت کے ساتھ عورت جنم سے مرثیہ تک خانہ بدوش ہے۔“

بلاشبہ کہ عورت خانہ بدوش ہے کہ اس کا کبھی کوئی ”گھر“ نہیں ہوتا۔ ماں باپ کے ساتھ رہے تو ماں باپ کا گھر، شوہر کے ساتھ رہے تو شوہر کا گھر اور بیٹوں کے ساتھ رہے تو بہوؤں کا گھر۔ شوہر نہیں نکلتا نہ ہی بہوویں نکلتی ہیں۔ اُسے تو نکلتا ہی پڑتا ہے۔

مگر میں پروین کے اس جملے سے متفق نہیں کہ بلا کچھ قابل ذکر کیئے وقت کے اتھاہ سمندر میں غرقاب ہو جاتی ہے۔ پروین تم نے اتنا جو کچھ لکھا ہے وہ تمہیں وقت کے اتھاہ سمندر میں غرقاب نہیں ہونے دے گا۔ دیکھو اب ایک صف اول کی ادیبہ، بانو قدسیہ، تمہارے بارے میں کیا لکھ رہی ہیں۔ (یہ تحریر پروین کے افسانوں کے تازہ بہ تازہ مجموعے ”میں میلی پیا اُجلے“ کی پشت پر موجود ہے)۔

”پروین عاطف ذہن اور قلب کا ایسا مکمل متناسب اور قابل رشک امتزاج ہے کہ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس دور میں اس جیسی عہد ساز تحریر شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی۔ آپس کی بات ہے اور مجھے علم ہے کہ آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں گے کبھی کبھی اس کی وطن پرستی کردار سازی، بیانیے کی رنگینی اور باریک بینی کو دیکھ کر میرا دل رشک کی سرحدوں سے گزر کر حسد کی جھڑپوں میں پڑ جاتا ہے۔“

بانو آپا نے سو فی صد سچ کہا۔ میں خود معترف ہوں کہ میں نے بارہا چاہا کہ پروین جیسی شگفتہ تحریر لکھنے کا ہنر مجھے بھی آئے۔ ممکن ہے کہ میری دعا کو کبھی شرف قبولیت حاصل ہو۔

پروین کے بارے میں تھوڑی سی معلومات پروین کے بھیا جناب احمد بشیر سے ملیں۔ ان کی صحافت اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا جب میں عامل صحافی (working journalist) تھی روزنامہ انجام، مشرق اور پھر جنگ میں ملازمت کے پندرہ سال کے دوران اور پھر اپنا ذاتی ماہنامہ ”روپ“ کی دس سالہ مدت۔ گویا ربع صدی صحافت کے نخلستانی صحرائی گزری۔ لیکن پھر بھی احمد بشیر صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھاگتی دوڑتی زندگی کا پل پل زنجیر پاتا تھا۔ لیکن جب جناب احمد بشیر کے لکھے خاکوں کا مجموعہ ”جو ملے تھے راستے میں“ پڑھا تو بریگیڈیئر عاطف کے متعلق لکھا خاکہ ”موچھا“ مجھے پھر پروین سے ملا گیا۔ لیکن یہ ملاقات مجھے اور زخمی کر گئی۔ اب پروین کی شخصیت کی، ایک عورت کی صحیح اور سچے موتی جیسی کھری تصویر دکھانے کے لئے ضروری ہے کہ احمد بشیر نے جو پروین کے لئے لکھا ہے میں ان ہی الفاظ میں وہ تصویر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ آپ خود دیکھ لیں۔

موچھا:

”حقیقت یہ ہے کہ میں عاطف کو نہیں جانتا۔ یا یوں کہیے اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اس روز جب وہ کراچی میں میرے چوہارے پر میری بہن کا رشتہ لینے آیا تھا وہ آکر سر کنڈے کے موہڑے پر بیٹھ گیا۔“



اس نے بڑی مختصر بات کی۔ میں نے بھی بڑی مختصر بات کی۔ وہ پُر وقار تھا۔ میں پُر اعتبار۔ اس نے بڑے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور وہ اچھے کپڑے ہی پہنتا ہے میں گھر میں شلو اور قمیص پہن کر بھی برہنہ لگتا ہوں۔ نہ اس نے کچھ تکلف کیا نہ میں نے۔

پروین میری بہن اس زمانے میں ایم اے میں پڑھتی تھی اور لاہور میں رہتی تھی وہ ایسی حسین لڑکی تھی کہ میں اس کا بڑا بھائی ہو کر چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اور سوچتا اللہ میاں تو نے یہ بہت کسی فرصت کی گھڑی میں گھڑا ہوگا۔ یہ چاند ہمارے صحن میں کیسے اتر آیا۔ پروین کے نین، کا جل بن کالے۔ اس کی کلاسیاں کجروں بنا مہکتیں۔ اس کے رخساروں کے گرد بھنورے منڈلاتے۔ اب اس نیلے گنبد کی ساری ٹانگیں اکھڑ چکی ہیں۔ مگر چھتر کی گولائی پر ابھی چاندنی چٹکتی ہے۔ وہ اردو کی صاحب طرز ادیب ہے مگر بد خط ہے اس لئے کم لکھتی ہے۔ لکھتی ہے تو عطف کے لئے جس نے اس کی کوئی تحریر کبھی نہیں پڑھی اس کی کتاب چھپی تو اس نے الماری میں رکھ دی۔

پروین کو ماں باپ اور میرے بھائی اختر سے جو مجھ سے چھوٹا اور اس سے بڑا تھا عشق تھا۔ وہ ایک کھلنڈرا شخص تھا۔ ایسا مزاح نویس میں کوئی پیدا نہ ہوا مگر وہ صرف چھ مضامین لکھ کر مر گیا۔ پروین سے اُسے بھی عشق تھا۔ دونوں دوست تھے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ پروین شادی نہ کرے گی اور پروین اس فیصلے پر قائم تھی۔ دراصل دونوں آپس میں کبھی جدانہ ہونا چاہتے تھے۔ مگر میں نے عطف کو فوراً ہی پسند کر لیا تھا۔

عطف اوپیکس کھیل چکا تھا۔ لمبا ترنگا پر اعتماد نو جوان، فوج میں کپتان، نڈل کلاس گھرانے کے لئے عمدہ بر۔ پروین صرف شادی پر اس لئے تیار ہو گئی کہ میں نے یعنی اس کے بڑے بھائی نے ہاں کر دی تھی اور ہمارے والدین بیٹی کی شادی کروینا چاہتے تھے اس پر اختر اور پروین گلے میں بانہیں ڈال کر روئے۔ وہ زمانہ آج کے زمانے سے بہت مختلف تھا۔

پروین کی ایک ہی لگن تھی تعلیم۔ وہ بہت ہونہار اور ارادہ مند لڑکی تھی۔ بچپن اس نے گاؤں میں گزارا تھا جہاں اسکول صرف چھٹی جماعت تک تھا۔ وہ چودہ برس کی تھی جب ہمارے والدین نے سوچا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ پروین والدین کے آگے کبھی نہ بولی تھی وہ ان کا بہت احترام کرتی تھی، ان کی محبت میں دیوانی تھی مگر تعلیم کا شوق لے کر وہ میرے پاس لاہور بھاگ آئی۔ اس ایک حرکت کے سوا اس نے والدین کی نافرمانی کبھی نہیں کی۔ ادھر کچھ میں نے سمجھایا کچھ ہماری والدہ نے زور ڈالا۔ ہمارے والد قدر امت پسند ہونے کے باوجود بہت لکھنے پڑھنے آدمی تھے وہ بھی مان گئے پھر پروین اور ہماری دوسری بہن ثریا نے گھر میں بیٹھ کر ادیب فاضل پاس کیا اور دونوں مدرستہ البنات گرلز اسکول میں داخل ہو گئیں۔ وہاں پروین نے میٹرک پاس کیا پھر بی اے کیا اور پھر یونیورسٹی میں چلی گئی جہاں وہ غیر معمولی طالب علم شمار ہوئی۔

عطف نے کہا میں فوراً شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پروین فاضل میں تھی اور چند مہینوں کی مہلت



مانگتی تھی یہ مہلت عاطف نے اسے ندی اور دروہ روتی دھوتی ڈولی میں بیٹھ گئی۔  
اس زمانے میں مجھے پتا نہیں تھا کہ عاطف ایک ضدی بچہ ہے۔ چاند مانگتا ہے تو لے کر چھوڑتا  
ہے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ چاند سے کم کوئی کھلونا مانگتا نہیں۔

اب آگے ان دونوں کی شادی کی باتیں ہیں مجھے حق نہیں کہ کچھ کہوں لیکن اگر مجھے عاطف پر  
کچھ لکھنا ہی ہے تو پھر مجبوری ہے وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوگا، پروین منہ بگاڑے گی مگر میں قلم ہاتھ میں  
لیتا ہوں تو جس طرح عاطف ہاکی ہاتھ میں لے کر دنیا و مافیہا سے اعلق ہو جاتا ہے اسی طرح میرے  
رشتے بھی سب سے کٹ جاتے ہیں پروین بگڑ کر بھی میرا کیا کر لے گی۔

تو میں نے یہ سنا کہ عاطف نے پہلی رات ہی پروین کی پٹائی کی اس لئے پٹائی کی کہ تم اتنی  
خوبصورت کیوں ہو۔  
وہ واقعی قصور وار تھی۔

مگر عاطف نے اس کی عزت کی۔ اسے بہت سنبھال کر ڈرائنگ روم کی دیوار کے ساتھ  
لٹکا دیا۔ وہ سویرے اٹھ کر تصویر کی جھاڑ پونچھ کرتا اس کے گرد پھولوں کے تازہ ہار لٹکاتا پھر اپنے عمار میں  
اتر جاتا۔ پروین کہتی ہے جہاں رہے خوش رہے۔ مجھے روٹی کپڑے کی تکلیف نہیں دیتا۔ میری بچیوں  
اور دامادوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ بیٹیوں کی ضروری اور غیر ضروری خواہشات پوری کرتا ہے۔ وہ  
ایک مغل منصب دار ہے جو چاہے کرے۔ مجھے بھی اب اس سے محبت نہیں۔ اس سے رشتہ داری ہے۔  
مگر وہ جھوٹ بولتی ہے وہ ایک شمع ہے جب جلتی ہے تو اس کی بوند بوند پکارتی ہے۔ عاطف۔ عاطف۔  
مگر عاطف تو کنہیا ہے، گوری کا چرواہا ہے۔ جاتا ہے تو پروین اس کے قدموں کے نشانوں کی آرتی  
اتارتی اور بھجن گاتی ہے۔ اس خیال سے کہ شاید کبھی کاہن بھی مرلی بجا دے مگر صنم کبھی بولے ہیں جو  
عاطف بولے۔ پروین یہ حقیقت جانتی ہے مگر وہ اذیت پسند ہے۔ قدموں میں پڑی خوش رہتی ہے۔  
سچ پر چڑھ جاتی ہے تو مین کرتے زندگی گزار دیتی ہے۔ سچ ہے اللہ کسی کا حق نہیں مارتا۔

عاطف کا پیدائشی برج عقرب ہے۔ عقرب لوگوں کی دو خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ عقرب لوگ  
ایک تو ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔ جس مہم کا تہیہ کر لیتے ہیں اسے سر کر کے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ من کے بھید  
کسی کو نہیں بتانے۔ یہ خصوصیات قدیم انسان کی خصوصیات ہیں۔ میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ  
عاطف اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایک پری میٹو آدمی ہے اردو میں مجھے اس کا مساوی لفظ نہیں آتا۔

پروین کے لئے احمد بشیر صاحب کا لکھا اتنا ہی کافی ہے۔ اب وہ ہی پروین میرے سامنے  
ہے۔ ”پٹرواسنی“ پر چھپی ہوئی تصویر سے مختلف۔ بردبار اور معتبر سی شخصیت کے سحر میں لپٹی لپٹائی۔  
آنکھوں میں وہ ہی معصوم سی چمک ہے لیکن ماند سی۔ پروین ایمن آباد ضلع گجراں والہ پنجاب کی رہنے  
والی ہے۔ ۱۳/ اپریل ۱۹۳۶ء اس کی تاریخ پیدائش ہے۔ میری ۶/ اپریل ہے۔ اس لئے پروین کی  
بہت سی باتیں مجھ میں بھی ہیں۔ کیوں کہ دونوں Aries ہیں (برج حمل) ایمن آباد میں رہنے والوں



کے بارے میں ممتاز مفتی مرحوم کہہ گئے ہیں کہ انہیں باتیں کرنی آتی ہیں۔ ایسی دل چسپ اور تعمیل باتوں کے جال بچھا دیتے ہیں کہ ٹھننا محال ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں یہ گفٹ انہیں کہاں سے ملا۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہونے والے پروین کے افسانوں کے مجموعے ”میں میلی پیا“ اگلے ”کاشتہا ریا اعلان“ میں نے ماہنامہ ”تخلیق“ لاہور میں پڑھا اور کسی سے گزارش کی کہ وہ خرید کر مجھے بھجوا دیں۔ یہ کام جاوید اختر چودھری کی بہن طیبہ اصغر نے کیا اور مرزا اصغر نے بہ اہتمام یہ کتاب مجھے دینہ جہلم سے خرید کر انگلینڈ لا کر دی۔ سرورق کی تصویر اتنی خوب صورت ہے کہ کوئی صاحب ذوق اسے فریم کرا کے اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنالے تو داد پائے۔ مگر اندر پروین کے افسانوں کے علاوہ پروین کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔

”پروین تم اتنا کم کیوں بولتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بولتی تو ہوں۔ چلئے اب زیادہ بولتی ہوں۔ آپ کا ادب سے لگاؤ اور محنت قابلِ داد ہے۔ آپ جیسی مخلص ہستیوں پر ہم لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ حاصل کرنے کی خواہش مند ہوں۔ اور..... اور.....“

”پلیز پلیز پروین۔ میں نے ایسا کچھ بولنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ میں تمہارے اپنے بارے میں، ادب کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے اپنے افسانوی مجموعے کا نام کہاں سے لیا؟“

”ہوا یوں کہ.....“ پروین جیسے داستان گو ہو۔ داستان گو کی طرح ہی اس کی بانی میٹھی ہے کہہ رہی تھی..... ”قصہ یوں ہوا کہ دراصل امیر خسرو کا ایک گیت ہے۔ جو بھائی احمد بشیر نے اپنی فلم ’نیلا پرست‘ میں لیا۔ ان کی فلموں کے گیت حفیظ جالندھری اور ابن انشا جی نے لکھے تھے۔ کہانی ممتاز مفتی کی تھی اور ڈائلاگ احمد بشیر (میرے ویر) کے تھے۔ اس میں یہ دو حایا گیت تھا

میں میلی پیا اگلے پھر کیسے ملنا ہووے

ہاتھ چھڑاوت جاؤ ہو بے بس جان کے موہے

دل سے جب جئی تو میرے تب مرد کہوں گی تو ہے

میں میلی پیا اگلے پھر کیسے ملنا ہووے

پروین کہہ رہی تھی..... ”سوشیا لوجی میں ایم اے کے بعد میرا جی مطالعہ میں زیادہ لگتا تھا۔ شادی بھی جلدی ہو گئی۔ اس زندگی کی اپنی مصروفیات تھیں ممتاز مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی اور کہنے پر میں نے لکھنا شروع کیا اب بھی منٹو، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، ارون دھتی رائے، امریتا پریت، عصمت چغتائی، جارج ایلٹ اور ہیمنگ وے کو دل چسپی سے پڑھتی ہوں۔ لیکن افسوس میرے بچوں کو اردو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ میری کتابیں نہیں پڑھتے۔ اس کی شکایت مجھے اپنے آپ سے ہی ہونی چاہیے۔ یا اس زمانے سے جس میں بسنے والے روزگار کے حصول کی دوڑ میں خود سے بھی بچھڑ گئے ہیں۔ میری اپنی عمر عزیز لا حاصل کے پیچھے بھاگتے گزر گئی۔ میں نے بہت کام کیا جیسے خواتین کے



کھیل، فلم، ڈرامہ، تھیٹر، سماجی کام وغیرہ وغیرہ لیکن کثیر المقاصد ہونے کی وجہ سے کوئی ایک منزل سامنے نہیں آتی۔ بس یہ تعین کتابیں ہیں۔ دو سفر نامے اور افسانوں کا ایک مجموعہ (۱) کرن، بتلی اور بگولے (۲) ٹرو وائی اور میں میلی پیلا جلتے۔ اور یہ جو آپ نے پوچھا کہ میں لکھنے کے لئے کن موضوعات کا انتخاب کرتی ہوں۔ لیکن میں نے کبھی جان بوجھ کر موضوع نہیں چنا۔ کوئی واقعہ، کوئی احساس یا کوئی تجربہ حسیات پر طاری ہو جائے تو لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ جیسے لاہور کے نزدیک غریب عورتوں کا گینگ ریپ تو مجھے کہانی ’نافیاں‘ لکھنے کی تحریک ہوئی۔“ پروین خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات اس وقت بھی نمایاں تھے۔ میں نے موضوع کی تبدیلی کے لئے کہا۔ ”پروین اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سناؤ جو اس وقت یاد ہو۔“

”زندگی کے ان گنت دل چسپ واقعات ذہن سے فراموش ہو چکے ہیں لیکن ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں گھر کی چھت پر تنہا گھوم رہی تھی۔ چاند گگن جگمگا رہا تھا شاید چودھویں کا تھا۔ مجھے لگا وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ میں نے از خود اس کی طرف دیکھ کر چیلنج کے طور پر اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ان دنوں چھتوں کے درمیان سلاخوں کے جنگلے ہوا کرتے تھے۔ شاید روشنی اور ہوا کی خاطر۔ اُنہیں پنجابی میں ’مگ‘ کہا جاتا ہے۔ چھوٹے شہروں کے پرانے مکانوں میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ چاند کے ساتھ ساتھ مسلسل چلنے کی ایکسٹنٹ میرے ذہن میں آج بھی تازہ ہے۔ رفتار کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ مجھے لگا جیسے میں نہیں وہ میرے تابع ہے۔ غرور کا سر نیچا۔ اُسی گھڑی میرا پاؤں مگ پہ پڑا جو کھٹا تھا۔ پھر مجھے شدید خوف کی وہ گھڑی بھی یاد ہے جب میں کسی طرح اُس کی ایک سلاخ سے لٹکی زندگی اور موت کے درمیان چیخیں مار رہی تھی۔ نیچے سے تمام بزرگوں کی بھاگ دوڑ اور مجھے جوں توں لٹکے رہنے کی تلقین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری ماں کا برا حال تھا۔ چند منٹوں میں بزرگوں نے نیچے سرکس والوں کی طرح چادروں کو آپس میں باندھ کر ایک چھت سی بچھا دی اور مجھے اس کے اندر چھلا لگ لگانے کو کہا..... میں ہار گئی اور فطرت جیت گئی۔ اور فطرت تو ازل سے بھی پر اسرار اور طاقتور ہے۔

دوسرا اہم ترین واقعہ میری زندگی کا نیویارک میں ہونے والا ۹/۱۱ کا 'ٹوئین ٹاورز' کا ہے۔ جس نے مغرب کی جانب سے مسلم دنیا پر بے وجہ جارحیت کا آغاز کیا۔ اور اب جس کے انجام کے بارے میں کوئی پیش گوئی ممکن نہیں۔ یا پھر سقوطِ ڈھاکہ۔ جس نے پاکستانی حاکموں اور فوج کی اپنے ہی وطن سے برتی خود غرضی اور ظلم کو بے پردہ کیا۔

پروین کی بیشتر کہانیاں پاکستانی حاکموں کی خود غرضی اور وطن میں پھیلی ہوئی لاقانونیت پر مبنی ہیں۔ وطن سے محبت پروین کی رگ و پے میں لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ وہ اس محبت کی بنا ایک سانس بھی نہیں لے سکتی۔ پروین کی تحریروں میں روانی ہے۔ فنی مذاکعتیں پوشیدہ ہیں۔ استعارے روشن قندیلوں کی مانند ہیں جو قاری کے لئے آگے جانے اور آگے جانے کی راہیں روشن کرتی ہیں۔ پروین کی کہانیاں



چاہے وہ 'نافیاں' ہوں، 'مائی' فی میں کنوں آکھاں، ہو یا 'مجھے' موسموں سے ڈراؤ 'مست' ہو یا پروین کے سفر نامے ہوں پنجاب کی سکہ بند زبان کا استعمال کہانی میں نشہ آور کیفیت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ زبان و بیان کی مناسبات ان چند جملوں میں شہد و شکر کی طرح گھلی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے.....

نہیں تو اس کی اب عمر کی وجہ سے پتلی کاغذ کی گندی جیسی ہو چکی تھی (نافیاں)۔

زمین دار وحید چیمہ کے مشنڈے بیٹوں کی دھمکیوں اور گالیوں نے اس کے خون میں نیلا

تھوٹھا گھول رکھا تھا (نافیاں)

لوگ کہتے ہیں شالی کی امی کے پاس باتوں کے ورقوں کی سنہری تھدیاں ہیں۔ بات

کرتے کرتے سنہرے سے بھر جاتا ہے سارا ماحول (مائی فی میں کنوں آکھاں)

ایک گرین کارڈ والی امریکی لڑکی سے بلا معاوضہ کاغذی شادی رچا کر میں نے اپنی آنے

والی پاکستانی مہاجر نسلاں کے لئے امریکی گلوبلائزیشن کے اونچی اڑان والے جہاز میں نشستیں

بک کروالی تھیں (مسافر ہوں یا رو)۔

پروین نے مجھے لکھا تھا.....

”میرا ذاتی تاثر یہ ہی ہے کہ میرا شمار مقبول ترین ادیبوں میں نہیں.....“

پروین کے اس جملے پر مجھے محترمہ بانو قدسیہ کا کہا یاد آ رہا ہے.....

”پروین ایسا ادب پیدا کر سکتی ہے کہ اس کے قاری محبت کی ایسی تلافی کریں گے جو ان

بادلوں سے ممکن نہ تھی جو بن بر سے اس صحرا سے گزر گئے۔“

پروین عاطف! میں بانو قدسیہ آپ کی اس رائے سے متفق ہوں۔

Ms Parveen Atif,

117 J Model Twon, Lahore, Pakistan





زندگی کو حوصلے دینے لگے  
اب مجھ سے بچتے بڑے ہونے لگے

پروین لاشاری

۶-۱۲-۲۰۰۳

## پروین لاشاری

لندن، برطانیہ

کسی بھی افسانہ نگار کی کہانیوں کی کامیابی کا دار و مدار کہانی کے موضوعات میں نئے پن کے ساتھ ساتھ کہانی برتنے کے انداز پر بھی ہوتا ہے۔ اردو افسانے کا رشتہ داستان، حکایت، مذہبی روایتوں اور قدیم اساطیر سے جڑا ہوا ہے۔ نئے لکھنے والوں نے موجودہ دور کی افسردگی اور کش مکش حیات کو تخلیقی آئینہ دکھایا ہے۔ داستان کی روایت سننے سنانے کی تھی۔ بیسویں صدی میں افسانے کا ارتقا ایک تحریری صنف کا ارتقا ہے۔ اور اب موجودہ صدی میں ہم پھر پیچھے کی طرف جا رہے ہیں اور داستان کو کہانیوں میں سمیٹ کر قوت اور عادت باصرہ کے ساتھ ساتھ سامعہ کو بیدار کر رہے ہیں۔ اب افسانہ نگار اور شعرا اپنی کہانیاں، اپنے کلام کو سی ڈی (CD) پر منتقل کر کے داستان سنانے کی سالوں پرانی روایت کی تجدید کر رہے ہیں۔

کچھ عرصے پہلے لندن میں رہنے والی معروف افسانہ نگار اور شاعرہ پروین لاشاری نے بھی اسی میدان میں قدم آگے بڑھایا ہے۔ ان کے افسانوں اور غزلوں کے سی ڈی (CD) بعنوان ”یادوں کے کاغذ پر لکھوں“ کی تقریب اجرا لندن میں منعقد ہوئی اور شہر کا تقریب نے خاصی پذیرائی کی۔ اس سی ڈی پر پروین کی گیمپھر رومانٹک آواز میں بارہ افسانے اور دو غزلیں منتقل کی گئی ہیں۔



پروین کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ماہنامہ ”پرواز“ لندن کے مدیران جناب ساحر شیوی اور جناب صابر ارشد عثمانی نے اکتوبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں ایک خصوصی گوشہ شائع کیا ہے۔ اس میں ساحر شیوی صاحب نے پروین کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔

اندھیرے دور اس نے کروئے یورپ کی راہوں سے      ضیائے جاوہ اردو زباں پروین لاشاری  
لبودے دے دے کے پالا ہے ہمیشہ گلشن اردو      گلستانِ ادب کی باغباں پروین لاشاری  
اسی شمارے میں لندن کے معروف شاعر اعجاز احمد اعجاز نے بڑے نفیس انداز میں پروین کو منظوم خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

ترنم سن کے اس کا پتھروں کے دل پکھلتے ہیں      کہیں کلیاں چٹکتی ہیں کہیں سورج نکلتے ہیں  
انوکھے گیت اس کے ریڈیو پر ایسے ہوتے ہیں      محبت کرنے والے جس طرح خلوت میں ملتے ہیں  
دورانِ گفتگو پروین نے بتایا کہ انہوں نے شعر کہے لیکن کم کم۔ نثر زیادہ لکھی۔ ان کے افسانے اور کلام ماہنامہ ”سیپ“ اور ”افکار“ کراچی، ”شمع“ اور ”میسویں صدی“ دہلی کے علاوہ لندن کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن انہوں نے اپنی تخلیقات کو کتابی شکل دینے کے بجائے سی ڈی پر منتقل کرنا زیادہ مناسب جانا۔ اس کی وجہ بقول پروین یہ رہی..... ”فی زمانہ مغربی دنیا میں مطالعے کے لئے وقت نکالنا اور وہ بھی خصوصاً اردو زبان کے ادب کے مطالعے کے لئے خاصا مشکل مسئلہ ہو گیا ہے۔ ریڈیو اور سی ڈی تو لوگ سفر کے دوران کار میں بھی سنتے ہیں اور کیسٹ کے ذریعے بھی۔ ریڈیو کے ذریعے مغرب میں نئی نسل کی تعلیم کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ بلاشبہ اس سے کتابی مطالعے کو نقصان پہنچے گا لیکن دور جدید کی ٹیکنیک سے فیضیاب نہ ہونا بھی کفرانِ نعمت ہوگا۔“

پروین نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ چوں کہ وہ خود ریڈیو کی دنیا سے ایک طویل عرصے سے وابستہ ہیں اس لئے ان کا تجربہ ہے کہ کتاب کی طباعت سے سی ڈی بنانا زیادہ آسان ہے۔ خود پروین کی ریڈیو سے وابستگی ان کی نو (۹) سال کی عمر سے ہے جب پروین نے ریڈیو پاکستان، کراچی سے بچوں کے پروگرام ”بھائی جان“ میں حصہ لینا شروع کیا تھا اور یہ سلسلہ ان کا شادی تک جاری رہا۔ شادی کے بعد پروین لندن آ گئیں اور بی بی سی کی ورلڈ سروس سے وابستہ ہو گئیں۔ ۱۹۷۷ء سے پروین نے بی بی سی ٹیلی ویژن میں حصہ لینے کا آغاز کیا۔ تب سے اب تک بی بی سی کے مختلف چینلوں پر پروگرام دے رہی ہیں۔

میں نے پروین سے پوچھا کہ ان کے افسانوں کے موضوعات عام طور پر کیا ہوتے ہیں؟ پروین نے تفصیل سے بتایا..... ”میرے ارد گرد جانے پہچانے مگر لبو لبہاں چہرے ہیں۔ میں نے جس مٹی میں نمونپائی ہے میری تخلیقات جن ماحول میں پروان چڑھی ہیں میں ان ہی کی تصویر کشی کرتی ہوں۔ ویسے میرے افسانوں کے زیادہ تر موضوعات یہاں کی زندگی اور اس کے مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے یہاں اپنی تہذیب کو اور اپنی قدروں کو دم توڑتے دیکھا ہے۔ جس طرح اپنے احساسات کو مجروح



ہوتے دیکھا ہے اس کے منتوش کاغذ پر اتار دیئے ہیں۔ میرا شعر ملاحظہ ہو۔

یادوں کے کاغذ پہ لکھیں شکوں سے میں دل کی بات      شعر و ادب کی دنیا ورنہ کون سی دیکھی بھالی ہے

کالم نگار ثروت اقبال نے پروین کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”پروین کے اکثر افسانوں کے کردار وہ خود ہوتی ہیں۔ پروین کے افسانوں کی ہیروئن کوئی انجان نہیں بلکہ ایک جانی پہچانی شخصیت نظر آتی ہے۔ ایک ایسی شخصیت جو اپنے حالات سے خوش نہیں۔ لیکن ان کے ساتھ گزارا کرنا جانتی ہے۔ یہ تاثر ان کا افسانہ ”دو بول“ پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔“

معبر افسانہ نگار محترمہ صفیہ صدیقی کہتی ہیں۔ ”پروین کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ان کا انداز بیان ہے۔ وہ محاوروں سے پر ایسی خوب صورت زبان لکھتی ہیں جسے آج کل استعمال کرنے والے لوگ کم کم ہیں۔“

صفیہ کے کہنے کی تصدیق پروین کے افسانے ”اماں“ میں لکھے گئے ان جملوں سے ہوتی ہے۔ ”زلیخا کے سارے ناز ساس اماں نے اٹھائے۔ پیٹ جا پے کے دن پتا بھی نہ چلے اور گزر گئے۔ سوا مہینے چار پائی توڑی اور سر ہانے رکھا کترا ہوا میوہ چنگی چنگی کھایا۔ چھری کا نسا پکڑنے کی بھی ممانعت تھی کہ کچے دن تھے جو کہیں کلائی مڑ مڑا گئی تو زندگی بھر کا روگ پل جائے گا۔ وہ وہی مستیوں کی نیند سوتی رہی اور اماں کو رت جگے کراتے ان کے سینے پر گودتے عمو تین سال کے اونٹھا ہو گئے۔“

اسی کہانی ”اماں“ میں جب اماں بہو زلیخا کی زچگی نمٹانے برطانیہ آتی ہیں تو دو تہذیبوں کے تصادم کا شکار ہو کر کہتی ہیں۔ ”یہاں کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں۔ جسے دیکھو ہوا کے گھوڑے پر سوار، نہ پاس پڑوس والے آکر جھانکیں نہ پھیری والے گزریں۔ صبح سے شام تک منہ کو گوند لگا رہتا ہے۔“ بیٹے بہو کی موجودگی کے باوجود اماں تنہائی کے عذاب سے گھبرا کر واپس چلی جاتی ہیں اور پھر ان کا خط آتا ہے جس میں انہوں نے بہو کو لکھا ہے ”اپنا خیال رکھنا۔ زیادہ اوپر سے نیچے مت کرنا۔ تمہارے باورچی خانے میں اوپر کی الماری میں گوند، مکھانے کی برنی اور وہیں کترا ہوا میوہ بھی رکھا ہے۔ برابر کھاتی رہنا اور ہوا سے بھی بچنا۔ ہوا سے احتیاط ضروری ہے۔“

تب زلیخا مٹھی میں وہ خط بھیج کر بے اختیار رو پڑی۔“

نئی تہذیب کی لانگھی نے مشترکہ خاندان کی قدروں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ ماں یا بوڑھے باپ کو سوچنا پڑتا ہے کہ بقیہ زندگی گزارنے کے لئے کس نئے دروازے پر دستک دیں جہاں انہیں پناہ ملے کہ وہ گھرا ب ان کا نہیں بہوؤں کی ملکیت بن جاتا ہے۔

محسنہ جیلانی، جو خود ایک بہت اچھی افسانہ نگار ہیں، پروین کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔ ”پروین کی کہانی منافق، اقتصادی ناہمواری، غربت، محرومی اور دل کے نازک نو خیز جذبوں کی تشہیر کی کہانی ہے، بے ایمانی اور مرد کی منافقت کی کہانی ہے اور ”دو بول“، بے جوڑ رشتوں کی کہانی ہے۔ پروین کی کہانیاں ”اماں“ اور ”منتر“ زندہ رہنے والی کہانیاں ہیں۔ ہماری تہذیب میں اب پرانے رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔ ماں اور ساس کی افادیت اسی وقت تک ہے جب کہ ان کی ضرورت ہو۔“



جانی پہچانی اور مانی ہوئی افسانہ نگار بانو ارشد نے پروین کی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔ ”پروین نے عصمت چغتائی، بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، حجاب امتیاز علی اور دیگر ادیبوں کا خوب مطالعہ کیا ہے اور وسیع مطالعے کی بنیاد پر خوب سے خوب لکھ کر اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ اسی لئے متعدد ایوارڈ بھی جیتے ہیں۔ انہوں نے بہترین صداکار کا ایوارڈ، ریڈیو ڈرامے لکھنے اور پھر انہیں پروڈیوس کرنے کا ایوارڈ (رائٹر اینڈ پروڈیوسر کی حیثیت سے) بھی حاصل کیا ہے۔ پروین انتھک محنت اور جدوجہد کے ساتھ زندگی کے نشیب و فراز سے گزریں اور کبھی شکست نہیں کھائی۔“

پروین لاشاری ۱۳ دسمبر کو نوشہرہ، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ گورنمنٹ کالج برائے خواتین کراچی سے گریجویشن کیا جہاں وحیدہ نسیم، سلمیٰ شان الحق حقی اور مسز عباس نے تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی تربیت بھی کی۔ ان کی پہلی کہانی ”گجرے“ کراچی سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے ”بھائی جان“ میں چھپی۔ اس وقت پروین گیارہ برس کی تھیں۔ اس کہانی میں ایک ایسی بچی کا ذکر تھا جس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ روزانہ شام کو کیاری سے پھول توڑ کر گجر بناتی کہ شاید کبھی اس کی ماں جو اسے تین ماہ کا چھوڑ کر چل بسی تھی لوٹ آئے اور وہ اسے گجر اپیش کر سکے۔

پروین نے کہا۔۔۔ ”وہ بچی کوئی اور نہیں میں تھی۔ محرومی کا یہ پہلا احساس جسے میں نے محسوس کیا اسے جوں کا توں قلم کے ذریعے کاغذ پر اتار دیا۔“

پروین کو اپنے گزرے دنوں میں سے وہ دونوں کبھی نہیں بھولے ایک وہ جب انہوں نے پہلا ریڈیو پروگرام دیا اور دوسرا جب ان کی پہلی کہانی چھپی۔ خوشی اور کامیابی کے وہ جذبے اور ان کی دھنک دل میں، ذہن میں اور تصورات میں محفوظ ہے۔

افسانہ نگار اور براڈ کاسٹر جناب رضا علی عابدی کو آپ ہم اور اردو زبان و ادب کے سب سے شائقین جانتے ہیں۔ رضا علی عابدی نے پروین کے لئے یہ بڑی خوب صورت بات اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ ”براڈ کاسٹنگ میں ان کی خوبیوں کا ایک سبب ادب سے ان کا لگاؤ بھی ہے۔ نہایت شستہ اور شگفتہ شعر کہتی ہیں اور اسی کی دین ہے کہ الفاظ کی نشست و برخاست اور وقتوں اور سکوت کا ذہب انہیں خوب آتا ہے۔“

اور کیوں نہ ہو۔ بقول رضا علی عابدی، ”پروین کو لاشاری صاحب جیسے شوہر ملے ہیں جن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی بیوی کی خوبیوں کو اور ابھارنے میں پورا پورا ہاتھ بٹاتے ہیں۔“

لیکن اگر پروین میں وہ خوبیاں ہی نہ ہوتیں تو؟ جیسے مہر النساء (نور جہاں) نے شہزادہ سلیم کے سوال ”یہ کیو تر کیسے اڑے گا؟“ کے جواب میں اپنے دونوں ہاتھ میں پکڑا دوسرا کیو تر اڑا کر نہ دکھا دیا ہوتا تو مستقبل کا جہانگیر ان کی اس ادا پر کیسے مر مٹتا؟

Mrs. Perween Lasharie,

19 D, Porchester Square, Bayswater, London, W2 6AN, UK





”مجھے دیکھ کر مانے ہوئے ان فواہیں سے حشمت ہے  
جو نفل کرنے والوں کو تو یہاں سی کی سزا دیتے ہیں مگر نوح  
کو نعلے والے آزاد رہتے ہیں  
تبسم علوی  
۱۱/۱۲/۲۰۲۲

## تبسم محسن علوی

جدہ، سعودی عرب

میں تبسم کو بھی نہیں جانتی تھی اور محسن علوی کو بھی نہیں، اور جب شناسائی ہوئی تو تھوڑے ہی عرصے میں محسن علوی بھائیوں کی طرح لگے اور تبسم، ایک دوست اور بہن کی مانند سامنے آئیں۔ دونوں میاں بیوی کی خوبی یہ ہے کہ ایک ان میں سے شاعر ہے اور ایک نثر نگار۔ دونوں نے قلم کو پیشہ بنالیا ہے۔ راہ کے پتھر کو کاٹ کر صحران کو گلزار بنانے کی سعی میں دونوں مصروف ہیں۔

محسن علوی کا حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ کلام کا مجموعہ ”وارثی“ میرے سامنے ہے۔ حضرت درو کا گوروی کے نواسے محسن علوی اپنی خاندانی روایت نبھارہے ہیں۔ خانہ خدا کے شہر مکہ کے قریب جدہ میں رہتے ہیں اور عشق رسول میں سرشار ہیں۔ خود کہتے ہیں اور حرف حرف سچ کہتے ہیں۔

جب سے در نبی کا میں ادنیٰ غلام بن گیا وقت نے مجھ سے یہ کہا جا! تیرا کام بن گیا تبسم ان ہی محسن کی شریک حیات ہیں۔ اپنی خاندانی روایات، اپنی تہذیب اور وطن کی محبت کے گہر پاروں سے آراستہ ہیں۔ ان کے اصلاحی افسانوں کا پہلا مجموعہ بعنوان ”آدم و حوا“ شائع ہو چکا ہے۔ اور اس کی پزیرائی نے ان کے حوصلوں کو توانائی بخشی ہے۔ اس کے بعد سے تبسم نے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور جولائی ۲۰۲۰ء میں ان کا ناول ”تحریم“ منظر عام پر آیا۔ مہتر مہ شریا بیچا نے لکھا، ”تحریم



جدید دور یا آنے والے دور کے حقائق پر مبنی ایک خوب صورت، نتیجہ خیز کہانی ہے جس میں اصلاح کا پہلو سب سے نمایاں ہے۔ نئے جغرافیے، نئے مسائل، نیا ماحول، اجنبی لوگ بلکہ افسوس یہ ہے کہ اب تو اپنے بھی غیر ملکوں میں آباد ہونے کے بعد رشتے بھول کر اجنبی بن گئے ہیں۔ امریکہ کے شہر میں یوب میں بیٹھی ایک معصوم پاکستانی لڑکی کا اداس، فکر مند اور بے بس چہرہ دیکھ کر کسی سنجیدہ باشعور پاکستانی نوجوان کا یہ پوچھ لینا "کیا آپ کو ہلپ ہو (Can I help you) کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں" تحریم ناول کا نقطہ آغاز بھی ہے اور انجام بھی جو اپنے اندر خوب صورت جذبول کی کہانی سموئے ہوئے ہے۔

"تحریم" کا کردار وہ معصوم پاکستانی لڑکی کوئی ہو مجھے تو تبسم بھی اسی طرح کی معصوم لگتی ہیں۔ اپنی تحریروں میں تبسم خود بولتی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "آدم و حوا" میں ان کی ایک کہانی "رشتوں کی مہک" کا یہ جملہ پوری کہانی کا پس منظر بیان کر دیتا ہے جب عالیہ اپنے شوہر منصور سے کہتی ہے۔ "دیکھو نا یہاں لندن میں ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر اس کے باوجود مجھے ہمیشہ ادھر سے پن کا احساس تڑپاتا رہتا ہے۔ اکیلے اور تنہائی کا احساس ان مادی چیزوں سے بھلا دور کیا جاسکتا ہے؟ تمہارا دولت کمانے کا شوق بھی پورا ہو چکا ہے۔ بچے بھی پڑھ لکھ کر جوان ہو گئے ہیں۔ ہم نے اگر ابھی اپنے بچوں کو پاکستان میں ایڈجسٹ نہیں کیا تو۔۔۔" منصور کہتا ہے۔ "لگتا ہے تم پاگل ہو گئی ہو۔"

اس گفتگو کے دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ بیٹی پنکی نے ٹیلی فون اٹھایا اور باپ سے کہا۔

"ڈیڈ، ڈیڈ! یور کال فرام یور کنٹری، پرپس یور اولڈ فادر وائنس یو (Dad, Dad! your call from your country, perhaps your old father wants you) ڈیڈ آپ کے لئے آپ کے وطن سے ٹیلی فون ہے۔ شاید آپ کا بوڑھا باپ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے)۔ اس ایک جملے نے منصور کو سب کچھ سمجھا دیا کہ وہ پردیس کے دلدل میں گئے اتر چکے ہیں۔"

تبسم کی تحریر میں چاشنی ہے، اسی طرح تبسم کی گفتگو میں بھی دل بستگی ہے۔ میں نے پوچھا، "اپنے بارے میں بتائیں، آپ کی سوانح عمری۔۔۔" تبسم نے کہا، "سوانح عمری تو معتبر اور عظیم شخصیات کو زیب دیتی ہے۔ میرا مختصر تعارف یہ ہے کہ میں ۳/ ستمبر (انہوں نے سنہ نہیں بتایا اور میں نے اصرار نہیں کیا) کے دن کراچی، پاکستان میں امی جان کی آغوش میں آئی۔ ۱۹۸۰ء میں کراچی کے کمپری ہنسوباکی اسکول (Comprehensive High School) سے میٹرک کیا۔ ۱۹۸۲ء میں سرسید گرلز کالج سے انٹرمیڈیٹ کے بعد جامعہ کراچی سے ۱۹۸۶ء میں بائی (Botany) میں بی ایس سی آنرز کیا۔ میکے میں میرا نام تبسم ناز قدوائی تھا۔ لیکن محسن علوی صاحب کی شریک حیات بننے کے بعد تبسم محسن علوی کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ ماں کی گود اولاد کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے میں شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے خاندانی ماحول میں پروان چڑھی، جہاں انسانیت سے محبت، الفت، مذہبی اقدار کی پابندی اور وطن دوستی کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کی سادگی، خاندانی روایات، شرافت اور انسانی عظمت کے احساسات نے میری کردار سازی کی اور یہ خصائل میری شخصیت کا جزو بنیں۔ جب خاندانی



پس منظر میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو کوئی ایسی نسبت نظر نہیں آتی جو قابل ذکر ہو سوائے ان چند علمی حوالوں کے کہ میرے پرانا مولانا عبد الماجد دریابادی کا نام قابل ذکر ہے اور میرے دادا محترم وکیل احمد قدوائی صاحب مرحوم اور میرے والد شبیر احمد قدوائی صاحب مرحوم کو شعر و شاعری سے بڑا شغف تھا اور وہ گھر پر اپنے ذوق کی تسکین کے لئے بڑے بڑے مشاعرے کرواتے تھے جن میں نامور شعرائے کرام شرکت کرتے تھے۔ اس طرح ہمارے خاندان میں ادب کے بہترین قاری اور سامع موجود ہیں۔

۱۹۸۳ء میں شادی کے بعد میرے ادبی ذوق کو جلا بخشنے میں میرے شوہر انجینیئر محسن علوی کا بڑا حصہ ہے جو بنیادی طور پر ایک بہترین انجینیئر ہیں لیکن ادبی ذوق و شوق اور شاعری ان کا خاندانی ورثہ ہے۔ ۱۹۸۸ء سے ہم لوگ جدہ میں مقیم ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اردو کے فروغ اور اپنی ادبی ثقافتی و تہذیبی اقدار و روایات کو از سر نو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے ہم نے اپنی عزیز سہیلی اور معروف شاعرہ نورین طلعت عروبہ، نیلوفر سلطانہ اور شمع ظفر مہدی کے ساتھ مل کر جدہ میں خواتین کی پہلی ادبی و ثقافتی تنظیم 'سلسلہ' کی بنیاد ڈالی۔ یوں اس تنظیم نے عرب کے صحرائے ادبی گلستاں کی بنیاد فراہم کی اور اس 'سلسلہ' نے خواتین میں ادب کا پہلا چراغ روشن کیا۔ اس تنظیم نے تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔ اب تک اس کے تحت خواتین کے لئے تقریباً اٹھائیس (۲۸) پروگرام پیش کیئے جا چکے ہیں۔ ان میں مشاعرے، شام غزل، شام افسانہ، جشن پروین شاکر، شام اقبال اور وطن کے حوالے سے یوم آزادی کی تقاریب اور مختلف ادبی شخصیات کی آمد پر ان کی اعزازی تقاریب، مختلف خواتین شعرا و ادبا کی کتابوں کا اجرا اور تعارفی محافل شامل ہیں۔

”آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟“ میرے پوچھنے پر تبسم بولیں، ”قلم و قسطاس سے دوستی ادبی حوالے سے آٹھ (۸) سال کی عمر میں ہوئی۔ ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے رسالے 'نونہال' میں پہلی کہانی، 'گلاب کا پھول' سے ہوا۔ میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتی ہوں۔ میرے خیال میں انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جس قدر خوب صورت اور سہل انداز میں اشعار کے ذریعے کر سکتا ہے اور کسی پیرائے میں یہ ادائیگی مشکل ہے۔ اس لئے اکثر میں بھی ردیف و قافیے کی پابندی سے آزاد شاعری کر لیتی ہوں۔ لیکن میں نثر نگاری پر زیادہ توجہ دیتی ہوں۔ میری پہلی معمولی کاوش اصلاحی افسانوں کا مجموعہ 'آدم اور حوا' ہے۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ انسان کے اندر چاہے معمولی صلاحیت ہی کیوں نہ ہو اسے ان صلاحیتوں کو مثبت نظریات کے ساتھ سامنے لانا چاہیئے۔ میری یہ کوشش اس حدیث کا عکس بھی ہے کہ راستے سے خاردار جھاڑی یا پتھر ہٹا دینا بھی صدقہ یا نیکی ہے۔ میری دوسری کتاب 'تحریم' تعمیر جذباتوں سے معمور ایک سماجی اور معاشرتی ناول ہے۔“

”کیا یہاں بھی ادیب گروہ بندی کا شکار ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”جی ہاں“ تبسم نے کہا۔ ”اور میرے خیال میں اس گروہ بندی نے اردو زبان کی ترقی کو نقصان پہنچایا ہے۔ گروہ بندی یا تعصب کا چلن زندگی کے کسی شعبے میں ہو معاشرے پر گہرے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ شاعر اور نثر



نگار یوں بھی معاشرے کے نباض ہوتے ہیں۔ معاشرے کے لئے صحیح منزل اور راستہ متعین کرنے والے ان رہبروں اور رہنماؤں کو اس بارے میں سوچنا اور سمجھنا چاہیے۔ یہاں سعودی عرب میں بھی اردو ادبی گروہ بندی کا وہی حال ہے جو اور ممالک میں ہے جس سے میرے خیال میں آپ بخوبی واقف ہوں گی۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے ایک بنیادی منفی پہلو سے لوگ صرف نظر کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ اچھے باشعور اور سلجھے ہوئے شاعر اور نثر نگار پس منظر میں چلے جاتے ہیں، گاد اور جھاگ منظر عام پر نمایاں ہو کر صف اول میں نظر آنے لگتا ہے۔ گو یہ سلسلہ دیر پا نہیں ہوتا۔ گاد بالآخر تہہ نشین ہو جاتی ہے، جھاگ جلد بیٹھ جاتا ہے اور مقلد نظر کر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آ ہی جاتا ہے، لیکن اس وقت میں اچھے ادیب ضیاع وقت کا نقصان تو اٹھا ہی چکے ہوتے ہیں۔“

”امریکہ اور یورپ کو چھوڑ کر اب برصغیر پاک و ہند میں بھی اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس کی بقا کے لئے آپ کیا تجاویز پیش کریں گی؟“ میں نے سوال کیا۔ تبسم مسکرائیں، ”امریکہ اور یورپ کو چلئے آپ کے کہنے سے چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن وہاں پر رہنے والے پاکستانی اور ہندوستانی افراد کو اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی اپنی استطاعت کے لحاظ سے کام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ میری نظر میں جس طرح سرحدوں کی حفاظت فرض ہے اسی طرح مذہبی اقدار، آبائی تہذیب و اقدار اور اپنی زبان کی حفاظت بھی فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو کی بقا کے لئے میری رائے میں ہم اگر پابندی سے نثری اور شعری محافل کا انعقاد چھوٹے بڑے پیمانے پر کرتے رہیں تو بہتر ہوگا۔ چھوٹے پیمانے پر ایسی محافل کا انعقاد گھروں پر کیا جاسکتا ہے اور بڑے پیمانے پر سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ ادبی محافل کسی عوامی جگہ پر۔ اس مد میں شعری نشستوں، افسانہ کی شاموں، تنقیدی نشستوں اور نئی کتابوں کے اجرا کی تقاریب کے انعقاد ضروری ہیں۔ مخیر حضرات کو کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی تعاون دینے پر آمادہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی مخیر ادبا (شاعروں اور نثر نگاروں) کو اپنی کتابیں چھپوا کر سستے داموں فروخت کرنا چاہیے اور بلا کسی منفعت کے اردو زبان کے فروغ پر توجہ دینی چاہیے۔ میڈیا (media ابلاغ عامہ) میں بھی مزید نئے چینلوں (channels) کا اجرا ہونا چاہیے۔ دوسرے تفریحی پروگراموں کے ساتھ ساتھ ادبی محافل بھی نشر کی جائیں تو انشا اللہ اردو زبان باقی رہے گی۔“

میں نے دریافت کیا، ”سعودی عرب میں اردو کی ترقی و ترویج کے لئے کیا کام ہو رہا ہے؟ آپ صاحبان باہر سے آنے والے شاعر مہمانوں کے لئے مشاعرے کا اہتمام کرتے ہیں کیا آپ مہمان نثر نگاروں کی بھی پزیرائی اس طرح کرتے ہیں؟“

تبسم نے بتایا، ”سعودی عرب میں اردو کی ترقی و ترویج کے لئے بہت کام ہو رہا ہے۔ یہاں پر بہت سی ادبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ چنانچہ خواتین کی پہلی ادبی و ثقافتی تنظیم ’سلسلہ کے علاوہ مردوں کی مختلف تنظیمیں فعال کردار ادا کر رہی ہیں جن میں دائرہ ادب، جدہ، پاکستان رائٹرز فورم۔ ادارہ صحاب، ایوان اردو، کاروان فکر، دبستان جگر، اور عالمی اردو مرکز قابل ذکر ہیں۔ ان تنظیموں کے تحت باہر



سے آنے والے مہمان شہرا کے علاوہ مہمان نثر نگاروں کے اعزاز میں بھی محافل منعقد ہوتی ہیں۔  
 تبسم سے میرا گلا سوال تھا کہ وہ اردو اور یورپی زبانوں کے گن ادیبوں سے متاثر ہیں؟ تبسم  
 نے کہا، ”یورپی زبان و ادب سے تو میں زیادہ مستفید اور محفوظ نہیں ہو سکی لیکن اردو ادب میں تاریخی  
 حوالے سے نسیم حجازی، عنایت اللہ اور منورہ نوری خلیق کی نگارشات سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ جو بچپن  
 سے اب تک میرے ذہن میں اپنے اسلاف کی بے پناہ عزت اور ان سے بے انتہا محبت کرنے کا باعث  
 بنی ہیں۔ افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، نیلو فر اقبال، بنت الاسلام، اتم زبیر، وحیدہ نسیم،  
 ایم سلطانہ فخر، زبیدہ خاتون، رضیہ بٹ اور اے آر خاتون سے متاثر ہوں۔ مزاح نگاری کا خیال آتے ہی  
 شفیق الرحمن، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، میجر اشفاق حسین، ڈاکٹر یونس بٹ کی مزاح  
 نگاری ذہن میں ظرافت کے رنگ بکھیرنے لگتی ہے۔“

میں نے تبسم سے ایک سوال یہ بھی کیا کہ ان کے افسانے کن حالات، ماحول اور سماجی رویوں  
 کی عکاسی کرتے ہیں؟ تو جواب میں کہنے لگیں، ”میرے افسانے سادگی کے پیرائے میں ڈھلے ہوئے  
 ہیں اور موجودہ حالات کے ماحول میں گھریلو معاشرتی مسائل اور سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔  
 اور ان مسائل کا حل بھی ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔“

اب میں نے ان سے ان کی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنانے کی فرمائش کی۔ تبسم ہنسیں۔ ان کی  
 ہنسی بڑی دل فریب ہے۔ کہنے لگیں، ”میری زندگی تو یادگار واقعات کا مرقع بنتی چلی جا رہی ہے۔ کیا کیا  
 بتاؤں! آج تیزی سے ہم حال کی روشوں پر سے گزر رہے ہیں اور اپنے پیچھے ایک لمبا ماضی چھوڑ کر  
 مستقبل کی سرحدوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ اسی ماضی میں بہت سے یادگار واقعات ایسے ہیں جنہیں  
 سنانے کو دل چاہتا ہے لیکن تاکے۔ پھر بھی ادبی شگفتہ سا واقعہ سناتی ہوں۔ ہوا یوں کہ جب ہم نے جدہ کے  
 خشک ادبی ماحول (خواتین کے حوالے سے) میں اپنی تنظیم ’سلسلہ‘ کی جانب سے پہلے خواتین مشاعرے کا  
 انعقاد کیا تو ہمیں خیال تھا کہ جدہ کے ماحول میں محافل میں خواتین کی تنہا شرکت معیوب سمجھی جاتی ہے اس  
 لئے ہم نے ہوٹل میں صرف پچیس تیس خواتین کی نشست کے لئے بکنگ کرائی لیکن ہوٹل والے سے  
 احتیاطاً کہہ دیا کہ تعداد زیادہ سے زیادہ پچاس تک ہو سکتی ہے۔ لیکن شام سات بجے ہی سے خواتین کی کثیر  
 تعداد شرکت کے لئے جوق در جوق چلی آرہی تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ کے ساتھ ساتھ اراکین ’سلسلہ‘ بھی  
 بوکھلا گئے۔ لیکن خدائے لم یزل کی مہربانی سے ایک شاندار مشاعرہ اختتام پزیر ہوا جس میں تقریباً تین سو  
 خواتین نے شرکت کی۔ اس غیر متوقع کامیابی نے جہاں ہمارے دل میں خوش گوار پھول کھلائے وہیں ہم  
 نے اپنی خوش نصیبی پر سجدہ شکر ادا کیا۔ اور یہ ظفر یابی آئندہ ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ٹھہری۔“

Mrs. Tabassum Mohsin Alavi,

P.O Box 9299, Jeddah, 21413, Kingdom of Saudi Arabia.







اثر انداز ہوتے ہیں اور سماجی مسائل جو گھریلو زندگیوں کو بعض اوقات اتنا تلخ بنا دیتے ہیں کہ سکون سے بسا گھر ونداٹھوئے دیر نہیں لگتی۔ ترنم کی لکھی ایک کہانی ”ایسے مانوس صیاد سے“ ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ اس میں مکان کے اوپری حصے میں کرایہ دار کے مکان نہ خالی کرنے کی وجہ سے مالک مکان کی بہو کی اپنے شوہر سے ناراضگی ایک علیحدہ کمرہ نہ ہونے کی وجہ سے طول پکڑ گئی اور وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

عام طور سے ایسا ہوتا ہے یا نہیں، اس نکتے سے بحث نہیں۔ کہانیاں مفروضات پر مبنی ہوتی ہیں۔ دو اور دو چار کے اس دور میں آئیڈیل بیویاں بھی گنتی کی ملتی ہیں۔

ترنم ریاض کا ایک تحقیقی مضمون ”خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان..... مغربی تانیثیت کے پس منظر میں“ جو ماہنامہ ”شاعر“ ممبئی کے نومبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوا بہت کارآمد اور معلوماتی ہے۔ انہوں نے تانیثیت (Feminism) کو بحیثیت نظریہ (ideology) مغرب کی دین کہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کئی حوالے دیتے ہوئے اردو ادب میں خواتین کی تحریروں کے ایجنڈے کا بانی ڈپٹی نذیر احمد کو ٹھہرا لیا ہے جن کا ناول ”مراۃ العروس“ ایک رول ماڈل کے طور پر سامنے آیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد خواتین ادیبوں کے پہلے بیچ (badge) میں رشیدۃ النساء، اکبری بیگم، محمدی بیگم، مسز عباس طیب جی، صغرا ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، حسن بیگم، بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر، اور نذر سجاد حیدر کے نام آتے ہیں۔ ان خواتین ناول نگاروں کا دور ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران ۱۹۳۲ء سے ڈاکٹر رشید جہاں (انکارے کی مصنفہ)، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، واجدہ تبسم، رضیہ فصیح احمد وغیرہ کا دور شروع ہوتا ہے جس میں فرخندہ لودھی، صغرا مہدی، زاہدہ حنا، بشری رحمن، ذکیہ مشہدی، وحیدہ نسیم اور دیگر کئی نام ملتے ہیں۔ شاعرات میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ادا جعفری، پروین شاکر، رفیعہ شبینم عابدی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور دیگر شاعرات کے نام نمایاں ہیں۔

ترنم ریاض نے لکھا ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد خواتین کے اردو ادب میں حیاتیاتی جبر سے آزاد ہونے کی جدوجہد، اسٹیریو ٹائپس (stereotypes) روایتی جمود کو توڑنے اور مردوں کی عائد کردہ تعریفوں سے آزاد ہونے کے واضح رجحانات نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں کئی اشعار کا حوالہ دیا جن میں فہمیدہ ریاض کی ایک تاثراتی نظم ”کب تک“ کے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔

کب تک مجھ سے پیار کرو گے // کب تک؟ // جب تک میرے رحم سے بچے کی تخلیق  
کا خون نہ ہے گا // جب تک میرا رنگ ہے تازہ // جب تک میرا رنگ ہے تنا // پر اس  
سے آگے بھی تو کچھ ہے // وہ سب کیا ہے // کسے پتا // وہیں کی ایک مسافر میں  
بھی // انجانے کا شوق بڑا ہے // پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے کب تک

ترنم ایک باصلاحیت ادیبہ ہیں۔ ایک فرض شناس بیوی ہیں اور دو نو عمر بچوں کی ذمہ دار ماں ہونے کے ساتھ ساتھ ساہتیہ اکادمی کی گورننگ کونسل (governing council) کی ممبر بھی ہیں۔



سابقہ اکادمی دہلی کے شعبہ اردو کے مشاورتی کونسل کی ممبر ہونے کے علاوہ پوسٹری سوسائٹی کی ممبر بھی ہیں۔ خوش آواز ہیں اور "نیو دہلی ایئر" (New Delhi Air) سے خبریں بھی پڑھتی ہیں۔

میں نے انہیں خط لکھا اور برہنگہم آنے کی دعوت بھی دی۔ جواب مورخہ ۲۱ / دسمبر ۲۰۰۳ء لکھتی ہیں۔ "آپ نے یاد فرمایا، بہت اچھا لگا کہ میں بھی آپ کو برسوں سے پڑھتی آرہی ہوں۔ آپ کے خط سے اس بات کی مزید تصدیق ہو گئی کہ خواتین بڑے بڑے کارنامے کر سکتی ہیں۔ (گرچہ جو حضرات بڑے کام کرتے ہیں وہاں بھی ایک گریٹ وومن great woman کا ہاتھ ہوتا ہے) اس کام کے لئے دلی مبارک باد اور ہاں اتنی محبت سے نہ بلایا کیجئے کہ لوگ سچ مچ ہی آجائیں۔ لیکن اگر میں کبھی آتی تو آپ کا خط نہ ملنے کی صورت میں بھی آپ سے ملاقات کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔"

"پھر پیاری ترنم آہی جاؤنا" میرے دل کی آواز ترنم تک کیا پہنچی وہ میرے سامنے تھیں۔

"ترنم اپنے بارے میں بتائیں۔ یہ رہا سوال نامہ۔۔۔۔۔"

ترنم نے سوال نامہ دیکھا۔ مترنم آواز میں بولیں۔ "میں ۹ / اگست ۱۹۶۳ء کو سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئی۔ تعلیم کا شوق تھا چنانچہ ایم اے ایم ایڈ میں سند لی۔ حالاں کہ میں ابتدائی کلاسوں میں ریاضی میں کمزور تھی مگر یہ کمزوری مجھے شاعرہ بنا گئی۔ ہوا یوں کہ میں ساتویں درجے کے شش ماہی امتحان میں ریاضی کے پرچے میں فیل ہو جانے پر اپنے اور رونے کے بعد دوبارہ حساب کی کتاب کی مخصوص صورت دیکھ کر میری وہ کیفیت شعر میں ڈھل گئی۔"

بھول جاشب بھر کی ساری تلخیاں ہر سویرا اک نیا آغاز ہے  
اب میں نثر بھی لکھتی ہوں اور شعر بھی کہتی ہوں۔ انحصار ماحول پر ہے۔ میرے افسانوں کے دو مجموعے "یہ تنگ زمین" اور "ابابلیس لوٹ آئیں گی" شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کتاب "بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب (بھارت میں)" مرتب کی ہے جسے سابقہ اکادمی شائع کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے سابقہ اکادمی کی کچھ کتابوں کا انگریزی اور ہندی سے ترجمہ کیا ہے۔

اردو کے مستقبل کے حوالے سے ترنم نے کہا۔ "جب ایک چھوٹی سی مملکت میں عبرانی زندہ رہ سکتی ہے تو روئے زمین کے وسیع کیونس پر خوش خط و خوش آہنگ زبان اردو کیوں نہیں۔ اور عبرانی کی مثال لیتے ہوئے میں کہوں گی کہ دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک تو اردو رسم الخط کو زندہ رکھنا اور نئی نسل تک منتقل کرنا اور دوسرے اردو تحریروں کو خرید کر حاصل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا۔ اب کتابیں مانگ کر پڑھنے کا رواج ختم ہونا چاہیے۔"

ترنم کا کہنا ہے کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے تو اردو اردو نہ رہ کر کوئی دوسری زبان ہو جائے گی چاہے دیوناگری ہو یا رومن یا کچھ اور، کہ اس کی شیرینی اس کے 'ش'، 'ق' کے صحیح ہونے میں پوشیدہ ہے۔ جس سے کوئی دوسرا رسم الخط انصاف نہیں کر سکے گا۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا۔ "لفظ 'ہے'۔"



لیجیئے اگر اسے رومن میں لکھا گیا تو یہ hai (ہائے) ہوگا یا hei (ہی) اور یا hei (ہے ٹی) پڑھا جائے گا اور خدا کی جگہ khuda (کھڈا) پڑھا جائے گا۔ اور ہم خدا کو پہچانتے ہیں کھڈا کو نہیں۔ لہذا رسم الخط بدلنے کی سوچ ہی غلط ہے۔“

ترنم ریاض کے پسندیدہ ادیب قرۃ العین حیدر اور سارتر ہیں۔

میرا اگلا سوال تھا، ”ترقی پسند رجحانات ختم ہو کر اس کی جگہ جدیدیت نے لے لی ہے۔ آپ کا نکتہ نظر کیا ہے؟“

ترنم کا جواب تھا، ”حق تو یہ ہے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں اور دوسرے لوگوں نے میانہ روی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں کہ ترقی پسندی کے رجحانات مکمل طور پر ختم ہو گئے ہیں کہ اب بھی کئی قلم کار اس نکتہ نظر کے زیر اثر لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح کچھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے جڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ رجحانات موجود ہیں۔ مگر بعض لوگ ان مکاتیب فکر سے یکسر آزاد ہیں۔“

دوران گفتگو ہندو پاک کے جرائد بھی زیر بحث آئے کہ یہ جرائد کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ ترنم ریاض کی رائے ہے، ”ہندو پاک کے جرائد بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے موقف کو واضح کرتے ہیں۔ جدید معاشی نظام کے سبب جو سماجی حالات پیدا ہو رہے ہیں ان کا پر تو ہندو پاک کے اردو ادبی جریدوں میں بخوبی نظر آتا ہے۔ وہ قدریں جو جنگ عظیم دوم کے بعد روایتی اقدار کی جگہ لے رہی تھیں اور گزشتہ زائد از پچاس (۵۰) برس سے پنپ رہی تھیں، بلکہ ایک طرح سے قدیم اور جدید کا سنگم تھیں۔ اب مکمل طور پر نئی ابھرتی اقدار میں گم ہو رہی ہیں۔ یہ نئی ابھرتی ہوئی اقدار انسانوں کو مکمل تنہائی کی طرف دھکیلتے ہوئے ایک بے حس اور خود غرض سماج کو جنم دے رہی ہیں جس میں صرف طاقت ور ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ survival of the fittest (صرف تنومند بچ رہے گا) کا دور ہے۔ یہ حقائق مختلف تخلیقات کی شکل میں ہندو پاک کے رسائل اور جرائد میں نظر آتے ہیں۔“

Ms. Tarannum Riyaz,

C-11, Jangpura Extension, New Delhi, 110014, India



ہوسیں گے گھر بنایا تھا میرا کہاں ہو  
تینکے کہیں رکھے تھے، بس میرا کہاں ہو  
باہر نکل کے دیکھا تو ہر سمت دھوپ تھی  
ہسکے ہمارے گھر میں سویرا کہاں ہو

تسلیم الہی زلفی  
پبلشنگز



## تسلیم الہی زلفی

ٹورنٹو، کنیڈا

”نئے سال کی آمد آمد ہے۔ نئے سال کی مناسبت سے کوئی شعر سنائیے۔“

زلفی نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر کہا۔

زندگی نے کیا ہے پیش ہمیں پھر نئے سال کی عدالت میں  
چلے اب اس مشہور شعر کے جواب میں اپنا کوئی شعر سنائیے۔

عرض ہے۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی  
تسلیم الہی زلفی نے جواباً اپنا شعر سنایا۔

دشمنوں میں کچھ رواداری تو ہے دوستوں کو شرم آنا چاہیے  
پھر فوراً پوچھا، ”آخر آج شاعری میں کیوں گفتگو کر رہی ہیں۔ کوئی امتحان درپیش ہے؟“

”امتحان تو ہم خود اپنا لے رہے ہیں۔ دراصل آپ کی ایک غزل پڑھی تھی۔ کیا کیا تلمیحات ہیں اس میں۔  
اس کا ایک شعر کچھ یوں تھا۔ مگر شعر یاد نہیں رہا۔ مفہوم کچھ آوری والا تھا۔“

تسلیم الہی زلفی کو اپنے اشعار حفظ ہیں۔ انہوں نے پہلے سے مطلع اور پھر شعر سنایا۔



دماغ کے لئے سینے میں آگہی دے دی      چراغ کے لئے منجی میں روشنی دے دی  
 تراشتا رہا لفظوں کو ہاتھ خون ہوئے      خدا نے شہر سخن کی جو آفری دے دی  
 ایک نئی فکر کی روشنی سے منور تلمیحات سے بحرِ پورا شعار سن کر میں نے پوچھا، ”آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ  
 کے دیوان کا عربی سے براہِ راست منظوم ترجمہ کر رہے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت کس مرحلے میں ہے؟“  
 ”بس جلد ہی پائے تکمیل کو پہنچے گی۔ انشا اللہ۔“

میں چوں کہ جانتی تھی کہ زلفی کو اردو کے علاوہ عربی، انگریزی اور فارسی پر مکمل عبور حاصل ہے، میں نے  
 پوچھا، ”آپ کنیڈین اخبارات میں مقامی اور بین الاقوامی موضوعات پر ۱۹۹۰ء سے مستقل کالم لکھ رہے  
 ہیں۔ آج کل ٹی وی پر اردو پروگرام کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی ہیں۔‘ سخنور بہت اچھے کے عنوان سے  
 کتاب میں آپ نے اہل قلم پر مضامین اور خاکے لکھنے کے ساتھ ساتھ منظوم خراجِ تحسین بھی پیش کیا  
 ہے۔ آپ کی رائے میں اردو کا مستقبل روشن ہے یا تاریک۔ جب کہ ہماری نئی نسل کو اردو زبان پڑھنے  
 اور لکھنے سے قطعی دل چسپی نہیں۔“

زلفی کو غصہ آگیا۔ ”خاتون! میری رائے میں تو دنیا میں کہیں بھی اردو کا مستقبل تاریک نہیں۔  
 آپ نے ایسا کیوں سوچا۔ اردو ماشا اللہ خوب پھل پھول رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک اردو  
 بولنے والے باقی ہیں یہ زبان ایسے ہی بولی اور لکھی جاتی رہے گی۔ آپ کے خیال میں ہماری نئی نسل  
 معدوم ہو رہی ہے؟ ہماری آبادی کم ہو رہی ہے؟ مجھے تو ایسا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ہم نے تو جب سے  
 ہوش سنبھالا ہے بس دو ہی نعرے سنتے چلے آ رہے ہیں..... ایک تو ’اسلام خطرے میں ہے‘ اور دوسرا ’اردو  
 کا مستقبل تاریک ہے‘۔ لیکن آج چھپن (۵۶) سال ہو گئے۔ ماشا اللہ دونوں شعبے دن دوئی اور رات  
 چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔“

میں زلفی کی رائے سے متفق نہیں تھی لیکن اس سوال پر بحث کرنے سے فائدہ کچھ نہ تھا۔ ہماری  
 نسل تک تو اردو زندہ ہے۔ یہ میں بھی جانتی ہوں اور اگلے سو سال بعد ”اردو“ بے چاری کا کیا حشر ہوگا  
 اس کا بھی اندازہ ہے مگر شکر ہے رب کا کہ اس ”حشر“ کو دیکھنے کو ہم زندہ نہ ہوں گے۔

چنانچہ اگلا سوال اردو رسم الخط کی تبدیلی کے حوالے سے پوچھا۔ زلفی بھی اس شور و غوغا سے  
 واقف ہیں جو اردو رسم الخط کی تبدیلی کے حوالے سے آج کل اکثر محفلوں میں ہو رہا ہے۔

زلفی نے کہا، ”یاد رکھیے کہ کسی زبان کی بقا اور ترقی اس کے اپنے رسم الخط میں ہوتی ہے۔ ہمارا  
 اردو رسم الخط ہماری زبان کی علامت اور پہچان ہے۔ اب جب ہماری زبان دنیا کی تمام بڑی زبانوں  
 کے مقابلے میں مستحکم، زرخیز، مکمل اور ہر زبان کے الفاظ کو ویسے ہی تلفظ کے ساتھ اپنے قالب میں  
 ڈھالنے پر قادر ہے تو پھر آخر کیوں اس کا رسم الخط بدلا جائے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ رسم الخط بدلنے کا  
 شوشہ وہی لوگ چھوڑتے ہیں جو اردو زبان سے خوف زدہ ہیں اور جن کی اپنی زبان زرخیز اور قادر نہیں  
 ہے۔ دوسرے وہ لوگ اردو زبان کا رسم الخط بدلا کر اسے بے نام و نشان کر دینا چاہتے ہیں۔ لہذا میری



ان سب سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اردو رسم الخط کو بدلنے کی ہر تحریک اور سازش کو سختی سے کچل دیں۔ ورنہ یہ اردو کا مستقبل تاریک ہے کہہ کر ڈرانے والے اور اردو کا رسم الخط بدلنے کا مشورہ دینے والے ایک دن اردو زبان اور تہذیب کا نام و نشان مٹا دیں گے۔“

میرا اگلا سوال تھا، ”کیا موجودہ دور میں لکھے جانے والے افسانوں سے آپ مطمئن ہیں؟ نیز علامتی کہانیاں ادب کا حصہ بن سکتی ہیں؟ اور موجودہ دور میں جو تنقید لکھی جا رہی ہے وہ کہاں تک ہماری رہنمائی کر رہی ہے؟“

کئی سوال ایک ساتھ تھے۔ مگر زلفی کی نگاہ آج کے ادب پر سرسری نہیں۔ بڑے اطمینان سے کہنے لگے، ”اردو افسانوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروپ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کا بنتا ہے جن میں خارجی حالات و واقعات کی بنا پر سماجی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور جنسی مسائل کو برتنے میں حقیقت پسندی، استحصالی قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں بھرپور جرأت، بصیرت اور کھلی معنویت سے کام لیا گیا ہے۔ اس گروپ میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، راجند سنگھ بیدی اور ہاجرہ مسرور وغیرہ نمایاں ہیں۔ جب کہ موضوعات کے اعتبار سے دوسرا گروپ ان افسانوں کا بنتا ہے جن میں انفرادی اور اجتماعی نفسیاتی کیفیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو فرد کی پریشان خیالی، ذہنی انتشار اور نجی زندگی میں بے کیفی، تشنج اور فرار کو جنم دیتی ہے۔ اس گروپ میں قرۃ العین حیدر، غلام عباس، ممتاز مفتی، اختر حسین رائے پوری، سلطان جمیل نسیم، سلطانہ مہر، شکیلہ رفیق، زاہدہ حنا، رضیہ فصیح احمد، سلیم بشیر، قیوم راہی، احمد داؤد، اشفاق احمد، رام لعل، اختر جمال، جوگندر پال، ظہیر بابر، گلنار آفرین، طاہر نقوی کے علاوہ درجنوں نام لیے جاسکتے ہیں۔ لہذا آج کا افسانہ پوری توانائی کے ساتھ لکھا جا رہا ہے، اور یقیناً ترقی پزیر ہے۔ کہانی کی بنت کی نئی نئی جہتیں، انداز اور زاویے سامنے آرہے ہیں۔“

اب رہی علامتی کہانیاں تو علامتی کہانیاں اور شاعری ہمہ وقتی نہیں ہوتی ہے، یہ تو زبان بندی اور قلم بندی کے دورانیے کی پیداوار ہوتی ہے۔ لہذا علامتی افسانہ نگاری کو مخصوص حالات کا طرز اظہار جان کر دیکھا جائے تو پاکستان میں نہایت خوب صورت افسانے اور کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں۔ لیکن جیسے ہی پابندیاں نرم ہوئیں یا ختم ہوئیں، تمام علامت نگاری سیاق و سباق کی کہانی نویسی کی جانب لوٹ آئے۔

اب جہاں تک موجودہ دور میں تنقید نگاری کا سوال ہے تو سچی بات تو یہ ہے کہ ایک زمانہ ہوا کہ کھری اور سچی تنقید نگاری کا چلن ہی اٹھ گیا۔ اب تو ستائش باہمی، گروپ بندی اور منفعت ذاتی کا زمانہ ہے، لہذا اب ایسے دور اور حالات میں پچاس سال پہلے والی تنقید کہاں لکھی جاسکتی ہے۔“

انٹرنیٹ کی مقبولیت نے کتابی مطالعے کو کہاں تک متاثر کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

اس کے جواب میں زلفی کا کہنا ہے

”کتب کا مطالعہ تو ہر دور میں مفید رہا ہے اور رہے گا، اور پھر جو کتاب سے پڑھنے کی بات



ہے وہ مونیٹر کے اسکرین پر نظر جمانے میں کہاں، اس پر نہ ہی پڑھاؤ نہ نشین ہوتا ہے اور نہ ہی محسوساتی طور پر لگتا ہے کہ کوئی کتاب پڑھی۔ اور پھر علم و ادب کا جو خزانہ کتابوں میں بند ہے اس کا عشر عشر بھی انٹرنیٹ پر نہیں ملتا!! اور جہاں تک 'کام چلانے' کی بات ہے آپ نے کی تو مطالعہ خالصاً ذوق و شوق کا معاملہ ہے اور ظاہر ہے ذوق و شوق کی تکمیل کے لئے محض 'کام چلانے' سے بات نہیں بنتی ہے۔

اب آئیے زلفی کی کتابوں کی کتابوں کے حوالے سے بھی ان کا تعارف ہو جائے۔  
۱۳ / جولائی ۱۹۶۳ء کو ہندوستان کے شہر شکوہ آباد (ضلع مین پوری) آگرہ میں پیدا ہونے والے تسلیم الہی قریشی نے اپنا ادبی نام تسلیم الہی زلفی رکھا۔ جامعہ کراچی سے انہوں نے سوشیالوجی میں ایم اے کی سند حاصل کی اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی سند لی۔

ایئر کرافٹ جی ایس ای (Aircraft GSE - maintenance) کا ڈپلوما امریکہ کی ریاست ٹیکساس سے لیا اور اسی شعبہ سے وابستگی اختیار کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد جدہ آکر سعودی عرب میں ایئر لائنز سے وابستہ ہوئے۔ تعلیم کے دوران بیروت میں ان کی ملاقاتیں فیض احمد فیض سے رہیں اور جدہ میں شعر و ادب کی تخلیقی، اشاعتی اور مجلسی سرگرمیوں کے دوران اور پاکستان و ہندوستان کی شعری محفلوں میں کئی اکابرین ادب سے ملاقاتیں رہیں جن میں حفیظ جالندھری، احسان دانش، جوش علی سردار جعفری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر مالک رام، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی شامل ہیں۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو ۱۹۶۲ء سے ہی ہو گیا تھا جب انہوں نے بچوں کے مختلف رسائل میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی پہلی غزل "الشجاع" کراچی میں شائع ہوئی۔ جنوری ۱۹۹۰ء میں کنیڈا آئے۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "تنہا پرندے کی اڑان" ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ ان کی دیگر کتب "سنخور بہت اچھے" ۱۹۹۲ء میں اور ان کی سیاسی نظمیں اور عالمی سفر نامہ "آگرہ سے نیا گرا" ۱۹۹۴ء میں اور ان کی اردو/انگریزی کی منتخب نظمیں "سات سمندر پار (Beyond Seven Seas)" ۱۹۹۴ء میں اور عالمی اہم واقعاتی نظموں کا مجموعہ "ابابلیس نہیں آئیں" ۱۹۹۵ء میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

زلفی نے کبھی مصوری بھی کی تھی اور شاہ فیصل کا پورٹریٹ بنانے پر شاہ فیصل (سعودی عرب) کی جانب سے ۱۹۶۵ء میں سند اور انعام بھی حاصل کیا۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام "یونیورسٹی میگزین" میں بہترین کمپیئر (ناظم) کی سند ۱۹۶۸ء میں حاصل کی۔ بہترین شاعر کا اعزاز انہیں ۱۹۶۸ء میں بین الجامعات پاکستان (کراچی) کے مشاعرے میں ملا۔ ۱۹۸۴ء میں نئی دہلی (ہندوستان) میں منعقدہ عالمی اردو کانفرنس میں ممتاز شاعر کا ایوارڈ ملا۔ حکومت اوٹارو کی جانب سے بھی انہیں اعلیٰ ادبی تخلیقی صلاحیت کی اعترافی سند اور تمغہ عطا کیا گیا ہے۔

موجودہ دور کے ادب اور ادیبوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے زلفی نے



تقسیم ہند کے بعد اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے ادیبوں نے ہیئت کے تجربوں کے علاوہ اپنے موضوع سخن کا رخ بھی بدل دیا۔ اور معاشرتی مسائل کی تنقید ان کا جزو ایمان بن گئی۔ اس دور کے سربراہ آوردہ ادیبوں میں فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، ان م راشد، اور احمد راہی کے نام سرفہرست ہیں۔ لیکن میرے مطالعے کے مطابق دور جدید کے ادیبوں میں چڑچڑاپن آگیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تلخی بھی ہے اور برہمی بھی اور خاص قسم کی cynicism بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے ادیب کو جو ذاتی پریشانیاں لاحق ہیں یا اس کی اپنی ذات جن پابندیوں میں گرفتار ہے اس سے وہ بہت خفا ہے۔ نئے ادیبوں کی تخلیقات پر مایوسی اور افسردگی کی گھٹا بھی چھائی رہتی ہے۔ یہ مایوسی اور افسردگی بھی انفرادی کیفیات میں شمار ہوں گی۔ ان کا تعلق غم زیست سے بالکل نہیں ہے۔ غم کا اظہار ادب کا نہایت اہم موضوع ہے۔ اس سے درد مندی پیدا ہوتی ہے۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش تیز ہوتی ہے۔ روح کی طہارت ہوتی ہے۔ لیکن وہ غم جو خالص ذاتی ہو اور جس میں آفاقی غم بننے کی صلاحیت نہ ہو، ہمیں افسردہ کرتا ہے اور ہماری قوت تخلیق، قوت عمل کو شل کرتا ہے۔

میں نے پوچھا، اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنائیں گے؟

کہنے لگے۔۔۔۔۔

”وہ زندگی ہی کیا کہ جس کا ہر پل یادگار نہ ہو۔ اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ یادگار رہا ہو، اس کے کسی ایک واقعے کو دہرائی یقیناً خود سے زیادتی کے مترادف ہوگا۔ وہی بات ہے کہ۔۔۔  
کے یاد رکھوں، کسے بھول جاؤں

والی بات ہے۔

Mr. Tasleem Wlahi Zulfi,

311 Axminster Drive, Richmond Hill, Ontario, LAC-2W3, Canada

e-mail: zulfi @ rogers.com





محمد توفیق خاں کی زندگی کا سفر  
مردانہ اور عورتانہ دونوں کے ساتھ ساتھ  
توڑنے اور بنانے کے کام میں  
جہاں ان کا تعلق ہے وہاں ان کا اثر ہے

25/9/83 -

## محمد توفیق خان

سرونج، ایم پی، ہندوستان

میں ان سے پوچھے جا رہی تھی.....

”توفیق خاں صاحب، آپ کو ادیبوں کی گروہ بندیوں سے واسطہ پڑا؟، ہم اردو کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ کیا اردو میں نئے الفاظ کی شمولیت مع انگریزی زبان کے الفاظ اردو زبان کے فائدہ مند ہے؟ اور توفیق خاں صاحب یہ جو رسم الخط کی تبدیلی کا سلسلہ چلا رہے کیا یہ.....“

وہ مسکرا رہے تھے اور سن رہے تھے۔ پھر ایک دم سے بولے.....

”جی بی بی، میں آپ کے سارے سوالات کا جواب دے رہا ہوں۔ آپ چھری تلے تھوڑا سا

دم تو لیں۔“

بہت دنوں بعد اردو کا یہ محاورہ سن کر خوشی سے آنکھیں بھر آئیں۔ ایسی بات محاورہ اردو اب سننے کو کہاں ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ”چھری“ سے جڑی دوسری ترکیبیں اور محاورے بھی یاد آ گئے مثلاً ”چھری بند بھائی، چھری کنار، چھری بھلی نہ کنار، چھری کنار ہو نا۔“ اور یہ سب محاورے ہندی سے اردو میں آئے ہیں۔ میں نے چھری تلے دم لیا یعنی انتظار کی تکلیف سہی۔ اور آپ سے بھی کہوں گی کہ ذرا صبر سے کام لیں۔ اس صبر آزما وقت کے دوران میں محمد توفیق خان صاحب کے بارے میں تھوڑا



سا آپ کو بتا دوں۔

دسمبر ۱۹۲۶ء ان کی پیدائش کا مہینہ اور سن ہے۔ سرونج جائے پیدائش ہے۔ تعلیمی اسناد ایم اے، بی بی، آئی جی بی اور آر ڈی سی سے مزین ہیں۔ چونکہ بولتے بہت کم ہیں اس لئے تعلیمی اسناد کے مخفف پر ہی رک گئے۔ ہم نے بھی اصرار نہیں کیا۔ پھر بتانے لگے کہ چند دن نائب تحصیل دار رہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب سرونج صوبہ راجستھان سے نکل کر صوبہ مدھیہ پردیش میں ضم ہوا تو خان صاحب محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ اب ریٹائر ہو کر اپنا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے ہیں۔ اور ضلع انجمن ترقی اردو (ہند)، سرونج شاخ کے صدر کی حیثیت سے انجمن کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

انہیں لکھنے کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک قلمی اخبار جاری کیا اور اس میں مضامین لکھے مگر دیگر مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ پھر باقاعدہ لکھنے کا آغاز ۱۹۹۰ء میں کیا اور تب سے اب تک سینکڑوں مضامین اور تبصرے لکھ چکے ہیں۔ بنیادی طور پر نثر کے آدمی ہیں۔ انہیں غالب اور اقبال پسند ہیں اس کے باوجود کہ خود شعر نہیں کہتے۔ ان کی کتب میں (۱) جگن ناتھ آزاد اور اردو ادب (ب) علم شناسی (ج) سیفی سرونجی..... شخصیت اور فن (د) بکھرے شیرازے اور (ہ) صلاح الدین نیر کے ادارے شامل ہیں۔

میں نے پوچھا تھا کہ اردو زبان ”رتی پتی“ نظر آ رہی ہے۔ اسے اس کا مقام دلانے کے لئے کیا تدبیر کریں کہ اردو پھلے پھولے؟

انہوں نے کہا، ”کوئی مشکل کام نہیں۔ پہلے کی طرح اسکولوں میں اردو زبان لازمی قرار دے دی جائے تو اردو دنیا کی سب سے بڑی زبان بن جائے۔ اردو زبان مٹ نہیں سکتی حالاں کہ نئی نسل کی بے توجہی سے نقصان ضرور پہنچ رہا ہے، لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے اس ورثے کو قائم رکھنے کے لئے نئی نسل کو احساس دلانا چاہیے۔ بقول کسی شاعر۔

تم اپنے عہد کا ورثہ تو کھو چکے ہو  
جو بچ سکے تو یہ اردو زبان رکھ لینا

اور سلطانہ بی بی ہر زبان کا رسم الخط ہی اس کی جان ہوتا ہے۔ وہی اس کی شناخت کہلاتا ہے۔ رسم الخط بدلنے کا مطلب ہے اس کا قتل۔“

وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، ”اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے ہمیں وسیع انظری سے کام لے کر اس میں اپنی تحریروں کے ذریعے نئے الفاظ شامل کرنے چاہئیں ورثہ زبان کا ارتقا رک جائے گا۔ جناب گیان چند جین نے کہا کہ.....

زبان کے ارتقا کی راہ میں دوز بردست روڑے لغت اور قواعد ہیں۔ یہ دونوں زبان کو باندھ کر ماضی کی پابندی پر اصرار کرتے ہیں جب کہ زبان کی زندگی کے لئے مسلسل تغیر کا عمل درکار ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں سنسکرت کے عظیم ماہر قواعد و ماہر صوتیات پانینی نے



سنسکرت کی قواعد کے ایسے پکے اصول بنادئیے کہ ان سے ہٹ کر کچھ کہنا بے اصولی کہلاتا تھا۔  
اس کے سخت اصولوں کی وجہ سے سنسکرت کا ارتقارک گیا۔ وہ جامد ہو گئی جس کے نتیجے میں بول  
چال کے وسیلے سے نکل گئی۔

گیان چند جین کی اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ زبان کبھی ترقی نہیں کر سکتی جس میں نئے  
الفاظ داخل نہ ہوں اور اس لحاظ سے اردو کی ہر نئی صنف سخن زبان و ادب کے لئے، اس کی ترقی کے لئے  
سب سے بہترین ذریعہ ہے، بہترین وسیلہ ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلے میں ڈاکٹر مناظر عاشق برگانوی  
اردو کی ہر صنف سخن کو پھیلانے والے واحد شخص ہیں جو زبان و ادب کے فروغ کے لئے رات دن ایک کر  
رہے ہیں۔ میرے نزدیک تو ایسے شاعر بھی قابل مبارک باد ہیں جو دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ  
استعمال سے اردو زبان کو کچھ دے رہے ہیں۔ یہاں کچھ ایسے شاعروں کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

|  |  |
|--|--|
| سوجاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر    | مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے (منور رانا)       |
| یہ دیکھ کر پتنگیں بھی حیران ہو گئیں    | اب تو چھتیں بھی ہندو مسلمان ہو گئیں (منور رانا)      |
| شام تک کتنے ہاتھوں سے گزروں گا میں     | چائے خانے میں اردو کا اخبار سا (بشیر بدر)            |
| کوئی کاغذ نہ تھا لفافے میں             | صرف تتلی کا ایک پر نکلا (بشیر بدر)                   |
| پیر پیمبر کو اب اور نہ زحمت دے         | چولھا چکی روٹی سبزی یا اللہ (ندافاضلی)               |
| کرگل اور کشمیری تیرے نام ہوں کیوں      | بھائی بہن محبوبہ بیٹی یا اللہ (ندافاضلی)             |
| اتر آتی ہے میری آنکھ میں اخبار کی سرخی | ابو کی بوند ہر تازہ خبر میں بیٹھ جاتی ہے (مظفر حنفی) |
| کھوٹی بتا رہی ہے، آمینہ بولتا ہے       | تصویر تیری مجھ سے چہرہ بدل رہی تھی (مظفر حنفی)       |

ابھی فی الحال میں نے چار شاعروں کے حوالے دیئے ہیں جن کے یہاں کھر دے اور انگریزی کے بہت  
سے لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن کس خوبی کے ساتھ کہ وہ لفظ اردو کے دکھائی دے رہے ہیں۔ غزل  
جو نرم و نازک صنف سخن ہے ان الفاظ کے استعمال کے بعد بھی اس کی نزکیت اور اس کی آبرو برقرار ہے۔  
فٹ پاتھ، کرگل، کھوٹی، لفافہ، چائے، چولھا، چکی جیسے الفاظ غزل کی زیئت بنائے گئے ہیں۔ دراصل یہ ہی  
زبان کو ایک دین کہلاتی ہے کہ غزل کی روح بھی زخمی نہ ہو اور شعر میں بات بھی بن جائے۔

ادیبوں کی گروہ بندیوں کے حوالے سے انہوں نے کہا، ”بے شک ادیبوں اور شاعروں کی  
گروہ بندیوں نے اردو زبان و ادب کو بے حد نقصان پہنچایا ہے، خاص طور پر ایسے پروفیسر ادیبوں اور  
لیکچراروں نے جو صرف اردو کی کھاتے ہیں لیکن اردو کی ترقی کے لئے ان میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ وہ  
صرف پروفیسر اور لیکچرار ہونے کی وجہ سے ادیب کہلاتے ہیں اور ادھر ادھر کے مضامین جمع کر کے  
سمیناروں میں پڑھتے ہیں۔ غالب اور میر کی شاعری مرتب کر کے ادیبوں کی فہرست میں شامل ہو کر  
مصنف کہلاتے ہیں۔ گروہ بندی کی مثال کے لئے بھوپال یونیورسٹی کا ایک واقعہ میں آپ کو سناؤں۔ یہ  
۱۹۹۰ء کا زمانہ تھا۔ سیٹی سروجنی نے پی ایچ ڈی کے لئے بعنوان ”ندافاضلی“ حیات، شخصیت اور فن کے



لئے رجسٹریشن کرایا۔ تین سال میں انہوں نے بہت محنت کی اور مقالہ قلم بند کیا۔ لیکن پروفیسر حضرات کی گروہ بندیوں کی وجہ سے اسے روک دیا گیا۔ وجہ۔۔۔ ان کے تعلقات مذاقِ ضلی سے اچھے نہ تھے۔ اس طرح تین سال ضائع ہوئے۔ اس گروہ بندیوں سے بیچارے طالب علموں کا کیا تعلق ہے؟ اردو میں ریسرچ کے حوالے سے ہر یونیورسٹی میں یہی حال ہے۔ یونیورسٹی کے اربابِ بست و کشاد کو اس کی کوئی فکر نہیں کہ ان کی گروہ بندیوں سے زبانِ وادب کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ گروہ بندی صرف تعمیری انداز میں ہو تو ادب کے خزانے کا منہ بھر دیتی ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ سنئے۔۔۔

میر انیس کو اردو مرثیہ کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ انیس اور دبیر اردو مرثیے کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اگر یہ شاعر اپنے مرثیے کے ذریعے اردو شاعری کا رخ اس طرف نہ موڑتے تو لکھنؤ سے اردو شاعری کا وجود ختم ہو جاتا۔ دونوں شاعروں میں چشمک بھی رہی مگر وہ ذاتیات پر کبھی نہیں اترتے تھے۔ ہمیشہ فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مثلاً دبیر کی ایک رباعی بہت مشہور ہے۔

رحمت کا بن کے امیدوار آیا ہوں  
منہ ڈھانپے کفن میں شرمسار آیا ہوں  
چلنے نہ دیا بارِ گناہ نے پیدل  
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

جب انیس کے دوستوں نے اس رباعی کی بہت تعریف کی تب انیس نے یہ رباعی کہی۔

رحمت کا امیدوار ہوں یارب  
از بس کہ خطاوار ہوں یارب  
رحمت کا سزاوار نہیں ہوں مگر میں  
پھر بھی رحمت کا طلب گار ہوں یارب

اس طرح کی چشمک اور مقابلہ ظاہر ہے کہ بڑے فن کاروں کو ہی زیب دیتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل دس غزلیں چھپنے کے بعد شاعر میر اور غالب کی شاعری میں کیڑے نکالنے لگتا ہے اور اپنے شعروں میں بے جا اتانیت کا اعلان کرتا ہے۔ اور یہ رویہ اساتذہ کو بھلا بھی لگتا ہے۔ نئی نسل کو ادب میں مقام حاصل کرنے کی بہت جلدی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس لئے آج ادب میں لعل و گہر کم اور کوڑا زیادہ پایا جاتا ہے۔

Mr. Mohammad Tofeeq Khan,  
Tallia, Sironj, M P. 464228, India







رہنے والے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں ان کے دادا کے ساتھ پٹیاں ریاست آ گئے تھے۔ وہاں ان کے دادا عدالت سے منسلک رہے۔ ثریا کے دادا فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ غالباً علم کی طلب ثریا کو ورثے میں ہی ملی تھی۔

اپنے بارے میں انہوں نے بتایا۔ ”میری تعلیم کا آغاز کراچی میں ہوا۔ میں نے ایک پاری اسکول میں پانچویں تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ہم لوگ جالندھر چلے گئے اور وہاں سے تقسیم ہند کے وقت لاہور آ گئے۔ ایف اے میں نے لاہور آ کر کیا اور بی اے کے لیے میں نے لاہور کالج میں داخلہ لیا۔ میرے پاس حساب کا مضمون تھا، کیونکہ میرے والد کا خیال تھا کہ مسلمان طالب علم سائنس جیسے ٹھوس مضمون سے گھبراتے ہیں اور ریاضی ایک مشکل مضمون ہے۔ طالب علم آسان مضمون لے کر خوش رہتے ہیں تاکہ محنت نہ کرنی پڑے، میری خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے میری شادی اس زمانے میں ہوئی جب میں بی اے فائنل میں تھی۔ اس طرح ریاضی سے جلد ہی جان چھوٹ گئی۔

میری کالج کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ گھر میں تیاری کر کے بی اے پاس کیا اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ میرے خاوند آرمی میں تھے۔ ایک دفعہ ڈھاکہ تبادلہ ہوا تو دوبارہ پڑھنے کا جنون پیدا ہوا۔ چنانچہ میں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ڈیڑھ سال انگریزی ڈپارٹمنٹ کے چکر لگائے کہ پھر لاہور آنا پڑا۔ واپسی کی وجہ میرے میاں کی بیماری بھی تھی اور تبادلہ بھی تھا جو کہ فوجیوں کے لیے بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر تین سال میرے خاوند بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ یہ ۱۹۶۹ء کا زمانہ تھا۔

اب زندگی اس دور میں داخل ہو چکی تھی کہ کچھ کرنے کو نہ تو جی چاہتا تھا نہ کہیں سے حوصلہ ملا۔ البتہ مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے ان برسوں میں بہت سنجیدگی سے کتابیں پڑھیں۔ جو اچھی کتاب ہاتھ لگ جاتی میں اس کا مطالعہ ضرور کرتی۔ یہ بھی اپنی دلچسپی کی وجہ سے۔ میں نے کسی پروگرام کے تحت نہیں پڑھا۔ نہ ہی میرا افسانہ نگار بننے کا پروگرام تھا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں جب میں امریکہ آ گئی تو گھر کے قریب والی لائبریری میری ساتھی بن گئی۔ دوسرا کوئی ملنے والا نہیں تھا۔ بس یوں وقت گزر گیا۔ ایک تنہائی تھی کہ زندگی جیسے ایک غار میں گزر گئی۔ مگر گزر رہی گئی۔ یہ اچھا رہا کہ میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ ہر چیز سیکھنے کی پوری کوشش کی، لیکن چاہے کچھ بھی کرتے رہو، تنہائی کہیں نہیں جاتی۔

اسے بھی ایک اتفاق سمجھ لیں کیونکہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں کہانی لکھوں گی۔ البتہ شاعری کا شوق ہمیشہ ہی رہا لیکن وہ بھی باقاعدہ نہیں ہوئی اور اتفاق یہ ہوا کہ ایک بار میں اپنے بڑے بیٹے کے گھر گئی۔ وہاں اس نے مجھے لاس اینجلس سے شائع ہونے والا ہفت روزہ ”پاکستان لنک“ لا کر دیا۔ میں نے اس میں ایک کہانی پڑھی تب میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں



نہ میں بھی کہانی لکھنے کی کوشش کروں۔ اس کہانی نے مجھے حوصلہ دلایا۔ میں نے سوچا کہ یہ اخبار ایک ایسی واوی ہے جہاں مجھ جیسے نووارد سیر کو آنکلتے ہیں۔ میرے احساسات کو مہمیز ملی اور میں نے ایک کہانی لکھ ڈالی۔ اس کہانی کا نام ”گرین کارڈ“ تھا اسے میں نے ”لنک“ میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ چند دنوں کے بعد ”لنک“ کے سابق ایڈیٹر رحمن صدیقی صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ کہانی چھپ گئی ہے اور بڑے اچھے الفاظ میں انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ بلاشبہ اگر صدیقی صاحب اس قدر حوصلہ افزائی نہ کرتے تو دوسری کہانی لکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ دوسرے دن میرے بیٹے نے ”پاکستان لنک“ لا کر دیا۔ اپنی کہانی کاغذ پر چھپی ہوئی دیکھ کر میں سکتے میں آ گئی۔ سچ جانے سلطانہ کہ مجھ میں ہمت ہی نہ تھی کہ کہانی پڑھتی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ میں نے اپنے اصلی نام کے بجائے دوسرا نام لکھا تھا۔ اس طرح ایک عرصے تک میں سعیدہ بانو کے نام سے لکھتی رہی۔ آپ کہیں گی مجھ میں خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ یقیناً تھا۔ میں سوچتی رہی کہ اگر لوگ ہمیں گے تو بے چاری سعیدہ بانو پر ہنسیں گے۔ ثریا تو بچی رہے گی۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ مجھے لکھنے پر ہنسنے میں کسی کی رہنمائی کبھی نہ ملی۔ ورنہ کام آسان ہو جاتا، نہ میں کسی سے واقف تھی۔ جو بُرا بھلا لکھا اسے سیدھا اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ بہت دل چاہتا تھا کہ کسی سے مشورہ کروں، کوئی رائے لوں لیکن ایسا موقع کبھی نہ ملا۔ حالانکہ میرے بھائی مصلح الدین بڑے مانے ہوئے صحافی تھے۔ وہ لاہور ٹیلی وژن سے وابستہ تھے۔ میں نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی شروع کی تھی چنانچہ ایک بار میں نے اپنی غزلوں کی کاپی انھیں دی کہ کسی کو دکھا کر مشورہ کر لیں تاکہ میری راہ نمائی ہو۔ میرے بہت اصرار پر وہ جناب مختار صدیقی صاحب کو دے آئے۔

کچھ دنوں کے بعد میری غزلیات بمعہ ایک رقعے کے میرے ہاتھ آئیں۔ اس رقعے میں مجھے زندگی کی بہت بڑی خوشی ملی۔ میں نے بہت عرصے تک وہ خط سنبھال کر رکھا تھا۔ اگرچہ میرے بھائی نے دیتے وقت کہا تھا کہ وہ ساری تعریف بھائی کے منہ دیکھے کی ہے۔ انھیں مذاق میں چھیڑنے کی عادت تھی اور میں نے کونسا ایسا یقین کر لیا تھا، لیکن پھر حالات بھی کچھ ایسے ہو چلے کہ میں شاعری واری سب بھول گئی اور حالات کے پیش نظر دوسری باتیں زیادہ اہم نظر آنے لگیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ ادب کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ میں نے جو بھی لکھا ہے اپنے تجربے، اپنے مشاہدے کے تحت لکھا ہے۔ مطالعے نے مجھے تکنیک وغیرہ سے واقفیت کرا دی تھی۔ میں اپنی استاد خود رہی ہوں لیکن ایک غلطی مجھ سے ہوئی کہ میں نے اپنے بچوں کو اردو ادب سے بے بہرہ رکھا۔ مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے اور اس کا اعتراف بھی مجھے کھلے ذہن سے کرنا چاہیے۔



میں شکر گزار ہوں اپنے رب کی کہ میرا بیٹا خالد، جس کے ساتھ میں رہتی ہوں، میرے سب کام خوشی خوشی کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے کہ میں لکھتی رہوں۔ اُس کی حوصلہ افزائی سے میں کچھ کر بھی لیتی ہوں۔ اسی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ”جو بھی کچھ ہے“ شائع کرایا۔

یہ میری اولین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ میری دوسری کتاب بھی انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔ میرے نے مویاساں کی کچھ کہانیوں کے ترجمے کیے ہیں۔ ”ہیرے کا نکس“ ان میں سے ایک ہے۔

”دوسری کہانی پیرولیس کی ہے۔ (The widow of Ephesus) اس کا نام میں نے ”وفا کی پتلی رکھا“ ہے۔ یہ اور دوسری کہانیاں ”پاکستان لنک“ میں شائع ہو چکی ہیں۔

ثریا نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کہا ”اردو زبان اور اس کا ادب واقعی بے اعتنائی اور بے قدری کا شکار ہے۔ نئی پود اردو ادب سے مکمل طور پر ایسے بہرہ ہے۔ اس میں ترجیحات کا بہت دخل ہے۔ اب لوگ ٹی وی اور فلمیں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مصروفیت اس قدر ہے کہ لوگ مطالعے سے دور ہو گئے ہیں۔ ہفتہ وار رسائل اور ڈائجسٹوں نے توجہ حاصل کر لی ہے۔ پاکستان ہندوستان سے باہر بسنے والے انگریزی ادب میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، چنانچہ اردو زبان و ادب کو عدم مقبولیت کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے آج کے ادیب کو بھی زمانے کے ساتھ چلنا ہوگا۔ ہر وقت کا، ایک تقاضا ہے۔ اب ترجیحات بدل گئی ہیں۔ اب لوگ اپنے لیے نئے افق کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اگر ہم اپنے ملک کی بات کریں تو وہاں شرح خواندگی حد درجے نیچے ہے۔ گاؤں کے لوگ پڑھے لکھے نہیں، شہر کے لوگ اردو ادب کم پڑھتے ہیں۔ جو پڑھتے ہیں وہ بھی کتاب، کہاں خریدتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لے کر پڑھ لیتے ہیں۔ خواتین ہزاروں روپے کا ایک جوڑا تو بوتیک سے خرید کر پہن لیتی ہیں لیکن کتاب پر خرچ کرتے ہیں نے انھیں نہیں دیکھا۔ ہمارے ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ

(۱) تعلیم ملک میں عام رائج ہو۔ دیہات اور گاؤں میں اسکول کھولے جائیں اور تعلیم

عام کی جائے۔

(ب) اسکولوں کے نصاب میں تبدیلی لائی جائے۔ ایسا نصاب رکھا جائے جس سے

پڑھنے والوں کو ادب سے بھی دلچسپی پیدا ہو۔

(ج) رسالے کتابیں بہت مہنگی بکتی ہیں۔ ان کے سستے ایڈیشن شائع کئے جائیں۔

(د) ہر محلے اور ہر کالونی میں لائبریریوں کا قیام ہو۔ ٹی وی پر نئی کتابوں کو عوام سے

روشناس کرایا جائے۔



(ج) ادیب کو اس کا جائز مقام دیا جائے اور لوگوں میں مطالعے کا شوق پیدا کیا جائے تاکہ ادیبوں کی کتابیں فروخت ہوں اور ان کی آمدنی میں اضافہ ہو۔

امریکہ میں جیسے رائٹنگ ورکشاپ (Writing Workshops) ہیں وہاں ہر عمر اور ہر طرح کے لوگ آتے ہیں اور پڑھنے لکھنے کا کام ہوتا ہے۔ اس طرح ہمارے ملک میں بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے کلب کھولے جائیں جہاں ادیب جا کر اردو ادب کے موضوع پر تبادلہ خیال کر سکیں اور لوگوں کو اپنے علم سے فیضیاب کر سکیں۔ آج کے ادیب کو بھی زمانے کے ساتھ چلنا ہے۔ وہ کچھ لکھا جائے جو زندگی کے نزدیک تر ہو۔ خواب آلود نغموں کے دن نہیں رہے۔ ادب کو زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرنی ہے۔ اردو ادب ہماری روایات، ثقافت اور تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ اگر ہم اردو ادب سے کٹ گئے تو ہم اپنی روایات اپنی تہذیب سے دور ہو جائیں گے۔ لکھنے والوں اور عوام کے نوئے رابطے پھر سے جوڑے جانے چاہئیں۔ ایک ادیب کو معاشی فکروں سے نجات ملنی چاہیے کیونکہ اقتصادی حالات ہی اسے اعلیٰ پائے کی تخلیقات رقم کرنے کی طرف رجوع کرنے نہیں دیتے۔

آپ مغرب کے ممالک کا جائزہ لیں۔ چرچل کے لکھے ایک ایک حرف کی قیمت چکانی گئی ہے۔ حالانکہ جنگ کے بعد برطانیہ کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ امریکہ کی تو بہت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہاں تو لکھنے کے لیے ایڈوانس میں ہی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ایلس واکر (Alice Walker) تین ملین ایڈوانس لے کر اپنے آبائی گاؤں چلی گئی اور ایک برس کی مدت میں دی کٹر پریل (The Colour Purple) لکھ کر لے آئی۔ ہمارے ہاں بھی ایک سے ایک عظیم لکھنے والے ہیں، مگر قد دان نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں ترجمے کے محکمے میں بھی بہت ست رفتاری ہے۔ مقتدرہ اکیڈمی پر واجب ہے کہ وہ اس شعبے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دے۔ ہم دوسرے ملکوں کے ادیبوں کو انگریزی زبان کے توسط سے پڑھتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ گو ترجمہ بے شک ایک مشکل فن ہے۔ لیکن یہ بڑی اہمیت کا حامل بھی ہے۔ اردو ادب کا لکھنے والا، اردو ادب سے دلی وابستگی رکھتا ہے اور اس کا نکھار اور رعنائیاں اُجاگر کرنے کے لیے اپنی زندگی اس میں سمو دیتا ہے لیکن اقتصادی مسائل اسے گھیرے رہتے ہیں۔ اردو ادب کے لکھنے والوں میں ایسی معتبر ہستیاں ہیں جن کے تخلیقی کارناموں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے کی ضرورت ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ آئے میں نمک کے برابر ہے۔ ایسے کئی اداروں کا قیام عمل میں لانا ضروری ہے جن کے تحت یہ کام انجام دیئے جائیں۔ آپ کو میں الیگزینڈر موثرے کی مثال دوں۔ اس نے اپنے خطبے میں کہا تھا ”ادب، ناقابل تردید انسانی تجربات کو نیچوڑ کر ایک اور بے بہا طریق سے منتقل کرتا رہا ہے یعنی ایک نسل سے دوسری نسل کو۔ یوں یہ قوم کی زندہ یادداشت بن جاتا ہے اور جو کچھ تاریخ کے دھند لکوں میں جا چکا ہوتا ہے۔ ادب میں تروتازہ رہتا ہے۔“



”ٹریا، آپ نے کن ادیبوں کو پڑھا اور آپ کے پسندیدہ ادیب کون رہے؟“  
 ”کچھ ادیب تو ایسے ہیں جن کے نام یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اردو ادب میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، سعادت حسن منٹو، ایسے لکھنے والے ہیں جن کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ میں صرف نثر کی بات کر رہی ہوں۔ منشی پریم چند کی بعض کہانیاں ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ خواتین میں قرۃ العین کو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔“

میں کالج کے دنوں میں کرشن چندر کو پڑھا کرتی تھی۔ ان کی کہانیوں میں حقیقت اور تخیل کا میل جول مجھے خوب بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ہی ان کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بن گیا تھا۔ بعد کی کہانیوں میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ان کی کہانیوں کی خاص خوبی شدت تاثر ہے جبکہ راجندر سنگھ بیدی کے یہاں عورت کے مختلف روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ راجندر سنگھ بڑے دلچسپ لہجے میں حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے اور قاری کے سامنے زندگی کے دلدوز اور دلفکار حقائق پیش کرتا ہے۔ میں جس طرح کرشن چندر سے متاثر ہوئی اسی طرح مغرب کے لکھنے والوں میں نالسنائی، چیخوف، دوستوفسکی، ڈی موپاساں اور کافکا میرے خیالات پر بہت اثر انداز ہوئے۔ میں نے ان کے کارناموں کو بہت دل لگا کر پڑھا۔ میرے پاس بہت وقت ہوتا تھا اور دوسرے مطالعے کا بھی مجھے بے حد شوق ہے۔ چیخوف تو مختصر کہانیوں (Short Stories) کا شہنشاہ کہلاتا ہے۔ نالسنائی بہت عظیم لکھنے والا ہے۔ کافکا علامت نگاری کے باوجود واقعات اور حقائق کو کمال تفصیل سے پیش کرتا ہے۔ وہ ایک اور بجنل تخلیق کار ہے اور ایک زبردست کرافٹسمین (Craftsman) ہے۔ وہ قاری سے اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی کہانیاں پڑھ کر زندگی کی تفہیم بہتر طور پر کر سکیں۔ اس کی کہانیوں میں ہر واقعہ اور عمل اپنے ساتھ نتائج لاتا ہے۔  
 بانو قدسیہ بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ جیلانی بانو کو میں نے پڑھا نہیں مگر سنا ہے کہ وہ بہت اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں میں نے پڑھا ہے۔ پڑھنا اور پڑھتے رہنا میرا مشن ہے۔“

Suraiya Inam

3670, Ralston Avenue

Hill Sbrough, CA94010 USA.

PAKISTAN:

Block No:2 Street No, 133

Defence Society, LAHORE CANTT

LAHORE PAKISTAN





مقولہ: ماواں مُنڈیاں چھاواں  
جامعہ لکھنؤ

## جاوید اختر پاشا

نیویارک، امریکہ

روشنی میں کبھی کبھی ایسی کرن بھی مل جاتی ہے کہ جو چھو لے تو ”پارس“ بنادے اور پارس جسے چھو لے وہ ”اکسیر“ ہو ہی جائے۔

یہ جملہ میرے قلم سے اس وقت لکھا گیا جب میں نے جاوید پاشا کے کالموں کے مجموعے ”انقلاب آفریں“ میں جناب محترم حکیم سعید کی لکھی درج ذیل تحریر پڑھی۔

”ایک بزرگ و برتر عالم کا معمول تھا کہ ایک مہمان کو کھانا کھلائے بغیر خود کھانا نہ کھاتے۔ کسی دن مہمان نہ آتا تو خود ڈھونڈ لاتے۔ ایک روز وہ ایک مہمان کو ڈھونڈ لائے جس نے خوب سیر ہو کر کھایا مگر کھانے سے پہلے نہ تو بسم اللہ پڑھی اور نہ بعد میں رب کا شکر ادا کیا۔ بزرگ عالم کو افسوس ہوا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا مہمان مسلمان نہ تھا انہیں دکھ ہوا کہ نیکی ضائع ہو گئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے مکالمہ کیا کہ اے بندے ہم تو اس منکر کو نوے برس سے کھانا دے رہے ہیں تم ایک ہی بار میں پریشان ہو گئے؟“

جناب حکیم سعید کو مرحوم لکھنے کے لئے دل آمادہ نہیں کہ وہ تو مسکراہٹ بانٹ کر زندگی دیتے تھے۔ ایسا شخص مرحوم کیسے ہو سکتا ہے۔ جس کی شیریں کلامی مریضوں کے درد کی دوا تھی اور جس کا یقین تھا کہ کرۂ ارض پر جو انسان برائی کا جواب اچھائی سے دینے پر قادر ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ تو ان پر مہربان



ہوتی جاتا ہے مگر انسان کے دل بھی جذبہ انتقام سے خالی ہو جایا کرتے ہیں۔

آپ جاوید اختر پاشا سے ملیں تو وہ حکیم سعید صاحب کے اس قول کی تصویر و تفسیر نظر آتے ہیں۔ اور غالباً ان کے مزاج کی اسی خوبی نے انہیں صحافت کے ایک شعبے ”تعلقات عامہ“ سے وابستہ کر دیا اور پھر ان سے تعلقات عامہ کی خوبیوں، اصولوں اور طریقہ کار پر ایک کتاب بھی بنام ”تعلقات عامہ“ انقلاب آفریں لکھوائی۔ جس کے فلیپ پر روزنامہ ”پاکستان آبزرور“ اور ہفت روزہ ”حرمت“ کے ایڈیٹر انچیف، جناب زاہد ملک نے لکھا۔ ”پاکستان میں تعلقات عامہ کو جاوید اختر پاشا کی سرپرستی حاصل ہو گئی ہے۔ وہ محسن تعلقات عامہ ہیں۔ پاکستان میں جن چند حضرات نے تعلقات عامہ کی آبیاری کی ہے ان میں جناب جاوید اختر پاشا سرفہرست ہیں۔“

میں نے جاوید اختر پاشا سے پوچھا کہ افسانے لکھتے لکھتے آپ صحافت کی دایوں تک کیسے

آن پہنچے؟

کہنے لگے، ”صحافی بننے کا خناس بھی ماموں مقصود الہی شیخ کا پیدا کردہ تھا۔ دراصل بی اے کرنے کے بعد ایم اے کی ڈگری صحافت میں لینا چاہتا تھا لیکن یار لوگوں نے صحافیوں کے بھوکے مرنے کی اتنی داستانیں سنائیں کہ میں نے سیاست کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔“

میں نے انہیں وہیں روک دیا کیوں کہ صحافی اور وہ بھی افسانہ نگار، گویا کہ کڑوا کر یلا اور وہ بھی نیم چڑھا، اگر بولنے پر آجائے تو اچھے اچھے سیاست دانوں کو مات کر دے۔

میں نے کہا، ”ہم بتدریج آگے بڑھتے ہیں۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے کس سرزمین پر جنم لیا؟“  
جاوید کہنے لگے ۲۶ / اکتوبر ۱۹۴۲ء کے دن پنڈی گھوپ پٹیاب پاکستان کی سرزمین پر جنم لیا۔ راولپنڈی کے گورنمنٹ ڈگری کالج سے بی اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سیاست، تاریخ اور انگریزی میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔

”بادشاہو! تین مضامین میں ایم اے کی اسناد لینے کے بعد۔۔۔“ ہم نے کہنا چاہا مگر افسانہ نگار جاوید نے موقع ہی نہیں دیا۔ کہنے لگے، ”دراصل اسے بھی اتفاق ہی کہیے کہ زندگی کے چار سال شعبہ تعلقات عامہ اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے میں اور ایک سال ٹیلی ویژن کے شعبے میں گزارنے کے بعد ہم کسی اور کام کے طور پر ہی نہیں چناں چہ باقی تمام زندگی ذرائع ابلاغ عامہ کی ترقی و ترویج اور درس و تدریس میں گزاری۔ میں نے دو ادارے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ریلیشنز اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز قائم کئے اور انہیں بیس سال سے زائد عرصے تک کامیابی سے چلایا۔ ان اداروں کے ذریعے پاکستان کو ہزاروں تربیت یافتہ ماہرین اور نئے اسلوب دیے۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے نیویارک آنا پڑا۔ یہاں گزشتہ چھ سال سے یعنی ۱۹۹۷ء سے میں نے پاکستانی برادری کے لئے ایک ٹیلی ویژن نیوز پروگرام روزنامہ، جاوید اختر پاشا کے ساتھ شروع کیا۔ یہ پروگرام نیویارک کے علاوہ آس پاس کے علاقوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جس ادارے کے تحت یہ پروگرام کیا جاتا ہے اس کا نام کلر آف ایشیا



ٹی وی نیویارک (Color of Asia T V New York) ہے۔ اردو پروگرام میں کسی نہ کسی ایک کنبے کو کسی کاروائی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ پروگرام ناظرین میں مقبول ہے۔

”مگر آپ تو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ افسانے لکھنے کا آغاز کب ہوا تھا؟“

جاوید نے سوچتے ہوئے کہا: ”میری پہلی کہانی غالباً ۱۹۵۸ء میں روزنامہ ’جنگ‘ میں شائع ہوئی تھی۔ شعر تو میں نے کبھی نہیں کہا لیکن کہانیاں لکھتا رہا۔ میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ’فسانے تیرے‘ اور دوسرا ’خواب کیا کیا‘ کتابی شکل میں قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ تعلقات عامہ پر معلوماتی مضامین ’تعلقات عامہ‘، ’انقلاب آفرین‘ بھی شائع ہو چکا ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے میں ہفت روزہ ’نیوز پاکستان‘ نیویارک میں باقاعدگی سے کالم لکھ رہا ہوں اس اخبار کے مدیر اعلیٰ جناب مجیب الرحمن لودھی نے میرے افسانوں کے دونوں مجموعوں کو قارئین تک پہنچانے کے لئے تمام تر تکلیفیں اٹھائیں۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ میرے دوست ظفر اقبال قریشی (جواب اس دنیا میں نہیں رہے) نے بلاشبہ حق دوستی نبھایا۔ جناب مقصود الہی شیخ، مرزا ادیب، سید ضمیر جعفری، افتخار عارف، آغا ناصر، محترمہ شبنم شکیل، احمد جاوید جیلانی، ڈاکٹر شوکت محمود میکسم اور انجم خلیق قریشی نے حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی تو غالباً میری تخلیقات عوام تک نہ پہنچتیں۔

اب میرے کالموں کا مجموعہ ’آئینہ ایام‘ (غیر سیاسی اور سیاسی مطبوعہ، ہفت روزہ ’نیوز پاکستان‘ نیویارک) اور نظم و نسق (مطبوعہ ہفت روزہ صدائے پاکستان نیویارک) زیر طبع ہیں۔ گزشتہ پانچ سال سے زائد عرصے سے یہ مضامین یا کالم ان دونوں اخبارات میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ویسے ’آئینہ ایام‘ کا آغاز ۱۹۷۷ء کے اوائل میں روزنامہ ’حریت‘ کراچی سے ہوا اور کافی عرصہ جاری رہا۔ جب کہ میں نیویارک آمد سے پہلے روزنامہ ’الاخبار‘ اسلام آباد میں کالم ’صبح جہاں‘ تو اتر سے لکھتا رہا ہوں۔

جاوید بتا رہے تھے، ”مجھے اردو صحافت یا اردو ادب سے مالی اعتبار سے آج تک تو ایک دھیلے کا بھی فائدہ نہیں ہوا۔ البتہ دوستوں اور چاہنے والوں سے پیار، محبت اور خلوص بے پایاں ملا جس کے لئے اُن سب کا احسان مند ہوں۔“

انہوں نے کہا: ”ادیبوں کی گروہ بندی سے نقصان کم لیکن اردو کی ترویج و ترقی میں بہت مدد ملی ہے۔ فوری حوالوں میں محترم احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے اسمائے گرامی ہیں۔ نیویارک میں کئی گروہ ہیں جن کی راہیں جدا لیکن منزل ایک ہی ہے۔“

اردو کے مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کہا: ”پاکستان تو اردو کا مستقبل ہے۔ البتہ بھارت نے اردو بولنا اور سمجھنا اپنا لیا ہے لیکن رسم الخط بدل کر لکھنا اونچی ماری ہے۔ ویسے اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں کیوں کہ نیویارک میں اس وقت ۱۰ سے زائد اردو اخبارات باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں ایک اردو ادبی مجلہ ’زاویہ‘ کسی بھی عالمی معیار کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق نہایت مضبوط حلقہ ہے جہاں کم از کم ہر پندرہ گھنٹے حاضری پچیس تیس سے کم نہیں ہوتی۔



درجنوں انجمنیں ہیں جو اردو کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ مقامی طور پر پانچ ٹی وی پروگرام ہیں۔ باقی شہروں میں بھی کم و بیش یہ ہی صورت حال ہے۔“

جاوید اختر پاشا کے پسندیدہ ادیبوں میں مرزا ادیب، اشفاق احمد، بطرس بخاری اور احمد ندیم قاسمی کے نام سرفہرست ہیں۔ پسندیدہ شعرا میں فیض احمد فیض، احمد فراز اور ناصر کاظمی ہیں۔ ان کا موٹو ہے ”کسی کو اپنا بنا لو یا کسی کے ہو جاؤ“

ان کی زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ ہے جب نیویارک کا ٹریڈ سنٹر تباہ ہوا تھا۔ دہشت گردی کا یہ واقعہ کسی لمحے بھی ان کے ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے۔ جب کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ امن پسند ہیں۔

میں نے ان کے افسانوی مجموعے ”خواب کیا کیا“ کی پہلی کہانی ”جگنو“ پڑھی۔ ان کی بیانیہ تحریر میں روانی اور کہانی کا رچاؤ ہے۔ ایک بچہ جو ٹی وی کارٹون پروگرام کے دوران یونیسف کی جانب سے دیئے گئے اشتہار میں بھوک اور فاقے سے متاثر زدہ انسانی ڈھانچہ دیکھ کر خوف سے موت کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس کہانی کو جاوید اختر پاشا نے کس موثر انداز میں تحریر کیا ہے کہ قاری کہیں رکتا ہی نہیں۔

دوسری کہانی ”دیکھا جو تیر کھا کے“ اخبار میں روزانہ پیش گوئیوں سے اٹھائے گئے موضوع پر ہے جس میں فرخ اپنے برج کے تحت ہونے والی اس دن کی پیش گوئی کو پڑھتا ہے..... ”آپ کو اغوا کیا جانے کا خدشہ ہے۔“ پھر کہانی میں ایک اہم موڑ آتا ہے کہ اس پورے پلاٹ کے کرداروں میں بینک کا اعلیٰ افسر فرخ کا پڑوسی یا مین خان اور فرخ کا عم زاد جو ایک ماہر نفسیات ہے اور اخبار میں ”آج کا دن کیسے گزرے گا“ کا کالم نگار، شامل ہیں۔ گویا کہ گھر کے بھیدیوں نے نہ صرف لڑکا ڈھائی بلکہ گھر کے چراغ بن کر گھر کو آگ لگا دی۔

اب میں آپ کو دوسری کہانیاں نہیں سناؤں گی۔ آپ خود کتاب خرید کر جاوید پاشا کی کہانیاں پڑھیں کہ جو مزہ پڑھنے میں ہے وہ سننے میں کہاں!

Mr. Jawaid Akhtar Pasha,

122-12, 18<sup>th</sup> Avenue, College Point, NY. 11356, USA

e-mail: coatr@aol.com





میوشی مندی یہ کہے دیکھ حقیقت کو امیر  
دلِ نادان یہ کہے رہنے دے خوابوں کا امیر  
سید جعفر امیر  
۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء

## سید جعفر امیر امریلوٹیکس، امریکہ

زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ادیب و شاعر پیدا ہوتے رہیں جو نہ صرف بدلتے وقت اور حالت کی عکاسی کریں بلکہ شارع عام سے ہٹ کر فکر و انشا کی نئی منزلیں تلاش کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو زبان میں التباس کی وجہ سے جمود پیدا ہونے کا خطرہ اور ادب کی ترقی کے مفقود ہو جانے کا ڈر ہے۔ زبان کے ارتقاء میں مضمون آفرینی اور جدت طرازی کی اہمیت کے ذکر میں سید جعفر امیر رضوی کا خیال آ جاتا ہے۔ سید جعفر امیر امریکہ کی ایسی ادبی شخصیت ہیں جو نئی فکر کے ساتھ ایسے عنوانات اور موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں جن پر اردو زبان میں کم لکھا گیا ہے۔ امیر کی سخن وری کی انفرادیت اور تحریری تخلیقات کی وجہ ان کے ابتدائی زندگی کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ جعفر امیر سے ملنے سے قبل ان سے میر انیس کا یہ شعر سن لیں۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر ہم نے پتہ گراں کر دیا

سید جعفر امیر رضوی حیدر آباد دکن کے ایک معزز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد سید منظور حسین رضوی مرحوم جن کا آبائی وطن لکھنؤ تھا، حکومت حیدر آباد کے اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور اسلامی تاریخ کے عالم بھی تھے۔ ان کی کتاب ”سلطنت حیدر آباد کے آخری



ایام“ وکن کے خاندان آصفیہ کے آخری زمانے کی پُر آشوب تاریخ ہے۔ امیر کے جدِ اعلیٰ میں موخر الذکر سید اصدق حسین رضوی، مؤلف ”لغات کشوری“ تھے۔

امیر کی پرورش میں ان کے گھر کے ادبی اور تعلیمی ماحول کا بہت دخل ہے۔ ان کے والدین زبان کی صحت اور تلفظ کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے۔ اس ماحول کی وجہ سے انھیں بچپن ہی سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ امیر کی ابتدائی تعلیم انگریزی میڈیم کے اسکول میں ہوئی جس کی وجہ سے انگریزی ادب سے انھیں دلچسپی ہو گئی۔ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں انھوں نے انگریزی کے ادب و شعرا اور ادبِ عالیہ کا کافی مطالعہ کیا تھا جس کا اثر آگے چل کر ان کی اردو کی تخلیقات پر ہوا۔ ہائی اسکول پاس کر کے جب وہ نظام کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو ان کے ادبی ذوق کی رہنمائی عربی اور فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ دستگیر نے کی۔ امیر نے ڈاکٹر عبداللطیف (مترجم قرآن پاک) سے انگریزی شاعری میں استفادہ کیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھیں نثر نگاری کا شوق انگریزی کے مضامین کے مطالعے سے اوائل عمر ہی سے ہو گیا تھا۔ ان کے سائنس اور انجینئرنگ پر لکھے ہوئے ان گنت مضامین امریکہ کے پروفیشنل جریدوں اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

امیر کی ادبی کاوشیں اردو اور انگریزی ادب میں بٹی ہوئی ہیں اور اس وجہ سے یہ کبھی کبھی ترجمہ کا کام بھی کرتے ہیں۔

امیر نے جاپانی زبان کی انگریزی میں مترجمہ کتاب Gossamar Years کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کے تحریک کی ضمن میں انھوں نے بتایا کہ ایک شام ان کی صاحبزادی نے انھیں گوسامرایرز کی کتاب پڑھنے کو دی۔ کورس کی یہ کتاب دراصل ایک جاپانی نواب زاوی کا روزنامہ تھی جس کو ایک ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کی مصنفہ کو دنیا کی اولین مصنفات میں شامل کیا جاتا ہے۔ امیر کو اس کتاب سے اتنی دلچسپی ہوئی کہ وہ اسے رات بھر پڑھتے رہے اور گوسامرایرز کے دلچسپ واقعات، تاریخی اہمیت اور دیگر خوبیوں سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ امیر ایک ہزار سال پرانی جاپانی تہذیب، اس زمانے کی ازدواجی زندگی، معاشرت، تاریخ، آداب و رسوم اور مذہب سے اردو دانوں کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گوسامرایرز میں جابجا مختلف کرداروں میں تحریری تبادلہ منظوم ہے جسے کبھی اردو میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس میں مناظر کی تصویر کشی بھی بہت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔

امیر کا خیال تھا کہ گوسامرایرز کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کیونکہ ان کو ان دونوں زبانوں کی مشق ہے۔ لیکن جب ترجمہ کرنا شروع کیا تو ان کو مشکلات کا اندازہ ہوا۔ انھیں انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے اردو، فارسی اور عربی لغات کی مدد لینا پڑی۔ بہر حال تین سال کی طویل مدت میں امیر نے گوسامرایرز کا ایسا ترجمہ کیا کہ کوئی ملاوٹ کی تہمت نہیں لگا



سکتا۔ انھوں نے گوسامرایہ کی نثر کا اردو میں لفظی ترجمہ کیا اور جو شاعری تھی اس کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔  
 آزاد ترجمے میں الفاظ سے زیادہ مفہوم پر زور دیا جاتا ہے۔ چند مثالیں وضاحت کے لیے پیش ہیں کہ  
 قارئین لفظی ترجمہ اور آزاد ترجمہ کے اصول جو اس کتاب میں استعمال ہوئے ہیں، سمجھ سکیں۔  
 مثال نمبر (۱)

I have grown away from the world what have these irises to  
 do with me.

منظوم آزاد ترجمہ:

فرق کیا ہوگا ہمیں رسم عبادت سے بھلا زندگی سے نہ زمانے سے سروکار ہمیں  
 لفظی ترجمہ: میرا دل دنیا سے سیر ہو گیا ہے۔ اس آئی ری کس (تہوار) سے مجھے کیا لینا۔  
 مثال نمبر (۲)

THESE THOUGHTS TORMENT ME IN INFINITE DETAIL  
 AND TEARS FALL AS THE DROPS OF RAIN

منظوم آزاد ترجمہ:

کس قدر مجھ کو ستاتے ہیں خیالات مرے آب باراں کی طرح اشک مرے جاری ہیں  
 لفظی ترجمہ: یہ خیالات مجھ کو بے حد پریشان کرتے ہیں اور میرے آنسو بارش کے قطروں کی طرح بہتے  
 ہیں۔

مثال نمبر (۳) نثر کا لفظی ترجمہ:

\* The Eighth Year of Tenryaku (954)

I SHALL not touch upon the frivolous love notes I had  
 received from time to time. Now the Prince was beginning  
 to send messages. Most men would have gone through a  
 suitable intermediary, a lady in waiting perhaps, but he went  
 directly to my father with hints, possibly half-joking at first,  
 that he would like to marry me; and even after I had  
 indicated how inappropriate I found the idea he sent a  
 mounted messenger to pound on my gate. I scarcely  
 needed to ask who it was. With the house in an uproar, I  
 finally had to take the message, though I would have  
 preferred to refuse it. My women only became noisier.



It consisted of but on verse: "sad am I, mid talk about the warbler, May not I too hear its voice?"

(ترجمہ) ”منہ چلے اور عشقیہ خطوط جو وقت بہ وقت مجھے ملتے تھے ان کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ مگر اب شہزادے نے بھی پیغام بھیجنا شروع کر دیے ہیں۔ عام طور پر تو عاشق اپنے خط کسی نامہ پر یا کسی بڑی بوڑھی کے ہاتھ بھیجتے ہیں، مگر شہزادے نے میرے والد سے رابطہ کیا اور ان سے کبھی اشارے کنائے اور کبھی ہنسی مذاق میں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا ہے۔“

گو سامرا یز کا ترجمہ کرتے وقت امیر نے محسوس کیا کہ اردو، فارسی اور عربی کی لغات میں ایک لفظ کی مختلف صورتیں اس کے مصدر کے ساتھ نہیں لکھی جاتی ہیں جیسے انگریزی لغات میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حصول، محصل، تحصیل، حاصل، محصول، محاصل وغیرہ اپنے مصدر کے تحت نہیں لکھے جاتے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ اردو کی اور اکثر فارسی کی لغات جو عام استعمال میں ہیں، کسی مرکزی اصول کے تحت نہیں لکھی گئی ہیں، یعنی کسی لغت میں تذکیر و تانیث ہے تو واحد و جمع نہیں۔ اعراب کبھی لفظوں پر دیے ہیں اور کبھی نہیں دیے ہیں۔ لغات میں ان کمزوریوں کی وجہ انہیں معلوم نہ ہو سکی۔ لہذا ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے انہوں نے ایک نئی لغت لکھنا شروع کی ہے جس میں مصدر کے تحت تذکیر و تانیث، واحد و جمع، اسمیت و صفیت، تصغیر، اعراب سے تلفظ کی وضاحت ایک جگہ ہوں گی۔

یہاں اس امر کا انکشاف دلچسپ ہو گا کہ امیر کے پرانا، جناب سید تصدق حسین رضوی صاحب لکھنوی نے جو اپنے زمانے کے فارسی اور عربی کے عالم تھے نول کشور پریس کی سرپرستی میں لغات کشوری لکھی تھی۔ یہ لغت اردو زبان کی اولین لغات میں سے ایک ہے جس میں مغربی لغات کی ترتیب (Format) کو استعمال کیا گیا تھا۔

امیر نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی تھی۔ اگر ان کی نیچرل شاعری کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ اس میں منظر نگاری اور احساسات کی تپش کے ساتھ ساتھ بیان میں تفصیل اور خیالات میں غیر معمولی تسلسل ہے۔ عام طور سے شاعری میں مضامین جیسا انداز بیان نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تفصیل نثر نگاری تک محدود رہتی ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے امیر کے تعارف میں ان کی شاعری کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

ان کا کہنا ہے، ”زبان کے ترقی پذیر ہونے کے لیے نئی فکر و انشاء کی اہمیت کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حالی، اقبال، جوش، خلیل جبران، رومی، ورڈس ورث (Wordsworth) وغیرہ اپنی زبانوں کے ایسے شعراء تھے جن کی اہمیت ان کی بلند پایہ شاعری کے علاوہ اس بات سے بھی ہے کہ انہوں نے ایک نئی روش اختیار کی۔ مثال کے طور پر اردو زبان میں مولانا حالی نے عشق و حسن کی آزمائی ہوئی رومانوی شاعری سے ہٹ کر نیچرل اور مذہبی موضوعات پر لکھا اور زبان کی وسعت فکر کو بڑھایا۔

موجودہ دور میں شاعری کے میدان میں سید جعفر امیر نے ایسے موضوعات جن پر اردو میں کم



یا کچھ نہیں لکھا گیا تھا، طبع آزمائی کر کے ایک نئی روش پیدا کی ہے۔ ان کی نظمیں، بہار، کنگھی، پیاز، نمیند، لفظ کی چارہ گری، روح ابن بطوطہ، قرطبہ کی مسجد، وغیرہ اور فطری مناظر پر لکھی ہوئی نظمیں، برسات، سرما، گرما، بہار، خزاں، آمدِ سحر، گاؤں کی رات، ترشح، چودہویں کا چاند، نشاطِ شب، دو گز کا سمندر، ستارے، وغیرہ مضمون آفرینی کی ایسی یکتا مثالیں ہیں کہ میراثیں کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو  
امیر نے نہ صرف نئے موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا بلکہ شاعری میں جدت بیان اور فکر کی بلاغت سے مضمون کی مخفی اور ظاہری صورتوں کو ابھارا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا انفرادی پہلو ہے جو اکثر ان کی نیچرل شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے ”چونکہ موجودہ دور میں جبکہ رومانی اور سیاسی شاعری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، میں نے اپنا زیادہ تر تخلیقی کام نیچرل شاعری اور انسان کے باطنی احساسات کی عکاسی پر کیا ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ غزل کے مقابلے پر نیچرل شاعری کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرنا آسان نہ ہوگا، پھر بھی میں نے یہ مشکل راستہ اختیار کیا۔ دراصل میرا مزاج ہے کہ آسان راہ کے ذریعے سستی شہرت کا خواستگار بننے کے بجائے مشکل راستہ اپنا کر کوئی نئی چیز پیش کی جائے۔ میں شاعری اپنے ذوق کی تکمیل اور ادب کی خدمت کے لیے کرتا ہوں۔ میرا یہ شعر دیکھئے،

بزلیہ سخی سے ملے تعریف سخن کاری کی نہ کریں دوست ستائش مری فنکاری کی  
امیر کی نیچرل شاعری کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی الفاظ کے رنگوں میں تصویر اتار رہا ہے۔ وہ شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔ کیونکہ ان کی قلمی نقش نگاری کے رنگ کسی آزمودہ مصور کے برش سے بنی ہوئی تصویروں سے کم نہیں ہیں۔ مثال دینے سے خیالات کی تشریح ہوتی ہے لیکن نیچرل شاعری کی مثال چند اشعار میں پیش کی جائے تو منظر کشی کی خوبصورتی ظاہر نہیں ہوتی۔ چنانچہ امیر کی نظم ”آمدِ سحر“ کے تین بند ملاحظہ ہوں۔

ادائے ناز سے لیتی سحر ہے انگڑائی نشانِ رخصتِ شب ہے اذانِ مرغِ چمن  
افق کے موڑ پہ ابھری گہر کی لالی سی سپیدہ ہو گیا لو ارضِ مشرقی کا بدن

☆

ہے رقصِ رنگِ فجرِ بادلوں کی چادر پر کہ جیسے قوسِ قزح پھیل کر بکھر جائے  
کہیں ہیں سرخ، کہیں زرد اور کہیں اودے طلائی گوٹ سی دامن میں جیسے لہرائے

☆

کھلیں جو کلیاں، مہکنے لگی چمن کی فضا فسوں کی جیسے کہر چھا گئی ہے عالم پر  
ظہور پڑھتے ہیں مل کر درود و حمد و ثنا سکوتِ آب پہ الٹا ہے عکسِ نقشِ شجر

کہر سے میں اپنا صبح کا یہ منظر اور پرندوں کی سحر انگیز بولیوں کو امیر نے ایسا خوبصورت پیکر عطا کیا ہے کہ قاری خود کو اسی فضا میں موجود محسوس کرتا ہے۔ یہ ان کی نیچرل شاعری کی گہری محبت اور وابستگی کا پرتو



ہے۔ انھیں محبت ہے بادلوں سے، آسمانوں سے، چاند و ستاروں سے، مہکتی صبحوں سے، سنگی راتوں سے، صحراؤں و ریاضوں سے، موجوں سے اور پرندوں سے۔

وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو منظر کشی کے ساتھ ساتھ ان کیفیتوں کو بھی بیان کر دیتے ہیں جو ان مناظر کو دیکھ کر جنم لیتی ہیں۔ ”موسم برسات“ کی طویل نظم کے آخر میں بارش کے منظر کو دیکھتے ہوئے اپنے ماضی اور حال کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔

میں بھی گوشے میں کہیں اک پیڑ پر لیٹے ہوئے  
یہ نظارہ دیکھتا تھا اپنا سر ٹیکے ہوئے

وہ زمانہ اب کہاں جو بھائے گی ساون کی رُت  
کیا پتہ تھا اک آگ سی بن جائے گی ساون کی رُت

کوکتی کوئل ہے کیوں، کیوں آگنی ساون کی رُت  
اور اپنی نظم ”خزاں“ میں اپنی زندگی کی خزاں کی جھلک اس طرح دیکھتے ہیں،

میں اکیلا ہی یہاں نقش جہاں دیکھا کروں  
خار و خس اُڑتے ہوئے بادرواں دیکھا کروں  
پیڑ سے ٹیکا لگا کے یہ سماں دیکھا کروں  
عکس ہستی ان مناظر میں نہاں دیکھا کروں

زندگی کا موسم بے کیف پھر جاری ہوا  
فصل گل رخصت ہوئی، افسوں غم طاری ہوا  
نیچرل شاعری ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ خیالات کے بہاؤ کو خوبصورت و موزوں الفاظ کی لڑیوں میں پرونا کبھی کبھی تو جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا مگر جعفر امیر جنھوں نے اپنے اسلاف کی شاعری سے استفادہ کیا ہے اور پھر ان کی گہری نظر انگریزی شاعری پر بھی ہے چنانچہ وہ ”جوئے شیر“ لانے کی مہم کیوں نہ سر کر لیتے۔

اُن کی انھی خوبیوں اور ادب کی خدمات کے اعتراف میں مالپگاؤں مہاراشٹر اہندوستان سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے ”توازن“ کے مدیر جناب عتیق احمد عتیق نے ان کا ایک خصوصی گوشہ ”توازن“ کی سہ ماہی اشاعت مارچ ۲۰۰۳ء میں شائع کیا ہے جس میں خود عتیق صاحب نے انھیں ان کی نیچر یا الطبیعیہ شاعری پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس گوشے میں سید جعفر امیر کی شاعری اور ان کی دیگر ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جناب عبدالحمید سرور، نقوش نقوی (مدیر سخن ور کراچی پاکستان) ناصر رضوی، خالد خواجہ، رحمن صدیقی، سلطانہ مہر اور ڈاکٹر انیس قدوائی (امریکہ) نے مضامین لکھے ہیں۔

اردو زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں،  
”اردو زبان کو رومن (انگریزی) یا دیوناگری حروف میں لکھنے کے بارے میں میری رائے  
نشی میں ہے۔ اس رائے کی دلالت میں منطق کے بجائے میں ترکی زبان کی مثال پیش کرتا ہوں۔ کمال



اسا ترک نے ترکی زبان کا رسم الخط عربی سے رومی (Latin) کر دیا اور اوپر سے حکم نافذ کیا کہ ترک قوم اپنا لباس، تہذیب اور معاشرت یورپی اختیار کرے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ان کی قوم ترقی کرے گی اور یورپ ترکی کو برابر کا درجہ دے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا، بلکہ ترک یورپ کے بیمار کہلانے گئے۔ انسان جب اپنی زبان، تہذیب اور تمدن کی خود عزت نہیں کرتا تو اس کی خودداری ختم ہو جاتی ہے اور پھر دنیا بھی اس کی عزت نہیں کرتی۔ کواچلا ہنس کی چال... ترقی کجا آج ترکی زیادہ پس ماندہ ہے اور مغربی دروازوں پر کھڑا دستک دے رہا ہے کہ اندر بلاو۔

اُردو زبان کو بدلنے کی تحریکیں پہلے بھی چلی تھیں اور یہ کہا جاتا تھا کہ اُردو میں اتنی سکت نہیں کہ مغربی سائنسی علوم کی ترجمانی کر سکے۔ حضور نظام بادشاہ حیدر آباد دکن کا بھلا ہو کہ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کی مدد سے تمام مغربی علوم کا اُردو میں ترجمہ کیا اور یونیورسٹی میں سائنس کی تعلیم اُردو میں رکھی۔ اس طرح منکرین پر ثابت کیا کہ اُردو زبان مشکل سے مشکل خیال کو بڑی تمکنت سے ادا کر سکتی ہے اور بغیر اپنا رسم الخط بدلے۔

تجویز کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ اُردو زبان میں ف، ق، خ، ز، ژ جیسی آوازیں انگریزی زبان کے حروف کس طرح ادا کریں گے۔ اس تبدیلی سے اُردو زبان کیا اُردو زبان رہے گی؟ جب ہندو، چینی، کوریائی اور اسی طرح تیسری دنیا کی دوسری قومیں اپنی زبانوں کا رسم الخط نہیں بدل رہی ہیں تو ہم پر کیا مصیبت آئی ہے۔

Mr. S.J. Amir

P.O.BOX 33402

AMARILLO, TX 79120

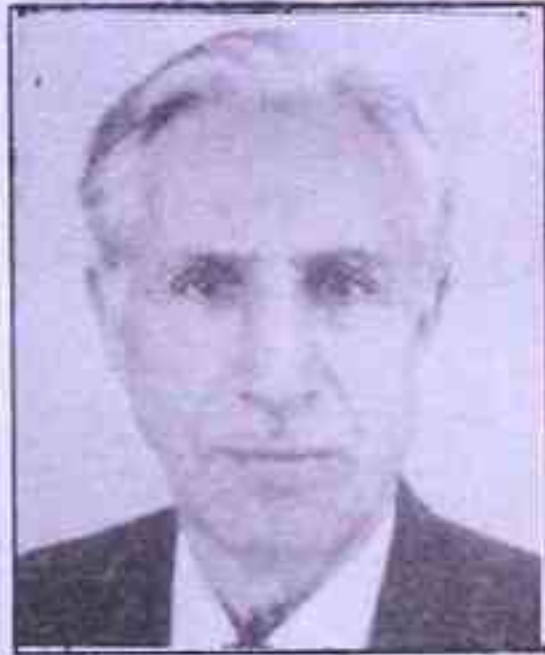
USA



اَلَا تُكِنُّ شَيْئًا مَّا خَلَقَ اللّٰهُ بِاِطْلَاقٍ  
وَسُئِلَ نَعِيمٌ لَا مُحَالَهَ شَرِيفٌ

ترجمہ: اس بات کو خوب جان لو کہ خدا کے سوا ہر چیز کا عقل ہے اور  
نعمت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عقل ہے اور شریف بنی اسرائیل کا عقل ہے

جمال  
دینی دہشتہ



## ڈاکٹر جمال الدین جمال

کیلیفورنیا، امریکہ

بڑے مرتجان مرنج انسان ہیں ڈاکٹر جمال الدین صاحب۔ ہمیشہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالا  
اور ریت سے سونے کے ذرات برآمد کیے۔ خوبی ان کی یہ بھی ہے کہ فنی تعلیم ان کی ایم بی بی ایس ہے۔  
ایکمرے کے اسپیشلسٹ ہیں پیشہ بھی یہ ہی ہے مگر رغبت اور وابستگی اردو شاعری کے عروض و اوزان سے  
ہے۔ اور اسی موضوع پر کئی مفید اور مستند کتب لکھی ہیں۔

یہ ہمارے عزیز شاعر ناصر خان ناصر کے استاد ہیں۔ یا یوں کہیں کہ ناصر خان نیو اور لینڈ  
اوزیانہ (امریکہ) میں بیٹھ کر بھی ڈاکٹر جمال الدین کے قدموں میں بیٹھے ملتے ہیں تو یہ ناصر خان کے  
مقدر کا عروج ہے اور ان کے کردار کی حسن و خوبی بھی۔

ڈاکٹر جمال الدین نے اپنی عمر کا ایک نہایت قیمتی حصہ اردو ادب کے سرمائے میں اضافے  
کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اب وہ عمر کی اس منزل پر ہیں کہ جہاں آرام زیادہ ضروری ہوتا ہے مگر ڈاکٹر  
جمال کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے قائل ہیں۔ ابھی حال ہی میں اردو عروض اور اردو شاعری میں مروجہ  
اوزان پر ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر جمال الدین ۱۱/ اپریل ۱۹۲۳ء کے دن موضع سلہریاں کلاں تھانہ کلیریاں تحصیل



وسو بہ ضلع ہوشیار پور پنجاب (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی، انگریزی، ہسپانوی اور پنجابی زبان پر بھی مطالعے کی حد تک دسترس و کمال حاصل ہے۔ ان کی دل چسپی کے مضامین ہمیشہ سے عروض، ریاضی اور فزکس رہے۔ فنی تعلیم ایم بی بی ایس کے ۱۹۴ء میں کیا اور ایکسرس اسپیشلسٹ (ڈی ایم آرای) کی ڈگری کے ۱۹۵ء میں لی۔ سرگزگارام اسپتال لاہور میں ریڈیو تحیر اپسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور طبیب الاشعہ مستشفی الزہرہ مکہ معظمہ (سعودی عرب) میں بھی رہے۔

ڈاکٹر جمال نے بتایا ان کی ادبی زندگی کا آغاز ایف ایس سی کی تعلیم کے دوران ہوا۔ لاہور کے رسالے ”ساز“ میں ان کے لکھے چھ مضامین اور چند افسانے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر جمال شعر بھی کہتے ہیں اور اردو پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔

نثری کتب میں انہوں نے ”اردو شاعری میں مروجہ اوزان“ کے عنوان سے تین سو سالہ اردو شاعری میں سے ۷۶ (76) شعرا کی دس ہزار غزلوں کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ کتاب میسرز ناشرین لاہور سے شائع ہوئی ہوئی ہے۔

دوسری کتاب ”تفہیم العروض“ ہے جس میں عربی فارسی اور پنجابی کے عروض پر بحث کی گئی ہے اور معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی میسرز ناشرین الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر جمال نے ہائی اسکولوں کے لئے انگریزی میں نصابی کتب ہائی جین، فزیالوجی اور دو کتابیں پنجابی میں فرسٹ ایڈ اور بچوں کی دیکھ بھال پر بھی لکھی ہیں۔

بیگم شکیلہ جمال کے اشتراک سے ان کی دو ادبی تالیفات بعنوان (i) پاکستانی پنجابی چوٹوں کویتا کے ۱۹۴ء سے ۱۹۹۰ء تک اور (ii) پاکستانی پنجابی چوٹوں کہانی کے ۱۹۴ء تا ۱۹۹۰ء تک شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ اس کے ایم بی بی ایس کے لئے بعنوان Fractures and Their Treatment جناب پروفیسر اے کے توفیق کے اشتراک سے کتاب لکھی ہے جو مذہبی کتب شائع کرنے والی ”ریجنس بک سوسائٹی“ انارکلی لاہور پاکستان نے شائع کی ہے۔ ان کے اردو میں لکھے مضامین کا مجموعہ اردو و پنجابی کلام کا مجموعہ زیر طبع ہے۔

گوٹا گوں خصوصیات کے مالک ڈاکٹر جمال سے میں نے پوچھا کہ ادیبوں کی گروپ بندی کا آپ بھی شکار ہوئے یا نہیں؟

انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر بڑے سنجھے ہوئے لہجے میں کہا.....

”ادیبوں کی گروہ بندی ہمیشہ سے رہی ہے۔ یہ اردو سے مخصوص نہیں بلکہ ہر زبان کے ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ بندی سے زبان و ادب کو صرف نقصان ہی نہیں بلکہ کچھ فائدہ بھی پہنچتا ہے کیوں کہ اس سے مسابقت کی فضا پیدا ہوتی ہے اور ہر شخص آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے میں اس میں حرج محسوس نہیں کرتا۔“



ڈاکٹر صاحب نیا گلے سوال کے جواب میں کہا.....

”میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ میں اردو ادب کو اپنا کر شہرت اور مالی اعتبار سے خسارے میں رہا ہوں۔ کیوں کہ میں نے ادب کو پیشہ نہیں بنایا اس لئے مالی نفع و نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر میں عربی یا فارسی میں لکھتا تو بھی مالی اعتبار سے صورت حال کچھ مختلف نہ ہوتی۔ مالی منفعت تو صرف انگریزی میں لکھنے میں ہے اور میں ٹیگور یا سروجنی ٹائیڈ و جینی انگریزی نہیں جانتا۔ علم عروض ہمارے اسلاف کی ایجاد ہے مسلمانوں نے دیگر علوم از قسم جیومیٹری، --- اور طب وغیرہ اہل یونان سے لے کر انہیں مزید ترقی دی مگر عروض ہم نے کسی دوسری قوم سے نہیں لیا بلکہ الجبرے کی طرح خود ایجاد کیا ہے۔ آج کل نثری نظم کے رواج کی وجہ سے عروض کے جاننے والے کم ہوتے جا رہے ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کی ایک بڑی کتاب لکھ کر اس گراں بہا علم کو محفوظ کر دیا جائے۔ نہ اس میں کوئی مالی منفعت ہے اور نہ ہی یہ میرا مقصد تھا۔“

اردو کے مستقبل کے تحفظ کے حوالے سے انہوں نے کہا، ”اس سوال کا مکمل جواب چند سطور میں دینا ممکن نہیں اس لئے میں اس کے صرف عملی پہلو پر (بغیر دلائل کے) چند گزارشات پیش کروں گا۔

■ اردو کی بقا کا دار و مدار تو حکومتوں کی پالیسیوں پر ہے جو فی الحال اس کے خلاف ہیں۔ اس لئے اردو بولنے لکھنے اور پڑھنے والوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسمبلیوں کے ممبروں کے ذریعے حکومتوں کو اردو کے حق میں بولنے کے لئے مسلسل کوشش کریں۔

■ اگر آپ کی مادری زبان اردو ہے اور آپ پاکستان میں رہتے ہیں تو مقامی زبانوں کے الفاظ اور محاورات کو اردو میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔

■ اگر آپ پاک و ہند سے باہر رہتے ہیں تو اپنے بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا ضرور سکھائیں۔ پاک و ہند سے کتب و افرقہ اد میں لائیں اور انہیں اپنے گھروں میں رکھیں اور لائبریریوں میں رکھوائیں۔

■ پاک و ہند میں اردو کی تنظیمیں جو واقعی کچھ کام کر رہی ہیں ان کو مالی مدد دیں۔

■ اب چوں کہ شاعری میں استاد شاگردی کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا ہے اس لئے بڑے شاعروں اور ادیبوں اور نقادوں کو چاہیے کہ اپنے تنقیدی مضامین کو نو عمر شعرا اور ادبا کے نقائص کو گنوانے تک محدود نہ رکھیں بلکہ ان نقائص کو دور کرنے کی طرف بھی رہنمائی کریں۔ جو ادبی تنظیمیں تنقیدی اجلاس منعقد کرتی ہیں انہیں خصوصاً ادھر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

■ اردو کتب بہت مہنگی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ کتب فروشوں کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ کمیٹی ادویات بنانے والوں سے 15 فیصد کمیشن لیتے ہیں جب کہ کتب فروش پبلشر سے 50 فیصد کمیشن لیتا ہے۔ ادبی تنظیموں کو چاہیے کہ ریزولیشنز کے ذریعے حکومتوں پر زور دیں کہ کتب فروشوں کا کمیشن بھی 15 فیصد کیا جائے۔“



اردو زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کے متعلق انہوں نے کہا، ”میں اردو رسم الخط بدلنے کا سخت مخالف ہوں۔ جہاں تک نقائص کا تعلق ہے دنیا کا کوئی رسم الخط ان سے مبری نہیں۔ انگریزی (رومن) رسم الخط میں اردو رسم الخط سے کہیں زیادہ نقائص ہیں۔ اردو کا رسم الخط بدلنے سے نہ صرف ہم عربی اور فارسی سے کٹ جائیں گے بلکہ اردو ادب کا سارا سرمایہ بھی ضائع ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر جمال کو عرب شعرا میں زہتیر، کعب بن زہیر، خنسا، عمر بن ابی ربیعہ، جریر، فرذوق، گمیت اور معری؛ فارسی کے سعدی، حافظ اور خیام اور پنجابی کے وارث شاہ اور فضل شاہ اور اردو کے سید انشاء، غالب، نظیر اکبر آبادی، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض پسند ہیں۔

اردو کے مستقبل کے حوالے سے ڈاکٹر جمال الدین جمال نے جو پیش قیمت مشورے دیے ہیں اگر ان پر عمل درآمد ہو تو بلاشبہ اردو زندہ و پائندہ رہے گی۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر جمال الدین کی نگرانی میں عروض کی تعلیم دینے کے لئے کلاسوں کا اجرا کیا جائے تو یقیناً نئے دور کے شعرا بالخصوص مغرب میں اردو کے مقیمین شعرا و شاعرات فیضیاب ہوں گے۔

Dr. Jamal-ud-din,

8920 Royal Gateway, Elk Grove, CA 95624, USA





ایک دگرے کی عزت کرو۔ نغرتوں میں دکھائی کی ہے۔  
انسانی سطح پر سب برابر ہیں۔ بڑا کون چھوٹا کون!

جمشید مرزا ۱۵/۱/۵۱

## جمشید مرزا

ہیز، میڈل سیکس، برطانیہ

پروفیسر امین مغل نے جب جمشید مرزا کی کہانیاں پڑھیں تو کہا، ”یہ اپنی کہانیوں میں تبصرہ نہیں کرتے اور اخلاق کی صحت کو نہیں کھنگالتے۔ یہ بھی افسانہ نگاری کی ایک ٹیکنیک ہے۔“

افسانہ نگار شاہدہ احمد نے ان کی کہانیوں کے مجموعے ”دیکھیں کیا پایا“ میں لکھا، ”یہ دھیسے لب و لہجے کی کہانیاں ہیں۔ ان کی کہانی ’پھر کیا ہوا؟‘ میں اگر ان کا قلم ذرا سا بھی غیر محتاط ہو جاتا تو کہانی میں عورت کی نسائیت مجروح ہونے میں دیر نہ لگتی۔“

صفیہ صدیقی کہتی ہیں، ”عام طور پر لوگ نئی نسل کے گم راہ ہونے کا ردِ ناروتے نظر آتے ہیں گم راہ ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مغرب میں ہوں۔ نئی نسل پاکستان میں بھی گم راہ ہو سکتی ہے۔ جمشید مرزا نے اپنی کہانیوں میں نوجوان نسل کو بڑے اہتمام اور احترام سے پیش کیا ہے۔“

جمشید مرزا نے ایک ناول بعنوان ”سنگرور“ لکھا۔ یہ جمشید مرزا کی جنم بھومی ہے۔ جمشید نے ۱۹۳۴ء میں اسی مٹی میں جنم لیا۔ سنگرور مشرقی پنجاب کی ایک چھوٹی سی ریاست ’حیدر‘ کی راج دھانی تھی۔ وہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا تناسب ایک جیسا تھا۔ چالیس پچاس ہزار کی وہ آبادی پُر امن اور تعصب سے پاک تھی۔ جب بھارت اور پاکستان کی سرحدوں کا اعلان ہوا تو بعض شری پسندوں کی وجہ سے



ملک میں قتل و غارت گری کی آگ پھیل گئی۔ لاکھوں بے گناہ جان سے گئے۔ اس آگ کے شعلے ریاست حیدر میں بھی پہنچے مگر سنگرور بچا رہا۔ یہ ہی ناول 'سنگرور' کا موضوع ہے، امن کے دوران اور امن کے بعد۔

جمشید مرزا نے ایک سفر نامہ بھی لکھا ہے اور اسے ایک بڑا خوب صورت اور پرکشش اور دل آویز نام دیا، "اے پرندو کیا تمہیں یاد ہے؟" وہ کہہ رہے تھے، "مدتوں سے ہندوستان جانے کے لئے سوچ رہا تھا۔ اپنے آبائی شہر اور جائے پیدائش، سنگرور، حیدر، تاریخی شہر دہلی، آگرہ، لکھنؤ دیکھنا تھا۔ بچپن میں عبداللہ پور، جگا دھری اور سہارنپور سے آگے نہیں گیا تھا۔ پاکستان ہجرت کے بعد بھی جانے کا کوئی موقع نہیں ملا۔" چنانچہ جمشید مرزا نے سفر نامہ لکھا۔ اس کتاب کی اور ان کی کہانیوں کے مجموعے "ہم آپ کو بھولے نہیں" کی تعارفی تقریب اسلام آباد میں ادبی تنظیم "استعارہ" نے منعقد کی۔ اس کتاب کی تعارفی تقریب لندن کے بعد ہندوستان کی دہلی یونیورسٹی میں بھی منعقد ہوئی۔ جہاں مشہور افسانہ نگار، جوگندر پال نے اس موقع پر کہا، "اس سفر نامے میں پنجابی کے ایک چھوٹے سے فقرے نے مجھے بڑا محظوظ کیا۔ دروازے ڈھا ڈتے، پر سڑکاں اونہی نے۔ یعنی دروازے ڈھا دیئے گئے مگر سڑکیں تو وہی ہیں۔" انہوں نے کہا، "یہ لوگ جو باہر سے آتے ہیں وہ لکھتے نہیں بلکہ باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریروں میں نیا محاورہ اور نیا پن ہوتا ہے۔ گیلی مٹی کی طرح اپنے خیال، ماحول اور ضرورت کے مطابق ڈھال لیتے ہیں جس سے اردو زبان میں وسعت اور قوت پیدا ہو رہی ہے۔ قاری کو نئی چیزیں پڑھنے کے لئے مل رہی ہیں ان میں ایک خاص مزا ہے۔"

جمشید مرزا کی زندگی کا فسانہ بھی معلومات کے لحاظ سے کم دلچسپ نہیں۔ ان کے آباؤ اجداد جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے وقت دہلی چھوڑ کر ریاست حیدر کی راج دھانی سنگرور میں آکر آباد ہوئے۔ جہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ یہ سلسلہ پاکستان بننے تک قائم رہا۔ ۱۹۴۷ء میں یعنی تقسیم ہند کے وقت سنگرور ان چند جگہوں میں سے ایک تھا جو فسادات کے دوران مذہبی تعصب اور قتل و غارت گری سے بچا رہا۔ بائیس ہزار (۲۲۰۰۰) مسلمان جو سنگرور سے چار (۴) میل کے فاصلے پر مرزا خورشید بیگ کی قیادت میں دو ماہ امن ہونے تک کیمپ میں رہے (اس کی تفصیل سوانحیاتی ناول سنگرور میں موجود ہے)۔ پھر تین ریل گاڑیاں ان لوگوں کو لے کر بالترتیب بھلول، ضلع سرگودھا، خانیوال اور ملتان لے کر پہنچیں۔ جمشید مرزا کا کنبہ پہلے بھلول، پھر لاہور اور آخر میں راولپنڈی کے آریہ محلہ میں قیام پزیر ہوا۔ آریہ محلہ کمپنی باغ (تبدیل شدہ نام لیاقت باغ) کے بالمقابل تھا۔ اسی کمپنی باغ میں قائد ملت وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے وقت جمشید مرزا اسٹیج سے تقریباً تیس (۳۰) گز کے فاصلے پر تھے۔ جہاں ہزاروں لوگ نے قائد ملت کی تقریر کا انتظار کیا تھا اور جہاں وہ تقریر کے دوران شہید ہوئے تھے، اسی کمپنی باغ میں جمشید مرزا میونسپل لائبریری کی کتابوں سے مستفید ہوئے اور وہاں مشاہیر کو دیکھا اور سنا۔ جن میں عطا اللہ شاہ بخاری، علامہ عنایت اللہ مشرقی، سردار عبدالرب نشتہ، قاسم رضوی، قیوم خان (سرحد)، سہروردی، خواجہ ناظم الدین اور ذوالفقار علی بھٹو قابل ذکر ہیں۔

۱۹۵۳ء میں میٹرک کے بعد جمشید مرزا نے ڈرافٹس مین (Draftsman نقشہ نویس) کا کورس کر کے منگلا ڈیم میکانیکل ڈویژن کے ڈرائنگ آفس میں انچارج مقرر ہوئے۔ سات سال کی



ملازمت کے بعد ۱۹۶۳ء میں برطانیہ چلے آئے۔ یہاں وقتاً فوقتاً اپنے علم، ضرورت اور شوق کے لئے مختلف کورس، ملازمتیں اور کاروبار کرتے رہے۔ بال روم ڈانسنگ (Ball-room Dancing) میں برانز میڈل (Bronze medal) کا نسی تمغہ (اور ڈرامیٹک آرٹ (Dramatic Art) میں لندن اکیڈمی سے سلور میڈل (Silver medal) فکری تمغہ) حاصل کیا۔ میری لینڈ دو برن میں فلم میکینگ (Film Making) کا کورس کیا جس میں ان کے گروپ کو اول نمبر ملا۔

۱۹۷۶ء میں برمنگھم سے راولپنڈی اپنی کار میں تنہا سفر کیا اور تیرہ (۱۳) روز میں پہنچے۔ پٹرول اور دوسرے اخراجات کے لئے دو سو (۲۰۰) پونڈ لے کر چلے تھے۔ راولپنڈی پہنچے تو ایک پورا پونڈ بھی جیب میں نہ تھا۔ سفر تکلیف دہ، خطرناک مگر بے حد دل چسپ تھا۔ چند روز کے بعد فیصل آباد جا کر ۱۹۷۴ء کے ایک ہیرو اور اپنے محبوب لیڈر مرزا خورشید بیگ سے ملاقات کر کے کچھ مزید معلومات حاصل کیں کیوں کہ ذہن میں ان کے متعلق فلم بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور ان کی شخصیت سے جذباتی حد تک متاثر تھے۔ ان ہی دنوں کچھ اسکرپٹ نمائندگیاں لکھ ڈالیں۔ وہ تحریریں اپنے والد مرزا حسن یار بیگ کو سنائیں، جو خود بھی آغا حشر کے ڈرامے اسٹیج کرتے تھے۔ انہوں نے ان کو پسند کیا۔ برمنگھم واپس آ کر محمود ہاشمی صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں وہ فائل دکھائی۔ انہوں نے چند صفحات پڑھے اور فرمایا۔ مگر اسے پورا کریں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ زندگی کی مصروفیات نے الجھائے رکھا۔ خواب خواب ہی ہوتے ہیں۔ وہ کاغذات پڑے پڑے پیلے ہو گئے اور بعد میں ناول ”سنگرز“ لکھنے میں مددگار ثابت ہوئے۔

۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک انہوں نے وسط لندن میں ریسٹورنٹ کا بزنس کیا۔ نقصان کی صورت میں اسے بند کر دیا۔

میں نے پوچھا، ”جمشید! آپ نے افسانہ نگاری کا سفر کب شروع کیا؟“ جمشید نے کہا، ”اس عمل کی ابتدا کا وقت اور جگہ تو صحیح یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ حالات بدلتے رہے، زمینیں بدلتی رہیں، حساس طبیعت اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھواتی رہی۔ مگر سنجیدگی سے یہ عمل اردو مرکز، لندن سے شروع ہوا۔ اردو مرکز، لندن ۱۹۸۱ء میں قائم ہوا۔ الطاف گوہر، تحریک ورلڈ فاؤنڈیشن کے سربراہ تھے۔ اردو مرکز اس کا ذیلی ادارہ تھا۔ افتخار عارف اس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء سے جولائی ۱۹۹۰ء تک مجھے بھی اس عظیم ادارے اور افتخار عارف جیسی شخصیت کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مغربی ممالک اور خاص طور پر برطانیہ میں اردو کو فروغ دینے والا یہ ادارہ مالی مشکلات کی وجہ سے اگست ۱۹۹۰ء میں بند ہو گیا۔ مجھے اردو مرکز، لندن سے منسلک ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ افسانہ نگار جتیندر بلو نے اپنا تعارف کرایا۔ جتیندر پشاور میں پیدا ہوئے اور کچھ عرصہ ممبئی فلم انڈسٹری سے وابستہ رہے۔ اب لندن میں آباد ہیں۔ برطانیہ کے ادبی حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ میں ان کی صاف ستھری اور حقیقت پر مبنی کہانیاں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ چند لمحے میرے سامنے بیٹھ کر وہ مگریت کے کش لگاتے رہے۔ میں چائے پیتا رہا۔ موسم سے بات چلی تو اردو ادب، بین الاقوامی سیاست اور پھر اپنی زندگی کے تجربات ہم ایک دوسرے کو



سنانے لگے۔ آدمی کھڑے اور بات سننے اور سنانے والے تھے اس لئے دوستی کی طرح ڈل گئی۔ اپنے کاروبار کے متعلق کچھ تلخ حقائق جتیندر بلو کو سنائے جو چند ہفتے پہلے ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے رائے دی کہ میں وہ واقعات قلم بند کروں۔ یہ ایک دل چسپ اور انوکھا موضوع ہے اور چونکہ میں ان سے گزرا ہوں اس لئے خود لکھوں۔ میں نے سنا اور بات آئی گئی ہوئی۔

چند ہفتے بعد میں نے محسوس کیا کہ اردو ادب کے اس ادارے میں جہاں پاکستان، ہندوستان، یورپ، روس امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کے رسائل اور اخبارات ہیں وہیں اردو کتب کا بھی اچھا انتخاب موجود ہے۔ مجھے لگا کہ مجھ میں پھر سے مطالعے میں دل چسپی پیدا ہو رہی ہے۔ اور کچھ لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ میں نے لکھا، کاٹا، پھر لکھا، بار بار لکھا ہوا پڑھا، مگر اس میں نفرت اور تعصب کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوئی تعمیری پہلو نظر نہیں آیا۔ موضوع کا قصور نہ تھا لیکن بات کہنے اور لکھنے میں فرق تھا۔ لکھنے کی پکڑ صحیح نہ تھی۔ اسے ضائع کر دیا۔ تاہم لکھنے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ ایسا لاؤ جلائے کا شوق نہ تھا جس کی روشنی میں لوگ صرف مجھے دیکھ لیں اور اس کی گرمی محسوس ہی نہ کریں۔ یہ الاؤ اندر ہی اندر جلا اور بجھ گیا۔ لیکن گرم راکھ کے نیچے چنگاری پڑی رہی۔ باطن کے سکون کے لئے حساس طبیعت نے طرح طرح کے ذرائع ڈھونڈے۔ اپنے اضطراب اور بے چینی سے نکل کر ایک عام زندگی گزارنے کی کوشش کرتا رہا جس میں آرٹ (art فن) اور ادب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ماضی کو بھولنا اور حال سے سمجھوتہ کرنا کتنا مشکل ہے..... کسی وقت محبت کی وجہ سے معمولی بات بھی برداشت نہیں ہوتی اور..... بعض اوقات اسی محبت کی وجہ سے بڑی بڑی باتیں ہم برداشت کر جاتے ہیں لیکن جو ہماری روح مجروح ہوتی ہے، اس سے رستے ہوئے خون کو تو کوئی نہیں دیکھتا۔

اردو مرکز صرف لائبریری ہی نہ تھا بلکہ وہاں ایسے ایسے دانشور اکابرین اور مشاہیر تشریف لاتے جنہیں برسوں ڈھونڈتے رہیں تو ان سب سے ملاقات نہ ہو۔ برصغیر ہند سے آئے ہوئے یا اردو مرکز کی دعوت پر بلوائے گئے نقادوں، ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے اعزاز میں اعلیٰ سطح پر ادبی محفلوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ یہ محفلیں زیادہ تر لندن یونیورسٹی، نیوزی لینڈ ہاؤس یا اردو مرکز کی عمارت میں ہوتی تھیں۔ تمام ممبران کو باقاعدہ دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ اردو ادب میں دل چسپی رکھنے والے مختلف رنگ و نسل اور مذاہب کے لوگ جوق در جوق آتے تھے۔

اردو کے قلم کاروں کے علاوہ دوسری زبانوں کے قلم کار بھی افتخار عارف کے پاس آتے رہتے تھے جن سے ہم فیض یاب ہوئے۔ لندن یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں صدیوں سے ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کی جتنی کتابیں اور لائبریریاں یہاں ہیں، وہ ملک کی آبادی اور تناسب کے لحاظ سے شاید ہی کسی دوسرے یورپی شہر میں ہوں۔ میں نے ان لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ افتخار عارف صاحب کے مشورے اور سید معین الدین شاہ مرحوم، فاروق حیدر، صفیہ صدیقی، محمد ارشد اور عبدالرزاق مرحوم کے تعاون سے ”ایشین لنک“ کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد نوجوانوں اور والدین کے درمیان رابطے کو مضبوط کرنا تھا۔ بہت سے کامیاب جلسے ہوئے۔ جن میں



نصیر احمدی (فلم ڈائریکٹر) اور رشید احمد صدیقی کے اعزازی جلسے سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ لیکن ۱۹۹۰ میں ملازمت کے جانے سے یہ تنظیم بھی بند ہو گئی۔ طبیعت کیونکہ تبدیلی پسند ہے اس لئے ملازمت چلے جانے کا زیادہ افسوس نہ ہوا لیکن ادارے کے بند ہونے کا دکھ ضرور ہوا کیوں کہ یہ مشرق اور مغرب کے درمیان اردو ادب کا ایک چوراہا تھا جہاں بہت معیاری جلسوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بہت سی ادبی انجمنوں کو شعر اور ادب کے علاوہ اردو سے محبت رکھنے والوں سے رابطے کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔

۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء تک پھر ضرورت، مجبوری یا شوق سے پڑھائی کا سلسلہ شروع کیا۔ کل وقتی یا جزو وقتی کورس کیے۔ جن میں کمپیوٹنگ (Claite--RSA)، بزنس ایڈمنسٹریشن (NVQ Business Administration--Finance, RSA) اور تعلیم بالغان سرٹیفکٹ (Adult Teaching Certificate, City & Guild) خاص طور پر مفید اور دل چسپ تھے۔ اردو میں نثر نگاری اور ادبی محفلوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

جمشید شعر نہیں کہتے مگر شوق سے سنتے ضرور ہیں۔ اظہار خیال کے لئے اب تک نثر کو ہی اپنایا ہے۔ ویسے ان کی بیگم شوکت مرزا شاعرہ ہیں اور انہوں نے یورپ میں بچوں کے لئے اردو کا پہلا میگزین ”بچوں کی باتیں“ کا اجرا کیا اور اب اسے باقاعدگی سے شائع کرتی ہیں۔

جمشید نے بتایا کہ اردو ادب سے وابستگی ان کے لئے باعث فخر و اطمینان ہے۔ اردو ادب نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ ہاں ادب میں گروہ بندی لندن ہی میں نہیں، پاکستان میں بھی دیکھی ہے۔ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس ادیبوں کے بیٹھنے کی ایک معروف جگہ تھی جہاں تین چار ادیب اور شاعر ہمیشہ علیحدہ علیحدہ اپنی ہی مخصوص میز کے گرد بیٹھتے تھے اور اپنے گروپ کے لوگوں کو آگے بڑھاتے تھے۔ اسی لئے لکھنے کا فن غیر ملکی تراجم کو چھوڑ کر ایسا آگے نہیں بڑھا جس سے ریفرمیشن (reformation) اصلاح اور تشکیل نو) ہوتی اور نئے لوگوں میں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق آگے بڑھتا۔

جمشید کی رائے میں اردو زبان میں اتنی لچک اور طاقت ہے کہ اس کا مستقبل تاریک نہیں ہوگا۔ جغرافیائی لحاظ سے آثار چڑھاؤ ہوتے رہیں گئے اسی طرح جمشید اردو رسم الخط بدلنے کے بھی حامی نہیں ہیں۔

جمشید کے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست میں ممتاز مفتی، منو، قدرت اللہ شہاب، گوپی چند نارنگ، افتخار عارف، کشور ناہید، زاہدہ حنا، جوگندر پال، ولیم جیمز، میاں عبدالحکیم، وزیر آغا، ذیل کارنیگی، ڈاکٹر افتخار حسین، ڈاکٹر فاخر حسین، شورش کاشمیری اور فلپ کے بیٹی (Philip K Hitti) کے نام ہیں جن کی تحریر کچھ سیکھنے اور کچھ کرنے کا دلولہ پیدا کرتی ہے۔

”میں یہاں بتانا چاہوں گا کہ مجھے جناب رالف رسل کے متعلق معلوم تھا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، اردو کے عالم و دل دادہ ہیں اور یہ کہ زبان بہت صاف بولتے ہیں۔ میں نے ”ایشین لنک“ کے جلسے کا دعوت نامہ دیا اور کہا کہ کچھ ٹیچر صاحبان بھی آئیں گے آپ بھی تشریف لائیں۔ فرمانے



لگے، میں ٹیچر نہیں ہوں، تھوڑا سا ہنسے اور چل دیئے۔ ان کا یہ رویہ مجھے پسند نہیں آیا مگر میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر میں نے 'گفتنی'، حصہ ال؛ صفحہ ۲۳۸ تا ۲۵۰ پر سلطانہ مہر کا لکھا ہوا جناب رالف رسل کا تعارف پڑھا تو میری رائے میں تبدیلی آئی اور موصوف کا احترام بھی بحال ہو گیا۔ جس طرح سے محترم جمیل الدین عالی نے سلطانہ مہر کے انٹرویو کے دوران محبت و احترام کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح سے انہوں (رالف رسل) نے اپنی زندگی اردو سیکھنے اور پڑھانے میں گزار دی۔ ایک مرتبہ کسی جلسے میں پروفیسر صاحب نے کہا کہ ایشیائی قلم کار خاص طور پر جو تھوڑا سا وقت لے کر یورپ آتے ہیں ان کی تحریروں میں زیادہ تر یورپ کی جنسی آزادی اور شراب کا ذکر ہوتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ یورپ کی اچھائیوں کا ذکر بھی کریں تاکہ ان کے ممالک کے لوگوں میں اچھے کام کرنے کا شوق پیدا ہو۔ میں ان کی اس بات سے سو فی صد متفق ہوں اور سمجھتا ہوں یہ بہت ضروری ہے اور قابل غور ہے۔ بہت سے ادیب ایسا بھی کر رہے ہیں۔ مغربی میڈیا میں بھی بتدریج تبدیلیاں آرہی ہیں۔

جمشید مرزا نے اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سنایا..... ایک کوئل کا یادگار واقعہ جسے وہ اپنے سفر نامے "اے پرند کیا تمہیں یاد ہے" میں لکھ نہیں پائے۔ جمشید مرزا کہہ رہے تھے، "میں اپنی جائے پیدائش سنگرور کو نصف صدی کے بعد دیکھنے گیا اور جب سنگرور پہنچا تو ایک درخت کے پاس کھڑے ہو کر اپنے تصور میں پرندوں سے یہ کہا، اے پرند کیا تمہیں یاد ہے جب میں چھوٹا سا تھا تو ان میں سے ایک دو نے چونچ اور گردن گھما کر دیکھا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ لیکن ان میں کوئل نہ تھی کیوں کہ پھل دار درخت کاٹ دیئے گئے تھے۔ کوئل کی آواز آم کے موسم میں وہاں گونجتی تھی۔ سنگرور سے واپسی پر دہلی، پھر لکھنؤ ایک چھوٹے سے مگر خوب صورت گھر میں ٹھہرا جس میں ایک گیٹ، چھوٹا سا گارڈن اور اونچا کھجور کا درخت تھا۔ میزبانوں سے گفتگو اور کھانے کے بعد گہری نیند میں تھا کا ماندہ سو گیا۔ صبح ہی صبح کوئل کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ غور کیا تو ایسا لگا جیسے کہہ رہی ہو..... تم کون ہو/ تم کون ہو۔ اور آواز بلند ہوتی گئی۔ کسی وقت آواز بدل جاتی تو لگتا کہ کہہ رہی ہو..... تم کہاں سے آئے ہو/ کہاں سے آئے ہو/ کون ہو۔ آواز اتنی بلند اور پیاری کہ دل میں کبھی جا رہی تھی۔ سوچا غالباً کوؤں کی طرح کوئل کی بھی عمر زیادہ ہو۔ شاید سنگرور کے پرندوں نے اسے کچھ بتایا ہو اور مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئی۔ دل تڑپا۔ جلدی سے چادر ہٹائی اور کمرے سے باہر نکلا۔ کھجور کے درخت پر پیاری کوئل بیٹھی تھی۔ جیسے ہی میں باہر نکلا تو 'تم کون ہو' کی آواز اس کے حلق میں دھنس گئی۔ ایک ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ چند لمحے بعد اس نے پروں کا جھاڑا، انگڑائی سی لی۔ لگتا تھا کہ ایک لمبی اڑان کے بعد وہ اپنی تکان اتار چکی ہے۔ پھر یک دم پھر سے اڑ گئی۔"

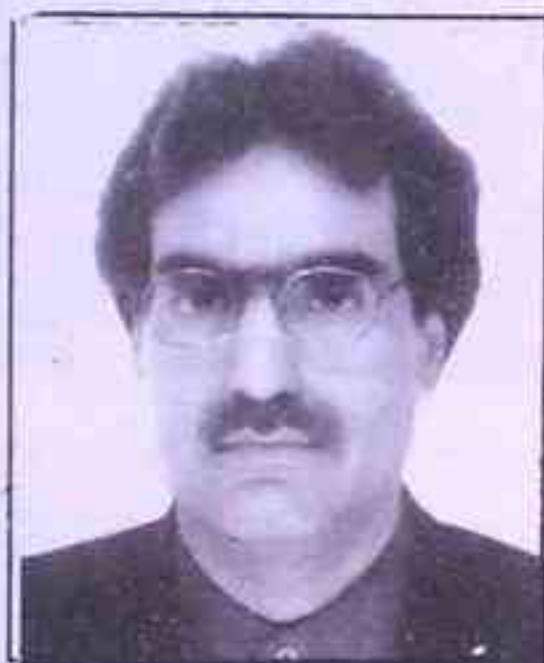
Mr. Jamshed Mirza,

13 Bramley Close, Hayes, Middlesex, UB3 2JU, UK.



۱۔ اعلیٰ درجہ کی اصلاح پر متفق رہے۔ چنانچہ ان کی اصلاح  
کے اصول کو ہمیں دیکھنا کہ انسان اور دنیا میں کبھی کسی کو  
کہ نہ کسی نعمت کا عذاب پہنچتا ہے خواہ وہ فخر و غرور یا عین  
کے باعث ہو۔ اور نہ ہی نہیں۔  
۲۔ اعلیٰ درجہ کی اصلاح کو ہمیں بھی دیکھنا کہ ان کی  
کامیابی۔

1000 1000 1000



حمید قیصر

بریڈ فورڈ، برطانیہ

اگست یا ستمبر ۲۰۰۳ء کے مہینے میں میری ملاقات حمید قیصر سے ہوئی تھی۔ محترم بھائی مقصود الہی شیخ کے گھر پر وہ محترمہ شاہدہ لطیف اور جناب منصور آفاق کے ہمراہ آئے تھے۔ اس پہلی ملاقات میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس بندے کے مزاج میں منافقت نہیں ہے۔

پھر جب میں نے ان کی کہانیاں پڑھیں تو میری رائے اور پختہ ہو گئی۔ حمید قیصر کی کہانیوں میں بھی ان کی شخصیت کا پرتو جھلکتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں بھی مجھے ویسے ہی مخلص نظر آئے جیسے کہ ذاتی زندگی میں ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ فن کار اگر اپنے فن کے ساتھ مخلص نہ ہو تو راندہ و رگاہ بن کر رہ جاتا ہے کہ ملمع زیادہ عرصہ کار گر نہیں ہوتا۔

میں نے حمید قیصر کی صرف تین کہانیاں پڑھی ہیں..... آواز، رازداں اور دوسری عورت۔ اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ”سیڑھیوں والا پل“ ہے جس کا تیسرا ایڈیشن بھی آپکا ہے کیوں کہ ۲۰۰۳ء میں اس کی طباعت کا اعلان میں نے پڑھا تھا۔ ان تین کہانیوں میں سے ”رازداں“ بیانیہ کہانی ہونے کے باوجود علامتی کہانی ہے۔ بڑے سلیقے سے کہانی کار نے جوتوں کے ذریعے ان کے مالکان کی کردار نگاری کی ہے۔ کہانی کے اختتام پر جب کہانی کار کے جوتے نے اپنے مالک کی کہانی کہنی چاہی تو کہانی



کار نے وہاں سے کھسک جانے میں عافیت جانی۔ لیکن اگر میں یہ کہانی لکھتی تو...

ہر لکھنے والا اپنے انداز سے لکھتا ہے۔ یہ بھی حمید قیصر کا سچ ہے کہ اپنے بارے میں سچ کہنے کا حوصلہ ہر ایک میں نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہانی کار کے کردار کا ایک پہلو ہے جو حمید قیصر اس کہانی کے ذریعے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔

یہ کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حمید قیصر کو کہانی کہنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور کہانی کے ذریعے اپنے معاشرے کے خدوخال اور اس کے کردار کو آئینہ دکھانا بھی آتا ہے۔ ان کے بیان میں ابہام نہیں۔ سادگی و پُرکاری کی گھلاوٹ ہے جو ان کے قارئین کو نہ صرف اپنے ساتھ لئے چلتی ہے بلکہ غور و فکر پر بھی مجبور کرتی ہے۔

حمید قیصر کی گفتگو بھی ان کی کہانیوں کی طرح دلچسپ اور لطافت سے بھرپور ہے۔ چاہے وہ زندگی کا احوال سنائیں یا کوئی اہم واقعہ۔

تو ہم ان کا تعارف ان کی زندگی کے اس اہم واقعہ سے شروع کرتے ہیں جو ہمارے سوال کے جواب میں انہوں نے تفصیل سے سنایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”یوں تو زندگی بذات خود ایک بہت بڑا واقعہ اور حادثہ ہے جس کے اندر سے دوسرے واقعات پھوٹتے ہیں لیکن دسمبر ۱۹۹۶ء میں پیش آنے والا یہ واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہوا یوں کہ میرے ایک کولیگ (colleague رفیق کار) کی ایک حادثہ میں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہم تین دوست ایک دوست کی گاڑی میں اس کی عیادت کرنے ہسپتال گئے۔ اس کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اور چوں کہ اس کا اپنا گھر دوسرے شہر میں تھا ایک دوسرا کولیگ جو اس کا روم میٹ (room mate) بھی تھا اس کے پاس انٹینڈنٹ (attendant) کے طور پر بیٹھا تھا۔ تقریباً رات دس بجے ہسپتال سے ان سے رخصت ہونے لگے تو مریض کے پاس بیٹھے دوست نے کہا کہ یار میں بھی تین دن سے یہاں ہسپتال میں بیٹھے بیٹھے مریض ہو گیا ہوں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔ ذرا سپر مارکٹ چلتے ہیں۔ اور واپسی پر میں مریض کے لئے کھانا لیتا آؤں گا۔ اگلے روز ویسے بھی چھٹی تھی اور ہم چاروں دوست بہت دنوں بعد اکٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ پہلے جناح سپر مارکٹ، آب پارہ مارکٹ اور نہ جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے۔ رات بارہ بج گئے۔ ایک دوست نے ترنگ میں آکر صلاح دی چلیں راولپنڈی صدر چلتے ہیں وہاں سے جہانگیر ریسٹورنٹ سے خود بھی کھانا کھاتے ہیں اور ہمراہ بھی لیتے آئیں گے۔ گاڑی والا دوست اس روز کچھ زیادہ ہی فارغ اور ترنگ میں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کارفرمائے بھرتی ہوئی اسلام آباد ہائی وے پر فیری ہو گئی۔ صدر پہنچ کر پہلے تو خوب گھومتے پھرے بعد ازاں جہانگیر ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر نکلے تو دو بچے والے تھے۔ تب انٹینڈنٹ دوست کو مریض کا خیال آیا اور دو فکریں لاحق ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ مریض کھانے کے انتظار میں بھوکا ہی ہوگا اور پریشان بھی، دوسرے یہ کہ ہسپتال والے اتنی رات گئے ہسپتال میں نہیں گھسنے دیں گے۔ اب کیا ہو سکتا ہے، سوائے اس کے کہ پہلے سے تیز رفتاری کا مظاہرہ



کرتے منچلے دوست کے رحم و کرم پر مزید برق رفتاری کا سامنا کیا جائے اور ہسپتال تک پہنچنے کے لئے چند شارٹ کٹ (short cut) لگائے جائیں۔ چنانچہ صدر راولپنڈی سے جی سیون سیکٹر تک کیسے پہنچے مت پوچھئے۔ جی سیون پہنچ کر کاروائے دوست کو اپنے ایک دوست کے گھر کا خیال آیا اور ایک ضروری کام کہہ کر اندھیری گلیوں میں گھس گیا اور وہاں بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگا۔ سب نے کہا یا یہ کام صبح کر لینا پہلے ہسپتال پہنچو لیکن کار کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ میں تھا اور جہانگیر کی بالٹی کا خمار بھی تھا۔ اس نے ایک اندھیری گلی کے ویران سے گھر میں تیل دے کر دوست کو جگایا اسے ایک لفافہ جیب سے نکال کر تھمایا اور واپس گلیوں اور بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا، کبھی کہے یہ شارٹ کٹ اور کبھی کہے فلاں گلی سیدھی فلاں بڑی سڑک پر جانکے گی۔ پھر اللہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ تیزی سے عام ٹریک (tarck) چھوڑ کر اسی تیز رفتاری کے ساتھ ایک دونوں جانب سے جھاڑیوں سے ڈھکی پٹی سڑک پر آگیا اور کہنے لگا یہ پل بڑا شارٹ کٹ ہے اور باہر نکل جاتا ہے۔ اب ہم سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ اتفاقاً مجھے اس کا پتا تھا کہ اس پل پر سے گاڑیاں نہیں گزرتیں بلکہ پیدل چلنے کا راستہ ہے اور اس کے دوسرے سرے کو آئرن بار (iron bar) لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ پل تنگ بھی تھا اور اس کے کناروں پر جنگلا بھی نہ تھا۔ ابھی میں گھبراہٹ کے عالم میں اسے یہ سب بتا ہی رہا تھا کہ گاڑی آدھے پل تک پہنچ گئی اس کے بریک چرچرائے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹ میں پل کے دوسرے کنارے پر لگے آئرن بار بھی نظر آنے لگے۔ اب وہ بہت ٹپٹایا۔ اسی اثنا میں، میں جلدی سے گاڑی سے اتر گیا اور اسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو اب جلدی کرنے کی ضرورت نہیں پل بہت تنگ ہے گاڑی ریورس (reverse) کرنا ہوگی لیکن بہت احتیاط سے کیوں کہ پیچھے روشنی نہیں ہے۔ پل کی سطح بمشکل نظر آئے گی، پل کے کنارے بھی نہیں ہیں اور چاروں اور گھنے درخت اور گھپ اندھیرا ہے۔ اب میں یہ سب کچھ سمجھاتے ہوئے گائیڈ (guide) کر رہا ہوں۔ رات کا پچھلا پہر اور سخت سردی ہے۔ ایک دوست اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر اور دوسرا ساتھی پچھلی سیٹ پر گھبراہٹ اور سردی سے دبکا بیٹھا ہے، دونوں دوست حسب توفیق اسے کوسنے بھی دے رہے ہیں لیکن وہ عقل کے ناخن لینے کے بجائے بدستور ترنگ میں ہے۔ اس نے انتہائی مہارت سے گاڑی ریورس کرنا شروع کی اور جوائنٹسی لیٹر پر پاؤں رکھا تو اس وقت اٹھایا جب گاڑی میرے دیکھتے ہی دیکھتے زندہ مچھلی کی طرح پھسل کر پل سے نیچے لڑھک گئی۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کار والوں کی چیخیں رات کی ویرانی میں صرف میں نے سنیں۔ لمحے بھر میں میں نے دیکھا کہ کار گہرے پل سے نیچے گرنے کے بجائے کنارے پر لگے درختوں اور جھاڑیوں میں ایک قلابازی کھا کر جا پھنسی۔ اب منظر یہ ہے کہ گھنی جھاڑیوں اور پتوں میں سے گاڑی کی ہیڈ لائٹیں آسمان کی طرف جاتی ہوئیں عجیب وحشت ناک منظر پیش کر رہی ہیں میں چیخ کر ان سب کو پکار رہا ہوں کہ سب کس حال میں ہیں؟ تھوڑی دیر میں سب کے اوسان بحال ہوئے تو ایک ایک کی گھنی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ ایسے میں مجھے کئی ایک انگلش فلموں کے ایسے خطرناک سین (scene) یاد آئے جس میں گرتے ہی گاڑیوں



میں آگ لگ جاتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرا خون خشک ہونے لگا اور میں زور زور سے چیخنے لگا۔ گاڑی کسی درخت کے تنے کے ساتھ پانچ چھ فٹ نیچے جا کر کچھ ایسی گئی تھی کہ بظاہر وہاں سے کسی کے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد میری نگاہیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو پل کے دوسرے سرے کی طرف سے آہستہ آہستہ نیچے اتر اور درختوں کی ٹہنیاں اور جھاڑیاں پکڑتے پکڑتے کسی نہ کسی طرح لٹکی ہوئی گاڑی تک جا پہنچا۔ اب مجھے ذرا تسلی ہوئی۔ پتا نہیں اس دم کہاں سے اتنی قوت آگئی کہ میں بہادر ہو گیا اور خوف جاتا رہا۔ میں خاصے تردد اور کوشش کے بعد گاڑی کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور بمشکل تمام ایک ایک کر کے سب کو باہر نکالا۔ سب کو کہیں نہ کہیں چوٹ ضرور آئی تھی اور گاڑی بدستور لٹکی ہوئی تھی۔“

”اب کچھ اپنے بارے میں اپنے پڑھنے والوں کو بتائیے“ وہ واقعہ سنا چکے تو میں نے پوچھا۔ کہنے لگے۔۔۔۔۔ ”یہ بھی ایک کہانی ہے۔ یوں تو والدین نے میرا نام عبدالحمید رکھا تھا اسکول ہی کے زمانے میں قیصر خٹلمس کر لیا تھا۔ میں ضلع میانوالی کے ایک الف لیلوی شہر ’کالا باغ‘ میں ۷ مارچ ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوا۔ یہ شہر صدیوں سے دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ پرائمری تعلیم کا آغاز اسی آبائی شہر سے ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں والدہ کی ناگہانی وفات نے زندگی میں بہت تغیرات برپا کیے۔ والدہ کے جانے کے بعد یہ خلا کبھی پورا نہ ہو سکا۔ پڑھائی کی لگن شروع سے تھی۔ میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول کالا باغ سے ۱۹۷۶ء میں میٹرک کیا۔ میٹرک کے بعد ۱۹۷۷ء میں کالا باغ سے تیس (۳۰) میل دور میانوالی کالج میں داخلہ لیا۔ کیوں کہ نواب کالا باغ کے باقیات کے محلوں کے اونچے برجوں اور ان کے اونچے شملوں کو علم پھیلنے سے طرح طرح کے خطرات لاحق تھے۔ انہوں نے کالا باغ میں کالج نہیں بننے دیا جو سرکار نے عیسیٰ خیل میں بنایا۔ دونوں شہر کالا باغ سے یکساں فاصلے پر واقع ہیں۔ چنانچہ روزانہ تیس میل کا بس کا سفر کر کے آتا جاتا۔ ۱۹۷۷ء کا دور پر آشوب تھا جب پاکستان میں عام انتخابات ہوئے اپوزیشن (opposition) نے نتائج ماننے سے انکار کر دیا اور تحریک نفاذ نظام مصطفیٰ کا آغاز کر دیا گیا۔ ملک بھر کے تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ اسی دور میں نواب آف کالا باغ کے سالہا سال سے معصوم عوام پر مسلط جبر و استبداد کی سلطنت کے برج بھی ہلنا شروع ہو گئے۔ شہر کے دیگر باشعور لوگوں کی طرح میرے والد صاحب بھی اس جبری نظام کے سخت خلاف تھے اور ایک عرصے سے پردیس کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس دور کو ہجرت کے لئے بہترین دور جان کر کالا باغ سے اسلام آباد چلے آئے۔ کالا باغ کے عوام بھی ’تنگ آمد‘ جنگ آمد‘ کے مصداق سروں پر کفن باندھ کر ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس انقلاب میں کالا باغ کے پڑھے لکھے نوجوان اور باخبر طبقے کا کردار تاریخی ہے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں بھی عملی طور پر اس تحریک میں شامل رہا۔ صبح کی سپیدی اور ظلم کے درمیان کشمکش کے اسی دور میں ۱۹۷۹ء میں میری شادی ہوئی۔ اس وقت تک میرے تایا سسر اور ان کا خاندان اپنے آبائی گھر میں ہی تھے۔ بعد ازاں ان کا خاندان بھی راولپنڈی ہجرت کر آیا۔ میں نے اسلام آباد میں رہتے ہوئے



پرائیویٹ (private) انٹر میڈیٹ کیا۔ ۱۹۸۱ء میں پہلی بار وفاقی وزارت تعلیم کے تحت قائم ادارے 'اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۸۳ء میں اکادمی سے استعفیٰ دے کر وزارت سیاحت و ثقافت کے تحت ایک ادارے 'لوک ورثہ اسلام آباد' کے شعبہ مطبوعات میں خدمات انجام دینا شروع کر دیں۔ جہاں مجھے پبلشنگ اور مارکیٹنگ (publishing & marketing) کا تجربہ حاصل ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۸۸ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین جناب پروفیسر پریشان خٹک کی طرف سے بہتر پوزیشن (position) کی آفر (offer) ہوئی اور ایک بار پھر میں نے اکادمی میں پرنٹنگ انچارج (Printing Incharge) کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ دو سال بعد شعبہ سرکیولیشن (circulation) و اشتہارات خالی ہوا تو مجھے اس کا چارج (charge) دے دیا گیا۔ تب سے اب تک میں اکادمی میں سرکیولیشن مینیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہوں۔ واضح رہے کہ اکادمی ہی کے تحت دو جرائد سہ ماہی اردو ادبی جریدہ 'ادبیات' اور شش ماہی انگریزی جریدہ 'پاکستان لٹریچر' (Pakistan Literature) جاری ہوتے ہیں جن کی مارکیٹنگ اور اشتہارات میرے ذمہ ہیں۔ ان جرائد کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

گفتگو جاری تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔۔۔ "میری ادبی زندگی کا آغاز اسکول ہی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ جہاں میں نے بچوں کے جرائد 'امروز'، مساوات، بچوں کی دنیا، جگنو، تعلیم و تربیت اور نونہال' میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ تاہم میرا پہلا افسانہ 'کیلے کا چھلکا' روزنامہ 'جنگ راولپنڈی' کے ادبی صفحے میں ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ میری کہانیاں پاکستان کے تمام قابل ذکر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'سیڑھیوں والا پل' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں القلم دار الاشاعت، اسلام آباد سے شائع ہوا جب کہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن بھی اسی ادارے میں زیر طبع ہے۔"

"کیا آپ نے شعر بھی کہے؟"

"جی ہاں۔ کالج کے ابتدائی دنوں میں شاعری کا آغاز کرتے ہوئے میں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ بعد ازاں میری کہانی شاعری پر غالب آ گئی۔ جہاں تک نثری غزل اور نظم کے تجربے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں نئے نئے تجربات ہماری زندگی کی ترقی اور خوب صورتی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ ادب میں بھی نئے تجربات ضروری ہیں لیکن نثری نظم و غزل کا تجربہ یونہی ہے گویا کوئی ندی نالہ اپنی حدود عبور کر کے گلیوں اور بازاروں میں بہنا شروع کر دے۔ دریا اور ندی نالوں کا بہاؤ اپنے کناروں میں بھلا لگتا ہے۔"

حمید قیصر اردو کے مستقبل سے بہت پر امید ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔۔۔ "زبان و ادب ہماری معاشرت اور تہذیب کے ساتھ ساتھ پھلتے پھولتے ہیں۔ اردو ایک خوب صورت اور مکمل زبان ہے۔ اس کا دامن بے حد وسیع ہے۔ اور اس زبان میں دیگر علاقائی اور بڑی عالمی زبانوں کے الفاظ کے



ذخیرے کو اپنے اندر جذب کرنے کی پوری صلاحیت اور گنجائش ہے۔ کسی بھی بڑی زبان کی یہ ہی بنیادی خوبیاں ہیں جن کے تحت وہ انسانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور شاہکار ادب جنم لیتا ہے۔ لیکن جہاں تک اردو کے رسم الخط کے تبدیل کرنے کی بات ہے، اردو زبان کا موجودہ رسم الخط نہایت آسان اور مانوس ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسے تبدیل کر کے کوئی نیا رسم الخط رائج کیا جانا ضروری ہے۔ نئے رسم الخط سے مانوس ہوتے ہوتے ایک ایسا خلا پیدا ہوگا جسے پر کرنا ممکن نہ ہوگا۔ ہماری وہ نئی نسل جو پہلے ہی انگلش اور اردو میڈیم کے کنفیوژن (confusion) کا شکار ہے اب وہ جس قدر اردو زبان کے رسم الخط سے مانوس ہے موجودہ رسم الخط کی تبدیلی سے اردو زبان سے بہت دور ہو جائے گی۔ چنانچہ میرے نزدیک ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

اگلے سوال کے جواب میں حمید قیصر نے بڑے اعتماد سے کہا: ”میں اردو زبان کو اپنا کر قطعاً گھائے میں نہیں رہا بلکہ فائدے میں رہا ہوں۔ مجھے انگلستان آئے ہوئے تقریباً نو ماہ ہوئے ہیں اور میں دوسری بار یہاں آیا ہوں۔ مجھے یہاں آ کر دو فائدے ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں آ کر مجھے اپنی کمزور انگریزی درست کرنے کا موقع ملا دوسرے یہ کہ مجھے تھوڑی بہت اردو آتی ہے جو دوسرے بہت سے لوگوں کو نہیں آتی ذرا سوچئے تو، میں فائدے میں رہا ہوں۔“

حمید قیصر نے کہا: ”میں ہمیشہ غالب، اقبال، فیض اور مجید امجد سے متاثر رہا اور رہوں گا۔“ پچھلی صدی کے نثر نگاروں میں انہیں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، احمد بشیر، قرۃ العین حیدر اور قیصر تمکین کی تخلیقات پسند ہیں۔

حمید قیصر بریڈ فورڈ سے ایک سہ ماہی جریدہ ”تادیب“ شائع کر رہے ہیں۔

Mr. Hameed Qaiser,

Tadeeb Quarterly, 79 Carlisle Road, Bradford, BD8 8BE, UK

e-mail: tadeeb@hotmail.com





تم میری تنہائی کا سبب پوچھو رہے ہو  
اسباب مسئلہ بہت بڑے اسباب مسئلہ

خالد خواجہ  
نیک انگریز 1953ء

## خالد خواجہ

لاس اینجلس، امریکہ

شہر میں رہ کے بھی حق بات کہنے والا  
مرے اندر ہے کوئی گھاؤں کا رہنے والا

ایبٹ آباد، پاکستان کی مٹی میں جنم لینے والے خالد کے اندر ابھی تک گاؤں کا رہنے والا  
کھر انسان موجود ہے اس کے باوجود کہ امریکہ میں اُسے بے ہوئے ربع صدی گزر چکی ہے۔ خالد  
شاعر بھی ہے اور افسانہ نگار بھی۔ افسانے لکھتا ہی نہیں زبانی سنا تا بھی ہے۔ اپنی زندگی کا ایک یادگار  
واقعہ اُس نے افسانوی انداز میں ہی سنایا۔ خالد کی زبانی وہ واقعہ یوں ہے ... ”میں ہائی اسکول میں  
تھا جب احمد فراز کی کتاب ”درد آشوب“ شائع ہوئی۔ اُس زمانے میں ہندو پاک میں قتلِ شفا فی اور  
ساحر لدھیانوی کا طوطی بولتا تھا۔ راولپنڈی کے پاکستان سنٹر میں کتاب کا افتتاح ہوا۔ فتح محمد ملک  
نے ایک اچھا مضمون پڑھا۔ انہوں نے فراز کے بہت سے اشعار کے حوالے سے ثابت کیا تھا یا  
ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فراز اکثر فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں اور  
ان کا اسلوب اسی فیض احمد فیض کا اور میں فیض ندیم کا ہے۔ اور یوں فراز ان دونوں شعرا سے بری طرح  
متاثر ہیں۔



اس مضمون نما تبصرے کے فوری رد عمل کے طور پر فراز نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ کسی سے ہرگز متاثر نہیں ہیں اور وہ اپنا الگ اسلوب رکھتے ہیں۔ انہوں نے زور دے کر یہ بھی کہا کہ وہ متاثر ہونے والے شاعر نہیں ہیں۔

بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو ٹھیک تھا مگر فراز نے پشاور پہنچتے ہی اپنے دوستوں کو جن میں انور خواجہ بہت نمایاں تھے اکٹھا کیا اور یوں پھر ایک علمی کم اور ذاتی بحث چل نکلی۔ سرگودھا اسکول بھی ان کا ہم نوا تھا۔ فتح محمد ملک پر یلغار ہوئی۔ ہر طرف سے یہ ہی کہا گیا کہ فراز متاثر ہو کر کہنے والی شے نہیں ہیں۔ ہاں۔ پھر چند برسوں بعد احمد ندیم قاسمی کی ساٹھویں سالگرہ کی خوشی میں اسلام آباد میں ایک بھاری جلسہ ہوا۔ جلسہ کیا تھا ایک میلے کا سماں تھا۔ مرکزی وزیر حنیف خان صدارت فرما رہے تھے۔ لاہور سے انتظار حسین، یوسف کامران، منیر نیازی وغیرہ شریک تھے۔ کئی سو لوگوں کا مجمع تھا۔ احمد فراز نے بھی تقریر کی اور بھاری بھر کم لہجے میں کہا: "میں اس موقع کے لئے نظم بھی لکھ سکتا تھا مگر عدیم الفرصت ہوں اور ندیم صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر بھرتی کی نظم پیش کرنا زیادتی ہوگی۔ لہذا ایک غزل پیش کرتا ہوں جو ندیم کی زمین میں کہی گئی ہے اور ندیم سے 'متاثر' ہو کر یہ غزل کہی تھی۔ لوگ چونک پڑے۔ بہت دیر بعد فراز کو احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں ... پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔"

خالد! یہ واقعہ سچا ہے؟

"اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" خالد کے چہرے پر پٹھانی جلال کی سرفی چھا گئی۔ "ارے بھائی نیویارک کے ہفتہ وار 'نیوز پاکستان' کے ۹۵۳ / اکتوبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں یہ واقعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔"

"اچھا، اب میں نے گفتگو کا رخ بدلا۔" اب یہ بتاؤ کہ اردو افسانے نے کتنی ترقی کی ہے؟ ماضی کے افسانہ نگاروں کے فن کی روشنی میں تم کیا کہو گے؟

خالد نے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے کہا: "ایک زمانے میں نثری ادب میں افسانہ سب سے زیادہ مضبوط اور مقبول صنف تھی۔ اس دور میں قرۃ العین حیدر، منٹو، کرشن چندر، بیدی، ممتاز مفتی، غلام عباس، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی افسانوی میدان کے معروف شہسوار تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے فوری بعد افسانے کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے اچھے افسانے دیے۔ ان میں انتظار حسین، قیصر تمکین، رام لعل، اشفاق احمد اور آغا بار کا نام لیا جاسکتا ہے۔ خواتین میں الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، اختر جمال اور پھر پروین عاتق، نیلم احمد بشیر، نگہت مرزا، رفعت مرتضیٰ، زاہدہ حنا اور نیلو فر اقبال آئیں۔ مگر افسانہ اپنی پچاس کی دہائی والی تباہ و تاب کھو چکا تھا۔ اب بھی افسانے لکھے جا رہے ہیں مگر میری رائے میں یہ دور شاعری کا ہے۔ شاعری سب سے مضبوط اور مقبول عام صنف کا درجہ اختیار کر گئی ہے اور شاید کئی دہائیوں تک



غزل کی حکمرانی قائم رہے گی۔“

ناول کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے خالد نے کہا: ”اردو ادب میں اچھے ناول کم ہی لکھے گئے ہیں۔ عبداللہ حسین، الطاف فاطمہ، کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے نام اہم ہیں۔ عصمت کا ایک آدھ ناول بھی قابل ذکر قرار پائے گا۔ بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی نے ایک دو ناول ہی اچھے دیئے ہیں۔ دراصل مغربی ادب کے مقابلے میں اردو ادب ایک طفل مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔“

خالد نے کئی دل نشین افسانے لکھے ہیں، جیسے ”یزید کے بیٹے“، نائن لیون [۹۱۱]، شام سے پہلے، مجھے جینے دو، اور ”کمپنی چوک کے ارد گرد“۔

ان کا کہنا ہے: ”اردو اتنی تند و تیز زبان ہے کہ نہ صرف ہندوپاک بلکہ جہاں جہاں اردو بولنے والے رہتے ہیں وہاں وہاں یہ رابطے کی زبان بن چکی ہے۔ یہ غیر منقسم ہندوستان کی اور اب پاکستان کی بھی ہزار سالہ تہذیب، ثقافت، عروج و زوال اور بے شمار تغیرات کی تاریخ کی امین ہے۔ امیر خسرو سے ولی اور پھر غالب تک اور غالب کے بعد خالد خواجہ اور سلطانہ مہر تک یہ زبان یک جہتی اور مہر و محبت کی ترجمان رہی ہے۔ امیر خسرو کی شاعری میں جو ماحول ملتا ہے وہ ایران، توران کا نہیں ہے بلکہ وہ اپنی مٹی کی کہانی ہے، اُس مٹی کی جہاں سے انہوں نے اپنی شعر گوئی کا آغاز کیا۔ دیکھئے میں ایک شعر سنا کر بات ختم کرتا ہوں تاکہ آپ کو یقین ہو جائے کہ یہ زبان اتنی جلدی فنا کی مٹی نہیں چائے گی۔ یہ شعر انعام اللہ خان یقین کا ہے۔

بٹیاں خوں کر کے میرا سب لگے آپس میں یہ کہنے

یہ کافر جیوتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

اب دیکھئے کہ نفس مضمون اور زبان کے اعتبار سے اردو نے کتنی منزلیں طے کی ہیں اور کتنی دشوار گزار راہوں سے گزری ہے۔ گو آج ہندوپاک میں اسے سر بواہان مملکت کی وہ سرپرستی حاصل نہیں جس نے کبھی اس زبان کو عروج تک پہنچایا لیکن کیا ہم خود اردو کے پرستار اس کی سرپرستی نہیں کر سکتے؟ میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔ ہماری سابقہ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو ایک جلسے میں تقریر فرما رہی تھیں۔ جب ان کے سیکریٹری نے ان کو تقریر ختم کرنے کا اشارہ کیا تو وہ پوچھنے لگیں: ”کیا اذان بجنے والا ہے؟“

اس سرپرستی پر بھی ہم اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔“

Mr. Khalid Khuwaja,

Pride Printing Inc., 6651 Western # 1, Buena Park, CA 90621, USA





آپ جس وقت اور کتنے سے  
کام سر رہے ہیں وہ قابلِ مبارکباد لگے

خالد سہیل

## ڈاکٹر خالد سہیل

ٹورنٹو، کینیڈا

ڈاکٹر خالد سہیل کے شہر جانیے اور انہیں ڈھونڈیے تو کبھی بن ملے ہی لوٹ آنا ہوگا اور کبھی یوں بھی ہوگا کہ مل گئے تو پھر اس طرح جیسے شیر میں شکر گھل مل گئی ہو۔ ان سے گھنٹوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ ان کے لبوں پر کھیلتی میٹھی مسکراہٹ اجنبیت اور دوری کے تمام فاصلے پل بھر میں ختم کر دیتی ہے۔ گو اس میٹھی مسکراہٹ کے پس پردہ غم جاناں کے کم اور غم دوراں کے آن گت دکھوں کے جگنو دن میں بھی روشنی دیتے ہیں اور نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ دکھ ان کی شاعری میں بھی سمٹے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک نظم کے چند اشعار دیکھیے جو انہوں نے پاکستان میں مارشل لا کے دور میں کہی تھی۔

ہمارے بچوں کی سوچوں پہ کب سے پہرے ہیں کہاں سے آئے گا آزاد نو جوان کوئی  
جو بام و در پہ منقش ہوا ہے ذہنوں کے وہ شہر درد کا شاید ہے بے نشان کوئی  
تمام شہر کو آزادیوں کی خبریں دے قفس قفس پہ رقم کر کے آشیاں کوئی  
شب حیات بڑی مختصر رہی خالد نہ ماہتاب ہی دیکھے نہ کہکشاں کوئی

خالد نے اپنے وطن کے ہی نہیں تمام عالم کے بچوں کے دکھوں کا مطالعہ کیا ہے کیونکہ ان کا بچپن بھی اسی قسم کے دکھوں میں گزرا ہے۔ انہوں نے بتایا: ”میں نے جب زندگی کی آغوش میں آنکھ کھولی تو اپنی چھوٹی سی دنیا کو



روایات کی اونچی دیواروں میں محصور پایا۔ خاموشی، تاریکی اور گھٹن نے میرا استقبال کیا۔ لاکھوں انسان لکیر کے فقیر بنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ فرسودہ طرز حیات کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ اس ماحول میں اندھا ایمان قابل قدر تھا، شک کرنا گناہ اور سوال کرنا جرم۔ میرے سرپا میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔ روایت سے انحراف نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ قابل سزا جرم تھا۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھتا تو احساس ہوتا۔

اس درجہ روایات کی دیواریں اٹھائیں نسلوں سے کسی شخص نے باہر نہیں دیکھا میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس ماحول سے بہت دور، بہت دور بھاگ جاؤں۔ مگر ممکن نہ تھا۔ میرے شعور نے جب بلوغت کی طرف قدم بڑھائے تو مجھے پڑھنے لکھنے کا جنون ہو گیا۔ میں ساری دنیا سے کٹ کر اپنی ذات میں ایک دنیا بسا نے لگا۔ میرا قلم میرا ساتھی تھا اور رقیب بھی۔ وہ مجھے ڈھارس بھی دیتا تھا، میری اقدار پر چر کے بھی لگاتا تھا اور میرے ایمان کو کریدتا بھی رہتا۔ میں نے اپنے قلم کو کدال بنایا تو میرے لئے دیواروں میں کھڑکیاں کھلنے لگیں۔

میں اپنے ماحول سے ایک عجیب رشتے میں منسلک تھا۔ میں ان ادیبوں اور دانشوروں سے زیادہ قریب تھا جو مدتوں پہلے اس دار فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ لیکن میرے آس پاس بسنے والے لاکھوں انسان ایک ایسی دھند میں ملبوف تھے کہ میرے لئے ان کی پہچان اور اپنی ذات کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ مجھے اس جہوم میں کھو جانے کا ڈر تھا۔ میں نے قدم قدم پر۔

اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے اپنے ماحول سے آزاد فضا میں مانگیں

میں جب اپنی تلاش میں چند قدم آگے بڑھا تو میری ملاقات چند ایسے رشتہ داروں، استادوں اور دوستوں سے ہوئی جو میری طرح سے اپنے گھروں سے نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ہمارے سامنے شاہ راہیں نہ تھیں، صرف پگڈنڈیاں تھیں۔ لیکن ان پگڈنڈیوں پر چند نقش قدم ہی حوصلہ افزائی کے لئے کافی تھے۔ ہم زندگی کی کان میں مختلف نظریوں اور ضابطہ حیات کے مقناطیس لیے کھوئے کو کھرے سے جدا کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اپنے اپنے تجربات کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل ۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں انہوں نے خیبر میڈیکل کالج پشاور سے ایم بی بی ایس کیا اور پھر ۱۹۸۲ء میں کنیڈا کی میموریل یونیورسٹی سے ایف آر سی پی نفسیات میں کیا۔ نوعمری سے انہوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ انگریزی سے عالمی ادب کے تراجم بھی کیئے اور نفسیات کے حوالے سے بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی خواہش رہی کہ یہ اپنے مشاہدات اور خوابوں کو تخلیقی سطح پر پیش کریں۔ اصناف کا چناؤ ان کے لئے ثانوی رہا کیونکہ بقول ان کے یہ سب ایک ہی منزل تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اور بنیادی وجہ اس بات پر رہنی چاہیے کہ اپنے مخصوص نکتہ نظر کو تخلیقی طور پر اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکیں۔

وہ کہہ رہے تھے: ”جب میں نے لکھنا شروع کیا اور جب میرے ذہن اور قلب کے کیوس پر کچھ واضح نقوش ابھرنے لگے تو میں نے اپنے افسانوں اور شعروں میں ان کے رنگ بھرنے چاہے۔ میں پرندوں کی



طرح اڑتا چاہتا تھا، اونچا، بہت اونچا، ان دیواروں سے بلند، ان لوگوں کی رسائی سے بالاتر جو ہاتھوں میں تیر کمان اور بند و قیس لیے کھڑے تھے۔

اپنی ذات کی کھوج میں، حقیقت کی جستجو میں، نئی صبح کی تلاش میں، میں شرق و غرب کی شاہ راہوں، صحراؤں، وادیوں، جنگلوں اور شہروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ جگہ جگہ اپنی روح کی پیاس بجھانے کے لئے رُکا۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میری سائنسی تعلیم کے برخلاف پانی کا بھی ایک رنگ تھا، ایک ذائقہ تھا۔

میں جب مغرب میں آ بسا تو نفسیات کو اپنے پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ میرے لئے یہ ادب اور فلسفے سے قریب ترین پیشہ تھا۔ میں پڑھتا رہا، لکھتا رہا، اپنی ذات کی گہرائیوں سے پردے اٹھاتا رہا، لوگوں کی زندگیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور ان طالب علموں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہا جو انسان اور کائنات کے رازوں کی گتھیوں کو سلجھانے میں اُلجھے رہے۔ یہ محنت، یہ جدوجہد، یہ کوشش، یہ جستجو ایک نئی زندگی، نئی دنیا کی تلاش میں تھی، ایسی دنیا جہاں ہمارا فردا ہمارے ماضی سے روشن تر ہوگا۔ میرے نزدیک یہی جدوجہد ہمیں انسانیت کے اعلیٰ معیار کی طرف لے جاتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس چھوٹے سے قافلے میں شامل ہوں جو اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اردو ادب میں بہت کم شاعروں اور ادیبوں نے عورت کے حقوق کی بات کی ہے۔ خالد کا کہنا ہے کہ ان کی ذات اور شخصیت کے ارتقا میں عورت کی رفاقت نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں۔

میری ماں نے زیست کے ہر چوراہے پر اہمیت کے کچھ پھول کھلائے  
چاہت کے کچھ گیت سنائے / اس اہمیت نے اس چاہت نے  
دو کلیوں کا روپ سنوارا

اس طرح خالد کی نظموں میں عورت کی عظمت و تقدس کا اظہار ملتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: ”میرے بچپن میں میرے اہل خاندان، لڑکپن میں اساتذہ اور جوانی میں دوستوں نے مجھے بہت پیار و خلوص دیا۔ شاید یہ ہی وجہ کہ مجھے زندگی سے محبت اور انسانوں پر اعتبار کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ اپنے سفر کے ہر موڑ پر میری ملاقات عورت سے ہوئی، میری ماں، میری بہن، میری دوست، میری محبوبہ۔ ہر قدم پر میں نے اسے قربانیاں دیتے دیکھا اور اس دن کا انتظار کرتے ہوئے پایا جب وہ اپنے ماحول سے مردوں کے برابر لطف اندوز ہو سکے گی اور معاشرہ اسے مرد کے برابر قبول کر سکے گا۔“

خالد نے بتایا انہیں بطور ماہر نفسیات اُن انسانوں کے ساتھ بھی دو چار قدم چلنے کا موقع ملا جن کے ساتھ زندگی اور دوسرے انسانوں نے سوتیلے پن کا سا سلوک کیا، وہ لوگ جو اپنی ذات کا توازن قائم رکھنے کی جدوجہد میں ذہنی توازن کھو بیٹھے، وہ تنہائیوں کے دوزخ میں سلگتے رہے اور اپنے ماحول اور بنی نوع انسان سے کٹ کر رہ گئے۔ بقول خالد اُن ہم سفرؤں نے انہیں نئی بصارتیں اور بصیرتیں عطا کیں۔

وہ زیست کی راہوں میں ان سرنگوں سے بھی گزرے جب اپنے ماحول کو اپنی ذات پر تنگ ہوتے



ہوئے پایا۔ دشمن اور جس کا احساس بڑھنے لگا۔ اپنے گھر سے انہیں اجنبیت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ خالد ہجرت کی وادیوں سے گزرتے ہوئے اپنی کائنات سے ایک نیا رشتہ دریافت کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ جستجو انہیں اس مقام پر لے آئی جہاں دھرتی اور انسانیت ایک ہو گئے۔ یہ ذات اور کائنات کے عرفان کی پہلی منزل تھی۔ خالد کا سفر آج بھی جاری ہے کیونکہ انسان ازلی وابدی مسافر ہے جسے نئے رشتوں کی تلاش ہے، نئی منزلوں کی جستجو ہے۔

خالد سمیل اس حقیقت سے اتفاق کرتے ہیں کہ عظیم شاعری جارحیت اور داخلیت کو ایک ساتھ سمونے کا ریاض ہے۔ ایک بڑا فن کار بلاشبہ دنیا کے واقعات اور حادثات سے تاثر قبول کرتا ہے اور اسے اپنے ذہن اور دل و دماغ میں پرورش کرتا ہے، اسے اپناتا ہے اور پھر اسے اپنے تخلیقی شعور سے رفعت دے کر تحریر کرتا ہے۔

ان کا بیشتر کلام اور افسانے اس کیفیت کے عکاس ہیں۔ خالد ہجرت کے دکھ سے آشنا ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس دکھ کو سمودیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ زندگی کا ہر دور اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر لے کر چلتا ہے اور ہر دور کے انسان اپنی جست گم گشت کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں۔ خالد کہہ رہے تھے: ”ہمارا عہد جدید آسائشوں کے ساتھ ساتھ نئے تقاضے بھی لے کر آیا ہے۔ ہم اس حقیقت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دنیا کے ہر گوشے میں بسے ہوئے انسان چاہے وہ کسی بھی رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ جس طرح جسم کا ایک حصہ باقی حصوں سے کٹ کر نشوونما نہیں پاسکتا اسی طرح ایک انسان یا انسانوں کا ایک گروہ باقی انسانوں سے جدا رہ کر زیادہ دیر کامیاب و کامران نہیں رہ سکتا۔“

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانی معاشرے میں انسانیت کی قدر مشترک کو جلد یا بدیر قبول کرنا ہوگا۔ یا تو ہم سب مل کر بہتر زندگی کی جستجو کریں گے یا مل کر خودکشی کر لیں گے، پوری انسانیت کا انہی توانائی سے مجموعی طور پر خودکشی کرنا بیسویں صدی میں ممکن بھی ہو گیا ہے۔ جب ہم اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ چاہے وہ جنوبی ایشیا کی معاشی ناہمواریاں ہوں یا مشرق وسطیٰ کی سیاسی اور مذہبی رنجشیں و ریشہ دوانیاں، چاہے وہ شمالی امریکہ کا احساس تنہائی ہو یا جنوبی افریقہ کا احساس غلامی اور چاہے وہ اقلیتوں کے مسائل ہوں یا عورتوں کے حقوق کی جدوجہد، یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔“

خالد سے میرا اگلا سوال تھا کہ کیا آج کے ادیب نے اپنے قلم کا رشتہ اپنی دھرتی سے جوڑ رکھا ہے؟ خالد جواب میں کہنے لگے: ”ایک ایسے معاشرے کے خدوخال واضح کرنے میں، جس کی بنیاد تعصب، جہالت اور ناانصافی کے آہنی ستونوں پر قائم ہو، ادب نے ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب نے ہمیشہ اپنے عہد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ بیسویں صدی میں افراد اور قوتوں کے رشتوں میں (چونکہ ساری دنیا میں میڈیا [media] ابلاغ عامہ) اور سفر کی سہولتوں نے ایک عالمی گاؤں کی صورت پیدا کر دی ہے) حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں اس لئے ایک انسان یا قوم کا تجربہ پلک جھپکتے ہی پوری انسانیت کا تجربہ بن جاتا ہے۔ اس تبدیلی نے ہمیں انسانی زندگی کے سفر کی اگلی منزل پر اکھڑا کیا ہے اور ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہمارے



ادیب تجربات کو پورے خلوص سے تخلیقی سطح پر پیش کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہمارے سائنس دان، چاہے وہ ماہر انسیات ہوں یا ماہر بشریات، اپنے تجربوں کو منظم طریقے سے تنہیم کرنے کی اور ہمارے فلسفی اور دیگر دانشور وجدانی طور پر انسانیت کے مستقبل کی پیشین گوئی کرنے کی کوشش کریں۔“

خالد کے خیال میں تاریخ کے اس موڑ پر ایک مہاجر ادیب قیادت کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی میں اس کا ایک سے زیادہ تہذیبوں، ثقافتوں، زبانوں، معاشرتوں میں زندگی گزارنے کا تجربہ اور اس کا تخلیقی اظہار کاروان حیات کا رخت سفر بن سکتا ہے۔ اس تجربے نے اس کی تیسری آنکھ کھول دی ہے، ایسی آنکھ جو اسے انسانی روح کے نہاں خانوں میں جھانکنے میں مدد دیتی ہے۔ ایک کامیاب ادیب اپنی تخلیقات میں نہ صرف اپنی ذات کا تخلیقی اظہار بھرپور طریقے سے کرتا ہے بلکہ اپنے اور قارئین کے درمیان ابلاغ کا ایک پل بھی تعمیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے: ”اگر میری تحریریں میرے قارئین کی سمجھ میں نہیں آئیں گی تو اس میں نقصان سراسر میرا ہے نہ کہ قاری کا۔ میرے نزدیک فن کار کی عظمت اس کی عاجزی اور متکسر المزاجی میں ہے نہ کہ غرور اور تکبر میں۔ پھل دار ڈالی تو ہمیشہ جھکی رہتی ہے۔ ادیب سائنس دان ہو یا فلسفی، وہ فن کاروں کے قافلے کا ایک مسافر ہے جو انسانیت کے لئے خوب سے خوب تر زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور اس منزل کے حصول کے لئے زندگی بھر ریاض کرتا ہے۔ میری بھی کوشش یہی رہی ہے کہ میں اپنی تخلیقی شخصیت میں ان علوم کی روشنی کو جذب کر کے ان کے رنگ قوس قزح کے رنگوں کی طرح اپنی تخلیقات میں پیش کروں۔ میں اپنی نوجوانی کے زمانے میں ہی سائنس، فلسفے اور ادب کا طالب علم رہ چکا ہوں اور آج بھی خود کو طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔“

خالد نے اس طرز زندگی اور اس سے مرتب ہونے والے اثرات کا نقشہ کچھ یوں پیش کیا: ”میرے ہر روز شام کو پڑھنے اور صبح دم تنہائی کے لمحات لکھنے اور طبع زانو تخلیقی کام میں مصروفیت نہ ہونے کے دوران ذاتی ڈائری اور ادبی دوستوں کو خطوط تحریر کرنے، عالمی ادب کے تراجم کرنے اور ہر چند ہفتوں کے بعد ان جانی منزلوں کے سفر پر نکل کھڑے ہونے سے نہ صرف میری تخلیقی زندگی میں استقامت (satbility) پیدا ہوگئی بلکہ ارتقا (evolution) کا عمل بھی جاری ہے جس سے میں فنی مسرت (artistic satisfaction) حاصل کرتا رہتا ہوں۔ اگرچہ میرا تخلیقی سفر نہایت صبر آزما اور دشوار گزار ہے لیکن میرے بے پایاں شوق، دوستوں کی پُر خلوص رفاقت اور تعمیری تنقید نے اسے پُر لطف اور پُر معنی بنا دیا ہے۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو ایک خوش قسمت انسان اور ادیب سمجھتا ہوں۔“

میں نے خالد سے پوچھا: ”وہ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں؟“ انہوں نے کہا: ”واقعہ میرا تو نہیں لیکن میری زندگی پر چسپاں نظر آتا ہے اور مجھ جیسے بہت سے حضرات ہوں گے جو ہجرتوں میں نوسٹیلجیا (nostalgia فرقت وطن) کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگر اسی انداز میں سوچیں جس انداز میں ان ایرانیوں کے امیر نے سوچا تھا تو زندگی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ مجھے ایک ہندوستانی رفیق کار نے سنایا تھا۔ جب ایران پر عربوں نے حملہ کیا اور اپنی طرز زندگی ان پر مسلط کرنا چاہا تو کچھ پارسی ایک کشتی میں سوار



ہو کر ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ ہندوستان کے ساحل پر پہنچے تو انہوں نے وہاں خیمے لگائے۔ جب اس ریاست کے بادشاہ کو کارواں کی آمد کی خبر پہنچی تو اس نے ایک پیامبر کو حکم دیا کہ وہ اس گروہ کے امیر کو بادشاہ کی طرف سے سادہ پانی سے بھرا ہوا گلاس پیش کرے۔ جب پیامبر وہاں پہنچا تو کارواں کے لوگ خیموں سے باہر زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پیامبر نے آگے بڑھ کر پانی سے بھرا گلاس پیش کیا تو امیر کارواں نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھا۔ چینی کے ایک پیالے میں سے کچھ چینی گلاس میں ڈالی اور درخواست کی: "اے پیامبر! تم اس گلاس کو جا کر دوبارہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں ہماری طرف سے پیش کرنا اور ان سے عرض کرنا کہ وہ اسے چکھیں۔" حاضرین کو امیر کی بات سمجھ میں نہ آئی اور انہوں نے وضاحت کی درخواست کی۔ امیر کارواں نے کہا: "بادشاہ نے پیغام بھیجا تھا کہ ہماری ریاست اس گلاس کی طرح بھری ہوئی ہے جس میں مزید ایک قطرے کی اور ایک انسان کی بھی گنجائش نہیں اور میں نے چینی ڈال کر کہا کہ ہم اس ریاست میں نہ صرف اس طرح جذب ہو جائیں گے جس طرح چینی پانی میں، بلکہ اسے میٹھی بھی کر دیں گے۔ اس وضاحت کو سن کر حاضرین مسکرا دیئے۔

میں جب اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے آپ کو اس وجہ سے خوش قسمت محسوس کرتا ہوں کہ مجھے مشرق و مغرب کے دونوں معاشروں میں زندگی گزارنے اور ان کی اقدار کو جذب کرنے کا موقع ملا اور پر امید بھی کہ مجھے ذاتی اور اجتماعی طور پر مختلف روایات اور طرز زندگی کے خوش گوار امتزاج کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اب میں اپنی ذات کو اس درخت کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کی جڑیں مشرق کی مٹی میں پیوست توانائی حاصل کر رہی ہوں اور جس کی شاخیں مغرب کی فضا میں جھولتی ہوئی تازہ ہوا میں سرشار ہوں۔ اب اس درخت پر جو پھل پھول لگے ہیں ان کی خوش بو اور ذائقہ آپ کو میرے افسانوں میں ملے گا۔" تخلیقی میدان میں خالد نے شجر سایہ دار تلے دم لئے بغیر اپنے ادبی سفر کو مسلسل جاری رکھا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "سلاش، آزاد فضا میں اور تازہ ہوا کا جھونکا" شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں کے یہ نام ہیں۔ ان میں افسانے، ترجمے، انٹرویو اور نفسیاتی مضامین شامل ہیں۔

(۱) زندگی میں خلا، (۲) چنگاریاں، (۳) ٹوٹا ہوا آدمی، (۴) امن کی دیوی، (۵) مغربی عورت، (۶) ادب اور زندگی، (۷) کالے جسموں کی ریاضت، (۸) انفرادی اور معاشرتی نفسیات، (۹) دو کشتیوں میں سوار، (۱۰) دھرتی ماں اُداس ہے، (۱۱) سوغات (۱۲) بھگوان، (۱۳) ایمان انسان، (۱۴) آزاد فضا میں، (۱۵) سلاش، (۱۶) تازہ ہوا کا جھونکا، (۱۷) اک پیروچ زنجیر۔ اس کے علاوہ پنجابی اور انگریزی میں بھی کئی تخلیقات شامل ہیں۔

Dr. Khalid Suhail,

Creative Psychotherapy Clinic Inc., 213 Byron St., South Whitby,  
Ontario, Canada, L1N 4P7





ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی  
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبت بنام کیا

دیک بد کی  
05.09.2001

## دیک بد کی

بڑودہ، گجرات، ہندوستان

۲۳ جولائی ۲۰۰۳ء کے اخبار ”جنگ، لندن“ میں ہماری ہمعصر صحافی مسرت جہیں کا کالم ”ہیری پاٹر کا جادو“ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو میرا جی چاہا کہ ہیری پاٹر سیریز کی نہ صرف کتابیں پڑھی جائیں بلکہ اس کہانی پر بننے والی فلموں کو بھی دیکھنا چاہیے کہ آخر یہ جادو کیا ہے۔

تجسس کا جذبہ ہر صحافی میں ہوتا ہے بلکہ میں یوں کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ تجسس ہی ایک صحافی کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

یہ بھی میرا تجسس ہی تھا کہ دیک بد کی کی کہانیاں مختلف جرائد میں پڑھنے کے بعد مجھے تلاش ہوئی کہ لفظ ”بد کی“ دیک کمار کے ساتھ کن معنوں میں ہے۔ میں نے انہیں خط لکھا تو دیک نے وضاحت کی... ”بات یوں ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے سرنیم (surname عرفیت) اسی طرح چپک جاتے ہیں جیسے انگریزوں کے ساتھ وہابٹ، براؤن اور بروکر۔ سنا ہے قدیم زمانے میں ہمارے گھر کے کسی شخص کو گھر کی زمین کی کھدائی کے وقت رائج الوقت سٹکوں (کشمیری زبان میں ’بد کیوں‘) کا خزانہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے لوگ ہمیں ’بد کی‘ والے کہنے لگے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لفظ صرف ’بد کی رہ گیا‘۔“



دیکھ کو سلاوں کا خزانہ تو نہیں ملا مگر قلم کا خزانہ مل گیا۔ دیکھ بد کی ۱۹۷۱ء سے لکھ رہے ہیں۔ بتیس تینتیس سال کی قلم کی ریاضت نے انہیں ان کے سینئر افسانہ نگاروں کی نظر میں محترم ٹھہرایا۔ ان کے افسانوں پر رائے دیتے ہوئے نئی دہلی کے بلراج کول نے لکھا: ”آپ کے افسانے گہرے مشاہدے اور انسانی رشتوں کو سمجھنے کے عمل میں کامیاب تخلیقی ترسیل کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ آپ کے ہاں تجسیم کا عمل نہایت ملامت سے تکمیل سے سرفراز ہوا ہے۔“

نئی دہلی ہی سے کنور سین نے بڑا مؤثر تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں: ”میں نے افسانے پڑھے تو یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ آپ اپنے افسانوں کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اپنی رائے اور اپنے اعتقادات قاری تک پہنچاتے ہیں اور اس میں خوب کامیاب ہیں۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور اُسے صفحہ قرطاس پر اتارنے کے لئے بے چین دل و دماغ بھی ہے۔ آپ کی شخصیت کا اضطراب اور کردار کی بے قراری آپ کی دولت ہے۔“

رائے درست ہے۔ دیکھ بد کی ایک افسانہ نگار ہے جو نہ ہندو ہے، نہ مسلمان اور نہ عیسائی۔ اس کا دل ایک مظلوم کے دکھ سے تڑپتا ہے۔ انسانیت پر ظلم و بربریت دیکھ کر اس کی آنکھیں خون بھرے آنسوؤں سے لب ریز ہوتی ہیں۔ اُس نے ۷۱ / اپریل ۲۰۰۲ء کو اپنے خط میں مجھے لکھا: ”محترمہ سلطانہ مہر صاحب! آداب و خلوص

آپ کا ۱۳ / فروری کا تحریر کردہ عنایت نامہ موصول ہوا۔ جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اپنے سارے پرسنل کام ملتوی کرنے پڑے۔ یہاں گجرات میں تین پوسٹل ریجن (postal region) ہیں اور ہر ریجن کا الگ الگ پوسٹ ماسٹر جنرل ہے مگر دو مہینوں سے تینوں ریجنوں کا کام میں ہی دیکھ رہا ہوں کیوں کہ احمد آباد اور راج کوٹ کے افسران ریٹائر ہو گئے اور ابھی ان کی جگہ کسی کی تقرری نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ ۲۸ / فروری سے گجرات کے حالات فرقہ وارانہ فسادات کے باعث بد سے بدتر ہوتے گئے۔

پچھلے دس بارہ سالوں سے یہ ہی کچھ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں اپنے آبائی وطن کشمیر میں تھا کہ وہاں دہشت گردی نے زور پکڑ لیا۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بستیاں خالی ہو گئیں۔ وہاں کشمیری ہندو اقلیت میں تھے اس لئے انہیں وہاں سے نقل مکان کرنا پڑا۔ دنیا میں اگر کوئی جگہ مذہبی رواداری کے لئے بے مثال تھی تو وہ تھی وادی کشمیر۔ اسی ضمن میں میں نے ’ادھورے چہرے‘ میں ایک افسانہ بعنوان ’اچانک‘ لکھا تھا۔ ۱۹۹۹ء میں جب کشمیر پھر جانا پڑا تو وہاں کا ماحول ہی بدلا ہوا پایا۔ دس سال کی انڈاکری نیشن (indoctrination) نے نئی پود کے ذہنوں کو تعصب اور فرقہ پرستی سے بھر دیا ہے۔ میرا بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی مسلمانوں کے ساتھ گزری ہے۔ اگر ایک مسلم شیعہ دوست نے سہارا نہ دیا ہوتا تو آج اس عہدے پر براجمان نہ ہوتا۔ ۷۳ء سے ۸۹ء تک کبھی کوئی بات ہی نہ سنی تھی۔ پھر وہاں کا منظر ایسا بدلا کہ خدا کی پناہ۔ ان ہی احساسات کی منظر کشی میں نے



اپنے افسانے ”چنار کے پتے“ میں کی ہے۔ ۱۹۹۲ء کے بعد میری پوسٹنگ (posting) (مشرقی ہندوستان میں ہوئی، پہلے ترپورا (اگر تالا) اور پھر ڈبروگ (آسام)۔ دونوں جگہیں وبشت گردی کے لئے بدنام ہیں۔ ایک جگہ ترپورا نیشنل وابہنی (ٹی این وی TNV) اور دوسری جگہ یونائٹڈ لبریشن فرنٹ آف آسام (یو ایل ایف اے ULFA) سرگرم عمل ہیں۔ ان سے جو جھگڑا پھر کشمیر میں دو سال اجنبی ماحول میں گزارے۔ اور اس کے بعد یہاں وزوڈرا (بروڈہ) پوسٹنگ ہوئی۔ بہت ہی شانت جگہ تھی۔ لوگ امن پسند اور شریف الذات لگ رہے تھے۔ نوراترا کے دنوں میں لوگ رات رات بھر گھومتے رہتے تھے۔ سڑکوں پر عورتیں اور لڑکیاں بنا خوف و خطر کے چلتی پھرتی تھیں۔ سوچا، چلو خدا کو ترس آگیا، کچھ سال آرام سے کٹ جائیں گے۔ یکا یک نہ جانے کیا ہوا کہ چاروں طرف آگ سی لگ گئی۔ ہندو مسلم فسادات نے سر اٹھایا اور گجراتی مسلمانوں کو جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر راحت کیمنوں میں جمع ہو گئے۔ وہ تھا مسلمانوں کا جبر اور یہ ہے ہندوؤں کا جبر۔ اب آپ ہی بتائیے کسے تہذیب یافتہ کہیں۔ پھر بھی شیش محلوں میں رہنے والے لوگ انسان کو اشرف المخلوقات کہہ رہے ہیں۔ ہیومن رائٹس (human rights) (حقوق انسانی) کی باتیں کر رہے ہیں۔ تہذیب و اخلاق کی باتیں کر رہے ہیں۔ عالمی گاؤں اور گلوبلائزیشن (globalisation) ہمہ جہتی) کی باتیں کر رہے ہیں۔ کس کو دوشی ٹھہرائیں کسے معصوم۔ دراصل ظلم و جبر انسان کی خصلت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جسے جہاں موقع ملتا ہے وہیں اس ہتھیار کو آزماتا ہے، محض اپنی خود غرضی کے لئے یا پھر اپنی انا کی تسکین کے لئے۔“

آئیے اب اس روشن خیال افسانہ نگار سے آپ کو ملو اؤں۔ دیکھ کمار بد کی ۱۵/ فروری ۱۹۵۱ء کے دن سرینگر، کشمیر، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۷۱ء میں علم نباتات میں ایم ایس سی اور ۱۹۷۳ء میں بی ایڈ کشمیر یونیورسٹی، سرینگر سے کیا۔ اسی سال جامعہ اردو، علی گڑھ سے ادیب ماہر کا امتحان بھی دیا۔ نیشنل ڈیفنس کالج، نئی دہلی سے ڈیفنس اسٹڈیز میں پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری لی۔ آرٹ اور پینٹنگ کے علاوہ کرکٹ اور بیڈ مینٹن میں بھی دل چسپی ہے۔ دہلی، روم، قاہرہ، پیرس اور بنکاک گھومنے کے بعد ان دنوں ہندوستان کے شہر بروڈہ میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے وابستہ ہیں۔ دیکھ بتاتے ہیں۔ شہر سرینگر، کشمیر، ہندوستان کے ایک گنجان آبادی کے علاقے میں ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ پتاجی کی دست کاری کی دکانیں تھیں۔ بعد میں گورنمنٹ ملازم ہو گئے۔ کالج کے دنوں میں اپنے گاندھی دادی پھوپا شری شام لال صراف، جو منسٹر اور بعد میں ممبر پارلیمنٹ تھے، کی زندگی اور تعلیمات کے زیر اثر آیا۔ یہی وجہ تھی کہ عمر بھر حرص و طمع، ذخیرہ اندوزی، کینہ پروری اور کینہ پروری سے آج تک خود کو بچاتا رہا۔ انہوں نے میرے ذہن میں پہلی بار اردو شعر مثنوی کی جوت جگائی۔ بارہ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پھر اٹھارہ سال کی عمر میں ہم عمر بچہ پیر سے بھائی کی رفاقت سے محروم ہو گیا۔ گھریلو حالات نے حساس ذہن کو جنھوڑ کے رکھ دیا اور قلم اٹھانے پر



اُکسایا۔ ۱۹۶۸ء میں پہلی بار ایک ڈرامہ بعنوان 'بندھن' تحریر کیا جو تلف ہوا۔ پانچویں جماعت تک اردو پڑھی۔ پھر دسویں تک ہندی میڈیم رہا۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ ۱۹۷۱ء میں اور پینٹل کالج میں باقاعدہ اردو سیکھی۔ ۱۹۷۱ء میں ہی پہلا افسانہ 'سلمیٰ' مقامی اخبار 'ہمدرد' سرینگر میں شائع ہوا۔ پھر مشہور ادیب موہن یادو کے ہفتہ وار 'رفقار' جموں میں میری کہانی 'کینچلی' چھپی۔ اس کے بعد مقامی اخباروں میں لگاتار میرے افسانے چھپتے رہے۔ 'تعمیر' دہلی نے افسانہ 'آج جانے دو' لوٹا دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ افسانہ رسالے کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ یو وائی سروس، آل انڈیا ریڈیو، سرینگر اور دور درشن، سرینگر کے پروگراموں میں شرکت کرتا رہا۔ دور درشن، سرینگر نے میرا ایک افسانہ 'ریزے ٹیلی وائز' بھی کیا۔ ایک ڈیڑھ سال ہفتہ وار اخبار 'عقاب'، سرینگر کے ایڈیٹر ریل بورڈ کے ساتھ جنوبی حد تک جڑا رہا۔ کچھ اور اخبار، مثلاً جہان نو، نوجیون، ہمارا کشمیر وغیرہ کے ساتھ بحیثیت کارٹونسٹ بھی کام کرتا رہا۔

۱۹۷۶ء میں انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کیا اور انڈین پوسٹل سروسز میں کام شروع کیا۔ اس سے پیشتر جموں و کشمیر ہندی کرافٹس (سیلز اینڈ ایکسپورٹ) کارپوریشن [کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایسوسی ایشن] میں بحیثیت سیلز مینیجر اور پھر پلاننگ آفیسر کام کیا۔ ۱۹۷۹ء میں فوجی ٹریننگ لے کر آرمی پوسٹل سروسز بحیثیت کپتان ڈیپوٹیشن (deputation قائم مقامی) پر چلا گیا جہاں لیفٹنٹ کرنل تک کے عہدے تک ترقی پائی۔ ۱۹۸۸ء میں واپس محکمہ ڈاک میں لوٹ آیا اور ڈائریکٹر پوسٹل سروسز کشمیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں ترقی پا کر پوسٹ ماسٹر جنرل بنا۔ ۲۰۰۰ء میں وروڈا پوسٹنگ ہوئی۔ متعدد ڈرائیوروں کی وجہ سے لگ بھگ سارا ہندوستان دیکھ چکا ہوں۔

انڈین پوسٹل سروسز میں آنے کے بعد دفتری مصروفیات اور دیگر وجوہات کی بنا پر ادب سے ناتا چھوٹ گیا۔ ایک اور اہم وجہ تھی اشاک ایکس چینج میں سرمایہ کاری کا شغل۔ ۱۹۹۳ء میں زندگی نے ایک ایسی کروٹ لی کہ سب کچھ ایک خواب سا لگنے لگا۔ اس سے پہلے ہی ایک روز غصے میں آکر اپنے سارے مسودہ جات اور شائع شدہ افسانے آگ کی نذر کر چکا تھا۔ مگر بدلے ہوئے حالات نے دل میں دہلی ہوئی چنگاری کو پھر سے بھڑکا دیا۔ ۹۷-۱۹۹۶ کے دوران میں میں نے وہ سارے افسانے جنہیں میں نے ضائع کیا تھا، پھر سے لکھ ڈالے اور از سر نو شائع کروائے۔ دو چار نئے افسانے بھی قلم بند کیے۔ ۱۹۹۹ء میں ان افسانوں کو یک جا کر کے 'ادھورے چہرے' کے عنوان سے کتابی صورت میں اردو اور ہندی، دونوں زبانوں میں شائع کیا۔ پہلا ایڈیشن جلد ہی بک گیا۔ اب دوسرے ایڈیشن کی تیاری کر رہا ہوں۔ میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'چنار کے نیچے' اردو اور ہندی میں زیر طبع ہے۔ اخباروں اور جرائد میں تبصرے لکھتا ہوں۔

ادیبوں کی گروہ بندی کے متعلق میرا نظریہ ہے کہ اپنی شناخت قائم کرنے کے لئے گروہ بندی ضروری ہے۔ ایک ہی ڈھیرے پر چلنا ادیبوں کے لئے آسان اور مناسب نہیں ہے۔ ارتقا کے لئے ضروری ہے کہ اردو کے اس تناور درخت سے شاخیں پھوٹیں اور پھوٹی رہیں۔ برگد کے جیز کی طرح یہ



شائیں اس اور بجٹل (original اصل) پیڑ کو مضبوط تر پر اپ (Prop سہارا) کرتی رہیں۔ ہاں گروپ بندی جہاں جزیرہ بناتی ہے وہاں اس کی موت یقینی ہوتی ہے۔

اردو کی بقا کے لئے لمبے چوڑے منشور لکھنے اور حکومت کی امداد کے لئے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اگر عملی کام کیا جائے تو بہتر ہوگا، مثلاً اردو جاننے والوں کے لئے روزگار کی فراہمی، ٹیلیویشن اور اخباروں کے ذریعے اردو کو مقبول بنانا، اردو تعلیم کے لئے موثر اقدام اٹھانا، اردو کو تعصب اور فرقہ پرستی سے پاک کرنا، اردو ادیبوں کی نگارشات پر خاطر خواہ معاوضے کے لئے مہم چھیڑنا وغیرہ۔ دوسرے کمپیوٹر نے اردو رسم الخط کی بہت ساری مشکلوں کو آسان کر دیا ہے۔ اب اس بارے میں سوچنا بھی کفر ہے کہ رسم الخط بدلا جائے۔

میرے پسندیدہ ادیب و شاعر سعادت حسن منٹو، پریم چند، موپاساں، غالب اور فیض احمد فیض ہیں۔

میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ اُس وقت کا ہے جب ہمارا مکان ایک گنجان آبادی والے علاقے میں واقع تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں کچھ بھی نہ اگتا تھا۔ میں نے کئی بار اُس صحن میں پودے لگانے کی سعی کی مگر پتا جی ٹوکتے رہے۔ اُن کے خیال میں بنجر زمین میں کچھ بھی نہیں اُگ سکتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ دادا جی نے کئی سال اُس صحن میں پیڑ لگانے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ ایک روز میں نے پتا جی کی ہدایت کو نظر انداز کر کے اُس زمین کے چھوٹے سے قطعے میں پیڑ پودے لگائے۔ دو چار مہینے میں ہی وہ چھوٹا سا صحن ہرا بھرا ہو گیا۔ ان دنوں میں کسی کمیٹی (competition مقابلے) میں اس لئے ڈرتا تھا کہ میرا جنرل ٹالچ (general knowledge معلومات عامہ) بہت کمزور تھا۔ اس ہریالی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر اس بنجر زمین میں پیڑ پودے اُگ سکتے ہیں تو میرے دماغ میں جنرل ٹالچ کیوں نہیں بس سکتا۔ چنانچہ کافی محنت کی اور چند مہینوں کے بعد انڈین سول سروسز میں امتیازی نمبر لے کر پاس ہوا۔

Mr. Deepak Kumar Budki,

Postmaster General, Warwotra Region, Baroda, Gujrat, 390002, India

e.mail: pmgvdtr@wilnetonline.net





عہد جوانی رورو کا نا پری میں لیں انگلیں مہر  
یعنی رات بہت تھکے جانے صبح سوئی آرام لیا  
۶ یو ڈ ۲۵ جولائی ۲۰۰۲

## ڈاکٹر ڈیوڈ جان میتھیوز

مڈکس، برطانیہ

۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء کے دن ڈاکٹر ڈیوڈ سے میری ملاقات ٹورانٹو میں جناب اطہر رضوی کے گھر ہوئی۔ اطہر بھائی کے گھر کا نام ہے Hidden Valley، یعنی ”چھپی ہوئی وادی“۔ اور واقعی پھولوں، پودوں اور بیلوں سے ڈھکا چھپا یہ گھر ایک چھوٹی سی وادی کی طرح ہے جس کے ایک کونج میں ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، ڈاکٹر شان الحق حق، میں اور اطہر بھائی اس گفتگو میں شریک تھے جو میرے اور ڈاکٹر ڈیوڈ کے درمیان ”گفتنی دوم“ کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر ڈیوڈ اپنی روسی اہلیہ لڈمیلا (Lyudimla) کے ساتھ میراٹیس کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں تشریف لائے تھے۔ یہ تقریب ڈاکٹر تقی عابدی اور اطہر رضوی صاحب اور ان کے احباب کے تعاون سے منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی کی ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل برسوں کی کاوش ”تجزیہ یادگار شہ انیس“ جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے۔ کا اجراء بھی ہونا تھا نیز نوادرات انیس کی نمائش بھی۔ یہ نوادرات ڈاکٹر تقی عابدی کے ادبی خزانے کا ایک حصہ ہیں۔

ڈاکٹر ڈیوڈ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۱ء میں کراچی میں ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر ہوئی تھی ان دنوں میں نئی نئی ممبئی سے کراچی آئی تھی اور محفلوں سے دور ہی رہتی تھی۔ برسوں بعد اب جو ڈاکٹر ڈیوڈ سے



تفصیلی ملاقات ہوئی تو انھیں اردو بولتے سن کر مجھے جناب مشفق خواجہ سے کلڈ اردو کتاب گھر صدر کراچی میں ہوئی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بے ساختہ کہا تھا۔  
 ”میں تو سمجھتا تھا کہ میں ہی واحد ہوں جس کا اردو کا لہجہ صاف ہے، آپ بمبئی کی ہیں پھر بھی آپ اتنی اچھی اردو بول لیتی ہیں۔“

ساحر لدھیانوی کے بعد یہ دوسری تیسرین آمیز مسرت تھی جو اردو لب و لہجے کے حوالے سے مجھے ملی تھی۔ اب ڈاکٹر ڈیوڈ جان میتھیوز کی اردو سن کر مجھے ویسی ہی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے ان سے پوچھا:

”کسی نجومی نے پیش گوئی تو نہیں کی تھی کہ آپ اردو کے ایک اہم اسکالرنہیں گے؟“

ڈاکٹر ڈیوڈ زور سے ہنسے اور کہنے لگے ”میرا ستارہ مارس ہے۔ میں ۲۶ فروری ۱۹۲۳ء کو لندن میں پیدا ہوا، میں نجوم وغیرہ کا قائل نہیں لیکن اخبار میں ستاروں کا کالم ضرور پڑھتا ہوں۔ میرے لیے تو کسی نجومی نے نہیں کہا مگر میری بیگم جب ہم عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں پڑھ رہے تھے مجھے ایک نجومی کے پاس لے گئی تھیں۔ انھیں علم نجوم سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کا ہاتھ دیکھ کر نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ کم از کم بیس ملکوں کی سیر کریں گی اور اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسیں گی۔ وہ ایک بڑے گھر میں رہیں گی۔ انھیں گھر بڑا ملا یا نہیں کہہ نہیں سکتا کیونکہ ہم تو لندن میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں لیکن یہ پیش گوئی اس حد تک تو صحیح ثابت ہوئی کہ وہ روس چھوڑ کر برطانیہ آ بسیں کیونکہ انھوں نے شریک حیات کے طور پر میرا انتخاب کر لیا تھا۔“

”یقیناً ایک عالم و دانش ور کا خیمہ بھی ایک ”بڑا گھر“ ہوتا ہے۔ علم و دانش کا گھر۔“ میں نے کہا اور دوسرا سوال اسی حوالے سے کیا جس سلسلے سے گفتگو ہو رہی تھی۔ ”آپ کی ملاقات لیڈمیل (Lyudimila) سے کب اور کہاں ہوئی تھی؟“

”وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو پڑھا رہی تھیں اور میں تحقیق کے سلسلے میں اس یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ یہ ۷۹-۸۰ء کا زمانہ تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا ایک خوبصورت لڑکی فون پر روسی زبان میں باتیں کر رہی ہے۔ مجھے روسی نہیں آتی تھی۔ دو الفاظ آتے تھے چنانچہ ان دو لفظوں کے سہارے میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں انگریز ہوں۔ انھوں نے مجھے چائے پر مدعو کیا۔ یوں سلسلہ آگے بڑھا۔ جب میں انگلستان واپس آتا تب میں نے اتفاق سے لندن کے ایک اخبار میں اشتہار دیکھا کہ غیر ملکیوں کے لیے کچھ کورسز شروع کیے جا رہے تھے۔ میں نے وہاں داخلہ لیا۔ اور روسی زبان سیکھی۔ ہماری شادی ویسے سویت یونین میں ہوئی تھی۔ لڈمیل سفر کی بہت شوقین ہیں۔ انھیں ہندوستان بہت، بہت پسند تھا۔ ہندوستانی کھانے بھی شوق سے کھاتی تھیں۔“

آپ کو ڈاکٹر لدھیانوی کے علاوہ بھی کسی نے متاثر کیا؟ ”ڈیوڈ ہنسے۔۔۔

”بھئی کیا کہنے ہیں، ہندوستانی مسن کے کالے کالے بالوں اور گورے گورے گالوں



والوں نے اکثر متاثر کیا۔ لیکن دل آنے کے ڈھنگ تو نرالے ہوتے ہیں۔ ویسے ہندوستان پاکستان کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں اس میں دورائے نہیں ہو سکتیں۔“

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی کب اور کیسے ہوئی۔ اس سوال کا جواب تفصیل سے دیتے ہوئے انہوں نے کہا ”ویسے تو میرے گھرانے میں کیا میرے رشتے داروں میں بھی کسی کو اردو زبان سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ لیکن غالباً روحانی طور پر میں علم و ادب سے وابستہ رہا۔ زبانوں سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جی چاہتا تھا کہ میں جتنی زبانیں ممکن ہوں سیکھ لوں۔ لیکن میں نے ہبلو نمین، سیرین، عبرانی، جدید یونانی، روسی، عربی، فارسی، فرانسیسی، جرمن اور میپالی زبانیں سیکھیں۔ یہ میرے تدریسی پیشے کی ضرورت بھی تھی۔ میں ۱۹۶۳ء میں کیمرج یونیورسٹی (انگلینڈ) کا طالب علم تھا۔ میں قدیم یونان اور قدیم مشرق وسطیٰ کے تعلقات پر تحقیق کر رہا تھا اور ادارہ مشرقی علوم اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ کیمرج سے منسلک تھا۔ میری بنیادی تعلیم لاطینی اور یونانی میں ہوئی تھی۔ یہ ۶۵ء کی بات ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں توسیع ہو رہی تھی۔ لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے اکابر چاہتے تھے کہ کوئی شخص ہندوستانی زبانوں کی صوتیات پر کام کرے۔ اس سلسلے میں مجھے وہاں ملازمت ملی اور تب میرے دل میں اردو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوئی۔ اس وقت اردو سکھانے والی کوئی ایسی کتاب نہ ملی جو میری مدد کرتی۔ بہت بعد میں ایک کتاب ملی۔ کچھ دوست بھی ملے۔ لیکن پھر میری صوتیات سے دلچسپی کم ہو گئی اور میں نے شعبہ جنوبی ایشیا، میں داخلہ لے لیا۔ ۶۸ء میں ایک سال کے لیے برصغیر گیا۔ اس وقت میری عمر ۲۶ سال تھی۔ سب سے پہلے میں کراچی آیا اور جامعہ کراچی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ذریعے اس وقت کے لیکچرار جمیل اختر خان سے ملا۔ ان سے بعد میں بڑی دوستی ہو گئی۔ وہ میرے ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ میں نے انہی سے شاعری کے رموز و اوقاف سیکھے۔ گو میں نے باقاعدہ شاعری کبھی نہیں کی۔ نثر لکھی اور یوں کہئے کہ تراجم زیادہ کیے۔ میں اور جمیل اختر خان کراچی کے ہوٹل جہیں میں بیٹھا کرتے تھے۔ کیا زمانہ تھا۔ وہ ادیب میری ملاقاتیں جوش صاحب، علی احمد صاحب، فیض صاحب سے ہوئیں اور یہ اپنے حقیقی صاحب بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لیں ان سب لوگوں سے میں نے اکتساب علم کیا۔ ہندوستان میں میری ملاقاتیں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جان نثار اختر، فراق صاحب، اختر الایمان، کرشن چندر، عصمت، قرۃ العین حیدر اور مخدوم سے ہوئیں۔ میں ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے والا ایک طالب علم تھا۔ ان قد آور ادیبوں اور شاعروں نے مجھے علم کا بڑا خزانہ دیا۔“

وہ تھوڑی دیر کو چپ رہے۔ اطہر رضوی صاحب نے کافی کا اہتمام کیا۔ پھر ڈاکٹر ڈیوڈ گویا ہوئے۔ ”لندن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو اب شعبہ جنوبی ایشیا کہا جاتا ہے۔ میں وہاں اردو پڑھاتا تھا اس زمانے میں لیکچرار کو ایک سال کی تعلیمی رخصت دی جاتی تھی تاکہ وہ برصغیر کا دورہ کر کے زبانوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ میرا بھی اسی سلسلے میں جانا ہوا۔ اب میں لندن یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ریٹائرڈ ہو گیا ہوں اور شعبہ کے لینگویج سینٹر میں جو خاص طور پر زبانوں پر زور دیتے ہیں، وہاں



تدریس سے وابستہ ہوں۔“

”آج کل آپ کس موضوع پر کام کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا

”میں جناب امیر خسرو کے کلام پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے ان سے بے حد دلچسپی ہے۔ میری رائے میں ان کی شاعری پر اتنا کام نہیں ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کئی سال کی عرق ریزی کے بعد خاصا مواد جمع کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ انگریزی میں ان کی سوانح عمری لکھوں۔ ان کے مخطوطات جمع کرنا بھی خاصا وقت طلب کام ہے۔ میں نے جتنے شعرا کو پڑھا ان میں امیر خسرو سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ ان کی تو روح میں شاعری رچی بسی تھی۔ وہ روسی شاعر پوشکن کی طرح سوچتے بھی شاعری میں تھے۔ امیر خسرو کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی ہیں۔ آپ نے یہ بھی پوچھا ہے کہ اس کام میں کتنا وقت لگے گا۔ میں کیا بتاؤں لیکن اندازہ ہے کہ دو تین سال لگ جائیں گے۔ میں درسی کتابوں پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ اردو پڑھانے کے لیے مواد بہت کم ہے۔ طالب علموں کے لیے قواعد اردو، مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے غالب کے فارسی کلام کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ ”اسرار خودی“ پر کام کیا ہے۔ گو اس کا ترجمہ نکلسن نے بھی کیا ہے مگر مجھے اس میں کچھ کمی محسوس ہوئی ہے۔ دراصل میں ترجمے کا کام کرتا ہوں اس لیے کہ انگریزی جاننے والے خصوصاً انگریز، ان کلاسک شعراء کو پڑھیں۔ وہ اقبال، غالب، انیس اور امیر خسرو کو پڑھیں۔ میرا وسیع مطالعہ اور مشاہدہ ہے کہ ۹۹ فیصد انگریز اقبال اور غالب کو نہیں جانتے۔ اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم انہیں انیس، سودا اور مصحفی وغیرہ کو بھی پڑھوائیں۔ میں میرا انیس سے اس وقت متاثر ہوا جب میں لکھنؤ کی مجالس میں گیا اور ان کا کلام سنا۔ پھر میں نے انیس پر بھی کام کیا۔“

ہم نے چائے اور کافی پینے کے لیے کچھ دیر توقف کیا۔ مجھے اظہارِ رضوی صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے ۱۹۷۶ء میں ”دکن کا اردو ادب“ کے موضوع پر مقالہ تحریر کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ وہ برطانیہ کی ”اقبال اکیڈمی“ کے رٹشی اور ”رائل ایشیاٹک سوسائٹی“ کے فیلو ہیں۔ انھوں نے اردو اور نیپالی ادب پر ۱۹ کے قریب کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے روسی شاعری پوشکن پر اپنی اہلیہ کے تعاون سے ۱۵۰ ایبوم پر مبنی ایک کتاب مرتب کی ہے جو زیر طبع تھی۔ اس کے علاوہ وہ مولانا حالی کی کتاب ”حیات جاوید“، مرزا ہادی رسوا کے ناول ”امراؤ جان ادا“، شوکت صدیقی کے ناول ”خدا کی بستی“ اور ابن انشاء کی ”اردو کی آخری کتاب“ کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ میرا انیس کے معروف مرثیے ”سب قطع کی مسافت، شب آفتاب نے“ کا بھی انھوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

”کیا آپ نے کچھ منظوم ترجمے بھی کیے ہیں؟“

ڈیوڈ نے کہا، ”میں کوشش تو کرتا ہوں، جیسے غالب کا یہ شعر جو بہت مقبول ہے:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار

یا الہی یہ ماجرا کیا ہے



اسے نثر میں لکھنا کوئی مشکل نہیں۔ مگر میری کوشش رہی کہ اسے منظوم کروں تاکہ وہ نثر کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہو کر سامنے آئے۔ لیکن اب ایک اور مسئلہ بھی سامنے ہے۔ شاعری اب اتنی مقبول نہیں جتنی پہلے تھی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ آکسفورڈ جیسے ادارے نے بھی اب شاعری طبع کرنا کم کر دی ہے۔ شیکسپیر اور ملن کو بھی اب کم پڑھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ الیکٹرونک میڈیا اور انٹرنیٹ کی آمد بھی ہے۔“

جناب اطہر رضوی نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ میں پورے یقین سے کہوں گا کہ اردو بولنے والے اپنے ادبی سرمائے کی جس طرح حفاظت کر رہے ہیں اور مقالوں، سیمینار اور مشاعروں کے ذریعے جو کام کر رہے ہیں ایسا کام انگریزی ادب کے لیے نہیں ہوتا۔ میں نے انگریزی زبان اور ادب کے ادبی اجتماعات دیکھے ہیں۔“

”پھر تو ہمیں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا، ڈاکٹر ڈیوڈ نے بھی دلچسپی لیتے ہوئے کہا کہ بے شک مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مسئلہ صرف اردو کے ساتھ نہیں۔ فرانس میں بھی جہاں فرانسیسی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں جواب دینا بھی ناپسندیدہ عمل تھا، اب انگریزی قدم چما رہی ہے۔ میں جب جب ہندوستان جاتا ہوں تو ابتدا میں لوگ مجھ سے انگریزی میں گفتگو کی کوشش کرتے ہیں چونکہ وہاں سرکاری زبان تو انگریزی ہے اور یوں ہمارے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے جیسے میری حیثیت صرف ایک سرکاری مہمان کی سی ہو۔ لیکن جب میں اردو بولنا شروع کرتا ہوں تو لوگوں کے چہرے خوشی سے روشن ہو جاتے ہیں، چنانچہ اردو کے بچاؤ کے لیے والدین کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ محنت کریں اور اپنے بچوں کو ایک اضافی زبان کے طور پر اردو پڑھائیں۔“

پھر بات پنپنی تو الیوں تک اور مزاروں تک۔ ڈاکٹر ڈیوڈ نے کہا ”انگلستان میں اب تو اب بھی بہت مشہور ہو رہی ہے۔ ایک صاحب نے انھیں کراچی سے فون کر کے تو اب کی سی ڈی بھیجی کہ اس کا ترجمہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ وہ سندھ پاکستان میں لعل شہباز قلندر اور بھٹ شاہ کے مزار پر بھی گئے ہیں۔ وہاں لوگوں سے تبادلہ خیال بھی کیا ہے کہ وہ مزاروں پر کیوں آتے ہیں اور گفتگو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنے اپنے مسائل سے گھبرا کر لوگ وہاں آتے ہیں اور شاید پڑھے لکھے لوگ صوفی منش اس لیے آتے ہیں کہ زندگی کے مقصد کا راز جان لیں۔ انھوں نے اس دوران عمر خیام کی ایک رباعی پڑھی۔ میں نے پوچھا عمر خیام پر کام کرنے کو جی نہیں چاہتا؟

کہنے لگے ہزاروں ادیب ایسے ہیں جن پر ٹھوس کام اب تک نہیں ہوا اور جو ہوا ہے اس میں بھی بہت نقائص ہیں۔ ان کی درستگی کو جی چاہتا ہے۔“ پھر انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے

”میں نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے حوالے سے زور کی کلیات دیکھی۔ اس میں ایک

شعر ہے:

پیابانج پیالہ پیا جائے نا  
پیابانج یک دل دیا جائے نا



یہ شعر و جہی کا ہے۔ قلی قطب شاہ کے مخطوطات میں بھی مجھے نہیں ملا۔ شان الحق حقی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا واقعی وجہی کا ہے؟“ ڈاکٹر ڈیوڈ نے کہا ”جی ہاں! سالار جنگ میں وجہی کے دیوان میں، میں نے دیکھا۔ علاوہ اس کے میں نے چونکہ قدیم اردو پر تحقیق کی ہے اور اس پر اپنا پل ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے چنانچہ میرے علم میں ہے کہ کتنے مخطوطات ایسے ہیں جن پر کام ہونا چاہیے اور نہیں ہوا۔ جیسے بیجار پور میں ۹۹۹ ہجری کے نہایت شاندار مخطوطے ہیں۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے میں لکھے گئے مخطوطات ہیں۔ بلوم ہرٹ نامی ایک محقق نے جب اس کا کیٹلاگ بنایا تو اسے ہندی کیٹلاگ میں رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ یہ پدموات کا ورژن ہے۔ چنانچہ اردو والوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میں نے ان مخطوطات کا مطالعہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام ”پدموات“ نہیں ہے اس کا نام ”پریم کا نیم“ ہے۔ نیم ہندی لفظ ہے جس کے معنی ہیں اصول۔ اس میں صاف لکھا ہے کہ میرا نام حسن منجولہ ہے اور میرا تخلص ”اپنا ام“ ہے یا ہنس شاہ اور یہ ماہ جی اور شاہ جی کی کہانی ہے۔ بلوم ہرٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میری یہ کتاب ”ساگر موتی رتن کھان“ ہے یعنی موتیوں کا ساگر اور رتن کی کان ہے۔ رتن نامی شخص رتن سنگھ تھا جو پدموات کا عاشق تھا۔ یہ ایک دلچسپی تاریخی دستاویز ہے۔ اس میں بڑی قیمتی، نادر اور انوکھی تصاویر بھی ہیں۔ آج کل لوگ ڈگری کے شوق میں آسان موضوعات اٹھاتے ہیں جیسے ”اقبال اور نفسیات، اقبال اور فینن ازم، طالب علموں کو چاہیے کہ اپنے ملک میں تاریخی داستانوں پر تحقیق کریں۔“

حق صاحب نے کہا ”جناب یہ معاشی مسئلہ ہے۔ اردو بے چاری نہ سرکاری زبان ہے نہ کاروباری۔ کوئی گھائے کا سودا کیوں کرے؟“

حق صاحب نے سچ کہا:

ہر کوئی سودائی تو نہیں ہوتا

Dr. David. Dr. Lyudmila Matthews  
272, Grasmere Avenue  
WEMBLEY, MIDDEX HA8 8TW UK.  
E-mail: matthesindia.fsnet.co.uk



آپ اپنا دروازہ بس یوں ہی کھلا رکھیے  
کیا پتہ کوئی راہی بھول کر ادھر آئے



رافت سلطانہ  
۲۴ ستمبر ۲۰۰۳ء

## ڈاکٹر راحت سلطانہ راحت

حیدرآباد، دکن، ہندوستان

آج کی دنیا میں تقریباً ہر جگہ اور ہر زبان میں جہاں کچھ ایسے ادیب اور شاعر نظر آئیں گے جن کے ہاں کسی نظریے کا دور دور تک کوئی پتا نہیں ہے وہیں بے شمار تخلیق کار ایسے ملیں گے جو اپنی نظریاتی بنیاد پر اصرار کرتے ہیں، حالانکہ نظریہ فن کی سرشت میں شامل نہیں۔ یہ ایک اضافی چیز ہے۔ زندگی کی بو قلموئی اور بے کرائی کسی فارمولے میں قید نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو لکھنے والے کا اپنا اعجاز ہے کہ اسے جو رنگ چاہے دے۔

ڈاکٹر راحت سلطانہ کے قلم نے بھی کسی مخصوص نظریے کی قبا میں لپٹے بغیر اپنی راہ کا آپ تعین کیا۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہندوستان کے معتبر اور نامور نعت گو شاعر عظیم صبا نویدی<sup>(۱)</sup> کی نعتیہ شاعری پر مقالہ لکھ کر حاصل کی۔

آج ہم خاتون محترم ڈاکٹر راحت سلطانہ سے گفتگو کرنے جا رہے ہیں۔ راحت سلطانہ ۱۔ عظیم صبا نویدی کے فکر و فن اور حیات و شخصیت پر اردو کے معتبر نقادوں نے آٹھ (۸) کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ ان کی شاعری کے تامل اور تیکو زبانوں میں دو منظوم ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جناب عظیم صبا نویدی گزشتہ چونتیس (۳۵) برس سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سلطانہ میر



۷ / ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد دکن کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے اسکولوں میں ہوئی۔ گریجویٹن سوشیالوجی اور عربی مضامین کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں اور اردو ادبیات میں ایم اے ۱۹۷۴ء میں جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے کیا۔ سلیقہ مندراحت نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران مختلف فنی علوم مثلاً ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ، کشیدہ کاری، مشین انیمر اینڈری میں بھی خاطر خواہ استعداد حاصل کر کے اسناد لیں۔ ۳۰ / اپریل ۱۹۷۶ء کو ڈاکٹر محمد علی اثر کی رفیقہ حیات بنیں۔ فروری ۱۹۷۶ء میں ان کا تقرر حکومت آندھرا پردیش کے ”محکمہ فنی تعلیم“ کے ایک انتظامیہ عہدے پر عمل میں آیا۔ ان کی تین لڑکیاں، کہکشاں عمران احمد، ڈاکٹر ثریا نجم الدین اور ڈاکٹر شائستہ ناہید، اور دو بیٹے، محمد عادل فراز اور محمد سہیل فراز ہیں۔ عادل فراز لندن میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ راحت نے بتایا۔

”رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کا میرا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ لیکن حسن اتفاق کہ ۱۹۹۶ء میں پروفیسر ناز قادری غریب خانے پر تشریف لائے تھے تو انہوں نے ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں بہار یونیورسٹی (جہاں وہ صدر شعبہ اردو ہیں) میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔ اور اسی سال مجھے ”علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری“ کے موضوع پر مذکورہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ ۲۰۰۰ء میں میں نے مقالہ داخل کیا اور ۲۰۰۱ء کے اوائل میں زبانی امتحان میں اپنے مقالے کی طرف داری پیش کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی سند یونیورسٹی نے تفویض کی۔ اور یوں میری زندگی کا ایک دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔ پڑنے اور مظفر پور (بہار) کے سفر کے سلسلے میں مجھے چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہاں جس انداز میں شب و روز میسر ہوئے وہ میری زندگی کے یادگار واقعات میں سے ایک ہے۔ میرا زبانی امتحان (viva) تو وقت پر ہو گیا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر مجھے اور میرے شوہر کو یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس (guest house) مہمان خانہ میں تقریباً دو ہفتے قیام کرنا پڑا۔ اس دوران بہار کے مختلف شہروں، بازاروں میں گھومنے پھرنے کے علاوہ وہاں کے شاعروں اور ادیبوں اور فنکاروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کا اتفاق بھی ہوا۔ ہندوستان بھر میں بہار کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ یہ صوبہ دراصل اردو کا علاقہ ہے۔ یہاں کی متعدد جامعات میں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی تعلیم کی سہولت کے علاوہ گریجویٹن، ہائی اسکول اور پرائمری اسکول کی سطح پر بھی اردو زبان میں درس و تدریس کا اہتمام حکومت کی طرف سے بھی ہے اور خانگی طور پر بھی ہے۔ یہاں سے اردو میں جتنے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں شاید ہی ہندوستان میں کسی اور صوبے سے نکلتے ہوں۔“

راحت کہہ رہی تھیں، ”میرے ادبی سفر کا آغاز ایم اے کی تعلیم کے دوران ۱۹۷۴/۷۵ء میں ہوا۔ میں نے شاعری کی طرف کبھی بھی باقاعدہ طور پر توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی شعر کہہ لیتی ہوں۔ میں نے چند نعتیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن یہ تعداد میں اتنی نہیں ہیں کہ کوئی مجموعہ



شائع ہو سکے۔ ہاں البتہ میری تین نثری کتابیں، 'منتاح شعر و ادب' (۱۹۷۲ء میں)، 'گلدستہ تجنیدت' (۱۹۷۲ء میں) اور 'آئینہ نقد و نظر' (۱۹۷۳ء میں) شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ تین تین نظمیں کا ایک مجموعہ 'خوش بو کی بارات' زیر طبع ہے۔ اور مجھے چوں کہ اردو ادب سے بے پناہ لگاؤ ہے اس لئے زندگی کے کسی حصے میں ادبی شہرت اور مالی خسارے کا احساس نہیں ہوا۔

راحت کے نظریے کے مطابق "ادیبوں کی گروہ بندی ناگوار ضرور ہے لیکن یہ گروہ بندی اردو زبان و ادب کی ترقی میں کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنی بلکہ اس سے ہمیشہ اور ہر زمانے میں ادب کو فائدہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک شاعر دوسرے شاعر کی خامیوں کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے یا ایک گروہ دوسرے گروہ کے فن کاروں پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اس کی وجہ سے کسی مخصوص گروہ سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے ادب کو فائدہ ہی ہوتا ہے۔ قدیم دکنی زبان ہو یا دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ یا دبستان رام پور، ترقی پسند تحریک ہو یا جدیدیت کی تحریک یا حلقہ ارباب ذوق کا رجحان، ہر زمانے اور ہر عہد میں کسی ایک گروہ، کسی ایک رجحان یا کسی ایک تحریک کو دوسری تحریک سے مخالفت کی وجہ سے فائدہ پہنچتا ضرور ہے۔"

راحت نے کہا.....

"میں اس بات سے پوری طرح متفق نہیں ہوں کہ ہندو پاک میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ لیکن مجھے اس تعلق سے زیادہ خوش فہمی بھی نہیں ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا مستقبل کا تعلق ہے ہمیں پہلے اپنے افراد کنبہ کو اردو سے دل چسپی کی طرف راغب کرنا چاہیے۔ گھر والے اگر اردو جانتے ہوں، اگر وہ اردو میں اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھتے ہوں تو دوسروں کو بھی اس زبان سے واقف کرانے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلے میں میری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دلوائیں اور ایسے مدرسے میں شریک کروائیں جہاں دوسری زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم کا انتظام بھی ہو۔

رسم الخط کے سلسلے میں بھی یہ ہی کہوں گی کہ رسم الخط کا بدلنا لباس کا بدلنا نہیں ہے۔ اردو زبان کا اپنے رسم الخط سے وہی رشتہ ہے جو جسم اور روح کا ہوتا ہے۔ لہذا رسم الخط کی تبدیلی کا رویہ کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

ڈاکٹر راحت سلطانہ میر، غالب، اقبال، فیض، جگر، حالی، شبلی، رشید احمد صدیقی اور قرۃ العین حیدر کی تحریروں سے متاثر ہیں اور مطالعہ سب ہی اصناف میں کرتی ہیں۔

Dr. Rahath Sultana,

H. No. 20- 4- 226/9, Chowk, Hyderabad, A P. 500002, India





حصار ذات کی محدود و محتوی سے ذرا  
نکل کے دیکھو تو دنیا بڑی کُشادہ لگے  
راشد آذر  
۲۷ مارچ ۲۰۰۱ء

## راشد آذر

حیدرآباد، آندھرا پردیش، ہندوستان

ہمیشہ کی طرح ”گفتنی حصہ دوم“ کے لئے بھی محترم حسن چشتی میرے معاون رہے۔ زیرِ نظر تعارف کا حصول بھی ان ہی کامرہون منت ہے۔ جناب راشد آذر کو جب میرا سوال نامہ برائے گفتنی حصہ دوم ملا تو انہوں نے ۲۳ / مارچ ۲۰۰۲ء کی تاریخ رقم کر کے حسن چشتی صاحب کو خط لکھا۔ ملاحظہ ہو محبِ سحرِ حسن بھائی

آپ کا دفتری اطلاع نامہ ملا، جس پر ایک نہایت مختصر پس تحریر کے طور پر آپ کی ”فرمائش“ دیکھی۔ یاد آوری کا شکریہ۔ آج سے تین سال قبل جب میں امریکہ (شکاگو) آیا تھا تو احمد خان صاحب نے مجھے ایک کوائف نامہ دیا تھا۔ فرمائش کی تھی کہ شعر اوالے شمارے کے لئے اس کی خانہ پری کر کے دوں، لیکن اپنی گوشہ نشینی اور تشبیر بے زاری کی ”بری عادت“ کی وجہ سے میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ اب آپ نے فرمائش کی ہے اور وہ بھی شکر نگاروں کے شمارے کے لئے! بہر حال آپ کی تحریرِ نظر سے گزری تو آپ کا دل جیتنے اور ہر بات منوالینے والا متہمس چہرہ بھی نکا ہوں میں پھر گیا اور میں سپر انداز ہو گیا۔ اب میں، یعنی سپر انداختہ راشد آذر، آپ کے جیسے ہوئے کوائف نامے کی خانہ پری کرتا بیٹھا ہے، جو اس



نے دلی کی اردو اکادمی کے لئے بھی نہیں کیا۔ اور حیدر آباد کی اردو اکادمی والوں نے میری اس "بری عادت" کو جانتے ہوئے مجھے بٹھا کر لکھوایا۔

پھر انہوں نے اپنے بارے میں لکھا..... "میرا نام مرزا راشد علی خان ہے۔ تخلص آزر ہے۔ ادبی دنیا میں راشد آزر کے نام سے معروف ہوں۔ ۳۱/ اگست ۱۹۳۱ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوا۔ تعلیم انگریزی ادب میں بی اے اور پھر ایل ایل بی اور بی ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ میری ادبی زندگی کا آغاز نو دس سال کی عمر میں شاعری کی دل چسپی کی وجہ سے ہوا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء سے باقاعدہ شعر کہنا اور مشاعروں میں پڑھنا اور جرائد میں چھپنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں شعر کہتا ہوں اور تنقیدی مضامین لکھتا ہوں۔ میرے مطبوعہ شعری مجموعے یہ ہیں۔

- ۱۔ نقش آزر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۲۔ صدائے تیشہ (ستمبر ۱۹۷۱ء)
  - ۳۔ آب دیدہ (نومبر ۱۹۷۴ء) ۴۔ خاکِ انا (مارچ ۱۹۷۹ء)
  - ۵۔ جمع و خرچ وفا (مئی ۱۹۹۰ء) ۶۔ منزل شوق (جولائی ۱۹۹۲ء)
  - ۷۔ زخموں کی زباں (دسمبر ۱۹۹۳ء) ۸۔ قرضِ جاں (۲۰۰۱ء)
  - ۹۔ چار ترتیب شدہ شعری مجموعوں، فردِ حساب، لمحہ نقد، یقین و گماں اور در در انگاں کو یک جا کر کے "اندوختہ" کے نام سے جنوری ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔
  - ۱۰۔ میر کی غزل گوئی..... ایک جائزہ (۱۹۹۱ء)
- مطبوعہ تنقیدی مضامین یہ ہیں۔

۱۔ ادب کی جدلیات، ۲۔ جاں نثار اختر کی شاعری، ۳۔ شاذ ممکنات، ۴۔ سلیمان اریب، ۵۔ مخدوم محی الدین، ۶۔ علی سردار جعفری کی آزاد شاعری، ۷۔ کیفی اعظمی، ۸۔ ساحر لدھیانوی، ۹۔ سماجی حالات اور ادیب، ۱۰۔ اُنٹھے گا جب جہم سرفروشاں، ۱۱۔ فن کار کی آزادی اظہار..... ایک جدلیاتی تجزیہ، ۱۲۔ اردو بحروں میں تجربوں کے امکانات، وغیرہ۔

راشد آزر صاحب سے مزید گفتگو سے قبل میں محترم اقبال مشین کا لکھا ہوا ایک مختصر خاکہ آپ کو پڑھوانا چاہوں گی۔ راشد آزر صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے یہ مختصر تحریر معاون ہوگی۔ اقبال مشین لکھتے ہیں۔

"اقلیمِ سخن کا ایک سفید بھک شہزادہ اپنے احباب میں راشد آزر اور خاندان میں راشد علی خان کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے چاہا بھی جاتا ہے۔ مارکس ازم اور ارسنوکریسی (Aristocracy) میں سمجھوتا ناممکن ہو یا نہ ہو، راشد آزر نے اس کو ممکن کر دکھایا ہے۔ وہ لوہا جس نے فرش کے نیچے پیر میلے نہیں کیئے، ہوش سنبھالا تو زندگی کی گند گیوں کو دور کرنے کا سودا اس کے سر میں سما گیا تھا۔ سنتا ہوں یہ داستان طویل ہے، لیکن اس ساری طویل



داستان میں ایک بات واضح ہے اور وہ ہے اپنے سامنے نعمتوں کے انبار رکھ کر بالکلی سے خالی کشکول لیے گد اگروں کے انہوہ پر نظر ڈالنا اور پھر ترس کھا کر رہ جانا۔ ذہنی انقلاب کی یہ ہیئت ترکیبی بے عمل سہمی، مستحسن ضرور ہے۔ زندگی کی صعوبتوں میں سماجی استحصال اور معاشرہ میں نابرابری کے شدید احساس نے راشد کو اپنے گھر کے روشن فانوس اور جگمگاتے قہقروں سے ہٹا کر اندھیروں کے سفر پر راغب کیا۔ جلو میں امارت، سامنے بے اماں تہی دستوں کا کارواں۔ راشد کی تربیت میں جہاں اُن کی نبض شناس امی (۱) کی آنکھیں عاطفت کی نرمی گرمی شامل رہی وہیں ان کے والد محترم پروفیسر حسین علی خان (۲) نے ادراک و آگہی کے بند کوڑا راشد کے ذہن رسا پروا کیے۔ اس تربیت نے راشد میں بردباری، رکھ رکھاؤ۔ اصول پسندی تو پیدا کر دی، لیکن وہ پلک اس کے حصے میں نہیں آئی جو زمانے کے سرو و گرم کے سہنے کے بعد مزاج کا حصہ بنتی ہے۔ اس طرح ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ یہاں راشد اپنے اصولوں کی پرستش میں معصوم پجاری کی طرح لگتا ہے۔ ایسا پجاری جس کے صنم اُس کی نظروں کے سامنے تہس نہس کر دیے گئے ہوں۔ لیکن وہ شوق جہیں سائی میں بتوں کی شکست و ریخت کا منظر بھی بھول بیٹھا ہو۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔

اس وفا کیشی نے راشد کی شخصیت کو بڑی حد تک متوازن بنا دیا ہے۔ اُس نے اپنی طرف سے اصول پسندی کے ایسے ہالے بنا رکھے ہیں کہ ان حصاروں کو توڑ کر راشد کو چھوتے ہوئے اس کے دوست احباب کو بھی ڈر لگتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بعض اوقات اس انداز سے دیکھتا ہے کہ اس کے قریبی احباب کی بھی ان واقعات پر اُن زاویوں سے نظر نہیں جاتی۔

ایک بار ان کے کسی ہمعصر شاعر نے بات کرتے کرتے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جن سے وہ کبھی بے تکلف نہیں رہا تھا۔ راشد دل مسوس کر رہ گیا اور مردت میں ناگواری کے احساس کو چھپا گیا۔ باتیں کرتے کرتے ان صاحب نے ترنگ میں پھر وہی حرکت کی۔ راشد نے بڑی نرمی سے اُن کا ہاتھ شانے پر سے ہٹا دیا۔ وہ چپکے تو راشد کہنے لگے عجب لوگ ہیں بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔

محترم اقبال متین صاحب کی تحریر سے یہ وضاحت ہوگئی کہ راشد آزر نے ایک شاہانہ نازک مزاج رکھتے ہوئے بھی شور و شغب سے دور رہ کر اردو کے لئے تن و من وقف کر کے کام کیا۔ اسی لئے ادیبوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں ان کی رائے میں وزن ہے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے ہے..... ”ادیبوں کی گروہ بندی نے اردو ادب اور زبان کو نقصان پہنچایا ہے کیوں کہ گروہ بندی کی بنیاد نامنصفانہ عصبیت ہوتی ہے جس کا علمی اور ادبی نقد و نظر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ علاقائی تعصب کا رویہ بھی

۱۔ معصومہ بیگم سابق وزیر آندھرا پردیش۔ ۲۔ پروفیسر حسین علی خان مرحوم، صدر شعبہ انگریزی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد۔



زبان، ادب اور ادیبوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس قسم کی گروہ بندی سے مجموعی ادبی منظر سے علمی اور فنی (نتیجہ) ادیبوں میں کم علمی کے ساتھ ساتھ اپنے گروہ کی بے جا منافعت بھی فروغ پاتی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں: ”یہاں گروہ بندی اور ادبی تحریکات پر مبنی انجمنوں سے وابستگی میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ادبی تحریکات سے ادب میں جمود کی کیفیت پیدا ہونے نہیں پاتی۔ ادبی تحریک اور تنظیم کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔“

انہوں نے بتایا: ”میں نے شاعری اور ادب کو ہمیشہ زیاں کا سودا سمجھا، منفعت بخش تجارت نہیں۔ اس لحاظ سے اس خسارے نے میرے لئے انسان کی حیثیت سے زندہ رہنے کا جواز پیدا کر کے میرے ہر نقصان کی تلافی کی ہے۔ جب میں جمع و خرچ کی فرد حساب دیکھتا ہوں تو مجھے خسارے سے منافع زیادہ ملتا ہے۔“

راشد کہتے ہیں: ”میں اردو زبان و ادب کے مستقبل سے مایوس نہیں، ہاں اردو والوں کی اردو سے بے رخی سے مایوس ہوں۔ اردو والوں سے مراد صرف مسلمان نہیں کیوں کہ میں اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا۔ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہونے کے لحاظ سے سب ہی کی زبان ہے۔ اب اگر مسلمان اس کو اپنی حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی کم نگاہی ہے۔ اردو کو اردو والوں سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اردو والے اردو کی کتاب عام طور سے خرید کر نہیں پڑھتے اور ویسے بھی عام طور سے اردو والے کم پڑھتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لئے جو تجاویز میں نے امریکہ (شکاگو)، کینیڈا (ٹورنٹو) اور انگلستان (لندن) کے سفر کے دوران پیش کی تھیں ان کے لئے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مختصر عرض ہے کہ اردو کی بقا کے لئے سب سے پہلے اردو کے ادیب کی بقا کا خیال رکھیے، کتاب خرید کر پڑھیے، یعنی خریدے بھی اور پڑھیے بھی۔ بہر حال اردو کے لئے سنجیدہ رویہ اختیار کیجئے۔ یاد رکھیے کہ اردو کی کتاب مفت نہیں چھپتی۔“

رسم الخط کے بارے میں کہتے ہیں: ”کسی بھی زبان کا رسم الخط بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہر زبان کی مخصوص آوازوں کے لحاظ سے اس کے رسم الخط کو برسوں کی محنت سے بنایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی ملک یا کسی ملک کے کسی خطے میں لوگ کسی زبان کو بول تو لیتے ہیں لیکن اس کے مخصوص رسم الخط کو پڑھتے نہیں، یا پڑھ نہیں سکتے تو اس ملک یا اس ملک کے اس خطے میں رائج رسم الخط کے ذریعے (اس خط میں ضروری ترمیم کے ساتھ) اگر کسی زبان کی ترویج ہو سکتی ہے تو اس زبان کے مخصوص رسم الخط کے علاوہ اس مقام کے رائج رسم الخط میں وہ زبان اپنے ادب کو دوسروں تک پہنچا سکتی ہے تو اس پر اوہلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی نئی نسل کو اردو زبان و ادب تو دے نہیں رہے ہیں اور ضد یہ ہے کہ وہ زبان اردو ہی کے رسم الخط میں سیکھیں۔ یہ کون سی دانش مندی ہے؟“

اپنے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں انہوں نے کہا: ”یہ فہرست بڑی طویل ہو جائے گی اس لئے صرف یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اردو، فارسی اور انگریزی ان تینوں زبانوں کی شاعری اور ادب کے



علاوہ ترجموں کے ذریعے فرانسیسی، روسی، چیک، عربی، چینی، جاپانی وغیرہ کے ادب کے کئی شاعر اور ادیب ایسے ہیں جن کے پائے جن کی تخلیقات قابل قدر ہیں۔ ویسے اردو، فارسی اور انگریزی شاعری اور ادب کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ خود میرے کتب خانے میں ہے جن میں میرے پسندیدہ کلاسیکی اور جدید شعرا کی بڑی نایاب دستخط شدہ کتابیں ہیں۔

اپنی زندگی کے اہم اور یادگار واقعات یاد کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ”میری زندگی میں کئی یادگار واقعات ہیں سے ایک واقعہ وہ تھا جب کالج کے طالب علمی کے زمانے میں جگر مراد آبادی صاحب نے میرے ایک شعر پر بہت داد دی اور تین بار پڑھوایا اور وہ شعر یہ تھا۔

صرف امید پہ قائم ہے نظام عالم  
زیست احساس تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں

جگر صاحب نے اگر راشد آزر کا شعر تین بار سنا تو یقیناً ایک طالب علم کی شاعری میں خوش آئند مثبت امکانات پائے ہوں گے۔ اس حوالے سے آپ بھی آزر کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ کریں۔ یقیناً آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ راشد کی شاعری ہماری عصری سوچ کا حصہ ہے۔

|   |   |
|---|---|
| کون کہتا ہے خموشی سے گزر جائیں گے         | لمحے تاریخ کے صفحوں پر لکھ جائیں گے     |
| دن کے سمجھوتوں نے جو زخم دیئے ہیں آزر     | بھول جائیں گے جو ہم رات کو گھر جائیں گے |
| آزر حویلوں کے ستوں رہ گئے فقط             | سیلاب وقت توڑ کے مخراب لے گیا           |
| زیاں و نفع پہ کیا، اس پہ تم نظر رکھو      | حساب وقت کی دیوار پہ رقم کیا ہے!        |
| وہ یہ سمجھتے ہیں دوری کا دکھ ہی سب کچھ ہے | ہم ان سے کیسے کہیں قربتوں کا غم کیا ہے  |
| میں اپنے ہاتھ میں دستک چھپائے پھرنا ہوں   | وہ کھلنے والا دریچہ مگر نہیں کھلتا      |
| وہ ہاتھ بڑھ کے گریبانہر تک پہنچے          | وہ ہاتھ جن میں کبھی کاسہ گدا کی رہا     |
| جن ہاتھوں سے ہنسی خیراتیں دیکھی تھیں      | ان آنکھوں ان ہاتھوں میں کاسے دیکھو      |

Mr. Rashid Azar,

Apt. 3-C, Block 3, Falcon Crest, Road No. 10, Banjara Hills,

Hyderabad, A. P. 500034, India.





منیالات بچے سوچے پر مجبور کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جب  
 بچہ بڑا ہو گا تو اسے سوچنا پڑے گا۔ ہم سب مل کر سوچنا سیکھنا  
 چاہیے۔ ہم سب سچے رہیں اور خود کو ڈھونڈیں۔  
 رضا علی عابدی  
 ۲۰ ستمبر ۲۰۰۷ء

## رضا علی عابدی

لندن، برطانیہ

زندگی میں کیسے کیسے موسم آتے ہیں کہ اپنے دل دار مرفقے حافظے کے در و دیوار پر نقش  
 کر جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

یہ موسم، یہ پل چھن ہم کو یاد رہیں گے یہ موسم چلے گئے تو ہم فریاد کریں گے  
 اب فریاد کریں یا صدائیں لگائیں، وہ موسم تو چلے گئے جو اب پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے۔ یہ گزرے موسم  
 رضا علی عابدی کا نام سامنے آتے ہی یاد آئے۔

میں ان دنوں کراچی میں تھی اور روزنامہ ”جنگ“ کے صفحہ خواتین کی مدیرہ تھی۔ رضا علی عابدی  
 بھی کراچی میں تھے اور جناب فخر مارتی مرحوم کے روزنامے ”حریت“ سے وابستہ تھے۔ مصوٰر غم علامہ  
 راشد الخیری کی پوتی اور جناب رازق الخیری کی صاحبزادی صفورہ الخیری بھی ”حریت“ سے وابستہ  
 تھیں۔ صفورہ سے جب بھی ملاقات ہوتی میں رضا علی عابدی کے بارے میں پوچھتی۔ وہ اپنے کالموں کی  
 وجہ سے ہماری صحافی برادری میں معتبر صحافیوں کی فہرست میں اولین نمبروں میں شمار کیئے جاتے تھے۔

میں نے انہیں دیکھا تھا۔ یاد نہیں کراچی پریس کلب میں دیکھا، یا ”حریت“ کے دفتر میں یا  
 کہیں اور، مگر باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بی بی سی سے انہیں سنا۔ میں نے جنگ چھوڑا۔ اپنا



ماہنامہ ”روپ“ شروع کیا۔ دس سال بعد ”روپ“ کو بھی دوسروں کے حوالے کیا اور امریکہ اپنے بچوں کے پاس چلی گئی کیوں کہ بچوں کے فراق میں جو گمن بنی ہوئی تھی۔

پھر لندن آئی تو جناب حیدر طباطبائی سے رضا علی عابدی صاحب کا ٹیلی فون نمبر ملا۔ گفتگو ہوئی اور اپنے پچھڑے شہر کراچی کے موسم واپس آتے محسوس ہوئے۔ یہ وقتی یادیں بھی کتنی خوش گوار ہوتی ہیں۔ اب جب جاوید صاحب کی ذاتی لائبریری سے رضا علی عابدی صاحب کی شہرہ آفاق ”جر نیلی سرک“ اور ان کے افسانوں کا مجموعہ ”اپنی آواز“ دستیاب ہوا تو میں نے ان سے رابطہ کیا۔ اور ان کی دیگر کتب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ علم و ہنر کا یہ جزیرہ بھی وسعت اختیار کر کے داستان کا ایک وسیع جہان بن گیا ہے۔ انہوں نے اپنی محنت شاقہ سے پہاڑ کاٹ کر آب دار جو اہرات کا نادر اور انمول خزانہ اردو ادب کو سونپا ہے جس کے آگے اس کوہ نور بیرے کی حیثیت بھی ماند پڑتی ہے جو برطانیہ کے شاہی تاج کی زینت ہے۔ رضا علی عابدی بھی اسی برطانیہ میں مقیم ہیں جہاں سب یکساں سلوک کے مستحق ہیں۔ مگر رضا علی عابدی اردو کے ادیب ہیں اور اردو ادیب کی شناخت اس کے اپنے ملک کی جانب سے نہ ہو تو دوسرے ممالک حاکم طائی بننے کی کیوں سوچیں۔

رضا علی عابدی کا سب سے بڑا کام بچوں کے ادب کی تخلیق ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ نئی نسل کے ذہنوں کی تربیت وہی کرتے ہیں جو ادب سے ناتہ زری کی طلب میں نہیں جوڑتے۔ چلے میں پہلے آپ کو رضا علی عابدی سے ملاؤں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ ایک محنت کش انسان نے کس لگن سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے۔ اپنے لڑکپن اور جوانی کے سنہرے ریلے شب و روز اردو زبان و ادب کی نذر کیے اور کبھی کبھتایا نہیں۔ محنت اور ایمان داری کی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے زندگی کے ارستھ (۶۸) برس گزار دیے اور کبھی پلٹ کر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں جو بغیر حساب کتاب کیے اور بعض وقت حساب کتاب کر کے بھی ادب کے مزدور کی محنت کا اعتراف نہیں کرتے۔

یہ ہمارے آپ کے رضا علی عابدی ہیں جن کی میٹھی بانی آپ نے بی بی سی سے ہواؤں کے دوش پر بارہا سنی ہوگی۔ رضا علی عابدی ۱۹۳۶ء میں یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر ’روڑکی‘ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ چودہ (۱۴) سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور ان ہی دنوں میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ کراچی میں بہادر یار جنگ ہائی اسکول اور اسلامیہ کالج میں تعلیم پوری کی۔ اس دوران بچوں کے لئے لکھتے رہے اور کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھیں۔ ابھی اسکول میں تھے کہ وہاں کی لائبریری میں ان کی لکھی ہوئی کتاب آگئی۔ کالج کی تعلیم کے دوران بچوں کے رسالے ”نونہال“ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۷ء میں روزنامہ ”جنگ“ کراچی کے عملے میں شامل ہوئے۔ اور تین سال بعد راولپنڈی جا کر ”جنگ“ کا مقامی ایڈیشن نکالا۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی لوٹ آئے اور فخر مآتری مرحوم کے اُس وقت کے انقلابی روزنامہ ”حریت“ کے ادارتی عملے میں شامل ہوئے۔ اس وقت یہ اخبار ”ذاتِ گروپ“ کی ملکیت میں چلا گیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں اخباری صحافت چھوڑ کر نشریاتی صحافت میں قدم رکھا



اور بی بی سی لندن سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں کام اور ذہن بدلنا اور بقول شاعر: "پتھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا، ایسا کھلا۔"

رضاعلی عابدی نے برطانیہ کے اس مشہور عالم نشریاتی ادارے میں زندگی کے تقریباً پچیس (۲۵) برس گزارے اور بی بی سی کو اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال کیا۔ ان کی آواز، اسلوب اور پیش کش نے غیر معمولی شہرت پائی اور ان کے پیش کیے ہوئے بعض پروگرام آج تک یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے جن پروگراموں نے سننے والوں پر گہرے نقش چھوڑے ان میں چند ایک یہ ہیں: "جرنیلی سرک"، "شیردریا"، "کتب خانہ" (برطانیہ میں موجود اپنی کتابوں کا ذخیرہ)، "کتب خانہ" (برصغیر میں نادر کتابوں کا ذخیرہ)، "انجمن"، "سب رس"، "چار بیت"، "نوجوان کیا کہتے ہیں" اور سب سے بڑھ کر بچوں کا پروگرام..... "شاہین کلب"، جو گھر کے تمام افراد کا پسندیدہ پروگرام بن گیا تھا جس میں سدھو بھائی کے مزاحیہ کردار نے دھوم مچا دی تھی۔ رضاعلی عابدی نے اپنے کئی پروگراموں کو کتابی شکل بھی دی جس سے انہیں ایک مستقل حیثیت مل گئی۔ وہ ۱۹۹۶ء میں بی بی سی سے ریٹائر ہوئے لیکن اب بھی ادارے سے تھوڑا بہت تعلق ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے بچوں کے لئے طرز جدید کی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ کچھ مختصر کہانیاں بھی لکھیں۔ بچوں کے لئے انقلابی نوعیت کے اردو قاعدے لکھے۔ ان کی لکھی ہوئی یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں: "کتب خانہ"، "جرنیلی سرخ"، "شیردریا"، "ریل کہانی"، "جہازی بھائی (مارشس کا سفر نامہ)"، "اپنی آواز (کہانیاں)"، "جان صاحب (کہانیاں)"، اور ان کی تازہ تصنیف "ملکہ وکنوریہ اور غشی عبدالکریم" زیر طبع ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "جانے پہچانے" شائع ہونے کو ہے جو ان کے مختلف مقالوں کا مجموعہ ہے اور کراچی کا اشاعتی ادارہ دانیال شائع کر رہا ہے۔

بچوں کے لئے ان کی یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں: "پہلا تارا"، "پہلی کرن"، "چمپا"، "مُن"، "اُلٹا گھوڑا"، "ظالم بھیڑیا"، "پیارے ماں"، "میری امی"، "گنگنا تا قاعدہ"، "بندر کی الف بے پے"، "نٹ کھٹ لڑکا (نظمیں)"، "پہلی کتنی"، "چوری چوری چپکے چپکے"، "کمال کے آدمی" اور "قاضی جی کا اچار"۔ ان دنوں "سردھن کی بیگم سرو اور شاہ عالم" کے عنوان سے تازہ کتاب لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان کی بیشتر کتابیں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کی ہیں۔

آپ نے کبھی رضاعلی عابدی سے گفتگو کی ہے؟..... ایک داستان گو ہیں وہ۔ ان سے باتیں کیجئے تو سسے گزرنے کا پتا نہیں چلتا اور ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔ جس موضوع پر گفتگو ہوگی وہ ہی نقشہ تصویری صورت میں ابھرتا چلا جائے گا۔ میں نے ان سے پوچھا، "جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو ذہن میں تھا کہ کیا اور کیوں لکھ رہے ہیں؟"

رضاعلی عابدی کہنے لگے..... "اب آپ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے کہ میں کیوں لکھتا ہوں تو اس کا جواب یہ ہوگا... پتا نہیں بالکل اس طرح جیسے ہائی اسکول میں داخلے کا امتحان تھا، پہلا سوال تھا 'بیس میں چار کتنی مرتبہ شامل ہیں؟' اور میں نے لکھا تھا 'پتا نہیں'۔"



جب کسی سے کسی قسم کی بحث ہوتی ہے تو مجھے اکثر یہ کہتے سنیں گے کہ ہر بات کا سبب ہونا کوئی ضروری نہیں۔ کچھ یہ ہی حال میرے لکھنے کا ہے۔ اور اس کی روداد یہ ہے کہ میں چودہ سال کا تھا جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ اب اس عمر میں یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں گزری کہ میں کیوں لکھ رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہم ہو یا گمان، دونوں کا حال آج بھی جوں کا توں ہے۔ یوں بھی اس سے کسی کو کیا کہ کوئی شخص کیا لکھتا ہے۔ اس پاس کے ادیب، شاعر اور تنقید نگاریوں سوچتے ہیں تو سوچتے ہوں، خود لکھنے والے کا دھیان اس طرف کم ہی جاتا ہے، اور پڑھنے والے کو کیا پڑی ہے کہ اس سوال کی خاطر سر کھپائے۔

میرے گھرانے میں میرے والد سے لے کر سب سے چھوٹے بھائی تک سب کسی نہ کسی قسم کے انجینیئر ہیں۔ میری تینوں بزرگ بہنیں، خدا انہیں جنت نصیب کرے، بھائیوں کی چکنی چکنی ہتھیلیوں کو سہلا سہلا کر کہا کرتی تھیں کہ ہمارے خاندان کا شمار اہل قلم میں ہوتا ہے اہل سیف میں نہیں۔ اہل سیف کی ہتھیلیاں کھردری ہوتی ہیں اور یہ ہتھیلیاں ریشم کے مانند نرم ہیں۔

مگر ہمارے خاندان میں ایک بھی ادیب یا شاعر نہیں نکلا۔ اگر ہمارے بزرگ اہل قلم تھے تو وہ خوبی سید اکبر علی خلف سید شوکت علی خاں صاحب خلف سید کرامت علی خاں صاحب تک ورثے میں پہنچنے کی اطلاع ہم تک نہیں پہنچی۔ البتہ ان کے والد نواب معین الدولہ بہادر ناصر الملک سید عنایت علی صاحب کے قلم کی کرامات کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرحوم سلطان امجد علی شاہ بہادر بادشاہِ اودھ کے ماموں بھی تھے اور وزیر تھے۔ اس مناسبت سے کچھ نہ کچھ لکھتے ضرور ہوں گے۔

ہم جب ہندوستان چھوڑ رہے تھے اور گھر کا پرانا سامان ٹھکانے لگانے کے لئے نکالا جا رہا تھا تو لکھنؤ کے ایک اخبار کے تراشوں میں ایک سلسلہ وار مضمون تھا جس کا عنوان تھا ”میں نے لکھنؤ کیوں چھوڑا“۔ یہ تحریر میرے والد صاحب کی تھی۔

وہاں ہماری سوداگری کی حویلی کی چھت سے پتنگ بڑھی تو چودہ سال تک بڑھی رہی اور مقابل کے کنکڑے سے چودہ سال تک بزرگ پیچ لڑاتے رہے۔ اور ان کے مصاحب چاہلو سیاں کر کے میر باقر سوداگر کے گاؤں اور باغ فروخت کرتے رہے۔ جب معاملہ حد سے بڑھا تو فرنگی ریڈنٹ صاحب بہادر بیچ میں پڑے دونوں فریق مفلوک الحال ہوئے جاتے تھے۔ انہوں نے صلاح کرائی۔ ہمارے بزرگوں کی پتنگ دہن بنائی گئی اور فریق ثانی کا کنکڑا دولہا اور پتنگ رخصت ہو کر گھر گئی۔

جس وقت ہماری پتنگ کے ہاتھ پیلے ہو رہے تھے اور اشرافیوں کی تھیلی کے منہ ڈھیلے ہو رہے تھے، ہمارے والد صاحب اپنا بستر باندھ کر روڑ کی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مرزا محمد ہادی رسوا مسلمان لڑکوں سے کہہ چکے تھے کہ وہاں کے انجینیئر گنگا کالج میں جا کر کوئی ڈپلوما لیں اور یہ عمارت جو ڈھنسی جا رہی ہے، اس سے پہلے کہ اس کی چھت سر پر آن پڑے یہاں سے نکل چلیں۔

مجھے یاد ہے کہ اس مضمون میں والد صاحب نے لکھا تھا کہ جب انہوں نے اعلان کیا کہ وہ انجینیئر گنگا کالج میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں تو بزرگوں نے کہا کہ ہاں ہاں ضرور جاؤ، کچھ عرصے بعد رندا



اور بسوالے کر نکلو گے اور گلی گلی آواز لگاتے پھر وگے کہ نوئی پھوئی چار پائیاں مرمت کرالو۔

کچھ اس قسم کی تحریر تھی جس کی سیاہی کے چند قطرے دوسرے بھائیوں کو چھوڑ کر میرے خون میں آئے ہیں۔ میں بہت چھوٹا تھا اسی وقت سے لکھنے لگا تھا۔ ہمارے گھر میں بچوں کا رسالہ 'پھول' آتا تھا، وہ اس کے آخری دن تھے۔ پھر جامعہ اسلامیہ سے ماہنامہ 'پیام تعلیم' آنے لگا۔ دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی پورے ہندوستان پر جرمنی اور جرمنوں کا ہوا سوار تھا کہ ملک میں جرمن جاسوس آگئے ہیں اور اگر کوئی مشکوک شخص دکھائی دے تو اسے پکڑوانے میں پولیس کی مدد کریں۔

ماہنامہ 'پیام تعلیم' کے سرپرستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین پیش پیش تھے۔ اور اب ذرا سا یاد ہے، شاید ڈاکٹر محمود حسین اس کے مدیر تھے یا جو کوئی بھی مدیر تھا وہ یورپ کی ایک جرمن خاتون کو بیاہ کر لایا تھا۔ وہ خاتون بھی 'پیام تعلیم' کی ادارت میں برابر کی شریک تھیں۔ وہ باجی جان کہلاتی تھیں اور ان کی وجہ سے بچوں کے اس ہندوستانی رسالے میں یورپی رسالوں کی خوبیاں آگئی تھیں۔ پھر جرمن باشندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو باجی بھی کہیں دھری گئیں۔ اور وہ بڑا اچھا جیتا جاگتا رسالہ بھی دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ان ہی دو چار برسوں میں دلی سے ماہنامہ 'کھلونا' شائع ہونے لگا۔ ماہنامہ شمع کے مالک یوسف دہلوی نے اپنے بیٹوں کو رسالہ نویسی کے راستے پر ڈالنے کے لئے ان کے ہاتھ میں کھلونا نام کا ایک شغل تھما دیا۔

ان ہی دنوں میں نے بچوں کے لئے لکھنا اور 'کھلونا' کے یونس دہلوی اور ادریس دہلوی کو بھیجنا شروع کیا۔ وہ بھی جیسے قسم کھا کے بیٹھے تھے۔ میری ایک بھی تحریر چھاپ کر نہ دی۔ یہ سنہ پچاس کی بات ہے کہ شفیق الرحمن کی 'حماقتیں' ہمارے ہاتھ لگی۔ میں نے جھٹ اس میں ایک لطیفہ نقل کیا اور مدیران کھلونا کو بھیج دیا۔ وہ اسی مہینے شائع ہو گیا۔ پھر جب سے گزرتے وقت نے رکنے کا نام نہیں لیا، زمانہ ذرا ایک ٹھکانے سے لگا اور ادریس دہلوی مرحوم بے تکلف دوست بن گئے۔ تو میں انہیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ میں نے 'حماقتیں' آپ سے پہلے پڑھ لیں تھیں۔ کہتے تھے کہ میں حماقتوں کے معاملوں میں اکثر پیچھے رہا۔ وہ مرجانے میں آگے رہے تو خیال ہوتا ہے کہ کہیں جینا بھی تو کوئی حماقت نہیں؟

بس کچھ ایسے ہی خیالات آتے ہیں۔ میں ان کے اظہار کی خاطر لکھتا رہتا ہوں۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے چپ ہوئے۔ پھر کہنے لگے۔ "آپ نے یہ بھی پوچھا ہے کہ میں کیا لکھتا ہوں۔ اس کا جواب آسان ہے۔ میں وہ ہی لکھتا ہوں جو پڑھنا چاہتا ہوں۔ جو میں پڑھتا ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ سب وہ ہی پڑھیں۔ میں سونے پہلے خوش گوار تحریریں پڑھنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد قرینے کے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ خوابوں پر دیکھنے والے کا اختیار نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ خوابوں پر میرا اختیار ہو۔ میں چینی چنگھاڑتی تحریریں نہیں پڑھتا۔ میں کافکا کو نہیں پڑھتا۔ میں سر ریلز نام کی جو بھی شے ہے نہیں پڑھتا۔ میں سرشاری پڑھنا چاہتا ہوں، میں روشنی اور خوش بو پڑھنے کا خواہش مند ہوں۔ یہ چاہتا ہوں کہ میرے سامنے کھلی ہوئی کتاب سے تتلیاں اڑیں، کرنیں پھوٹیں، تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کی مہک اٹھے اور دھوپ کے ساتھ برسنے والے مینہ کی دھنک اٹکے، اور کچھ نہ ہو تو ایک چھوٹے بچے کی چہکار سنائی دے۔"



اتنا سکون بخش جواب ایک داستان گوئی دے سکتا ہے۔ اپنے دانش ور ہونے کا رعب جھارے بغیر وہ کہہ رہے تھے..... "مطالبے سے میرے مطالبے بہت تھوڑے سے ہیں مگر بہت تھوڑے سے لکھنے والے میرے مطالبے پر کان دھرتے ہیں۔ مجھے اس ادب سے جس پر خدا جانے کس نے ترقی پسند ادب کا ٹھپہ لگا دیا اسی ایک بات کا گلہ ہے کہ اس کی تلخیص کے طور پر آج تک ظلم و ستم کی، استبداد کی، بے داد کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ خدا جانے کیوں لوگ اپنی کہانیوں میں کبھی ایک کمسن لڑکے کو مار دیتے ہیں، کبھی ایک رات کی بیابانی و بھین کو اور کبھی پائی پائی سے محروم کلرک کی بوزخی ماں کو۔ میں بتاؤں میرے پاس بچوں کی جاپانی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے اس کے شروع ہی میں مصنف نے پڑھنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کہانیوں میں کوئی مرے گا نہیں۔

جب تک ترقی پسندی کی لہر نہیں اٹھی تھی، کہانی جب کسی جگہ اٹک جاتی تھی تو کوئی پری یا جادوگر آ کر کہانی نوٹس کی مشکل آسان کر دیا کرتا تھا۔ پھر جب وقت بدلا تو اُسی پری یا جادوگر کا کام موت نے انجام دینا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج تک چلا آ رہا ہے۔ اور یہ ادب جو نیا ادب کہلاتا ہے ذہن پر کچھ اس قسم کے سوالوں کی بوچھاڑ پر آمادہ ہے کہ لکڑ بھگا بھگا کیوں اور لکڑ بھگا رو یا کیوں۔ نمبر دار کے نیلے کو کہانی کے اندر تو موت آئی تھی، باہر بھی آگئی۔ تو بات یوں مکمل ہوئی کہ میں وہ ہی لکھتا ہوں جو میں خود پڑھتا چاہتا ہوں۔

اب اگر آپ مجھ سے یہ بھی پوچھ لیں کہ میں کس کے لئے لکھتا ہوں تو میری بات اور واضح ہو جائے گی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کاش میرے ہائی اسکول کے داخلے کے امتحان میں پہلا سوال یہ ہوتا تو میں اس کا آسان سا جواب لکھتا۔ وہ یہ کہ میں دو چار باتیں بہت یقین سے جانتا ہوں ان میں ایک بات یہ ہے کہ میں اپنے قاری کو جانتا ہوں اور اس سے واقف ہوں۔ اپنے برصغیر کے طول و عرض کے دوروں میں جو کام میں نے بہت دل لگا کر کیا وہ یہ کہ میں نے تاریخی عمارتوں کے حسین منظروں سے زیادہ ان عمارتوں کے پچھواڑے اور ان منظروں کے پرے رہنے والے انسان کو قریب جا کر دیکھا نہیں، اسے محسوس کیا، اسے جانا ہی نہیں، اسے سمجھا، اس نے مجھے صرف اپنے دل میں بٹھایا، میں نے اسے اپنے شعر کے نہاں خانے میں بٹھایا۔ اب سُراور تال میرے ہیں اور سنگت اس کی۔ میں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ میں لکھوں اور وہ پڑھے بلکہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں لکھوں اور وہ میری تحریر کا حصہ بن کر رہے۔ دور کے اس رشتے میں بلا کی قربت ہے۔

مغرب میں اکثر مصنفوں سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اپنے قاری کو بیان کیجئے۔ میرا قاری صبح سائیکل یا بس یا اپنی چھوٹی سی پرانی کار میں بیٹھ کر پڑھنے یا کام کرنے جاتا ہے۔ راستے بھر دنیا کو دیکھتا جاتا ہے۔ ہر روز کے منظر میں نئی نئی باتیں تلاش کرتا ہے کہ جس اس کی ذات کا حصہ بن چکا ہے۔ کسی بات پر تبسم کرتا ہے، کہیں فکر میں پڑ جاتا ہے کہیں اداس ہو جاتا ہے لیکن مایوس نہیں ہوتا۔ مایوسی انگلی پکڑ کر چلنے کے لئے پھل جائے تو اس کے طلبے لباس میں چھپی ہوئی کوئی آس ڈھونڈ نکالتا ہے اور باقی سارا راستہ اُس پر امید ہمراہی کے ساتھ طے کرتا ہے۔ وہ سادہ تو ہے لیکن دیکھنے ہی میں سادہ لگتا ہے۔ بات کو ایک اشارے میں سمجھتا ہے لیکن دیکھنے والے سوچتے ہیں کہ نہیں سمجھا۔ بات کرتا ہے تو سلجھی ہوئی اور جیسے لب و لہجہ میں جس کا کوئی فقرہ پیچیدہ نہیں ہوتا اور جس کا کوئی لفظ دشوار، یعنی مشکل نہیں ہوتا۔ وہ شب کو رات کہتا ہے اور



جنور کو ابھی۔ اس کی گفتگو میں لفظ ہم ایک بار بھی نہیں آتا۔ اور یہ اس نے ٹھان رکھی ہے کہ اس حوالے سے اور اس حوالے سے کی گردان جیتے جی نہیں کرے گا۔ وہ ہندوستانی ادب بھی پڑھتا ہے لیکن اپنی باتوں میں نہ تو کبھی یہ کہتا ہے کہ یہ معاملہ فلاں چیز سے جڑا ہوا ہے اور نہ کبھی یہ کہتا ہے کہ اس مسئلے کو لے کر ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ کبھی وہ پتھلوں کو دیکھ کر سرشار ہوتا ہے اور کہیں آبشار دیکھ پائے تو کھل اٹھتا ہے۔ وہ پانی سے بھرے ہوئے بادلوں سے برستی رس کی بوندیں اور مشرق سے لالی کھیرتا سورج ابھرتا دیکھتا ہے تو اپنے دل کے اندر چھپی ہوئی صداقتوں کی تصدیق نظر آنے لگتی ہے۔ تب وہ اپنی کتاب نکالتا ہے اور جن ورقوں کے بیچ میں اس نے بڑے سلیقے سے بس کا ٹکٹ رکھا تھا اسی جگہ سے ورق کھول کر پچھلی رات والی عبارت سے آگے پڑھنے لگتا ہے۔ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہوتا ہے وہ اس کے چہرے پر عیاں ہو جاتا ہے اور وہ جو اس کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے اسے ہماری طرف آسودگی کہتے ہیں۔“

رضا علی عابدی نے صحافت کی دنیا میں اس روز قدم رکھا جس دن سویٹ یونین کا اسپونٹک خلا میں گیا تھا۔ ان ہی دنوں برصغیر کی پہلی جنگ آزادی کے سو برس پورے ہو رہے تھے۔ پاکستان کی سیاست دانوں اور فوجی حکمرانی کا آغاز ہونے کو تھا۔ وہ اپنے سفر کے مراحل طے کرتے ہوئے برطانیہ پہنچے اور اپنی بیگم ماہ طلعت کے ساتھ لندن میں اب بھی مقیم ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

میں نے ان سے ”گفتنی“ کے سوال نامے سے ہٹ کر چند سوالات کیئے۔ ایک سوال تھا کہ

ترقی پسندی اور جدیدیت کے نظریات کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر کیا ہے؟

رضا علی عابدی کا کہنا ہے..... ”میری رائے ہے کہ ترقی پسندی اردو فکشن کا قتل عام ہے۔ غزل سے تو رومان خارج کرنا ممکن نہ تھا۔ اس تحریک نے کہانی کے فطری ارتقا میں خلل ڈال کر راتوں رات اس کا حلیہ بدل ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ترقی پسندی کی گردنیں تو افسانے نے خود کو معلق پایا۔ اب جن لوگوں نے اس پر طبع آزمائی شروع کی اور کلیشے کو توڑنے کا عمل شروع کیا تو پوری غمارت ڈھس گئی۔ کہانی کا قاری سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اور غضب یہ ہوا کہ وقت بے وقت کے ساتھ قاری کی ذہنی تربیت کا جو عمل ہوتا تھا وہ بھی رُک گیا۔ لکھنے والا کا فکا بن گیا اور وہ قاری مر گیا جو کہانی پڑھنے کی خاطر بگ اسٹال کی طرف لپکا کرتا تھا۔ اب اگر لوگ ’ڈائجسٹ‘ پڑھتے ہیں تو اس میں نہ لوگوں کا قصور ہے نہ ڈائجسٹوں کا۔ سارا قصور ان لکھنے والوں کا ہے جنہوں نے روایت کو اس کی فکری ڈگر پر چلنے نہیں دیا۔“

ادبی جرائد ادب میں نئے موسم تخلیق کرنے میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا..... ”ادبی جرائد کے حال کے بارے میں کیا کہوں! اب حالت یہ ہے کہ برصغیر کے ہر گلی کوچے سے ادبی جریدے نکل رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے قاری کتنے ہیں اور ان کے خریدار کتنے۔ دو چار کو چھوڑ کر باقی ادبی جریدے شاعروں اور ادیبوں کے مختلف دھڑوں میں گردش کیا کرتے ہیں۔ ادب کے فروغ میں ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔“

پچھلے چند سالوں میں قابل ذکر ناولوں یا نکتے گئے ناولوں، افسانوں کے حوالے سے رضا علی



عابدی کہنے لگے۔ ”قابل ذکر ناولوں، افسانوں اور ان کے مصنفین کے نام لے کر نشان دہی کرنے کی رسوائی مول لینے سے احتراز ہے۔ ناولوں کے معاملے میں تو اردو ادب یوں ہی ہانپ جاتا ہے۔ کل اردو ادب میں زیادہ سے زیادہ بارہ یا سولہ ناول ہیں جنہیں قابل ذکر کہا جائے۔ بعض ناولوں کی دھوم ہے لیکن وہ ایڈیٹنگ کے بغیر چھاپ دیئے گئے ہیں۔ ایک مصنف اپنے مشہور ناول کا ترجمہ کرنے بیٹھے تو انہیں احساس ہوا کہ کتاب کے صفحے کے صفحے redundant (فالتو) ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پاکستان کے دو چار مصنفوں کو چھوڑ کر سارا اچھا ادب ہندوستان میں لکھا جا رہا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ جدیدیت کے تجربے کی دیوار سے سر پھوڑنے کا عمل ہندی نے پہلے کر لیا جس سے اردو دانوں نے عبرت پکڑی۔ نام نہیں لوگوں کا لیکن ہندوستان کے بہت سے لکھنے والوں کو میں سلام کرتا ہوں۔“

اردو کے مستقبل پر گفتگو ہوئی تو کہنے لگے۔ ”یہ لمبی بحث ہے۔ اردو کو صرف اردو والے ہی بچا سکتے ہیں (اور وہ ہی مٹا سکتے ہیں)۔ اتنی نفیس زبان کو سلیقے سے برتا جائے تو دلوں میں اتر کر مقام پائے گی۔ شدھ ہندی بولنے والوں کے رویے میں فرق آنے لگے گا۔ اردو مرنے والی نہیں۔ اب رہی اردو رسم الخط کی بات، تو اسے بدلنے والے دیوانے ہیں اور دیوانے کو پند بے کار ہے۔“

آپ کو کن ادیبوں کی تحریریں پسند ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہنے لگے۔ ”مغرب کے لکھنے والے تو قطار در قطار کھڑے ہیں۔ جی اگا کر لکھتے ہیں اور تحریر مقبول ہو جائے تو رانٹلی پر باقی عمر ہنسی خوشی کاٹ سکتے ہیں۔ ان کا ہمارے ادیب سے مقابلہ بے کار ہے۔ مغرب میں ادب نے ارتقا کے فطری مرحلے پائے ہیں اور جو کام پڑھنے والے کروا رہے ہیں اس لئے ہر ایک کے ذوق کی تسکین کا سامان دستیاب ہے۔ یہ ایک الگ دنیا ہے جس سے ہمارے ادیب کا موازنہ بے سود ہے کبھی وہ غریب درد غم جمع کرتے کرتے عمر گزار دیتا ہے۔“

ان کی زندگی کا اہم واقعہ؟ ”زندگی کا اہم واقعہ، کیا کم یادگار ہے کہ ہم بدستور زندہ ہیں۔“ یہ واقعہ رضا علی عابدی کے لئے اہم ہے مگر میرے نزدیک ان کی زندگی کا اہم واقعہ وہ سفر اور سفر نامہ ہے جس کا نام ”جر نیلی سڑک“ ہے۔ جر نیلی سڑک جو وادی پشاور سے سر زمین بنگال تک پندرہ سو میل لمبی سڑک جو ساڑھے چار سو سال پہلے ہندوستان کے افغان بادشاہ شیر شاہ نے بنائی تھی۔ اس پوری سڑک کا سفر رضا علی عابدی نے کب، کتنے دنوں اور کیسے کیا اس کی داستان اس کتاب میں موجود ہے جو کسی بھی الف لیلوی داستان سے کم نہیں۔ اور یہ دو سطوروں کی کہانی بھی کم نہیں کہ اس کی تجویز بی بی سی اردو سروس کے سربراہ ڈیوڈ بیج کی پیش کردہ تھی کہ پشاور کو کلکتہ سے ملانے والی گرینڈ ٹرنگ روڈ کو موضوع بنایا جائے۔ یہ تجویز رضا علی عابدی کے دل کو لگی۔ اسی رات انہوں نے شیر شاہ کی تاریخ پڑھ ڈالی اور ۱۹۸۵ء میں جی ٹی روڈ پشاور سے رضا علی عابدی کا سفر شروع ہے۔ پھر یہ سفر نامہ تاریخ کی داستانوں میں ایک داستان بن گیا۔ رضا علی عابدی کی فراہم کردہ اطلاعات اور ان کا انداز بیان و تحریر اور ان کے کٹیلے جملے بس یہ سب پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

Mr. Raza Ali Abidi,

33 Alverston Avenue, London, SW19 8BD, UK



## کارگیر، کمہار اور رام پیاری

گجرات تک پہنچتے کی بات تو رہ ہی گئی۔

جہلم سے آگے کا راستہ سوکھا پڑا تھا۔ کسی زمانے میں لوگوں نے درخت کاٹ کر چولہوں میں جلا دیے اور پھر جو بارشیں آئیں انہوں نے تنگی زمین کو خوب خوب پامال کیا۔ پوری پوری زمینیں بہہ کر دریا میں چلی گئیں اور دریا مٹی سے اٹ گئے تو اپنے پرانے پاٹ چھوڑ گئے۔

ماہ رمضان کی تپتی دھوپ میں ہمارے بس کھاریاں پہنچی۔ روزوں کے دنوں میں می واحد پڑا تھا جہاں مسافروں کے لئے پینے کا ٹھنڈا پانی دستیاب تھا۔ پانی پلا تا یوں بھی شاید کھاریاں کی روایت رہی ہے۔ کہتے ہیں شہنشاہ اکبر نے یہاں کسی جوگی سے خوش ہو کر پوچھا کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ وہ سچا جوگی ہوگا، اس نے سوکھی زمینوں میں ایک کنواں مانگا، اکبر نے دو کنویں کھدوا دیے۔

علاقے کے لوگ کہتے ہیں کہ کنویں کھدوانے کا پروانہ ہمایوں نے اُس وقت لکھ کر دیا تھا جب وہ ہندوستان سے بھاگ رہا تھا۔ سب اس کا یہ بتاتے ہیں کہ جوگی نے اُسے اکبر کی ولادت کی خوش خبری سنائی تھی مگر علاقے کے لوگ کہانیاں بناتے ہوئے یہ دیکھنا بھول گئے کہ ہمایوں کھاریاں کی طرف سے نہیں بلکہ سہی اور مستونگ کے راستے بھاگ کر قندھار گیا تھا۔

زبان خلق کا ہر بار نقارہ خدا ہوتا ضروری نہیں۔

کنویں اور بڑا فوجی ٹھکانہ بن جانے کے باوجود کھاریاں کا یہ سارا خطہ بخر پڑا تھا اور میں بس کی کھڑکی سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کر سایہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سائے کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ آس پاس کہیں موجود نہ ہو تو آنکھیں اُسے تلاش کرتی ہیں۔ موجود ہو تو چاہے اُس کے تلے جانے کی ضرورت نہ پڑے تب بھی یہ اطمینان رہتا ہے کہ سایہ موجود ہے۔

اس روز دہکتی سوکھی زمینوں کا سفر طے کرنے کے بعد جب گھنے درخت آئے تو تشفی سی ہو گئی۔ میرے ایک ہم سفر نے کہا درخت آگئے، اب گجرات قریب ہے۔ وہ ہی گجرات کا جس کا پرانا نام اود۔ بگڑی تھا، یعنی ہریالی کا شہر۔

بعد میں جب اکبر نے اسے اپنے میلے پردہ بارہ آباد کیا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اُس اونچائی پر پانی موجود



ہوگا۔ میں وہ پانی دیکھنے اور چڑھا۔ گجرات میں اکبر کی تین نشانیاں مجھے زبانی یاد تھیں۔ ”حصار و باؤلی و کھنہ حمام“۔  
 >حصار یعنی قلعہ تو مجھے دور سے نظر آنے لگا۔ نیچے کے نیلے کی چوٹی تک بہت اونچی فصیلیں اٹھائی گئی  
 ہیں اور ان کے پتھر اتنی صفائی اور مضبوطی سے پنے گئے ہیں کہ اب تک سالم رکھے ہیں۔ معلوم ہوتا کہ مزدور ابھی  
 ابھی اجرت لے کر اور سلام کر کے گئے ہیں (جر نیلی سڑک، ص ۹۹-۱۰۰)۔

— اور چڑھتی ہوئی بازار نما سڑک کے کنارے اکبر کا بنایا ہوا حمام بھی تھا۔ یہاں غسل خانوں کے فرش کے نیچے  
 آگ جلائی جاتی تھی اور لوگ بھاپ میں غسل کرتے تھے۔ ترکی کا یہ رواج ہندوستان میں قائم نہ رہ سکا۔ لیکن  
 گجرات کے اس حمام میں آج بھی فرش کے نیچے آگ جلائی جاتی ہے اور لوگ اپنے پسینے اور بھاپ میں نہاتے  
 ہیں۔ یہ حمام آج تک اسی طرح چلایا جا رہا ہے جیسے مغلوں کے دور میں چلتا ہوگا۔ مگر اب اس میں جوڑوں اور  
 پنچوں کے درد اور ایسی ہی دوسری تکلیفوں کے مریض نہاتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ حمام کے اوپر بورڈ لگا ہے  
 جس پر امراض کے نام لکھے ہیں۔ مرض جتنا شدید ہوتا ہے، غسل کا معاوضہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ پھر یہ غسل  
 حکمت سے خالی نہیں۔ مریضوں کو پہلے سب سے زیادہ گرم حمام میں رکھا جاتا ہے، پھر کم گرم میں اور اس کے بعد  
 اس سے بھی کم گرم حمام میں۔ اور یوں وہ بتدریج باہر آتا ہے۔ غسل خانوں کے فرش کے نیچے تہہ خانے بنے  
 ہیں جن میں لکڑی سلگتی ہے۔ حمام چلانے کا فرض محلے کے دو خاندانوں کو ہمیشہ سے ملا ہوا ہے۔ وہ اسے باری  
 اری چلاتے ہیں۔ کچھ عجب نہیں جو ایک خاندان گوجر ہو دوسرا جاٹ۔ یہ سارا قلعہ ہی گوجروں اور جانوں کا جھگڑا  
 ختم کرنے کے لئے بنوایا گیا تھا۔

— یہ شہر کہ جس کا نام گجرات ہے کارگروں اور فنکاروں سے ایک دن بھی خالی نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ سب سے اچھی  
 شمشیر یہاں کے لوگ بنایا کرتے تھے، پھر انہیں سبایا کرتے تھے اور ان کے دستوں اور پھل میں سونے چاندی کے تار  
 اُتار دیا کرتے تھے۔ لوہے میں رو پہلے سہرے تار اُتارنے کا یہ فن کوفت گری کہا جاتا تھا۔

سکھوں کے زمانے تک گجرات میں بہترین کوفت گری ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ گجرات کے بڑھئی  
 ایسا اعلیٰ فرنیچر بناتے تھے کہ انگریزوں کے دور میں گجرات کی کرسیاں انگلستان تک جاتی تھیں۔ وہ جو آرام  
 کرسیاں کہلاتی ہیں، وہ گجرات ہی میں بنتی تھیں۔

پھر مٹی کے برتن! نفاست ان پر ختم تھی۔ پانی پینے کے ایسے کوزے تو خود میں نے دیکھے ہیں جو سرخ  
 کاغذ جیسے ہوتے تھے اور ان میں دھوپ چھنتی تھی۔ چاک گھومتے تھے تو گندھی مٹی انگوٹھے اور انگلیوں کے بیچ خُسن  
 میں ڈھل جایا کرتی تھی۔ وہ اسی گجرات کے گھڑے تو تھے جو اگر کچے نہ ہوں تو عشق کی چناب کے پار اُتار دیا  
 کرتے تھے۔ (حوالہ بالا، ص ۱۰۱-۱۰۲)

رام پیاری کون تھی؟ اس کی تفصیل جاننے کا وقت نہ تھا۔ وہ کیسی تھی؟ یہ پوچھنے کے لئے رمضان کا  
 مہینہ مناسب نہ تھا۔ بس اتنا سنا کہ بہت خوب صورت تھی۔ علاقے کے ایک رئیس سے اس کی شادی ہوئی تو جیسی  
 رام پیاری تھی، اُس کے لئے اُس نے ویسا ہی محل بنوایا۔

اُسی کی خاطر شہر میں پہلے پہل موٹر گاڑی آئی۔ اس میں بیٹھ کر شام کو جب رام پیاری دریا میں ڈوبتے



سورج کا حسن دیکھنے جانی تھی اس وقت شہر چڑھتے ہوئے چاند کا حسن دیکھنے بیٹھ رہا تھا۔ اور پھر جب برہمچاری  
تقسیم ہوا اور ادھر کی آبادی ادھر ہوئی تو رام پیاری گجرات میں اپنا محل جوں کا توں چھوڑ کر ہندوستان چلی گئی (۱)۔  
فرانسیسی کھڑکیوں، ہسپانوی درجیوں، اطالوی ٹائلوں سے مزین فرش اور دیواروں، تراشیدہ پتیل  
بونوں سے آراستہ چھتوں اور کنورین طرز کے کشادہ چوبلی زینوں کے اس محل میں اب دو سولہ لڑکیاں رہتی ہیں۔  
اس عمارت میں اب طالبات کا ہاسٹل ہے اور ان کا کالج سرگ پار قریب قرین اتنی ہی شاندار رائے بہادر مالہ  
کیدار ناتھ کی کوٹھی میں قائم ہے۔ (حوالہ بالا ص ۱۰۷)

۱۔ یہ خوب صورت خاتون ڈنگ کے آنجنابی رائے بہادر سندرد اس چوپڑا کی بیوی تھی۔ وہ کوئٹہ کے ایک بڑے فوجی محکمے دار  
تھے۔ ان کی تین بیویاں تھیں۔ رام پیاری سب سے چھوٹی تھی۔ انہوں نے اپنے آبائی قصبے ڈنگ میں اپنی تین بیویوں  
کے لئے تین محل بنوائے تھے۔ خود رام پیاری گجرات کی رہنے والی تھی چنانچہ اس کی درخواست پر اس کے لئے گجرات  
میں بھی ایک شاندار عمارت بنوائی گئی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ آزادی سے پہلے ہی مر گئی تھی (حوالہ بالا ص  
۱۱۰)۔ ذاتی خط سالک رام مہتا بنام رشتہ علی عابدی۔





مطالع سے ذہن و دل روشن ہوتے ہیں  
کتاب انسان کی بہترین دوست اور ساتھی ہے

۱۲ ستمبر ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر رضیہ حامد

بھوپال، ہندوستان

کچھ تخلیقات ایسی ہوتی ہیں کہ پہلے دن کے مطالعے میں سب کچھ نہیں دیتیں مگر کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ پہلی بار کے مطالعے میں قاری ان سے بڑی حد تک مستفید ہو جاتا ہے۔ لیکن چند تخلیقات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ہر مطالعے میں قاری ان سے مستفید ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کی چند تصنیفات کا شمار بھی ایسی ہی تحریروں میں کیا جاسکتا ہے کہ ان کا مطالعہ ہر بار کیا جائے اور فکر کے پرت کھلتے چلے جائیں۔ ان کے سہ ماہی مجلے کا نام بھی ”فکر و آگہی“ ہے۔ جو بھوپال سے شائع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد یہ رسالہ گزشتہ اٹھارہ (۱۸) سال سے شائع کر رہی ہیں۔ انہوں نے ”فکر و آگہی“ کے تحت ’بھوپال نمبر، ہیکل اتساہی نمبر، بشیر بدر نمبر، اوپر انگاری (اردو میں) اور رفعت سروش نمبر‘ تالیف اور شائع کیے۔ علاوہ ان کے ڈاکٹر رضیہ حامد نے نواب صدیق حسن خان پر تحقیق کی۔ ان کی دوسری تحقیقات بعنوان ”بھوپال ورپن (ہندی)“ اور ”معاون حج (اردو/ہندی)“ شائع ہو چکی ہیں۔

خود ڈاکٹر رضیہ اور ان کے شریک حیات محترم ڈاکٹر میر محمد حامد عربی زبان میں ایم اے کی سند رکھتے ہیں۔ دونوں مل کر اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کے دن بھوپال (مدھیہ پردیش، ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔



تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ دوران تعلیم ان کی شادی ۸ / مئی ۱۹۶۴ء کو سید محمد حامد، بی ایس سی (علیگ) سے ہوئی۔ ڈاکٹر رضیہ کے جذامجد ایران سے ہندوستان آئے تھے اور بھوپال میں آباد ہوئے۔ رضیہ نسبی طور پر سادات میں سے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ کے تین بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے۔ سید محمد عامر، سید محمد عاصم، اور سید محمد عاطف اور صالحہ شفیع۔ تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور برسر روزگار ہیں اور اچھے عہدوں پر بیرون ملک خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد مجھ سے ۱۹۹۹ء میں دہلی میں محترمہ انور نزہت کے گھر پر ملی تھیں۔ میرا قیام نزہت کے گھر پر تھا۔ ان دنوں میں پی ایچ ڈی کرنے کے شوق میں گرفتار تھی۔ ڈاکٹر تنویر علوی صاحب کا مشورہ تھا کہ دہلی جاؤں اور دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں۔ محترمہ رضیہ حامد نے بھی مشورہ دیا کہ میں پکا ارادہ کر لوں تو کوئی کام مشکل نہیں ہوگا۔ مگر جب میں لوٹ کر لاس اینجلس پہنچی تو میری بی اے اور ایم اے (صحافت) کی اسناد غائب ہو چکی تھیں اور جیسا میرا اندازہ ہے میرے کسی اپنے نے ہی کسی کو کنیڈا کی شہریت دلانے کے لئے انہیں 'فروخت' کر دی تھیں۔ پروفیسر سحر انصاری نے مشورہ دیا تھا کہ میں جامعہ کراچی میں درخواست دے کر اور فیس جمع کر کے ان کی کاپی حاصل کر سکتی ہوں۔ سو میں نے ارادہ تو باندھا تھا لیکن کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ پی ایچ ڈی کرنے کی خواہش ہی ترک کر دی۔

ذکر تھا ڈاکٹر رضیہ حامد کا، مدہم لہجے میں گفتگو کرنے والی خاتون کا، جو مجھے بتا رہی تھیں کہ وہ ماضی میں بھی اور آج بھی اُسی توانائی سے خانداری کی جملہ ذمہ داریاں ادا کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق مطالعہ کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور مسلسل علمی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ اور اب بھی روزانہ چار پانچ گھنٹے مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "لمحوں کا سفر" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

میں نے اُن سے اُن کے پسندیدہ ادیبوں کے نام پوچھے جن کی تحریروں نے ان کے دل میں جگہ پائی۔ ڈاکٹر رضیہ کہنے لگیں، "جن ادیبوں کو زمانہ یاد رکھے گا ان کی فہرست طویل ہے۔ مگر چند نام یہ ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری، عبدالرحمن بجنوری، سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی نعمانی، سر سید احمد خان (اگرچہ ان کے کارنامے انیسویں صدی سے سامنے آئے)، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ۔"

اگلا سوال تھا، فکشن کو 'جدیدیت' نے نکھارا سنوارا یا مجروح کیا؟ رضیہ کا جواب تھا، "بے شک فکشن لکھنا ایک آرٹ ہے۔ اور اردو میں فکشن نگاروں کی کمی نہیں۔ پریم چند سے لے کر کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی تک ایک کہکشاں ہے۔ ان کے بعد قرۃ العین نے فکشن میں اپنا لوہا منوایا ہے لیکن میرے نزدیک ان پر جدیدیت کی کوئی چھاپ نہیں ہے۔ اس رجحان یا تحریک سے متاثر ہونے والے



فلشنگ نگاروں کی جو فہرست سامنے آتی ہے ان کا کوئی کارنامہ بہوز قابل قدر نہیں ہے جس سے وہ اپنے پیش روؤں پر سبقت لے گئے ہوں۔

اردو میں ناول نگاری کے تنزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "اس صدی میں زندگی کی رفتار نسبتاً تیز ہے اور عام آدمی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ طویل ناولوں کا مطالعہ کر سکے۔ دوسرے الیکٹرانک میڈیا نے عوام الناس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے۔ دوسری یہ کہ آج کا ادیب معاشی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران زندگی کے جدید طریقوں اور میکینزم (mechanism) ساخت و فنی پہلو) کی وجہ سے ان حالات کے دباؤ کا شکار ہے۔ ادیب بھی معاشرے سے الگ نہیں ہے بلکہ اس کا رد عمل حساس ہونے کے باعث شدید ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے کسی نئے نظام فکر کی تلاش فضول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے کلاسیکل نظام میں اس کی جگہ موجود ہے۔ روحانی بحران کا سب سے معتبر علاج مذہبی اقدار کو بروئے کار لانے میں ہے۔ روحانی بحران دور ہوگا تو ذہنی آسودگی خود بخود میسر آئے گی۔"

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا: "معیاری ادب کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے اور زندگی کے گونا گوں مسائل کو حل کرنے میں کس حد تک مثبت رول ادا کرتا ہے۔ برصغیر سے باہر جو ادیب رہتے ہیں ان میں سے بیشتر کا پیشہ برصغیر کے ادیبوں کی طرح ادبی کاموں سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ شاعری کی نسبت نثر نگاری زیادہ توجہ اور وقت چاہتی ہے۔ میں یہ نہیں مانتی کہ غیر ممالک میں موضوعات کی کمی ہے۔

اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں سے لفظ اخذ کرتی ہے لیکن اس سلسلے میں توازن کی ضرورت ہے جس سے زبان کا بنیادی مزاج مجروح نہ ہو۔ غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ کو اردو میں داخل کرنا اردو کی خدمت نہیں ہے۔ اب رہی نئے علوم کی بات، تو علوم کی معلومات کے ساتھ انگریزی الفاظ خود بخود اردو میں داخل ہو رہے ہیں اور یہ مستحسن بات ہے۔ میرا خیال ہے ایسی کوئی شعوری کوشش نہیں کی جائے جس سے انگریزی الفاظ کا اردو میں داخلہ ممنوع ہو۔ مگر بات صرف توازن کی ہے۔"

اردو کے فروغ کے حوالے سے ہم باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے بتایا: "ہندوستان میں اردو کے فروغ کے لئے بہت سی اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو کلاسیکی کتابوں کو چھاپ کر کم قیمت پر فروخت کرتی ہے تاکہ مطالعہ کا رجحان بڑھے۔ اردو میں کمپیوٹر کلاسیں شروع کی گئی ہیں۔ عموماً گورنمنٹ اسکولوں میں نہیں مگر چند اسکولوں میں "تیسری زبان" کے طور پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اب یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ اگر وہ اردو سے محبت کرتے ہیں تو اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں لکھائیں۔ اور جہاں تک رسم الخط کا سوال ہے جو اردو نہیں پڑھ رہے ہیں وہ یا تو رومن میں یا دیوناگری رسم الخط میں پڑھیں گے۔ ویلکھے قرآن کے ترجمے دیوناگری رسم الخط میں آرہے ہیں۔ ہندی ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لئے اس میں چھپی کتابیں خوب بکتی ہیں۔ ہندوستان



کے بیشتر ادیبوں کی کتابیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں ترجمہ ہوتی ہیں یا دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ یہ ہی دیکھئے کہ بھوپال اردو کا مسکن رہا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بھوپال میں اردو کے لئے کام نہیں ہو رہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تراجم اب عصری تقاضوں پر پورے نہیں اُترتے۔ اب اردو میں نئے سرے سے کون کام کرے گا؟ مہاراشٹر، اتر پردیش، گجرات، بنگال تک اردو میڈیم کے اسکول ہیں تو لیکن مستقبل میں اردو کہاں تک باقی رہے گی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

۱۸/ مئی ۲۰۰۳ء کے دن ڈاکٹر رضیہ حامد اور ڈاکٹر محمد حامد کے لئے کراچی کے ایک معروف جریدے ”طلوع افکار“ کے مدیر محترم حسین انجم نے ایک محفل سجائی جس کی صدارت کے فرائض سید علی اکبر رضوی نے انجام دیئے۔ دیگر شرکائے محفل میں ڈاکٹر سردار زیدی، ڈاکٹر شکیل نواز رضا، احمد زین الدین (مدیر روشنائی)، حیدر امام، ڈاکٹر حسین جعفر، فرحت علی، مصطفیٰ جمال، نور محمد شیخ اور حسنہ زیدی شامل تھے۔ اس موقع پر سوالوں کے جواب میں ڈاکٹر رضیہ حامد نے اردو کے فروغ کے حوالے سے کہا، ”بے شک اردو میں تنقید کی بے حد کمی ہے۔ بیشتر نقاد اپنے ذہن میں کچھ اصول رکھ کر اس کسوٹی پر ادب کو پرکھتے ہیں۔ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہر تخلیق کو پڑھنے کے بعد اس کے حسن و قبح کا جائزہ لیا جائے اور تنقید کے سوتے تخلیق سے پھوٹیں۔ میکائیکی تنقید سے اردو کو نقصان ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے نئے تخلیق کار تنقید سے بے زار نظر آتے ہیں۔ اردو کی ترقی کے لئے اس بات کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کا ترجمہ کیا جائے۔ اردو میں یہ کام تسلی بخش نہیں ہو رہا ہے۔ اور ترجمہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔ یہ زبان کے لئے مضر ہے۔ علاقائی زبانوں کا ترجمہ تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کیوں کہ اس سے اپنے ہی ملک کے ادب اور سماج کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اور ملک میں ادبی ہم آہنگی کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔“

Dr. Razia Hamid,

6 Kinara Apartment, V I P Road, Bhopal, 462001, MP, India





مرگزدی دروب پس سدی، جازوں خوشی کی مل نہ سکی  
شام ہونے ہے سالم صاحب، چلے اب تو اپنے گھر

محمد سالم

۱۸ اکتوبر

محمد سالم

نیوجرسی، امریکہ

سالم صاحب اپنی غزل سنار ہے تھے متقطع تھا۔

مرگزدی دھوپ میں سدی، چھاؤں خوشی کی مل نہ سکی  
اس شعر پر میں نے انہیں روک لیا۔ ”سالم صاحب کیا جلدی ہے۔ روز ہی شام ہوتی ہے۔“ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شعر کی زبان استعمال کر رہے ہیں میں انجان بنی رہی۔ آج بھی شام ہونے کو ہے اور پھر آج کی شام خنک سی شام ہے۔ ابھی ابھی تو ہم نے افطار کی تیاری کی ہے۔ نیویارک کی سردی تو ویسے ہی مشہور ہے۔ دانت بچ رہے ہیں۔ کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ سردی میں باہر نکلے۔ مگر سالم صاحب جیسے مسلمان ہیں کہ نماز باجماعت میں شرکت کے لئے دانت بھتی سردی میں بھی مسجد پہنچیں گے۔ کچھ سوچ کر وہ بیٹھ گئے۔ روزہ افطار کر اور نماز پڑھ کر وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میری جانب دیکھا۔ میں ان سے پوچھ رہی تھی، ”سالم صاحب، ایک طویل عرصے سے آپ نے اردو کی خدمت کی ہے، بلکہ اس میں عمر صرف کر دی ہے، اب اگر آپ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب کو اپنا کر آپ محسوس تو نہیں کیا کہ آپ شہرت یا مالی خسارے میں رہے ہیں؟“

سالم صاحب مسکرائے۔ بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔ پھر کہنے لگے، ”محبت میں خسارہ کیسا!



ہماری اردو سے محبت نو عمری کی محبت ہے اور دیکھتے طلب صادق ہو تو انسان کبھی بھی گھالے میں نہیں رہتا۔ اردو زبان نے تو شاگرد پیشہ لوگوں کو بھی فائدہ پہنچایا ہے اور ہم ٹھہرے اُس زمانے کے لوگوں کی نسل سے جو لین دین میں یقین نہیں رکھتے، پلے ہے تو دینے کے لئے ہی ہے۔ خدمت کا نعم البدل روحانی خوشی ہوتی ہے جو اللہ نے ہمیں عنایت کی ہے۔ اور ویسے بھی رب العزت نے ہمیں خاصا نوازا ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ہم اپنے قلم سے اللہ رب العزت کا نام لکھتے ہیں۔ وہ چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بارے میں کہنا شروع کیا۔

”میرا پورا نام محمد سالم اور تخلص سالم ہے۔ تاریخ پیدائش ۶/ اپریل ۱۹۳۳ء اور مقام پیدائش محلہ مہرولی، درہنگا، بہار، ہندوستان ہے۔ لیکن اسکول کی سند کے مطابق میرا سنہ پیدائش ۱۹۳۶ء درج ہے۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی کی گھر پر ہوئی لیکن اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم ادھوری رہی۔ ایسا ہوا کہ شروع شروع میں میرے والد مرحوم مجھ کو انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ مگر بعد میں انہوں نے اپنا خیال بدل دیا اور مجھ کو وکیل بنانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مجھے وکیل بننا پسند نہیں تھا کیوں کہ وکالت کے پیشے میں سچ اور جھوٹ میں کوئی امتیاز ہی نہیں برتا جاتا بلکہ جھوٹ کو جائز تصور کیا جاتا ہے جو میرے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے، جب میں بی اے کے آخری سال میں تھا اور اسی زمانے میں درہنگا ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تھا، اچانک یہ خیال آیا کہ کیوں نہ بی اے کی پڑھائی چھوڑ کر چپکے سے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا جائے تاکہ بی اے کے بعد والد کی جانب سے مجھ پر بی ایل پڑھنے کا دباؤ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب والد صاحب کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ بہت دنوں تک مجھ سے ناراض رہے۔ لیکن پھر میں نے انہیں منالیا۔ بہر حال ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد میں بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ، بھوپال (Bharat Heavy Electricals Ltd., Bhopal) کے لئے آل انڈیا مقابلے میں بیٹھا اور کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد بھوپال کمپنی نے مجھے ٹریننگ اسکول میں اٹھارہ (۱۸) مہینے کی اسپیشل آئزڈ ٹریننگ (specialised training) دی۔ اور ۱۹۶۰ء میں وہیں کارخانے میں انسپکشن ڈیپارٹمنٹ (Inspection Department) میں جونیئر انسپکٹر کے عہدے پر بحال ہوا۔ پھر والد مرحوم کی خواہش پر وہاں کی دس سالہ ملازمت ترک کرنے کے بعد میں وطن واپس چلا گیا اور آبائی جائداد کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد ظفر الدین بھی ادیب ہیں۔ ان کی صحبت میں مجھے بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ میرا ذہنی جھکاؤ فکشن کی جانب تھا۔ عبد الحلیم شرر، ایم اسلم، اور پریم چند کے ساتھ ساتھ رتن ناتھ سرشار، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری وغیرہ کو خوب پڑھا۔ نیگور کا ناول ’گورا‘ اور شرت چندر کے ناول ’چندر ناتھ‘ اور ’بڑی دیدی‘ بھی پڑھ ڈالے۔ میٹرک تک میرا پسندیدہ ماہنامہ ’میسویں صدی‘ تھا۔ اس کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ اب بھی یاد کر کے ہنسی آتی ہے۔ ہاں میں ذکی انور کی کہانیوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ذکی مرحوم کی کہانیوں سے مجھے افسانہ لکھنے کی تحریک ملی۔ چنانچہ میٹرک کے زمانے میں افسانے لکھنے کی ابتدا ہو گئی تھی۔ مگر اطمینان



اور اعتماد نہیں تھا کہ کہیں اشاعت کے لئے بھیجتا۔ ان ہی دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین و رجسٹرڈ شاخ کی نشستیں 'امیر منزل' میں ہوا کرتی تھیں۔ میں وہاں ۱۹۵۲ء میں جانے لگا تھا۔ لیکن میں نشست میں صرف سامع کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔ غالباً ۱۹۵۳ء کے اوائل میں جنگ کے موضوع پر ایک کہانی 'لنی بٹیا' لکھی اور میرے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کہانی کو نشست میں پڑھ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے وہ کہانی پڑھی جس کی کافی پزیرائی ہوئی۔ اس نشست میں مولانا عبدالعلیم آسی مرحوم، مظہر امام، منظر شہاب، حسن امام ورد، ذکی انور مرحوم، شمیم سیفی مرحوم، سید منظر امام، سید احمد شمیم وغیرہ موجود تھے۔ وہ کہانی ماہنامہ 'سہیل'، گیا، میں شائع ہوئی۔ ان ہی دنوں اپنے دوست سید احمد شمیم کی ترغیب پر ایک غزل کہی۔ اُس غزل پر انہوں نے اپنے والد مولانا طالع الہی فکری مرحوم سے اصلاح دلوا کر 'سہیل'، گیا، میں برائے اشاعت بھیج دی جو پورے صفحے پر شائع ہوئی۔ اس کے چار شعر ملاحظہ کیجئے۔

جب کوئی کھلی مسکراتی ہے فکر انجام خوں رلاتی ہے  
تیرے کوچے میں جب بھی جاتا ہوں اپنی رسوائی یاد آتی ہے  
تم وفا کا جو نام لیتے ہو بے وفائی ہنسی اڑاتی ہے  
میری دنیا کو دیکھ کر سالم ان کی جنت بھی جھوم جاتی ہے

یہ غزل بھی انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ درجسٹرڈ کی نشست میں پڑھی گئی۔ اس نشست میں مظہر امام صاحب بھی موجود تھے۔ موصوف غزل سن کر بہت خوش ہوئے اور مجھ سے کہا کہ شاعری جاری رکھو کامیاب رہو گے۔ لیکن افسوس کہ میں نے اس وقت ان کے مشورے پر توجہ نہیں دی اور صرف افسانہ نگاری ہی سے جڑا رہا۔ بلاشبہ 'امیر منزل' کے ادبی ماحول سے مجھے بہت کچھ روشنی ملی۔ مظہر امام کے چھوٹے بھائی سید منظر امام سے ۱۹۵۲ء میں میرے مراسم ہوئے اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو گئے۔ مظہر امام صاحب کی ایک ذاتی لائبریری ان کے گھر میں تھی جس میں قیمتی کتابوں اور ادبی رسائل کا انبار تھا۔ وہیں سے مجھے ہندو پاک کے مشہور ادبی رسائل مثلاً نقوش، سویرا، ادب لطیف، ساقی، ادبی دنیا، شاعر، شاہ راہ وغیرہ کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ ادبی جریدے میری علمی و ادبی نشوونما میں بہت معاون ہوئے۔ نظریاتی اور فکری اعتبار سے جو تحریک اور رجحان اس وقت نئے ادبی ذہنوں میں تشکیل پا رہے تھے ان سے میں بخوبی آشنا ہوا۔ وہیں سے مجھے کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، اوپندر ناتھ اشک، ممتاز مفتی، حجاب، امتیاز علی تاج، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، دیوندر ستیا رتھی، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، اسے حمید، ابراہیم جلیس کو پڑھنے کا موقع ملا۔ جوش، فراق، فیض، سردار جعفری، مخدوم، راشد، اختر الایمان، وغیرہ کی شعری تخلیقات بھی پڑھیں۔ گورکی، مائلسائی، چیخوف، ترگینف، موپاساں، ڈی ایچ لارنس وغیرہ کی تصنیفات کے اردو تراجم کا مطالعہ کیا۔ اشتراکیت پر جو کچھ بھی میرا مطالعہ ہے وہ 'امیر منزل' کی دین ہے۔ اسلامیات پر ذخیرہ تو میرے گھر میں موجود تھا، مثلاً امام غزالی، ابن تیمیہ، جلال الدین رومی، شاہ



ولی اللہ، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ کی کتابوں کو بڑے و اہم انداز میں پڑھا۔ پھر ۱۹۵۸ء میں بسلسلہ ملازمت بھوپال منتقل ہو گیا جہاں پر میرا رابطہ تبلیغی جماعت سے قائم ہو گیا اور میں دعوت و تبلیغ میں اتنا مصروف ہوا کہ ادب سے میرا رشتہ برائے نام رہ گیا۔ ۱۹۶۸ء میں استعفیٰ دے کر وطن لوٹا تو پرانے احباب کی کشش مجھے ادبی دنیا میں کھینچ لائی۔ لیکن افسانہ نگاری کے بجائے شعر گوئی کی طرف رغبت ہوئی اور ساتھ ہی تنقیدی مضامین لکھنے کا ذوق بھی میرے اندر ابھرا۔ پھر کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ میں ۱۹۹۰ء میں نیوی بچوں کے ساتھ امریکہ ہجرت کر کے آ گیا۔ جب سے یہیں مقیم ہوں اور نیویارک ایرپورٹ پر ملازمت سے منسلک ہوں۔ اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ ۲۰۰۳ء کے فروری میں ریٹائر ہو جاؤں گا اور تب آخرت کی تیاری کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے کی خواہش ہے۔

سالم صاحب کی تصانیف کے نام یہ ہیں: زاویہ خیال (تنقیدی مضامین)؛ صباے سنگ (غزلیں، نظمیں)؛ شمس الرحمن فاروقی۔ شعر، غیر شعر اور نثر کی روشنی میں (تنقید)۔ نئی سمت نئے تقاضے (تنقیدی مضامین) اور زیر ترتیب درد کا سفر (نظمیں غزلیں)۔

میں نے پوچھا، ”سنا ہے کہ آپ کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھتے ہیں۔ کیا یہ کوئی پڑانی عادت ہے؟“ کہنے لگے، ”جب کسی سے تعلق خاطر اور محبت ہوتی ہے تو اس پر خرچ کرنے سے طبیعت پر گرانی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ موجودہ دور میں عوامی سطح پر ادبی ذوق برائے نام رہ گیا ہے۔ عام طور پر کتابوں اور رسالوں کی نکاسی ادیبوں اور شاعروں کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ادبا و شعرا کو اپنی کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی قربانی دینی پڑتی ہے لیکن یہ کتابیں بہت کم بکتی ہیں۔ اس لئے بچی ہوئی کتابیں دوستوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں مالی خسارہ تو ہوتا ہے لیکن بہر حال یہ ادبی خدمت ہی ہے جس کی وجہ سے خسارے کا احساس کوئی زیادہ نہیں ہوتا۔ میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوں۔ میں نے علم کی اور دوستوں کی خدمت کر کے ہمیشہ مسرت پائی ہے اور اس معاملے میں کبھی کنجوسی نہیں کی۔“

اگلا سوال ادیبوں کی گروہ بندیوں سے پیدا ہونے والے نقصانات کے سلسلے میں تھا۔ سالم صاحب نے کہا، ”ہم اگر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ادبی دنیا کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنماؤں میں بھی فقہی مسائل میں بھی اختلاف پائیں گے۔ لیکن ان کے اندر اخلاص کی بنیادیں مضبوط تھیں اس لئے اختلاف کے باوجود انہوں نے آپس میں رواداری کو قائم رکھا۔ چنانچہ ان کے ہاں غیر اخلاقی قسم کی باتیں نہیں ملیں گی۔ لیکن موجودہ صورت حال بالکل مختلف ہے۔ مذہبی رہنماؤں کے یہاں بھی اب پچھلی روایات مٹی جا رہی ہیں۔ اختلافات کے سلسلے میں سیاست کی تنگ نظری کے زیر اثر اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا ہے۔ مذہبی سیاسی داؤں بیچ کے شور و غل میں یہ فیصلہ مشکل ہو گیا ہے کہ کون حق پر ہے، کون ناحق؟ لیکن اللہ کے کچھ ایسے نیک بندے اب بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنے دامن کو جھوٹی سیاست سے محفوظ رکھا ہے۔ بہر حال بات ادیبوں کے گروہ بندی کی بابت چل رہی تھی تو ظاہر ہے کہ ادبی حلقوں کو بھی گندی سیاست



نے اپنی لپٹ میں لے لیا ہے جس کے ہامٹ اکثر غیر اخلاقی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی غرض سے اکثر ایسے مضامین چھپتے ہیں جن میں ذاتیات پر حملے ہوتے ہیں۔ پرچوں میں بعض خطوط بھی ادبی گراوٹ کا نمونہ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح زبان و ادب دونوں کی ترقی کو ضرور نقصان پہنچا ہے۔

میں نے ان سے پوچھا، ”سالم صاحب آپ کی زندگی کا کونسا واقعہ آپ کو بہت اہم لگتا ہے؟“ کہنے لگے، ”اس سلسلے میں ماضی کے اہم خواب کا ذکر کرنا چاہوں گا جو بعد میں سچ ثابت ہوا۔ ہو بہو وہی واقعہ پیش آیا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ حالاں کہ ایسا کم ہوتا ہے اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ میں اس خواب کو کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ ۱۹۵۸ء کے اوائل میں بہار یونیورسٹی سے میں آئی اے کا امتحان دے رہا تھا۔ چوں کہ کالج کے امتحان میں اردو کے پرچے میں میری اول پوزیشن ہوا کرتی تھی اور انگریزی میں کبھی دوسری یا تیسری پوزیشن۔ چنانچہ میرے متعلق یونیورسٹی میں فرسٹ ڈویژن کی توقع کی جاتی تھی۔ لیکن ایسا ہوا کہ ریاضی بھی میرا ایک مضمون تھا جس کا ایک پرچہ مذکورہ امتحان میں اچھا نہیں ہوا تھا اس لئے نتیجہ کے تعلق سے میں بہت فکر مند تھا۔ نتیجہ نکلنے سے دس روز قبل ایک رات میں نے یہ خواب دیکھا کہ انگریزی اخبار ’انڈین نیشن‘ میں نتیجہ شائع ہو گیا ہے۔ اخبار پڑھنے میں چھپتا تھا۔ سوچا کہ رات کے نو بجے ایک ٹرین پٹنہ سے درہنگہ پہنچتی ہے تو چل کر دیکھا جائے شاید ٹرین میں کسی مسافر کے پاس اخبار مل جائے۔ اسی خیال سے میں پریشانی کے عالم میں درہنگہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور تیزی سے پلیٹ فارم پر آگیا۔ دیکھا ٹرین کھڑی ہوئی ہے۔ اور مسافر اترنے چڑھنے میں مصروف ہیں۔ میں بھی ایک سکند کلاس کے ڈبے میں چڑھ گیا۔ ایک شخص پر نظر پڑی جو عینک لگائے انگریزی اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی میں نے اس سے پوچھا کہ رزلٹ نکل گیا ہے؟ اس اجنبی شخص نے چونک کر مجھے دیکھا اور جواب دیا، ہاں اور اخبار میرے سامنے کر دیا۔ پھر میں رزلٹ کے کالم میں اپنا نام تلاش کرنے لگا۔ فرسٹ ڈویژن میں میرا نام نہیں تھا، سکینڈ اور تھرڈ ڈویژن کے کالم میں بھی مجھے اپنا نام دکھائی نہیں دیا۔ میں گھبرا کر بولا، ہائیں! یہ کیا ہوا! اس پر اسی اجنبی شخص نے یہ کہہ کر مجھے ڈھارس دی کہ گھبراؤ نہیں اور میرا نام پوچھا۔ اس نے نتیجہ کے کالم پر ایک نظر ڈالی اور کہا، یہ دیکھو! سکینڈ ڈویژن میں تمہارا نام تو ہے میں نے دیکھا واقعی میرا نام وہاں درج ہے۔ اس کامیابی پر میرا دل و دماغ باغ باغ ہو گیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں نے گھر میں کسی سے بھی اس خواب کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن محلے میں ایک دوست منظور الحق تبسم سے اس کا ذکر کر دیا۔ پھر خواب میرے خیال سے یوں نکل گیا کہ خوابوں کا کیا بھر دسا اکثر یہ سچ نہیں ہوتے۔ عجب اتفاق کہ دس روز بعد میں کسی کام سے بازار میں تھا۔ میرے ساتھ تبسم بھی تھے کہ اچانک خبر ملی کہ پٹنہ میں آئی اے کا نتیجہ نکل گیا ہے۔ گھڑی دیکھی تو رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ تبسم نے رائے دی کہ ہم لوگ اسٹیشن جا کر انگریزی اخبار تلاش کریں کیوں کہ پٹنہ سے نو بجے گاڑی آتی ہے اور ممکن ہے کہ کسی مسافر سے مطلوبہ اخبار مل



جائے۔ مجھے ان کی رائے پسند آئی۔ میرے پاس سائیکل تھی۔ ان کو ساتھ لے کر بڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ نو بجے ہم دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ تبسم کو سائیکل دے کر یہ کہا کہ آپ باہر میرا انتظار کرو اور اندر جا کر میں اخبار تلاش کرتا ہوں۔ اور پھر ہو بہو خواب کا وہی واقعہ پیش آیا جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ کامیابی کی خوشی میں جب میں باہر پہنچا تو معاً گزشتہ خواب یاد آیا جو ذہن سے نکل چکا تھا۔ تبسم نے یہ سوال کیا کہ آیا میں نے اس شخص کا نام اور پتا پوچھا جس سے اخبار لے کر اپنا نتیجہ دیکھا تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ فوراً واپس جاؤں اور معلوم کر کے آؤں۔ لیکن جب میں واپس پہنچا تو ٹرین جا چکی تھی۔“

محمد سالم صاحب نے اپنی زندگی مطالعہ اور قلم کی خدمت میں صرف کر دی۔ سہ ماہی ”وقت“، دھن باد، جہاز کھنڈ، بہار“ نے اُن کی خدمات کے اعتراف میں ایک خوب صورت اور ضخیم ”محمد سالم نمبر“ شائع کیا ہے۔ کئی سال پہلے سہ ماہی ”توازن، مالیگاؤں، مہاراشٹر“ نے بھی ان پر ایک گوشہ ترتیب دیا تھا۔ ان پر لکھے ہوئے مضامین کا ایک مجموعہ بعنوان ”شخص اور عکس“ ابوذر ہاشمی نے مرتب کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ محترمہ شاہینہ امام متھلا یونیورسٹی میں ان کے فکروفن پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہی ہیں۔ پھر بھی یہ اعترافات سالم صاحب کی خدمات کے مقابلے میں کم ہیں۔

ضروری ہے کہ سالم صاحب کو ان کی زندگی میں خراج محبت پیش کرنے کے لئے اہل علم نیویارک، نیوجرسی امریکہ کے علاوہ ہندوستان میں بھی ان کا جشن منعقد کریں۔ اور جو ادارے ہزاروں ڈالر اور درہم کے انعامات سفارشوں پر بانٹتے ہیں وہ ان گوشہ نشینوں کے کاموں کی طرف بھی توجہ دیں کہ ”اعتراف محبت و تحسین“ کے اصل مستحق اور حق دار تو ایسے ہی لوگ ہیں اور ان کا حق انہیں ان کی زندگی میں مل جائے تو بات ہے۔

Mr. Mohammad Salim,

55 Manor Drive, Apt. 8-0, Newark, N J, 07106, USA





ایک عسقی مکتبہ چھپو سوسائٹیاں چھپو سوسائٹیاں چھپو سوسائٹیاں  
سب لکھ کر کیا زندہ آدمی مکتبہ سوسائٹیاں چھپو سوسائٹیاں چھپو سوسائٹیاں

*Smeha SETHI*

سعدیہ سیٹھی

نونگھم، برطانیہ

برطانیہ میں کئی شہروں سے ریڈیو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ ان میں نونگھم چھوٹا شہر ہونے کے باوجود ریڈیو پروگراموں کے لحاظ سے خاصا فراخ دل واقع ہوا ہے۔ نیلما ناں بھی وہاں سے ریڈیو پروگرام پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے سعدیہ سیٹھی سے متعارف کرایا۔ سعدیہ خود بھی ریڈیو پروگرام پیش کرتی ہیں۔ شاعرہ بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) مشرق کی خوش بو (۲) رشتوں کا بھنور

ان کی شاعری کے بھی دو مجموعے شائع ہوئے ہیں (۱) اشک بہانے کی آرزو، اور (۲) رقص خوش بو کا۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ سعدیہ شاعرہ اچھی ہیں یا کہانی کار۔ ان کی غزل سے ایک شعر ہے۔  
سانس کی دُوری کا بندھن ٹوٹنے کی دیر ہے مہرباں منہ پھیرتے جائیں گے سارے دیکھنا  
ان کی دوسری غزل سے ایک یہ شعر بھی بڑا دل نشیں ہے۔

نئی منزلوں کی تلاش میں کوئی کامیاب سفر تو ہے اُسے مل گئی نئی روشنی، مرا گھر پڑا ہے جلا ہوا  
سعدیہ کے افسانوی مجموعے ”مشرق کی خوش بو“ سے ایک افسانہ بعنوان ”پیان“ پڑھا اور بھی افسانے ہیں۔ کچھ نرم کچھ گرم۔ انگریزی میں گفتگو کرنا اب ان کے لئے بھی مجبوری بن گئی ہے جو شاعری کرتے



میں اور افسانے لکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں جگہ جگہ انگریزی کے الفاظ ملتے ہیں اس کے باوجود کہ ان کے متبادل اردو الفاظ موجود ہیں۔ لیکن لکھنے والوں کو کچھ تو وقت نے مجبور کر دیا ہے اور کچھ مصروفیت کے حوالے سے لاپرواہ اور کاہل بھی ہو گئے ہیں کہ کام تو چل ہی رہا ہے محنت کون کرے اور کیوں؟

بہر حال سعدیہ کا افسانہ ”پیان“ پڑھ کر خوشی یوں ہوئی کہ اب ہمارے افسانہ نگاروں نے مبلغ کا کردار بھی سنبھال لیا ہے۔ افسانہ کی ہیروئن جاناں جب اپنے بھائی سے ملنے لندن آتی ہے تو اس کے پڑوسی شیلی اور سیلی کے بھائی جیسن سے بھی ملاقات ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ جاناں اور جیسن کی محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جاناں کی دعائیں رنگ لاتی ہیں کہ جیسن مسلمان ہونے کی خواہش لے کر جاناں کے شہر پہنچ جاتا ہے اور پھر دونوں کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلی۔ اچھا ہوتا اگر افسانے میں ”مشرق کی بیٹی“ کی گردان پر زور دینے کے بجائے ”اسلام کی خوبیاں“ گنوائی جاتیں۔ توقع ہے کہ سعدیہ کی اگلی منزل ان کی فکر اور سوچ میں اور پختگی لے آئے گی۔

سعدیہ سیٹھی گجرات پاکستان میں ۲۳ / مئی کو پیدا ہوئیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے انہوں نے اردو زبان و ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

سعدیہ ادب میں گروپ بندی سے نقصان پہنچنے کی قائل نہیں۔ کہتی ہیں کہ گروپ بندی سے ادب یا زبان کو نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ اردو کے مستقبل سے بھی مایوس نہیں۔ جتنا کام اردو کے لئے اپنے دیس اور پردیس میں ہو رہا ہے اس سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ سعدیہ کے پسندیدہ ادیبوں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، عصمت چغتائی، مولانا الطاف حسین حالی، اور فاطمہ ثریا بجیا کے نام سرفہرست ہیں۔

اگلا سوال میں نے پوچھا تو سعدیہ نے سوچتے ہوئے کہا، ”اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں کیا کہوں۔ میں آپ کو تفصیل سے لکھ بھیجوں گی۔ پتا ہے ابھی تھوڑی دیر میں میرا ریڈیو پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ پھر مجھے گھر جا کر ہانڈی چولھا بھی دیکھنا ہے۔“ اور پھر پھر سعدیہ نے جمائی لی۔ اُسے نیند بھی آرہی تھی لگتا ہے دنوں سے ایسی نیند بھی نہیں ملی۔

سعدیہ کے شریک سفر پرویز عزیز سیٹھی اور بیٹے عدنان احمد سیٹھی اور محمد علی سیٹھی سعدیہ کی روزمرہ کی مصروفیات میں ہاتھ بٹاتے ہیں لیکن پردیس کی مصروفیات بھی تو معمولی نہیں ہوتیں۔

”سعدیہ! میں نے اس سے پوچھا، ”اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سناؤ۔“

سعدیہ سوچ کر بولیں، ”سلطانہ! یہ واقعہ میرا اپنا تو نہیں کسی اور کا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے۔ آپ بھی سنئے۔ خلیفہ ہارون رشید نے شہزادہ امین کے لئے جب احمر کو اتالیق مقرر کیا تو اتالیق کو یہ ہدایت نامہ جاری کیا.....

’اے احمر میں نے اپنا لخت جگر اور جوانی کا ثمر تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ اب اس پر تمہیں اختیار دیا ہے۔ اسے قرآن، شاعری، احکام و عقائد کی صحیح تعلیم دو۔ بے موقع ہنسنے سے منع کرو۔ تاکید کرو



کہ ہاشمی خاندان کے بزرگوں کا احترام کرے۔ اس کا کوئی لمحہ علم و ہدایت سے خالی نہ رہے۔ وہ افسردہ خاطر نہ ہونے پائے۔ اس کی تربیت و اصلاح میں نرمی سے کام نہ لینا۔ یہ طریقہ کار گرنہ ہو تو تم اس کے ساتھ سختی سے بھی پیش آ سکتے ہو۔

چنانچہ میں اس ہدایت کو اکثر پڑھتی ہوں و ہر اتنی ہوں تاکہ ہم اپنے بچوں کی تربیت اس کی روشنی میں کریں تو فلاح پائیں گے۔

اردو کے قارئین کے لئے اس نووارد افسانہ نگار کی سرپرستی یقیناً یہاں اردو کی ترویج و ترقی میں معاون ہوگی۔

## کچی عمر کے خواب

”جور یہ! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ تم اپنے حواس میں تو ہو؟ ایسے رشتے تو قسمت والوں کو ملا کرتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے خدائے ہمیں اتنا اچھا رشتہ عطا کیا ہے اور تم ہو کہ انکار کر رہی ہو۔ دانیال ہمارا دیکھا بھالا بچہ ہے۔ نوکری بھی لگ گئی ہے۔ خدا خدا کر کے تمہاری پھوپھو کے دن پھرے ہیں۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہی ہیں اور تم ہو کہ انکار کر رہی ہو۔“

ماما کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا۔

”میں تم کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

”ماما آپ میری بات تو سن لیں۔“

”میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ کل تمہاری پھوپھو آ رہی ہیں تمہیں انگوٹھی پہنانے۔“

”ماما پلیز مجھے بے ادب ہونے پر مجبور نہ کریں۔ میری ایک آئیڈیل لائف ہے میں نے اپنی

لائف اسی طریقے سے گزارنا چاہتی ہوں۔ جس آئیڈیل لائف کے بارے میں میں نے سوچا ہے اس

میں دانیال پورا نہیں اترتا۔ ماما آج کل کی فاسٹ لائف میں اتنا سوچا نہیں جاتا۔ میں آپ لوگوں کی

طرح اچھے دنوں کے انتظار میں اپنے بال سفید نہیں کرنا چاہتی۔ بابا اتنے سالوں کی جدوجہد کے بعد آج

جا کر اس قابل ہوئے ہیں کہ ہم سیکنڈ ہینڈ گاڑی افورڈ کر سکتے ہیں۔ ساری عمر سفید پوشی کا بھرم رکھتے

ہوئے کیا سے کیا ہو گئی ہیں آپ اور پھوپھو بھی تو ساری عمر آپ کی طرح سفید پوشی کا پردہ اوڑھے ہوئے



میں اور اوپر سے بیٹے کی جوڑی ملاتے ملاتے چار بیٹیاں..... امی آپ سوچیں اگر میں اور ارمان دونوں میں بھائی کی بجائے پانچ سات بہن بھائی ہوتے تو ہمارے گھر میں تو کھانے کے لالے پڑ جاتے۔“

”کم عقل لڑکی یہ سارے مقدر کے کھیل ہیں۔ ان فضول باتوں میں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔ اللہ رکھے تمہاری اور دانیال کی شادی کے ساتھ رضیہ بیگم عروج کی شادی سے فارغ ہو جائے گی۔ باقی تین بچیوں کا بھی مقدر وقت کے ساتھ ساتھ کھل جائے گا۔“

”امی آپ تو میری دشمن ہیں۔ خود سوچیے وہاں پر شادی ہوتے ہی میری Struggle کا دور شروع ہو جائے گا۔ جب تک میں اور دانیال بہنوں کی شادی سے فارغ ہوں گے میری اپنی اولاد بڑی ہو جائے گی۔ تو ماما میں زندگی میں کیا دیکھوں گی۔ ہر وقت کفایت شعاری ہر وقت دیکھ دیکھ کر خرچ کرنا۔ سوائے غمی خوشی کے اگر کبھی اتفاق ہو بھی جائے تو کئی کئی مہینے بجٹ کا متاثر ہونا ضروری ہے۔“

وہ تمسخر سے بولی۔ ”امی سوری میں کسی بھی دانیال جیسے لڑکے سے شادی کر کے ساری عمر کفایت شعاری میں نہیں گزار سکتی۔ میں تو ایسے آدمی سے شادی کروں گی جو امیر ہو۔ کم از کم اس زندگی کا بھرپور لطف تو لے سکوں۔“

”نہیں ماما کچھ بچ بھی تو جاتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ماما مجھے زندگی کو انجوائے کرنا ہے اور وہ میں ہمایوں کے سنگ کر سکتی ہوں۔ وہ سب کچھ

آسانی سے افورڈ کر سکتے ہیں جو میں چاہتی ہوں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم نے سب کچھ بالا ہی بالا تہہ کر لیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔“

وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”یہ ہمایوں کون ہیں؟“

”ماما ہمایوں انڈسٹریز کے مالک۔“

”کیا تم ملک ہمایوں کی بات کر رہی ہو؟“

”جی ماما۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”بیٹی رشتہ اپنے جوڑ کے لوگوں میں ہونا چاہیے۔ ہم ان لوگوں کے ہم پلا نہیں ہیں اور وہ شخص تو

شادی شدہ ہے۔“



”تو کیا ہوا ماما۔ وہ کہتے ہیں وہ مجھے الگ رکھیں گے۔“

”میں تمہیں اپنی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ ماما غصے سے باہر نکل گئیں اور وہ غصے سے کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

وہ اپنے خوابوں کی تعمیر کے لیے ڈٹ گئی۔ اس نے دانیال کو صاف صاف بتا دیا:

”وہ جدوجہد کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے تو سب کچھ پلیٹ میں رکھا ہوا چاہیے۔ وہ پیرس، لندن، امریکہ جا کر دن رات انجوائے کرنا چاہتی ہے۔ پارٹیز انینڈ کرنا چاہتی ہے۔ خوب ڈھیر ساری شاپنگ کرنا چاہتی ہے۔“

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر رہے تھے اور دانیال خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور پھر سب نے دیکھا کہ ہمایوں سے رشتہ ہونے میں سب سے زیادہ کردار دانیال نے ادا کیا۔ ماما دانیال اور پھوپھو دونوں سے شرمندہ تھیں۔ مگر کیا کرتیں، ماں تھیں۔ سب کچھ کیا مگر بے دلی سے۔ جب وہ خاموشی سے رخصت ہو رہی تھی تو وہ بے اختیار رو پڑیں۔

”دیکھو رضیہ اس بچی کی کم عقلی۔ کیسے کیسے ارمان تھے میرے دل میں اس کی شادی کے۔ اس نے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ شادیاں ایسے ہوتی ہیں۔“

”اب چپ کر جاؤ مسرت! اور بیٹی کی خوشیوں کے لیے دعا کرو۔ یہ سب اس کی قسمت میں تھا۔ اللہ تعالیٰ آگے اس کی قسمت اچھی کرے۔ ابھی ہم تو بڑے زور و شور سے شادی کرتے۔ اب ہمارے داماد صاحب نے ہی منع کر دیا تھا۔ وہ سادگی سے صرف نکاح کرنا چاہتے تھے۔ نہ جانے کیسے پچانس لیا میری معصوم سی بیٹی کو۔“

وہ اب دل کے پھپھو لے نکال رہی تھیں۔

”رضیہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ اس لڑکی نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

”مسرت اب چپ ہو جاؤ اور اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کی دعا کرو۔“

لندن، پیرس، امریکہ، ناروے کہاں کہاں نہیں وہ گھومی ہمایوں کے سنگ۔ نیا گرہ فال دیکھتے ہوئے مسرت اس کے چہرے پر پھوٹ رہی تھی۔ وہ کتنی خوش تھی۔ واپسی پر اس نے ہمایوں سے فرمائش کی۔



”ہمایوں پلیز ہم پورا پاکستان دیکھ کر لاہور جائیں گے۔“ وہ نخرے دکھاتے ہوئے بولی تو  
ہمایوں اپنی جوان سال بیوی پر فریفتہ ہوتے ہوئے بولے۔

”جان ہمایوں جہاں جہاں کہوگی لے کر چلوں گا۔“

وہ بیٹھ کر سارا پروگرام مرتب کرنے لگی۔ کاش انی دیکھیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔ ساری عمر میں  
بھی شاید کوئی ملک تو کیا پورا پاکستان کبھی نہ دیکھ سکتی۔ چلو ماما اب تو خوش ہوں گی جب ان کو میرے کارڈ  
دنیا کے ہر ملک سے ملتے ہیں۔

آخر یہاں پوری دنیا کی سیر کرتے ہوئے آخر میں پورا پاکستان پھرتے ہوئے وہ کل ہی لاہور پہنچی  
تھی۔ ہمایوں اس کو ماں کے گھر چھوڑ گئے تھے کہ شام کو پی سی میں ڈنر کرنا تھا۔ وہ سارا دن فارغ تھی۔  
اکیلے گھر بور ہونے کے خیال سے وہ ماما کی طرف جانے کا سوچنے لگی تو ہمایوں جاتے ہوئے اسے چھوڑ  
گئے اور کہا کہ شام کو تیار رہنا۔ پی سی میں ڈنر کریں گے۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ  
ماما سے باتیں کیے جا رہی تھی اور ماما ہلکی سی مسکان لیے اس کی باتیں سن رہی تھیں کہ اچانک اسے پھوپھو کا  
خیال آ گیا کہ ان چھ مہینوں سے اسے کسی کا ہوش نہیں تھا۔

”دانیال تو دینی چلا گیا ہے اور عروج اور شامیا کی شادی ایک ساتھ ہو گئی۔ اب ردا اور ندا کے  
ساتھ تمہاری پھوپھو کراچی چلی گئی ہیں کہ رحمن بھائی کا تبادلہ ہو گیا ہے۔“

”اچھا!“ وہ سرسری سی بولی۔ دانیال کے دینی جانے کا اسے عجیب سا لگا۔ ”ماما اس کی شادی  
وادی کا کوئی چکر چلا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹی۔“

”نہیں بیٹی وہ کہتا ہے کہ لڑکیوں کے خیالات بدل گئے ہیں۔ اب پہلے کچھ بن جانا چاہیے پھر  
شادی کرنی چاہیے۔“ ماما کی بات سن کر اس کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

ہمایوں صاحب کی پہلی بیوی ممتاز اختر کو جب پتہ چلا تو ہمایوں صاحب کے ہوش ٹھکانے  
آ گئے۔ عشق کا سارا بھوت اتر گیا۔ وہ بیگم کے سامنے میا نے لگے۔

”کان کھول کر سن لو ہمایوں! تم نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو میں تم کو چھوڑ دوں گی۔ کچھ نہیں  
رہے گا تمہارے پاس۔ تم کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جاؤ گے۔ پھر میں دیکھوں گی کہ تم کتنی شادیاں کرتے  
ہو۔“



ہمایوں صاحب بیگم کے تیار رکھے گئے۔ سارا کچھ تو ممتاز اختر کا خاندانی ورثہ تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتھی اولاد تھی۔ لہذا ماں باپ کے انتقال کے بعد سب کچھ انہی کو ملا اور پھر ہمایوں کی وہ چچا زاد تھی۔ سارا خاندان اس کے ساتھ تھا۔ جس شادی کو انہوں نے ساری عمر چھپا کر رکھنے کا ارادہ کیا تھا، چھ مہینوں میں سب گھر والوں کے سامنے آگئی۔ بیٹابیٹی نے بولنا بند کر دیا اور ممتاز اختر نے حکم دیا کہ دو دن کے اندر طلاق کی کاغذات بھیج دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ جتنی خاموشی سے شادی ہوئی، اس سے زیادہ خاموشی سے وہ ٹوٹ گئی۔ ہمایوں صاحب نے اسے طلاق دے دی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ مگر ہمایوں نے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر دیا۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ماما۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب ممتاز اختر نے اسے دھمکایا کہ اگر اس کے ہونے والے بچے کی وجہ سے جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بچے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی تو وہ ڈر گئی سہم گئی۔ زندگی کے اس رخ کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ اس کو ایک چپ لگ گئی۔ ہر چیز سے اس کا دل اٹھ گیا۔ ماما اس کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی۔ ارمان شادی کر کے باہر چلا گیا۔ ماما بابا کے ساتھ وہ بھرے پرے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اس کی زندگی میں اگر جینے کی اُمید تھی تو وہ اس کی بیٹی روشنی۔ روشنی کی وجہ سے ماں بابا بھی بہل گئے تھے۔ وقت کب کسی کے لیے رکتا ہے۔ وہ جو زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ ایک مشین بن کر رہ گئی۔ اسکول کی نوکری، بچی کی پرھائی، ماما بابا کی تیمارداری۔ بس یہی کچھ تو تھا اس کی زندگی میں۔ ماما بابا اس کی خاموشی پر کڑھا کرتے تھے۔ شاید اسی کا غم ان کو یکے بعد دیگرے دنیا سے لے گیا۔

وقت کتنی تیزی سے گزر گیا۔ آج اس کی بیٹی اس کے مد مقابل کھڑی تھی۔ اسے روشنی کی بڑی فکر تھی۔ اس نے اپنی کئی کولیگ کو کہہ رکھا تھا کہ روشنی کے لیے کوئی اچھا ساڑ کا نظر میں رکھیں۔ وہ جلد از جلد روشنی کے فرض سے فارغ ہونا چاہتی تھی۔

”روشنی! روشنی! کہاں چلی گئی ہے یہ لڑکی۔“

”ماما میں یہاں ہوں!“

وہ ماں کے سامنے آگئی

”ماما یہ دیکھیں اپوائنٹ منٹ لیٹر۔“ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے لیٹر لہراتے ہوئے بولی۔



”کیا مطلب؟“ مطلب یہ کہ مابہ دولت نے آپ کا ہاتھ بنانے کا سوچا ہے۔ ہم نوکری کریں

گئے۔“

”تمہیں نوکری کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت ہے ماما۔ آپ کی تنخواہ سے تو صرف کھانا پینا چلتا ہے۔“

”ماما ڈارلنگ دنیا میں اور بھی چیزیں ہیں۔ ماما میں اڑنا چاہتی ہوں۔ نیلے آکاش میں

چاہتی ہوں، میرے پاس ڈھیر ساری دولت ہو اور میں دنیا بھر کی ساری خوشیاں سمیٹوں۔“

”روشنی!“ وہ دہل گئی۔ اسے بیٹی کی خواہشوں سے ڈر لگنے لگا۔

”روشنی اتنے سنے نہیں دیکھتے۔ ان کا انجام برا ہوتا ہے۔“

”برا کیوں ہوتا ہے۔ اچھی باتیں تو سوچنی چاہئیں ماما اور پھر ہمارا بھی حق ہے خوشیوں پر۔“

وہ خاموش ہو گئی اسے لگا جیسے وقت واپس آ گیا ہے۔ یہاں خیالات اس کے بھی تھے۔ مگر ملا تو وہ

جو اس کا مقدر تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ روشنی کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ آج وہ کتنے دنوں بعد

اکٹھی بیٹھی تھیں۔ جب سے روشنی نے نوکری کی تھی دونوں ماں بیٹیوں کو اکٹھے بیٹھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

جب سے روشنی بیٹھی تھی۔ احمد صاحب کی باتیں کر رہی تھی۔

”ماما وہ اتنے گرلیں فل ہیں کہ کیا بتاؤں۔“

”بیٹا! مجھے یہ پسند نہیں کہ تم زیادہ کسی میں انوالو ہو۔ اپنے کام سے کام رکھو اور زیادہ کسی سے

بات نہ کیا کرو۔“

اس نے دیکھا کہ روشنی کے چہرے پر تاریک سایہ سالہرا گیا۔

”ماما میں احمد صاحب سے شادی کر رہی ہو۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو؟“ آج بڑے دنوں بعد وہ دونوں خوشگوار ماحول میں بیٹھی تھیں کہ روشنی کے

اس انکشاف سے وہ دھک سے رہ گئی۔“

”نہیں روشنی یہ نہیں ہو سکتا۔ تم کو پتا ہے کہ احمد صاحب عمر میں تم سے دس پندرہ سال بڑے

ہوں گے۔“



دس پندرہ سال بڑا ہونا بری بات تو نہیں۔

”تو کیا وہ اتنا عرصہ تمہارے لیے بیٹھا ہوگا۔ وہ بال بچے دار ہوگا۔“

”تمہیں ماما میں نے پوری انکوائری کر لی ہے۔ احمد بڑے اچھے ہیں۔“

”روشنی! میں تمہاری شادی اپنی مرضی سے کروں گی۔“

”نہیں ماما میں اپنی خواہشوں کو پورا ہوتے دیکھ رہی ہوں۔ احمد صاحب بہت امیر آدمی ہیں۔

ویسے بھی مجھے آج کل کے لڑکے امپریس نہیں کرتے۔ میں اپنی ساری لائف اپنی خواہشوں کے پورا

ہونے کے انتظار میں نہیں گزار سکتی۔ مجھے پوری دنیا گھومنی ہے۔ یورپ، پیرس، لندن کی رنگین شاہیں

دیکھنی ہیں۔ ماما میں شادی کروں گی تو احمد صاحب کے ساتھ۔ وہ مجھے ساری خوشیاں دے سکتے ہیں، جن

کا میں پسند دیکھتی آئی ہوں۔“

وہ اتنا کہہ کر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر جو ریہ وہیں بیٹھی رہ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا

اب مکافات عمل شروع ہوا ہے۔ جو سزا میں ساری زندگی کاٹی رہی ہوں وہ کیا تھی۔ اس کا جواب اس

کے پاس بھی نہیں تھا۔

Mr. Sadia Sethi,

240 Loughbrough Road, Nottingham, NG2 7EE, UK.

0305 6406067

PDF Book Company



یہ مختصر حیات کم نہیں ہے  
ہر حال میں آدمی رہا ہوں (صبا اکبر آبادی)

سلطان جمیل نسیم  
یکم نومبر ۲۰۰۱ء



## سلطان جمیل نسیم

کراچی، پاکستان

اردو ادب میں محترم سلطان جمیل نسیم کا جو مقام ہے اس کا تقاضا تھا کہ ان کا تذکرہ ”گفتنی حصہ اول“ میں شامل ہو جاتا۔ مگر میرے بہت سے دیگر محترم ادیبوں کی شمولیت اس لئے ممکن نہ ہو سکی کہ وقت بھی کم تھا اور کتاب مذکور کی ضخامت بھی مانع آرہی تھی۔ چنانچہ ”گفتنی حصہ دوم“ کی اشاعت کا فیصلہ تب ہی کر لیا کہ میں اس شرم ساری کے دل گرفتہ احساس سے نکل سکوں اور ان بٹار ادیبوں کی محنت کے ذکر کو اور اردو سے ان کی محبت اور شیفتگی کے نرم و گرم جذبات کے نقوش حسن کو قید نوشتہ کر کے قارئین اردو تک پہنچا سکوں۔

مشہور افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم بھی ان ہی میں سے ہیں جنہوں نے تاخیر سے سوال نامہ ملنے کے باوجود مجھ سے تعاون فرمایا۔ گفتنی حصہ دوم کا سوال نامہ انہیں محترم طاہر سلطانی نے پہنچایا، مگر سلطان جمیل نسیم صاحب امیگریشن (Emigration) پر کنیڈا جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ انہیں ترک وطن کر کے کنیڈا جانے میں اس لئے تاہل یوں نہ تھا کہ بقول ان کے کنیڈا منتقل ہونے میں پاکستان کی محبت اور شہریت میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ کنیڈا کے قانون کے مطابق آپ چاہیں تو دہری شہریت کے حامل بن سکتے ہیں جب کہ امریکی شہریت اختیار کرنے والوں کو یہ سہولت میسر نہیں۔



مجھے جب علم ہوا کہ سلطان جمیل نسیم کنینڈا منتقل ہو چکے ہیں تو میں نے محترم اکرام بریلوی (مقیم کنینڈا) کو فون کر کے سلطان جمیل صاحب کا نمبر لیا اور ان سے رابطہ کیا۔ ان سے گفتنی کے سوال نامے کے جوابات موصول ہوئے مگر تصویر نداشت۔ میں نے پھر ٹیلی فون کیا تو موصوف سو رہے تھے۔ پھر فون کے جواب میں ان کا خط ملا۔ خط بھی ایک افسانہ خود میں سمجھ رہا تھا اور پھر صبا اکبر آبادی صاحب کا شعر جو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کے لائق ہے۔ خط ملاحظہ ہو:

سلطانہ ادب محترمہ سلطانہ مہر

آداب و تسلیم۔ میں نے آپ کو خط لکھا آپ کی خواہش کے احترام میں آپ کے سوالات کے جوابات لکھے اور آپ نے ٹیلی فون کیا۔ دیکھئے میں 'ہوائی باتوں پر یقین نہیں رکھتا ہوں اس لئے جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ بزبان قلم کہہ دیتا ہوں۔

ایک تو وقت کا بڑا چکر ہے۔ یہاں کچھ اور وقت ہے تو آپ کی شہر کی گھڑیاں کچھ اور بتا رہی ہیں۔ نتیجہ، آپ کا فون آیا۔ میں سو رہا تھا۔ معلوم نہیں بیٹے نے اٹھایا یا بونے آپ کی بات سنی۔ صبح اخبار کے ایک کونے پر آپ کا فون نمبر..... اس کے بعد..... لفظ تصویر لکھا ہوا ملا۔

لکھئے، تصویر حاضر ہے۔

جب کوئی بات دیدنی ہی نہیں تم نے دیکھا ہمیں تو کب دیکھا (صبا اکبر آبادی) نئی کتاب "میں آئینہ ہوں" بھی آپ کی نذر ہے۔ اب جو سلوک چاہے کچھ لکھئے۔

اب جو گزرے یا مقدر یا نصیب

۴ / دسمبر ۲۰۰۵ء مخلص، سلطان جمیل نسیم

پ۔ ن: دس دن پہلے سیدھی سطر میں لکھی تھیں اور بھول گیا۔ بھول کی معذرت۔ عید کی مبارک باد اور نئے سال کی تہنیت قبول فرمائیے اور اگر رسید میں چند سطر بھیج دیں تو عنایت۔ س ج ن

سلطان جمیل نسیم مشہور شاعر صبا اکبر آبادی کے بیٹے ہیں مگر شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں، کیوں؟ یہ وہ خود بتائیں گے۔ میرا پہلا سوال تھا، "سلطان صاحب اپنے بارے میں بتائیے کہ....." وہ درمیان میں بولے، "جی خاتون، مجھے علم ہے کہ آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ میرا پورا نام خواجہ سلطان جمیل ہے اور نسیم تخلص۔ تاریخ پیدائش ۱۴ / اگست ۱۹۳۵ء (آگرہ، یوپی، بھارت)۔ والد محترم کا اسم گرامی خواجہ محمد امیر صبا اکبر آبادی۔ بارہویں واسطے سے جد اعلیٰ کا نام خواجہ بہا الدین نقشبند سے ملتا ہے یعنی جو لوگ نقشبندی سلسلے میں بیعت ہیں وہ ہمارے خاندان کے مرید ہیں۔ مرزا غالب کی نضیال سے بھی رشتہ ملتا ہے۔ بہر حال بارہ سال کی عمر اور پانچویں جماعت (سینٹ جونز ہائی اسکول، آگرہ) میں تھا، جب ۱۷ / ستمبر ۱۹۴۷ء کو والدین کے ساتھ کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ سندھ مدرستہ الاسلام، کراچی میں ایک سال پڑھنے کے بعد حیدرآباد سندھ منتقل ہو گیا جہاں غلام حسین ہدایت اللہ ہائی اسکول سے نویں جماعت پاس کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں میٹرک کیا۔ اُس کے بعد ٹیلی فون



ڈیپارٹمنٹ، کلیمز (سیٹلمنٹ) ڈیپارٹمنٹ اور ریڈیو پاکستان، حیدرآباد میں کام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں یو بی ایل (UBL) میں ملازمت مل گئی۔ یوں اندرون سندھ کے کئی چھوٹے بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ۶/ دسمبر ۱۹۶۳ء کو شادی ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں کراچی تبادلہ ہو گیا جہاں جوڈیا بازار، صرافہ بازار اور کھارادر جیسی بڑی برانچوں میں فیجر رہا۔ ۱۹۷۲ء میں انٹر، ۱۹۷۴ء میں بی اے اور ۱۹۸۰ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔

۱۹۸۰ء میں تھائی لینڈ، ۱۹۸۲ء میں سنگاپور، ملیشیا، انڈونیشیا کا مختصر دورہ کیا۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۳ء میں انگلستان، مصر گیا۔ ۱۹۹۹ء میں کنیڈا اور امریکہ گھوما۔ اب کنیڈا کی شہریت بھی رکھتا ہوں۔ ۱۹۹۵ء میں یو بی ایل سے نائب صدر کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں پہلا عمرہ کیا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں دوسرا عمرہ اور ۱۹۹۶ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔

اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ جو کچھ سلطان جمیل نسیم نے بتایا اس حوالے سے ان کے حوصلے اور ان کی جدوجہد قابل تحسین ہے کہ وہ شادی کے بعد ملازمت کے ساتھ تعلیم کے حصول میں بھی مصروف رہے اور اعلیٰ تعلیم کی منزل تک جا پہنچے۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے اور ریڈیو پر نشر ہونے والے سات ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ افسانوں کے مجموعوں کے نام اور ان کے سنیں اشاعت یہ ہیں: ”کھویا ہوا آدمی“ ۱۹۸۵ء میں؛ ”سایہ سایہ دھوپ“ ۱۹۸۹ء میں؛ ”ایک شام کا قصہ“ ۲۰۰۰ء میں اور ”میں آئینہ ہوں“ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئے۔ ریڈیائی ڈراموں کے مجموعہ کا نام ”جنگل زمین خوشبو“ ہے۔

”آپ نے افسانے لکھنا کب شروع کیے؟“

سلطان جمیل نسیم کہنے لگے، ”ادب خون کی گردش میں شامل ہے۔ ۱۹۵۰ء میں شعر کہنا اور افسانہ لکھنا شروع کیا تھا۔ شاعری کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ اگر غزل گوئی کو فن ٹھہراؤں گا تو حبیب جالب سے آگے نہ جاسکوں گا اور نظم نگاری پر توجہ دی تو منیر نیازی بن کر رہ جاؤں گا۔ اس لئے تیسرے درجے کے شعرا میں آن پھنسوں تو شعر سنا دیتا ہوں ورنہ اصل اور اپنا کام افسانہ نگاری ہے۔ ۱۹۵۳ء میں پہلا افسانہ شائع ہوا۔“

سلطان جمیل نسیم کی گفتگو بھی ان کے نام کی طرح شگفتہ اور دل نواز ہے۔ دوران گفتگو ذکر آیا ادیبوں کی گروہ بندی کا، کہ اس سے اردو ادب اور زبان کی ترویج کو نقصان پہنچتا ہے۔ مگر سلطان جمیل کی فکر مختلف ہے۔ وہ کہنے لگے، ”معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ میں اس بات سے بالکل متفق نہیں ہوں کہ ادیبوں کی گروپ بندی نے اردو ادب و زبان کو نقصان پہنچایا ہے۔ جو لکھنے والا خیال، بیان اور زبان کے بارے میں سنجیدہ رہا اُسے دیر سے سہمی اس کا مقابلہ کیا۔ گروپ بندی کے ماتحت جس کو بھی بانس پر چڑھایا گیا وہ دس پندرہ سال میں منہ کے بل زمین پر آن گرا۔ ادب کی تاریخ میں بہت سے حوالے مل جائیں گے۔ اور آپ کے اگلے سوال کے جواب میں یہ بھی کہ زمین کے کسی بھی حصے میں، میں



نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اردو ادب کو اپنا کر کسی بھی اعتبار سے خسارے میں رہا ہوں۔ لیکن میری نیگم مجھ سے متفق نہیں ہیں کم از کم مالی اعتبار سے۔“

سلطان جمیل اس نقطہ نظر سے بھی اتفاق نہیں رکھتے کہ اردو زبان کا مستقبل کوئی بہت خوش آئند نہیں۔ ان کا کہنا ہے، ”اگر زبان میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں ہے تو ہر تجویز بیکار ہے ورنہ جب تک امام حسین کی مجالس برپا ہو رہی ہیں عزائیہ شاعری کے ساتھ ذاکری زندہ ہے۔ زبان کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ آج کل سارا مباحثہ رسم الخط کے حوالے سے ہو رہا ہے۔ رسم الخط بھی بظاہر سوچاں سال تک موجودہ صورت میں قائم رہے گا۔ میں جس رسم الخط میں افسانے لکھ رہا ہوں فی الحال اس کے بدلنے کا حامی نہیں ہوں۔ آئیل مجھے مار..... کیوں؟“

اور اگلے سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے، ”میں ہر اس لکھنے والے کو پسند کرتا ہوں جس کی تحریر سے روشنی کی ایک کرن بھی ذہن میں منتقل ہو جائے۔ اور.....“ وہ لمحے بھر کو چپ رہے اور پھر کہنے لگے، ”میری زندگی کا سب سے یادگار..... اگر یادگار سے آپ کی مراد کبھی نہ بھولنے والا واقعہ ہے..... تو وہ تین تاریخوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ۲۸/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کی دوپہر سے ۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کی رات تک، میرے والد حضرت صبا اکبر آبادی اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں بلڈ پریشر چیک کرانے لے لئے میرے بھائی شجاع عالم کے ساتھ خود چل کر گئے، اور ۳۰/ اکتوبر کو اپنے چار بیٹوں کے کاندھوں پر واپس آئے۔“

سلطان جمیل نسیم اب بھی چاق و چوبند ہیں۔ کہانیاں آتی ہیں اور ان کے سامنے زنانوے ادب تہہ کرتی ہیں، سر جھکا کر دست بستہ گزارش گزار ہوتی ہیں کہ ہم پر ”قلم شفقت“ رکھو۔ چناں چہ کہانیاں تخلیق ہوتی ہیں، جرائد کی زینت بنتی ہیں اور کیا عجب کہ ان کے افسانوں کا پانچواں مجموعہ اس تذکرے کی اشاعت تک پایہ تکمیل کو پہنچا ہوا ہو۔

Mr. Sultan Jamil Nasim,

A-49, Block 3, Gulshan-e-Iqbal, Karachi, 75300, Pakistan

OR,

# 315, 10 Willowridge Rd., Etobicoke, ON, M9R 3Y8, Canada



یا محمد با محمد ہر سار  
اسکی سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں

سلطان محمود

3/10/03



سلطان محمود

برصغیر، برطانیہ

”قلم کے ذریعے اظہار، ادب میں ہو یا صحافت میں، دونوں میدانوں کے شہسوار سچائی کے اظہار کو اپنا شیوہ سمجھتے ہیں۔ خبر یا مواد کی تلاش ادیب و صحافی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ صحافی کے لیے یہ آسانی ہے کہ خبر یا واقعہ اس کی دسترس میں آتے ہی رقم ہو جاتا ہے لیکن ادیب جب تک تخیل کی اس منزل میں آمیزش نہ کرے اور مخصوص صنف ادب کی فنی اسلوبیاتی اور فکری اقدار یا اصولوں کا لحاظ نہ کرے اس وقت تک فن پارہ وجود میں نہیں آ سکتا۔“

ان خیالات کو قلم بند کیا ہے ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے جو ان کے مضمون ”ادب اور صحافت... قربتیں اور فاصلے“ مطبوعہ روزنامہ جنگ ۹ ستمبر ۲۰۰۲ء کا ایک اقتباس ہے۔ ڈاکٹر ممتاز صاحب کا یہ مضمون اپنی جگہ خود ایک بصیرت افروز ہے۔ اسی طرح محترم صحافی اور ادیب سلطان محمود کی کتاب ”شنا سا چہرے“ جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی ہے ایک اہم کتاب ہے۔

کتاب کی فہرست پر نظر ڈالنے پر موضوعات کے لحاظ سے یہ کتاب صحافتی کالم، خودنوشت، خاکے اور مختصر افسانوں کے ایک مجموعے کے ضمن میں آتی ہے۔ اس کتاب کی تمام کہانیاں یا مضامین تخیلی نہیں ہیں بلکہ انھیں ”وارداتی مضامین“ کہنا چاہیے کہ جو واقعات مصنف پر گزرے یا جن سے مصنف



دو چار ہوئے اسے انہوں نے سیدھے سادے اور کھرے انداز میں قلم بند کر دیا۔ ان میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ ہم اور آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں کہ ہر دوسرے قدم پر ایک انسان کس طرح دھوکا دیتا ہے اور جعلی کارناموں کی جب قلعی کھلتی ہے تو کیسی پسپائی منتظر ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ... ان کالموں یا مضامین میں جہاں پاکستانی معاشرے کے اور ہمارے سیاستدانوں کے کارنامے سامنے آتے ہیں وہاں برطانوی اور یورپین معاشرے کی خرابیاں بھی منظر عام پر آتی ہیں لیکن ہمارے معاشرے کے مقابلے میں یہاں انصاف اور قانون کی جس طرح پاسداری کی جاتی ہے ان واقعات کو پڑھ کر ہمیں اسلام کا اولین دور یاد آ جاتا ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی صفحے پر برہنگم کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور محترم عاشور کالمی نے ان اشعار میں جناب سلطان محمود کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ایک بشر خدمت انسان ہے جس کا مقصود پیکر عجز ہے، بیگانہ ہر نام و نمود  
دوستوں کے لیے سورج کی نسیا، جس کا وجود جیسے برکھا کی پون، جیسے بہاروں کی نمود  
اک صحافی جو صداقت کا چلن رکھتا ہے نام سلطان ہے، افکار ہیں اس کے محمود

سلطان محمود کی ایک کتاب ”باقی سب خیریت ہے“ ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ بھی ان کے کالموں کا مجموعہ ہے مگر یہ بھی صحافتی کالم سے زیادہ انشائیے یا خاکے کا روپ لیے ہوئے ہیں۔ صحافت کے ضمن میں ان کی پہلی کتاب ”برطانیہ میں اردو صحافت“ ہے جو اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بلاشبہ برطانیہ میں پاکستانیوں کی آمد اور اردو اخبار کی ضرورت کے عنوان کے تحت یورپ میں اردو اخبارات کے مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔

”پرایا دیس اور اپنے لوگ“ اور ”ایک حقیقت ایک افسانہ“ کے عنوان سے ان کی مزید دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلطان محمود ۱۶ ستمبر ۱۹۵۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ان کے بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔ چنانچہ یہ اپنی بہن کے پاس دلی چلے گئے۔ پرائمری تعلیم وہیں دہلی میں حاصل کی۔ ۳۶ء میں یہ واپس لاہور آ گئے اور بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ کالج میں ”بزم ارباب علم“ کے جنرل سیکریٹری رہے۔ اس بزم کے صدر جناب علامہ علاؤ الدین صدیقی تھے جو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ انہوں نے کالج کے ہونہار طالب علموں میں سلطان محمود کا شمار کیا تھا۔

لندن آ کر انہوں نے باقاعدہ خود کو صحافت سے وابستہ کر لیا اور ”مشرق“ سے اس کا آغاز کیا۔ اب وہ ”نوائے وقت“ گروپ آف نیوز پیپرز کے پورے یورپ میں بیورو چیف اور کالمسٹ ہیں۔ اس کے باوجود خود کو انکساری میں ان معمولی رپورٹروں کی فہرست میں گروانے ہیں جن کا شوق درست نہیں۔ حالانکہ خود ۵ کتابوں کے مصنف ہیں۔

اپنی کتاب ”برطانیہ میں اردو صحافت“ میں انہوں نے لکھا ہے۔



”میں تحریر و تحقیق کی دنیا میں ایک اخباری رپورٹر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور اتنے سال گزرنے کے بعد آج بھی میں صرف ایک رپورٹر ہی ہوں۔ میں نہ کوئی ادیب ہوں اور نہ شاعر، نہ صاحب طرز نثر نگار، نہ داستان طراز، صرف خبریں لکھنا ہی میرا کل تجربہ ہے اور اس میدان میں بھی مجھے بہت کچھ دیکھنا اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔“

خبروں کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے اور اگر یہی زبان کتاب نویسی کے لیے بھی استعمال کی جائے تو غلطیوں کا امکان بہر حال موجود رہتا ہے۔ میں کتاب کی زبان سے غیر آشنا ٹھہرا اور اسی زبان میں اس کتاب کو تحریر کرنے پر مجبور ہوں جو مجھے آتی ہے۔ لہذا آپ کو میری غلطیوں کو بھی برداشت کرنا پڑے گا اور میرے انداز تحریر کو بھی۔ البتہ ایک بات کی میں آپ سے داد ضرور چاہوں گا کہ میں نے ایک اہم منصوبے کی بنیاد رکھ دی ہے اور اس پر جیسا تیسرا مواد بھی دستاویزی طور پر فراہم کر دیا ہے۔ آگے اہل دانش، اہل نظر اور اہل قلم لوگوں کا کام ہے کہ اپنی ذات اور اپنے روشن مستقبل سے پل بھر کو بے نیاز ہو کر اس اہم موضوع کی طرف بھی توجہ دیں۔“

سلطان صاحب کی اس کتاب کو پنجاب یونیورسٹی کے طلباء، حوالہ جاتی کتاب کے طور پر پڑھتے ہیں۔ مشہور اسکالر اور دانش ور ڈاکٹر خالد علوی ان کی کتب کو ”مثبت قومی خدمت“ قرار دیتے ہیں۔ ان کی کتاب ”باقی سب خیریت ہے“ عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ اسے پڑھ کر ایک حوالدار امتیاز علی نے خط کے ذریعے ان سے فرمائش کی کہ وہ ایسی ہی ایک اور تصنیف منظر عالم پر لائیں۔ سلطان محمود نے اس وطن کے نگہبان سپاہی کی خواہش کے احترام میں یہ کتاب مرتب کی۔ یوں انھوں نے ادب اور صحافت دونوں میدانوں میں خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر مختار احمد خان اپنے اسی مضمون ”ادب اور صحافت... قربتیں اور فاصلے“ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ اچھا ادب اپنے پڑھنے والے پر یہ تاثر واضح کرتا ہے کہ اس سے کچھ نہ کچھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ ادب انسان کو بدل بھی سکتا ہے۔ ادب قارئین کو بڑے کرب سے بھی گزارتا ہے۔ صرف محفوظ ہی نہیں کرتا۔ ادب میں بے انصافی، استحصال، طبقاتی تضادات، ظلم، رشتوں کی شکستگی، خوف و جبر، مفلسی، معاشرتی عدم توازن، جیسے موضوعات کا احاطہ اگر قارئین کو ادا کرتا ہے تو حالات کی بہتری کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ خدا کی بستی اور جانگلوں میں شوکت صدیقی جیسے ناول نگار نے شہری اور دیہی معاشرتوں کی حقیقت پسندانہ عکاسی کر کے جرائم پیشہ افراد کی نقاب کشائی کی ہے۔ یہی کام انگلینڈ میں چارلس ڈکسن نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ صحافت بھی یہی کردار انجام دیتی ہے۔ وہ برائیوں کے خاتمے کے لیے اپنے طور پر خبروں اور مضامین کے ذریعے احساس جنگاتی ہے اور حکومتوں کو اصلاح احوال کے لیے آمادہ کرتی ہے اور دوسری طرف عوام الناس میں ایک خاص نکتہ نظر کو ابھارنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ جس طرح ادیب پورا سچ بیان کرنے میں علامتوں، استعاروں، ایمانیات اور تمثیل سے کام لیتا ہے اسی طرح صحافی بھی اپنا کام کرتا ہے مگر اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ صحافت کا ایک بڑا احسان



یہ ہے کہ اس نے اپنی کھڑکیاں ادب کے لیے کھول دی ہیں۔“

سلطان محمود کی ساری تنگ و دو اور جدوجہد مندرجہ بالا تحریر کی آئینہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں ”جب تک اردو اخبارات زندہ ہیں اردو بھی زندہ و تابندہ رہے گی۔“

سلطان محمود صاحب کی کتاب ”شنا سا چہرے“ میں سارے مضامین یا کالم سچے واقعات اور ان کے اپنے تجربات سے بھرے پڑے ہیں۔

اب درج ذیل واقعہ پڑھ لیں اور موازنہ کریں کہ ہم مسلمان اپنی اسلامی و دینی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر کس طرح پستی میں رہ رہے ہیں جبکہ انہی تعلیمات کو غیر مسلموں نے اپنا کرا قوام عالم میں خود کو با عزت و ممتاز بنا رکھا ہے۔ یہ سب ترقی یافتہ ممالک اور ترقی یافتہ اقوام میں گئے جاتے ہیں اور ہم...؟

اس سوالیہ نشان کا جواب درج ذیل واقعے میں ہے جسے سلطان محمود نے ”شنا سا چہرے“ میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں... ”مرکزی لندن میں واقع پیڈنگٹن پولیس اسٹیشن میں ایک شخص ایک سولہ سالہ لڑکے کا بازو تھامے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ اس شخص نے نہایت قیمتی اسمارٹ قسم کا سوٹ زیب تن کر رکھا ہے۔ ڈھلتی جوانی کے اس شخص کی چال ڈھال میں ایک وقار ہے۔ اس کے طرز عمل میں دلآویزی ہے۔ اس کے طرز خطاب میں حلاوت ہے۔ یہ انسانی محاسن اس امر کے عکاس ہیں کہ یہ شخص کوئی ایرانگیر نہیں ہے۔ جونہی یہ باوقار اور دبدبہ والا شخص اس ۱۶ سالہ لڑکے کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے اندر داخل ہوتا ہے تو ڈیوٹی آفیسر (محرر) کو اسے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی اور وہ احتراماً کھڑا ہوتا ہی چاہتا ہے کہ وہ محرر کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی نشست پر بیٹھے رہنے کا عندیہ دیتا ہے۔ اس شخص کی یوں اچانک تھانے میں آمد سے اٹھل پٹھل پیدا ہو جاتی ہے اور پولیس افسران ششدر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت تھانے کا انچارج انسپکٹر ابن تھامس آگے بڑھ کر لجاجت آمیز لہجے میں گویا ہوتا ہے

”سر! آپ نے خود تھانے آنے کی زحمت کیوں اٹھائی ہے۔ خیریت تو ہے نا!!“

”میں اس وقت کوئی سر نہیں ہوں“ وہ تاسف بھری آواز میں جواب دیتا ہے۔

”مجھے آپ لوگوں سے کام تھا۔ لہذا مجھے خود چل کر آپ کے پاس دوسرے لوگوں کی طرح ہی

آنا چاہیے تھا۔ یہ لڑکا جو میرے ساتھ ہے۔ یہ خطا کار ہے۔ قانون کا مجرم ہے۔ ایک مجرم کو قانون کے حوالے کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔ میں نے اپنا یہ شہری فرض نبھایا ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ آپ قانونی تقاضے پورے کریں، میں اجازت چاہتا ہوں۔ گڈ بائی...“

برطانوی قانون کے مطابق پیڈنگٹن پولیس اسٹیشن کے ڈیوٹی سارجنٹ نے ملزم سے پوچھ گچھ

کرنے کے لیے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ اس لڑکے کا نام ولیم (William) ہے جو لندن کے ایک نواحی پرائیویٹ بورڈنگ اسکول میں زیر تعلیم ہے۔ انتہائی ذہین اور لائق طالب علم ہے۔ اس کے متعلق اس کے اساتذہ کی پیشین گوئی ہے کہ وہ عملی زندگی میں بڑا نام اور دام پائے گا۔ اس کی ذہانت و فراست کا



آپ یوں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابھی اس نے اسے لیول کا امتحان بھی نہیں دیا کہ دنیا بھر کی مشہور کیمبرج یونیورسٹی نے اس کی غیر معمولی تعلیمی کارکردگی کے پیش نظر اسے اسکالرشپ کے ساتھ داخلہ دینے کی پیشکش کر رکھی ہے۔ برطانوی یونیورسٹیاں اس قسم کی پیشکش شاذ و نادر ہی کرتی ہیں۔ یہ استحقاق اور خوش نصیبی ایسے طلباء کے حصے میں آئی ہے۔ جن کے بارے میں تعلیمی حکام کو یقین ہوتا ہے کہ وہ آگے چل کر تعلیمی میدان میں بڑے غضب ڈھائیں گے۔ اس قسم کی یونیورسٹی پیشکشوں کے پس پردہ سفارش کا جھرو ہوتا ہے اور نہ ہی کسی طالب علم کے اعلیٰ خاندانی پس منظر کا شاخسانہ۔ یہ کلیٹا میرٹ کا عمل ہوتا ہے۔ ولیم برے کردار کا لڑکا نہیں ہے۔ بس ذرا سانشنی باز ہے اسے اپنی دھاک جمانے کا شوق ہے۔ اس سال ۱۹۹۹ء مئی کے مہینے میں اس کے تین کا اس فیلوز نے اسے کہا کہ اگر تم واقعی ”اوپنچی چیز“ ہو تو اسکول ہوسٹل میں ہفتہ کی رات کو جمنے والی دوستوں کی محفل کے لیے تھوڑی سی چرس کا بندوبست کر کے دکھاؤ۔ اپنی سنجی پسند عادت سے مجبور ہو کر اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور نہ جانے اس نے کیسے اور کہاں سے تھوڑی سی چرس کا واقعی انتظام کر دیا اس کے کسی بدخواہ نے برطانیہ کے ایک مقبول قومی اخبار ”ڈیلی مرر“ کو یہ اطلاع دی کہ فلاں فلاں بڑے باپ کا بیٹا ولیم چرس کا دھندہ کرتا ہے۔ چنانچہ اخبار مذکورہ کے رپورٹرز اس کے پیچھے لگ گئے۔ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی جو بحیثیت ٹریننگ رپورٹر ڈیلی مرر سے وابستہ تھی۔ اس نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ ولیم اس کا دوست بن گیا۔ ایک دن یہ رپورٹر لڑکی اس سے کہنے لگی کہ میں کبھی کبھار تفریح طبع کے لیے چرس کا ایک ”آدھ“ ”سوٹا“ لگا لیتی ہوں۔ ولیم کہنے لگا کہ میں ابھی تمہیں چرس مہیا کر سکتا ہوں۔ میری ایسے لوگوں سے دوستی ہے جو منشیات کا دھندہ کرتے ہیں لیکن اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لڑکی نے اسے بیس پونڈ دیے اور وہ اس رقم سے چرس خرید لایا۔ جب وہ اس خاتون رپورٹر کی ہتھیلی پر چرس کی پڑیا رکھ رہا تھا تو ڈیلی مرر کے فوٹو گرافر نے خفیہ طریقے سے اس کی تصویر اتار لی۔ یہ لڑکی ولیم کے ساتھ چرس کے موضوع پر ہونے والی تمام گفتگو پہلے ہی اپنی جیب میں چھپے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کر چکی تھی۔ بعد ازاں اس نے یہ سارے ثبوت اپنے ایڈیٹر کے سامنے رکھ دیے۔ مرر کے ایڈیٹر نے لڑکے یعنی ولیم کے باپ کو ٹیلی فون کر کے سب کچھ بتا دیا اور وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اسی وقت ولیم کے اسکول گیا۔ اسے کار میں بٹھایا اور پیڈ گئٹن پولیس اسٹیشن لا کر قانون کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود واپس اپنے دفتر چلا گیا۔

اب آپ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ اس لڑکے کا والد کون ہے؟ تو ذرا دل تھام کر سنئے کہ ان کا نام رائٹ آنریبل جیک اسٹرا ہے۔ جو برطانیہ کے وزیر داخلہ اور دنیا کے چند زیرک سیاست دانوں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں وزیراعظم اور وزیر خزانہ کے بعد سب سے اہم اور کلیدی عہدہ وزیر داخلہ کا ہی ہے۔ ملک بھر کی پولیس، جیل خانہ جات، قانون نافذ کرنے والے تمام ادارے اور خفیہ ایجنسیاں وزیر داخلہ کے ماتحت ہیں۔ اپنے بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں پولیس کے حوالے کرنے کے بعد مسٹر جیک اسٹرا نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک قیمتی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا



”اگر میرے اپنے بچے قانون شکنی کی کالک اپنے منہ پر ملیں گے تو میں دوسرے لوگوں کو کس منہ سے قانون کے احترام کا سبق دے سکتا ہوں۔ کسی بھی شخص کو قانون سے بالاتر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ چاہے میں خود ہوں یا میرا بیٹا۔“

اب ذرا ایمانداری سے آپ بتائیں کہ کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسی مثال ہے کہ کسی جنرل، کرنل، وزیر، سفیر، سیکرٹری یا پولر رکن پارلیمنٹ نے اپنے خطا کار بیٹے کو قانونی تقاضے پورے کرنے کے مقصد سے خود اپنے ہاتھوں جیک اسٹرا کی طرح پولیس کے حوالے کیا ہو؟ کیا ہمارے معاشرے میں ایک ٹریفک سارجنٹ (برطانیہ میں ٹریفک سارجنٹ کو ٹریفک واڈر کہتے ہیں) کو اتنی ہمت اور جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ وزیر داخلہ کو کرخت لہجے میں یہ حکم دے کہ ”بڑے میاں! یہاں گاڑی کھڑی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے فوراً یہاں سے ہٹاؤ ورنہ میں تمہارا چالان کر دوں گا۔“

برطانوی وزیر داخلہ مسٹر جیک اسٹرا نے اپنے ملکی قانون کے احترام کی جو قابل رشک مثال قائم کی، ہماری قومی تاریخ ابھی تک تو ایسی خوش آئند مثالوں سے غیر آشنا ہے۔“

سلطان محمود صاحب نے ایسے کئی اور حیرتناک اور عبرتناک واقعات اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ انھوں نے برطانوی معاشرے کی خرابیوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ سلطان محمود گفتگو کی طرح اپنی تحریروں میں بھی دیانتدار اور کھرے ہیں۔

Mr. Sultan Mahmood  
78, OakField Road.  
Sally Park. B29- 7EG. UK.





زندگی کیا ہے عذاب میں طہر و تربیت  
موت کیا ہے انہی اعزاء کا پریشان ہونا

۶۲/۱۱

## پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

حیدرآباد، دکن، ہندوستان

ہمارے ایک ادیب، شاعر اور دانشور سلیم احمد مرحوم نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا.....  
”ادیب بننے کی تمنا اور افسر بننے کی تمنا اور کوٹھی اور کار کی تمنا اور بینک بیلنس کی تمنا اور سب سے خوش گوار  
تعلقات بھی رکھنے کی تمنا کو ایک سینے میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔ ان رویوں سے ایک ادیب سماجی آدمی بھلے  
ہی بن جائے مگر وہ ویسا ادیب نہیں ہو سکتا جیسا وہ ان چیزوں کے بغیر ہو سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ خوش  
حال ہونا علیحدہ بات ہے مگر ان تمناؤں کا غلام ہو کر کوئی بڑا ادیب نہیں بن سکتا۔“

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سے ملیئے، ان کے بارے میں پڑھیے تو اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے  
کہ انہیں ان کی زندگی میں جتنے منصب تفویض ہوئے وہ جنوبی ہند کے اردو کے کسی پروفیسر کو نہیں ملے۔  
وہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، قومی کونسل برائے ترقی اردو بیورو، بھارتیہ گیان پیٹھ، اردو اکادمی، جامعہ اردو،  
حیدرآباد یونیورسٹی اور مولانا آزاد یونیورسٹی کی مہمان پروفیسری اعزازات وغیرہ سے سیراب ہیں۔ اپنے  
عہدوں سے انہوں نے ذاتی فائدہ اٹھانے کے بجائے زبان و ادب کی خدمت کو ترجیح دی اور اعزازات  
کے تیز دھاروں نے ان کے قلم اور فکر کو کبھی کند نہیں کیا۔ ان کا نقطہ نظر ہمیشہ یہ ہی رہا کہ عہدوں اور  
اعزازات کا حصول کبھی مقصد حیات نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کا مقام بالآخر اس کی فکر و نظر کے دین سے



متعین ہوتا ہے جوڑ توڑ کے ہنر سے نہیں۔

جو پروفیسر سلیمان اطہر کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں۔  
میں پروفیسر صاحب کا تعارف پیش کرنے سے پہلے ضروری سمجھتی ہوں کہ پروفیسر من سعید کی رائے کا  
کچھ حصہ یہاں پیش کروں (۱)۔

پروفیسر من سعید پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں..... "جاوید صاحب  
کی شخصیت میں ایک خاموش، نرم رو، مگر پر تین کوئی کیفیت ہے جو پہلی ہی ملاقات میں ملنے والے کو ان کے ساتھ  
پیوست کر دیتی ہے۔ ان کا گرفتار، ان کے سحر سے آزاد ہونے کی کبھی تمنا بھی نہیں کرتا بلکہ اس گرفتاری الفت سے  
مخلوط ہونے لگتا ہے۔ وہ ایک ایسے محکم رشتے میں بندھ جاتا ہے جس میں وہ اپنوں سے زیادہ اپنے اور یگانوں  
سے کہیں زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں۔

وقت تغیر کا نقیب ہے۔ ہر گھڑی منقلب زمانے میں انسان نئی صورت حال کے مطابق خود کو ڈھالنے  
کی برابر کوشش کرتا ہے اور کبھی اس قدر ڈھل بھی جاتا ہے کہ اس کی اصلی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ لیکن جاوید  
صاحب کے بعض معاملات میں وقت ٹھہر گیا ہے، تعلقات کے، پاس و لحاظ کے معاملے میں، انکساری و خاکساری  
کے معاملے میں، اپنے بزرگوں اور کبھی کبھی اپنے خوروں کے احترام کے معاملے میں۔

جاوید صاحب یک رنگی کے قائل ہیں۔ وہ اس وضع داری کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ میسور  
(بحوالہ "لسانیات کا سالانہ گرمائی اسکول میسور یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء) کے پروگرام کے دوران میں ایک دو بار ان  
کا گھر آنا ہوا تھا۔ میری والدہ سے غالباً اس وقت عروض کے موضوع پر ان سے گفتگو ہوئی تھی۔ پھر جو ادب و  
احترام کا ایک رشتہ بن گیا تو وہ آخر وقت تک نباہتے رہے۔ مرحومہ کی کتاب "غزلیات غالب کا عروضی تجزیہ"  
شائع ہوئی تو اپنی بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ مجھے یاد ہے کہ والدہ کی وفات کے فوراً بعد بنگلور تشریف لائے تو پہلا  
اصرار یہ کیا کہ قبرستان چلیئے۔ میں ان کی قبر کی زیارت کر لوں اور فاتحہ پڑھ لوں تب ہی چین آئے گا۔ اور یہ ہی  
کیا اور کہا کہ اب قدرے سکون حاصل ہوا۔

تروپتی اور بنگلور کے کم فاصلے کی وجہ سے جاوید صاحب کا بنگلور اکثر آنا رہتا ہے۔ وہ یونیورسٹی کی  
میشننگس ہوں، ادبی جلسے ہوں، توسیعی لکچر ہوں، مذاکرے ہوں کچھ ہوں، دن تو مصروفیت میں گزرتا ہے اور  
شامیں ہمارے حلقے کے لئے مخصوص ہو جاتیں جس میں عزیز اللہ بیگ، واسطی، عبدالحفیظ اور کبھی کبھار امان اللہ  
شریک ہو جاتے۔ جاوید صاحب گودو باتوں کا نہایت شوق ہے۔ آوارہ گردی اور عیاشی؛ آوارہ گردی یعنی چلنا ان  
کی محبوب تفریح ہے۔ شام سے رات اور رات سے آدھی رات ہو جاتی مگر چل رہے ہیں۔ ادھر نکلے ادھر پہنچے اور  
ادھر پہنچے ادھر نکلے۔ کبھی لال باغ میں ہیں کبھی ودھان سودھان میں کبھی دفتر سالار میں کبھی اپنے ہوٹل پر۔ پھر ان کی  
گفتگو سے پچھلی چیزیاں برابر پھوٹ رہی ہیں۔ تازہ ادبی مسائل پر بحث جاری ہے۔ کسی ادبی رسالے کے تازہ

۱۔ "سلیمان اطہر جاوید..... منزل بہ منزل حیدر مسلسل کا نام" از پروفیسر من سعید، روزنامہ سیاست، حیدر آباد، دوشنبہ  
۷/ مئی ۱۹۷۰ء۔ یہ تعارفی مضمون لائق مطالعہ ہے سلطانہ مہر۔



مشمولات پر اظہار خیال ہو رہا ہے۔ جاوید صاحب کی آمد ایک ادبی مسیحا کی آمد سے کم نہیں ہوتی تھی۔ آوارہ گردی کا یہ سلسلہ میسور سے ہی شروع ہو گیا تھا جس میں شام کا صبح کرنا نہ سہی رات کرنا ضروری تھا۔ عیاشی کرنا ہم نے میسور میں جاوید صاحب ہی سے سیکھا۔ چلتے چلتے اپنا تک کہہ بیٹھتے، چلیے عیاشی کریں۔ کچھ ایسی مہنگی بھی نہیں تھی۔ دس پیسے فی پیالہ میں تھی۔ جتنی ملے، جہاں بھی ملے جس قدر ملے، چائے!

گراں سماعتوں کو سبک کر دینا جاوید صاحب کا وصف خاص ہے۔ کشیدہ سے کشیدہ ماحول کو وہ اپنی خوش گوار گفتگو اور حاضر جوابی سے کشادہ اور خنک کر دیتے ہیں۔ ایک واقعہ عرض کروں۔ گرمانی اسکول کے دوران، فیض احمد فیض ایک ادبی ورکشاپ کے سلسلے میں میسور آئے ہوئے تھے۔ فیض صاحب سے ہماری ملاقاتیں رہیں۔ ایک ممتاز شاعر بھی شہر میں تھے۔ فیض صاحب کو انہوں نے ناشتے پر مدعو کیا۔ ناشتے میں جاوید صاحب، کرتار سنگھ دگل اور یہ خاکسار بھی شریک تھے۔ فیض صاحب کی غیر متوقع ہم نشینی سے شاعر صاحب کچھ بے قابو ہو گئے تھے اور نہایت بلند آواز میں ان کی نظم 'آ جاؤ افریقہ دھمک کے ساتھ سنانے لگے۔ صورت حال نازک ہونے لگی تو دگل فیض صاحب کو نکال لے گئے اور ہم سب انہیں دروازے تک پہنچانے آئے۔ جاوید صاحب نے سہارا دے کر شاعر صاحب کو باہر نکال لیا اور کیمپس کی کشادہ سڑکوں پر ٹہلانے لگے۔ وہ بار بار بھڑک کر رک جاتے اور پوچھتے، 'آپ سمجھتے ہیں میں پیئے ہوئے ہوں اور جاوید صاحب مسکراتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی اور تحمل کے ساتھ جواب دیتے، 'کون کہتا ہے۔ آپ پیئے ہوئے ہیں۔ پیئے ہوئے تو میں ہوں۔' بہت دیر اس کا تصفیہ ہوتا رہا۔ جب ان کی حالت معمول پر آگئی تو انہیں گھر پہنچا آئے۔ اس وقت انہیں وہیں چھوڑ دینا ان کے گھر کے ناموس کو خطرے میں ڈالنے سے کم نہیں تھا۔ جاوید صاحب دراز قد ہیں لیکن اس وقت میں نے ان کا وہ قد دیکھا جو نگاہوں کے ادراک میں سما نہیں سکتا۔

تنقید جاوید صاحب کا اختصاصی میدان ہے۔ وہ کسی خاص نظریہ تنقید سے وابستہ نہ ہو کر بھی اپنے نقطہ نظر کے توازن، اعتدال اور معروضیت کے لئے ہر ایک سے تحسین وصول کر چکے ہیں۔ قمر رئیس کے الفاظ میں "پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی تجزیاتی تنقید میں ابتدائی سے نکتہ رسی، شرف مبنی اور اعتدال و توازن کا احساس ہوتا ہے اور بلاشبہ یہ ان کے انہماک، غور و فکر، وسیع مطالعہ اور محنت کا ثمرہ ہے۔"

جاوید صاحب ادبی تنقید کے عصری تقاضوں کے بارے میں بے حد حساس ہیں۔ "اردو ادب میں ابہام اور اس کے مسائل" اور "اردو شاعری میں اشاریت" اپنے عہد کی معرکتہ آرا کتابیں تھیں۔ تخلیقی ادب میں ابہام جس وقت فیشن کی حد تک بڑھ گیا تھا اس وقت اس دھند کو صاف کرنے میں جاوید صاحب کی ان کتابوں نے اہم کردار ادا کیا۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے بڑے جامع الفاظ میں جاوید صاحب کے تنقیدی موقف کو واضح کیا ہے۔ "اس کی تنقید کسی بھی 'ازم' کا شکار نہیں۔ اس کا ذوق بھی بہت گہرا اور متوازن ہے۔ وہ کانٹوں میں بھی پھول تلاش کر لیتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ پھول کتنے کانٹوں میں گھرا ہوا ہے۔" آئیے اب ان اے ملے ہیں۔ سلیمان اطہر جاوید ان کا نام ہے اور شخص جاوید ہے۔

۹/ اپریل ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو ادبیات میں پی ایچ ڈی



کی سند تفویض ہوئی۔ ۱۹۶۶ء سے سری ونکٹسوارا (Sri Venkateswara) یونیورسٹی، تروپتی میں رہے اور پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۹۶ء تا ۱۹۹۸ء تک مہمان پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی حیدرآباد میں تعینات رہے۔ ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۰ء تعلیمی مشیر کے عہدے پر مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد میں خدمات انجام دیں۔ ۲۰۰۱ء سے عثمانیہ یونیورسٹی میں مہمان استاد رہے ہیں۔ انہوں نے روزنامہ ”رہنمائے دکن“ حیدرآباد میں ”رفقار سیاست“ کا صفحہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک لکھا۔ روزنامہ ”منصف“ حیدرآباد میں انہوں نے بعنوان ”میرا مطالعہ“ کا کالم ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۷ء تک لکھا۔ اور ۲۰۰۰ء سے تاحال روزنامہ ”سیاست“ حیدرآباد میں ”ادبی ڈائری“ کے عنوان سے کالم لکھ رہے ہیں۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء سے ہو گیا تھا جب آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی جملہ تصانیف بائیس (۲۲) ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

- (۱) رشید احمد صدیقی..... شخصیت اور فن (۲) اردو شاعری میں اشاریت
- (۳) عزیز احمد کی ناول نگاری (۴) عزیز احمد کے افسانے (۵) تنقید شعر
- (۶) اقبال..... ماورائے دیو حرم (۷) غالب کے چند نقاد (۸) ساحر لدھیانوی
- (۹) ادب میں ابہام اور اس کے مسائل (۱۰) آنگن آنگن دکھ کے پیڑ (شعری مجموعہ)
- (۱۱) تنقید اور تہذیب۔

ان کی جملہ تصانیف بائیس (۲۲) ہیں جن میں سے کئی ایک کو مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں کے ایوراڈ ملے ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی رائے میں ادیبوں کی گروہ بندی سے وقتی طور پر کچھ نقصان ہوا ہو لیکن اس طرح بحث کے دروازے بھی کھلے ہیں۔ لوگ اپنی اصلاح پر متوجہ ہوئے۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بڑھا۔ یوں مجموعی طور پر ادب کو فائدہ ہوا۔

ان کا کہنا ہے..... ”کم از کم ہندوستان میں اردو کا مستقبل ایسا تاریک نہیں ہے۔ ہاں چکا چونکہ کیفیت شاید پھر نہ آئے۔ لیکن اردو تعلیم و تدریس اور شعر و ادب کا بازار ایک حد تک گرم رہے گا۔ بس یہ ہی کافی ہوگا کہ اردو والے اردو پڑھیں اور اپنے بچوں کو دیگر زبانوں کے ساتھ اردو بھی پڑھائیں۔ کم یا زیادہ ایسا ہو رہا ہے۔ اردو ہندوستانی تہذیب میں اپنی جڑیں اتنی دیر تک اور دور تک پھیلا چکی ہے کہ کن کن محاذ پر اردو دشمن مقابلہ کریں گے؟ ان کو ویسی کامیابی نہیں ہوگی جیسی وہ چاہتے ہیں۔ میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔“

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اردو رسم الخط کی تبدیلی کے حامی نہیں۔ انہوں نے کہا..... ”اب یہ بات سب تسلیم کر چکے ہیں کہ رسم الخط کے بعد زبان کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اردو کے تعلق سے بھی یہ بات درست ہے۔ کہنے والے جو چاہیں کہہ لیں لیکن اردو اپنے رسم الخط کے ساتھ ہے اور رہے گی۔“



ان کے پسندیدہ ادیبوں میں یہ نام سرفہرست ہیں:  
 سر سید، حالی، اقبال، احمد ندیم قاسمی، فیض، شکیل الرحمن، شمس الرحمن فاروقی،، ٹیگور، شبلی،  
 قاضی نذر الاسلام، دشمنیت کمار، نامور سنگھ، حافظ، سعدی، گورکی، سری سری، ایلینٹ، کیٹس اور کس کس  
 کے نام لیے جائیں۔ فہرست طویل ہے۔  
 میرا آخری سوال تھا کہ اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائیے۔ انہوں نے کہا..... ”ایسا کوئی  
 واقعہ نہیں کہ بتا سکوں“۔ تاہم ان کی ایک نظم ”آگہی“ اپنی جگہ خود ایک واقعے سے کم نہیں جو ہم یہاں  
 شامل کر رہے ہیں۔

## آگہی

کوئی ملتا ہی نہیں اپنا شناسا بھی یہاں  
 یہ وہ خطہ ہے جہاں میں نے گزارے برسوں  
 یہیں پیدا بھی ہوا اور یہیں پروان چڑھا  
 دوست، احباب، عزیزوں کا بیاں کیا کیجئے  
 درود یوار بھی لگتے ہیں پر اے جیسے  
 ایک بے گانگی ہر موڑ پہ نگران، ہر سو  
 اور وہ گھر، میں جسے اپنا کہا کرتا ہوں  
 میری بیوی، مرے بچے میرے گلشن کے گلاب  
 اتنے بے حس ہیں کہ جیسے کوئی رشتہ ہی نہیں  
 اتنے انجان کہ جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں  
 اور بک شیلف میں جتنی ہیں کتابیں ساری  
 پاس ہو کر بھی بہت دور ہوئی جاتی ہیں  
 اور تصویر جو میری ہے، وہ میری ہی کہاں؟  
 نہ مری آنکھ، مرے کان، مرے ہونٹ  
 مرے بال نہ رخسار مرے  
 سوچتا ہوں کہ جو پہچانا ہے خود کو میں نے  
 یہ اسی کی ہے سزا، جس کو بھگتنا ہوگا۔

Professor Sulaiman Ather Jaweed,  
 9-4-134/11, Aruna Colony, Toli Chowki, Hyderabad, 500 008,  
 AP, India





مجھے یاد بھی تو وہ آتے ہیں  
مرے دکھ کی ساری دوائے گئے  
سنجے گوڈ بولے ۲۲/۹/۲۰۰۱

سنجے گوڈ بولے

پونے، ہندوستان

اس تعارف کو لکھتے ہوئے پہلی بات جو میں کہنا چاہوں گی وہ یہ ہے کہ جب کبھی آپ ہندوستان جائیں تو پونے ضرور جائیں۔ اور وہاں سنجے گوڈ بولے سے ضرور ملیں۔ اگر آپ کو نوادرات سے، آثارِ قدیمہ سے دل چسپی نہ بھی ہو لیکن اگر اردو زبان و ادب سے دل چسپی ہو تو سنجے کا بنایا ہوا میوزیم ضرور دیکھیں اور اسے داد دیں کہ مہاراشٹر کی خاک سے جنم لینے، مرہٹہ خاندان میں پیدا ہونے اور مراٹھی زبان بولنے والا ایک باشندہ میر وغالب کا شیدائی کیسے بن گیا۔ اردو زبان پر فریفتہ کیسے ہوا۔ اور پھر اس زبان اردو کے سرمایہ ادب کو مراٹھی زبان میں منتقل کرنے کے لئے اس نے کیسے کیسے بار اٹھائے مگر اس کے کاندھوں نے اسے پھولوں کا بوجھ سمجھا اور اب تک وہ اس کام کو پھولوں کا بوجھ سمجھ کر ہی آگے بڑھا رہا ہے۔

اردو سے ایسی بے لوث محبت نے ہی جناب کیفی اعظمی مرحوم کو بھی متاثر کیا تھا جو ستمبر ۲۰۰۲ء میں مشاعرے میں شرکت کے لئے پونے گئے تھے۔ سنجے کے نوادرات دیکھ کر انہوں نے بے ساختہ اپنی رائے کا نذرانہ سنجے کی اردو سے محبت کی نذر کیا جو ممکن ہوا تو میں سنجے کے انٹرویو کے ساتھ اس کا عکس شائع کروں گی۔ انہوں نے لکھا تھا: ”پونے میں میری صحت کی خرابی کی وجہ سے میرا آنا مشکل تھا۔“



لیکن مشاعرے میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ اور یہاں ایک عظیم دوست خجے گوڈ بولے سے ملاقات ہوئی۔ ان کے پاس اردو کے مخطوط ہیں۔ ان کی زیارت کبر کے میری ساری تحکمن دور ہو گئی۔ یا تو یہاں آنا مشکل تھا اب یہاں سے جانا مشکل نظر آتا ہے۔

۱۹/ مئی ۱۹۶۳ء کو پونے، ہندوستان میں ایک برہمن گھرانے میں جنم لینے والے خجے نے اردو زبان کو اتنی کم عمری میں جتنا سرمایہ سونپا ہے وہ کم نہیں۔ اردو ادب کے اس متوالے کا تعارف کراتے ہوئے نجل حسین خان نے اپریل ۲۰۰۳ء کے ماہنامہ ”پرواز“ لندن میں لکھا ہے: ”جنوبی ہند میں حیدرآباد کے بعد مہاراشٹر ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو زبان و ادب کے لئے بہت قابل قدر کام ہوئے ہیں۔ مہاراشٹر میں اردو اور مراٹھی دونوں میں ایک دوسرے سے ترجمے کا عمل پچھلے تیس (۳۰) برسوں سے جاری ہے۔ پونے کے رہنے والے خجے گوڈ بولے اس میدان میں نمایاں امتیاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کو مراٹھی میں بڑی خوبی کے ساتھ منتقل کیا ہے۔

خجے گوڈ بولے مہاراشٹر کی ایک فعال اور متحرک شخصیت ہیں۔ ایک پُر جوش نوجوان ہیں۔ انہوں نے نہ تو باضابطہ طور پر اردو کی تعلیم حاصل کی اور نہ وہ اردو زبان و ادب کے کسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ محکمہ آثار قدیمہ سے وابستہ ہیں۔ پرانے کاغذات اور سکوں پر لکھی تحریروں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے انہوں نے فارسی زبان سیکھی اور اس کے توسط سے وہ اردو کے قریب آئے۔ اس کے علاوہ خجے کو علمی، ادبی، ثقافتی اور خاندانی پس منظر ملا۔ خجے کا خاندان علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے منسلک رہا ہے۔ ان کے دادا نے پہلی جنگ سے واپسی کے بعد رضا کارانہ طور پر لوگوں کو اردو اور ہندی پڑھائی۔ خجے کے دادا نے ۱۸۶۰ء میں ”بہار دانش“ فارسی کہانیوں کا مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ خجے نے نہ صرف اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھا بلکہ اس میں قابل قدر اضافہ بھی کیا۔

اردو زبان و ادب سے خجے گوڈ بولے کی دل چسپی رنگارنگ اور حیرت انگیز ہے۔ ان کی پہلی کتاب ”انتخاب“ مراٹھی میں چھپی، جس میں غالب کے شاگرد خداداد خان کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا۔ پونے میں موجود ان کی قبر کا عکس اور اس کے علاوہ پونے کے چالیس (۴۰) شاعروں کا تعارف اور ان کا کلام بھی شائع کیا گیا ہے۔ حکیم خداداد خان کا ذکر اپنی کتاب ”تاریخ اردو، پونے“ میں مختصراً کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آئی تو مراٹھی اخبارات کے علاوہ اردو اور انگریزی اخبارات میں اس کتاب پر تبصرے شائع ہوئے۔ اس واقع کارنامے پر خجے گوڈ بولے کو ہر طرف سے داد ملی۔

خجے گوڈ بولے کی دوسری کتاب ماہر غالبیات و ممتاز محقق جناب کالی داس گپتا رضا کی کتاب ”غالب کی شرح“ کا ترجمہ ہے جو خجے نے مراٹھی میں کیا ہے۔ غالب سے خجے گوڈ بولے کو شروع ہی سے دل چسپی تھی۔ انہوں نے پہلی اردو کی کتاب جو خریدی وہ دیوان غالب تھی۔ وہ غالب کو ”اردو شاعری کا کوہ نور“ اور ان کی شاعری کو ”خدا کا کرشمہ“ بتاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مراٹھی کی دوسری



کتاب مرزا غالب کے مشہور اشعار کی تشریح کے طور پر شائع کی۔ خجے نے یہ ترجمہ خاص لکھن اور محنت سے کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف غالب کو خراج عقیدت پیش کیا بلکہ کالی داس گیتا رخصا کی خواہش کی تکمیل بھی کی ہے۔ بقول خجے گوڈ بولے: ”ان کی لکھی ہوئی کلام غالب کی شرح کو مراٹھی میں سمجھنے کی ایک راہ بھی نکل آئی“۔ اس کتاب کو یادگار بنانے کے لئے اس میں غالب کے آگرہ والے گھر کی تصویر، غالب کے مزار کی تصویر اور غالب کی مختلف یادگار تصویریں بھی شائع کی ہیں۔ یہ کتاب خجے گوڈ بولے کا نہ صرف علمی و ادبی بلکہ تاریخی کارنامہ بھی ہے۔

خجے گوڈ بولے نے مراٹھی میں اردو کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ دو کتابیں اردو میں مرتب کی ہیں۔ ”ایک غیر معروف دانشور پروفیسر بلیرور ماٹھکر، احوال و شاعر“ اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب ہے جس میں پروفیسر بلیرور ماٹھکر کا ایک طویل انٹرویو شائع کیا گیا ہے۔ جس میں بعض دل چسپ انکشافات ہیں۔

خجے کی مرتب کردہ دوسری کتاب ”دیوان میر دوم عکسی“ ہے جو تین سو چورائے (۳۹۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مخطوط فن کتابت کا عمدہ نمونہ تھا اس لئے خجے گوڈ بولے نے عکسی شائع کیا۔ بقول خجے گوڈ بولے، اس پر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔ یہ مخطوط ریڈ یوس (reduce) چھوٹی تختی) کر کے طباعت کے مراحل سے گزارنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ مخطوط ایک طرح سے انیسویں صدی کا آئینہ ہے جس میں ہم اس وقت کے اردو خط اور املا کی صورت کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت اسے عکسی شائع کیا گیا ہے۔ دیوان میر کے حصہ اول میں ذکر میر کے عنوان سے خجے گوڈ بولے کا تحریر کردہ ایک مضمون بھی شامل کتاب ہے جس میں انہوں نے میر کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے حوالے سے معلوماتی نوعیت کا مضمون لکھا ہے۔ جو میر کی شاعری کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ نذیر فتح پوری، مدیر سہ ماہی اسباق نے میر کی زندگی سے وفات تک کے سب ہی واقعات تاریخی تسلسل کے ساتھ اپنے مضمون میں قلم بند کیے ہیں۔ کتاب کے سرورق پر میر کی قلمی تصویر شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب معنوی لحاظ سے خوب صورت ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ خجے کے یہ دونوں کارنامے لائق توجہ و تحسین ہیں۔ انہوں نے نہ صرف مخطوطے تلاش کیے بلکہ انہیں کتابی شکل میں شائع کر کے اردو زبان و ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ خجے کی دوسری کتابیں مثلاً مراٹھی میں عمر خیام کے کلام کی شرح، تاریخی باتیں اور نایاب تصاویر، مراٹھی اور ہندی میں استاد ذوق دہلوی کی شاعری اور حالات سے متعلق یہ سب ہی کتابیں طباعت کے مراحل میں ہیں جو کہ جلد از جلد منظر عام پر آنے والی ہیں۔ اردو زبان و ادب سے خجے گوڈ بولے کی یہ محبت لکھن اور جذبہ بلاشبہ قابل قدر ہے۔ بقول جلیل الہ آبادی۔

پوند کو ہے غرور تمہارے وجود پر اردو کو جس پہ ناز ہے، وہ براہمن ہو تم  
خجے گوڈ بولے شعر بھی کہتے ہیں لیکن کم کم۔ انہوں نے کچھ غزلیں اور مایے کہے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۸ء میں ہوا جب انہوں نے انگریزی میں اپنا تحقیقی مضمون یونان کے قدیم سکوں



کے بارے میں لکھا تھا۔ ان کا کاروبار بھی کتابوں کی خرید و فروخت ہے۔ کتابیں اوڑھنا بچھونا ہیں۔ غالب کے ایک عاشق اور مہر غالبیات آنجنمانی کالی داس گپتا رضا ان کے استاد تھے۔ بچے نے اب تک انگریزی، مراٹھی، ہندی اور اردو میں پانچ سو (۵۰۰) سے زائد مضامین لکھے ہیں جن میں ترجمے بھی شامل ہیں۔ یہ مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُسے مطالعے کا بے حد شوق ہے۔ اُس نے غالب کو پڑھا تو اُسے معلوم ہوا کہ غالب نے بھی میر تقی میر کو ان کی شاعری کے حوالے سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا اور غالب ہی پر کیا منحصر، میر کو سلام کرنے والوں میں یہ شعر ابھی تھے جو میر بننے کی حسرت لینے چلے گئے۔ سودا تو اس غزل کو، غزل در غزل ہی لکھ ہوتا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح = سودا نہ ہوا پر نہ ہوا میر سا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا = ذوق شعر میرے بھی ہیں پُر درد لیکن حسرت میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں = حسرت میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پر جاؤں اکبر ناسخ و ذوق بھی تو نہ چل سکے میر کے ساتھ = اکبر ”بچے! تم نے آثار قدیمہ کا علم جاننے کے لئے پروفیسر دستگیر شہاب سے فارسی سیکھی۔ لیکن یہ قدیم چیزیں جمع کرنے کا شوق کب اور کیسے ہوا؟“ میں نے دریافت کیا۔

بچے نے بتایا، ”میں نے پونے یونیورسٹی سے بی کام اور ایل ایل بی کی ڈگریاں تو لیں لیکن میرے نوادرات جمع کرنے کے ازلی شوق نے مجھے علم تاریخ (History)، آثار قدیمہ (Archeaology) اور قدیم ہندوستانی تہذیب (Indology) میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مجبور کیا۔ اور میں نے ان تینوں علوم میں پونے یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ اب میں برطانیہ کی رائل ایشیائی سوسائٹی (Royal Asiatic Society) کا اور سکوں سے متعلق رائل نیومس میٹک سوسائٹی (Roayl Numismatic Society) کا فیلو ہوں۔ ساتھ ہی مہاراشٹر کی غیر معمولی نوادرات جمع کرنے والی بین الاقوامی سوسائٹی کا سرپرست اور پونے مہاراشٹر کی نیومس میٹک سوسائٹی کے بانی ارکان میں سے ہوں۔ ہندوستان کے کئی بڑے شہروں جیسے دہلی، بنارس، میسور وغیرہ کی اس قسم کی انجمنوں نے بھی مجھے اعزازی رکنیت عنایت کی ہے۔“

”سلطانہ صاحبہ!“ بچے نے گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے کہا، ”میں نے اپنی پندرہ سولہ سال کی عمر میں اس بات کا نوٹس لیا کہ ہمارے ہندوستان میں سیاح آتے ہیں اور یہاں کی قدیم تاریخ جاننے کے لئے در بدر پھرتے ہیں۔ وہ پرانے سکے، مہریں، قدیم مخطوطات اور پرانی گھریلو اشیاء کبھی کوڑیوں کے مول خرید کر اور کبھی بھاری قیمت ادا کر کے لے جاتے ہیں۔ ان پر ریسرچ کرتے ہیں اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ ان چیزوں سے اپنے میوزیم کی آرائش کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ روپے کے انچ میں ان چیزوں کو مٹی و حول سمجھ کر فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کی حفاظت نہیں



کرتے۔ غیر ملکی ہمارا کتنا سرمایہ لوٹ کر لے گئے اس کا حساب کتاب کسی کے پاس نہیں۔ میں نے کوہ نور ہیرے پر ریسرچ کی اور ایک مضمون میں وضاحت سے لکھا کہ یہ ہیرا گو لکندہ کی قطب شاہی حکومت کے وزیر امیر الملک میر جملہ کی ملکیت تھا۔ کوہ نور جسے روشنی کا پہاڑ کہنا چاہیے پھر یہ برطانیہ کیسے پہنچا۔ یہ تاریخی داستان پڑھنے کے قابل ہے۔ میرے مراٹھی میں لکھے اس مضمون کا اردو ترجمہ جناب منظور احسن نے کیا جو روزنامہ 'انقلاب' ممبئی کی ۲۱ / دسمبر ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ ہندوستان نے اس ہیرے کی واپسی کے لئے حکومت برطانیہ سے خط و کتابت کی۔ وزیراعظم ٹونی بلیر کو بھی خط لکھا مگر حکومت برطانیہ نے اس معاملے میں خاموشی کا روزہ رکھ رکھا ہے۔

میں نے اپنے شوق کے تحت اپنے چھوٹے سے میوزیم میں یہ چیزیں جمع کر رکھی ہیں جسے بیرونی سیاح آکر بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں اور مجھے فخر ہوتا ہے میں نے میرے ہندوستان، اپنے وطن کے نوادرات کو جتنا ممکن ہو سکا ہے محفوظ کر لیا ہے۔

بچے نے بتایا اس کے پاس تین سو سالہ پرانی سنسکرت کی کتابیں، ۹۸۰ ہجری کا قطب شاہی ۱۵۳۶ء کا نظام شاہی فرمان ۱۵۸۰ء کا وہ توصیف نامہ جو قلی قطب شاہ کی مدح میں لکھا گیا تھا، شہنشاہ اکبر کے زمانے میں لکھی ہوئی ایک عربی کتاب، ۱۵۹۰ء کی عادل شاہ کے کارخانوں کی سند، ۱۹۶۰ء میں شائع ہونے والا حضرت شیخ سعدی کے پانچ مجموعہ ہائے کلام کا کلیات کا دستی قلمی نسخہ جس کے صفحات مینا کاری سے مزین ہیں، ۱۳۵۹ء کی کا پر پٹیش، شہنشاہ اکبر کے خطوط کا مجموعہ 'اکبر نامہ' جسے ابوالفضل نے مرتب کیا تھا، شاہجہاں کے دور کا قرآن کا دستی قلمی نسخہ، ایران کے شاعر کشتی کے دیوان کا نسخہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کا شیئر سرٹیفکیٹ (۱) میوزیم میں ہیں۔

بچے کے نوادرات میں "تل و منیتی" (۲) کا فارسی ترجمہ بھی محفوظ ہے۔ سولہویں صدی کی تل و منیتی کی رزمیہ داستان محبت سنسکرت میں ہے اس کا فارسی ترجمہ بیجاپور (۳) کے ایک کباڑیے کی دکان میں دھول میں انا پڑا تھا۔ گوڈبولے نے بتایا، "فارسی دستاویز دو سو بیاسی (۲۸۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فارسی ترجمے پر اٹھارویں صدی میں گجرات کے مغل صوبیدار شہنشاہ محمد شاہ کا نام دیکھ کر میرے ایک دوست نے اس کا مطالعہ کیا اور پتا چلا کہ یہ سنسکرت میں لکھا رزمیہ تل و منیتی کا فارسی ترجمہ ہے۔ شہنشاہ ۱۔ یہ سرٹیفکیٹ تیرہ (۱۳) سالہ بچے کو ایک کباڑیے کی دکان پر ملا اور وہ اسے لے کر پونے یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈی وی پوت دار کے پاس گیا تھا اور جنہوں نے بچے کی یہ لگن دیکھ کر پیشینگوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا محقق بنے گا اگر اسے صحیح رہنمائی ملی۔

۲۔ بزبان سنسکرت "تل و منیتی" (Nal Damanty) مرزا صاحبان یا کسی پونی کی طرح کا ایک رومانوی جوڑا تھا جہاں راجہ تل نے و منیتی کے واسطے اپنا راج پاٹ اور خود اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں میرے غزل کا ایک شعر ہے۔

بیاری بازی ہارنا ہے تو پوری کر لیں ہار // دل تو ہار، زبان بھی باریں۔ راجہ تل ہو جائیں سلطان مہر

۳۔ بیجاپور کسی زمانے میں علی عادل شاہ کی راج دھانی تھا۔ سلطان مہر







اردو ایک زبان نہیں ایک تہذیب ہے اور اردو کا رسم الخط اس زبان کا سہاگ ہے۔ اس کی تبدیلی اردو کو بیوہ بنا دے گی۔

بچے نے ”غالبیات پر تین یادگار تقریریں“ کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی جس میں ڈاکٹر علی سردار جعفری، ڈاکٹر خلیق انجم اور کالی داس گپتا رضا کی تقریریں شامل ہیں۔ دوسری تالیف ”جانشین داغ... بھائی جان عاشق“ ہے۔ ان کی زیر طبع کتابوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) عمر خیام کی شاعری (مراٹھی میں ترجمہ)؛ (۲) استاد ذوق؛ (۳) رسالہ استاد شاعر اردو... از کمال کرتار پوری (ہندی ترجمہ)

بچے ۱۸۱۰ء میں قائم شدہ پونے کی سب سے قدیم سنسکرت کی دھارمک کتابوں کی دکان کے مالک ہیں۔ ان کے آبا و اجداد سنسکرت زبان میں فلسفہ کی کتابیں شائع کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے حویلی نما مکان کی پہلی منزل پر اپنے خاندان کے ساتھ مقیم ہیں۔ دوسری اور تیسری منزل کے چند کمرے انہوں نے اپنے نجی میوزیم کے لئے مختص کیئے ہیں۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ کسی کی شخصیت اور اس کے مزاج کو جاننا ہو تو اس شخص کے مکان یا اس کے پسندیدہ دوست کا مطالعہ کیجئے۔

بچے کی زندگی کا یہ اہم واقعہ اُسے آج بھی یاد ہے جب اُس نے بیس (۲۰) سال کی عمر میں ٹیپو سلطان کے مزار واقع سری رنگا پٹم، میسور پر زیارت کے لئے حاضری دی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ انہوں نے بچے کو ٹیپو سلطان شہید کی تصنیف کردہ کتاب اور اس زمانے کے کچھ سکے بطور تحفہ دیئے حالانکہ وہ اس فقیر منش درویش سے یہ چیزیں قیمتا خریدنا چاہتے تھے۔ غالباً اس درویش کی دلی دعا تھی یا دعا بھری نظر کا صدقہ کہ بچے کے اس شوق کو ہمیز لگی اور آج اس نوجوان کی لگن اقبال کے اس شعر کی تفسیر بن کر سامنے آئی ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف صوت  
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

Mr. Sanjay Godbole,

847 Budhwar Peth, Laxmi Road, Pune, 411002, India

e-mail: sanjay\_godbole2000@yahoo.com





اگر تم خود پیر حیران ہوئے تو یہ دنیا کی سب سے  
سڑی حیرت ہوگی، اور اگر تم خود سے ڈر گئے  
تو یہ دنیا کا سب سے سڑا ڈر ہوگا۔

شاہدہ احمد

30-12-88

## شاہدہ احمد

اسٹین مور، مڈل سیکس، برطانیہ

انسان جب ایک زمین سے اکھڑ کر دوسری زمین پر قدم رکھتا ہے تو وہ اپنی تہذیبی جڑیں بھی  
ساتھ لے آتا ہے۔ اگر ان جڑوں کو نئی زمین اور آب و ہوا اس آگئی تو وہ پھلتا پھولتا ہے ورنہ سوکھ کر بے  
برگ و بار ہو جاتا ہے۔

شاہدہ احمد نے بھی ہجرت کی۔ نرم گرم زمین سے برف زار میں آئیں اور بڑے سلیقے سے  
اپنی زبان و ادب کے پودے کی آبیاری کرتی رہیں۔ مگر وہ ہجرت کے دکھ اور نئی بود و باش اور تہذیب کے  
خون آشام ٹکراؤ سے نا آشنا نہ تھیں۔ یہ ریزہ ریزہ کرنے والے دکھ ان کی بیشتر کہانیوں میں سمٹ آئے۔  
شاہدہ کی ایک کہانی ”کھویا ہوا لمحہ“ ایسے ہی ایک مختصر خاندان کی کہانی ہے جس میں ماں باپ معراج دین  
اور زینت نے برطانیہ آ کر دولت تو کمالی مگر یہاں کی تہذیب سے کچھوتا نہ کر سکے۔ اور اپنے نوجوان بیٹے  
جمیل اور بیٹی صغرا کو اپنی تہذیب سے ہم آہنگ بھی نہ کر سکے۔ اور نئے دیس کا تمدنی ملبوس بھی انہیں گوارا  
نہ تھا۔ نتیجے میں خاندان بکھر کر رہ گیا۔

شاہدہ احمد کو افسانہ لکھنے پر عبور حاصل ہے۔ خوب صورت استعارے، زندہ علامتیں اور سادہ  
زبان ان کے افسانوں کی رنگارنگی کو برقرار رکھتی ہیں۔ شاہدہ کے افسانے ان کے سابق وطن کی مٹی سے



اگتے ہیں اور اپنی مٹی کا رنگ روپ لے کر تناور درخت کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔ عورت ہونے کے ناطے عورت کے دکھ افسانہ نگار شاہدہ احمد کے ذاتی دکھ بن جاتے ہیں، بالخصوص مزدور عورت جو گھر کی ملکہ ہونے کے باوجود محنت کش ہے کیوں کہ شاہدہ نے بھی اپنی عمر قلم کی مشقت میں گزاری ہے۔

شادی سے پہلے شاہدہ کا قلمی و خاندانی نام سیدہ شاہدہ سیف تھا۔ شادی کے بعد شاہدہ احمد کہلائیں۔ ۲۰/ ستمبر ۱۹۴۹ء کے دن الہ آباد، ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ لڑکپن میں پاکستان ہجرت کی۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ گریجویشن پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے کیا۔ شاہدہ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۵ء میں کشمیر کے پس منظر میں لکھے ایک تاثراتی خاکے سے ہوا جو روزنامہ ”نوائے وقت“ میں شائع ہوا۔ پھر تو شاہدہ کا قلم رکا نہیں۔ ان کی ان گنت کہانیاں ہندو پاک اور برطانیہ کے جرائم میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک یعنی آٹھ سال بی بی سی ٹیلی ویژن پر ایشیائی پروگرام کرتی رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں ”سمن زار“ کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی اور پہلی بار برطانیہ میں آباد گیارہ (۱۱) افسانہ نگاروں کا انتخاب بعنوان ”برطانیہ میں اردو کے منتخب افسانے“ کتابی شکل میں شائع کیا۔ ۱۹۸۶ء میں شاہدہ کراچی چلی گئیں اور وہاں سے معذوری کے موضوع پر معذوروں کی فلاح و بہبود کے لئے ماہنامہ ”آدرش“ جاری کیا۔

شاہدہ کہتی ہیں.....

”میرا قلم کسی موڑ پر بھی رکا نہیں بلکہ میری بہت سی عبادتوں کے سلسلے میرے قلم سے جا ملے ہیں۔ میں نے ادب کو تو نہیں البتہ صحافت کو ماہنامہ ”آدرش“ کے اجرا کی صورت عبادت سے ضرور ہم کنار کیا ہے۔“

شاہدہ کی دیگر تخلیقات میں ان کا پہلا ناول ”سپنے تیری یادوں کے“ ۱۹۷۷ء میں پاکستان سے شائع ہوا۔ ”ہجرتوں کے بھنور“ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ دوسرا مجموعہ ”بھنور میں چراغ“ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ بچوں کے لئے یونانی دیومالائی / اساطیری (mythological) کہانیوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ شاہدہ کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ بھی تیار ہے۔ اور آج کل وہ اپنی خود نوشت سوانح بھی قلم بند کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ”تحریریں“ ادارہ ”گلوبل آرٹس“ شائع کر رہا ہے۔

شاہدہ نے ایک نائف ”آپ کی عدالت میں“ لکھا تھا جو اسٹیج کیا گیا اور بے حد مقبول ہوا۔ اس ڈرامے کو پاکستان ہائی کمیشن نے سرپرستی دی تھی اور اپوا (آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن) لندن کی سابق چیئر پرسن (chairperson صدر) بیگم نرگس جعفر نے ۲۰۰۲ء میں اسے کمیشن کیا تھا۔ اس کا موضوع ”طے شدہ شادیاں اور جبری شادیاں“ تھا۔

شاہدہ کا قلم اب بھی رواں دواں ہے اور وہ بلاشبہ قلم کا حق ادا کر رہی ہیں۔ شاہدہ نے اپنی



زندگی کا بیشتر حصہ معذوروں کی خدمت اور دل دہی میں گزارا ہے۔ ان گنت کہانیاں اور سلسلہ وار مضامین بھی لکھے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے۔

”میرا یہ شوق اور مشن ہے اور شوق کے سودے میں نفع و نقصان کے گوشوارے ترتیب نہیں دیے جاتے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ مجھ سے متفق نہ ہوں مگر یہ میری سوچ ہے، میں ایسا ہی سوچتی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنے محسنوں کی شکرگزاری میرے مزاج کا حصہ ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ادب نے مجھے ہر طرح سے نوازا ہے۔ میری جو بھی چھوٹی موٹی پہچان ہے اس میں اردو ادب کی دین کا بڑا دخل ہے۔ لہذا اردو ادب کو اپنا نامیرے لئے تو خسارے کا سودا نہیں ہے۔ ادیبوں کی گروہ بندی کے جراثیم برطانیہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔“

میرے پوچھنے پر شاہدہ نے بتایا، ”ادیبوں کی گروہ بندی تو وہ امر نیل ہے جس کا منحوس سایہ جس بھی شعبہ زندگی پر پڑا نقصان اس کا مقدر ٹھہرا۔ پھر اردو زبان و ادب کو اس سے کس طرح فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ حوالے کے طور پر دوسری جگہوں کے بارے میں تو میں صورت حال سے پوری طرح باخبر نہیں لیکن انگلستان کی حد تک یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو کر کام کرنے کی کوشش کی جاتی تو نئی نسل کو اردو زبان سے قریب کرنے کے امکانات بہت روشن ہو سکتے تھے۔“

اگلے سوال کے جواب میں شاہدہ کہہ رہی تھیں.....

”میں بے حد عمل پسند عورت ہوں لہذا اپنی توانائی تجاویز کی پیش کش پر صرف کرنے کے بجائے عمل کی پالیسی پر خرچ کرنے پر یقین رکھتی ہوں۔ اور مسجد میں چراغ جلانے کی نیکی کمانے سے پہلے گھر میں چراغ روشن کرنا میری ترجیحی پالیسی ہے۔ لہذا بحیثیت ماں اگلی نسل کو اپنی زبان، ادب اور تہذیب سے واقف کرانے کی جو بھاری ذمہ داری میرے کمزور کندھوں پر عائد تھی تمام عمر پوری دیانت داری سے اُسے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ باقی یا قسمت یا نصیب، کیوں کہ پردیس کو دیس بنالینے والے مجھ جیسے لوگ کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ عمر بھر کی ان کڑی ریاضتوں اور مشقتوں کا کس کو کیا ثمر ملے گا، کچھ ملے گا بھی یا اولاد کی ایک ہی جست میں سب رائگاں چلا جائے گا کسے معلوم ہے۔ بہر حال ضمیر مطمئن اور قلب پرسکون ہے کہ اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ یہ ہی میری تجویز ہے۔ بچوں کی سب سے پہلی درس گاہ ماں کی گود، باپ کی نگاہ اور گھر کا ماحول ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کو اردو بولنا، لکھنا اور پڑھنا سکھائیں گے تو اردو باقی رہے گی۔“

اب جہاں تک رسم الخط کا سوال ہے تو میرا شمار اردو رسم الخط بدلنے کے حامیوں میں سے نہیں ہے کیوں کہ میرے سامنے کمال اتاترک کی تحریک کے نتیجے میں ترکی رسم الخط کو رومن میں بدلنے کا تجربہ موجود ہے۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ کا یہ سوال بالکل بجا ہے کہ جب ہندی، مراٹھی، تملگو، ملیالم یا گورکھی وغیرہ کسی بھی زبان کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تو صرف اردو رسم الخط کو بدلنے کے پیچھے لوگ لٹھ لے کر کیوں پڑے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں رومن یا دیوناگری یا کسی بھی



اور رسم الخط کے قالب میں ڈھلنے کے بعد اردو تخلیقی اور تحقیقی کام سے محروم ہو کر صرف بولی ٹھولی ہی بن کر رہ جائے گی۔ اس تبدیلی سے زبان کے تخلیقی عمل پر یقیناً منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ جو زبان اپنے اصلی رسم الخط کی شناخت کے ساتھ زندہ رہنے کی قوت نہیں رکھتی اُسے کسی بھی متبادل رسم الخط سے محفوظ کرنے کا خیال انتہائی طفلانہ ہے۔ میرے نزدیک یہ اپنے اوپر عائد ذمہ داری سے فرار کا راستہ ہے۔ ساؤتھ افریقہ میں لگ بھگ سولہ (۱۶) مروج زبانیں ہیں جن میں سے بیشتر اپنا خود کا رسم الخط نہ ہونے کی وجہ سے بولی ٹھولی کے درجے سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔

شاہدہ احمد کے پسندیدہ غیر اردو ادیبوں میں ٹالسٹائی، جین پال سارتر اور کافکا ہیں۔ اردو میں ممتاز مغربی، بانوقدسیہ اور زاہدہ حنا کی تحریریں انہیں پسند ہیں۔

Mrs. Shahida Ahmed,

1 Fern House, 43 Woodlands Drive,

Stanmore, Middlesex, HA7 3PB, UK



نہیں منزل کی تلخوں میں سفر آٹھے ہی آٹھے جلتا جلتا ہے  
ایک مہلک کمر سے لٹکتا ہے جیسے جھوڑا آٹھے شاید وہی منزل تھی  
اب واپس کا راستہ طویل و دشوار اور عمر کوتاہ ۔ " شاہدہ بیگم



## شاہدہ بیگم

اوسلو، ناروے

یورپ میں انگلیوں پر گنی جانے والی اردو نثر نگار خواتین ہیں۔ شاہدہ وسیم کا نام ان میں نمایاں ہے۔ ہاں یہ پہلے شاہدہ وسیم تھیں لیکن اب شاہدہ بیگم ہیں اور وسیم کے لاحقے کے بغیر انہوں نے جینا سیکھ لیا ہے۔ گوزندگی کی کٹھنائیوں سے بچہ لڑانا اور وہ بھی ایک ابلا کے لئے آسان بات نہ تھی مگر شاہدہ نے ہمت نہیں ہاری۔ ایسی ہی عورتیں سرخ رو ہوتی ہیں۔ آج شاہدہ بھی سرخ رو ہیں، اپنے بچوں کے سامنے بھی اور اس معاشرے کے سامنے بھی۔

شاہدہ بیگم کے افسانے میں نے پڑھے تھے۔ شاہدہ نے ترقی پسندی یا جدیدیت کا لیبل لگائے بغیر اپنے افسانوں میں ان بے بس عورتوں کے دلوں میں دبی ہوئی امٹلوں کو اجاگر کیا جو مردوں کے بنائے ہوئے اس سماج میں قرونوں سے پستی چلی آرہی ہیں۔ میں نے اپنے بھائی عاشور کاظمی کی معرفت ”گفتنی حصہ اول“ کا سوال نامہ ۱۹۹۹ء میں شاہدہ کو بھجوایا، اور وہ ہی ہوا جو اکثر ہوتا آیا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں جب میں نے ”گفتنی حصہ دوم“ پر کام شروع کیا تو شاہدہ سے پھر رابطہ کیا۔ اس دوران میں ان کی کئی اور کہانیاں پڑھ چکی تھی جو ہندو پاک کے مختلف جراثیم میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ شاہدہ کا افسانہ ”کانٹے“ کلکتہ کے ماہنامہ ”انشا“ میں شائع ہوا تھا۔ کیسے سلیقے سے شاہدہ نے استعارے استعمال کیے



ہیں، دیکھئے...

”ایک عورت کھلے میدان میں تنکے بین بین کر جمع کر رہی تھی۔ دوسری عورت بھی اس کے پاس پہنچ گئی اور پوچھنے لگی انہیں کیوں جمع کر رہی ہو۔ ان سے تو چڑیاں اپنا گھونسلہ بناتی ہیں۔ پٹلی بولی... ہم بھی بناتے ہیں۔“ دیکھو یہ تڑکا، اسے اپنے گھر یلو اخراجات سے کاٹ کر نکالا ہے۔ اور یہ دیکھو اسے اپنی خواہشات سے توڑا ہے۔ اور یہ تنکے، انہیں اپنی تمناؤں اور آرزوؤں پر قینچی چلا کر کترا ہے۔ اور دیکھو ان تنکوں کو، انہیں اپنی بچت سے پایا ہے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے تنکے ہیں۔ انہیں اپنے بچوں کے دکھ تکلیف میں انہیں سلانے کے لئے اور خود جاگتے رہنے کے لئے (یہ تنکے) جس اپنی پٹکوں پر جما لیتی تھی تاکہ آنکھ جھپک نہ جائے۔“

شاہدہ بیس پچیس سال سے لکھ رہی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ”شہر بتاں“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ الہ آباد (ہندوستان) میں پیدا ہونے والی شاہدہ ہندو پاک کی سرحدیں عبور کر کے اب ناروے کے شہر اوسلو میں مقیم ہیں۔ بی اے تک کی تعلیم تو الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پھر ناروے میں نرسری کی ٹریننگ لی اور بعد میں ٹیچر ٹریننگ کر کے درس و تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔

ان کے پسندیدہ ادیبوں میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی شامل ہیں۔ شاہدہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو برصغیر سے نکل کر دنیا کے نہ صرف کونے کونے میں پہنچی ہے بلکہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ کتنے ہی غیر ملکی طالب علم اور اسکالرشپس آ رہے ہیں، ڈیڑھ سو کتب شائع ہو رہی ہیں۔ یہ ہی اردو کے اچھے مستقبل کی ضمانت ہیں۔

اردو کے رسم الخط کے حوالے سے شاہدہ کہتی ہیں: ”میں رسم الخط بدلنے کی حامی نہیں ہوں۔ قوموں کے عروج و زوال کے اثرات زبان پر پڑتے ہی ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قوم اپنی ثقافت اور لباس بدل ڈالے۔ رسم الخط کسی بھی زبان کا لباس ہی تو ہے۔ ہاں موقع محل کے تحت لباس میں تراش خراش اور جدت ہونا گوارا ہے۔ اور یہ اردو میں ہوتی رہی ہے۔ اس زبان میں اتنی پلک ہے کہ جہاں بھی جاتی ہے وہاں کے رائج الفاظ بڑی خوبی سے اپنے میں سمو لیتی ہے۔ اس سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ آج ہندو پاک میں اردو کی کشتی ڈانواں ڈول ہے تو مایوس نہ ہوں۔ ایسے دور پہلے بھی آچکے ہیں۔ پہلے بھی اس کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ لیکن دیکھئے اس دور کے بعد بھی اردو، دنیا کے ایسے ایسے مقام اور برفانی علاقوں تک بھی پہنچ گئی جہاں کبھی پہنچنا ممکن نہ تھا۔ بس کوشش جاری رکھیں۔ یہ میرا ایمان ہے کہ کامیابی ہوگی۔“

شاہدہ کے اتنے مختصر تعارف کے بعد مختصر جواب بھی قسطوں میں ملے۔ پھر میں نے جب ۲۰۰۱ء کے اوائل میں انہیں خط لکھا تو اس کے جواب میں شاہدہ نے طویل جواب دیا۔ اس کی اشاعت نہ صرف خواتین قارئین بلکہ مرد قاریوں کے لئے بھی ایک تازیانہ اور مشعل راہ ہے۔ دیکھئے صنف نازک کی فرد نے اپنی راہوں کے کانٹے کس طرح سے پنے اور وہ کیسے منزل مقصود تک پہنچی۔ یہ خط ۲/ اگست ۲۰۰۱ء کا لکھا ہوا ہے۔



آپ کا خط ملا۔ خوشی اور حیرانی ہوئی کہ عروج ادب کے ایک درخشاں ستارے نے مجھے تعارف قلم بخشا۔ اردو کے لئے آپ کی محبت قابل ستائش ہے۔ میری مثال اس میدان میں پیچھے پیچھے چلنے والے اُس سپاہی جیسی ہے جو لشکر کا ساتھ بھی نہ چھوڑنا چاہتا ہو اور دوزخ کے ساتھ چلنے کی ہمت اور جرأت بھی نہ رکھتا ہو۔ آپ کو میری کہانی پسند آئی شکریہ۔ آپ کا مشورہ بھی قبول، کوشش کروں گی اسلامی اور تاریخی حقائق پر مبنی واقعات قلم بند کر سکوں جس کے لئے میرا علم بہت تھوڑا ہے۔

آپ نے میرا مکمل تعارف مانگا ہے۔ شاید پچھلا بھیجا ہوا آپ کو ادھورا لگا۔ بہن جس کی داستان زندگی ادھوری اور نامکمل ہو اس سے مکمل اور تسلی بخش سوانح کی فرمائش؟ پھر بھی آپ کے لئے حاضر ہے جس کی تشہیر میں نہیں چاہتی تھی۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں الہ آباد، انڈیا میں پیدا ہوئی۔ وہیں پٹی بڑھی۔ وہیں اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۶۸ء میں اچانک چند دن کے اندر شادی کراچی میں کر دی گئی۔ وہ حضرت اُن دنوں لکھنؤ اپنے رشتہ داروں کے پاس آئے ہوئے تھے۔ اکتوبر میں کراچی دھکیل دی گئی۔ جب آنکھ کھلی تو سب کچھ پرایا (اُن دنوں وہیں کی آنکھیں بند ہوتی تھیں)، جہاں نہ اپنا نہ پرایا، رشتہ دار، بہن بھائی نہ کوئی شناسا۔ وہ حضرت اکیلے ہی گئے تھے۔ چند دنوں بعد ہی وہاں اُن کے رنگ و حنک دیکھ کر واپس ہندوستان چلی گئی۔ لیکن اندازہ ہوا کہ شادی کے بعد مالکے کی دیواریں لڑکیوں کے لئے تنگ ہو جاتی ہیں۔ اور یوں بھی دو ملکوں کے قوانین آڑے آنے لگے تھے۔ میں پھر اپنی چھوٹی بچی کے ہمراہ واپس بھیجی گئی۔ میں نے کیسے کیسے دکھ جھیلے کیا لکھوں۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ حضرت ناروے سدھارے۔ ہندوستان پاکستان کے راستے آنے جانے کے لئے بند ہو گئے تھے۔ کراچی جس کی نہ میں سڑکیں پہچانتی تھی نہ دکانیں، نہ عزیز نہ رشتہ دار، وہاں سے ناروے آنے کے لئے کیا کیا پاڑ بیلے چند سطروں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ بس ایک دھن تھی روٹی روزی کے حصول کی اور بچوں کے پالنے کی، جن کے آنے کی کوئی اُمنگ نہیں لیکن جب آ ہی گئے تو ایک خوف کہ کیسے پلیں گے۔ ایک اور خوف جو ہر لڑکی کے ذہن میں بسا دیا جاتا ہے کہ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے، اس کی ناراضگی خدا کی ناراضگی ہے۔ اس خوف نے بچے تو پیدا کر دیئے لیکن ان کی پرورش نگہداشت کا وہ صفحہ میں بہت دیر میں پڑھ سکی جب بار بار ملازمت کے دوران گرنے اور کمر کی ہڈی کی چوٹ سے میڈیکل پر گھر میں رہنے کا موقع ملا۔ میڈیکل کے بعد معذوری پینشن ہو گئی۔ ان لمحوں میں ذہن اپنے آپ ہی عبادت الہی کی طرف مائل ہو گیا۔ نمازیں تو پہلے بھی پڑھتی تھی لیکن کم۔ کبھی وقت ملتا تو قرآن پاک اور بیچ سورہ بھی پڑھ لیتی تھی لیکن معنی اور تفسیر سے قرآن پاک پڑھنے کے بعد اپنے حقوق جان پائی۔ عورت اور مرد اللہ کی نظر میں برابر ہیں۔ ان میں ایک دوسرے پر کچھ فضیلت ہے تو وہ ہے تقویٰ۔ مرد، عورت اور بچوں کا کفیل اور ذمہ دار ہے، مونس اور نمکسار ہے، زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ ہے۔ جھوٹ جھوٹ ہے، منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے۔ ہدی کو مت چھپاؤ، اُسے بتاؤ تاکہ دوسرا اُس شخص سے محتاط ہو جائے۔ سچ بولو۔ یہ نہیں لکھا کہ اپنے اندرونی حالات زمانے سے چھپانے کے لئے سماجی بندھنوں کے ذرا اور خوف سے اپنے اندر ہل پل رستے زخموں کو جھوٹ کے پردے میں چھپالیں اور مقابل اسی



کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے ہنر ک معاشرے کا شریف اور مہذب انسان کہلائے۔

لیکن یہ سب جاننے تک وقت بہت سا نکل گیا تھا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ جھوٹ کے اوپر سچ کی پھیری قلمی پہچان گئے۔ ماں کی اچھی تنخواہ کے باوجود اس کی بیچارگی جان گئے۔ کوک اور شراب کی رنگت پہچان گئے جسے وہ باپ کو پیٹے دیکھتے، ماں سے وقت بے وقت جھگڑتے، گھر سے بے گانگی اور مد ہوش ہو کر سونے کی وجہ جان گئے۔ جوئے اور رلیس کی شناخت کرنے لگے۔ ویسے بھی یورپ کے پلے بڑھے بچے سچ ہی بولتے ہیں۔ غلط بات کوئی بھی کہے وہ سچ بات کہہ کر اصل بات کھول دیتے ہیں اس کی پرواہ کیئے بغیر کہ ہمارا معاشرہ کیا کہہ رہا ہے۔ تب ان کا جواب ہوتا ہے..." آپ کہتی ہیں کہ مذہب میں جھوٹ بولنا منع ہے تو کیا ہمارا معاشرہ جھوٹ بولنا سکھاتا ہے۔" ان بچوں نے مجھے بھی سچ بولنے کا حوصلہ دیا۔ لیکن میں اس بات میں واقعی فیصلہ اب تک نہیں کر سکی کہ خود کو پاکستانی سمجھوں یا ہندوستانی۔ اس کی وضاحت کر دوں۔ جس کے ساتھ مجھے کراچی بھیجا گیا تھا وہاں اکیلا ہی گیا تھا۔ ناروے آنے کے بعد جب کبھی جانا ہوا تو میں انڈیا ہی گئی۔ پاکستان کس کے پاس جاتی۔ بچوں نے جب ہوش سنبھالا تو ناروے اور انڈیا کو ہی دیکھا۔ آپ کو جان کر یہ حیرت ہوگی اسکول میں جب نیچر بچوں سے اپنے اپنے ملک کا فلگ بنانے کو کہتے تو وہ ہندوستان کا نقشہ بناتے اور خود کو ہندوستانی کہتے۔ ان کے احباب بھی انہیں ہندوستانی سمجھتے کیوں کہ جس طرح دوسرے اپنے وطن جاتے یہ انڈیا جاتے، اسی کے متعلق باتیں کرتے۔ بڑے ہونے پر انہیں سمجھ تو آگئی لیکن بچے کا ذہن وہی قبول کرتا ہے جو دیکھتا ہے۔ بتائی ہوئی باتیں شعور آنے کے بعد سمجھ سکتا ہے۔ اس طرح میرے ساتھ میرے بچوں کی شناخت بھی گڈ نہ ہو گئی۔ ہندوستانی ہمیں پاکستانی سمجھتے ہیں اور پاکستانی ہمیں ہندوستانی۔ آپ ہی بتائیں ہم خود کو کیا سمجھیں جب کہ شہریت اور پاسپورٹ ہمارے ناروے میں ہیں۔

شوہر کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی تو کبھی نہ تھی نا طے بھی بہت پہلے ٹوٹ چکا، ایک نام ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا اس کو بھی بنا دیا۔ جس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں اس کا نام رکھنا جھوٹ ہی تو ہے۔

زمانہ طالب علمی سے ہی تھوڑا بہت لکھ لیتی تھی جو لکھنؤ سے نکلنے والے رسالے "حریم" میں چھپا۔ کراچی میں سن بہتر تھیر (۷۲-۷۳) میں خواتین کے رسالے "اخبار خواتین" میں ایک افسانہ چھپا۔ ۱۹۸۱ء میں ناروے آئی۔ ۱۹۸۴ء سے یہاں وقفے وقفے سے لکھ رہی ہوں جو ہندوپاک کے ادبی اور غیر ادبی رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ یہیں ناروے سے ہندوستانی ہندی کا اخبار نکالتے ہیں پہلے

اس میں ہندی میں لکھا کرتی تھی۔ ایک مجموعہ "شہر بتاں" کے نام سے چھپا ہے لیکن اب وہ مجھے نا تجربہ کار ذہنیت کی کارگزاری ہی لگتا ہے۔ اور کیا لکھوں۔ اُمید ہے آپ کچھ نہ کچھ مطمئن ضرور ہو گئی ہوں گی میری اس نامکمل داستان حیات سے کہ یہ ہی میری زندگی کا ایک دردناک واقعہ بھی ہے۔

Ms. Shahida Begum,

Beverveien 3, LE1-19-0596, Oslo, 5, Norway





انہی خواب، ایک واقعہ کی صورت اعرا اور رنگ کی ہر

حقیقت میں ڈھل گیا۔

شایستہ سید ایمن

یکم جنوری ۲۰۰۱ء

## شایستہ سید ایمن

ہنٹنگٹن، لانگ آئی لینڈ، امریکہ

”بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑنا“ ایک حسین محاورہ ہے۔ لیکن ”بات کرنے میں کہانی بننا“ بھی ایک فن کارانہ محاورہ ہو سکتا ہے۔ شایستہ سید ایمن سے گفتگو کرتے ہوئے یہ محاورہ آپ ہی آپ میرے ذہن میں آ گیا۔ یہ ان کے عالم اور شاعر شریک حیات سید مامون ایمن کی رفاقت کا نتیجہ تو ہوگا ہی لیکن خود شایستہ کی اپنی شخصیت بھی تخلیقی ہے۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی شایستہ یقیناً ”چہار درویش“ کے کسی سلسلے سے نسبت رکھتی ہیں۔ ویسے تو ایک درویش سید مامون ایمن کی ذات میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس لمحے مجھے محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کی وہ میٹھی بانی بھی یاد آتی ہے جو انہوں نے برسوں پہلے اپنے مضمون ”جدید افسانے کے رجحانات“ میں کہی تھی۔ ”خدا نے جس دن انسان کو پیدا کیا اور شیطان سے سجدہ کرنے کے لئے کہا، اسی دن ایک افسانہ ہو گیا۔ شیطان نے جب انکار کیا تو اسی کے ساتھ کشمکش کا عمل وجود میں آ گیا۔ یہ کشمکش اس وقت اور نمایاں ہوئی جب شیطان نے ماں کو اور غلایا اور ماں نے وہ کام کیا جس کے لئے انہیں منع کیا گیا تھا۔ اچانک ہی بیٹیاں بفضل تعالیٰ آج تک یہ ہی کام کر رہی ہیں۔ شاید پہلا افسانہ وہ تھا جو ماں نے گندم کھانے کے بعد باوا آدم کو سنایا اور بتایا کہ کیسے سانپ نے انہیں گندم کھانے پر آمادہ کیا اور وہ گندم سرعریز کی قسم کیسا مزیدار تھا۔ ماں نے اُسے باوا



آدم کے پاس لے آئیں۔ اور غمزوں، عشوؤں اور اداؤں کے ساتھ کہا کہ وہ بھی اسے کھائیں۔ یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اس دن سے لے کر آج تک اولاد آدم جن نتائج تک پہنچتی ہے انہیں ماں جو اکی طرح بیان کر دیتی ہے اور اولاد آدم کا یہ بیان افسانہ ہو جاتا ہے۔

یہ اقتباس بذات خود ایک افسانے کی تمہید اور آغاز بھی ہو سکتا ہے۔ شاید یہ بھی ماں جو اکی بیٹی ہے اور ماں جو اکی بیٹیوں کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں ان کے ملک سے، ان کی تہذیب سے ان کی شہر کی گلیوں سے اور اس نیویارک کی دین سے بھی نکلتی ہیں جہاں افسانہ نویس شاید آج کل رہتی ہیں۔ ان کی مختصر کہانی ”آئینہ“ ماضی سے لے کر حال تک کا افسانہ ہے۔ ایک المیہ ہے جس نے کئی خاندانوں کو اپنے بچوں میں دبوچ رکھا ہے۔ شاید نے یہ آئینہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھا ہے اور پوچھا ہے، ہم کہاں سے چلے تھے؟ ہم کہاں پہنچے ہیں؟ شاید نے اختصار سے اور کتنی خوب صورتی سے یہ بات کہہ دی، دیکھئے.....

آئینہ

سکارس ڈیل، نیویارک کے خوب صورت علاقے میں واقع ڈیزے ایکڑ پر محیط ایک حویلی نمائنگ کے پورچ لائٹ (porch light) پیش گاہ کی بتی (چندن کی کرنوں کو ہمیشہ شکست دے کر اپنی مادی برتری منوا چکی تھی۔ گوشی کی بند ہوتی آنکھوں کے سامنے آج وہی برتری، کم تری اور کم مائیگی کا روپ دھارتی نظر آتی۔ سردی اور نشے کے باعث کپکپاتا جسم انگلیاں صحیح طرح استعمال کرنے میں ناکام رہا۔ چابی اگر کی ہول (keyhole) چابی سوراخ) میں چلی جاتی تو بڑا سا دروازہ خاموشی سے کھل کر گوشی کو حسب معمول ایک آشنا اجنبیت سے ہمکنار کر دیتا۔ لیکن آج اس کے لئے ہر بات غیر موافق ثابت ہو رہی تھی... سردی، نشہ، بوائے فرینڈ رابرٹ سے ڈسکو (disco) قرصہ) میں تو تو میں میں اور بند دروازہ۔ اس نے (کھیا ہٹ) کھیاں پت میں کال بل (callbell) گھنٹی) بجانا شروع کر دی۔

پروجیکٹ انجینئر واجد خان صاحب اپنے بیڈروم (bedroom) خواب گاہ) میں پڑے خزانے لے رہے تھے۔ سترہ سالہ نومی ایک اسکول ٹریپ (school trip) پرواٹکٹن ڈی سی گئی ہوئی تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بابر عرف بابی نے کبل میں سے سر نکال کر گھنٹی کی آواز کو چند لمحوں کے لئے سنا اور سو گیا۔

ماسٹر بیڈ روم میں ڈاکٹر نوری خان ایمرجنسی (emergency) ہنگامی) میں دو بڑے آپریشن (operation) عمل جراحی) کرنے کے بعد گرم گرم شاور (shower) لے کر لیٹنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہوں نے گھنٹی کی آواز سنی۔ انٹرکوم (intercom) پروالیوم (volume) جیٹے صدا) بڑھائی اور سیکورٹی کیمرہ (security camera) آن (on) کیا تو گوشی کو مین گیٹ (main gate) صدر دروازے) پر کھڑا پایا۔ انہوں نے روزمرہ کے کسی عمل کی طرح بٹن دبایا تو دروازہ بکڑ (buzzer) کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

گوشی اندر داخل ہوئی۔ نوری گراؤنڈ فلور (ground floor) چلی منزل) کی طرف لپکی۔ ماں بیٹی کا آنا سامنا دوسری منزل کی چوڑی، موٹے قالین والی سیڑھیوں پر ہوا۔

ماں نے بیٹی کے چہرے پر غفلت منتشر پائی۔ بیٹی کو ماں کے وجود میں عدم الفرستی بکراں نظر آتی۔ دونوں



کی نگاہوں میں سوالات تھے لیکن دونوں کے لبوں پر خاموشی تھی۔

مغربی رہن بہن، مشرقی اقدار پر غالب آچکا تھا۔ کسی ٹھانڈی مارتے دریا کے کنارے ایک دوسرے کو دیکھتے تو سکتے تھے لیکن گلے مل کر کوئی سرگوشی کرنے سے مجبور تھے۔

جینی گوش اپنے کمرے کی جانب آہستگی سے بڑھی اور ماں، ڈاکٹر خان نے خود کو اپنے بچے سجائے کمرے کی طرف گھسیٹا۔

جینی کا کمرہ روشن ہوا اور پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

ماں کو قید آدم آئیے میں اپنا وجود پہلی بار اجنبی سالک۔ اس نے کمرے کی ساری جتیاں جلا دیں۔ اجنبی وجود چمک اٹھا۔ چمک نے ہر دھندلا منظر واضح کر دیا۔ کراچی، لندن، ایف آر سی ایس، بے بی سٹرز (baby sitters) بچوں کی آئینیں (ڈے کیئر سنٹرز Day Care Centres) دن کے بودگاہان طفل، واجد خان، شراب، کاریں، بینک بیلنس (bank balance) میں اثاثے، سرکار ڈیل، مصروفیات اور خواہشات کی کبھی نہ ختم ہونے والی فہرست۔

ماں کی آنکھیں جھپکیں تو آئیے میں ایک نیا منظر ابھرا۔ ننھی نوری، مانی جان کا گلاب سا چہرہ، چٹائی پر بیٹھی ہوئی چھ چھ سات برس کی لڑکیاں، سپارے، جزدان، سروں پر دوپٹے، چہروں پر معصوم مسکراہٹیں، اور دعا کو اٹھائے ہوئے ہاتھ۔

ننھی نوری اپنی آنکھوں میں کوئی اور منظر ابھرنے سے پہلے، ایک بڑی سے الماری کی جانب لپک کر ایک پرانی جانماز ڈھونڈنے لگی۔

اب ہم اسی افسانہ نویس شاہستہ سے کچھ باتیں کریں جو ۱۶ ستمبر ۱۹۵۵ء کو لاہور، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ شاہستہ بتاتی ہیں، ”میرے والدین کا آبائی وطن پرگنہ چائل، ضلع الہ آباد، یوپی ہندوستان ہے۔ میری تمام تعلیم لاہور میں ہوئی۔ میرے بچپن اور جوانی کی ہر یاد لاہور سے وابستہ ہے۔ ہم سات بہنیں اور چار بھائی سیف الدین سید اور رحم بی بی سید کی اولاد ہیں۔ میرے چاروں بھائی عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ وہ سب جنت مکانی ہیں کہ بچپن میں وصال پانے والا ہر فرد ہر گناہ سے محفوظ ہونے کے باعث جنت مکانی ہوتا ہے۔ بہنوں میں میرا درجہ پانچواں ہے۔ میرے والد ادب پسند تھے۔ ان سے ادب پسندی ہم ساتوں بہنوں کو ملی۔ میرا گھرانہ خوش باش تھا۔ ہم سب بہنوں نے دینی تعلیم گھر میں حاصل کی اور دنیاوی تعلیم لاہور کے مختلف کالجوں میں۔ میری ایک بڑی بہن شاہدہ سیف سید نے اپنا پہلا ناول چودہ (۱۴) برس کی عمر میں لکھا تھا۔ یہ ناول لاہور میں چھپا تھا۔ شاہدہ آ پاپا شاہدہ احمد ہیں۔ شاہدہ آ پاپا کے دولہا، عزیز احمد موسیقی اور فوٹو گرافی کا خاص شغف رکھتے ہیں۔ شاہدہ آ پاپا قاعدگی سے افسانے لکھتی ہیں۔ ان کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ بھی تقریباً تیار ہے۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان دنوں وہ اپنی سرگزشت لکھنے میں مصروف ہیں۔ ان کا گھر لندن کا ایک ادبی مرکز ہے۔ فن افسانہ نگاری کے ضمن میں میں شاہدہ آ پاپا سے متاثر ہوں اور حسن زبان کے ضمن میں اپنے شریک حیات مامون ایمن سے۔ میری تحریروں میں مکالمہ نگاری اور خطابت ان ہی دونوں شخصیتوں کی مرہون منت ہیں۔ شاہدہ آ پاپا بی بی سی ریڈیو، لندن سے اور ایمن صاحب وائس



آف امریکہ ریڈیو نیویارک سے برسوں کی وابستگی کے دوران اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔  
 ایمن صاحب سے میری شادی ۱۹/ دسمبر ۱۹۸۷ء کو ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے میں ایمن صاحب کو شمالی امریکہ کے ایک معروف شاعر، نقاد اور براؤ کا سٹر کی حیثیتوں سے غائبانہ طور پر جانتی تھی۔  
 یہ شادی ان کے والد اور میری والدہ کی پسند سے ہوئی کہ اس شادی کے وقت ان کی والدہ نیویارک میں مقیم تھیں اور میرے والد ۱۹۷۸ء سے جنت میں مقیم ہیں۔ میری ساس بھی مجھے بہت چاہتی ہیں۔  
 میرے والد زندہ ہوتے تو وہ بھی میرے شوہر کو ہمہ مصفحتی کے باعث پسند کرتے۔ یوں یہ شادی بزرگوں کی پسند کا نتیجہ ہے۔

ہمارے تین بیٹے ہیں، طے، زین اور سمیع۔ ہم سب نیویارک سے مشرق میں واقع ایک خوب صورت شہر، ہینگلٹن، لانگ آئی لینڈ میں رہتے ہیں۔ ہمارا اپارٹمنٹ مین ہٹن، نیویارک شہر کے ایک خوب صورت علاقے میں ہے (لفظ 'خوب صورت' تکلفاً نہیں حقیقتاً استعمال کیا گیا ہے کہ اس کا سراغ میرے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے)۔

ایمن صاحب کا تعلق ادب سے پرانا بھی ہے اور اہم بھی کہ وہ شمالی امریکہ میں اردو ادبی سرگرمیوں کے بانی بھی ہیں۔ میں نیویارک بیاہ کر آئی تو مجھے ایمن صاحب کے مقامی اور دیگر جگہوں پر مقیم ادبی ساتھیوں سے ملنے، ان کے بارے میں جاننے کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارے گھر میں ادبی محفلیں باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہیں۔ امریکہ، کینیڈا، پاکستان اور ہندوستان کے قلم کار ہمارے مہمان ہوتے ہیں۔ ہم دونوں خوش قسمت ہیں کہ ہمیں عمدہ ادبی ساتھی میسر ہیں۔ ان ساتھیوں میں حمیرا رحمن، ڈاکٹر شہلا نقوی، فرحت زاہد، سردار سوز، صفوت علی، رئیس وارثی، جمیل نیر، ڈاکٹر نوید گیلانی اور الطاف ترندی نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ ہمارے گھر میں ڈالروں کی نہیں ادب کی بات ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں ادب اور صرف ادب کا چرچا ہے۔ اس ودیعت پر میں رب العزت کا شکر ادا کرتی ہوں۔

میں نے کب اور کیسے لکھنا شروع کیا اس حوالے سے میں کہوں گی کہ شعبہ صحافت سے تعلق کے باعث تحریر میری ضرورت بنی۔ اس ضرورت میں 'تخلیقی ادب' کم تھا اور 'خبری ادب' زیادہ۔ میں افسانے کی صنف سے 'مزاجاً' واقف تھی۔ افسانہ میرے رجحان تحریر کی اساس تھا۔ افسانہ میرے اظہار کی اولین صنف تھا۔ نیز میرا بچپن بھی اور کالج کا تعلیمی دور بھی ادبی ماحول میں گزرا تھا۔ اس کے بعد، مامون ایمن صاحب سے شادی کے بعد، لاہور سے نیویارک آئی تو اپنے نئے گھر کا ماحول بھی خالصتاً تعلیمی اور ادبی پایا۔ یوں میرے شوق نے جلا پائی اور میں نے نیویارک میں افسانہ نگاری کا آغاز دوبارہ یا یوں کہیے کہ باقاعدہ آغاز کیا۔ یہ ایک ہمت افزا اور خوش آئند آغاز تھا کہ مجھے ایمن صاحب کی دانشورانہ رفاقت بھی حاصل تھی اور ہنوز حاصل ہے۔ میں شعر نہیں کہتی حالاں کہ بقول ایمن صاحب، 'شاید وزن میں ہیں'۔ میں موزوں شعر کہہ سکتی ہوں لیکن باوجود اس کے میں شعر نہیں کہتی۔ میرے افسانوں کا مجموعہ بھی ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ یہ مجموعہ اردو اور انگریزی میں ایک کتاب کی صورت میں چھپے گا۔ (ایمن



صاحب میرے افسانوں کا ترجمہ انگریزی میں کر رہے ہیں)۔ یاد رہے کہ ایمن صاحب نیویارک میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ میں نے مجوزہ مجموعے کا نام 'جیون دھارا' رکھا ہے کہ اس میں پاک و ہند اور امریکہ میں مقیم کرداروں پر مبنی کہانیاں شامل ہوں گی۔

سلطانہ جی، اردو ادب کو اپنا کر میں کیسے خسارے میں رہتی جب کہ اردو ادب سے میری وابستگی نہ ذاتی شہرت کے لئے ہے اور نہ ہی کسی مالی منفعت کے لئے۔ میرا قلم معاشرے کی خدمت کے لئے مخصوص ہے۔ میرا قلم اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے مخصوص ہے۔ نیز یہ کہ میری تحریریں دوسری زبانوں میں منتقل ہوں گی تو دوسرے معاشرے بھی میرے معاشرے کی اقدار سے فنی طور پر متعارف ہو سکیں گے۔

ادب کی گروہ بندیوں کے حوالے سے کہوں گی کہ ادیبوں کے درمیان پائی جانے والی گروہ بندی ایک فطری بات ہے۔ یہ مختلف اذہان، مختلف افکار، مختلف رجحانات، مختلف نظریات اور مختلف اسالیب کو جنم دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی ماحول میں پائے جانے تمام اذہان کی راہ ایک ہو، منزل ایک ہو۔ لیکن منفی گروہ بندی تخریب کا باعث ہوتی ہے اور مثبت گروہ بندی تعمیر کا باعث۔ تخریب میں بھی تعمیر کے پہلو تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

میری رائے میں جدت کے نام پر افسانے کی صنف کو زک بھی پہنچی..... بجا..... لیکن یہ تعمیر پہلو بھی تو پیش نظر رکھیے کہ اس صنف سے غیر ضروری قنوطیت کا اخراج ہوا۔ غلامتی افسانے نے اسلوب کے ضمن میں بہت سے نئے درتے کھولے جن سے تازہ ہوا آئی اور اردو افسانہ دیگر زبانوں کے افسانوں کی جہت اور معیار کے قریب ہوا۔

زمانہ بدلا تو معاشرے کی ضروریات اور ترجیحات بھی بدلیں۔ آج کا دور کل کے دور سے معاشی، معاشرتی، مالی اور جغرافیائی طور پر مختلف ہے۔ مواصلات اور ابلاغ کے ذرائع ماضی سے مختلف ہیں۔ سیاست اور عقیدے نے کروٹیں بدل لی ہیں۔ ان میں سے بیشتر تبدیلیاں اردو افسانے میں نظر آنے لگی ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ تبدیلیاں اور مؤثر ہوں گی۔

'گلوبل ویلج' عہد حاضر کی ایک حقیقت ہے۔ اردو افسانہ بھی اس حقیقت سے کسی قدر آگاہ ہے۔ آئندہ اس حقیقت کے اثرات مزید ظاہر ہوں گے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح اردو زبان کا افسانہ بھی اس حقیقت کے اعتراف اور ارتقا کے عوامل کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص ثقافتی ورثے کے تحفظ اور بقا کے لئے کام زن ہوگا۔ بہت ممکن ہے آئندہ اردو افسانہ 'تہ داری' کے اسلوب سے بچ کر چلنا چاہے اور 'براہ راست' مختصر طرز نگارش اپنائے۔ آج کا دور طویل تہ دار افسانوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اردو رسم الخط کی تبدیلی کا سوال سن کر شاید نے کہا: "جی نہیں، ہرگز نہیں..... میں اردو کا رسم الخط بدلنے کی حامی نہیں۔ اردو زبان کی پہچان اردو رسم الخط سے ہے۔ اردو زبان کا رسم الخط بدلے گا تو اردو زبان کی پہچان ختم ہو جائے گی۔ کل کی طرح آج بھی اور کل بھی یہی رسم الخط برقرار رہنا چاہیے۔



رسم الخط بدلنے سے ہمارا ادبی ورثہ بے زبان ہو جائے گا۔ اردو ادب کا مزاج بھی اور خط بھی اسی رسم الخط میں مضمر ہے۔ یہ مزاج اور یہ خط کسی اور رسم الخط میں نہیں جھٹک سکتے۔ ثبوت درکار ہو تو کسی اردو غزل کو خود ہی رومن رسم الخط میں لکھ کر پڑھنے کی کوشش کیجئے۔ جھنجھلاہٹ آپ کو پریشان کر کے رکھنے پر مجبور کر دے گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آج کے کمپیوٹر عہد میں بچوں کو اردو بولنے کے ساتھ ساتھ اسے رومن میں لکھنے کی ترغیب دلائی جائے تاکہ وہ اردو دان معاشرے اور احباب سے جڑے رہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو اردو رسم الخط سیکھنے کی ترغیب بھی دلائی جائے تاکہ وہ اصل سے آگاہ ہو سکیں۔“

شایستہ کن ادیبوں کی تحریروں کو پسند کرتی ہیں، اس ضمن میں کہتی ہیں، ”میرے نزدیک پریم چند اردو افسانے کے قائد ہیں۔ کرشن چندر نے اس صنف کو جلا بخشی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور منشا یاد نے اس صنف کو بہت کامیابی سے آگے بڑھایا ہے۔ قرۃ العین کا اسلوب بھی میری رہنمائی کرتا ہے۔ اس ضمن میں کئی اور نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔“

میں نے یورپی ادب بہت کم پڑھا ہے لہذا اس ضمن میں کچھ کہنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔“

”شایستہ اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سناؤ۔“ شایستہ مسکرائیں۔ پھر بولیں، ”آپ بھی بڑی وہ ہیں۔۔۔۔۔ یہ یادگار واقعہ والی غیر شاعرانہ بات کہاں سے لے آئیں؟ لیکن آپ نے پوچھ ہی لیا تو لیجئے سن لیجئے۔ ہوا یوں کہ مامون ایمن نامی ایک استاد، بزرگ شاعر کو میرے ہاں آنا تھا۔۔۔۔۔ میرے رشتے کے لئے۔ میں چڑی بیٹھی تھی کہ اماں کو آخر یہ کیا ہو گیا جو انہوں نے اس بندے کو بلایا۔ میرے کئی رشتے اور بھی تھے۔۔۔۔۔ مزے مزے کے، دل چسپ، اچھے اچھے۔ لیکن امی تھیں کہ بن دیکھے اس امر کی شاعر پر فدا ہو گئیں۔ بہر حال، مامون ایمن نامی ایک امیدوار اپنے بچپن کے دوست طارق ظفر شیخ کے ہمراہ ہمارے ہاں آیا۔ میں ہی کیا بلکہ میرے گھر کا ہر فرد اس امیدوار کو دیکھ کر نہ صرف حیران ہوا بلکہ ششدر بھی ہوا اور ہکا بکا بھی۔ یہ امیدوار تو ایک نہایت ہنس مکھ، خوش شکل ’نو جوان‘ تھا۔ وہ چند لمحوں کی گفتگو کے بعد ہی ہمیں ہمارے ہی گھر میں ’مہمان‘ بنا بیٹھا۔ ہم سب دم بخود تھے کہ یہ جادوگر کون ہے؟ تیسرے روز میں بیگم ایمن بن گئی۔ اور تیرہویں روز امیگرنٹ ویزا (Emigrant visa) پر نیویارک آ گئی۔ یوں ایک یادگار واقعہ نے میری زندگی کی تمام بڑی چھوٹی خواہشات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر یک جا کر دیا۔ یوں کہیں کہ ایک خواب، ایک واقعے کی صورت ابھرا اور زندگی کی ہر حقیقت میں ڈھل گیا۔ (تو شایستہ! مامون ایمن جی سے آپ کی شادی کا واقعہ غیر شاعرانہ ہے؟۔ سلطانہ مہر)

Mrs. Shaesta Syed Aiman,

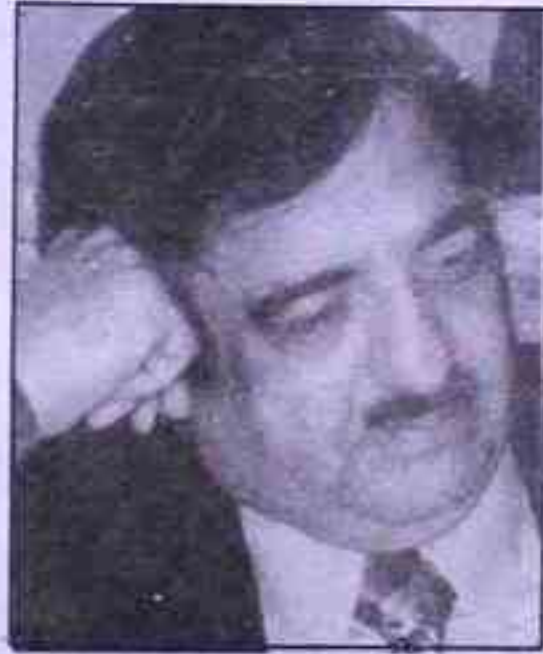
20 Biscayne Drive, Huntington, N Y 11743, USA

نوٹ: ہم نے محترمہ شایستہ کے نام کے اردو میں وہی سبب قبول کیے ہیں جو انہوں نے خود لکھے ہیں۔ سلطانہ مہر



”سلطان“ مہر

اور دو گے سو بھاگے میں لکھے بابا جی جی امان بھی  
ہیسا آج تکہ اکہ بھٹا ”اسی سلطان“ ماجی



ڈاکٹر شبیر احمد بن عبدالرشید

فلوریڈا، امریکہ

شاعر و فلاسفر ڈاکٹر شبیر احمد (ایم ڈی) کو میں نے جب پڑھا، وہ مجھے رسول خدا کے سچے پرستار اور علامہ اقبال کے اشعار کی تفسیر نظر آئے۔ اس خیال کی تصدیق علامہ اقبال کے صاحبزادے محترم ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس رائے سے ہوتی ہے جس کا اظہار انہوں نے ڈاکٹر شبیر احمد کی تصنیف ”نئی صدی نیا الف“ میں کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں: ”حالیہ برسوں میں ڈاکٹر شبیر احمد عالم اسلام کے روشن خیال اسکالر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ بہت سے صاحبان نظر انہیں اردو زبان کا بہترین ادیب اور مصنف قرار دے رہے ہیں۔ میری رائے میں وہ عصر حاضر میں علامہ اقبال کے بہترین ترجمان ہیں۔ آپ ڈاکٹر شبیر احمد کی کوئی اردو یا انگریزی کی کتاب پڑھنے کے بعد ان خیالات سے غالباً متفق ہوں گے: ”نئی صدی نیا الف“ مراد ہاف مین کی انگریزی کتاب ’اسلام ۲۰۰۰‘ کی ترجمانی ہے ترجمہ نہیں۔ ترجمے کے بجائے ترجمانی کر کے ڈاکٹر شبیر احمد نے بہترین فیصلہ کیا ہے۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی کہ ایک اور پینل رائٹر کو ترجمہ کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔“

اب ڈاکٹر شبیر احمد کی کتابوں کی فہرست ملاحظہ ہو:

۱۔ مہدی اور مسیح کب آ رہے ہیں (اردو/انگریزی، دوزبانوں میں)



- ۲۔ نئی صدی نیا الف
- ۳۔ گربا کی حقیقت: قاتلان حسین پاری تھے
- ۴۔ اسلام میری نظر میں یعنی میں کرسچین کیوں نہیں ہوں (اردو/انگریزی/ہسپانوی)
- ۵۔ اسلام کے مجرم (اردو/انگریزی) ۶۔ بندہ اور رام راج کے خواب
- ۷۔ دی آئیڈیل پرافٹ محمد رسول اللہ (انگریزی) [The Ideal Prophet  
[Muhammad Rasool-Al'lah SAW
- ۸۔ اسلام فار دی جونئر (اردو/انگریزی) [Islam for the Junior]
- ۹۔ انتخاب حدیث ۱۰۔ برگ حشیش (قصہ احمدیت)
- ۱۱۔ کالکی اوتار محمد صاحب ۱۲۔ ہمارے قائد اعظم
- ۱۳۔ کرسٹی سے آمنہ تک (اردو/انگریزی) ۱۴۔ بزم کہکشاں
- ۱۵۔ ۲۱ ویں صدی کس کی ہے؟ ۱۶۔ فلر چمن (مجموعہ کلام)
- ۱۷۔ آہٹ (نیگم فریدہ شبیر کے کالموں کا مجموعہ)

ان میں سے چند کتابیں ان کی صاحبزادی عائشہ احمد نے نونہالوں کے لئے لکھی ہیں جب کہ بارہ سالہ عائشہ خود ابھی طالبہ علم ہیں مگر بابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ابھی سے اسلام کے پرچار کے لئے انہوں نے خود کو وقف کر دیا ہے۔ ڈاکٹر شبیر احمد نہ صرف نوائے وقت، پاکستان کے مستقل کالم نگار ہیں بلکہ ہفت روزہ اردو ناٹمنر، نیویارک میں بھی دستک کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے ہیں۔ ان کی شگفتہ تحریر کے بارے میں محترم مرحوم ضمیر جعفری لکھ گئے ہیں۔ ”ڈاکٹر صاحب قلموں کی سنگین محرابوں میں جس صنعت کاری کے ساتھ چراغوں کی قطاریں روشن کرتے چلے جاتے ہیں یہ کلا کاری ان کو اس شگفتگی اور بشاشت کی بدولت نصیب ہوئی ہے جو ان کی طبیعت میں ایک قدرتی چشمے کی طرح موج زن ہے۔ مختلف علوم و فنون پر معلومات کی وسعت حیران کن ہے۔ تاریخ عالم تو ان کے کالموں میں ہوا کی طرح چل پھر رہی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو شخص اتنا پڑھتا ہے وہ اتنا اور ایسا لکھتا کس وقت ہے۔ ان کے علم کی گہرائی اور گیرائی ان کی تحریر کا ایک امتیازی وصف ہے جس کے بغیر صحافتی اور ادبی کالم ’نڈ منڈ‘ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیر احمد کو ان کے منفرد انداز اور علم کی وسعت کے اعتبار سے ’کالم نگاروں کا کالم نگار‘ اور ان کی طبیعت کی شگفتگی کے لحاظ سے ’مسلمان اخلاق کا مزاج نگار‘ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جناب شیخ کا نقش قلم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔“

اب ذرا ہم آپ کو ڈاکٹر شبیر احمد کے ایک کالم کی معلوماتی سیر کرادیں۔ میں خود اپنے پیارے بھائی ڈاکٹر شبیر احمد کی شگفتہ تحریر کی شیدائی ہوں کیونکہ ان میں معلومات کا ایک ساگر بھی رواں دواں ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کے کئی کالم محفوظ ہیں۔ ان میں ایک کالم ۱۵/ مارچ ۲۰۰۷ء بروز جمعرات بعنوان ”رام اور رحیم“ اردو ناٹمنر، نیویارک میں شائع ہوا تھا۔ اس کالم کی ابتدا علامہ اقبال کی نظم ’نیا سوال‘ کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برانہ مانے تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے



اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے اور پھر لکھتے ہیں:

آج ۲۰ / فروری ۲۰۰۲ء ہے۔ اور کل یعنی ۱۹ / فروری کو امریکی حکومت کی جانب سے مذہبی اداروں کی مالی امداد کے لئے ایک نئے ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ امریکی صدر جارج ڈبلیو بوش نے فلاڈلفیا میں اس ادارے کا افتتاح کر دیا ہے۔ ہندو تحریک "ہرے رام ہرے کرشنا" کے لئے کئی ملین ڈالر مخصوص کر دیئے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق ابتدا میں (۳۰) ملین ڈالر سے ہوئی ہے۔ ہماری قوم کے ماہرین فرما سکتے ہیں کہ یہ امریکہ کی ہندو نوآوری ہے۔ ہم اپنے ماہرین سے دو قدم آگے بڑھ کر کہیں گے کہ ۱۹۹۸ء میں مل کلنٹن کوئی وی پر دکھایا گیا تھا کہ وہ کتابوں کی ایک دکان میں خریداری کر رہے ہیں۔ جو کتاب انہوں نے منتخب کی وہ انڈیا کے بارے میں تھی۔ ہمارا تعلق چونکہ ماہرین کی قوم سے ہے لہذا ہم بجلی کی تیزی سے ایک نتیجہ تک پہنچ گئے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جناب صدر اب کسی ہندی موزیکا کی تلاش میں نکل پڑیں گے۔ اس گوبی کے چکر میں انہیں بھارت ماتا کی گود میں بیٹھنا پڑا تو ماتا کہہ کر بیٹھ جائیں گے۔ اور پھر صاحبو ایسا ہی ہوا۔ "ہرے کرشنا" کو دی گئی گرانٹ پر ہم اپنا دل یہ کہہ کر بھی بہلا سکتے ہیں کہ کافر تو سب ایک ہی قوم کے ہوتے ہی ہیں۔ یہود، ہندو، نصاریٰ کا لٹھ جوڑ نہ ہوگا تو کیا شیعہ سنی کا اتحاد ہو جائے گا؟

صاحبو! یہ ماہرانہ تجربے بجا صحیح، لیکن اب ایک سہر ماہرانہ بات سنئے۔ سچائی سے بڑھ کر سہر چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔ اور ہمارے لئے سبق آموز سچائی یہ ہے کہ ہرے کرشنا تحریک نے بیس (۲۰) برسوں میں امریکہ کے چالیس (۴۰) شہروں میں دفاتر قائم کیئے ہیں۔ اور یہ صرف دفاتر نہیں جہاں ٹائپ رائٹر کھڑکتے ہوں یا صرف کمپیوٹر چمک چمک کر رہے ہوں، یہ مراکز ہیں عمل کے مراکز۔ کیا کیا ہے انہوں نے اس بیس (۲۰) برسوں میں؟ بے گھر لوگوں اور پرانے فوجیوں کے لئے پناہ گاہیں (shelters) بنائی ہیں۔ منشیات ترک کرنے والوں کے لئے خصوصی صحت یابی کے نرسنگ گھر بنائے ہیں۔ جیل کی سزا کاٹ کر باہر آنے والوں کے لئے نفسیاتی اور سماجی بحالی کا بندوبست کیا ہے۔ ہرے کرشنا والوں نے اپنے خدا کی علامت کیا ڈیزائن کر رکھی ہے؟ ٹیلی جلد والا ایک چھوٹا سا کمزور لڑکا۔ مقابلتا یہ بھی نوٹ کرتے چلیئے کہ امریکہ میں اسلامی کہلائی جانے والی ڈیز ۱۵۰ (۱۵۰) انجمنیں قائم ہیں۔ تنظیمیں ہیں تحریکیں ہیں، ایسی تحریکیں جو چلتی ہی نہیں۔ یہ تحریکیں مسجدیں تو بنالیتی ہیں، نمازی بھی ان میں آجاتے ہیں صاحب اوصاف حجازی دیکھنے میں نہیں آتے، یعنی ایسے اصحاب جو بنی نوع انسان کی خدمت کر کے اسلام کو بلند نام کر سکیں۔ جمعہ کے دن امام صاحب جھومتے جھامتے منبر کی طرف بڑھتے ہیں اور مائیکروفون کو پکڑ کر چیخا چلانا شروع کرتے ہیں۔ ان کی تقریر میں نہ مغز ہوتا ہے نہ سر پیر۔ اصول یہ ہے کہ آواز جتنی بلند ہو پیغام اتنا ہی بے جان ہوتا ہے۔ ماحولیات کے معاملے میں غیر معمولی حساس ملک امریکہ میں مسجد آپ کو واحد جگہ ایسی نظر آئے گی جہاں دو سو (۲۰۰) کی گنجائش میں تین ساڑھے تین سو لوگ بیٹھے ہوں گے، ایر کنڈیشننگ کمزور ہوگی، تازہ ہوا کا ایک جھونکا اندر نہیں آسکے گا اور اس پر مائیکروفون اور الفاؤ ایڈیکر پوری آواز سے چلاتے ہوئے ملیں گے۔ نمازی سر پر رومال باندھے، ٹوپیاں پہنے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ یقین فرمائیے کہ دنیا کی کوئی قوم اس طرح کی بدسلوکی، گھٹن اور بے انتظامی برداشت نہیں کرتی۔ ملا جیل چکا تو قناعت دو چار ماتھے ٹیکے، جوتیاں اٹھائیں اور خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ مسجد میں دنیا کی بات چیت حرام، کون بیمار ہے؟ کون بے روزگار ہے؟ کس تنظیم، بیوہ اور غریب کو مدد کی ضرورت ہے؟ ہم کیا تعمیری کام کر سکتے ہیں؟

صاحبو اقیامت ہے کہ مسلمان آج تک اتنی ہی بات نہیں سمجھ سکے کہ موت کے بعد جسم بے معنی ہو جاتا ہے۔ آپ



اسے مکہ مدینہ میں دفن کیجئے یا یہ وہ نصاریٰ کے بیچ کا مٹاؤ صرف جانے والے کے اعمال آتے ہیں لیکن ماہ کی دو مسجد تک اور عوام کی دو قبرستان تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟ اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام (اقبال) نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ مسلمانوں کی ذینہ سو (۱۵۰) انجمنوں نے مسجد مدرسہ نظامی اور قبرستان کے سوا اور کچھ نہیں بنایا۔ ہمارے علم کے مطابق مرغیوں کے دڑے اور کبوتروں کے کابک تک نہیں بنائے۔ چندے کی پکاریں ہیں، اپیلیں ہیں، فنڈ ریزنگ کے ڈرامے ہیں، پھر سیاستیں ہیں، عہدہ داریوں کی تمنائیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہیں تو نمازی ہیں۔ پراکتہت اصولو کہیں نہیں۔

تیری نماز بے سرور تیرا امام بے حضور ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر (اقبال) صاحبو! یقین فرمائیے اب جو سطریں ہم لکھ رہے ہیں اس حال میں کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور جسم پر روٹھے کھڑے ہیں۔ لکھنے والی ہماری نیگم کو ہماری آواز بھرائی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ صدر جارج ڈبلیو بوش نے ہرے کرشنا کے لئے بہت سے پلین فرام کرتے ہوئے یہ کہا ہے .... ”ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ آپ کے عقیدے کیا ہیں؟ ہم یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ آپ نے اپنا مذہب مشرق کو کر لیا ہے یا مغرب کو؟ ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ آپ کے پروگرام نے کیا نتائج حاصل کیے ہیں؟“

اب بھی آتا نہیں گر آنکھ میں آنسو کوئی یہ مری شعلہ بیانی کی کمی ہے یا تری سادہ دلی (شہیر) اہل دل خواتین و حضرات سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ایک سو ستتر (۱۷۷) کھول کر دیکھ لیں۔ ”نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق و مغرب کی طرف منہ کرلو“۔ پھر ایمان کا ذکر ہے اور پھر رشتہ داروں، رقیبوں، مسکینوں، مسافروں، سواہیوں اور مالی بوجھ کے تلے دبے انسانوں کا۔

ہم نہیں سمجھتے کہ جناب بوش کو قرآن کریم پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ قرآن کریم کا مجروح سمجھ لیجئے کہ انسان جب منزل مقصود کی طرف چلتا ہے اور اسے پالیتا ہے تو قرآن کو وہاں پہلے سے موجود پاتا ہے۔ کتاب اللہ میں نہایت عملی (pragmatic پرکینیکل) طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یوں کرو گے تو یہ ہوگا، ویسا کرو گے تو وہ ہوگا۔ اس اصول پر ایمان محکم کی وجہ سے مرد مومن فیروں کو اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے تمہارے لئے تمہارا راستہ اور میرے لئے میری راہ، نتائج خود بتائیں گے کہ کون سیدھی راہ پر گامزن تھا۔ جارج ڈبلیو بوش نے قرآن کی اس حقیقت کو پالیا اور خود کو صاحب قرآن سمجھنے والی قوم اسی بحث میں لگی ہے کہ کون سی سورۃ سچی ہے اور کون سی مدنی۔ سچائی کی آواز بہت دور تک جاتی ہے۔ صاحبو! ہماری ننھی بیٹی نے انٹرنیٹ پر غالباً این بی سی کی جانب سے کیا ہوا ایک سروے poll دیکھا ہے۔ تاریخ کی سب سے بااثر، عظیم اور لازوال ہستیوں میں امریکیوں نے ۸۵% وہ نام نامی چنا ہے جو منتخب کیا جانا ہی چاہیئے تھا وہ ہے ہمارے رسول کا۔

آپ کا نام مرے واسطے عنوان حیات آپ کا ذکر عبادت کے سوا کچھ بھی نہیں شعر اچھا ہے لیکن صاحبو! حضور اکرم کا ذکر مبارک اور آپ سے محبت ہے تو عبادت بھی ہے اور سب کچھ بھی۔ اور صاحبو! دنیا دانستہ یا نادانستہ دربار مدینہ کی مست گامزن ہے۔ اگر باندہ رسیدی تمام بولسکی است



آپ نے ڈاکٹر شبیر احمد کے کالم کے آئینے میں ہم مسلم لوگوں کے کردار کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہوگا اور اگر تعصب کی عینک ہمارے چہروں پر نہ لگی ہو تو ہم اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی لریں گے۔ مگر کیا ۲۰۰۳ء میں لکھے ہوئے اس کالم کے بعد ۲۰۰۳ء میں آکر ہم نے اپنی قوم کے لئے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے اہل اسلام کی سر بلندی ہوئی ہو؟

مشہور جرمن فلاسفر فریڈرک نطشے (Friedrich Nietzsche, 1844-1900) نے کیا خوب بات کہی... ”جو زیادتی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے میں تو معاف کر دوں گا۔ مگر اس طرح جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے، اسے کون معاف کرے گا؟“... یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہر گناہ، ہر ظلم اور زیادتی کا منفی نتیجہ خود ہماری ذات پر ہی مرتب ہوتا ہے۔ لیکن غور فرمائیے کہ عظیم فلسفیانہ دانش بھی وحی خداوندی اور حکمت نبویؐ کے آگے کیسے پیچ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک نیکیاں گناہوں کو دور کرتی دیتی ہیں“ اور ارشاد نبویؐ ہے کہ اگر تم سے کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً کوئی نیکی کرو کہ وہ نیکی تمہارے گناہ کو مٹا دے۔ اگر نطشے کا مخاطب کوئی مسلم ہوتا تو وہ مسلم اس کو جواب دے سکتا تھا کہ جب تم مجھے معاف کرتے ہو تو میں اپنے خدا سے رجوع کر کے اور نیکی کر کے اپنی ذات کے خلاف کیا ہوا جرم بھی مٹا لوں گا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے یہ شہ پارہ بھی ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی کا ہے جو ان کی کتاب ”کہکشاں“ میں موجود ہے۔ یہ اور ایسے جانے کتنے شہ پارے ”کہکشاں“ میں موجود ہیں۔ ”کہکشاں“ جو پہلے ایک ماہنامہ تھا اور جس کی کتابت ڈاکٹر شبیر خود کرتے تھے اور ماہ بہ ماہ، بلا قیمت کئی ملکوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، ۱۹۹۵ء میں اس کے اول چھتیس (۳۶) شماروں کو یک جا کر کے انہوں نے انہیں کتابی شکل دے دی۔ اردو زبان سے انہیں والہانہ پیار ہے۔ چنانچہ ”کہکشاں“ میں انہوں نے قرآن اور سائنس کے موضوع پر بڑے معنی آفرین مضامین لکھے ہیں اور انتہائی اختصار کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس کا سرمایہ افتخار قرآن حکیم میں بیان کردہ وہ حقائق ہیں جن تک سائنس رینگتے ہوئے صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد پہنچی ہے۔

میں نے ”کہکشاں“ کے کئی شمارے پڑھے اور ڈاکٹر شبیر احمد کی سچی پیہم، لگن اور جدوجہد سے خاصی متاثر بھی ہوئی کہ یہ شخص بلا کسی معاوضے کے بلکہ اپنی جیب سے خرچ کر کے نہ صرف اردو زبان و ادب کے لئے کام کر رہا ہے بلکہ اپنی تہذیب و ثقافت کی بقا کے لئے بھی برسرِ پیکار ہے۔

ڈاکٹر شبیر احمد ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ٹھیک اسی دن بھیجا جس دن پاکستان وجود میں آیا۔

شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی؟ یہ سوال سن کر کہنے لگے...

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ

ڈاکٹر شبیر نثر میں افسانہ نگاری کو چھوڑ کر تاریخ، دین (نہ کہ مذہب)، کالم نگاری، فلسفہ، عمرانیات اور مزاج نگاری کو پسند کرتے ہیں۔ لکھتے بھی ہیں اور ان موضوعات کا لگن سے مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ”آج



معیاری ادب تخلیق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ادب کو بہت چھوٹی سرحدوں کے اندر قید کر رکھا ہے۔ غور کریں تو قرآن حکیم کائنات میں ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار ہے اور آقائے نامدار نے ادب براہ راست بارگاہ خداوندی سے سیکھا تھا۔ اگر ادب کا مفہوم وہ لیا جائے جو آج مروج ہے یعنی شعر و نثر میں افسانوی اور خیالی 'کبوتر بازی' تو ایسے ادب کی وفات پر مجھے کوئی رنج نہیں ہوگا۔ جس ادب میں گہری فکر اور تخلیق کے عناصر موجود نہ ہوں اس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

ناداں ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے اسباب ہنر کے لئے لازم ہے تنگ و دو

جب تک ہمارا ادیب نام و نمود اور محض ایک اسماٹ بات کہہ دینے سے واہ واہ کا طالب رہے گا وہ زبان یا قوم کی خدمت کرنے سے محروم رہے گا۔ اب رہی بات اردو زبان کے مستقبل کی، تو آپ جانتی ہیں کہ ہمارے شعر اور ادیب کی اکثریت خود اردو کی قاتل ہے۔ ان کے گھروں میں اردو کب بولی جاتی ہے۔ نہ وہ زحمت اٹھا رہے ہیں کہ بچوں کو اردو کی طرف راغب کریں۔ دوسرے اردو میں اور یجنل (original) اور فکری معیاری تخلیقات وجود میں نہیں آرہی ہیں۔ ہندو پاک کے بڑے نامور شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور کالم نگاروں کی حالیہ تحریریں نظر سے گزرتی ہیں تو یہ سوچ کر دل بھر آتا ہے کہ جب ہمارے دانشور طبقے کی ذہنی سطح کا یہ عالم ہے تو شاید اللہ کو بھی ہمارا حافظ ہونا گوارا نہ ہوگا۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈلا گیا ہوں مثل خلیلؑ

ہمارے ہاں یہ سانحہ اتنا عظیم ہے کہ وہ متوفی شاعر قومی فکر و ادب و شعر کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے جسے نوحی پر نحر تھا اور جسے یہ کہہ دینے میں کوئی باک نہ تھا۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

۱۹۹۹ء میں راولپنڈی کے معتبر ماہنامہ "چهارسو" نے اپنے جریدے کا گوشہ بعنوان "قرطاس اعزاز"

ڈاکٹر شبیر احمد کے لئے مخصوص کیا۔

ڈاکٹر شبیر نے "یوم آزادی" (۱) کے حوالے سے ایک دل گداز نظم لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

لیلۃُ القدر، لیلۃُ القرآن

لیلۃُ القدر، اُم پاکستان

وہ میرا دین، یہ میرا ایمان

فَبَايَ الْاِثْمِ رَبِّكُمْ اَنْتَ كَذِبْنُ<sup>۲</sup>

چاند کی جیسی چودھویں راتیں

ویسی چودہ اگست کی باتیں

میرے پروردگار کی سب شان

۱۔ ۱۳/ اگست ۱۹۳۷ء کی رات جب پاکستان بحیثیت ایک ملک آزاد ہوا تو وہ لیلۃُ القدر بھی تھی۔

۲۔ "اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے" سورۃ زمر



فَبَايَ الْاِلهِ رَبِّكُمْ اَنْتُمْ كَاذِبِينَ  
 ہیں خدا کی عنایتیں ہم پر  
 اور نبی کی رحمتیں ہم پر  
 ہم اسی سے ہیں ہم سے پاکستان  
 فَبَايَ الْاِلهِ رَبِّكُمْ اَنْتُمْ كَاذِبِينَ  
 آؤ اٹھ کر سچائیں اپنا چمن  
 رشک جنت بنائیں اپنا وطن  
 جاں سلامت اسی سے اپنی آن  
 فَبَايَ الْاِلهِ رَبِّكُمْ اَنْتُمْ كَاذِبِينَ  
 صرف جغرافیے کی بات نہیں  
 اپنی تاریخ کا وطن ہے امیں  
 پاک دھرتی ہے منزلوں کا نشان  
 فَبَايَ الْاِلهِ رَبِّكُمْ اَنْتُمْ كَاذِبِينَ

عزم و استقلال کی اس تفسیر و تصویر نے، کہ جس کا نام ڈاکٹر شبیر احمد ہے، کراچی کے اسکول جیکب لائسنس سے ۱۹۶۱ء میں میٹرک کیا۔ انٹر سائنس آدم جی سائنس کالج، کراچی سے ۱۹۶۳ء میں اور لیاقت میڈیکل کالج جام شورو سے ۱۹۶۸ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ جناح اسپتال، کراچی میں دو سال ہاؤس جاب کیا۔ پھر ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک پارس جنرل اسپتال، کراچی میں ملازمت کی۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک پاکستان آرمی میڈیکل کور میں کمپن کے عہدے پر رہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء کے درمیان بحیثیت کرنل سعودی عرب، اردن (اسرائیلی سرحد)، کویت، لیبیا وغیرہ میں سرکاری اور غیر سرکاری خدمات انجام دیں۔ کئی تمغے ان خدمات کے اعزاز میں حاصل کیئے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک کئی بار امریکہ آنا ہوا۔ جار جیا سے ایمرجنسی میڈیسن اور فیملی پریکٹس میں ایم ڈی ہوئے۔ ابتدا سے ان کے مشاغل میں لکھنا، پڑھنا، تیراکی، ڈائی ونگ، ٹیبل ٹینس، کرکٹ، گر جاؤں اور امریکی اسکولوں میں اسلام پر لکچر اور بچوں کے ساتھ وقت گزارنا شامل ہے، خبروں کے لئے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ ڈائی ونگ اور ٹیبل ٹینس میں کالج کے چیمپئن بھی رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کو اردو، انگریزی، پنجابی کے علاوہ فارسی اور عربی ادب سے بھی لگاؤ ہے۔ رواں عربی بولتے ہیں۔

۱۲ / ستمبر ۱۹۷۱ء کو ان کی شادی فریدہ سے ہوئی۔ یہ انتخاب ان کے والدین کا تھا۔ شبیر کہتے ہیں فریدہ ان کی بہترین شریک حیات اور شریک کار ہیں۔ متوازن مزاج کی پودھان پان سی خاتون ایک مثالی بیوی اور ماں ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے، شہزاد احمد، بیرسٹریٹ لاء ہیں۔ ان کی ولہن سائرہ ہیں۔ شہزاد سے چھوٹے ڈاکٹر فواد احمد ہیں اور ان سے چھوٹی عائشہ جو اب تقریباً بارہ سال کی ہوں گی۔



اپنی زندگی کا یادگار واقعہ سناتے ہوئے ڈاکٹر شبیر کہہ رہے تھے: ”اگست ۱۹۴۷ء میں میرے والد صاحب مجھے اور میرے سے ڈھائی سال بڑے بھائی سعید کو لے کر پاکستان آئے۔ میرے والد سرکاری ملازم تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آیا ہندوستان میں رہنا چاہتے ہو یا... انہوں نے بلا جھجک کہا... پاکستان... زندہ باد۔ اور پھر انہیں بہت سے سرکاری ملازموں کے ساتھ جیکب لائنز کی بیرکوں میں بٹا دیا گیا۔ ایک بیرک میں نو (۹) کشادہ گھر ہوتے تھے۔ اور یہ آٹھ سائے کی دو بیرکوں کے اٹھارہ (۱۸) گھر ایک خاندان کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ اب وہ محبتیں کہاں جو میرے اس شعر کے مثل تھیں۔

مجھے وہ میرا شبیر خوش گوار یاد آ گیا کسی گھر میں بھی جائے اس کا در کھلا ملا  
میں سات آٹھ سال کا تھا کہ خالہ نے مسلسل کہنا شروع کر دیا تھا کہ شبیر کمشنر بنے یا وزیر انہیں خوشی نہ ہوگی، وہ مجھے انسانوں کا مسیحا یعنی ڈاکٹر بنادیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ بیٹا کام کرو ایسے جو لکھے جائیں اور لکھو تو ایسا جو پڑھا جائے۔ سو میں نے یہ کر دکھایا۔“

چلتے چلتے شبیر نے کہا: ”میری پیشین گوئی ہے کہ مستقبل قریب میں امریکی قرآن کو اپنالیں گے اور مقام مومن تک پہنچ جائیں گے مگر اہل مشرق فرقہ بندیوں میں الجھے رہیں گے۔ اور کابلی، آرام پسندی، منافقت اور خوش فہمی (کہ وہ خدا کی پسندیدہ قوم ہیں) میں مبتلا رہیں گے۔ داڑھیاں تاپنے سے انسان کا ذہن ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں نہ کوئی موجد پیدا ہوتا ہے نہ مفکر۔“

Dr. Shabbir Ahmed,

6440 NW 53St. Lauderhill, Fl. 33319, USA

نوٹ: ڈاکٹر شبیر احمد سے ہر شخص کسی وقت بھی اس ٹیلی فون 2115-746-954 پر رابطہ کر سکتا ہے۔ مزید معلومات کے لئے ان کا ویب سائٹ [www.galaxydastak.com](http://www.galaxydastak.com) پر جائیں





شاہ جو جانتے ہی ردی میں کھیاؤ گے مجھے  
مجھ کو بڑھنے تو سہی صبح کا اصرار ہوں میں

شرف الدین شرف کمالی

شرف کمالی

2003  
25/12/2003

## شرف الدین شرف کمالی

کولہا پور، مہاراشٹر، ہندوستان

ہمارے بزرگ شرف الدین شرف کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے سورۃ یٰسین شریف کا اردو میں ترجمہ کیا اور وہ بھی منظوم۔ پھر ان کا تخلص یا نام کا حصہ ”کمالی“ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ اللہ نے ان کو شعری مزاج و دیعت ہی اس لئے کیا کہ وہ آیت الہی کی تفسیر دو مصرعوں میں بیان کر دیں۔ جیسے کہ اس آیت کا ترجمہ ان کی کتاب ”صحیفہ حکمت“ (منظوم ترجمہ سورۃ یٰسین) کے ابتدائی صفحہ ۸ پر درج ہے۔

أَفْرَأَ كَتَبَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَلِيكَ حَسْبًا (سورۃ بنی اسرائیل - ۱۲)

پڑھ اپنا نامہ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لئے تو خود ہی کافی ہے

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اب سے کوئی چوبتر (۷۴) سال چند مہینوں قبل (۷ / جولائی ۱۹۲۹ء) ایک بچہ مہاراشٹر کے گاؤں کانتہ، تحصیل چیلون ضلع رتناگیری میں پیدا ہوا ہوتا ہے۔ والدین اس کا نام شرف الدین محمد بھلے رکھتے ہیں اور یقیناً یہ نام ہی کا اثر ہوگا کہ شرف الدین نے دین کی جانب رہنمائی کے لئے ایک اہم کام انجام دے کر اپنے لئے شرف و کمال کی دستار حاصل کر لی۔

ان سے مجھے جناب شفیق موڈک نے متعارف کرایا تھا۔ کتاب تو میں لکھ رہی تھی مگر شفیق موڈک بھی کمر بستہ تھے کہ قلم کے اس گوہر آب وار سے اس کتاب ”گفتنی“ حصہ دوم کی رونق میں اضافہ



کیا جائے۔ لہذا اوہ اندونیشیا میں کاروباری کاموں سے چھٹنی لے کر جب ممبئی اپنے گھر واپس آئے تو شرف کمالی صاحب کا تعارف حاصل کرنے کے لئے بطور خاص ان کے گھر کو لکھا پور گئے۔ شرف کمالی صاحب فوج کا شکار تھے، لکھنے پڑھنے سے معذور۔ مگر شفیق موڈک کی محبت اور لگن دیکھ کر انہوں نے اپنا تعارف جوں توں لکھ کر دیا اور ٹکسی تحریر بھی۔ اور شفیق صاحب نے اپنے کیمرے سے ان کی تصویریں بنائیں اور ان سے ان کے کلام کا مجموعہ ”ادھورے خاکے“ بھی لیا جو ۱۹۶۲ء اور ۱۳۸۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے تیسرے صفحے پر شرف کمالی کا یہ شعر درج ہے۔

تجربوں میں زندگی کی وقعتوں کا راز ہے      تجربہ زندگی میں ٹھوکریں کھانے کا نام  
اس مجموعے میں شرف کمالی کی بڑی صاف ستھری دل آرا اردو زبان میں غزلیں اور نظمیں ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ جناب عبدالحمید بوبیر سے مرحوم، سابق ایڈیٹر ”صبح امید“ ممبئی نے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے شرف کمالی کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ کیا خوب تر جمانی ہے، ملاحظہ ہو۔

پونم کی رات، جلوۂ ماہ تمام تھا      بستی میں آج عرس کا خاص اہتمام تھا  
ہر فرد بے نیازِ حلال و حرام تھا      مرقد پر پیر جی کے بڑا اثر دہام تھا  
پی کر شراب آئے تھے عشاق پیر کے      لیکن زباں پہ نعرے تھے احمد کبیر کے  
یہ کتاب میرے پاس ایک امانت ہے جو مجھے واپس کرنی ہے لیکن ”صحیفہ حکمت“ انہوں نے مجھے تحفہً بھیجی ہے اور یہ میرے لئے اعزاز سے کم نہیں۔ اس کتاب میں عربی میں سورۃ یٰسین درج ہے۔ شرف صاحب کا اردو میں منظوم ترجمہ اور یہی ترجمہ دیوناگری رسم الخط میں بھی شعر کے نیچے درج ہے۔ اصحاب خیر شرف صاحب سے اجازت لے کر یہ منظوم ترجمہ شائع کرنے کے بعد مفت تقسیم کر کے اردوں کو بھی فیض پہنچا سکتے ہیں۔

کوکن کے اس بیٹے نے جس کی مادری زبان اردو نہیں، اردو میں یہ کام کر کے بلاشبہ ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

کوکن کے دیگر ان گنت لوگوں نے بھی اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے ایک عمر صرف کر دی ہے۔ دور کیوں جائیے برطانیہ کے شہر لیوٹن میں کوکن کے ایک سپوت ساحر شیوی بھی ہیں جنہوں نے اردو کے پودے کی آبیاری میں زندگی کا ایک بڑا حصہ کھپایا ہے۔ وہ خود دو پرچے ماہنامہ ”پرواز“ اور سہ ماہی ”سفیر اردو“ شائع کرتے ہیں اور دیگر پرچوں کے اجرا میں اپنے احباب کی مدد کرتے ہیں۔ ادھر ممبئی میں مبارک کا پڑی ہیں جو ماہ نامہ ”نقش کوکن“ شائع کرتے ہیں، شفیق موڈک ہیں جو ماہنامہ ”شمع“ دہلی کے لئے لکھتے رہے ہیں اور ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے داسے درے، قدے خنہ کوشش کرتے رہتے ہیں۔

بہت سے ادیبوں نے اپنی مادری زبان مراٹھی کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی جدوجہد شروع کی اور اس قافلے میں کئی احباب ہیں جن میں یعقوب راہی کا بھی نام ہے جنہوں نے مراٹھی



کی منتخب نظموں کے مجموعے کو اور وقار قادری کی کہانیوں کو "ولیت کتھا" کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر یونس اکا سکر، ڈاکٹر عبدالستار دلوئی، ڈاکٹر میمونہ دلوئی، ڈاکٹر محمود دلوئی، انجم عباسی (نائب مدیر سہ ماہی ترسیل، ممبئی)، نور پرکار (حالیہ مقیم کویت)، محمد حسین پرکار (ہندوستانی پرچار سبھا، ممبئی)، معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق، الناصر قاضی تاج الدین ہوڑیکر کے نام معروف ہیں۔ شرف کمالی نے بھی اردو میں تنقیدی مضامین اور انشائیے لکھے ہیں جو "کہتا ہوں سچ" کے عنوان کے تحت کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ ان کے آباؤ اجداد تقریباً چھ صدی پہلے بیجاپور سے گوکن آئے۔ ان میں سے بیشتر اصحاب عربی مدارس قریہ قریہ چلاتے تھے۔ علاوہ ازیں مسجد کی امامت اور دینی امور کی ادائیگی وہ ہی کیا کرتے تھے۔ ان میں ملا حسین بکلی ایک خدائیدہ بزرگ تھے جن کا مزار قریہ دہلی ضلع رتناگیری میں مرجع خاص و عام ہے۔

شرف کمالی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ انٹر آئرس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا۔ ادیب کامل جامعہ اردو، علی گڑھ یونیورسٹی سے کرنے کے بعد مہاراشٹر کی راشٹر بھاشا سبھا سے ہندی میں "پروین" کی سند حاصل کی اور سیکنڈری ٹیچر ٹریننگ (ایس ٹی سی) بھی وہیں سے کی۔ شرف کمالی کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ ساٹھ (۶۰) برس کا عرصہ گزرا ان کو شعر کہتے ہوئے۔ شاعری میں انہیں فخر مشرق، شاعر اسلام حضرت شفیق صدیقی جو پوری سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ شفیق صاحب مولانا حسرت موہانی کے جانشین تھے۔

شرف کمالی نے جناب حسین مصری خان دلوئی کی خودنوشت سوانح حیات کا مراثی سے اردو میں "افق پار" کے عنوان سے ترجمہ کیا جسے ایڈیٹور پبلی کیشنز، ممبئی نے شائع کیا۔ اس ترجمے پر انہیں مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے مبلغ پانچ ہزار روپے کا نقد انعام ۲۰۰۳ء میں دیا۔

اس وقت ان کی ڈھائی سو (۲۵۰) غزلیات کے علاوہ سو کے قریب حمدیں اور نعتیں تیار ہیں جن میں "انکشاف" غزلوں کا مجموعہ اور "ریاض الجنہ" (حمدوں اور نعتوں کا مجموعہ) کے نام سے اشاعت کے لئے ترتیب دے رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ "صحیفہ حکمت" کا پہلا ایڈیشن انہوں نے پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) روپے اپنی جیب سے خرچ کر کے دسمبر ۱۹۹۰ء میں پانچ ہزار (۵۰۰۰) کی تعداد میں شائع کرایا۔ اندرون ملک اس کی قیمت پچیس (۲۵) روپے رکھی۔ ایک ہی سال میں ان کی رقم ان کو واپس مل گئی۔ اس کے بعد سے کمالی صاحب اسے شائع کرنا مفت تقسیم کرتے ہیں۔ مدارس، مساجد اور تعلیمی اداروں میں مفت بھجواتے ہیں تاکہ ہندوگان خدا فیضیاب ہوں۔

سورۃ یسین کے منظوم ترجمے کا خیال ان کے دل میں کیوں کر پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل محترم شرف کمالی نے بتاتے ہوئے کہا: "ایک زمانے میں، میں پیری کر اس روڈ، باندہ کی وادی زیب مسجد میں مولانا مختار احمد ندوی صاحب کے درس حدیث و تفسیر قرآن مجید کی مقدس نشستوں میں باقاعدہ



حاضری دیا کرتا تھا۔ وہاں جانے سے میرے دل و دماغ کی کیفیت بدل گئی۔ سورۃ یسین قرآن کریم کا دل ہے۔ یہ حدیث میں نے پڑھی، سنی اور اللہ رب العزت نے میرے دل میں اسے منظوم کرنے کا خیال ڈالا۔ اس آپادھانی کے دور میں ہم اگر اللہ کے کلام کو سکون سے پڑھیں اور سوچیں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے اور اللہ نے جو نعمتیں ہمیں عطا کی ہیں ہم ان سے سرفراز ہو کر انسان کی تباہی کی ترکیبیں سوچنے کے بجائے اگر سکون سے زندگی گزارنے کے اصول سیکھ لیں تو انسانی زندگی میں یقیناً انقلاب رو نما ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے محترم مولانا مختار احمد ندوی اور میرے دیرینہ کرم فرما جناب کالی داس گیتا رضا (جو اب ہماری دنیا میں نہیں رہے) کا ممنون کرم ہوں کہ ان کی رہنمائی میں یہ کام انجام پایا۔ کالی داس گیتا رضا صاحب کو اسلامی ادبیات سے دلی لگاؤ تھا۔ مجھے شعری اعتبار سے انہوں نے مفید مشوروں سے نوازا تھا۔ انہوں نے یہ ترجمہ پڑھا تھا، ان کا دل بھر آیا اور آنکھیں نم ناک ہو گئی تھیں۔ یہ میرے رب کا کرم ہے کہ جس نے مجھے یہ سعادت بخشی اور میں نے عام فہم زبان میں اس کا منظوم ترجمہ کیا۔ میری اب خدا سے دعا ہے۔

جب دم واپس ہو یا اللہ لب پہ ہو لا الہ الا اللہ

میں یہاں شرف کمالی صاحب کا کیا ہوا سورۃ فاتحہ کا منظوم ترجمہ پیش کر رہی ہوں جو بحیثیت ایک منظوم دعا دل کو متاثر کر کے رقت قلب پیدا کرتی ہے۔ ترجمہ کی شروعات بسم اللہ الرحمن الرحیم کے منظوم ترجمہ یوں شروع ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وہ سب کا داتا، سب کا رب ایسا کوئی عظیم بھی ہے  
آغاز اللہ کے نام سے جو رحمن بھی ہے اور رحیم بھی ہے

سورۃ فاتحہ

سب حمد و ستائش البتہ اک اللہ ہی کو زیبا ہے  
وہ رب دو عالم ہے ہمد، وہ سب کا پالنے والا ہے

وہ سارے جہاں کا بخشنده کہتے ہیں "الرحمن" اے  
وہ ایسا رحیم گنہ گاروں پر لطف و کرم بھی فرمائے



اس خالق عالم کو ہم نے یوں "مالک یوم الدین" کہا  
وہ داوڑ محشر ہے بے شک، مختار ہے روز قیامت کا

محبوب حقیقی، ہم سب ہیں تیری ہی عبادت پر نازاں  
ہم راہ حیات میں ہر دم ہیں تیری ہی اعانت کے خواہاں

تو ایسی ہدایت دے ہم کو کہ ہم سیدھا رستہ اپنائیں  
انوار ہدایت ہی سے تری، اپنی منزل کا چٹا پائیں

وہ لوگ جنہیں تو نے یارب، انعام سے اپنے نوازا ہے  
ان کی مانند نواز ہمیں، تو ہی تو نوازنے والا ہے

مت ان کی ڈگر پر چلا ہم کو، جو تیرے غضب کا شکار ہوئے  
یا سیدھی راہ بھٹک کر جو گمراہ و ذلیل و خوار ہوئے  
آمین!

Mr. Sharaf-ud-din Sharaf Kamali,

"Rahmat", Inderjeet Colony, 446-9/B, Jadhoowadi, Kolahpur,  
416005, Maharashtra, India.





کل میں ہمیں آج سے زیادہ دشواروں کا سامنا کرنا ہے  
اور مسائل کے حل کے لیے ہمیں تیار رہنا ہے

شاعر اللہ خان  
05/12/2001

## ڈاکٹر شاعر اللہ خان

رام پور، ہندوستان

ڈاکٹر شاعر اللہ خان سے قلمی ملاقات اور ان کی زبانی ان کی علمی معلومات اور اردو سے محبت کا احوال سنتے ہی بے ساختہ جناب احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا  
قاسمی صاحب اپنے جریدے ”فنون“ کے ذریعے علم کے دریا بہاتے ہیں اور ہم جیسے تشنہ کاموں کو سیر ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں، اسی طرح ہندوستان کے شہر رام پور میں بسنے والے ڈاکٹر شاعر اللہ خان ہیں جو مجال ہے کہ دم بھر کوست پڑ جائیں۔ شمع اردو پر پختہ ہونے والے ایسے پروانوں کی موجودگی میں امید کا سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ دل کہتا ہے اردو کا گلستان ہمیشہ ایسا ہی آباد رہے گا اور اس کی مہک سے اُسکے چاہنے والے مشام جان معطر کرتے رہیں گے۔

۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر شاعر اللہ خان کراچی پاکستان گئے تھے۔ ۵ دسمبر ۲۰۰۱ء کے دن انہوں نے مجھے خط لکھا اور بتایا کہ مئی ۲۰۰۰ء میں کراچی میں ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھاگتے دوڑتے ایک دکان میں میری کتاب ”گفتنی حصہ اول (نثر نگاروں کا تذکرہ)“ خریدنے کے لئے پہنچے۔ دکاندار شکرگزار ہوا تھا۔ ان کی التجا پر انہیں ”گفتنی“ مل گئی اور پتا چلا کہ اسی نوعیت کے شعرا کے تذکرے



بعض ان "سختیوں" چار جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ان چار جلدوں کے حصول کے لئے مجھ سے رابطہ کیا۔ مگر میرے اپنے پاس کتابیں موجود نہیں تھیں۔ میں نے انہیں خط لکھا کہ مشفق خواجہ صاحب کی خدمت میں ان کتابوں کے چند نسخے اس گزارش کے ساتھ پیش کیئے تھے کہ وہ ان کو خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ہندوستان میں کسی توسط سے بھجوادیں۔ اور انہوں نے یقیناً کتابیں بھجوادیں ہوں گی۔ وہ مذکورہ لائبریری سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

اب آئیے میں آپ کو ڈاکٹر شعائر اللہ خان سے آپ کو ملواؤں۔  
 "ڈاکٹر صاحب! اپنے بارے میں مثلاً تاریخ و جائے پیدائش، تعلیم اور اپنے ادبی کاموں کے بارے میں کچھ بتائیے اور ادب، بالخصوص اردو ادب کے حوالے سے چند سوالوں کے جواب عنایت کریں۔"  
 ڈاکٹر شعائر اللہ خان نے فرمایا، "میں شمالی ہندوستان کی ریاست رام پور میں ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام مولوی نصر اللہ خان تھا جو افغانستان کے علاقہ قندھار کے معروف قبیلہ بڑیچ سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب مرحوم مدرسہ عالیہ رام پور کے فارغ التحصیل عالم اور وہاں کے سرکردہ حضرات میں شمار کیئے جاتے تھے۔ نانا جان حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خان قادری مجددی وجیہ رام پوری کے زیر سایہ میری تربیت ہوئی۔ حضرت وجیہ مدرسہ عالیہ رام پور کے پرنسپل، جامع مسجد رام پور کے امام اور مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ کے مونس تھے۔ ان کے علم و فن سے تشنگان علوم نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۸۰ء تک فیوض علمی حاصل کیئے۔

میں نے قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں فنی، فنی کامل اور جامعہ اردو کے تمام امتحانات پاس کیئے۔ چوں کہ شروع سے عربی سے کم اور فارسی سے زیادہ شغف تھا اس لئے فنی کامل (الآباد، بورڈ) کرنے کے بعد وزارت تعلیم حکومت ہند، دہلی کے ایک وظیفے پر حضرت احمد رام پوری کا کلیات بعنوان 'افضل نامہ' تدوین کیا۔ اسی عرصے میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی سے اردو زبان میں بھی ایم اے ۱۹۸۴ء میں کر لیا۔ نومبر ۱۹۸۶ء میں 'افضل نامہ' کی تدوین کے بعد ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی تحریک پر خدا بخش لائبریری میں جوئیئر فیلوشپ اور بعد میں سینئر فیلوشپ میں شمولیت کر لی۔ اس عرصہ میں انیسویں صدی کے اردو رسائل کی تاریخ پر لائبریری کے لئے ایک ریسرچ پروجیکٹ تیار کیا جو کم از کم ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) صفحات پر مشتمل دستاویز ہے اور ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے علاوہ مشہور رسالہ جامعہ، دہلی کا اشاریہ تیار کیا۔ رضا لائبریری، رام پور کے اردو مخطوطات کی فہرست تیار کی جو جرنل (۲) رضا لائبریری رام پور میں شائع ہوئی۔ خدا بخش لائبریری میں رہ کر صولت پبلک لائبریری رام پور اور رضا لائبریری رام پور کے اخبارات و رسائل کی فہرست بھی مرتب کی۔ یہ دونوں فہرستیں اور رسالہ جامعہ کا اشاریہ خدا بخش لائبریری پٹنہ شائع کر چکی ہے۔

۱۹۹۲ء میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا (بہار) نے میرے تحقیقی مقالہ، بعنوان 'انیسویں صدی کے اردو رسائل' ایک تجزیاتی مطالعہ پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی۔ یہ تحقیقی کام ۱۸۰۱ء



سے ۱۹۰۰ء تک شائع ہونے والے اردو رسائل کی تاریخ پر مبنی ہے۔ چونکہ اخبارات پر کام ہو چکا تھا مگر رسائل پر بہت کم توجہ تھی اس لئے میں نے یہ منفرد موضوع تحقیق کے لئے منتخب کیا اور پانچ سال تک ہندوستان بھر کی لائبریریوں میں گھوم پھر کر مواد جمع کیا اور الحمد للہ اس طرح یہ کام مکمل ہوا۔ مجھے اپنے اس کام پر بے حد ناز ہے۔ امید ہے کہ اشاعت کے بعد اہل علم بھی اس کام کو ضرور سراہیں گے۔

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا ”میں نے مضمون نگاری کا سلسلہ اپنی مادر علمی مدرسۃ العلوم فرقانیہ کے سالانہ میگزین ’ضیاء وجیہ‘ سے شروع کیا تھا۔ اس میں میرا پہلا مضمون جامع مسجد رام پور کی تاریخ پر تھا۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور اور رام پور کے علمی مدارس پر تحقیقی مقالے لکھے جو مشہور رسائل مثلاً ماہنامہ المعارف، اعظم گڑھ اور رسالہ برہان، دہلی میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے عربی تراجم پروفیسر نثار احمد فاروقی کے زیر ادارت شائع ہونے والے عربی مجلہ ’الثقافت الہند، نئی دہلی‘ میں بھی شائع ہوئے۔ حافظ احمد علی شوق کے مشہور تذکرہ، ’تذکرہ کلامان رام پور‘ کی اشاعت ثانی کے وقت ۱۹۸۶ء میں متن کی تصحیح کی اور حواشی لکھے۔ اسے خدا بخش لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا۔ اس کے بعد ’تذکرہ کلامان رام پور‘ کی دوسری اور تیسری جلد کے لئے مواد تیار کیا جس میں ۱۹۳۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کے مشاہیر رام پور کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ مواد تقریباً آٹھ سو (۸۰۰) شخصیات پر مشتمل ہے اور ہنوز تھنہ طباعت ہے۔

میں نے ۱۹۹۱ء میں اپنے نانا جان علیہ رحمۃ کے حالات اور خدمات پر مشتمل ایک مجموعہ مقالات بعنوان ’یاد وجیہ‘ شائع کیا۔ اس کی ضخامت دو سو اٹھارہ (۲۱۸) صفحات کی ہے۔ اسی طرح مولوی شمس الرحمن کا تالیف کردہ ’تذکرہ بزرگان رام پور‘ بھی ایڈٹ کر کے ۱۹۹۱ء میں شائع کرایا۔ میرے تحقیقی مضامین کا مجموعہ بعنوان ’مشرقی علوم کے چند مراکز‘ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۳ء میں مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی پر ایک مجموعہ مضامین مرتب کر کے شائع کیا۔ برصغیر ہند میں اردو اخبارات اور رسائل کی فہرستیں مرتب کیں جو پانچ سو (۵۰۰) صفحات پر مشتمل ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح رسالہ ’نیرنگ‘، رام پور ۱۹۰۹ء کا اشاریہ بھی غیر مطبوعہ تیار ہے۔ ۱۹۹۸ء میں اردو کے معروف شاعر نظام رام پوری کی حیات و خدمات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ اور اس کی دوسری طبع اضافی (ایڈیشن) کا اجرا ۲۰۰۱ء میں کیا۔

میرے اب تک ستر (۷۰) مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات برصغیر ہند کے تمام ہی مقتدر رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۹۰ء سے ماہنامہ ’ضیاء وجیہ‘، رام پور کا معاون ایڈیٹر ہوں۔ اور تقریباً ہر شمارے کو مرتب کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہے۔ نومبر ۲۰۰۱ء میں اسی رسالے کا اشاریہ ایک سو بیس (۱۲۰) صفحات پر مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

میری عملی مشغولیات کا آغاز رضا لائبریری رام پور سے ہوا جہاں نومبر ۱۹۹۱ء سے دسمبر ۱۹۹۲ء تک بحیثیت انفارمیشن آفیسر تقرر ہوا تھا۔ لیکن وہاں کی گھنٹا سیاست نے جلد ہی دل برداشتہ کر دیا



کیوں کہ کام کا مزاج اور ماحول وہاں تشریباً محدود تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو اپنے نانا جان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے گروپ 'فرقانہ گروپ آف ایجوکیشن' میں بحیثیت معاون معتمد مسلک کر لیا۔ اور اب الحمد للہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور سماجی فلاح کے کاموں میں ہمہ وقت مشغول ہوں۔ علاوہ ازیں چند گھنٹے ادبی و علمی مضامین کی تکمیل میں گزارتا ہوں۔ ایک ثقافتی و علمی تنظیم بھی ۱۹۹۶ء سے بنا رکھی ہے جس کا نام روہیل کھنڈ لٹریچر سوسائٹی ہے۔ اس کی صدارت کا اعزاز فی الحال حاصل ہے۔

میں ادب برائے زندگی متحرک کا قائل ہوں اگرچہ ماضی سے بھی رشتہ رکھنا فرض سمجھتا ہوں۔ تخلیقی فن پاروں کا شیدائی اور منفرد موضوعات پر کام کرنے اور مطالعہ کرنے کا شوقین ہوں۔ بے شمار ادیبوں کو پڑھا ہے۔

اردو زبان سے عشق کی حد تک جنون ہے۔ نئی نسل کو اردو سے واقف کرانے کے لئے تن من دھن سے تیار رہتا ہوں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ میرے خاندان میں سب ہی بچے مثلاً بھانجے، بھتیجے۔ اپنے بچے اردو داں ہیں اور اردو لٹریچر کے مطالعے میں مگن رہتے ہیں۔

افسوس ہے کہ اردو ادب وادب و شعرا اپنے بچوں کو اردو سے محروم رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر نئی نسل اسی طرح اردو سے بے بہرہ رہی تو ہماری اور آپ کی تحریروں کو آئندہ کون پڑھے گا۔ اس طرح ہم اپنے قاری کو خود ہی ختم کر رہے ہیں۔

نئی نسل کے ادیب اور شعرا سے ایک اپیل یہ بھی کرتا ہوں کہ وہ زیادہ پڑھیں اور کم لکھیں تاکہ ان کے فن پاروں میں جان ہو اور وہ معیار کے حامل ہوں۔“

Dr. Shaair-ul-lah Khan,

Moh. Angoori Bagh, Rampur, UP, 244901, India





محبت اور عشق کا لطف صرف وہی محسوس کر سکتے ہیں  
جو پاکیزہ جذبات کے حامل ہوتے ہیں۔ جو بھوری  
روح ناموس حسن کا نام ہیں۔ دراصل باطن کا حسن  
ہی اصل حسن ہے جو دل و جان کو منور رکھتا ہے  
منشیہ افروز زیدی 21/3/2001

## ڈاکٹر شمع افروز زیدی

دہلی، ہندوستان

پرانے زمانے میں اردو کئی ناموں سے پہچانی جاتی تھی، مثلاً ہندوی، ریختہ، اردوئے معلیٰ۔  
پھر ریختہ میں ہائے ہوز کی جگہ یائے تانیث سے بدلی اور ”ریختی“ ایجاد ہوئی جو خالص عورتوں کی زبان  
تھی اور اب بھی ہے۔ اس ضمن میں عابدہ بیگم مرزا لکھنوی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔  
زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر یہ باتیں مردوئے لائیں کہاں سے  
اور تو اور خود اکبر الہ آبادی نے بھی اعتراف کیا ہے۔ کہتے ہیں۔  
اکبر ڈرے نہیں کسی سلطان کی فوج سے لیکن شکست کھا گئے بیگم کی ”نوج“ سے  
اسی نکسالی زبان کی وارث شمع افروز زیدی بھی ہیں۔ دہلی میں رہتی ہیں اور دہلی کی مخصوص و مشہور نہاری اور  
گہاؤں کی طرح ان کی گفتگو میں بھی ویسا ہی چٹکارہ ہے۔  
شمع افروز زیدی مشہور زمانہ ماہنامہ ”میسویں صدی“ کی نہ صرف مدیرہ ہیں بلکہ خود بھی  
افسانے لکھتی ہیں اور کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ان سے ایک ملاقات میں اردو زبان و ادب کے حوالے  
سے جو گفتگو ہوئی وہ یہاں درج ہے۔  
میں نے ان سے پوچھا کہ امی ابو کا دیوا ان کا نام کیا ہے؟ اور شمع نے کب اور کہاں جنم لیا ہے؟



”میرے نام کی بھی سبب کہانی ہے سلطانہ باقی۔ ابا نے میرا نام سعد یہ رکھا تھا لیکن اماں کے ہاتھ ’شمع‘ ناول آگیا تھا۔ انہیں یہ نام اچھا لگا سو اسی نام سے پکارنے لگیں اور اسکول میں بھی یہ ہی نام لکھوا دیا۔ (اگرچہ اس نام نے مجھے بہت پریشان رکھا) اور افروز کا لاحقہ میں نے ماتھ لگا دیا۔ خاندان سیدوں کا ہے تو سیدہ اور زیدی بھی نام کا حصہ بنانا ضروری تھا کہ ان دنوں اپنی پہچان نام کے ساتھ ضروری ہوتی تھی۔ یوں اسکول میں سیدہ شمع افروز زیدی نام لکھوایا۔ بچپن گزرا، کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اتنا بڑا نام سن سن کر لڑکیاں خوب ہنستیں۔ میڈم کو بھی پورا نام لینا دشوار لگتا تو وہ شمع زیدی کہنے لگیں۔ بعد میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کیا تو اولاً شمع زیدی کے نام سے آرٹیکل لکھے۔ پھر اپنے میاں ضیاء الرحمن خیر کو اپنے نام کی کہانی سنائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ چمن نیم (pen name) سعد یہ رحمن رکھ لو۔ کچھ آرٹیکل اور افسانے سعد یہ رحمن کے نام سے شائع ہوئے لیکن پھر شمع افروز زیدی کے نام سے ہی میری کتابیں شائع ہوئیں۔ اب مستقل یہ ہی نام میری ذات کا جزو بن چکا ہے اور یہ ہی میری پہچان بھی ہے۔ اس لمبی کہانی کے بعد انہوں نے بتایا

”میں نے نہپور ضلع بجنور میں ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اماں سے حاصل کی اور چوں کہ تعلیمی استعداد اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہو گئی تھی سو سیدھا داخلہ چوتھی جماعت میں مل گیا۔ نہپور سے میں نے آٹھویں جماعت پاس کی تھی۔ ان دنوں آٹھویں کلاس کے امتحان بورڈ کے ہوتے تھے۔ اچھے نمبر ملنے پر اسکالرشپ کی مستحق ٹھہرائی گئی۔ اگرچہ میں سائنس پڑھنا چاہتی تھی لیکن ہمارے معاشرے میں لڑکے لڑکیوں کا اکٹھا پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے دسویں کلاس کا امتحان پرائیویٹ دینا پڑا۔ دسویں پاس کرنے کے بعد انٹر میڈیٹ بھی پرائیویٹ کیا۔ اسی دوران ابا کا انتقال ہو گیا اور اماں نے انٹر میڈیٹ سے قبل ہی میری شادی کر دی۔ پڑھنے لکھنے کی لگن تھی سو شادی کے بعد بھی پڑھائی جاری رکھی اور بچوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی ڈگریاں بھی لیتی رہی۔ اس طرح میں نے ریگولر (regular) بی اے دہلی یونیورسٹی سے اور ایم اے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے کیا۔ پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی جامعہ سے ہی حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کرتے ہی عبداللہ گریڈ کالج علی گڑھ میں چھ ماہ ۲+ کی کلاسیں لیں۔“

”تم صحافت کی دنیا میں کیسے آئیں؟“ شمع کہنے لگیں۔ ”علی گڑھ سے واپس آئی تو دہلی اردو اکادمی میں ماہنامہ ’امنگ‘ نے رابطہ کیا۔ یہ بچوں کا رسالہ تھا۔ میں نے بطور اسٹنٹ ایڈیٹر ساڑھے چار برس تک کام کیا۔ جامعہ ملیہ میں خط کتابت اردو کورس میں بطور انسٹرکٹر دو سال کام کیا۔ اس دوران بی اے آنرز اور پاس کورس کی کلاسیں بھی پڑھائیں۔ پھر قومی اردو کونسل میں دو سال ایڈیٹریل سیکشن میں اپنے فرائض کی انجام دہی کی اور کونسل سے شائع ہونے والے رسائل ’اردو دنیا‘ اور ’فکر و تحقیق‘ میں بطور نائب مدیرہ کام کیا۔ اور پھر رحمن خیر صاحب نے جناب خوشتر گرامی سے بیسویں صدی لیا۔ جب سے میں ان کے ساتھ تھی اور ہوں اس طرح اب میں ہوں اور بیسویں صدی۔“



”شعر گوئی سے شغف ہے“؟ سوال سن کر شمع زور سے ہنسیں اور کہنے لگیں۔ ”شعر کہنے کے معاملے میں، میں بالکل کوری ہوں۔ زندگی میں ایک بھی شعر نہیں کہا۔ شعر کہنا تو درکنار تنگ بندی بھی نہیں کی۔ البتہ اچھے شعر یا ضرور ہو جاتے ہیں اور سن کر داد دینے کو بھی جی چاہتا ہے۔ سو میرا تخلیقی سفر نثر سے شروع ہوا اور پہلی کہانی ’اوراق پریشان‘ کے نام سے ماہنامہ ’روپی‘، دہلی میں ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ قارئین کے ذریعہ سراہے جانے پر یہ سلسلہ چل نکلا اور یکے بعد دیگرے کہانیاں لکھتی رہی۔ لیکن میری اصل دل چسپی مضامین لکھنے میں تھی سو میں نے اس جانب توجہ دینی شروع کی اور میرا پہلا ادبی مضمون پندرہ روزہ ’ہم قلم‘، نئی دہلی میں ’پطرس کی ظرافت‘ کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر دوسرا مضمون ’راجندر سنگھ بیدی اپنی کہانیوں کی روشنی میں‘ ۱۹۸۰ء میں ’بیدی نمبر‘ میں شائع ہوا جو بہت پسند کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ اللہ کے فضل و کرم سے آج تک جاری ہے اور مختلف رسائل میں میرے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

میری پہلی نثری کتاب ’اردو ناول میں طنز و مزاح‘ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب پر اردو اکادمی، دہلی نے مالی تعاون بھی دیا اور اسی موضوع پر مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی عطا کی گئی۔ طنز و مزاح کے سلسلے کی دوسری کڑی ’فکر تو نسوی..... حیات اور کارنامے‘ جو ادارہ بیسویں صدی نے شائع کی۔ پھر اردو اکادمی، دہلی نے شعر کا کلام مرتب کرنے کا کام مجھے سونپا جو ’گلدستہ‘ کے عنوان سے کتابی شکل میں اکادمی نے شائع کیا۔ ’اردو ادب اور جدیدیت‘ ۱۹۹۸ء میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ آج کل اردو کے افسانوی ادب پر کام کر رہی ہوں۔ خاصا کام ہو چکا ہے۔ انشا اللہ جلد ہی کتابی شکل میں منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔

”اردو زبان میں کام کر کے کیا پایا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو نے مجھے بہت کچھ دیا، جو بھی عزت اور تھوڑی بہت شہرت مجھے ملی ہے وہ اردو کی ہی دین ہے۔ بھلے ہی اس کے بدلے مالی خسارے میں رہی کہ ہمارے یہاں ہر شعبے میں گٹ بندی ہے سو میں بھی اس گٹ بندی کا بری طرح شکار ہوئی اور اس کے باوجود اللہ کا شکر ہے کہ میں مطمئن ہوں اور ماہنامہ ’بیسویں صدی‘ دہلی کے ذریعے میری کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اردو کی خدمت کرتی رہوں کہ موجودہ نامساعد حالات میں ہندوستان میں اردو پر چڑھنا اور وہ بھی پابندی وقت کے ساتھ دشوار ترین مرحلہ ہے۔ اور یہ مرحلہ میں اپنے شوہر ضیاء الرحمن نیر کی معاونت سے کامیابی کے ساتھ طے کر رہی ہوں۔“

”ادیبوں کی گروپ بندی فائدہ مند بھی ہے یا نہیں؟“ شمع نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”سلطانہ باجی! ویسے ادیبوں کی گٹ بندی ہر زبان میں ہے۔ مگر یہ ہماری بد نصیبی ہی تو ہے کہ اردو کے ادیب اس قسم کی گروپ بندی کرتے ہیں جس سے حقدار کا حق مارا جاتا ہے اور وہ نا انصافی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور بدنامی کا طوق اردو ادب کے گلے میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ادیبوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کی روزی روٹی تو خوب چلتی ہے نہ صرف گھی پھیری کے ساتھ بلکہ خوب خوب تر مال ملتا



ہے حالانکہ اس گروپ بندی سے اردو زبان و ادب کو بے انتہا نقصان پہنچتا ہے اور اردو ادب میں فلاح کے بجائے نقصان کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ جو رقم اردو زبان و ادب کی فلاح و بہبود کے لئے مختص ہوتی ہے اسے گروپ بندی ہضم کر جاتی ہے اور اردو ادب ترقی کے بجائے تنزل کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے۔ میں آپ کو کتنے قصے سناؤں اور کس کس کے نام لوں۔

رہا اردو کے مستقبل کا سوال اور وہ بھی ہندو پاک کے تناظر میں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں اردو کی حالت خاصی مستحکم ہے یہ الگ بات ہے کہ اسے سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا۔ اور ہندوستان میں اردو کا معاملہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جتنی مخالفت اردو کی ہوئی اگر کسی اور ہندوستانی زبان کی ہوتی تو وہ ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن اردو بہت سخت جان ہے اگرچہ اردو پڑھنے والوں کا دائرہ موجودہ دور میں کم ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ مسلمان بچے بھی اس زبان سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ اسکول کی سطح پر اردو زبان کا فقدان ہے۔ اور یہ تو کوئی نا سمجھ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب ابتدائی سطح پر اردو کو قتل کیا جا رہا ہے، اس کی جڑوں کو کھوکھلا کیا جا رہا ہے تو اعلیٰ سطح پر اردو کیسے فروغ پاسکے گی۔ بچہ جب ابتدائی کلاسوں میں اردو سے ناواقف ہوگا تو وہ ثانوی سطح پر اردو سے واقف نہ ہو سکے گا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلمیں اردو کو زندہ رکھنے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ سرکاری ادارے بھی اردو کے فروغ کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ سنجیدگی سے اردو کی کتابیں بچوں کے لئے خاصی تعداد میں شائع کرتا ہے۔ قومی اردو کونسل اور ریاستی سطح پر اردو اکادمیاں اردو کی ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں۔ لائبریری میں سال بہ سال لاکھوں روپے کی کتابیں خریدی جاتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ گوداموں سے باہر نہیں آتیں۔ اردو کی بقا کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم خود اردو کے تئیں دل چسپی لیں اور اپنے بچوں کو اردو گھروں میں پڑھائیں۔ موجودہ معاشرہ انگریزی کا ہے۔ تقریباً ہم سب کے ذہنوں پر انگریزی مسلط ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں یہ غلط بھی نہیں ہے کہ موجودہ معاشرے میں زندہ رہنے کے لئے روٹی چاہیے اور اردو روزی روٹی سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ بچے اسکولوں میں انگریزی زبان پڑھتے ہیں۔ والدین کا فرض ہے گھروں پر اردو کی تعلیم سے بچوں کو بہرہ مند کریں۔ اپنے دین اور مذہب کو سمجھنے کے لئے بھی اردو سے واقفیت لازمی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکول کی سطح پر بھی بچوں کو اردو پڑھائی جائے تب ہی اعلیٰ سطح پر اردو کا بول بالا ہو سکے گا، اردو کی بنیاد پختہ ہوگی۔ اس کے علاوہ نظام تعلیم کے ساتھ ہی نصابی کتابوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ اردو زبان دوسری زبانوں کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھ سکے اور نئے زمانے میں قدم جما سکے۔ آج سائنس یا ٹیکنالوجی، کوئی مضمون ایسا نہیں کہ اس پر اردو میں لکھنے والے ماہرین نہ مل سکیں۔ یہ بات تو بہت واضح ہے کہ ہمارے یہاں سائنس اور دوسری ٹیکنالوجی اردو میں پڑھانے کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اردو اصطلاحات کے پیچھے بھاگنے کے بجائے آسان زبان میں ان موضوعات پر کتابیں شائع کی جائیں تاکہ اردو پڑھنے والے اعلیٰ سطح پر ان مضامین سے ناواقف نہ



رہیں۔ یہ اہل حقیقت ہے جب تک اردو زبان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا بہتر انتظام نہیں ہوتا تب تک اردو زبان و ادب ترقی کی جانب گامزن نہیں ہو سکتا۔ اردو دوستوں کو اگر واقعی اردو زبان سے محبت ہے تو انہیں ذاتی طور پر میدان عمل میں آنا ہوگا۔“

شمع نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ”رسم الخط کسی بھی زبان کی شناخت اور روح ہوتا ہے۔ رسم الخط کو ختم کرنے کا سیدھا سا مطلب زبان کو ختم کرنا ہے۔ (اگرچہ) پچاس برسوں میں اردو کا خون کرنے کی بڑھ چڑھ کر کوشش کی گئی، اس کا رسم الخط تبدیل کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں اور یہ کوششیں اب بھی جاری ہیں۔ اردو رسم الخط سے عدم واقفیت نہ صرف اردو زبان سے محرومی کا باعث بن سکتی ہے بلکہ تلفظ کی ادائیگی میں بھی رکاوٹ کا سبب بن سکتی ہے۔ ایسے نامساعد حالات میں ہم سب کا فرض ہے کہ اردو جیسی شیریں زبان اور اس کے ہمہ گیر رسم الخط کو سیکھیں، اپنے بچوں کو سکھائیں تاکہ اپنی زبان کے ساتھ دیگر زبانوں کے الفاظ کا احترام بھی برقرار رہ سکے۔“

شمع نے اپنی زندگی کا یادگار واقعہ ہنس ہنس کر بڑے مزے سے سنایا۔ کہنے لگیں: ”جب میرے ابا نے آکر بتایا بیٹا تم میٹرک کے امتحان میں تیسرے نمبر پر آئی ہو تو میں خوب روئی۔ ابا نے بہت سمجھایا بیٹا کتنے ہی بچے فیل ہو گئے، اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم پاس ہو گئیں۔ لیکن میں رو رو کر ایک ہی بات دہراتی رہی کہ آپ اخبار اچھی طرح دیکھ کر آئیے یا مجھے لا کر دیجئے (ان دنوں ایک خصوصی ضمیمہ ’گزٹ‘ کے عنوان سے بطور خاص طلباء کے لئے شائع ہوتا تھا جس میں صرف رزلٹ آتا تھا)۔ ابا نے کہا بھیڑ بہت ہے کم ہونے پر اخبار لا دوں گا۔ میں نہ مانی اور روتی رہی کہ اتنے میں میرے استاد شاستری جی جو مجھے سنسکرت پڑھاتے تھے آئے اور کہا کہ صرف تین نمبر سے فرسٹ دیویشن رہ گئی ہے۔ اتنا سنا تھا میں روتے روتے ہنس پڑی۔ میں یہ واقعہ اب بھی اکثر اپنے بچوں کو سناتی ہوں۔“

Mrs. Shama Afroz Zaidi,

1/3, Muradi Road, Jamia Nagar, New Delhi, 110025, India



تمام شہر بیدار وقت جلی اٹھا کر  
محافظوں کے دلوں میں خنوار تھا، کیا تھا  
شیر طارق  
۲۰۰۱ء  
مہر



## شمیم طارق

ممبئی، ہندوستان

شمیم طارق ممبئی کے ایک خوب صورت مگر گنجان علاقے ”بایرکلا“ کے مرزبان مینشن کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کا رشتہ شاعری اور صحافت سے بھی استوار ہے وہ نثر خوب لکھتے ہیں۔ ماہنامہ ”شاعر“ ممبئی میں کتابوں پر تبصرہ اور مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ڈوب کر مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے کثیر المطالعہ ہونے کے نتیجے میں ہی ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہو کر قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔

- (۱) الرسول القائد
  - (۲) شرف محنت و کفالت (تین بار طبع ہو چکی ہے)
  - (۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور تصوف
  - (۴) غالب اور ہماری تحریک آزادی
  - (۵) تصوف اور بھگتی
  - (۳) اور ایک شعری مجموعہ بعنوان ”شہرگ“ بھی شائع ہو چکا ہے۔
- مگر انہیں مشاعروں میں کم کم ہی دیکھا جاتا ہے کہ مشاعروں کو انہوں نے ذریعہ روزگار نہیں بنایا۔ تصوف اور بھگتی تحریکوں کے مطالعے سے ان کی ذات میں بے نیازی بھی آچکی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ اردو ادب کو آؤڑھنا بچھونا بنا کر انہیں ممبئی کے کسی آسودہ حال علاقے میں بسیرا نہیں کرنا، سمندر کے کنارے کسی خوب صورت فلیٹ میں نہیں رہنا۔



قلندرانہ مزاج کے اس شخص سے میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ شمیم طارق نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ اپنی زبان و ہندیب کی خدمت کر کے مجھے ایسا قلبی سکون ملتا ہے جس کا نعم البدل کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ خسارے کا سودا ہے اردو شعر و ادب اور صحافت سے رشتہ استوار کیا ہے۔ ورنہ منافع کمانے کے تو بہت سے ذرائع تھے۔ ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا جہاد سے کم نہیں۔ آپ نے مجھ سے ادیبوں کی گروہ بندیوں کے حوالے سے سوال کیا تھا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ یہاں فیروں کے ساتھ اپنے بھی روڑے اٹکاتے ہیں۔ کردار کشی کرتے ہیں۔ کس کس کا نام لوں اور کس کا ذکر کروں کہ بہت سوں نے تو ان رویوں کا شکار ہو کر خون تھوکا ہے۔“

شمیم طارق سے گفتگو اتنی دل چسپ ہو رہی تھی کہ میں ان کا تعارف کرانا بھول گئی۔

نام ان کا شمیم احمد ہے، پکارنے کا نام طارق ہے۔ یوں دونوں نام ملا کر ایک ادبی نام ”شمیم طارق“ بن گیا۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں اتر پردیش، ہندوستان کے قدیم شہر بنارس میں پیدا ہوئے۔ علمی اور مذہبی گرانے سے تعلق ہونے کے سبب بچپن ہی سے علم و ادب سے تعلق رہا۔ انہوں نے کامرس اور اکاؤنٹنسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی لیکن بعض حالات کی وجہ سے فائنل امتحانات میں شریک نہ ہو سکے۔ ویسے بھی فطری رجحان شاعری، تصوف اور علوم شرقیہ کی طرف رہا اس لئے تجارت اور اس سے متعلق علوم سے انہیں دل چسپی کم تھی اور اب تو گویا تائب ہی ہو چکے ہیں۔

شمیم طارق سے ملیئے تو دیکھنے اور ملنے سے بھی لگتا ہے کہ یہ بھگت کبیر داس کے ماننے والوں میں سے ہیں۔ گفتگو کیجئے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ صوفی منش انسان ہیں اور ضرور کسی صوفی سے ان کے روابط ہیں۔ اور ایسا کچھ نہ بھی ہو تو انہوں نے تصوف اور بھگتی کا ڈوب کر مطالعہ کیا ہے۔

میں نے ان کی کتاب ”صوفیا کا بھگتی راگ“ کی ادھر ادھر سے ورق گردانی کی۔ تصوف اور بھگتی پر لکھنا پڑنا مارنا ہے۔ یہ کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اور یہ ہمارے گوشہ نشین ادیب شمیم طارق ہیں وہ اسی لئے محفلیں نہیں جماتے کہ تخلیقی کام کرتے ہیں۔ اور جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں تو کان کن کی طرح کان کے ہر ذرے کو چھان بھنک کر نایاب گوہر برآمد کر لیتے ہیں۔ ”صوفیا کا بھگتی راگ“ بھی ایک ایسا ہی گوہر نایاب ہے جو شمیم طارق کے عمیق مطالعے اور عرق ریزی کے بعد کتابی صورت میں سامنے آیا ہے۔

محترم مبصر حقانی القاسمی نے ماہنامہ ”کتاب نما“ دہلی شمارہ جنوری ۲۰۰۴ء میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”ادھر کچھ عرصے میں تصوف پر مطالعاتی سلسلے کا جو آغاز ہوا ہے اس سے کچھ گریں کھلی ہیں۔ مستشرقین نے بھی تصوف کے تئیں خاصی دل چسپی دکھائی ہے اور کچھ نئے انکشافات بھی کیئے ہیں۔ ان میں سے ڈوزی، ایم اسمتھ، تور آنڈرائی، ہارٹ مان، ایم ہارٹن، اسکاڈ، ایچ ریڈنگسن وغیرہ نے تصوف کے منبع، مصدر اور ماہیت سے متعلق بہت سی اہم باتیں تحریر کی ہیں۔ تاہم مسئلہ تصوف اس قدر گہرے رموز



اس امر میں متحاذر ہے کہ ایک مہم با اتحاد آتا ہے تو وہ مہم اپنا ہوتا ہے۔

شمیم طارق کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے مہم جوں پر مستند اور معتبر مصاویر اور مراجع سے رجوع کیا ہے اور شرقی تصوف کے تمام پہلوؤں پر تدبر اور تفکر کیا ہے اور تقابلی مطالعے کی بنیاد بنیاد پر نتائج استخراج کیا ہے۔

ان مضامین سے ان کی حرق ریزی اور محنت مترشح ہے۔ انہوں نے غوث محمد گوالیاروی، مجدد الف ثانی، امام قشیری، شاد ولی اللہ، جنید بغدادی، شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ بہا الدین نقشبندی، شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ عبد الواحد بلگرامی، فرید الدین عطار کے حوالے سے تصوف کے مفہوم کو آئینہ کر دیا ہے۔ اور اس کی تشکیلی صورتوں اور مثبت پہلوؤں پر مبسوط روشنی ڈالی ہے۔

بھگتی مزاج و پس منظر میں انہوں نے مکمل آگہی و عرفان کا ثبوت دیا ہے۔ اور بھگتی کے مزاج کی تفہیم شرعی مد بھگوت گیتا، رامانج اپاریہ، اور دیگر مفکرین کے حوالے سے کی ہے۔ بھگتی کال کے بارے میں بہت سی انکشافی معلومات بھی درج کی ہیں۔ کبیر، سرمد، کرشن، مرزا مظہر جان جاناں اور تلخی داس کے بارے میں وہ معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ ان کی علمیت پر شک آتا ہے۔ سرمد کے یہودی اور ملحد ہونے کی بات اور پھر ان کے عشق باطن کی کیفیت کا ادراک بھی کرایا ہے۔ کبیر کی ہندو بھگتی کے حوالے سے یہ معلومات بھی دل چسپ ہیں کہ وہ حضرت آفتی سہروردی کے خلیفہ تھے اوت حضرت بیکا چشتی سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ بھگتی کا باب نہایت ہی عارفانہ و عالمانہ ہے۔ اس باب کی نہایت ہی سنجیدگی سے قرأت کی جائے تو ذہن کی بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔

سچ پوچھئے تو شمیم طارق اردو ادب کے وہ کوکب درنی ہیں جس کی قدر مابعد زمانوں میں ہوگی۔ اس علمی زوال کے دور میں شمیم طارق کا دم خمیت ہے۔ بالخصوص اردو زبان جس کی زوال کی گھڑی میں ہے اس میں شمیم طارق جیسے جید عالم، فاضل ادیب لبیب کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔

”شمیم طارق تم ایسے ہی کام کرتے رہو۔ تمہیں ہماری عمر بھی لگ جائے۔“ یہ کہتے ہوئے

میں نے شمیم طارق سے پوچھا.....

”شمیم! آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کب کیا؟“

انہوں نے جواب دیا.....

”شعر گوئی اور مضمون نگاری کی ابتدا تو تیرہ چودہ سال کی عمر سے ہی ہو گئی تھی مگر باقاعدہ ادبی

زندگی کا آغاز ۱۹۸۰ء کے آس پاس ہوا اور یہ سفر اب تک جاری و ساری ہے۔“

شمیم طارق نے اردو کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو کرے ہوئے مشورہ دیا، ان کی رائے

میں ”اردو کی بقا کے لئے واحد ترکیب ہے کہ ہم نام و نمود اور دولت سے بے نیاز ہو کر اپنی تہذیب

اور زبان کی خدمت کریں۔ مشکل یہ ہے کہ اردو کی کئی ایسی شخصیتیں جو مشہور ہیں وہ فن کار سے زیادہ ادا



کار ہیں۔ ان لوگوں نے اردو کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کا تعاقب ہونا چاہیے۔ اور یہ ہی بات میں رسم الخط کے لئے کہنا چاہوں گا۔ رسم الخط کے بغیر زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ اردو کا رسم الخط تہذیب ہونے کے بعد جلیل ذلیل ہو جائے گا۔ اس لئے میں رسم الخط میں تہذیبی کا سخت مخالف ہوں۔“

انہوں نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: ”میں نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ تہذیبی اور معاشرتی روایات اصناف ادب کی صورت گری کے ساتھ تلمیحات، استعارات اور تشبیہات اور کنایات کی بھی تشکیل کرتی ہیں۔ ایک شاعر یا ادیب تلمیحات کے ذریعے ان تاریخی، اساطیری یا مذہبی واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کے گرد و پیش میں وقوع پذیر ہو چکے ہیں یا جنہیں اس نے تہذیبی سرمایے کے طور پر اپنے بزرگوں سے حاصل کیا ہے۔ ہماری زبان اردو ہمارا تہذیبی اور معاشرتی ورثہ ہے اور اس کا رسم الخط برقرار رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمیں کسی کرامت یا معجزے کا انتظار نہیں کرنا بلکہ ہمیں خود ذہنی تربیت کرنا ہے کہ اس زبان کی بقا میں ہماری تہذیب کی بقا ہے۔“

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئے۔ پھر بولے۔

”میں آپ کو عماد فقیرہ کرمانی کا ایک مشہور واقعہ سناتا ہوں۔ فقیرہ کرمانی حافظ کے ہمعصر شاعر اور صوفی تھے۔ انہوں نے ایک بلی پال رکھی تھی جو ان کے اقتدا میں باقاعدہ نماز پڑھا کرتی تھی۔ ان کے اقتدا میں بلی کے نماز پڑھنے کو لوگ ان کی کرامت سمجھتے تھے حالانکہ انہوں نے بلی کی تربیت اس طرح کی تھی کہ جب بھی وہ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے وہ ان کی نقل کرے۔“

اپنے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں شمیم طارق کا کہنا ہے کہ اردو یا یورپی زبانوں کے کسی ایک ادیب کا نام لینا ممکن نہیں ہے۔ تاریخ کے جس موڑ پر بھی جس نے کچھ کیا ہے پس اس کا معترف ہوں۔

Mr. Shamim Tariq,

Flat No. 27, 4th Floor, Marzban Mansion, Byculla Fruit Market,  
Mumbai, 400027, India.





خودی کو کمر بستہ آتنا کہ ہر تعمیر سے پہلے  
نوا بعد سے سے خود کو چھو بیٹا میری (نوا کتا ہے  
شوکت مرزا

## شوکت مرزا

ہیز، مڈل سیکس، برطانیہ

شوکت برجیس عرف شوکت مرزا اس ملک میں رہتی ہیں جہاں کے چوہے بھی کبھی سیانے  
ہوتے تھے (اب چوہوں کا سیانا پن سیاست دانوں نے اپنا لیا ہے)۔ اس ملک کے ایک بادشاہ شاہ  
ایڈورڈ سے متعلق ایک واقعہ بڑا مزیدار ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنی ولی عہدی کے زمانے میں انہوں نے اپنی  
والدہ ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط لکھ کر پانچ سو پونڈ مانگے۔ اماں جانی ایسی ویسی تو نہ تھیں کہ غریبوں سے لوٹی  
دولت کو یوں اڑا دیتیں انہوں نے بیٹے کو خط لکھا جس میں فضول خرچی سے بچنے اور کفایت شعاری سے  
رہنے پر لکچر دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ولی عہد نے ماں کو شکریہ کا خط لکھا اور یہ بھی اب اسے پیسوں کی ضرورت  
نہیں کیوں کہ اس نے اپنی اماں جان کا خط بارہ سو پونڈ میں فروخت کر کے اپنی ضرورت پوری کر لی ہے۔  
ایسے ملک میں رہ کر دولت کمانے کے گر ”سیکھنے“ کی بجائے شوکت مرزا بچوں کا رسالہ  
”ورثہ“ شائع کرتی ہیں اور اس میں بچوں کو انگریزی کے تعاون سے اردو سکھانے اور انہیں اخلاقی  
کہانیوں کے ذریعے مادر پدر آزاد اور ہنے کی بجائے محبتوں کے سبق دیتی ہیں۔ ہیں نا بہت عقل مند! خود  
ریسرچ کر کے بڑے خوب صورت مضمون لکھتی ہیں جس سے بڑے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہی جیسے پیگوانز  
(penguins) پر انہوں نے بڑا دلچسپ مضمون لکھا ہے اور بتایا ہے کہ نیوزی لینڈ میں سمندر کے



کنارے ہزاروں سال سے بسنے والے اس پرندے کے لئے وہاں کے نو آباد باشندوں نے زمین جنگ کر دی ہے اور اب ان کی آبادی کم ہوتی جا رہی ہے۔

اس جریدے کے لئے وہ ڈھونڈھ کر مضامین لاتی ہیں تاکہ بچوں میں دل چسپی قائم رہے جب کہ بچوں کے لئے لکھنے والے انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ اطہر راز مرحوم نے جو بہت پائے کے شاعر تھے بچوں کے لئے کچھ منظوم پہیلیاں بھی لکھی تھیں۔ ایک پہیلی آپ کو بھی سناؤں.....  
دشمن کو لکار کے آئے // پھر وہ اس کا خون پی جائے

یہ ”شے عزیز“ آپ کو امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں اپنی اصل شکل میں تو نہیں ملے گی کیوں کہ آج کل یہاں خون کے ”لو بھی“ دوسرے روپ میں موجود ہیں مگر یہ شے عزیز پاکستان میں عام ہے اب آپ خود بوجھیں تو بات ہے۔ لیکن آپ خود کو کہاں زحمت دیں گے۔ اس لئے میں ہی بتا دوں کہ یہ شے ”چھتر“ ہے۔

یوں شوکت مرزا نے خود کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ماہنامہ ”طلوع افکار“ کراچی نے شوکت مرزا کی خدمات کے اعتراف کے طور پر نومبر ۲۰۰۲ء کا شمارہ شوکت مرزا کے نام منسوب کر کے ان کا گوشہ شائع کیا تھا۔ اس میں مدیر ”طلوع افکار“ جناب حسین انجم نے ان کے لئے ایک خوب صورت شام کا انعقاد کیا اور منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

|                                      |                                     |
|--------------------------------------|-------------------------------------|
| ہیں وہ واللہ دل و جاں سے نثار اردو   | غرب میں ایسوں کے دم سے ہے بہار اردو |
| ان سے باقی ہے وہاں نام و نشان اردو   | ان سے آباد ہے مغرب میں جہان اردو    |
| ہے عجب یہ کہ ہیں لندن میں فدائے اردو | ہے سدا پیش نظر ان کے بقائے اردو     |
| قابل قدر سے یہ جذبہ عالی ان کا       | صرف اللہ ہے اس کام میں والی ان کا   |
| ہے یہ ہم سب کی دعا خانم شوکت مرزا    | تم پہ بارش ہو کرم ہائے الہی کی سدا  |

شوکت مرزا برصغیر کے نام سے بھی جانتی ہیں۔ ۱۷ جولائی ۱۹۳۲ء کو فتح گڑھ یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۵۸ء میں فتح گڑھ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۶۱ء میں جامعہ کراچی سے انٹراور بی اے کے بعد سوشل ورک میں ایم اے کیا۔ پوسٹ گریجویٹ نیچر ٹریننگ (P G C E) ۱۹۷۱ء میں برمنگھم یونیورسٹی سے کیا۔ تعلیمات (education) میں ایم اے کی ڈگری بھی انہوں نے اوپن یونیورسٹی سے ۱۹۹۵ء میں لی۔

اپنے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے شوکت نے کہا: ”میں نے پانچ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا۔ اسی عمر میں اردو روانی سے پڑھتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ لہذا اردو ادب ڈگری لیول تک پڑھا۔ اعلیٰ تعلیم کی منزلوں تک بڑی محنت سے پہنچی۔ اب لندن میں تیس سال سے مین اسٹریم (main stream) کی نیچر ہوں۔

میں نے اشعار پندرہ سال کی عمر سے کہنے شروع کیے تھے۔ یونیورسٹی کی پڑھائی کے دوران



نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ نثر نگاری کوئی چھ سال پہلے شروع کی۔ 'ورثہ رسالے' کے لئے کہانیاں اور مضمون لکھتی ہوں۔ انگریزی کہانیوں سے ترجمے کرتی ہوں۔ سفر کی جھلکیاں اور معلومات عامہ کے علاوہ جانور اور پرندوں کے بارے میں مضامین لکھتی ہوں۔ بچوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھیں جو بچوں کی نظمیں کے نام سے ۱۹۸۲ء میں کتابی شکل میں شائع کیں۔ جہاں تک بچوں کے اردو ادب کا تعلق ہے وہ میرے نزدیک بہت کم لکھا گیا ہے۔ میں اس سے منکر نہیں کئی شاعروں اور نثر نگاروں نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ دی ہے جیسے حفیظ جالندھری، شان الحق حقی، احمد ندیم قاسمی، صوفی قاسم، قسطل شفقائی، محمد یٰ بگم، اسماعیل میرٹھی وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بھی حضرات نے بچوں کے لئے رسالوں میں مزاج کے ذریعے بچوں کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ دی ہے۔ ویسے ہر دور میں بچوں کے لئے رسالے بھی شائع ہوئے ہیں جیسے پھول، غنچہ، کھلونا، بنات وغیرہ۔ پاکستان میں جناب اسلم فرخی نے بچوں کے لئے اسلامی کتابیں لکھیں اور ان کے صاحبزادے جناب آصف فرخی کی توجہ بھی بچوں کے ادب کی طرف ہے۔ محترم حکیم سعید مرحوم نے بلاشبہ بچوں کے لئے 'نونہال' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو اب تک ان کی صاحبزادی سعیدہ شائع کر رہی ہیں۔ برطانیہ میں بچوں کا ادب لکھنے والوں میں چند لوگ ہیں جیسے بانو ارشد، صفیہ صدیقی، رضا علی عابدی، محمود ہاشمی وغیرہ۔ ہندوستان میں چلڈرنز اکیڈمی، دہلی سے بچوں کے لئے کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

شوکت نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: "بچوں کا رسالہ نکالنے کے لئے کچھ خاص باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے خصوصاً کہانیاں، نظمیں اور دوسری تحریریں بھی ایسی ہوں جنہیں بچے دل چسپی سے پڑھیں۔ رسالے کی ظاہری خوب صورتی بہت اہم ہے۔ بچوں کا رسالہ بھی ایک دل کش کھلونے کی طرح ہونا چاہیئے۔ ان میں کھیل کھیل میں ہمارے کلچر سے واقفیت پیدا ہو اور بچے زبان بھی سیکھیں۔"

شوکت نے کہا: "ہمارے معاشرے کا بڑا المیہ یہ ہے کہ والدین کی طرف سے کوئی ہمت افزائی ہوتی نظر نہیں آتی۔ نہ ہی ہمارے ہاں بچوں کے ادب کی تخلیق کا رجحان ہے۔ جب کہ انگریزی زبان میں بچوں کے لئے ادب بڑی فراخ دلی سے تخلیق کیا جاتا ہے اور شائع ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ہر تیسرا شخص قلم کار ہے۔ بچے خود سے دل چسپ کہانیاں تخلیق کر کے لکھ سکتے ہیں۔ انگریز بچوں کی سوچ اور تصورات (imagination) کا دائرہ بہت وسیع ہے ٹیلی ویژن پر بچوں کے لئے خصوصی طور پر پروگرام تیار کیئے جاتے ہیں۔ بچے لائبریری جاتے ہیں۔ ڈرامے دیکھتے ہیں۔ میوزک سنتے ہیں۔ ماں باپ ان بچوں کو چھٹیوں پر لے جاتے ہیں جہاں یہ طرح طرح کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ مصوری کرتے ہیں تصویریں بناتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فنون لطیفہ انسان یا بچے کے ذہن میں تخلیق کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔"

اردو کا رسم الخط ہو یا کسی بھی زبان کا۔ یہ زبان کا دل ہوتا ہے۔ یہ بند ہو گیا تو زبان ختم ہو گئی۔ جو رسم الخط نہیں تو زبان نہیں۔ رسم الخط بدلنے سے ترکی کی زبان ختم ہو گئی۔ اس سے زیادہ عبرتناک مثال



کیا ہوگی۔ ہماری سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے بچوں کو اردو زبان و ادب کی طرف راغب کریں۔ اس طرح رسم الخط بدلنے کی ضرورت نہ ہوگی۔“

شوکت کی پسندیدہ شخصیت ڈاکٹر شان الحق حقی ہیں کیوں کہ انہوں نے بچوں کے ادب کی طرف بھرپور توجہ دی ہے۔ شوکت نے اب تک بچوں کے لئے ہی زیادہ لکھا ہے۔ باوجود اس کے ان کی غزلوں کا مجموعہ ”آنکھیں“ اور نظموں کا مجموعہ ”ہجرت“ شائع ہوا ہے۔ ان کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ در بدر ہیں فقط موسم جہاں کے لئے سکوں جاں کے لئے گوشہ اماں کے لئے  
بکھی ہے رزق کی خواہش، تلاش آب کبھی ہوا ہے ترک وطن صرف اک گماں کے لئے  
پہنچ ہی جائیں گے منزل پہ حوصلے والے زمین تنگ نہیں شوق بے کراں کے لئے

شوکت مرزا کے شوہر جمشید مرزا بھی ماٹھے ہوئے ادیب ہیں۔ ایک پیاری سی بیٹی ہے نرہت مرزا جس نے میڈیا اسٹڈیز ٹی وی پروڈکشن میں گریجویشن کیا ہے، اب بی بی سی لندن کے ڈاکومنٹری سیکشن میں ریسرچر کی حیثیت سے تحقیق میں مصروف ہے۔  
میں نے کہا، ”اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سناؤ۔“

شوکت نے کہا، ”میری زندگی کا یہ اہم واقعہ ہی ہے جس نے زندگی کو ایک نیا موڑ بھی دیا اور میں نے بچوں کے لئے ایک میگزین شائع کرنا شروع کیا۔ چوں کہ مجھے لکھنے لکھانے کا شوق ہمیشہ سے رہا۔ ایک دن ایک مشاعرے میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ہماری عمر کے لوگ تو ان ادبی محفلوں میں شریک ہو کر لطف اندوز ہوتے ہیں مگر بچے ان سے محروم ہیں۔ بس بھر بچوں کو ذہنی طور پر ایک جگہ جمع کرنے کے لئے میں نے قدم اٹھایا۔ ایک میٹنگ کی جس میں مرحوم اطہر راز، ابرار ترمذی، سرور عالم، مونا مرزا اور ساحر شیوی نے شرکت کی یہ ستمبر ۱۹۹۷ء کی بات ہے۔ نومبر ۱۹۹۷ء میں میں نے پہلا پرچہ شائع کیا اور اب تک یہ انتھک محنت جاری ہے۔

اب پچھلے چار پانچ برسوں سے میں اردو زبان کو دور دور تک پہنچانے کے لئے ’سلاؤ لایبریری‘ جاتی ہوں۔ وہاں ہر ماہ کے آخری ہفتے کو دو سے تین بچے تک بچوں کو کہانیاں سناتی ہوں۔ کھیل سکھاتی ہوں جن کے ذریعے بچے اردو بولنا سیکھیں۔ ایک کلب یارا۔ سٹریٹ گڈ قائم کیا ہے جو ابھی صرف لندن کے بچوں میں متعارف ہے۔ اسے ترقی دینے کی خواہش ہے۔ میری گزارش ہے کہ بچوں کے ادب سے محبت کرنے والے اور اردو کی بقا کے لئے کام کرنے والے آئیں تو ہم متحد ہو کر اپنے اپنے حصے کا چراغ جلا لیں۔

Mrs. Shaukat Mirza,

244 Balmoral Drive, Hayes, Middlesex, UB4 0AA, UK



صدرا در رخسار کے جذبے لعل اوجات اسقدر لے قابو  
موقتہ میں کہ انسان سارے آداب کو روک رہا تھا، اور  
قدیم احقری قدر میں با حال کرتا بھرنا ہے۔

شہناز منزل  
یکم ستمبر ۱۹۸۰ء



## ڈاکٹر شہناز منزل

لاہور، پاکستان

میں شہناز کا خط پڑھ رہی تھی اور اس کی تصویر کو بھی غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر میں شہناز سے باتیں کرنے لگی۔ اس کا کلام سننے لگی۔ اور ایک جگہ، ایک شعر سن کر میں نے اُسے روک دیا۔ ”بس، اسی شعر کو دھراؤ شہناز۔“

بھید گھل پایا نہیں گر تجھ پہ ہست و بود کا

گردشِ دوراں ترا سارا سفر بے کار ہے

اور اس کی ترنم ریز ملکوتی آواز کمرے کے سناٹے سے ہم آغوش ہو کر فضا کو مترنم کرنے لگی۔ ہاں، کبھی کبھی کسی خاص ماحول میں سناٹے بھی بولنے لگتے ہیں۔ زندگی کی فلسفیانہ تہہ داریوں کو سمجھنا آسان بھی نہیں اور کہا جاتا ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے دانش اور فکر و شعور کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ عورت جس کے لئے کہا گیا ہے کہ اس کی عقل مٹنے میں پڑی ہوتی ہے، وہ بھلا ان رموز و اسرار کو کیا سمجھے گی۔ ایسا کہنے والے دانشوران کے لئے شہناز منزل کا یہ شعر ہی کافی ہے۔

اصنافِ سخن میں نعت کہنا آسان نہیں۔ حد ادب ہر حرف کی زنجیر ہوتا ہے۔ شہناز نے یہاں بھی اس صنفِ سخن کو نیا پن دیا ہے۔ ”اسمِ محمد“ کے عنوان سے اور حرفِ حرف جوڑ کر اپنے رسولؐ سے



محبت اور عقیدت کے جو نقش تراشے ہیں وہ دل میں ایسی دل پذیر تصویر بناتے ہیں کہ وہ نعت بابار پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ذہن در تپے کھول کے بیٹھی

ہاتھ پہ رکھے ہاتھ

کیسے لکھوں نعت

بھیکا چہرہ، بھگی پلکیں

بھگی رہی ہے رات

چشم بینا نور بصیرت

کوئی نہ دے گا ساتھ

اسم محمد جو دل پہ اترے

پھر ہی بنے گی بات

شہناز نے شاعری زیادہ کی ہے اور نثر کم کم لکھی ہے۔ لیکن اس نے پتھر لیے راستوں پر چلتے ہوئے کتاب سے اپنا نانا نہیں توڑا۔ اس کی شاعری کے نو (۹) مجموعے اور نثر کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے کلام کے مجموعے (۱) پیام نو (۲) جرأت اظہار (۳) جذب و حرف (۴) عکس دیوار پر تصویر (۵) موسم کے سائبان (۶) میرے خواب ادھورے ہیں (۷) جادۂ عرفان (۸) نون پینٹس آف ٹوڈے [Ten poets of today] اور (۹) عشق تماشا ہیں۔ دسواں مجموعہ ”قرض وفا“ برمنگھم میں مقیم شہناز کی دوست، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے ان کے کلام سے اپنی پسند کا انتخاب شائع کیا ہے۔ نثر میں ان کی کتب یہ ہیں (۱) نماز بچوں کے لئے (۲) لائبریریوں کا شہر، لاہور [ڈاکٹر کڑی] (۳) فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار [لکچروں کا مجموعہ] اور اجلاکون میلاکون [کالموں کا مجموعہ]۔

یہ ہی نہیں شہناز سوشل ورک کے کئی اداروں کے ساتھ بطور صدر یا ڈائریکٹر فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی اپنا وقت دیتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر سیمینار، مشاعرے، کانفرنسیں، ٹاک شو (Talk Show) اور ٹیلنٹ شو (Talent Show) منعقد کرتی ہیں تاکہ پاکستان میں خواندگی کا رجحان پیدا ہو۔

۱۰/ اپریل ۱۹۵۴ء کے دن شہناز فیصل آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد صاحب حشر القادری افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ چنانچہ شہناز کے کانوں نے اذان کے بعد اپنے والد کی شاعری سنی اور شعری ذوق ان کے خمیر میں رچ بس گیا۔ طلب علم نے ان سے کئی تعلیمی مرحلے طے کرائے۔ لائبریری سائنس میں ایم اے کے بعد انہوں نے سائنٹفک مینجمنٹ (scientific management) کا چار سالہ ڈپلوما نیدر لینڈ (Nederland) سے کیا۔ کئی زبانوں کے کورس کیے۔ کمپیوٹر کورس کیے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تمام تعلیم انہوں نے شادی کے بعد حاصل کی۔ ایف اے کے بعد ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ان کے شریک حیات سلطان صاحب مرحوم تعلیمی لحاظ سے وکیل تھے مگر تجارت کرتے تھے۔



۱۹۹۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ شہناز نے دو بیٹیوں، نعمانہ سلطان اور میمونہ سلطان کے ساتھ زندگی کے مشکل اور صبر آزما حالات کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا۔ ادبی اور رفاہی خدمات پر انہوں نے کئی ایوارڈ بھی حاصل کئے ہیں۔

شہناز بتا رہی تھیں کہ انہوں نے کئی مختصر کہانیاں بھی لکھیں لیکن لکھنے کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ جب شہناز چوتھی جماعت میں تھیں تو انگریزی میں ایک نظم کہی۔ اردو میں پہلی بار مصرعہ طرح پر کہی گئی غزل سے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

گلشن کی اب ہے خیر نہ اب آشیاں کی ہے  
بہکی ہوئی نگاہ کرم باغباں کی ہے  
جست پسند ہوں مری فطرت بلند ہے  
ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے

اس نئے آسمان کی تلاش میں شہناز نے پندرہ سال قبل ”ادب سرائے“ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا مقصد نئے لکھنے والوں میں ادبی رجحانات کو فروغ دینا ہے۔ اس تنظیم کے تحت باقاعدہ نشستیں ہوتی ہیں۔ شہناز کو یوں بھی ادب کی خدمت کر کے بڑا سکون ملتا ہے اور فخر محسوس ہوتا ہے۔ مالی خسارہ ان کے اس فخر اور سکون کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ گروہ بندیوں کے بھی خلاف ہیں۔ بقول شہناز، ”ان ہی گروہ بندیوں کی وجہ سے کئی نا اہل اپنے جعلی کام کی وجہ سے ابھر آئے ہیں اور باصلاحیت لوگ پیچھے رہ گئے ہیں“

شہناز کو میر، غالب، اقبال، ن م راشد اور آدا جعفری کے ساتھ شیکسپیر، کیٹس اور ہارن کا مطالعہ کرنا پسند ہے۔

ڈاکٹر اجمل نیازی نے شہناز منزل کے ایک انٹرویو میں لکھا ہے۔۔۔۔۔

”ایک سچی عورت جہاں کھڑی ہو جاتی ہے وہاں گھر بن جاتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن لاہریری کی انچارج محترمہ شہناز منزل ایک اعلیٰ ذوق کی خاتون ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں لاہریری کی پہلی نگران بن کر آئیں اور نہ صرف لاہریری کو ایک خوب صورت گھر کا انداز دیا بلکہ ماڈل ٹاؤن والوں کے لئے اس جگہ کی کشش عام کی۔ خاص طور پر عورتوں اور بچوں کو اس طرف مائل کیا۔ انہوں نے لاہریری کو ایک ادارہ بنانے کی کوشش کی۔ اب ماڈل ٹاؤن میں اس لاہریری سے زیادہ آسودگی، کشادگی اور تازگی کہیں نہیں ملتی۔ ہر روز سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہیں۔ کتابیں لے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت کی نرمی اور محبت سے لوگوں کو گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اگر اداروں میں اس طرح کے لوگ ہوں تو ایک خوب صورت ماحول قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہاں وہ پڑھنے والوں کی رہ نمائی کرتی ہیں۔ وہ خود ایک بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں۔“



صاحب طرز ادیب نذیر قیصر نے لکھا ہے.....  
 جس معاشرے میں عورت کی تخلیقی گواہی کو رد کرنے کی روایت پڑ جائے وہ معاشرہ تہذیبی،  
 سماجی اور ثقافتی سطح پر بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے۔ شہناز منزل ہماری ایسی غیر تخلیقی روایت میں لفظ اور  
 خواب کے حوالے سے ایک زندہ اور تخلیقی گواہی بن کر ظاہر ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری ہماری  
 تہذیب کے کھنڈر سے طلوع ہوتی ہوئی کسی صبح کی مانند ہے..... سچی اور خوب صورت۔  
 شہناز میرے سامنے تھیں۔ سچی اور خوب صورت باتیں کر رہی تھیں۔ شاعری کی زبان میں کہنے لگیں۔

تا پتے دھوپ الاؤ مجھے صدیاں گزریں  
 جلتا سورج ہی مقدر میں لکھا کیوں میرے  
 کیا ترے پاس یہی کچھ تھا بتا میرے لئے  
 ساری ٹھنڈک کو بہاروں میں بانٹ دیا  
 مجھ سی ”بے وقت گداگر“ کے لئے کچھ نہ بچا  
 چاند گر میرے نصیبوں میں نہیں تھا کوئی  
 اک کرن نور کی بس مرے نام لکھ دیتا  
 مجھ سی ”بے وقت گداگر“ کو وہی کافی تھا  
 کاسہ چشم میں موتی کے خزانے جڑ کے  
 تا پتے دھوپ الاؤ میں چلی آئی ہوں

ہمارے ڈاکٹر صفات علوی شہناز منزل کا ”شکوہ“ پڑھ کر کہیں گے، یہ گستاخی ہے، بے ادبی  
 ہے اللہ کے حضور ہمیں شکوہ نہیں کرنا چاہیئے۔

میں ڈاکٹر صاحب سے کہتی ہوں، شکوہ ہم نہ کریں گے تو کیا فرشتے کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے  
 خود کہا ہے کہ وہ جتنی محبت اپنے بندوں سے کرتا ہے اتنی ان کے ماں باپ بھی نہیں کر سکتے۔ سو یہ شکوہ  
 نہیں۔ اپنے رب سے ایک محبت بھری فریاد ہے۔ اور بندہ اپنے رب ہی سے تو فریاد کرے گا تو وہ اپنی  
 رحمت کے دروازے وا کرے گا اور بندے کے سارے دکھ درد اور دلدرور ہو جائیں گے۔

شہناز منزل کی شخصیت اور فن پر محترمہ نعمانہ فاروق نے ”عکس خیال“ کے عنوان سے ایک  
 تعارفی کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں اکیس (۲۱) جلیل القدر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے  
 مضامین ہیں۔ ان کی کتابوں پر معروف شعرا کی آرا کے علاوہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور پروفیسر شمیم یوسف  
 کے خطوط بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر شہناز منزل ایک قابل ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی ہیں۔ اردو، پنجابی، انگریزی اور سرائیکی  
 زبانوں پر قدرت رکھتی ہیں۔ بہت اچھی مترجم ہیں۔ لائبریریوں کے یوم تائیس پر ڈراموں کا پروگرام  
 کراتی ہیں تو ان کے لئے ڈرامے بھی خود لکھتی ہیں۔ مسرتوں کے ان کاموں کے ساتھ انہیں اس وقت



بہت دکھ ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتی ہیں کہ کئی لوگ جب کتابیں پڑھنے کے لئے لے جاتے ہیں تو اندر سے صفحے پھاڑ لیتے ہیں۔ کئی بار تو کتاب کی خالی جلد واپس رکھ دیتے ہیں اور اندر سے کتاب چرا لیتے ہیں۔ اس نقصان کی تلافی کے لئے لائبریری کو سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیر بار ہونا پڑتا ہے (۱)۔

اپنے مرحوم شوہر کو یاد کرتے ہوئے شہناز نے کہا، ”وہ بہت باذوق، عالم اور اعلیٰ ظرف شخص تھے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں میرے شوہر کی محبت اور تعاون کا اس میں بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی شخصیت ایک ٹھنڈے، میٹھے پانی کے چشمے جیسی تھی جس نے میری ہمہ جہت صلاحیتوں کی آب پاشی کی۔“

اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ یاد کرتے ہوئے شہناز نے کہا، ”یہ اس دور کی بات ہے جب میں کالج کی طالب علم تھی۔ میرے کالج کے مشاعرے میں کشورنا ہید مہمان خصوصی تھیں۔ میں نے بڑے زور شور سے تیاری کی مگر عین وقت پر ان کی شخصیت کے رعب کی وجہ سے مشاعرے میں شرکت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ حالاں کہ اس سے قبل کئی مشاعروں میں شرکت کر کے انعامات بھی حاصل کر چکی تھی۔ میں کالج کے لان (lawn / سبزہ زار) میں ایک درخت کے چچھے چھپی بیٹھی تھی۔ میرے نام کا اعلان بات بات ہوتا رہا، مگر میں چھپی بیٹھی رہی۔ آج بھی جب کشورنا پالمٹی ہیں تو یہ واقعہ ان کے گوش گزار کر کے خوشی ہوتی ہے کہ میں مرعوب بھی ہوئی تو ایک خاتون کی قد آور شخصیت سے“

اور اب اپنی تنظیم ”سرائے ادب“ کے ذریعے اردو ادب کی آبیاری کرنے والی شہناز منزل خود بھی ادب کی دنیا میں ایک قد آور خاتون کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔

Dr. Shanaz Muzammil,

125 F, Model Town, Lahore, Pakistan

۱۔ ایسی ذہنیت، وہ بھی پڑھے لکھے تعلیم یافتہ لوگوں میں ہو سکتی ہے یقین نہیں آتا۔ بہر حال یہ مقام افسوس ہے کہ ایسی ذہنیت کے لوگ بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ سلطانیہ مہر





نالہ شب ہے نارسا، آہِ محراب ہے اتر  
میرا خدا کہاں گیا، میرے خدا کو کیا ہوا

۱۴۱۱ھ

## صابر ارشاد عثمانی

لندن، برطانیہ

”یہ بات ہے ۱۵/ جون ۱۹۳۳ء کی جب آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک طرحی مشاعرے میں ڈیوڈ ہرسٹ نے (جو انڈین انسٹی ٹیوٹ میں اردو پڑھاتے تھے) اپنی طرحی غزل سنائی۔ اس کا ایک شعر ہے۔  
زبانِ اردو کلامت سے میں ثنا خواں ہوں یہ صدقِ دل سے کہتا ہوں، اشتہار نہیں دیکھیے یہ جذبات تھے ایسے شخص کے جس کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ اور ڈیوڈ ہرسٹ جیسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو اردو سے اپنی مادری زبان کی طرح پیار کرتے ہیں۔ دور کیوں جائے ایک اور انگریز ڈیوڈ میتھیو زبانی برطانیہ کے باسی ہیں جن کے شب و روز اردو پڑھیے، اردو لکھیے اور اردو میں سوچئے کے تحت ہوتے ہیں۔“  
ان جذبات کے اظہار کے بعد صابر ارشاد عثمانی ذرا خاموش ہوئے تو میں نے سوال کیا، ”آپ نے اردو ٹرسٹ بھی تو قائم کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیے۔“

”اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ ہم بنیادی ارکان (جس میں اطہر راز مرحوم، ڈاکٹر عبدالغفار عزم، فاروق حیدر) اور چند دیگر احباب نے ۷/ نومبر ۱۹۹۶ء کو اردو ٹرسٹ کی بنیاد ڈالی۔ اس کا بنیادی مقصد برطانیہ میں اردو کا احیا، ترقی و ترویج ہے۔ اور اردو ہال، کتب خانہ، تحقیقی و اشاعتی ادارے کے لئے کام کرتا ہے۔ اس کا ذکر اس مجلے میں بھی ہے جو اردو ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام فروری ۲۰۰۰ء میں دوروزہ



عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔

انہوں نے اپنی میز پر سے مجلہ اٹھا کر مجھے دیا۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل اس خوب صورت مجلے میں کانفرنس کی روداد کے علاوہ شرکائے کانفرنس کی رنگین اور غیر رنگین تصاویر کے ساتھ دنیا بھر کے دانشوران ادب کی معلوماتی تحریریں، مقالے اور مضامین بھی شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مجلہ صابر ارشاد عثمانی کی اردو سے محبت اور اس کی ترویج میں ان کی لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عثمانی صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہیں کہ انہیں اردو سے محبت کرنے والے ارکان و احباب بھی میسر ہیں جو ہدایا و عطیات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ ان کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے اور ان کی محنت کو کامیابی کے خوش رنگ پھولوں سے سجادیا۔ ان سب کے نام بھی اس مجلے میں موجود ہیں۔

صابر ارشاد عثمانی نے افسانہ بھی لکھا ہے۔ اگست ۱۹۵۳ء میں لکھا ان کا افسانہ ”چنان قحط سالے“۔ خاصا مقبول ہوا اور کئی جریدوں نے اسے شائع کیا۔ ماہنامہ ”شاعر“، ممبئی کے مارچ ۱۹۵۳ء کے شمارے میں ان کے دوخا کے ایک ہی عنوان ”کہانی روپ“ کے تحت شائع ہوئے۔ یہ خا کے لائق مطالعہ ہیں۔ صابر صاحب صحافی بھی ہیں اور ساحر شیوی صاحب اور ودیا ساگر آنند کے جریدے ”پرداز“ کے مدیر ہیں۔

میں نے گفتنی حصہ دوم کا سوال نامہ ان کے سامنے رکھ کر پوچھا، ”کچھ اپنے بارے میں بتائیے مثلاً.....“ مگر جملہ مکمل ہونے سے پہلے انہوں نے سوال نامہ اٹھا لیا۔ پڑھ کر کہنے لگے، ”میری جائے پیدائش بارہ بنکی، اودھ، ہندوستان ہے۔ تاریخ پیدائش جو پاسپورٹ پر لکھی ہے ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء ہے۔ ۱۹۴۹ء تک ابتدائی اور ثانوی جماعت کی تعلیم بارہ بنکی کے نیپلٹ اسلامیہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی، پاکستان ہجرت کی۔ اعلیٰ تعلیم ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک اسلامیہ کالج کراچی میں حاصل کی۔ اس وقت یعنی پچھلی صدی کے پچاسویں عشرے میں کراچی اردو کے مایہ ناز دانشور، افسانہ نگار، نقاد اور شاعر حضرات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ وہاں پروفیسر کرار حسین، پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر ممتاز حسین، جناب مصطفیٰ زیدی، سید ابوالخیر کشفی، اور طالب علموں میں (پروفیسر) حسین کاظمی، باقر رضوی اور مشفق خواجہ جیسے لوگوں کا جھگڑا تھا۔ لامحالہ ایسے ماحول نے ذہن کو متاثر کیا اور مجھ میں ایک ادبی شعور نے جنم لیا۔ ہجرت دوم انگلستان نومبر ۱۹۵۵ء میں کی۔

میری ادبی زندگی کی شروعات تو کراچی کے دوران قیام میں ہی ہو گئی تھی۔ غالباً ۱۹۵۳ء کا آغاز تھا۔ میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بندر روڈ کراچی کے زلیمن کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ وہاں اس وقت جناب اختر انصاری اکبر آبادی مدیر ’مشرق‘ کراچی بھی تشریف رکھتے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے طنز اُکھا.....

’ادب کی ہانڈی تو بہت بگھارتے رہتے ہو کیوں نہ کوئی تخلیقی کام کرو کھاؤ۔‘

اس بات کو میں نے بطور چیلنج قبول کر لیا اور ایک افسانہ بعنوان ’چنان قحط سالے‘ لکھا جس کی ٹیکنیک اپنی نوعیت کی انوکھی اور نئی اختراع تھی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں وطن عزیز پاکستان سے ہجرت کر کے یہاں پہنچا۔ اس کے



کچھ دنوں بعد تیج الہ آبادی (جن کو پاکستان سول سروس کمیشن نے مصطفیٰ زیدی بنا دیا تھا) اپنی ٹریننگ کے سلسلے میں یہاں آئے تھے۔ جب تک وہ یہاں رہے میرے لئے ادبی ماحول رہا۔ لیکن ان کے لوٹ جانے کے بعد اس ادبی ماحول سے بھی ناکٹاؤٹ گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایک دوست سے، جو پاکستان سے آئے ہوئے تھے، ملنے گیا۔ ان سے دریافت کیا..... کیا ان کے پاس اردو کا کوئی رسالہ یا اخبار ہے۔ جس پر انہوں نے 'جنگ اخبار' دیا۔ اس میں میرا وہ ہی افسانہ چھپا ہوا تھا جو ۱۹۵۳ء میں تحریر کیا تھا۔ بعد میں مختلف لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت بھی یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوا کہ اس کی نقل رکھی جائے کیوں کہ اس وقت تک اردو ادب سے دل چسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ لندن میں ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس سے بھی بے خبر رہا۔ ہاں ایک بات کا ضرور قلق ہے۔ اس دوران میں ابن انشا یہاں ہسپتال میں رہے اور انتقال کر گئے اور میں ان سے نمل پایا۔ ایک بار یہ افواہ بھی اڑی کہ مشفق خواجہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۹۳ء میں جب کراچی گیا تو ان کی موت کی خبر ان ہی کو سنائی۔ ۱۹۹۱ء میں ایک صاحب مجھے 'فیض اکیڈمی' لندن کی ایک نشست میں لے گئے۔ جس کے بعد اردو ادب پڑھنے اور لکھنے کا شوق دوبارہ پیدا ہوا۔ تب مجھے اپنے افسانے کا خیال آیا۔ دسمبر ۱۹۹۶ء میں جناب حمایت علی شاعر یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان سے اپنے افسانے کا تذکرہ کیا۔ ان کے پاس وہ کراچی میں موجود تھا۔ انہوں نے وہ افسانہ اپنی اس تحریر کے ساتھ روانہ کیا.....

'ماشا اللہ! خوب ہے۔ آج سے پینتالیس (۳۵) سال پہلے آپ اتنا اچھا خیال انگیز افسانہ لکھتے تھے اب تو بہت ہی اچھا اور فکر انگیز لکھتے ہوں گے۔ کاش آپ کی تحریریں میری نظر میں سے گزرتی رہیں۔'

۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۱ء تک روٹی کپڑا مکان میں پھنسا رہا۔ اس وجہ سے اردو کتابوں کے مطالعے سے اور اردو لکھنے سے محروم رہا۔ اس طویل وقفے کی وجہ سے میری نستعلیق تحریر میں کچا پن آ گیا، جملوں میں کجی اور املا میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

جیسا عرض کیا ۱۹۹۱ء میں 'فیض اکیڈمی' کی نشست میں، جو 'فیض اور امن' کے تحت ترتیب دی گئی تھی، شامل ہونے کے بعد دوبارہ لکھنے کی تحریک مجھ میں پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں امریکہ عراق پر بم باری کر رہا تھا۔ رسالہ 'عصری ادب' کے ڈاکٹر محمد حسن بھی وہاں موجود تھے۔ اس کے سرورق پر ڈاکٹر کنول کرشن بالی کے مضمون بعنوان 'علامہ اقبال پر کھری کھری باتیں' کی سرخی نمایاں چھپی ہوئی تھی۔ اور مضمون اشتراکی نقطہ نظر کی ترجمانی کر رہا تھا۔ میں نے اس کے جواب میں مراسلہ تحریر کر کے ڈاکٹر محمد حسن کو بھیجا۔ جس کا آغاز یوں تھا.....

"یہ اتفاق تھا یا حسن اتفاق کہ ۳۵ سال قیام لندن میں پہلی مرتبہ ایک ادبی محفل میں شرکت کا موقع ملا، ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کی ادبی نشست کی کشش ہو یا پھر امن عالم کی جستجو۔ ادھر آپ کی صدارت میں امن کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، ادھر یو این او کی سرپرستی میں انسانیت کھلی جا رہی تھی۔ اقبال نے دوسری جنگ عظیم سے قبل لیگ آف نیشنز کے متعلق کہا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ داشت پیرا فرنگ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے



اسی داشتہ کی اولاد یو این او ہے جس کو امریکہ نے اپنی دولت کے بل بوتے پر ہائی جیک کر لیا ہے۔ اور بقول جوش ملیح آبادی۔ میری دولت کے آگے دولت قارون شرمندہ۔ اب وہ امریکہ کی باندی بن گئی ہے اور اسی ناجائز رشتے کی وجہ سے خلیجی جنگ کا آغاز ہوا ہے۔ اسی زمانے میں فیض اور امن عالم کی نشست کا اہتمام ہوا جس میں آپ سے شرف نیاز حاصل ہوا اور عصری ادب سے روشناس ہوا۔

اس کے جواب میں انہوں نے تحریر کیا.....

’آپ کی سعی مبلغ کی ضرورت ہے۔/-£250‘

میں نے اس مضمون کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ ابھی تک وہیں رکھا ہوا ہے۔ تاہم اس آغاز سے حوصلہ بڑھا۔ ’صدائے لندن‘ نے مجھے مشاورتی کونسل میں شامل کر لیا۔ اس کے مدیر اطہر راز مرحوم تھے۔ وہ مجھ سے کچھ تحریر کرنے کا تقاضا کرتے اور میں ٹال جاتا۔ انہوں نے دو تین رپورٹیں تحریر کر کے میرے نام سے شامل کر دیں تو میں نے ان سے کہا آپ ہی بتائیے کس موضوع پر لکھوں۔ سامنے میز پر ایک کتابچہ پڑا ہوا تھا..... ’تاریخ امیر خسرو اور ان کے حالات‘۔

’اسی میں سے نکال نکول کے مضمون تحریر کر دو‘۔

میں نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کو تحریر کرنے کے لئے کوئی تین مہینے کے قریب انڈیا آفس لاہور پر جا کر مطالعہ کیا پھر اس مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ امیر خسرو نے اردو زبان کی بنیاد ڈالی اور وہ اردو کے پہلے عوامی شاعر تھے۔ یہ مضمون سلسلے وار پانچ اقساط میں ’صدائے لندن‘ میں شائع ہوا۔ یہ تحقیقی مضامین تحریر کرنے کا آغاز تھا۔ میں نے نثر لکھی ہے لیکن شاعری کی نعمت سے محروم ہوں۔ رہا سوال تصانیف کا۔ سو ہنوز دلی دور است۔

اور رہا اردو ادب اپنانے میں خسارے کا سوال، تو خاتون! ادب میں دل چسپی کا آغاز ہی اس وقت ہوا جب زندگی کی رسی کا آخری سرا ہاتھ میں رہ گیا۔ اب شہرت اور خسارے کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔

آپ کا یہ سوال کہ ادیبوں کی گروہ بندی سے اردو زبان کو نقصان پہنچا یا نہیں۔ چنانچہ میں اس سوال کا جواب ذاتی تجربہ کی بنیاد پر پیش کر سکتا ہوں۔ ۱۹۹۶ء میں اردو ٹرسٹ کی بنیاد پڑی اور ۱۹۹۷ء میں یہ ٹرسٹ چیرمن کمیشن میں رجسٹر ہوا۔ میں اس ٹرسٹ کا جنرل سکریٹری منتخب ہوا۔ اس نے ۲۰۰۰ء میں اردو زبان پر پہلا سہ روزہ عالمی سیمینار کا انتظام کیا تھا۔ جس میں کوئی باون (۵۲) مندوبین مختلف ممالک سے مدعو کیئے گئے تھے۔ ایک دن پر مشتمل دوسرا عالمی سیمینار ۲۰۰۱ء میں تشکیل پزیر ہوا۔ اس میں بھی مندوبین مختلف ممالک سے مدعو کیئے گئے تھے۔ اردو ٹرسٹ کے کانسٹیٹیوشن کے تحت ہر تیسرے سال الیکشن ہونے کی شرط تھی۔ الیکشن کی تاریخ مقرر ہوئی۔ صدر نے پہلے تو استعفیٰ دیا پھر چیرمن کمیشن کے متولین کے خلاف درخواست دی تا کہ الیکشن نہ ہو سکے۔ پھر اپنے ایک متولی دوست کی، جن کا مستقر ویسے تو لاہور ہے لیکن وہ امریکہ اپنے لڑکوں سے ملنے آتے جاتے رہتے ہیں اور لوٹے میں اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے لندن میں قیام کرتے ہیں، موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ووٹ سے صدر بن گئے اور سب طاقت اپنے ہاتھ میں



لے لی۔ لیکن چیرٹی کمیشن نے اسے منظور نہیں کیا اور یہ شرط عائد کی کہ دونوں میں رابطہ قائم ہو جائے۔ جو مصیبت ہے وہ یہ ہے کہ وہ صدر رہنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ٹرسٹ میں اور متولین کو مدعو کیا جائے اور الیکشن ہو وہ اس کے خلاف ہیں۔ اس طرح ۲۰۰۲ء میں ٹرسٹ کچھ نہ کر سکا۔ پورا سال چیرٹی کمیشن سے خط و کتابت میں لگ گیا۔ صرف ذاتی مفاد کے تحفظ کے چکر میں نقصان اردو کی ترویج کو پہنچا۔ اسی طرح ایک اور ادبی تنظیم یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی جس کی بنیاد اطہر راز مرحوم نے ڈالی تھی، ان کے انتقال کے بعد اس کا جنرل سکریٹری میں منتخب ہوا۔ ہم نے ۲۰۰۲ء میں بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی۔ اس کے مندوبین میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ چناں چہ ماسکو، پراگ، پیرس، استنبول اور لندن کے مقامی اردو دان اس میں شامل کئے گئے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی اور کالی داس گیتارضا بھی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ ماہنامہ پرواز اسی سوسائٹی کا ترجمان ہے اور میں اس کا مدیر۔ چناں چہ اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ جتنا فائدہ اردو زبان کو ہونا چاہیے تھا ہوا یا نہیں۔“

اردو کے مستقبل کے حوالے سے ان کا کہنا ہے.....

”برصغیر پاک و ہند میں یہ تصور ذہن نشین ہو گیا ہے کہ درحقیقت تعلیم یافتہ طبقہ وہ ہے جس کا تعلق انگریزی میڈیم اسکولوں سے ہے۔ اس طبقے نے لارڈ میکالے کے ۱۸۳۵ء کے اس منشور کی کوکھ سے جنم لیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا..... ہمیں ایسے کارندوں اور آدمیوں کی ضرورت ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن جو اپنے طور طریقوں، اپنی سوچ، اپنے اخلاق اور نقطہ نظر اور آراء کے اعتبار سے انگریز ہوں۔ بد نصیبی یہ ہے کہ یہ انگریزی میڈیم کے بچے دنیا کی ترقی یافتہ ملکوں کے بچوں کے مقابلے میں، جو اپنی مادری زبان میں سوچتے اور اسی زبان میں لکھتے پڑھتے ہیں، ڈی گریڈ ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہمارے ملک کے حکمران حضرات کی کوتاہ چشمی ہے۔ پاکستان میں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے تاکہ دوسرے بچوں سے مقابلہ کر سکیں جو اپنی بول چال کی زبان میں سوچتے اور جواب دیتے ہیں۔“

میں اردو کا رسم الخط بدلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ دراصل نہائی جینٹری حضرات کی بیخ ہے جن کی وفاداریاں اپنے ملک سے کم اور اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ ہیں۔ اس میں سیاست کے پہلو زیادہ کارفرما ہیں۔ کیوں کہ اردو کے رسم الخط کے پیشوا عربی اور فارسی زبانیں ہیں وہاں سے کوئی خطرے کی گھنٹیاں سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ اگر ہندوستان کی طرف نظر دوڑائیں تو اس کے باسی دنیا میں بہت زیادہ ہیں۔ ان کی بھی اپنی علاقائی زبانیں ہیں مثلاً ہندی، بنگالی، ملیالم، تامل، مراٹھی، گجراتی اور ان زبانوں کے بولنے اور لکھنے والے بھی ان دیاروں میں بسے ہوئے ہیں وہ اپنی زبان کا رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ ان حلقوں کی طرف سے مے ڈے مے ڈے (Mayday mayday) کی چیخ و پکار نہیں سنائی دے رہی ہے۔ تو آخر اردو کے لئے یہ داویلہ کیوں؟

سوال نمبر آٹھ کے جواب میں انہوں نے کہا: ”ٹھیکسیر کے الفاظ 'To be or not to' be that is the question کی تشریح حضرت خضر علیہ السلام ہی بہتر کر سکتے ہیں۔ اور علامہ اقبالؒ کا یہ شعر حضور سرور کائنات کے نظریہ کی تشریح کر رہا ہے۔“



خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ان دونوں شاعروں کی شاعری صرف انسانیت کی پرچار کرتی ہے اور یہ دونوں میرے محبوب شاعر ہیں۔  
اپنی زندگی کا اہم واقعہ ان کے کہنے کے مطابق ۸ / جنوری ۱۹۵۳ء کا دن ہے جب کراچی میں پہلی  
مرتبہ طالب علموں پر گولیاں چلی تھیں۔ اس کے بعد طالب علموں کی دو تنظیمیں زیادہ پیش پیش ہو گئی تھیں۔ جیسا  
کہ حمایت علی شاعر اپنی منظوم خودنوشتہ سوانح حیات 'آئینہ آئینہ' میں لکھتے ہیں۔

ہماری ایک جماعت تھی وہ تھی "ڈی ایس ایف" بس ایک "جمعیت طلبہ" تھی ہم سے خائف  
یہ ۱۹۵۳ء کا زمانہ تھا۔ اسلامیہ کالج میں بزم اردو کے اراکین دونوں تنظیموں سے منتخب کیے گئے تھے۔ میرا تعلق  
ڈی ایس ایف سے تھا۔ یہ یاد نہیں کہ میرے ذمے کون سا عہدہ تھا۔ جمعیت طلبہ والے ہمیں 'سرخا' کہتے تھے۔  
ہم ان کو ملائے کہتے تھے۔ بزم ادب کی تقریب کے لئے طے پایا کہ ہر گروپ اپنی اپنی پسند کے دو مہمان  
خصوصی بلائے۔ جمعیت طلبہ نے جن دو کو مدعو کیا ان میں ایک تو ماہر القادری تھے اور دوسرے تھے کوئی مولوی  
صاحب جن کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ ہماری طرف سے ابراہیم جلیس اور ممتاز حسین تشریف لائے تھے۔ پہلے  
مولوی صاحب آئے اس کے بعد ماہر القادری صاحب نے نعت پڑھ کر مجمع کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اس کے  
بعد ابراہیم جلیس نے اپنے طنز و مزاح کے نشترؤں سے قہقہوں کا بازار گرم کر دیا۔ جس سے ہال گونج گیا۔ ان  
کے بعد ممتاز حسین اپنا دقیق مضمون لے کر کھڑے ہو گئے۔ جس کی وجہ سے لوگ اپنی گھڑیوں کی طرف دیکھنے  
لگے۔ نیند کے خمار کی جھپکیاں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ ہم لوگوں کے پسینے چھوٹنے لگے۔ ہم یوں پریشان تھے  
کہ ابراہیم جلیس نے جو سماں باندھا تھا وہ غائب ہو رہا ہے۔ میں نے ابراہیم جلیس کی طرف مایوسی کے عالم میں  
دیکھا انہوں نے مجھے بلایا اور کہا، اگر کوئی قرأت جانتا ہو تو اسے میرے پاس بھیج دو۔ میں ایک دوست کو جانتا  
تھا۔ اس کا تعلق بھی ڈی ایس ایف سے تھا۔ اتنے میں اذان کی آواز کان میں آئی۔ ممتاز حسین صاحب مضمون  
ختم کر کے نیچے آ گئے۔ پھر چائے کا دور شروع ہوا۔ اتنے میں برابر کی مسجد کے امام صاحب شرکت کے لئے  
تشریف لائے۔ ان سے کہا گیا کہ اذان کی وجہ سے جلسہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا کونسی نماز کی  
اذان؟ عصر کئی نماز کو ختم ہوئے تو ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا اور مغرب کی اذان میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ ابراہیم جلیس  
میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے،.....

'بچو، ہم نے عزت رکھ لی'۔

یہ ابراہیم جلیس کی ذہانت کا کرشمہ تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ زندگی نے ان کا ساتھ نہ دیا اس  
وقت ایک شعر یاد آرہا ہے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں ان کے حوالے سے یہ شعر سنایا۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

Mr. Sabir Irshad Usmani,

53 Leigham Vale, London, SW16 2IQ, UK





کی محمد سے دنا تو نے تو ہم سیر سے ہیں  
یہ جہاں سیر سے کیا لوچ و خلم سیر سے  
صبیحہ علوی / افسانہ قمر سلطانہ

۱۹۳۰ء  
۱۰/۱۱/۳۰

## صبیحہ علوی

برمنگھم، برطانیہ

جب گھر میں دو افسانہ نگار ہوں اور وہ بھی میاں بیوی تو کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ کوئی ایک، دوسرے کی صرف پر اچھائیں بن کر رہ جاتا ہے۔

گو صبیحہ علوی کا قیصر تمکین سے کوئی مقابلہ نہیں کہ جناب تمکین پرانے لکھاڑی ہیں، ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں اور آج بیشتر جرائد کے مدیران قیصر تمکین کی کہانیوں کے منتظر رہتے ہیں لیکن صبیحہ علوی نے بھی خوب لکھا ہے۔ اور ان کی کہانیاں ”میم صاحب کے آنسو“، ”دفنایا ہوا زخم“ اور ”لوہے کے پتے“ مختلف جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ہی نہیں ان کی ایک کہانی ”میم صاحب کے آنسو“ پہلے گورکھی میں ترجمہ کی گئی۔ مترجم تھے ڈاکٹر گردیاں سنگھ مقیم برمنگھم۔ پھر یہ ہی کہانی انگریزی میں برطانیہ کی معروف افسانہ نگار محترمہ صفیہ صدیقی نے انگریزی میں ترجمہ کی اور دیگر مصنفین کی کہانیوں کے ساتھ اپنے مجموعے ”دا گولڈن کیج (The Golden Cage) سنہرا پنجرہ“ میں شائع کی۔ اس کتاب کی دیگر مصنفین میں بانو ارشد، محسنہ جیلانی، شاہدہ احمد، فیروز جعفر مرحومہ، نجمہ عثمان، حمیدہ معین رضوی، پروین لاشاری، ڈاکٹر فیروزہ مکر جی اور ستارہ خانم کی کہانیوں کے ساتھ خود صفیہ صدیقی کی کہانی بھی شامل ہے۔

رضیہ قمر سلطانہ عرف صبیحہ علوی ۲۵ / نومبر ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد، ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔



ان کے والدین فتح پور، یوپی سے ہجرت کر کے حیدرآباد دکن گئے تھے۔ حالاں کہ ہسودہ میں ان کی زمینداری تھی لیکن صبیحہ کے اوسیدہ صفدر حسین نے وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے خاندان میں پہلے وکیل تھے۔ زمینداری سے مزاج لگا نہیں کھاتا تھا۔ دادا سید علی حسین زمیندار تھے مگر بیٹے کو اپنی مرضی کا تابع نہ بنا سکے۔ چنانچہ سید صفدر حسین نے ہسودہ سے ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

صبیحہ کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی اور پھر علی گڑھ جا کر پڑھا۔ ۱۹۵۴ء میں، یعنی چودہ سال کی عمر میں ان کا نکاح جناب قیصر تمکین سے ہوا اور ۱۹۵۵ء میں رخصتی ہوئی۔ قیصر تمکین صاحب نے بھی اس وقت انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی۔ تمکین صاحبہ صبیحہ کے دور کے رشتے سے چچا زاد تھے۔ شادی کے بعد صبیحہ لکھنؤ آ گئیں۔ اور ۱۹۶۱ء میں برطانیہ آنے کے بعد لکھنؤ لکھانے کی سرگرمی طاق پر دھری رہ گئی۔ گھرداری اور بچوں کی پیدائش کی وجہ سے ان کی پہلی ترجیح بچوں کی تعلیم تھی۔

قیصر تمکین اور صبیحہ علوی کی تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی جمیل فاطمہ ایڈنبرا میں انگریزی کی لکچرار ہیں۔ ان کے میاں طارق منیر پروفیسر ہیں۔ دوسری صاحبہ زادی نور الصباح ڈاکٹر ہیں اور لیڈز میں کنسلٹنٹ ہیں۔ اور تیسری صاحبہ زادی مصباح آئی ٹی وی میں پروڈیوسر ہیں۔

یہ تخلیقات اتنی اعلیٰ رہیں کہ صبیحہ کو قلم چھٹنے کا غم تو رہا مگر اس وقت بچوں کی پرورش اولیت درجے کی حامل تھی۔ اب جب کچھ فراغت ملی ہے تو صبیحہ ادب کی طرف لوٹ آئی ہیں۔

میں نے پوچھا برطانیہ آ کر کیسا لگا؟ یہاں کی ادبی فضا اس آئی؟

صبیحہ کہنے لگیں، ”در اصل ہمارے گھر کی تعلیم و تربیت کچھ ایسی تھی کہ ہمیں صبر و برداشت کی عادت سی پڑ گئی۔ ہم نے والد صاحب کی تربیت کے زیر اثر کسی سے مرعوب ہونا نہیں سیکھا۔ چوں کہ ابا جان نے انگریز راج کو کبھی پسند نہیں کیا لہذا جب کبھی کوئی انگلستان پڑھنے آتا اور ایک عدد میم کو بیوی بنا کر اپنے ساتھ لے آتا تو ہم کبھی اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ جب میں نئی نئی برطانیہ آئی تو میں نے یہاں کی خوش حالی کا تجزیہ کیا۔ یہاں تو میموں اور صاحبوں کے کتے اور بلیاں ہمارے غریب فاقہ زدہ ہم وطنوں سے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ انہیں پلیٹ میں کھانا ملتا ہے۔ ہمارے ملک کی عورتیں اکثر روتی رہتی ہیں۔ کسی نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیوں؟ اس کیوں کے جواب میں، میں نے کہانی ’میم صاحب کے آنسو‘ لکھی۔

مشرقی تہذیب، وہاں کی تعلیم اور وہاں کی قدریں سونے چاندی اور جواہرات سے بھی زیادہ انمول ہیں۔ افسوس کہ ہم میں سے بیشتر لوگوں نے دولت کے حصول کی خاطر ان قدروں سے اپنے بچوں کو محروم کر دیا۔ آج ہمارے بہت کم بچے مذہبی تعلیم سے آراستہ ہیں۔ اردو تو پھر دور کی بات ہے۔ وہ لمحہ بھر رکیں اور پھر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، ”ہمیں افسوس تو ہندوستان اور پاکستان میں اردو سے بے نیازی کا ہونا چاہیے۔ پاکستان میں تو پھر بھی اسکولوں، کالجوں بلکہ



یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے مگر ہندوستان جہاں کی مٹی سے اردو کا خمیر اٹھا تھا، وہیں اس کے کفن و فن کا سامان تیار کیا جا رہا ہے۔ وہی والدین یہاں بھی گھر میں اردو بولنے میں شرم محسوس کرتے ہیں تو بچے کہاں سے اردو سیکھیں گے۔“

صبیحہ کو اردو زبان سے عشق ہے۔ کہنے لگیں، ”جیسے ماں کا دودھ رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے اسی طرح اردو میری رگوں میں لہو کی صورت میں رواں ہے۔“

صبیحہ اور قیصر تمکین صاحب کو کتابوں سے عشق ہے۔ ان کے گھر کے ہر کمرے میں دیوار گیر الماریاں کتابوں سے پٹی پڑی ہیں۔ ”بغیر مطالعے کے ہماری فکر کو روشنی نہیں مل سکتی۔“ صبیحہ نے کہا، ”میاں کو بغیر پڑھے خند نہیں آتی۔ انہیں کھانے سے اتنی رغبت نہیں لیکن کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہی کتابیں میری بھی تنہائی کی ساتھی ہیں۔ میں نے تعلیمی دور میں عصمت، بیدی، راشد الخیری، پریم چند اور ڈپٹی نذیر احمد کو بڑے چاؤ سے پڑھا تھا۔ اب تو ادب کی ترقی کی رفتار بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو جو مزہ کتاب کے پڑھنے میں ہے وہ کمپیوٹر سے پڑھنے میں نہیں۔“

”اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائیے،“ میرا آخری سوال تھا۔

میری زندگی کا یادگار واقعہ جناب سہام مرزا (۱) مرحوم کا وہ خط ہے جو انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ غالباً انہوں نے میری کوئی کہانی یا مضمون کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ سہام مرزا صاحب کی بھابی ہماری پڑوسن تھیں اور امی سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ سہام صاحب بھی پہلے حیدر آباد دکن میں تھے بعد میں ہجرت کر کے پاکستان گئے۔ انہوں نے خط کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کی۔ میری تحریر کو سراہا اور مشورہ دیا کہ مجھے لکھتے رہنا چاہیے۔ وہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔“

صبیحہ یادوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اسی لمحے قیصر تمکین صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ان کی اپنی کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ کتاب کا نام تھا ”اک کہانی گزکا جمنی سی“۔ اور اس مجموعے میں کئی ایک گزکا جمنی کہانیاں تھیں۔ یہ کہانیاں بلاشبہ اردو ادب میں ایک خوب صورت اضافہ ہیں۔

”آپ کی کہانیوں کا مجموعہ کب شائع ہوگا؟“ میں نے صبیحہ سے پوچھا۔

”جب میں بھی قابل ذکر کہانیاں لکھوں گی۔“ صبیحہ نے ایک خوب صورت مسکراہٹ کے درمیان ہنرمندی سے ایک میٹھا جملہ کہا اور ہم چائے کی میز کی طرف بڑھ گئے۔

Mrs. Sabiha Alvi,

72, Corisande Road, Birmingham, B29 6RP, UK.

۱۔ سہام مرزا کراچی پاکستان سے کئی جرائد شائع کرتے تھے۔ ان میں ”دو شیزہ ڈائجسٹ“ بے حد مقبول تھا۔ سلطانہ مہر





”ابھ ۱۱ پند ۱۱ آف سماجی ذمہ داری ہے۔ تاہم دنیا میں سب سے مشکل کام  
اکھا ہے اور آکھت میں سب سے مشکل کام کوئی بھی یا مورخان تحریر کو ۱۲ دیا میں  
بروان چڑھا ہے۔ آف سائنس کی تحریر کو محض دوسرے میں لکھ کر آف میں  
علم کو پھر لکھ ہے۔“

صفا صفت علوی  
۱۹۰۴ء

## ڈاکٹر صفا احمد علوی

بریڈ فورڈ، برطانیہ

ڈاکٹر صفا احمد علوی ایک فرہنگی ایک ادارہ ہیں۔ علم و ادب کا، لسانیات کا اور معلومات کا ایک  
ادارہ۔ لہذا ان سے گفتگو کے وقت یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کا رویہ طالبان علم والا ہو متحکم والا نہ ہو۔  
ڈاکٹر صاحب کی گونا گوں خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جدوجہد اور محنت پر یقین  
رکھتے ہیں۔ علم کے حصول کے لئے انہوں نے جہد کا ایک طویل سفر کیا۔ اس سفر کی روداد بھی ان ہی سے سنئے۔  
میرا سوال تھا، ”ڈاکٹر صاحب اپنا پورا نام، تاریخ و جائے پیدائش کے متعلق بتائیے۔ ساتھ  
ہی یہ بھی کہ آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی؟  
ڈاکٹر صفا مسکرائے، ”آپ نے ایک سوال میں کئی سوالات کر لیے ہیں۔ بس چند منٹ، میں ایک  
پیالی کافی لے لوں۔“

ڈاکٹر صاحب نے بلیک کافی لی۔ وہ بغیر دودھ شکر کے کافی پیتے ہیں۔ اور کافی میں زمانے کی تلخیاں  
گھول کر پی جاتے ہیں۔ انہوں نے کافی کا پہلا گھونٹ لیا۔ مگ کو سامنے رکھا اور گویا ہوئے۔  
”والدین نے نہ معلوم کیا سوچ کر صفا احمد نام دیا تھا۔ کیوں کہ آج کل نئے متعارف میرے نام  
کی تصحیح کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان نے کرم فرماؤں کے لئے ’ص’ کو ’ش’ سے بدل دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا



ہے۔ ادھر ہم اردو والے عام طور سے 'ع' کا تلفظ ویسے ہی کھا جاتے ہیں چنانچہ ایسے کرم فرمائے نجات کو شفات کرویتے ہیں۔ ایک مہربان نے تو یہ بھی کہا کہ صفات (ص کسرہ کے ساتھ) عربی میں اسم مونث ہے اس لئے کسی مرد کے دیئے گئے نام میں 'ص' کا بالشتہ تلفظ کرنا ضروری ہے۔ خاندانی نام علوی خود سے چپک گیا۔ پاکستان ہجرت کے بعد علوی کال غیر متحرک ہو گیا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ ہم اردو والے 'ع' کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرنے سے معذور ہیں، اس لئے اب اکثر احباب بالخصوص وہ جو آسان اردو کے حامی ہیں، الوی سب کوہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ بزرگوں نے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں جائے پیدائش حیدر آباد، دکن اور تاریخ پیدائش ۱۰/ اکتوبر ۱۹۳۴ء لکھوا رکھی ہے۔ والدین کا تعلق اتر پردیش میں ضلع مظفرنگر کے قصبہ جھنجھانہ اور تھانہ بھون سے تھا۔ وسطانوی و فوقانی تعلیم دکنی ہند کے شہر حیدر آباد اور انگ آباد میں ہوئی۔ جامعہ کی تعلیم کا کچھ حصہ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن اور کچھ کراچی یونیورسٹی میں اور باقی لیور پول یونیورسٹی میں پورا کیا۔ لیور پول یونیورسٹی کے دوران قیام میں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے دماغی امراض کی نرسنگ کی۔ لیور پول یونیورسٹی میں زہراوی پودوں کی تقسیم و درجہ بندی پر کام کیا۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۴ء تک لیبیا اور ناٹجیریا کی جامعات میں درس و تدریس اور وہاں کے زہراوی پودوں پر بھی کام کیا۔ بچوں کی تعلیم کی خاطر ۱۹۸۴ء میں ناٹجیریا سے واپس انگلینڈ آ گیا۔ اس وقت یہاں کی یونیورسٹیاں مسز تھچر کی 'طلب و رسد اور منج کاری' (مارکٹ فورسز اور پرائیویٹ آریزیشن Market forces & Privatization) کی آگ کی لپیٹ میں پوری طرح آچکی تھیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں اور تحقیق کے شعبوں میں آسامیاں ناپید ہو چکی تھیں۔ ایسے میں جو کام لوگوں کو مل جاتا تھا اسے غنیمت جانا جاتا تھا۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ مجھے بریڈ فورڈ کونسل کے شعبہ کتب خانہ میں کام کا موقع مل گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کافی کے مگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے دوسرا سوال کیا، "آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کب کیا؟"

"سلسلہ یوں رہا کہ شرفا کے گھروں میں ماں باپ، دادا دادی اور نانا اور ماموں وغیرہ زندگی کے آداب کی تربیت صغیر سنی ہی میں شروع کر دیتے تھے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ میری ادبی زندگی اسی وقت شروع ہو گئی۔ لیکن آپ کے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ باقاعدہ یا بے قاعدہ لکھنا کب شروع کیا؟ تو عرض یہ ہے کہ ہجرت کی زندگی اس قدر بے قاعدہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی کام کسی ضابطے کے تحت انجام نہیں دیا جاسکتا۔ جب ابتدائی درجوں میں زیر تعلیم تھا اس وقت والد سے چھپ کر دو تین کہانیاں ماہنامہ پھول اور ماہنامہ 'دغنیچہ' کے لئے لکھیں۔ جب پکڑا گیا تو والد سے مار پڑی کہ اگر اس کی انک پڑ گئی تو ان کا ڈاکٹر بنانے کا شہرا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ انہوں نے جس قسم کا ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا تھا وہ تو پورا نہ ہوا البتہ کہانی نگاری کا اکھواسر اٹھائے ہی سوکھ گیا۔ ۱۹۸۴ء میں ناٹجیریا سے واپس انگلینڈ آنے پر مقصود النبی شیخ صاحب نے زور دے کر چند مضامین ہفت روزہ راوی کے لئے قلم بند کرائے۔ اس طرح تقریباً پینتیس سال بعد دوبارہ لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔"

میرا اگلا سوال تھا، "کیا آپ شعر بھی کہتے ہیں؟" انہوں نے جواب فرمایا، "شعر کبھی نہیں کہا۔ کہتے



ہیں شعر سننے کی چیز ہے۔ میرے خیال سے اگر قاری اسے بغور پڑھے تو جلد ہی اس کو ادب کے اس حصے کے نئے پن کا احساس ہو جائے گا اور وہ نثری ادب کی طرف، جو صحیح معنی میں معاشرتی انقلاب کا حامل ہوتا ہے، متوجہ ہو جائے گا۔ البتہ نثر میں میرے مضامین کا مجموعہ انا میکا سال رواں یعنی ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔

”اور اب یہ بتائیے کہ کیا زندگی کے کسی حصے میں آپ نے محسوس کیا کہ اردو ادب کو اپنا کر آپ شہرت اور مالی خسارہ میں رہے کیوں کہ آپ انگریزی میں بھی خوب لکھتے ہیں اور کئی تراجم بھی آپ نے کیئے ہیں؟“

”وہ ادیب جو ادب سے اپنا نان نفقہ کھاتے ہیں ان سے یہ سوال کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں نے

دوران گفتگو آپ سے عرض کیا تھا کہ ادب لکھنا ایک پیشہ ہے۔ عموماً ہمارے نزدیک پیشہ وہ ہے جس سے انسان روزی کماتا ہے۔ یقیناً بہت سے ادیب ادب لکھ کر اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور اس لحاظ سے پیشہ

ورادیب ہیں۔ تاہم بہت سے ادیب ایسے بھی ہیں (اور اردو ادب لکھنے والوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے) جو

اس معنی میں پیشہ ور ادیب نہیں اور نہ ہی شوقیہ ادیب (amateur writer) ہیں۔ بلکہ یہ وہ ادیب ہیں جو

ادب کو ایک معاشرتی ضرورت سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ادب کی جانب ان کا تمام تر رویہ پیشہ ورانہ ہے اور وہ اس کو روزی

روٹی کے لئے اختیار نہیں کرتے۔ میرے خیال سے میں دوسرے زمرے میں داخل ہوں۔ جہاں تک شہرت کا

تعلق ہے، میرے نزدیک شہرت سے کہیں بہتر یہ بات ہے کہ اگر کوئی اپنے لکھے ہوئے ادب سے ایک یا دو

آدمیوں کو بھی متاثر کر لے جو اس کی سوچ کو آگے بڑھائیں تو ایسی صورت میرے اطمینان کے لئے کافی ہوگی۔“

”ادب کی گروپ بندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میری رائے میں تو اس گروپ

بندی نے اردو ادب و زبان کی ترقی کو نقصان پہنچایا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ کوئی حوالہ دے

سکیں تو اس سے قارئین کی رہنمائی ہوگی۔“

”محترمہ خاتون! اس کے جواب میں عرض ہے کہ گروہ بندی کو اردو ادب کی تاریخ کا ایک حصہ کہا

جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بالخصوص اس تاریخ کا حصہ جب ہندوستان کا تنزل پزیر سوانح اور اس کا تمدن بتدریج ٹیکن

تیزی سے ایک بیرونی سامراج کی جکڑ میں آ رہا تھا اور نئی انتظامی حکومتی مشین کو اپنے قدم جمانے کے لئے یہ

ضروری تھا کہ وہ مقامی مسلم اور غیر مسلم حاکموں کی تمام سابق روایات کو جس قدر جلد ممکن ہو تھیں نہس کر دیں۔

ایسے میں ایک احتجاجی ادب کا پیدا ہونا ایک امر ضروری تھا۔ کسی زبان کے شعری ادب کی ذمہ داری خوں اور اس میں

استعمال ہونے والی زبان کے لوج سے، بلا مزاحمت اور بلا خوف تا دہی کا روائی، ایک ایسا ادب پیدا کیا جاسکتا

ہے۔ چنانچہ اس دور میں (اور آج تک اس کا ورثہ جاریہ) اردو ادب میں شعری ادب اور اس کو پیدا کرنے والوں

کی بہتات سے پیدائش ہوئی۔ چوں کہ شاعری کے لئے نہ صرف ایک حساس مزاج کی، بلکہ ایک ایسے موزوں

طبیعت اور اس سے زیادہ ایک ایسا استاد کی رہبری بھی درکار ہوتی ہے جو شاگرد کو انہی پکڑوں کو اس کو طریق شاعری کی

اونچ نیچ سے واقف کرائے، اس دور میں اور آج بھی نوا موز شاعر کسی کہنے مشق شاعر کی سرپرستی قبول کر کے اس کے

گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم پیشہ ماہرین کے درمیان آپس کی چشمک بھی جانی پہچانی بات ہے۔ چنانچہ

ہم نہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی میں لکھنؤ اور دہلی کے اردو زبان و ادب کے دو اسکول قائم ہوئے



بلکہ وہاں کے اساتذہ شعرا کے تنکے بھی قائم ہوئے۔ یہاں میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ کسی ازم کے تحت یا کسی اسکول کی پیروی میں پیدا ہونے والا ادب، باوجود اس کے کہ وہ کسی عصیت کا حامل ہو، ضروری نہیں کہ اچھے ادب کے ضمن میں نہ آئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اردو میں چند اعلیٰ ادب پارے پیدا ہوئے۔ مثلاً انیسویں صدی میں غالب نے غزل کو اس عروج کمال پر پہنچایا کہ اس نے متاخرین کے لئے اس صنفِ سخن میں کسی قسم کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ یا بیسویں صدی میں جوش کی سیاسی انقلابی شاعری زبان و بیان اور اثر کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اکبر الہ آبادی کی طنزیہ اور مزاحمتی شاعری کا جواب اردو ادب میں ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی عیسوی میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد، رجب علی بیگ کا فسانہ عجائب اور منشی محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کی مرتب کردہ کہانیاں بعنوان ”طلسم ہوش ربا“ آج بھی اردو فکشن میں زبان اور پرواز خیال کے لامتناہی نمونے ہیں۔“

اب ہم اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا، ”امریکہ اور یورپ کو چھوڑ کر پاک و ہند میں بھی اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس کی بقا کے لئے آپ کیا تجویز کریں گے؟“

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے، ”اردو کا مستقبل تاریک ہے!! ایسا لگتا ہے یہ ایک قسم کا سیاسی نعرہ ہے جو اردو زبان کے رسائل کے مدیران و قوافو قفا اپنے جرائد کے دائرہ مطالعہ بڑھانے کے لئے لگاتے رہتے ہیں۔ کسی زبان کا مستقبل اس کی معاشی اہمیت پر مبنی ہے۔ اور معاشی اہمیت کسی زبان کی اس صلاحیت پر مبنی ہے کہ اس میں علوم حاضرہ کو سمونے کی کتنی گنجائش ہے۔ ہمیں اس بات کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ وہ زبان جہاں کی وہ قومی زبان ہے کیا وہاں کی سرکاری زبان بھی ہے؟ اور وہاں کے عوام اور خواص اس زبان کے استعمال پر کس قدر اعتبار اور بھروسہ رکھتے ہیں؟ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہندوستان (بھارت) نے آزادی ہند کے بعد اردو کو، جو وہاں کے ایک ایسے صوبے کی زبان تھی جو آبادی کے لحاظ سے ہندوستان پر حاوی تھا، دیس نکالا دے دیا تھا اور پاکستان نے ایک اقلیتی گروہ کی زبان کو، باوجود اس کے کہ اس وقت اس کے ایک حصے میں اکثریت کی زبان ہنگامی تھی اور دوسرے حصے میں اکثریت کی زبان پنجابی تھی، قومی زبان قرار دیا۔ ہندوستان میں سرکاری سطح پر اس دیس نکالے کی وجہ ہندو عصیت بیان کی جاتی ہے تو پاکستان میں سرکاری سطح پر اس سے بے اعتنائی کی وجہ کہیں اس کا بھڑ ہونا تو نہیں؟ ہندوستان میں باوجود اس کے کہ سرکاری سطح پر اس کے ساتھ سوت کا سلوک روا رکھا گیا ہے لیکن کیا وہاں کا سب سے اہم اور معاشی اعتبار سے مضبوط ادارہ، فلم اور پاپ میوزک (pop music) اپنے درمیان سے اسے خارج کر پایا؟ کسی زبان کی ترویج میں فلم اور عوامی موسیقی (پاپ میوزک) کی اہمیت ہمیں تسلیم کرنا چاہیے۔ اب وہاں کے بعض صوبوں میں اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اجازت مل گئی ہے۔ تاہم زبان کی ترویج میں اجازت سے فائدہ اس وقت پہنچے گا جب اردو اپنی اقتصادی اہمیت بین الاقوامی منڈی میں منوانے کے قابل ہو جائے گی۔

جہاں تک امریکہ اور یورپ میں اردو کے مستقبل کے تاریک ہونے کا سوال ہے میں اس کا مکمل

جواب دینے سے معذور ہوں۔ روس، ترکی اور بعض مشرقی یورپی ممالک میں علمی سطح (academic level) پر دل چسپی کی وجہ سے وہاں کی بعض جامعات اردو زبان کی تدریس اور تحقیق میں حصہ لے رہی ہیں۔ جہاں تک



مغربی یورپ اور یورپی معاشی مندری کا تعلق ہے اس کی بعض جامعات میں اس زبان سے حاشیائی دل چسپی موجود ہے۔ بریڈفورڈ یونیورسٹی میں ماڈرن لینگویجز (Modern Languages) کا شعبہ خاصا اہم ہے لیکن اس کے باوجود کہ یہاں کی مقامی آبادی کا سب سے بڑا اقلیتی گروہ پاکستانیوں کا ہے، اس یونیورسٹی کے اس شعبے میں اردو شامل نہیں۔ یہاں شیردل کلب کے ایک ڈنر میں اسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو موصوف نے اس سلسلے میں شعبہ اسلامی دینیات (اسلامک اسٹڈیز Islamic Studies) کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی۔ لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے ڈاکٹر میتھیوز نے اردو سیکھانے کے لئے ایک آڈیو ٹیپ (Audio tap) کے ساتھ کتاب تیار کی ہے اور اس کی پوشش پر کلمہ طیبہ کے کچھ حصے کے ساتھ ساتھ مسجد کی گنبد اور مینار کی شبیہ چھپی ہوئی ہے۔ اس وقت جب ان ممالک میں اسلام دہشت (اسلام فوبیا Islam Phobia) پھیلی ہوئی ہے اس زبان کے ڈانڈے اسلام سے جوڑ کر اس کو عوامی مقبولیت کیا اور کس طرح حاصل ہوگی، میرے خیال میں اس کا جواب دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

انہوں نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا، ”انگلستان کے ثانوی مدارس کے قومی انصاب (نیشنل کیری کولم National Curriculum) میں اردو بحیثیت ایک انتخابی ماڈرن لینگویج (Elective Modern Language) شامل کی گئی ہے۔ اس سے قبل اس کو مادری زبان کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مساجد سے جڑے نجی مدارس میں بچوں کو قرآن کے ساتھ ساتھ اردو سکھانے کا بندوبست بھی ہے۔ موخر الذکر مدارس میں کم عمر بچے ہوتے ہیں اور اول الذکر مدارس میں تیرہ اور تیرہ سال سے زائد عمر کے بچے زیر تعلیم ہوتے ہیں۔ موخر الذکر مدارس میں معلم باعوم موجودہ دور کے تدریسی طور طریقوں میں نہ تو تربیت یافتہ ہیں اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ان کے پاس اردو زبان کی کوئی سند ہو۔ اول الذکر مدارس کے اردو معلم محکمہ تعلیم و تربیت کی طرف سے مدرس مجاز کی حیثیت (Approved Teacher Status) تو رکھتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کے پاس اردو لکھنے پڑھنے کی سند ہو۔ جب کہ ایسی صورت یورپی زبانوں کے سلسلے میں نہیں ہے۔ اکثر اسکول کے صدر مدرس اردو پڑھانے والے اساتذہ کے تقرر کے لئے ان کا پاکستانی ہونا یا ان کا شاعر یا ادیب ہونا کافی سمجھتے ہیں اس سے آپ خود اندازہ لگا سکتی ہیں کہ حکومت اور اسکول کی انتظامیہ اردو کی تدریس کی جانب کس قسم کا رویہ رکھتی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ بچے کا اردو سیکھنے کا تسلسل بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ بچہ جو کچھ کچھ کچی پکی اردو مساجد کے مدرسوں میں سیکھ لیتا ہے اور ثانوی اسکولوں کے درمیان اتنا وقفہ گزر جاتا ہے کہ اکثر صورتوں میں وہ اردو کی شد بد کھو چکا ہوتا ہے۔ تدریسی مواد پاکستانی مسلم تہذیب اور قومیت کی اساس پر ہے۔ جس کی وجہ سے غیر پاکستانی بچوں میں اردو سیکھنے کی کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔

چنانچہ اردو بقا کے لئے تجاویز میں سب سے پہلے خود پاکستان میں عوام کے درمیان اس زبان پر عوامی اعتبار قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دور میں ہندو اور مسلم سیاسی رہنماؤں کی تنگ نظری اور ذاتی مطلب پرستیوں کی بنا پر اردو کو جو مذہبی تشخص دے دیا گیا ہے اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اگر سندھی زبان عربی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاسکتی ہے اور کوئی سندھی اس پر معترض نہیں یا پنجابی گودکھی اور فارسی رسم الخط میں قابل



قبول ہے تو اردو کو دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھنا قابل قبول کیوں نہیں؟ اس کے علاوہ اردو کا نستعلیق خط اردو کو موجودہ بین الاقوامی سے کئی طور پر مستثنیٰ ہونے میں حائل ہے۔ اگر اہل فارس اپنے دیدہ زیب نستعلیق کو ترجیح دیتے ہیں تو اردو والے اس فرسودہ خط کو کیوں گلے لگائے ہوئے ہیں؟ جس قدر جلد ہو سکے ہم کو اردو کے لئے موجودہ فارسی کا نسخہ قبول کر لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کو شعر کے سحر سے آزاد کرانا ضروری ہے۔ یہ کہنا شاعر اور تخلیقی ادب زبان کی ترویج میں اہم ہیں شاید اس حد تک تو صحیح ہے کہ عوام اس ادب کے توسط سے زبان سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن زبان صرف اس ادب کے تحت پھر بھی گنی نہیں جاسکتی کیوں کہ زبان، شاعری اور تخلیقی ادب کے علاوہ دیگر اصناف ادب اور تمام تہذیبی عناصر کی مرسل و مشتر ہوتی ہے۔

نیز آپ نے اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں بھی میری رائے معلوم کی ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک باتیں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ رہا اس کو رومی حروف میں لکھنے کا مسئلہ، اس کا میں یکسر مخالف ہوں۔ برصغیر کے حالات کے تحت میں اس کو موجودہ رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھنے کی اور اشاعت کی اجازت دینا ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ اہم ترین علمی مسئلہ اردو کی بقا کا ہے۔

ہاں اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اردو زبان کی ترقی میں ایک اہم رکاوٹ اردو والوں کا شعر سے غیر معمولی شغف بھی ہے۔ آپ چاہیں تو اس بات سے اتفاق نہ کریں لیکن سچ تو یہ ہے کہ شعر کی لطافت، اس میں شاعرانہ اشارات، کنایات شعر کو سمجھنے میں سنگ راہ ہوتے ہیں اور یہ شعریت چادر بن کر ان حقیقی تاثرات کو ڈھانپ لیتی ہے جو شاعر کے ذہن میں شعر کہتے ہوئے دارو ہوتے ہیں ایک قاری کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر شاعری ختم ہوتی ہے اور کہاں حقیقت شروع ہوتی ہے (۱)۔ اس وجہ سے میرے خیال میں شاعری عمومی طور پر ادب اور بالخصوص زبان کی ترقی میں کوئی مثبت فعل انجام دینے سے قاصر ہے۔ اس کے مقابلے میں اچھی نثر میں گو شعر کی ہی لطافت، اشارات و کنایات کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن وہ ادیب یا نثر نگار کے خیالات کا بہترین آئینہ ہوتی ہے اور اس لئے ادب اور زبان، دونوں کی ترقی میں بہتر معاون ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دینا میں انسانی فلاح و بہبود کے جتنے بھی پیغام نشر ہوئے وہ نثر میں ہوئے ہیں جب کہ میدان جنگ ہو یا کوٹھا، انسانی جذبات کو انگیزت کرنے کے لئے شعر کا استعمال ہوا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ انگیزت جذبات کے تحت کوئی تعمیری، اصلاحی اور ارتقا پریری کا کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ اردو زبان کو ترقی اور ترویج تب ہی مل پائے گی جب اہل اردو شاعری کے بجائے نثری ادب کی طرف راغب ہو جائیں گے۔

گفتنی حصہ اول کے ایک سوال کا حوالہ دے کر ڈاکٹر صفات کہنے لگے: ”آپ کو یاد ہوگا آپ نے پوچھا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان سے باہر اردو میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔ نثر بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ اس کا سبب موضوعات کی کمی ہے یا جرات؟۔ یہ سوال موضوع پر انا نہیں۔ میں کہوں گا، اہل اردو شاعری ادب کے سحر کے تلے سانس لے رہے ہیں۔ طبیعت موزوں ہو تو شعر کہنا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ زبان اور شعر گوئی کے قواعد پر پورا اترے یا نہ اترے۔ شعر میں نہ تو کسی منطق کی ضرورت ہے اور بالخصوص غزل میں نہ

۱۔ حوالے کے لئے دیکھیں ”آثار ابوالکلام آزاد“ از قاضی عبدالغفار، گلشن ہاؤس، ۱۱، نور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۵، ۱۱۶۔



خیال میں کسی تسلسل کی۔ بیرون برصغیر ہندو غزل گوئی پر زور ہے۔ اکثر شاعروں کے شعر الفاظ کا ایک ایسا مجموعہ ہوتے ہیں جو بس کسی لے کی پابندی کر جائیں ورنہ اس کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، کیوں کہ شعری ضرورت کے سہرے اصول کی آرز میں زبان کی خامیاں بھی ڈھانپ لی جاتی ہیں۔ لیکن نثر میں ادیب کو اپنے خیالات کو تسلسل اور منطقی انداز سے پیش کرنا ہوتا ہے اگر زبان میں کسی قسم کی کجی ہو تو قاری کی گرفت کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، یہاں ان کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن وقت یہ ہے کہ یہاں پر اردو کا ادیب اور شاعر ایک ایسا باسی ادب پیدا کر رہا ہے جس کا منبع پاکستان اور ہندوستان میں واقع ہے جہاں وہ بچپاس ساٹھ سال پہلے رہتا تھا۔ ایک طویل عرصے سے مغربی ممالک میں رہنے کے باوجود یہ ممالک اس کے لئے دھماور ہیں۔ وہ مقامی زبان کے شاعر اور ادیب کے ساتھ رابطہ کرتے ہوئے گھبراتا ہے اور ہیر پھیر کر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اپنا تشخص ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تشخص کی بات آئی تو ایک اور بات کا خیال آیا۔ شعر گوئی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مشاعروں میں عوام تحسین کا ڈونگرا بھی برساتے ہیں جس سے انا پھلتی پھولتی ہے۔ ایسی تحسین بے چارے نثر نگار کو کہاں نصیب؟ اب یہ دوسری بات ہے کہ بارش کا پانی جو پودے کی نشوونما میں مدد و معاون ہوتا ہے جب جڑ میں مرنے لگے تو پودا گلنے سڑنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر صفات خاموش ہو گئے۔ میں نے اگلا سوال کیا، ”اردو یا یورپی زبانوں کے کُن ادیبوں سے متاثر ہیں؟“

”افوہ!“ وہ مسکرائے، ”آپ کے سوال مشکل سے مشکل تر ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس کا طالب علم رہا ہوں اس لئے بالکل آزاد سوچ کا عادی ہوں۔ وسیع المطالعہ ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جن ادیبوں اور شاعروں کو پڑھا ہے ان میں نہ تو ہر چیز ان کی اچھی ہے اور نہ ہی ہر چیز بری۔ تاہم ایسا کوئی نہیں جسے امام مان لیا جائے۔ اردو والوں کے یہاں تشخص پرستی بہ اتم ہے۔ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے یہاں اقبال کی کوئی خامی پکڑنا قابلِ گردن زدنی ہے۔ وہاں کا کوئی شاعر جب تک فیض کو بے عیب لاٹانی شاعر نہ کہے خود برادری میں قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ نتیجہ میں کسی بھی معروضی تنقید کا فقدان ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے تنقیدی میدان میں بھی خاصا کام کیا ہے۔ لہذا میں نے تنقید کے حوالے سے بھی پوچھ لیا، ”اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ نہ عملی نہ نظریاتی ترقی ہو رہی ہے۔ نظریات کا مطلب کسی ازم کی نشان دہی نہیں اس اصطلاح کو وسیع تناظر میں رکھتے ہوئے اس کے اسباب بتائیں۔“

انہوں نے بڑی خوش دلی بتایا، ”اردو ادب میں تنقید تو ہو رہی ہے لیکن مثبت تنقید کا فقدان ہے۔ ادب اس تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے جس میں وہ نشوونما پاتا ہے۔ لازماً اس ادب پر تنقید اسی تہذیبی تناظر میں ہوگی جہاں اس کا جنم ہوا ہے۔ لیکن اردو ادب میں تنقید اس کے تہذیبی دائرے سے باہر رہ کر کی جا رہی ہے۔ اکثر تنقیدی ڈھانچہ مغربی ادب سے مستعار ہے۔“

ادب کو اگر ایک جنس (صنعت) مان لیا جائے اور ادیب یا شاعر کو اس کو پیدا کرنے والا یا صنعت کار تو اس بازار میں اس پیداوار کا صارف عام قاری ہے۔ جنس چاہے کتنی ہی اعلیٰ معیار کی ہو لیکن اگر وہ گاہک کی



پسند اور ضرورت کے مطابق نہ ہو تو وہ سوومند نہیں گنی جاتی۔

جب ساہوکار اور مقروض ایک ہی ہوں تو بینک کے کاروبار کو مفلسی کا منہ دیکھنا ہی ہوگا۔ جس طرح ادب پیدا کرنا ایک پیشہ ہے اور ادیب یا شاعر کا پیشہ ور ہونا ضروری ہے اسی طرح تنقید کرنا بھی ایک پیشہ ہے اور ناقد کے لئے پیشہ ورانہ رویہ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن جب ہم عصر ادیب یا شاعر ایک دوسرے پر تنقید کریں گے تو ”من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو“ کا رویہ درآنا لازم ہے۔

انہوں نے یہ بھی کہہ ”میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ادب پیدا کرنا ایک پیشہ ہے اور پیشہ کسی ازم کی چار دیواری کی قید میں نہیں رہتا۔ کوئی جراح کسی مریض کی جان بچانے والے ایک نہایت اہم جراحی عمل کو صرف اس لئے مال دے کہ وہ عمل اس کے مذہبی اقدار کے خلاف ہے تو یقیناً وہ نہ تو اچھا پیشہ ور ہے اور نہ ہی اچھا انسان۔ اسی طرح جب کوئی ادیب صرف کسی ازم کے تحت کام کرے گا تو یقیناً وہ اپنے پیشے کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہوگا۔“

”ڈاکٹر صاحب! اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ بتائیے، میں نے آخر میں پوچھا۔

”جن کے پیروں میں بلیاں بندھی ہوں ان کی زندگی میں زندہ رہنے کی کوشش ہی سب سے اہم ہے“ وہ ہنس کر بولے ”سن بلوغت کی دہلیز پر قدم ہی رکھا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا تب سے اب تک ہجرت کا طوق گلے میں ہے۔ ہجرت کی ایک روایت پر کاربند ہوں کہ مہاجر ایک بار گھر چھوڑ دے تو وہ وہاں واپس گھر بسا نے نہیں جاتا۔ اور بقول شخصے، ”ہم وہ مجبور ہیں جن کو عہد جوانی نہیں ملا“ مجھ جیسے پر صادق آتا ہے۔ آخری ہجرت پاکستان سے انگلستان کی تھی اب یہ وطن ثانی ہے اور اس لئے دس سال لیبیا اور ناںجیر یا میں بن باس کاٹ کر واپس آ گیا ہوں۔“

کیا زندگی میں اس زیادہ اہم واقعہ بھی کوئی ہو سکتا ہے !

Dr. Sifat A. Alavi,

21 Wimborne Drive, Allerton, Bradford, BD15 7AH, UK

نوٹ: ڈاکٹر صفات علوی کے مضامین کے مجموعے کا نام ”انامیکا“ ہے۔ عموماً اردو والے اس اسم سے واقف نہیں۔ کوئی بے نام شے ”انامیکا“ ہے۔ اس کتاب میں دیباچہ کے تحت یہ مختصر تحریر درج ہے۔ ”اس کتاب کو کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ نام اور دیباچہ، دونوں ڈاکٹر صفات علوی کی گوشہ نشین، کم آمیز عادات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سلطانہ مہر



دیوار عشق کا طاہر - غزل علی سی  
مستیوں کا لغت میں سراپ کی ارتقا

طاہر تونسوی

۲۹ جنوری ۲۰۰۳



## ڈاکٹر طاہر تونسوی

ملتان، پاکستان

میں تو بھول چلی تھی مگر ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ذاتی کوائف کی فہرست میں ان کے دوسرے "سفر نامہ ہندوستان" کی تاریخ درج تھی اور وہ تھی ۲ / دسمبر ۱۹۹۰ء۔ وہ سنہری، روپیلی اور سرخی شام ان ہی تاریخ کے آس پاس رہی ہوگی جب میں پہلی بار ان سے افسانہ نگار انور زہت کے گھر دہلی میں ملی تھی۔ یہ نشست ان کے اور ان کے رفیق اور استاد ڈاکٹر سلیم اختر کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ ایک طرح سے مہمان خصوصی میں ان دو صاحبان کے ساتھ میں بھی شریک تھی۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کی موجودگی میں خود کو مہمان خصوصی کے بجائے ان کی میزبان کے طور پر یاد رکھے جانے میں مجھے لطف آ رہا تھا۔ ڈاکٹر طاہر کو میں نے پڑھا نہیں تھا۔ اس لئے بس کسی طاہر تونسوی کی حیثیت سے ان سے ملی لیکن جب وہ غزل سرا ہوئے تو دل موہ لے گئے۔ کیا مرصع غزل تھی، خوب صورت احساسات اور ایک دل نواز فکر کی آئینہ دار غزل جو میں آپ کے مطالعے کے لئے یہاں ضرور شامل کروں گی کہ اس کے سارے اشعار میں نے اپنی "یادگار اشعار کی بیاض" میں محفوظ کر لیے تھے۔

جو ہو سکے تو میرے حق میں فیصلے لکھنا  
اگر ہوں داغ تو داغوں کو آئینے لکھنا  
شکستگی کے معانی، مری لغت میں نہیں  
میں ٹوٹ جاؤں تو اس کو زاویے لکھنا



سفر کی دھول سے چہرہ انا ہوا ہے مگر  
کواڑ بند کئے ہی نہیں ہیں آنکھوں نے  
ملائمت ہے غزل میں بہ فیض شیریں لباب  
مثال ریگ رواں اڑ رہے ہیں برسوں سے  
تم اپنی ذات کے زنداں میں قید ہو طاہر  
جو لکھ سکو تو انہیں اپنے واسطے لکھنا  
وصال یار کا منظر بس اک سے لکھنا  
مرے حساب میں صدیوں کے رت جگے لکھنا  
اے رب - نطق نئے اب تو ذائقے لکھنا  
ہماری خاک کے ذروں کو آسروے لکھنا

ڈاکٹر طاہر تونسوی تنقید کے ”مرد میدان“ ہیں لیکن شاعر بھی خوب ہیں۔ اصولاً ان کا تعارف ”گفتنی حصہ اول“ میں آنا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے پورا پورا تعاون کرتے ہوئے میرے لکھنے کے لئے تمام تحریریں بھی بھجوا دیں۔ کئی تھی تو صرف ان کی تصویر کی۔ میں دہلی سے کراچی گئی اور پہلے سے لکھے ہوئے تعارف کمپوزنگ کو دیئے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں تین کتابیں تھیں، سنخور حصہ اول، سنخور حصہ چہارم اور ”گفتنی حصہ اول“۔ ان کی کمپوزنگ، طباعت، نائٹل بنوانا، غرض کہ ایک طویل کام تھا۔ پھر میرا ایکسڈنٹ بھی ہو گیا اور چونکہ ان کتابوں کا کام کرنا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے زندگی تو بچالی، بس ناگ توڑ کر گھر میں بٹھا دیا۔ میرا ذاتی گھر تو نہ تھا، کبھی بہن آمنہ کے گھر اور کبھی دوست کشور کے گھر قیام ہوتا تھا۔ اس افراتفری کے علاوہ کچھ نئے انٹرویو لیئے تھے۔ ان میں ہندوستان سے محترمہ قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، ڈاکٹر نارنگ، جوگندر پال، ڈاکٹر صفری مہدی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر کالی داس گپتا رخصا (آنجنابی)، افتخار امام صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر، ممبئی)، پاکستان کے ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری شامل تھے۔ ان انٹرویو کو قلم بند کرنا تھا۔ دو صاحبان میری معاونت بھی کر رہے تھے، پھر بھی کام طویل تھا جو چھ ماہ میں ختم ہوا۔ اس درمیان خط و کتابت کرنا کاردار رہا تھا۔ لیکن میں نے سنخور حصہ اول کے ان شعرا سے رابطہ قائم کیا جو حیات تھے اور ان کے تعارف میں اضافے کی ضرورت تھی۔ ان میں لاہور کے محترم عبدالعزیز خالد اور قتیل شفائی بھی شامل تھے۔ میں نے ڈاکٹر تونسوی کو خط لکھا، مگر ان کی تصویر نہیں آئی۔ دہلی میں گھر کے کمرے سے کھینچی گئی تصویریں اتنی اچھی نہ تھیں کہ ان سے کتاب کے لئے پرنٹ نکالا جاسکے۔ یوں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تعارف ”گفتنی، اول“ میں نہ آسکا۔ مگر میں نے ۲۹/ جنوری ۲۰۰۰ء میں بھیجے گئے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مسودات سنبھال کر رکھے۔ کراچی سے انہیں اپنے ساتھ اپنے ہینڈ بیگ میں لاس اینجلس، امریکہ لائی کہ یہ مجھ پر ایک ادبی قرض تھا جو مجھے بہر حال بے باق کرنا تھا۔ اور پھر اپنے حالات کی بنا پر ایک اور ہجرت جو میرے مقدر میں لکھی تھی، چنانچہ میں یہ مسودات برمنگھم، برطانیہ لے آئی۔

کوئی مجھے داد و تحسین سے نوازے نہ نوازے مگر میں وقتاً فوقتاً خود اپنی پیٹھ تھپکتی رہتی ہوں کہ سلطانہ مہر تجھے یہ حوصلہ، یہ سلیقہ جو تیرے پروردگار نے ودیعت کیا ہے اسے ضائع نہ کر اور جب تک تیرے ہاتھوں اور قلم کی طاقت اور تیرے ہوش بحال ہیں تو علم کا چراغ جلائے جا۔ سو آج بھی اسی علم کی روشنی میں اردو ادب کا ایک تاب دار اور انمول گہر، ڈاکٹر طاہر تونسوی کی صورت میں ”گفتنی حصہ دوم“ میں محفوظ کر کے آپ کی نذر کر رہی ہوں کہ اس شخص نے اپنی عمر عزیز کے کتنے ہی قیمتی ماہ و سال زبان و ادب کے



اس خزانے میں اضافے کے لئے خرچ کر دیئے اور اس کا کوئی حساب بھی نہیں رکھا۔ ان کی کتب کی تعداد تقریباً بیالیس (۳۲) ہے اور سن ۲۰۰۰ء میں مجھے ملی ہوئی فہرست کے مطابق تقریباً بارہ (۱۲) کتب زیر طبع تھیں۔ محترمہ سمیعہ ناز اعوان، جو اسلامیہ یونیورسٹی، بھاولپور کے شعبہ اردو کی طالبہ تھیں، اپنے ایم اے (اردو) کے لئے ”ڈاکٹر طاہر تونسوی، محقق و نقاد“ کے موضوع پر مقالہ لکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ہندوپاک کے کئی جنید عالموں اور دانشوروں کو ایک سوال نامہ بھیجا اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کے متعلق ان کی آرا و فکر جمع کیں۔ ان میں محترم ڈاکٹر جمیل الدین عالی بھی شامل تھے جنہوں نے ڈاکٹر طاہر کے لئے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ یادگار پیرا گراف بھی لکھا ہے:

”ڈاکٹر طاہر تونسوی اگر وسطی پنجاب، کراچی یا اسلام آباد میں مقیم اور تعینات رہا کرتے تو ان کی شہرت اور توقیر انہیں ایک قابل ذکر ادارے کی حیثیت عطا کر دیتی۔ مگر بڑے شہروں کی شادینیت زدگی اور اس کے اثرات قدیم سے ایسے جوہر قابل کو ان کا مقام نہ ملنے دینے کی راہ میں حائل رہتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہی روایت زندہ ہے۔ یہ تبصرہ تمام تاریخ ثقافت عالم پر محیط سمجھئے، افسوس ناک مگر حقیقت واقعہ۔ گو میں یقین رکھتا ہوں کہ سو سو برس میں رفتار و احاطہ ابلاغیت اس ظلم قدیم و جارح کو ہر جگہ تو ذکر رکھ دیں گے۔“

خدا کرے عالی صاحب کی یہ پیشین گوئی جلد کوئی ثمر لائے۔ ورنہ بے حسوں کی اس دنیا میں لوگ صرف اپنے لئے سوچتے ہیں اور اپنے لئے جیتے ہیں ورنہ اب تک ڈاکٹر طاہر تونسوی کو بغیر پبلک ریلیشن کے کوئی تمغہ امتیاز و خدمت تو ملنا ہی چاہیے تھا۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی ڈاکٹر سلیم اختر کے شاگرد رشید ہیں اور بڑے فخر و محبت سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس فخر کا سرمئی حسن ان کے چہرے پر اس وقت ملاحظہ لے آتا ہے جب وہ اپنے ذیشان استاد کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ چلتے ہوئے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی چال میں بھی ایک وقار پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے انہیں دہلی میں دیکھا ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر کے لئے ان کے احساسات کی وارفتگی دیکھ کر سوچا بھی ہے کہ دونوں میں خوش نصیب کون ہے، ڈاکٹر سلیم اختر یا ڈاکٹر طاہر تونسوی!!

ڈاکٹر طاہر تونسوی یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش ڈیرہ غازی خان میں واقع تونسہ شریف ہی رہی ہوگی۔ والدین نے ان کا نام حفیظ الرحمن طاہر رکھا تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۷۷ء سے انہوں نے بحیثیت لکچرار سرکاری ملازمت اختیار کی تھی۔ پہلے تو شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا مگر پھر تحقیق و تنقید کی طرف توجہ دی۔ ان کی کتب کی فہرست دیکھی تو گن کر دیکھا کہ ان کے تنقیدی مضامین کے (۲۰۰۰ء تک) پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یوں ان کی بنیادی حیثیت ”محقق و نقاد“ کی ہے۔ اسی حوالے سے محترمہ سمیعہ ناز اعوان نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ”گل بکف، اسلام آباد“ اور ”اہل قلم، ملتان“ نے ان کے بارے میں گوشے شائع کئے ہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں بحیثیت پرنسپل، پروفیسر، ڈائریکٹر کالج اور چیئر بورڈ کی حیثیت سے پنجاب کے کئی مقامات پر تعینات رہے۔ ۱۹۷۹ء میں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی کام کیا۔ یہ تحقیقی کام ڈاکٹر نیر مسعود کے والد پروفیسر مسعود



حسن رضوی اور بے مرحوم پر تھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود بتاتے ہیں: ”ڈاکٹر طاہر ان ہی کے مہمان تھے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور بالا خانے کے جس کمرے میں ان کا قیام تھا وہ بری طرح چمٹا تھا اور اس کی تپش کو کم کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر طاہر کسی قسم کی بھی بے آرامی کا اظہار و گلہ کیے بغیر دن دن بھر خود کو پرانی کتابوں، مخطوطوں اور منتشر کاغذات کے انباروں میں گم کیے رہتے۔ اس وقت مجھے ان کی تحقیقی لگن کا اندازہ ہوا۔“

معتبر شاعر اعجاز احمد آذر نے اس رائے میں اس طرح اضافہ کیا ہے: ”ڈاکٹر طاہر تونسوی بہت متحرک، بہت فعال اور بہت دل نواز انسان دوست ہے۔“

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے بارے میں بہت سے دانشوروں نے لکھا ہے اور اتنا کچھ لکھا ہے کہ ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ان میں ان کے استاد محترم ڈاکٹر سلیم اختر کا مقالہ بعنوان ”جاوہ تراش نقاد... ڈاکٹر طاہر تونسوی“ قابل مطالعہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر طاہر کی گونا گوں خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

”ڈاکٹر طاہر اپنے مقالات کے عنوانات بڑے سلیقے اور ہنر سے منتخب کرتے ہیں جس سے نفس موضوع روشن ہو جاتا ہے، جیسے دشت خوف کی آبائے درد کا شاعر، ظہور نظر، عرفان جنوں و آگہی کا شاعر، مجروح سلطان پوری، بے خواب ساتوں کا شاعر، ریمس فروغ اور ردائے خواب کا شاعر، سید محسن نقوی۔ شعریت کے ساتھ ساتھ ان عنوانات کی یہ اضافی خوبی بھی ہے کہ ان میں یا تو مجموعہ کلام کا نام آ جاتا ہے ورنہ شاعر کے فکر و احساسات کے کسی خاص رخ کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

”اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو میراجی نے مشرق و مغرب کے نغمے میں ایسے عنوانات کا پہلی مرتبہ تجربہ کیا تھا، جیسے فرانس کا ایک آوارہ شاعر، چارلس بادلیئر، امریکہ کا تخیل پرست شاعر، ایڈگر ایلن پو اور مغرب کا ایک مشرقی شاعر، طامس مور۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے مزید لکھا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی میراجی کی نقالی میں نظم جدید کی کروٹیں میں شاعر کے تخلیقی رویوں کو مظہر بننے والے عنوانات قائم کرنے کی کوشش کی، مگر یہ کوشش اس بنا پر فلاپ ہو گئی کہ موصوف کے پاس، وہ گہری بصیرت نہ تھی جس کے نتیجے میں شاعر کی شخصیت اور فکر و فن کی تنہیم کے لئے کلیدی الفاظ استعمال کرنے کا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ان کے بعض عنوانات تو ایسے گمراہ کن ہیں کہ شاعر کا تخلیقی تناظر ہی برعکس ہو کر رہ جاتا ہے۔ جیسے فطرت پرستی کی ایک مثال، اقبال، انجماد کی ایک مثال، فیض۔“

میر مقصد ’موازنہ طاہر و آغا‘ نہیں ہے یہ تو یوں ہی مقطع میں سخن گسترانہ بات آگئی تھی (۱)۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے لئے بطور نقاد جو مسلک اپنایا وہ زندگی کے بارے میں ترقی پسندانہ رویے سے عبارت ہے جیسا کہ اس نے ’رجحانات‘ کے پیش لفظ میں اپنا ادبی موقف واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ دیانت داری اور صداقت سے اپنی سوچ و فکر کو قرطاس و قلم کے حوالے کروں اور یہ سوچ ترقی پسندانہ ہی تو ہے۔ اس لئے ترقی پسند تحریک سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اسے ’سخن گسترانی‘ کہنے یا ادبی چھیڑ چھاڑ انہیں بہر حال ڈاکٹر وزیر آغا کا پاس ادب ہمیشہ ملحوظ رہا ہے۔ سلطانہ مہر



اور میرے نزدیک ترقی پسند تحریک نے ہی ادبی ریش اور ادبی روئے تعین کیے ہیں اور اردو ادب میں روشنی خیالی اتون اور  
وہمت انی تحریک کے حوالے سے آئی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ یہ ساری کیفیتیں میری تحریر میں بھی آجائیں۔

موجودہ فضا (یا پھر ڈاکٹر طاہر تونسوی کے پسندیدہ لفظ "موجودہ") میں ایسا اعتراف بذات خود بڑی جرأت کا  
مقتضی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں، ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مسلک ہی حق گوئی و بے باکی ہے اور اگر وہ رو بہ صفت  
ہوتا تو اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گویوں میں! جس کی وجہ سے نہ تو وہ اچھا نفاذ ہوتا، نہ قابل اعتماد دوست۔ محض مرغ، باد  
نما۔ مگر اس کے برعکس ڈاکٹر طاہر تونسوی جاوید تراش غدا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ جاوید تراشی کے لئے جس  
خارشگانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی میں موجود ہے بلکہ مجھے تو اس میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ  
ہی نظر آتا ہے۔

جب میں نے ڈاکٹر طاہر کے سامنے سوال نامہ رکھا تو بڑی خوش دلی سے انہوں نے میرے  
سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا: "شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید سے میری گہری وابستگی ہے۔ میں اردو  
کی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوں۔ البتہ ادب کے ذریعے پروپگنڈے کا قابل نہیں۔ فنون، تخلیق،  
ادبیات، نیرنگ خیال، نگار، گل بکف، اوراق اور ملک کے مقتدر جرائد میں میری تخلیقات و تنقیدات شائع  
ہوتی رہتی ہیں۔ شاعری سے زیادہ مجھے تحقیق و تنقید سے دل چسپی ہے چنانچہ مطبوعات میں کئی تنقیدی  
مجموعے شامل ہیں۔ شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید کی کتب میرے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ تنقیدی مضامین کے  
لئے افسانے اور سفر نامے بھی مطالعے میں آتے رہتے ہیں۔"

اپنی زندگی کے اہم واقعات سناتے ہوئے انہوں نے کہا: "میری زندگی، سچی بات ہے، غم و  
آلام سے عبارت ہے۔ خوشی کے مواقع بہت کم میسر آئے ہیں۔ تاہم اس نعمت سے محروم بھی نہیں ہوں۔  
میری حیات مستعار کے کئی اہم واقعات ہیں جن کو لکھنے کے لئے اوراق کی ضرورت ہے۔ تاہم جب مجھے  
پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تو یہ میری زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ میں کسی خاص وجہ سے پرنسپل شپ چھوڑ کر  
پروفیسر بن گیا تھا اور میں نے ایجوکیشن کالج کے وائس پرنسپل کے آرڈر کرالئے۔ صبح جب میں لاہور سے  
ملتان پہنچا تو ایک دوست کا ساہیوال سے ٹیلی فون آیا کہ ایک لیکچرار کا تبادلہ کر دیں۔ میں نے اُن سے کہا  
کہ میں ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں۔ دفتر جا کر ڈائریکٹر صاحب سے درخواست کروں گا۔ انہوں نے کہا،  
آج کا روز نامہ جنگ دیکھیں، آپ ڈائریکٹر بنادیے گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اس  
لئے کہ یہ اہم واقعہ تھا۔ پھر میری زندگی کا اہم ترین واقعہ بیس (۲۰) گریڈ کا ملنا ہے جس سے میں یکم اپریل  
۱۹۹۶ء کے دن سے وابستہ ہوں۔ یہ تاریخ بھی ایک مخصوص حوالے سے یادگار ہے۔ ویسے مجھے دوستوں  
کی بے پناہ محبتیں ملی ہیں اور کتاب سے میرا گہرا رشتہ ہے۔ اس تناظر میں جب میرے استاد محترم ڈاکٹر  
سلیم اختر نے اپنی نئی کتاب 'زبان کیا ہے' مجھے بھیجی تو اس پر لکھا: "ٹومن شدی..." ڈاکٹر اے بی اشرف  
نے ترکی سے مجھے خط لکھا، مگر میں جواب دینا بھول گیا۔ ان کا خط آیا، لکھا تھا: "تمہیں کیا پتا مجھے تمہارے  
خط کا کتنا انتظار رہتا ہے۔" ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے اپنی نئی کتاب 'میر کو سمجھنے کے لئے' میرے نام



منسوب کی۔ یہ قیوں باتیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں، یوں دکھ تو زندگی کے ساتھ ہیں ہی۔“

ان کا کہنا ہے... ”اردو واقعی دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ اردو کا مستقبل بہت تاریک ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ اردو ادب دنیا کے ہر خطے میں پھیل پھول رہا ہے اور کوئی ایسا ملک نہیں جہاں یہ زبان کسی نہ کسی سطح پر پڑھائی نہیں جا رہی ہو۔ ہر ملک میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں اور پیش بہا تحقیقی و تنقیدی کام ہو رہا ہے۔ اس لئے میں اس کے مستقبل سے پُر امید ہوں۔ اور شاعری میں غزل کو بہتر سمجھتا ہوں اس لئے کہ یہ شاعری کی صدا بہار صنف ہے۔ تجربات بری چیز نہیں مگر نثری نظم اور نثری غزل چہ معنی دارد؟“

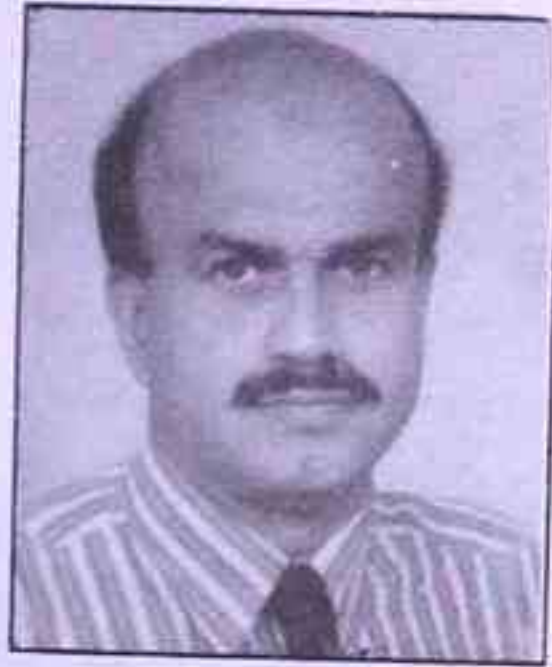
گفتگو آگے بڑھی تو انہوں نے کہا... ”مشاعرے اردو ادب کی ترویج میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ادب کی تخلیق میں بالعموم اور شاعری کی تخلیق میں بالخصوص مؤثر اور فعال کردار کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں سامعین کی بھی بڑی تربیت ہوتی ہے۔ یہ چوں کہ بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں اس لئے ان کے نقوش گہرے اور دیر پا ہوتے ہیں۔ تنقیدی نشستیں محدود ہونے کی بنا پر کم اثرات مرتب کرتی ہیں۔ تاہم دونوں کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے اور رہے گی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ اور اشاعت کم ہو گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کی اہمیت کم ہو رہی ہے۔ مگر جائزہ لیں تو جس رفتار سے ہر موضوع پر کتابیں اشاعت پزیر ہو رہی ہیں وہ بھی حیران کن ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مقابلہ سخت ہونے کے باوجود کتاب کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم یہ لمحہ فکر ضرور ہے کہ مطالعے کی عادت کم ہو رہی ہے۔ اس بارے میں حکومت کو لائبریریوں کو فعال بنانے کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ کاغذ کی قیمت کم کر کے کتابوں کی قیمت گھٹائی جائے تاکہ ہر شخص کتاب آسانی سے خرید سکے اور کتب لائبریریوں کی زینت بن کر نہ رہ جائیں بلکہ سستی کتابیں ہر کس و نا کس کے ہاتھ میں پہنچ سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی رسائل کا حال بالکل پتلا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ مقتدر ادبی رسائل کو رعایتی قیمتوں پر کاغذ مہیا کرے اور اشتہارات بھی دے تاکہ صحت مند ادب فروغ پائے اور ’زرد صحافت‘ سے بھی نجات مل جائے۔“

تنقید کے حوالے سے انہوں نے کہا... ”میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ البتہ اس کا گراف نیچے کو آ گیا ہے اس لئے کہ تنقید مصلحتوں کا شکار ہو کر شخصی حوالہ بن گئی ہے۔ تاہم ایسے ناقدین بھی ہیں جن کی وجہ سے تنقید کا بھرم قائم ہے اور اس کی بدولت تنقید ابھی مری نہیں بلکہ زندہ ہے اور تنقید کی بدولت ادب اور ادبی معیارات زندہ ہیں۔ نقاد کو کسی تعصب اور گروہ بندی کا اسیر ہونے بجائے بلا خوف تنقیدی عمل سرانجام دینا چاہیے۔“

Dr. Tahir Tonsavi,

Al-Aai'sha, Ghalib Street, Ghaf'fariya Colony, Bosan Road,  
Multan, Pakistan





مجموعہ علم کے درمیان بنسنا، اس کی عظمت کی نشانی ہے۔

عابد  
۱۸ دسمبر ۲۰۰۷

ڈاکٹر عابد معز

ریاض، سعودی عرب

مارچ ۱۹۸۲ء کا "اردو دنیا" کا شمارہ میرے سامنے تھا۔ میں اردو کے ایک نابغہ روزگار، خوش قلم افسانہ نگار شفیق الرحمن کا مضمون "مجبوریاں" پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا۔  
"کسی نے کہا (غالبا شیکسپیر نے، کیوں کہ عموماً وہ ہی کہا کرتا تھا) کہ مجھے کسی شخص کے دوست کو دکھا دو اور میں بتا دوں گا کہ وہ شخص کتنے پانی میں ہے۔ ایک اور صاحب نے فرمایا کہ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کوئی شخص کس فلم کمپنی کے کس فلم کو پسند کرتا ہے اور میں فوراً بتا دوں گا کہ وہ شخص کیسا ہے۔ کئی حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نائی کی گرہ، جوتوں کا سائز اور مونچھوں کی لمبائی دیکھتے ہی سب کچھ بتا دیں گے۔  
یہ سب کچھ بجا سہی لیکن بھلا اس قدر محنت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اتنی چھان بین کا ہے کہ کرتے ہیں کہ تاپ لیتے پھریں۔ آپ محض چند منٹ خاموشی سے اس شخص کا مطالعہ کیجئے اور وہ خود سب کو بتا دے گا کہ وہ مجبور ہے یا یوں کہنے کے وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔ ہم سب مجبور ہیں۔"  
شفیق الرحمن جیسا ثقافت نثر لکھنے والا اب ہم کہاں پائیں گے؟ لیکن نعم البدل تو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ پیدا کر رہی دیتا ہے۔ کبھی بہتر اور کبھی بہترین بھی۔  
ڈاکٹر عابد معز پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں لیکن ادبی حوالے سے شفیق الرحمن، کرنل محمد



خان، مشتاق یوسفی، مشفق خواجہ، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے ناموں کے بعد ڈاکٹر معزز کا نام ایک معتبر اضافہ ہے۔ اس سے پہلے میں آپ کو ڈاکٹر عابد معزز سے متعارف کراؤں میں چاہوں گی کی آپ جناب یوسف ناظم کے مضمون کا یہ اقتباس پڑھ لیں (۱)۔

”عابد معزز کوئی پندرہ سال کے مزاج نگار ہیں یعنی ان کی تحریر غفوان شباب سے آشنا ہو چکی ہے۔ لیکن میرا یہ بیان صرف شاعرانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ادب اور خاص طور پر مزاجیہ ادب کو جانچنے کے پیمانے پر ماہ و سال کی لکیریں نہیں کھینچی ہوتی ہیں۔ عابد معزز نے اس مجموعے سے صرف مزاج نگار ہونے کا نہیں، اس میدان خاوار میں کہنہ مشق ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اپنی ذکاوت، ذہن کی بڑائی کو خوش سلیقگی کے ساتھ برتتے ہوئے وہ ایک شوخ و شنگ، ثقافت مزاج نگار بلکہ ایک شریہ یا بہ آمادہ شرارت ادیب کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ وہ مزاجی متین اور عادتاً رکھ رکھاؤ کے سنے سمٹائے آدمی ہیں لیکن ان کی تحریر بشارت انگیز ہے۔ انہیں پڑھتے ہوئے قاری کو آگے بڑھنے کے لئے کوشش نہیں کرنی پڑتی اور وہ غیر محسوس طریقے پر فرحت و انبساط کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتا چلا جاتا ہے۔ عابد معزز کی تحریر پڑھنے کا وہی لطف ہے جو جھولا جھولنے اور پتلیوں لینے میں ہے (میں پتلیوں بڑھانے کا ذکر نہیں کر رہا ہوں) میں سمجھتا ہوں خود عابد نے جو کچھ لکھا ہے نا دانستہ طور پر لکھا ہے۔ مبالغہ کرنے کا مجھے شوق نہیں ہے ورنہ بہت کچھ لکھتا۔ جس طرح حیدر آباد کن سے مشرق وسطیٰ کا سفر عابد معزز نے آسانی سے طے کیا ہے اتنی ہی آسانی سے انہوں نے ظرافت کی تیج پر خود کو اظہر الدین ثابت کر دیا ہے۔ انہوں نے چھلے تو نہیں لگائے لیکن چھلے چھڑا ضرور دیئے۔“

۲۵ / جنوری ۱۹۵۵ء کو حیدر آباد میں پیدا ہونے والے سید خواجہ معزز الدین، عابد معزز کے نام سے ادبی دنیا میں متعارف ہیں۔ حیدر آباد کن جس کی سوندھی علمی مٹی نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اکسایا کہ وہ اپنی محبوبہ ”بھاگ متی“ کے عشق میں ایک شہر بسائے اور اس نے حیدر آباد کے نام سے موسیٰ ندی کے کنارے ایک شہر بسایا اور کبھی کا یہ چھوٹا سا شہر آج ایک ملک ہے جس کی گود میں جامعہ عثمانیہ جیسی ایک علمی دنیا آباد ہے۔ اس شہر کے لوگ اپنی ایک جداگانہ خوب صورت شناخت رکھتے ہیں اور ان کی بدولت آج شکاگو (امریکہ) میں جائیں تو ایک منی حیدر آباد ملے گا اور بقول مجتبیٰ حسین..... ”کوئی پتھر اٹھائیے۔ اس کے نیچے سے ایک حیدر آبادی آداب عرض کہتے ہوئے برآمد ہوگا۔“

شکاگو سے آگے جائیے تو ٹورنٹو (کنیڈا) میں مخدوم محی الدین کی شاعرانہ بولی میں ”ایک چنبیلی کے منڈوے تلے“ حیدر آباد کے احباب ملیں گے۔ اور پھر جہاں جائیے ایک میٹھی بولی ”ہو“، ”نکو“ آپ کو بتا دے گی کہ آپ جس سے مخاطب ہیں وہ خالصتاً حیدر آباد کن کی خاک سے جنما ہے اور اسی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ اور عابد کے کہنے کے مطابق اس کا حیدر آباد علم دوستی، ادبی سرپرستی، نوابوں،

۱۔ یوسف ناظم صاحب کا مذکورہ مضمون عابد معزز کی کتاب ”سگ گزیدہ میں شامل ہے۔ یہ مضمون ۲ / جنوری ۱۹۹۵ء میں رقم ہوا تھا۔



میناروں، محلوں، موتیوں، شیردانی، بریانی اور اب انٹارمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے مشہور ہے۔  
اسی حیدرآباد میں عابد معزز نے انگلش میڈیم اسکول سے تعلیم پائی۔ ماورئی زبان اردو کو ثانوی  
زبان کی حیثیت سے پڑھا اور سیکھا۔ ۱۹۷۹ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس کیا اور ۱۹۸۵ء میں  
تغذیہ اور استحالی امراض میں پوسٹ گریجویشن کیا۔

تعلیم کے بعد سرکاری نوکری اور خانگی پریکٹس کی۔ حیدرآباد میں سول اسٹنٹ سول سرجن  
کے طور پر پہلے جیل اور پھر عدالت عالیہ میں کام کیا۔ ۱۹۸۷ء کے اوائل سے سعودی عرب کی وزارت  
صحت میں کنسلٹنٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

عابد معزز نے ۱۹۷۷ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے دو فکاہیہ مضامین حیدرآباد کے ایک  
روزنامے میں چھپے۔ پھر ۱۹۸۱ء سے باقاعدگی سے ماہنامہ ”شگوفہ“ حیدرآباد میں مضامین لکھنے لگے۔ تب  
سے ہندو پاک اور سعودی عرب کے مختلف اخبارات اور رسائل میں لکھ رہے ہیں۔

عابد معزز نے صرف طنز و مزاح اور فکاہیہ مضامین لکھے۔ نہ کبھی شعر کہانہ نثر کی کسی اور صنف میں  
لکھا۔ اب تک ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی ”واہ حیدرآباد“ ہے جس میں ماہنامہ ”شگوفہ“  
میں جون ۱۹۸۳ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک کے شائع ہونے والے مضامین بعنوان ”مراشہر لوگاں سوں  
معمور کر“ شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب سولہ مضامین کا مجموعہ ”سگ  
گزیدہ“ کے نام سے جنوری ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ پہلے مجموعے کے مضامین میں، جیسا کہ کتاب کے  
عنوان سے ظاہر ہے، مقامی رنگ زیادہ نمایاں ہے جب کی دوسرے مجموعے کے مضامین کا کیونس وسیع  
تر ہے جہاں ظرافت، طنز کے سارے رنگ مل جاتے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب نے کسی اچھے مزاح کی  
تخلیق کے لئے تین عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ اور وہ تین عناصر اچھے مزاح کی تخلیق میں ہوا، پانی اور  
روشنی کا کام انجام دیتے ہیں یعنی مطالعہ، مشاہدہ اور محاکمہ۔ اور عابد کے ہاں مطالعے اور مشاہدے کا عمق  
اور محاکمے پر دسترس موجود ہے۔ اس کے علاوہ فی الوقت ان کے پاس ان کے طبع زاد مضامین اتنی تعداد  
میں ہیں کہ آسانی سے تین چار مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔

عابد معزز کا فکاہیہ کالم اگست ۱۹۹۹ء سے ہر ہفتہ ”اردو میگزین“، جدہ میں باقاعدگی سے شائع  
ہوتا ہے۔ ماہنامہ ”شگوفہ“ اردو زبان کا منفرد طنز و مزاحیہ جریدہ ہے جو پچھلے چونتیس (۳۴) برسوں سے  
مستقل اور مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ عابد اس کے ایڈیٹر اور سیزر (editor overseas) ہیں۔

ہندوستان اور سعودی عرب میں ادبی جلسوں اور ادبی محفلوں میں، جنہیں نثری مشاعروں کا  
نام دیا جانے لگا ہے، عابد باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ وہاں مضامین پڑھ کر سناتے ہیں اور خوب  
داؤ میٹتے ہیں۔

طب اور تغذیہ کے موضوعات پر بھی عابد کے مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع  
ہوتے رہتے ہیں۔ ”صحت اور طب“ کے عنوان سے حیدرآباد کے روزنامہ ”منصف“ میں ہر دوسرے



بہتے ان کے مضامین کا سلسلہ ایک سال (۸۷-۱۹۸۶) تک چلتا رہا۔ دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ”سائنس میگزین“ کی مجلس مشاورت کے بھی ممبر ہیں۔ انہوں نے سعودی عرب میں صحت و طب کے چند موضوعات پر عوامی لکچر بھی دیے ہیں۔

اردو کی ترقی و ترویج کے لئے ریاض میں ”ہندوستانی بزم اردو“ کے نائب صدر ہیں۔ یہ انجمن اردو کے فروغ کے لئے مختلف کام کرتی ہے جیسے مقامی اسکول میں اردو تفریری مقابلوں کا انعقاد، محب اردو ایوارڈ، ادبی محفلوں اور مشاعروں کا انعقاد وغیرہ۔

میں نے پوچھا، ”کیا زندگی کے کسی حصہ میں آپ نے محسوس کیا کہ اردو ادب کو اپنا کر آپ شہرت اور مالی خسارے میں رہے؟“

عابد کا جواب تھا.....

”جی ہاں! بعض مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اردو ادب کو اپنا کر میں شہرت اور مالی خسارے میں رہا ہوں۔ یہ احساس بالخصوص اس وقت ہوتا ہے جب میرا تعارف ایک اردو ادیب کی حیثیت سے کروایا جائے اور اس تعارف کے جواب میں کوئی اردو والا کہے، ”جی مجھے اردو پڑھنا نہیں آتی“۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ مالی خسارہ تو اردو ادیبوں کا مقدر ہے۔ صرف چند گنے چنے شاعروں کو مشاعروں اور فلمی یا پاپ شاعری سے آمدنی ہو جاتی ہے۔ خالص اردو ادب یقیناً گھانے کا سودا ہے۔ لیکن گھانے کے احساس کے باوجود اردو ادب اپنانے پر مجھے افسوس نہیں ہے کیوں کہ اردو ادب میرا پیشہ نہیں ہے یہ میرے ذوق کی تسکین کا باعث ہے۔“

میں نے ان سے ادیبوں کی گروہ بندی کے حوالے سے سوال کیا۔ انہوں نے کہا..... ”مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ ادیبوں کی گروہ بندی نے اردو ادب و زبان کو نقصان پہنچایا ہے۔ ادب میں گروہ بندی ضرور ہوتی ہے۔ اور ہر گروہ نے اپنے نظریات اور افکار پھیلانے کی کوشش کی ہے اس کے ذریعہ اردو زبان کا بھی فائدہ ہوا ہے۔“

اردو کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو عابد نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا.....

”میں اس بات سے کچھ حد تک اتفاق کرتا ہوں کہ اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ میں اپنی بات ہندوستان کے حوالے سے پیش کروں گا۔ پاکستان، امریکہ اور یورپ کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پچھلی دو تین دہائیوں کے تجربے اور مشاہدے نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں اردو کا حال ناسازگار نہیں جس کا قیاس کیا گیا تھا۔ بول چال کی زبان کی حیثیت سے اردو زبان ناموافق حالات کے باوجود نہ صرف زندہ رہی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اب اس کی ترقی کی نئی راہیں کھلی ہیں۔

زی ٹی وی والوں نے ایک اردو چینل اپنی نگرانی میں لیا ہے۔ اور چند مہینوں کے اندر اردو کے تین چار سٹیلائیٹ چینل شروع ہونے والے ہیں۔ ان سے بول چال کی اردو کو یقیناً فروغ ہوگا۔ اردو لکھنے پڑھنے والوں کی کمی سے فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اردو لکھنے پڑھنے والے یقینی طور پر کم ہوتے جا رہے ہیں۔



چنانچہ اردو کی بقا کے لئے ہندوستان کے حوالے سے میری تجویز یہ ہے کہ اردو مادری زبان والوں پر اردو پڑھنے لکھنے کی پابندی عائد کی جانی چاہیے۔ حکومت اردو کو دوسری سرکاری زبان نہ بنائے اور نہ ہی اردو اکیدمیاں قائم کرے۔ وہ صرف اتنا کرے کہ جس کسی کی بھی اردو مادری زبان ہے اسے اردو بحیثیت ایک زبان کے پڑھنے اور لکھنے کی سہولتیں فراہم کر دے۔ اردو مادری زبان والے بچوں کے لئے اسکول اور کالج میں اردو پڑھنا اور لکھنا ایک لازمی مضمون قرار دیا جائے۔“

گفتگو آگے بڑھی تو انہوں نے کہا.....

”میں اردو رسم الخط تبدیل کرنے کی کسی بھی تحریک کی سختی سے مخالفت کروں گا۔ اردو کو اس کے مروجہ رسم الخط ہی میں لکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی اپنا تجربہ بھی بیان کرنا چاہوں گا۔ کئی لوگ اردو کو دیوناگری اور رومن رسم الخط میں پڑھ اور لکھ لیتے ہیں۔ اردو کی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں چھپ کر زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ یہ ایسا عمل ہے جس پر اردو والوں کا بس نہیں ہے۔ اردو دوسرے رسم الخط سے مشہور ہوتی ہے تو میری رائے میں ایسا ہونے دیا جائے۔ اس راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے شاید طالب علم کچھ عرصے بعد اردو کا اصلی رسم الخط سیکھنا چاہیں گے۔ ساتھ ہی میں اس بات پر زور دوں گا کہ اردو والوں کو اپنی زبان کا رسم الخط کسی بھی صورت میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

اپنے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے.....

”مجھے سب ہی ادیب متاثر کرتے ہیں۔ متاثر ہو کر ہی تو میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور شوکت تھانوی، فکاہیہ صنف کے لحاظ سے میرے پسندیدہ ادیب ہیں کہ میں ان کی ہر تحریر پڑھنا چاہتا ہوں۔“

Dr. Syed Khaja Moiz-ud-din, M B B S (Osm.) M Sc (AN)

Medical Nutritionist, Ministry of Health, Kingdom of Saudi Arabia, PO Box 5253, Riyadh, 11422, Saudi Arab

Permanent Address: 21/27 Surya Nagar Colony, Toli Chowki, Hyderabad, 500008, A P. India





مصافی بنایہ اچھا استقامت ہے  
(حضرت علی)

خطہ اس میں کتبہ  
16/2/2001

## عرفانہ تزکین شبنم

فورٹ، وانم باڑی، تامل ناڈو، ہندوستان

زندگی کا دوسرا نام واقعات اور ان کے ساتھ جینے کی جدوجہد ہے۔ اور جنہیں ان کو بیان کرنے کا ہنر آتا تھا انہوں نے اس ہنر کو داستان، کہانی، افسانے کا نام دیا۔ اب ماضی سے حال تک اور داستان سے افسانے تک افسانہ یا کہانی انسانی فطرت اور اس کی زندگی کا اہم جزو بن گئی۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ انسان بڑھاپے تک پہنچنے کے باوجود بچوں کی طرح کہانیاں سننا پسند کرتا ہے۔ ہر ایک ملک، ہر ایک قوم اور ہر زبان میں کہانی کہی اور لکھی جاتی ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک انسان کو کہانی سننے میں لطف آتا ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں فلمیں اور ٹیلی ویژن کے پروگرام کہانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

عرفانہ تزکین شبنم نے بھی اپنے بچپن میں لوریوں کے بعد کہانیاں سنی تھیں۔ ۱۹۵۵ء جولائی ۱۹۷۳ء کو پیدا ہوئیں۔ جائے پیدائش انہوں نے نہیں لکھی۔ مگر یہ ضرور لکھا ہے کہ انہوں نے ادیب ماہرو ادیب کامل علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا۔ ان کے گھر میں مشرقی ماحول تھا۔ ان کے والد جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ جب عرفانہ تزکین نو دس برس کی تھیں تب ہی سے انہیں مطالعے کا شوق تھا۔ ان کے والد صاحب نے اپنی بچی کے ذوق مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ہوئے رام پور سے شائع ہونے والے بچوں کا



ماہنامہ ”بلال“ ان کے نام جاری کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ”نور“، ”بتول“، ”ذکرئی“، اور ”حجاب“ بھی پابندی سے گھر میں آتے تھے۔ والد صاحب بیٹی سے انہیں با آواز بلند پڑھنے کی فرمائش کرتے اور بیٹی کی ادائیگی لب و لہجہ اور تلفظ کی تصحیح کرتے۔ چنانچہ عرفانہ کی اردو زبان کی تعلیم بچپن ہی سے اچھی بنیاد پر رکھی گئی۔ عرفانہ کہتی ہیں کہ ان کے والد خود بھی ایک اچھے شاعر تھے مگر انہوں نے کلام کبھی شائع نہیں کرایا۔

عرفانہ کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ”سحر ہونے تک“ ۱۹۸۷ء میں لکھا جو ۱۹۸۸ء میں ماہنامہ ”بتول“، رامپور میں شائع ہوا۔ کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتی ہیں۔ عرفانہ نے قلم سے رابطہ قائم رکھا چنانچہ کہانیاں تخلیق ہوتی رہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”جائے پناہ“ کے نام سے اپریل ۱۹۹۹ء میں اردو اکیڈمی، وائٹ ہاؤس کے تعاون سے شائع ہوا۔

عرفانہ ترمین اردو ادب سے متاثر ہو کر خوش ہیں کہ اس کے طفیل انہیں ایک پہچان اور شہرت ملی۔ عرفانہ کہتی ہیں، ”ادیبوں کی گروہ بندی نے اردو زبان و ادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہاں فرد کو اس کا فائدہ اتنا ضرور ہے کہ اس کی ایک شناخت جلد بن جاتی ہے مگر ان بیساکھیوں سے جلد یا بدیر نقصان بھی پہنچتا ہے“

اردو کی ترویج کے سلسلے میں عرفانہ کا مشورہ ہے کہ جدید تعلیم کے لئے مسلمان اپنے طور پر جو اسکول، اکیڈمیاں یا درس گاہیں قائم کریں ان میں اردو کو نہ صرف لازمی زبان کی حیثیت سے نافذ کریں بلکہ وہاں باقی مضامین کی تعلیم بھی اردو میں دینے کا اہتمام کریں۔ اردو کی ترویج کے لئے شبینہ مدارس کا اہتمام کریں مساجد میں دینی تعلیم کا بندوبست کریں۔ گاؤں گاؤں مکاتیب قائم کریں اور ان میں ذریعہ تعلیم اردو جاری کریں۔ ٹی وی پر اردو کے ایسے پروگرام پیش کیئے جائیں جس کے ذریعے اردو سے ناواقف لوگ اردو سیکھ سکیں، جس میں انگریزی سے اردو یا ہندی سے اردو کے ترجمے کر کے اردو تختی اور پھر گرامر سکھائی جائے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اردو کو عام کیا جائے۔ اور اردو کا اپنا ایک الگ ٹی وی چینل ہو۔ عرفانہ ترمین اردو رسم الخط کی تبدیلی کی حامی نہیں۔ ان کی رائے میں رسم الخط زبان کا تشخص ہوتا ہے۔ وہ زبان کی روح ہے۔ رسم الخط کو بدلنا زبان کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ کسی بھی ایسی تبدیلی سے آنے والی نسلوں کے لئے اپنے کلاسیکی ادبی ورثے تک پہنچنا ممکن ہو جائے گی۔

”آپ کو اردو اور دیگر ہندوستانی اور یورپی زبانوں کے کن ادیبوں نے متاثر کیا ہے؟“ اس سوال کے جواب میں عرفانہ نے کہا، ”میں نے یورپی زبانوں کے ادیبوں کو بہت کم پڑھا ہے۔ اردو کے ادیبوں میں بشری رحمن اور کرشن چندر نے مجھے متاثر کیا ہے۔ ویسے جو بھی تحریر معیاری اور دل کو چھونے والی ہوتی ہے وہ مجھے متاثر کرتی ہے۔“

آخری سوال کے جواب میں عرفانہ نے کہا، ”واقعات اور حادثات انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ لیکن بعض واقعات زندگی میں گہرے نشان چھوڑ جاتے ہیں، خاص طور پر جو ہمارے اعتماد کو چوٹ پہنچائیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ جولائی ۱۹۹۷ء میں مجھے پیش آیا۔ اپنے افسانوں کے سلسلے میں



مجھے اندرون ملک و بیرون ملک سے خطوط ملتے رہتے ہیں۔ اتنی طرح کا ایک خط جدہ، سعودی عرب سے  
 بادی بخش نامی شخص کا ملا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ جدہ کی ایک اعلیٰ کمپنی میں پرسنل مینیجر کے عہدے  
 پر فائز ہے اور اس کی کمپنی کو چند ایمان دار افراد کی ضرورت ہے۔ ویزا کا انتظام بھی کمپنی کی جانب سے  
 تھا۔ اس بات کا ذکر میں نے اپنے ایک عزیز سے کیا۔ جن کے ذریعے دو حاجت مند لوگ بخوشی جدہ  
 جانے لئے تیار ہو گئے۔ خط میں جس آدمی کا گجرات کا پتہ دیا تھا، میرے عزیز نے اس پتے پر خط اور ٹیلی  
 فون کے ذریعے سارے معاملات طے کرا دیئے، اور وہ دونوں لوگ پاسپورٹ بنوانے کے بعد ممبئی کے  
 لئے نکل پڑے۔ ان لوگوں نے اس شخص کی ہدایت کے مطابق تقریباً بیس ہزار روپے اپنے ساتھ لے  
 لیئے تھے۔ یہ رقم انہوں نے بطور قرض اٹھائی تھی۔ لیکن پانچ چھ دن بعد ہی یہ دونوں لوگ مایوس اور دل  
 گرفتہ ممبئی سے لوٹ آئے کیوں کہ وہ سب کچھ فراڈ تھا، ایک منظم سازش تھی۔ کس طرح جعلی ویزے  
 دے کر وہ شخص وہاں سے فرار ہوا تھا جہاں ان لوگوں کی ڈاکٹری جانچ ہو رہی تھی۔ یہ ایک داستان ہے  
 جس پر میں انشاء اللہ کبھی آئندہ ضرور لکھوں گی۔ بہر حال ادب کی آڑ میں جس طرح اس انسان نے معصوم  
 لوگوں کو فریب دے کر ان کے ارمانوں کا خون کیا، ان کے اعتبار کو پتہ نہ کیا وہ رذالت کی انتہا ہے۔ اس  
 واقعے نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا تھا اور میری توجہ قارئین کے خطوط کی طرف کافی کم ہو گئی تھی۔ تاہم ایک  
 عرصے بعد انڈونیشیا کے جناب شیخ موڈک صاحب جیسے ادب کے سچے قدردان نے متاثر کیا بلکہ ان  
 کے توسط سے ہی میں آپ تک پہنچ پائی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ایسے واقعات کی تشہیر ہوتی رہے تاکہ  
 دیگر معصوم لوگ دھوکہ کھانے سے بچ جائیں۔“

Miss Irfana Tazeen Shabnam,

388, Malayalam Street, Fort, Vaniyambadi, Tamil Nadu. 635751, India





سین لود کلود منج غم دلستاں ؟  
جو آب نہ سنی وہ سیر کا درستاں نہیں

سید عاشور کاظمی  
۱۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء

## سید عاشور کاظمی

برمنگھم، برطانیہ

”سلام اُس پر.....“ یہ عنوان ایک خوب صورت نظم کا ہے اور اس کا لکھنے والا یقیناً ان صد اقتوں کا پاسبان ہے جو اس نظم کی محرک ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

سلام اُس پر

درو اُس پر

یہ ایسے صادق کا ذکر ہے جو صد اقتوں کا امین بھی تھا

زمین کی پستیوں پہ رہ کر

فلک کا رفعت نشین بھی تھا

جو بے یقینی کی تیرگی میں اک آفتاب یقین بھی تھا

اُسی کا صدقہ

کہ سرزمین عرب کا صحرا ہے رشک گلشن

اُسی کا صدقہ

کہ بے ضمیروں کی ایک ٹولی زرو جو ابر میں پل رہی ہے



یہ صاحبان کلام و نثوت  
 یہ دشمنانِ رہ صد اقت  
 کہ عصر حاضر کے سارے رُشدی  
 انہیں کے سائے میں پل رہے ہیں  
 انہیں سے تھی جنگ کل ہماری  
 انہیں سے پھر آج معرکہ ہے  
 رہ صد اقت پر چلنے والو  
 ہمارا ہر روز، روزِ عاشور اور ہر گام کمر ہلا ہے

سلام اُس پر

درود اُس پر

جو بے یقینی کی تیرگی میں اک آفتاب یقین بھی تھا

صد اقتوں کی یہ تحریر سید عاشور کاظمی نے قلم بند کی ہے۔ عاشور کی ادبی زندگی کی ابتدا ۱۳/ اکتوبر ۱۹۳۶ء سے ہوئی جب وہ چودہ (۱۴) برس کے تھے۔ ۱۰/ فروری ۱۹۳۲ء کے دن فرید پور سادات تحصیل پانی پت، ضلع ہریانہ، ہندوستان میں پیدا ہونے والے عاشور کاظمی کا پہلا مجموعہ کلام ”بربط احساس“ تھا جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ حمد، نعت اور سلام کے مجموعے ”چراغ منزل“ ۱۹۵۳ء میں اور پھر ”صراط منزل“ ۱۹۸۷ء میں، افسانوں کا مجموعہ ”راہوں کے زخم“ ۱۹۵۷ء میں، مضامین، طنز و مزاح، خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ”سخن گسترانہ بات“ ۱۹۹۰ء میں، افسانے پر تحقیق بشمول مغرب میں آباد انتالیس (۳۹) افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کے منتخب افسانے بعنوان ”فسانہ کہیں جسے“ ۱۹۹۳ء میں، ”مرثیہ نظم کی اصناف میں“ ۱۹۹۶ء میں، شعری مجموعہ ”حرف حرف جنون“ ۱۹۹۹ء میں، شگفتہ نثر کا مجموعہ ”چھیڑ خوباں سے“ ۲۰۰۰ء میں، ”بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں“ ۲۰۰۱ء میں اور ”بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل“ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کتاب بہ معیت پروفیسر قمر رئیس ”ترقی پسند ادب“ پچاس سالہ سفر“ اور محقق سلیم قریشی کے ساتھ مل کر جدوجہد آزادی ہند کے تناظر میں غداروں کے خطوط پر مشتمل کتاب بعنوان ”اس گھر کو آگ لگ گئی“ شائع کی ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (پٹنہ، ہندوستان) نے ان کے فن اور شخصیات پر ایک ضخیم کتاب بعنوان ”عاشور کاظمی... فن اور شخصیت“ مرتب کی ہے۔ عاشور صاحب ناقد ہیں، محقق ہیں، شاعر ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ چنانچہ جب ان سے مل بیٹھنے کا موقع ملا تو میں نے پوچھا ناقد کے لئے کیا ضروری ہے کہ وہ تخلیق کار بھی ہو کہ تخلیق کے عمل سے گزرے بغیر ناقد تنقید کے فن سے انصاف نہیں کر سکتا؟ عاشور اس رائے سے متفق ہیں۔ انہوں نے کہا، ”ادیب یا شاعر کی تخلیقات پر دیانت دار نہ تنقید اسی وقت ممکن ہے جب



آپ اس کے پس منظر سے واقف ہوں۔“

”عاشور صاحب! آپ شاعری سے نثر کی طرف کیسے آئے؟ کیا محرکات تھے؟“ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا، ”قلم کار کے مختلف موڈوں کے تحت تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ شاعری میں اختصار ہوتا ہے اور بعض باتیں اور مسائل وضاحت چاہتے ہیں۔ اور یہ نثر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ میں جبر اور استحصال کے خلاف ہمیشہ لڑتا رہا ہوں۔ پھر میں نے نثر نگاروں کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے بھی نثر کا میدان ضروری تھا۔“

عاشور کا فلمی پچیس (۲۵) سال سے زیادہ عرصے سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ شعر و شاعرات کی ایک نئی نسل ان کے سامنے جوان ہوئی ہے۔ اس لئے ان سے اس سوال پر بھی تبادلہ خیال ہوا کہ مغرب میں کی جانے والی اردو شاعری کا معیار کیا ہے؟ عاشور صاحب کا کہنا ہے، ”ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہاں اردو لکھنے والوں کی آبادی کتنی ہے اور اس آبادی کے تناسب کو دیکھتے ہوئے نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ اور کینیڈا میں بھی شاعری کے مقابلے میں افسانہ بہت اچھا لکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہماری نئی نسل کسی طرح بھی پچھلی صف میں نہیں۔ بلکہ بعض نے تو بیرون برصغیر پاک و ہند رہ کر جو لکھا ہے اس میں ان کے یہاں کے تجربات شامل ہیں، یہاں کی معاشرت، یہاں کی اقتصادیات اور یہاں کی تہذیب کی بہت عمدہ جھلکیاں اور تصویریں ان کہانیوں میں ملتی ہیں۔ یہاں شاعری میں اتنی ترقی نہیں اور اس کی وجہ مطالعہ ہے۔ ہم تک وہ کتابیں نہیں پہنچتیں جو پاک و ہند کے ادیبوں کے مطالعے میں آتی ہیں۔

لیکن ایک اہم وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے اور بالخصوص پاکستان سے کچھ لوگوں نے یہ تجارت اور پیشہ اختیار کر لیا ہے کہ مغرب میں آکر پیسے لیتے ہیں اور نام و نمود کے خواہش مندوں کے لئے کتابیں لکھ کر اور ان کے نام سے چھاپ کر انہیں صاحب دیوان شاعر اور شاعرہ بنادیتے ہیں۔ چنانچہ بغیر محنت و ریاض کیے جب بنی بنائی شاعری مل جاتی ہے تو تخلیق کی زحمت کوئی کیوں کرے۔ نوواردان بساط سخن ان ہی مجموعوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ حالاں کہ جو شعر خود کہتا ہے وہ بھلے سے غالب، میر، فیض یا فرارز نہ ہو لیکن جیسو اکن (genuine کھرا) شاعر تو ہوتا ہے۔ ہمارے برطانیہ میں بہت سے صاحب دیوان شاعر ایسے ہیں جو درست طور پر شعر پڑھ نہیں سکتے تو شعر کیا کہیں گے۔ ایسے شاعروں کے تین چار دیوان بھی چھپ جائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ اگر وہ مشاعرے میں بے وزن شعر پڑھیں تو ان کے دوادین کا اعدام کر دینا چاہئیں۔ اس ’فرن چائز (franchise) شاعری‘ نے ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ میں آج کل ’تاریخ مرثیہ‘ لکھ رہا ہوں۔ اس سے فارغ ہوں تو میری خواہش ہے کہ ’مغرب میں اردو شاعری‘ کے عنوان سے ایسے شاعر اور شاعرات کو منظر عام پر لاؤں جن کی فرن چائز شاعری نے حقیقی اور کھرے شعر کو اور اردو ادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ میرے بچ بولنے سے پہلے ہی لوگ خوش نہیں اب بھی ناراض ہوں گے مگر مستقبل کے مورخ تک صحیح معلومات پہنچانا بہت ضروری ہے۔ سلیم کوثر سے تھوڑے سے تصرف کی معافی کے ساتھ یہ کہنا کس



قد درست ہے۔ یہ کلام ہے کسی اور کا، اسے نیچتا کوئی اور ہے۔“

”گفتنی حصہ دوم“ کے مرتب شدہ سوال نامے سے ہٹ کر عاشور صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ چنانچہ دوران گفتگو یہ سوال بھی سامنے آیا کہ خواتین قلم کاروں کا تناسب بمقابلہ مرد قلم کاروں کے کم کیوں ہے؟۔ عاشور صاحب کہا: ”مجھے آپ کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ لندن میں بانو (۹۲) شاعر ہیں۔ پران میں مستند کتنے ہیں۔ اصل میں ان خواتین کا ذکر آ جاتا ہے جو مختلف وسائل اختیار کرتی ہیں اور خصوصاً خوش شکل خواتین، مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ نقادان ادب کو ایسی خواتین کی تخلیقات میں روشن امکانات غالب نظر آتے ہیں۔ ان میں ہمارے جید شعرا اور ادیبوں کے نام بھی شامل ہیں۔“ عاشور کچھ توقف کے بعد بولے: ”میری کتاب ’فسانہ کہیں جسے‘ میں دیکھ لیں، پانچ (۵) افسانہ نگار مرد ہیں، جتندر بلو، قیصر تمکین، مقصود الہی شیخ، شصیر ادیب اور مصطفیٰ کریم۔ نئے افسانہ نگار جمشید مرزا ہیں۔ اب خواتین کے نام گن لیں، صفیہ صدیقی، عطیہ خان، بانو ارشد، صبیحہ علوی، شاہدہ احمد، پروین لاشاری، حمیدہ معین رضوی اور سعدیہ سیٹھی۔ (اس کے باوجود) برطانیہ میں جو افسانہ لکھا جا رہا ہے اس میں بڑی توانائی ہے۔“

اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو چھڑی تو عاشور نے کہا: ”حکومت یا امرا کا طبقہ سرپرستی کرے تو اردو باقی رہے گی، یہ تصور غلط ہے۔ بھلا حکومت کو کیا پڑی ہے کہ وہ اردو کی سرپرستی کرے۔ زبانیں عوام کے ساتھ بنتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ ہندوستان میں اس کو آپ ہندی کہہ لیں یا اردو، مگر فلم کے ذریعے عوام کے دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ یہاں برطانیہ میں ہم والدین خود اپنے بچوں کو اردو سکھانے کے لئے تردد نہیں کرتے اور ہم ادیب چار افسانے یا دس غزلیں لکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اردو کی خدمت کر رہے ہیں تو یہ ہماری نادانی اور خود فریبی ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اردو زبان تو کجا، ہم اپنے قومی تیوہاروں کو ریڈیو پر اسپانسر (sponsor کفالت) کرنے کی زحمت سے بھی گریز کرتے ہیں مگر دوسری قومیں اپنے تیوہاروں کو اسپانسر کرنے میں بخل نہیں کرتیں۔“

یہی حال اردو رسم الخط کا ہے اور ہوگا۔ گو میں رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں بالکل نہیں مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی ہے۔“

میرا اگلا سوال تھا: ”جو مانے ہوئے ادیب ہیں وہ بھی لکھنے پر آتے ہیں تو میر، غالب، اقبال اور فیض پر لکھتے ہیں۔ ہمارے اردو ادب میں اور بھی ادیب اور شاعر ہیں جیسے مصحفی، انشا، نظیر اکبر آبادی، ان کے فن اور ان کی شخصیت کو سامنے کیوں نہیں لایا جاتا؟“

”اس لئے کہ یہ فیشن ہے۔ اور لکھنے والا سمجھتا ہے کہ میر، غالب، اقبال اور فیض پر لکھنے سے ان کا قد بڑھے گا۔ ہماری ذہنیت کچھ اس قسم کی بن گئی ہے کہ ہم اردو ادب میں اضافے کرنے کے بجائے اپنا قد بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں یا بات اختلاف بڑھانے کے لئے لکھتے ہیں تاکہ کسی صورت بحث چھڑے، نام آئے اور بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا والے مقولے پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ یہ ہی



حال نقادان ادب کا ہے۔ وہ فن کی تعریف شخصیت کو دیکھ کر کرتے ہیں، فن کو پرکھ کر نہیں۔ کبھی تھے نقادان ادب جیسے کلیم الدین احمد، حسن عسکری، آل احمد سرور۔ آج بھی پاکستان میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مشفق خواجہ بڑی خوب صورت تنقید لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر عقیل رضوی، اعجاز علی ارشد اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور کئی دیگر ناقدین ہیں جو ابھی تنقید لکھ رہے ہیں۔“

عاشور کاظمی خود بھی بہت اچھے تنقید نگار ہیں۔ انکساری ان کی طبیعت کا خاصہ ہے ورنہ خطیب بھی اتنے ہی پائے کے ہیں۔ بولنے پر آئیں تو علم کے آبشار رواں ہو جاتے ہیں۔ افسوس میرے برادر کلاں عاشور کاظمی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے ان سے آخری سوال کیا، ”آپ کی ایسی کوئی خواہش جس کی تکمیل نہ ہوئی ہو اور تمنا ہو کہ وہ آپ کی زندگی میں پوری ہو جائے۔“

عاشور بھائی نے مسکرا کر بتایا، ”ایک خواہش جس کی تکمیل کے بغیر میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے اردو زبان و ادب کی خدمت کا حق ادا نہیں کیا، برطانیہ میں بی اے اور ایم اے تک اردو کی تدریس کا اجرا اور اردو یونیورسٹی کا قیام ہے۔ یہ کام قدرے آسان ہوتا اگر ہم اردو والے بالعموم اور اردو کے اہل قلم بالخصوص اجتماعی کوشش کرتے اور اس مطالبے کو تحریک بناتے۔ لیکن ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم میں اجتماعی فکر کے شعور کا فقدان ہے۔ اردو اہل قلم کی نظر میں اردو کی خدمت یہ ہے کہ چند غزلیں یا افسانے لکھ لیے جائیں۔ ان غزلوں یا افسانوں پر پیشہ ور نقادوں (عام طور پر بعوض معاوضہ نقد) دیباچے یا پیش لفظ لکھوا کر اپنی ہی جیب سے پیسے خرچ کر کے کتابیں شائع کرائی جائیں اور بس۔ یعنی اپنی ہی ادبی قامت بڑھانے کی کوشش اردو کی خدمت ٹھہرتی ہے۔ اور تو اور اردو زبان و ادب کی اس خدمت کے لئے اب یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کوئی خود شعر کہے یا ادب تخلیق کرے۔ پاکستان کے کچھ نام والے شعرا نے شعرو ادب کی دکانیں کھول لی ہیں۔ برطانیہ میں جس کا جی چاہے ان دکانوں سے ریڈی میڈ (ready made) تخلیقات حاصل کر کے ادیب یا شاعر بن سکتا ہے۔ یہ دکانیں ڈور ٹو ڈور سروس (door to door service) بھی فراہم کرتی ہیں، یعنی چھپے چھپائے دیوان اور افسانوں کے مجموعے گھر بیٹھے مہیا کرتی ہیں۔ غرض مند کو صرف اپنی تصویر اور زلف ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ برطانیہ میں ’نوادان بساطِ سخن‘ دو دو تین تین دیوانوں (شعری مجموعہ یعنی دیوان کی جمع ویسے آپ اسے دیوانہ کی جمع بھی تصور کر سکتے ہیں) کے ساتھ میدانِ شعر و سخن میں آتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ صحیح تلفظ کے ساتھ شعر نہیں پڑھ سکتے، لوگ ان دیوانوں کے دیواوین کی پزیرائی کرتے ہیں۔ اور کوئی نہیں سوچتا کہ ان کا یہ عمل برطانیہ میں اردو کی تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے کیوں کہ آنے والے دور کے محقق کو یہ پتا لگانا دشوار ہوگا کہ بیسویں صدی میں برطانیہ میں تخلیقی ادیب و شاعر یا جینوائن رائٹرز (genuine writers) خالص و کھرے لکھاڑی (کون کون تھے۔ اپنی قامت کو بڑھانے کی اس دوڑ میں مبتلا دیوانوں کو اب اس کی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور برطانیہ میں اردو تدریس کے منصوبوں پر اہل



منصب واقعہ ار سے گفتگو کریں۔ اور اگر کوئی مجھ جیسا سوداگر اردو زبان کی تدریس اور ادب کے فروغ کے لئے کوشش بھی کرے تو دانستہ یا نادانستہ اس کی راہوں میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ یہ الفاظ دیگر میں اس کو یوں عرض کروں کہ افراد کی نفسی اجتماعی مفاد کی راہوں میں رکاوٹ ڈال دیتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں (یہ آپ کے سوال کا جواب بھی ہو سکتا ہے کہ میں زندگی کا کوئی ایسا واقعہ بیان کروں جسے میں بھلا نہیں سکا) اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک اعلیٰ اختیاری میٹنگ میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ اردو میں بی اے یا ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے کیا مواقع ہیں؟ طلباء جرمن، فرنچ یا یورپی زبانوں کے مقابلے میں اردو کیوں پڑھیں؟ ان کے لئے اس کی افادیت کیا ہے؟ ہم اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ اردو یونیورسٹی کا ذکر آیا تو ایک صاحب منصب نے اخبار کا ایک تراشہ پیش کیا جس میں ایک اردو والے صاحب کا بیان چھپا تھا کہ اردو کا رسم الخط تبدیل ہونا چاہیئے اور یورپ میں اردو اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتی جب تک اسے رومن حروف میں نہ لکھا جائے۔ ہم نے کہا یہ ایک نحیف آواز ہے۔ ایک شخص کی ذاتی اغراض کا مظاہرہ ہے۔ اس شخص نے اس موضوع پر ایک جلسہ کرنے کی کوشش کی تو اس پر اتنے اعتراضات ہوئے کہ آخر اس شخص کو خود کہنا پڑا کہ اس کی مراد تو یہ تھی کہ برطانیہ میں اردو پڑھانے کے لئے انگریزی زبان اور اردو کے حروف تہجی کو انگریزی میں لکھ کر سمجھانا پڑتا ہے۔ ایک صاحب نے اطلاع دی کہ اُن موصوف کو صرف پانچ ہزار پونڈ کی اس گرانٹ میں دل چسپی ہے جو وہ اردو کے رسم الخط بدلنے کی تحریک کو چلانے کے لئے حاصل کرتے ہیں یا خود کو پہچانوانے کے لئے ایسی چونکا دینے والی بات کرتے ہیں۔ لیکن ایک صاحب منصب نے یہ کہا..... کیا یہ نہیں ہو سکتا جو آج (بقول آپ لوگوں کے) اکیلا ہے، کل کلاں اس کے ساتھ دس افراد ہوں، اس کے بعد ہزار ہوں، اس کے بعد دس ہزار ہوں، پھر ایک لاکھ اور دس برس میں ایک میلین لوگ جو یہ چاہیں کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ تو آپ جس اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس اردو یونیورسٹی کا کیا انجام ہوگا۔ اور میٹنگ بد ذائقہ ماحول میں ختم ہو گئی۔ اب انہیں یہ کون سمجھائے کہ انہوں نے دانستہ یا نادانستہ پانچ ہزار پونڈ سالانہ گرانٹ کے عوض اردو کے ایک اہم مقصد کو فروخت کر دیا۔ اس ناکام جنگ کے بعد ہمیں اپنے مقصد کو از سر نو تعمیر کرنا پڑا۔ استدلال کا دوسرا رخ اختیار کرنا پڑا لیکن ہم نے ایک فرد کی ذاتی منفعت والی سوچ کا کئی برس خمیازہ بھگتا اور شاید اب بھی بھگت رہے ہیں۔

Mr. Syed Ashoor Kazmi,

Institute of Third World Arts & Literature, #12, Westminster  
Court, Lyndon Close, Birmingham, B20 3NN





خاتم کا نام بھی شہادہ ہی ہیں۔ علامہ بھی اس پر زور دیتے۔ خود دین کے معنی  
نکولنا کہہ کر کے دہلا کر شہادہ اس کے ساتھ ہی ہے۔ اسے دراصل کوئی علامہ اس کے  
دائیں سر پر اس کے ساتھ ہی دہلا کر شہادہ اس کے ساتھ ہی ہے۔ اسے دراصل کوئی علامہ اس کے  
اور یہ بیوقوف نام سلسلہ کا اس کے ساتھ ہی ہے۔ اسے دراصل کوئی علامہ اس کے

۱۴۰۷ھ  
۱۴۰۷ھ  
۱۴۰۷ھ

## پروفیسر ڈاکٹر علی احمد فاطمی

الہ آباد، ہندوستان

یہ دسمبر ۱۹۹۹ء کا پہلا ہفتہ تھا جب دہلی میں میری ملاقات ڈاکٹر علی احمد فاطمی سے کہانی کار  
ڈاکٹر نگار عظیم کے گھر پر ہوئی۔ ہم گفتگو کر رہے تھے کہ معاشرے کی بیشتر خرابیوں کی ذمہ داری ایک  
ادیب پر ”بھی“ عائد ہوتی ہے، گویا سی حالات بھی اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں مگر ادیب کا قلم تو طوفان  
بھی اٹھا سکتا ہے اور حالات کا رخ بھی بدل سکتا ہے۔

میرا موقف تھا کہ ادیب پر ذمہ داریاں عائد کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ بلاشبہ  
ادیب ایک فن کار ہے اور جس فن کار میں قوت احساس جتنی شدید ہوگی اتنی ہی شدت اور تاثیر اس کے  
فن میں ہوگی اور یہ شدت یقیناً حالات کا رخ بدلنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ نگار کا کہنا تھا  
کہ ایک فن کار پر یہ قید لگا دینا کہ وہ فلاں جذبے کو اپنے اندر ابھرنے دے اور فلاں جذبے کو اپنے  
احساسات کی سرحد میں داخل نہ ہونے دے سراسر زیادتی ہے۔

علی احمد فاطمی سن رہے تھے۔ جب ہمارے دلائل مدھم ہوئے تو فاطمی نے کہا: ”یہ دل کی دنیا  
کسی پابندی کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ تضادات ہر زمانے میں سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر  
حیدرآباد دکن میں شیعوں کی حکومت ایک طویل مدت تک رہی مگر انیس اور دہائیوں میں پیدا ہوئے۔ اور



جس زمانے میں دلی لٹریچر میں لکھنؤ میں کٹکھی چوٹی کی شاعری ہو رہی تھی۔ اب اس تشاد کا کیا کیجئے۔  
ستم ظریفی ہے حالات کی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی صرف نقاد ہی نہیں وہ ”نیا سفر“ جریدے کے پہلی شاعر اور مدیر بھی ہیں۔  
”نیا سفر“ زندہ تحریروں سے بھرپور پرچہ ہے اور خود فاطمی صاحب پر و پگنڈہ باز نقاد نہیں۔ انہوں نے  
بے شمار مقالات اور مضامین لکھے ہیں اور اردو ادب کی خدمت کے حوالے سے کئی اعزازات حاصل  
کر چکے ہیں۔ یوپی اردو اکادمی کی جانب سے ان کی چار کتابوں پر ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۸ء تک دیئے گئے  
ایوارڈ کے علاوہ آل انڈیا پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (All India Progressive Writers  
Association) نے ۱۹۸۶ء میں نشان سجاد ظہیر کا ایوارڈ دیا۔ ۱۹۹۱ء میں انہیں یوپی اردو اکادمی نے  
اپنے افسانہ نویسی کے سیمینار میں میڈل (medal تمغہ) سے نوازا۔ آل انڈیا میر تقی میر اکادمی، لکھنؤ  
نے ”میر ایوارڈ“ ۱۹۹۳ء میں اور ”امتیاز میر“ ایوارڈ ۱۹۹۷ء میں عطا کیا۔ عالمی اردو کانفرنس، دہلی نے  
اگست ۱۹۹۷ء میں انہیں ”فراق گورکھپوری“ ایوارڈ سے نوازا۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو الہ آباد کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں ”ال تلخ“  
میں پیدا ہوئے۔ والدین نے سید علی احمد فاطمی نام رکھا۔ فاطمی بتاتے ہیں کہ ان کے گھر کا ماحول علمی و  
ادبی تھا۔ ان کے والد عربی اور فارسی کے عالم تھے اور والدہ شرر، راشد الخیری وغیرہ کے ناول ذوق و شوق  
سے پڑھتی تھیں۔ اس لئے انہیں بھی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ کہانی لکھنے، ڈرامہ کرنے، بیت بازی،  
تقریری مقابلہ وغیرہ کا شوق بچپن سے ہی ہو گیا تھا۔ بی اے میں اردو کے علاوہ انہوں نے فارسی بھی  
پڑھی۔ ایک تقریری مقابلے میں ممتاز ناقد احتشام حسین کے ہاتھوں انعام پا کر انہیں بے اندازہ مسرت  
ہوئی۔ پھر احتشام صاحب ہی انہیں ایم اے اردو کی طرف لے آئے۔ امتیازی نمبروں سے ایم اے  
پاس کرنے کے بعد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی نگرانی میں عبد الحلیم شرر کے ناولوں پر تحقیقی مقالہ برائے  
ڈی فل مکمل کیا۔ اسی زمانے میں فاطمی صاحب نے نہ صرف کہانیاں لکھیں بلکہ دیگر افسانہ نگاروں کی ہیں  
نئی کہانیوں کا انتخاب کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ان کی دوسری کتاب تھی، ”تاریخی ناول، فن اور اصول“۔  
۱۹۸۰ء میں پریم چند صدی کے موقع پر ”سوز وطن“ شائع کیا۔ اس کے بعد سینٹ جانس کالج میں ملازم  
ہو گئے۔ وہیں انہوں نے نظیر اکبر آبادی پر کتاب لکھی۔ جولائی ۱۹۹۳ء سے الہ آباد یونیورسٹی میں بطور  
ریڈر تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شعر گوئی کی طرف ان کی طبیعت مائل نہیں ہوئی۔ انہوں نے نشر کی طرف اور بالخصوص فکشن  
اور تنقید کی طرف توجہ دی۔ فکشن پر ان کے تقریباً پچاس مضامین ہندو پاک کے مقتدر رسائل میں شائع  
ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ان کی کتاب ”عبد الحلیم شرر بحیثیت ناول نگار“ شائع ہوئی۔ اس کے بعد  
انہوں نے فراق گورکھپوری پر کام کیا۔ ”نئی تنقید نے اقدار“ کے نام سے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ  
ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔



علی احمد فاطمی نے اپنی شب و روز کی محنت اور جی کے خون سے اردو ادب کا دیا جلایا رکھا ہے۔ میں نے پوچھا یہ گھائے کا سودا سر میں کیوں سمایا؟ ہنس کر کہنے لگے، ”میں نے ادب میں نفع و نقصان کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوں جس میں صرف خادموں اور مجاہدوں کا ہی گزر ممکن ہے۔ البتہ ”نیاسفر“ کو چھ سات برس تک نکالنے کے بعد مجھے خاصا مالی نقصان ہوا جس کی وجہ سے رسالہ بند کرنا پڑا۔“

پھر گفتگو کا رخ ادیبوں کی گروہ بندی کی طرف جا پہنچا۔ فاطمی کہنے لگے، ”ادیبوں میں اختلاف نظر تو فطری عمل ہے۔ لیکن سودو زیاں کے حوالے سے تو بہر حال نقصان ہوا ہے۔ صافیت نے بڑے بڑے ادیبوں کو بھی اپنے حصار میں لے لیا ہے اور ان سے حق گوئی و بے باک کلامی اور جرات مندی کے جوہر چھین لئے۔ آج کوئی بھی عصری ادب پر لکھتے ہوئے گھبراتا ہے۔ سرکاری اداروں نے بھی اس سلسلے میں تحزیبی کردار ادا کیا ہے۔، ایوارڈ، انعام وغیرہ نے تو زبان پر مہر لگا دی ہے۔ ادب سے حقیقت نگاری، بے نیازی، قناعت پسندی اور حق گوئی تقریباً رخصت ہو گئی ہے جس سے ادب اور ادیب کا اصل جوہر، عطر رخصت ہو گیا ہے۔“

”اردو زبان و ادب ’بے امان‘ ہے“..... اور اس کے رسم الخط کی تبدیلی کے حوالے سے فاطمی کہنے لگے..... ”ہندوستان میں اردو زبان سیاست دانوں سے زیادہ خود اردو والوں کی بے اعتنائی و بے توجہی کی شکار ہے۔ اپنی تہذیب و ثقافت سے بے خبری اصل وجہ ہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو مجاہدانہ و رضا کارانہ انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے گھر میں اپنے بچوں کو عربی کی ہی طرح اردو کو بھی پڑھانا مذہبی ہی نہیں اخلاقی و انسانی فریضہ سمجھنا چاہیے۔ کوئی بھی زبان صرف سرکاری کوششوں سے زندہ نہیں رہتی۔ اس کے بولنے والوں کا جذباتی سلسلہ اسے دور تک لے جاتا ہے۔ اب رہی رسم الخط کی بات تو میں رسم الخط بدلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ وہ لوگ جو دیوناگری یا رومن میں تبدیل کر کے اردو کے پھیلاؤ کی کوشش کر رہے ہیں ان کے خلوص پر تو شک نہیں کرتا لیکن اگر یہ آسانی دے دی گئی تو پھر وہ بھی اس رسم الخط سے بے گانہ اور دور ہوتے چلے جائیں گے۔ اردو زبان ہی میں نہیں، اس کے رسم الخط میں بھی لسانی تہذیب و ثقافت پوشیدہ ہے جو صدیوں کی ریاضت سے ممکن ہوا ہے۔ اسے ہم اتنی آسانی سے کھو نہیں سکتے۔ ہم دوسری زبانوں میں اپنا ادبی و تخلیقی سرمایہ زیادہ سے زیادہ منتقل کریں، یہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن فی زمانہ اگر ہم صرف ضرورت اور فیشن کو دیکھیں تو کیا اپنی جڑوں کو بھی چھوڑ دیں۔ یہ سراسر غلط اور خطرناک ہے۔“

علی احمد فاطمی حالی، احتشام حسین، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری سے متاثر ہیں اور مغرب میں انہوں نے ڈی ایچ لارنس، وال فاکس، نالسانی کی تحریروں کا اثر قبول کیا ہے۔ کہتے ہیں ”اور بھی ادیب و دانشور ہیں جن کی فہرست طویل ہے۔“

صحافی ہونے کے ناطے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ادیبوں کے انٹرویو میں بڑی معلومات اکٹھی



کی ہیں۔ سہ ماہی ”نیا سفر“ کے علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری پر لکھے گئے مضمون بعنوان ”سب دیے روشن تمہارے نام کے“ (شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء) میں لکھتے ہیں۔ ”مجروح صاحب کو ہم نے الہ آباد کے ایک مشاعرے میں بلوایا۔ وہ ممبئی سے لکھنؤ ہوائی جہاز سے اور اور لکھنؤ سے الہ آباد کار کے ذریعے لے جائے گئے۔ کار کے سفر میں ایک جگہ ایک ڈھابے پر چائے پینے رکے۔ چائے والا کار اور مجروح صاحب کے سفید کرتے پا جائے کو دیکھ کر بیچ پر کپڑا مارنے لگا تو مجروح صاحب نے کہا: ”میاں اسی یوں ہی رہنے دو۔ یہ اودھ کی دھول ہے۔ ہم اسی میں رہ کر جوان ہوئے ہیں۔“ دوران گفتگو انہوں نے یہ بھی بتایا کہ فلمی گیت لکھنے کے لئے بھی انہوں نے خون جگر خرچ کیا ہے اور راتوں کی نیند حرام کی ہے اور نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلم ’آرتی‘ کے لئے ڈاکٹر نے فرمائش کی کہ فلم چودھویں کا چاند کے گیت چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو ٹائپ کا خوب صورت گیت ہو۔ یہ گیت مینا کماری کے لئے لکھا تھا جو رومانی چہرہ نہیں رکھتی تھی۔ سنجیدہ اداکارہ تھی۔ یہ ان کے لئے ایک چیلنج سا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بہت سوچ بچار اور عرق ریزی کے بعد گیت لکھا اب کیا مثال دوں تمہارے شباب کی / انسان بن گئی ہے کرن ماہتاب کی۔“ مجروح صاحب بتا رہے تھے کہ یہ گیت ہٹ ہوا۔ میں اسے اپنے چند پسندیدہ نغموں میں شمار کرتا ہوں۔ ہم ہمیشہ اچھی دھن، زبان و بیان کا معیار اور عوامی مذاق سب پر نظر رکھتے ہیں جب کہ آج کے گیت نگاروں نے دولت اور شہرت کی خاطر مذاق کی سطح بگاڑ دی ہے۔

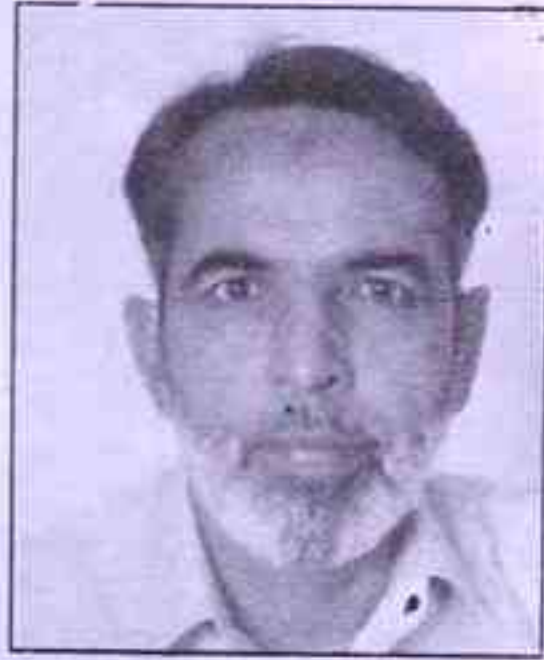
دوران گفتگو وہ ڈاکٹر فاطمی کو میاں فاطمی، برخوردار فاطمی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان کے مخاطب سے غیر معمولی اپنا پن جھلک رہا تھا اور میں افتخار محسوس کر رہا تھا مگر جب بات قدرے سنجیدہ یا علمی ہو جاتی تو وہ ”پروفیسر فاطمی“ سے مخاطب کرتے تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔

اپنی زندگی کا انہوں نے وہ اہم واقعہ سنایا جس نے ان کی زندگی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ فاطمی نے کہا: ”پہلی بار لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں میں نے تقریر کی تو میری پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ سامنے سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کفئی اعظمی، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی جیسے اکابرین بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن میری بچپن کی مشق کام آئی اور دھواں دھار تقریر کر گیا۔ تقریر ختم ہوئی تو پورے ہال میں تالیاں بج رہی تھیں۔ اسٹیج سے اترتے ہی مجروح صاحب نے گلے لگالیا اور کہا: تحریک کو تمہارے جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔ ہم تمہارا اس تحریک میں استقبال کرتے ہیں۔ جعفری اور کفئی صاحبان نے بھی پیٹھ ٹھوکی۔ ایسی ہی ایک تقریر جو میں نے بی اے میں کی تھی اس سے خوش ہو کر احتشام حسین مجھے اردو میں لے آئے ورنہ میرے والد مجھے سرکاری ملازمت کی طرف لے جا رہے تھے۔ احتشام حسین کے اس عمل نے میری زندگی کا راستہ ہی نہیں نقشہ بدل دیا۔ آج میں جو کچھ ہوں ان خصوصیات کے حصول میں ان بزرگوں کے علاوہ سید محمد عقیل رضوی اور قمر رئیس کا بھی بڑا حصہ ہے۔“

Dr. Ali Ahmad Fatmi,

229-A, Lukeriganj, Allahabad, No. 1, UP, India





سید علی امام نقوی کی زندگی اور خدمات کا ایک مختصر خاکہ ہے۔  
 (پروفیسر محمد رفیع صاحب کی تصنیف)  
 (پروفیسر محمد رفیع صاحب کی تصنیف)  
 (پروفیسر محمد رفیع صاحب کی تصنیف)

## سید علی امام نقوی

ممبئی، ہندوستان

”رجنی گندھا“ کی خوش بو میں بے شرم ممبئی میں رہنے والے افسانہ نگار علی امام نقوی کی کہانیوں میں ممبئی کے ان بایوں کے مسائل کی گونج ہے، ان کے درد کی ٹیسیں ہیں اور ان کی فریاد کی لے ہے جو آزادی ہند کے بعد بھی زندگی کے عذاب کی زنجیروں سے رہا نہیں ہوئے۔ بھوک اور افلاس آج بھی ان کی بد نصیبی میں شمار کئے جاتے ہیں جب کہ حقیقت میں یہ ان کی بد نصیبی نہیں ان کا اختیار لوگوں کی دین ہے جو ہیرا پھیری کے کاروبار کا ہنر جانتے ہیں۔

علی امام نقوی کا ناول ”تین بتی کے راما“ میں موضوع کی گھمبیرتا کے ساتھ ممبئی کی خاص زبان اور لہجے نے ناول کے کرداروں کو زندگی بخش دی ہے۔ اکثر مقامات پر مصنف کی اپنی زبان بھی ہے یعنی اردو جس کا اپنا مزہ ہے۔ اس ناول میں ایک کردار چیت رائے کا ہے جو پوربی زبان بولتا ہے۔ یہ کردار مختصر سا ہے۔ لیکن اپنے اختصار کے باوجود ناول نویس کی خوبی ہے کہ کردار قاری کے ذہن پر اپنے گہرے تاثرات چھوڑ جاتا ہے۔

علی امام نقوی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ”نئے مکان کی دیمک“ ۱۹۸۲ء میں، دوسرا ”مباہلہ“ ۱۹۸۸ء میں،



تیسرا ”گھٹتے بڑھتے سائے“ ۱۹۹۳ء میں اور ”موسم غذاؤں کا“ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئے۔ ناول ”تین جی کے راما“ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا جب کہ دوسرا ناول ”بساط“ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

میں نے ان کے منہ سے ”ممبیا“ اردو کی بجائے خالص ”میرٹھی“ اور یوپی کی فصیح اردو سنی تو پوچھا، ”ممبئی (جسے میں بدقت ممبئی کہہ پاتی ہوں) میں رہ کر اور ناولوں اور کہانیوں میں ممبئی کی زبان استعمال کر کے بھی اتنی ستھری اردو کیسے بول رہے ہیں؟“

”بی بی! اس کی وجہ یہ ہے کہ بھلے سے ہم ممبئی میں پیدا ہوئے (ان کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۹۴۰ء ہے) لیکن ہمارا وطن مالوف تو عبداللہ پور ضلع میرٹھ ہندوستان ہے۔ وہاں کی بوباس تو کہیں نہیں جاتی نا۔ اور پھر ہمارے تائے ابا کے بڑے صاحبزادے سید شجاعت علی جنہوں نے عربی فارسی بھی پڑھی۔ ان کی کتاب ’غالب کون ہے‘ نو عمری میں پڑھی گو اس وقت کچھ پلے نہیں پڑا مگر خون کے اثرات کہاں جاتے۔ شجاعت بھائی سید قدرت نقوی کے نام سے لکھتے تھے۔ ہمارے والد ماجد ۱۹۲۴ء میں ممبئی آ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے روزگار میں ترقی دی ہمارا بچپن بڑا شاندار گزر رہا۔ والد کی تربیت اور بھائی شجاعت کی تحریروں نے ہماری ادبی شخصیت کی تعمیر کی۔ اور یوں ہم نے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔“

”بھائی علی امام صاحب.....“ میں نے ان کے چہرے پر نظر کی اور ذرا کے ذرا رُکی..... چوڑے ماتھے پر نماز کی محراب اور آنکھوں میں ذہانت کے روشن دیپ جگمگا رہے تھے۔ خشکی سفید داڑھی اور چہرے پر اعتماد کا پرتو..... اور کیوں نہ ہو کہ وہ آج کے ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تخلیقات نے انہیں ایک جداگانہ شناخت دی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کی دردناک حقیقتوں کو مجسم کیا ہے کیوں کہ وہ خود دکھوں کی اس سر زمین پر رہے ہیں اور دھوپ سہی ہے اور دھوپ کی شدت دیکھی بھی ہے محسوس بھی کی ہے اور رگ و پے میں یوں اتاری ہے کہ وہ الفاظ بن کر کاغذ پر نقش ہو گئی ہے۔

اب میں جب بھی علی امام نقوی سے ملنا چاہتی ہوں ان کی کہانیوں کے ذریعے ان کی دنیا تک پہنچ جاتی ہوں۔ لیکن جب نہیں ملی تھی تب میں نے انہیں خط لکھا تھا اور انہیں بتایا کہ میں نے حال ہی میں ان کی ایک کہانی بھائی افتخار امام صدیقی کے جریدے ”شاعر“ میں پڑھی۔ اور جناب عبدالاحد سار سے ان کا تذکرہ رہا۔ یہ شاید سب اس لئے کہ شاید وہ مجھے نہ جانتے ہوں۔

جواب میں ان کا خط آیا۔ بڑے بھیا کی شفقت کی ٹھنڈک سی لیئے ہوئے..... انہوں نے لکھا، ”خواہر! سب سے پہلے تو شکریہ قبول کیجئے۔ یاد آوری، قدر افزائی اور حوصلہ افزائی پر۔ موسم، وقت اور قدریں ہر جہان کی بدل چکی ہیں۔ کلمہ خیر کی ادائیگی جب معصومیت قرار دی جانے لگے تو مذکورہ صفات جو پاپا جائے خوش نصیب اور جو اس کی تقسیم کو شعار تسلیم کرے وہ انتہائی خوش بخت قرار دیا جاتا چاہئے۔ آپ نے مہرِ مخلص جانے انجانے ان ہی اوصاف حمیدہ کے باعث ہی منتخب کیا ہے۔ جانے کیوں آپ کا خط ملنے سے پہلے اسی پر دل گواہی دیا کرتا رہا۔ اب تو متذکرہ گواہی یقین میں بدل چکی ہے۔“



اپنے تعارف کے حوالے کی خاطر جو دو نام آپ نے تحریر کیے ہیں وہ مجھے عزیز ہونے کے بعد اس وجہ سے بھی عزیز رہیں گے کہ آج جہاں ادب میں ان کی جو بھی شناخت ہے اسی اسکول کے باعث ہے جہاں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ دانش کدہ آپ کے حافظے میں محفوظ ہوگا۔ اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول اور وہاں کے اساتذہ کا ہم پر احسان ہے۔ بہن! ان باتوں کے بیان کی ضرورت یوں محسوس ہو گئی کہ ساز اور افتخار آپ کے تعارف کے لئے بعد کی ہستیوں میں شمار ہوں گے۔ میرے حافظے میں ممبئی کے اخبار کا وہ صفحہ بھی محفوظ ہے جو خواتین سے منسوب رہا۔ اصغری بیگم تحریر مجھے یاد ہیں اور ممبئی کی صحافت کا ایک نام درپن بھی کچھ لوگوں کو یاد ہے۔ عبدالحمید انصاری، سلامت علی مہدی، سلامت رضوی۔ کیسے درتے کھل گئے نا؟

مجھے حیرت تو ہوئی ہی تھی کہ وہ مجھے اتنے حوالوں سے پہچانتے ہیں۔ پھر تو ان سے خوب گپ رہی۔ اور کام کی باتیں..... بہت ساری کام کی باتیں بھی ہوئیں۔ مثلاً میں نے ان سے ادیبوں کی گروپ بندی کے حوالے سے بات کی کہ اس بیماری میں ہمارے پڑھے لکھے دانشور بھی مبتلا ہیں اور اس سے نقصان بھی پہنچا ہے۔

علی امام نے کہا، ”یہ گروپ بندی مثبت بھی ہے اور منفی بھی۔ اور اس کے باعث چند بہت اچھے جواہر فراموش کر دیئے گئے۔ مثلاً رفیق حسین، ضمیر الدین احمد اور محمد علی ردو لوی۔ ایک نام اور ہے شعر و نثر کا جو آج تک تقریباً بھلایا جا چکا ہے۔ وہ ہے قبلہ آوارہ مار ہروی۔“

گفتگو آگے بڑھی تو انہوں نے بتایا، ”میں اردو ادب میں راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، رفیق حسین اور ضمیر الدین احمد سے متاثر ہوں۔ ایک نام عزیز احمد کا بھی بھلائے نہیں بھولتا۔ قرہ العین حیدر اور عصمت چغتائی بھی متاثر کرتی ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر کے مطالعے کی خاطر صرف پڑھا لکھا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ ان کی تحریروں سے واقعتاً استفادہ کی خاطر قاری کی ادب سے اور تاریخ سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ دیگر زبانوں کی نگارشات مترجمین کی کرم فرمائیاں کے باعث پڑھ سکا ہوں۔ ان میں گورکی، نالسنائی اور میلان کنڈ ہوانے متاثر کیا ہے۔

میرا اگلا سوال تھا، ”ناول کے مقابلے میں آج کل افسانے زیادہ لکھے جا رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں اظہار کا بہترین ذریعہ کیا ہے؟“

”ناول بھی کم نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ چند بہترین ناولوں میں محسن علی کا ناول ’بڑا آدمی‘ جو گندر پال کا ’خوابِ رو‘، امراؤ طارق کا ’معتوب‘، اقبال مجید کا ’کسی دن‘ سید محمد اشرف کا ’نمبر دار کا نیلا‘ الیاس احمد گدی کا ’فائر ایریا‘، فہمیدہ ریاض کا ’گوداوری‘، شموئل احمد کا ’ندی‘، مشرف عالم ذوقی کا ’بیان‘ کے علاوہ کئی اور بھی نام ہیں جو اس وقت یاد نہیں۔ لیکن اظہار کے لئے دونوں ہی ذرائع اہم ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ ناول کا کیوں بڑا ہوتا ہے۔ اس میں کرداروں کی داخلی، خارجی، فطری اور غیر فطری باتوں کا تفصیل سے احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ افسانے میں یہ پہلو سکڑے سٹے ملتے ہیں۔ انہیں سمجھنے کی خاطر ذہن



کے درپے کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کی گرفت اپنی تحریر اور انداز بیان پر مضبوط ہو تو وہ نہ صرف پڑھنے والے کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے بلکہ فکر کے حوالے سے بھی اپنے کرداروں کا صحیح تجزیہ قاری کے ذہن نشین کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ”سیاسی خلیج“ نے ادیبوں کی فکر کو بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچنے نہیں دیا۔ اور بی بی! سچ پوچھیں تو ہم خود بھی اپنے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ ”جی گندھا“ کی جس خوش بو کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے وہ در جو آپ کے اندر ہے وہ کتنے ذہنوں میں لشکارے مار رہا ہے۔ خواہر ابر صغیر کے لوگ، ارباب اقتدار مخلص ہوتے تو سلطانہ مہر امریکہ بسا تیں؟ خالد سہیل کنیڈا میں اور عاشور کاظمی برطانیہ میں ہوتے؟ ایک بات کارونا ہو تو رو کر صبر آئے۔۔۔ علی امام خاموش ہو گئے۔

اور یہ خاموشی بڑی دیر تک طاری رہی۔ ماحول گھمبیر ہو چلا تھا۔  
 ”بھائی! میں نے دھیرے سے کہا۔

”جی بی بی! انہوں نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مسکرائے۔

میرا حوصلہ بڑھا تو بہ یک وقت ایک کے بعد ایک سوال پوچھنے لگی۔

”یہ بتائیے آپ کے ہاں ترجمے کا کام ہو رہا ہے، میرا مطلب ہندی سے اردو میں اور اردو

سے ہندی میں؟“

”کام تو ہو رہا ہے جیسے ہمارے ہاں حیدر جعفری، سید مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم، تجسم فاطمہ عمدہ ہندی کہانیوں کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ وقار ناصری نے بھی چند بے حد اچھی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ مراٹھی شاعری کے ترجمے کی ذمہ داری بدیع الزماں خاور، نور پرکار اور یعقوب راہی نے اپنے ذوق اور اپنے معیار کے حساب سے پوری کی ہے۔ نشر کی طرف عبدالستار دلوی، یونس اگاسکر، خالد اگاسکر، م ناگ، شاہد ندیم، ساجد رشید، رفیعہ شبنم عابدی اور قاسم ندیم نے توجہ ہی نہ کی بلکہ خاصا کام بھی کیا۔ اردو میں مراٹھی ادب اور مراٹھی زبان میں اردو نظم و نشر کی منتقلی کا فریضہ راہی جوشی اور رام پنڈت نے بڑے ذمے داری سے انجام دیا ہے۔ دہلی سے ”کتھا والوں“ نے ایک انتخاب شائع کیا ہے اور ایک دوسرا انتخاب وہ اردو افسانوں کا انگریزی میں شائع کرنے والے ہیں۔ کہانیوں کا انتخاب ہو چکا ہے۔ ترجمے کا کام ہو رہا ہے۔ مذکورہ انتخاب جی غالباً اس سال شائع ہو جائے گی۔ اردو سے مراٹھی، ہندی، بنگالی اور انگریزی میں منتقلی کی رفتار کم ہے۔ اس کا سبب ترجمے کے فن سے واقفیت کا نہ ہونا بھی ہو سکتا ہے اور کچھ مترجمین کی اپنی پسند، اپنی ترجیحات بھی ہوں گی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ٹریفک یک طرفہ ہے۔“

ہندوستان میں کون سے افسانہ نگار آپ کے نزدیک اہم ہیں اور کن خصوصیات کی بنا پر ان کو

اہم قرار دیا جاتا ہے؟“

”سب ہی اہم ہیں کہ موجودہ عہد میں زندگی گزارتے لوگوں کی زندگی سے متعلق واقعات بیان کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہ دریافت فرمائیں کہ کون زیادہ پسند ہیں تو میں سب سے پہلے نیر مسعود کا نام



لوں گا۔ اقبال مجید کا نام فوراً یاد آ جاتا ہے۔ انور خان، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، ساجد رشید، انور قمر، حسین الحق، عہد الصمد، مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرام اور م ناگ، اپنے موضوعات اور اسلوب کے باعث مجھے پسند ہیں کہ ان میں موجود کہانیاں احساسات کے تاروں کو چھیڑتی ہیں، پڑھنے والوں کو سوچنے پر اکساتی ہیں اور سرگوشی کے انداز میں قاری کے کان میں کچھ کہتی ہیں۔ اقبال مجید کی تحریر میں عصری صداقتوں کا علم ہوتا ہے، سلام اپنے عہد کے آدمی کی کہانی لکھتے ہیں، جو قدم قدم پر مفاہمت اور مصالحت پر مجبور ہوتا ہے۔ انور خان اپنے اختصار کی وجہ سے پسند آتے ہیں۔ حسین الحق کے افسانوں میں فکر کی اہمیت ہوتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی اور خورشید اکرام میں غضب کے جوہر ہیں۔

”کیا آپ لکھنے والوں کی کارکردگی کو تسلی بخش سمجھتے ہیں؟“

”میں صغیر رحمانی اور شاہد اختر کا نام اور لوں گا۔ ہمارے ساتھ کے لکھنے والوں میں م ناگ، شمول احمد، اور شاہد اختر کا میلان مجھے یکساں محسوس ہوتا ہے۔ تو اتر سے لکھتے رہے تو تینوں ہی اپنی اپنی راہ پائیں گے۔ صغیر رحمانی کی دو ایک کہانیاں بڑی اچھی آئی ہیں۔ روس کے بکھرے کو جس مؤثر پیرائے میں انہوں نے پیش کیا ہے اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ ’عصری ادب‘ میں یہ کہانی چھپی تھی۔ خورشید اکرام کم لکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات اور ان کی احتیاط اچھی لگتی ہے۔ ان سب نے تو اتر کے ساتھ لکھا اور خاطر خواہ پزیرائی ہوئی تو یہ سب ہی بہت آگے جانے والے افسانہ نگار ہیں۔ کم سے کم مجھے اطمینان ہے۔“

”ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟“

”اصل میں ہم اردو والے ہی اس کے مجرم ہیں۔ غزل سرائی کی محفلوں کے طفیل، جن کی حیثیت اردو زبان کی بقا اور فروغ سے زیادہ غزل سراؤں کے بینک بیلنس میں اضافہ ہے، میری رائے میں بھارت میں اردو بول چال کی حد تک باقی رہ جائے گی۔ تھوڑا حصہ فلموں اور ٹیلی ویژن کے اسکرپٹ نویسوں کو بھی ملے گا۔ ہم جو افسانے لکھ رہے ہیں، ناول لکھ رہے ہیں، شعر و شاعری کر رہے ہیں اس سے ہماری اولاد اردو زبان میں پڑھ پائے گی؟ اس کا امکان عمومی طور پر کم ہی ہے کہ اردو کا رشتہ روزی سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ اردو والے حاصل کے چکرویر میں الجھے ہوئے ہیں، اپنی اولادوں کو اپنے گھر میں بھی اردو نہیں پڑھاتے۔ فیصلہ آپ خود کر لیجئے کل کیا ہوگا؟“

”کیا رسم الخط کی تبدیلی سے اردو کی اپنی حیثیت برقرار رہ سکتی ہے؟“

”نہیں رہ سکتی! بالکل نہیں رہ سکتی۔ رسم الخط بدلا تو غزل، گزل، ہوگی اور غالب، غالب ہوگا۔ فراق، فراک ہو جائے گا۔“ انہوں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

Mr. Syed Ali Imam Naqvi,

54/103 Naya Nagar, CH Society, Mira Road East, Thane 401107, India





”علم و افتداری شہر لہنوں کو متواضع اور زریلوں کو  
متکبر بناتا ہے“

علی ایم شمش

۱۷ جولائی ۲۰۰۳ء

علی ایم شمش

ممبئی، ہندوستان

”کوکن کی آواز“ ایک جریدہ ہے اور تنسیم انصاری، ایم اے، بی ایڈ، اس جریدے کی مشیر کار  
ہیں۔ علی محمد شمش بھی کوکن کے سپوت ہیں۔ کوکن ہندوستان کے ایک صوبے مہاراشٹر کا علاقہ ہے جہاں  
ضلع رائے گڑھ کے علاقہ مال گاؤں اور مقام سائی ہے جہاں سے اس کے ایک سپوت نے ۱۰/ جنوری  
۱۹۳۶ء بروز جمعہ کو جنم لیا۔ والد علی میاں شمس الدین کھیر تکر نے بچے کے کان میں اذان دی اور دعا کی کہ  
اے مالک مطلق اس بچے کو اپنی خلق کی خدمت کا جذبہ عطا کرنا۔ دل سے نکلی ہوئی دعائے بارگاہ الہی میں  
قبولیت کا درجہ حاصل کیا۔ اور آج علی ایم شمش کو کوکن سے ممبئی تک ہر جگہ کے لوگ نہ صرف جانتے ہیں  
بلکہ اس سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتے ہیں۔ تنسیم انصاری بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ اور علی ایم شمش  
کے لئے کہتی ہیں۔

باہوش ہے عنوان نظر بانٹ رہا ہے  
برہتے ہوئے قدموں کا سفر بانٹ رہا ہے  
ہر رنگ میں جینے کا ہنر بانٹ رہا ہے  
آیا ہے کوئی شمس، سحر بانٹ رہا ہے

دیوانہ ہے طاؤس کے پر بانٹ رہا ہے  
چلتا ہے تو جاگ اٹھتے ہیں سوئے ہوئے رستے  
ہر حال میں ثابت قدمی اس کا وطیرہ  
دیکھو تو ذرا اپنی گپھاؤں سے نکل کر







زندگی میں سب سے محبوب عمل... وہ نفاست اور ڈسپلن کے بہت قائل ہیں۔ اپنی ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے شمشکی صاحب آدمی کو پہچان کر دل میں رکھنے اور پیسے کو پہچان کر جیب میں رکھنے کے قائل ہیں۔ ان کی ذات سے ان گنت لوگ مستفیض ہوتے ہیں مگر وقتی فائدہ اٹھانے والے بایوس ہوتے ہیں۔ وہ موڈ کو کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ موڈ ان کے وعدے اور ارادے پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکا۔ شمشکی کو تقریر کرنے پر کمال حاصل ہے۔ ان کے برجستہ جملوں اور شاعرانہ طرز بیان کو بہت سوں نے اپنی تقریر کا تمہیدی حصہ بنایا ہے اور میں بھی اس زلف کا اسیر ہوں۔ میں نے ایک شعر صرف اور صرف شمشکی صاحب کے لئے کہا ہے۔ یہ ایک شعر ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا ترجمان ہے۔

میں اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں لیکن کئی سورج مرے آگے بھی چلتے ہیں مرے پیچھے بھی آتے ہیں  
 علی ایم شمشکی سے میں نے پوچھا، ”آپ کو اپنے احباب میں کن شخصیات نے زیادہ متاثر کیا؟“  
 کہنے لگے، ”مشہور و معروف لوگوں کا ذکر کروں تو فہرست طویل ہو جائے گی۔ میرے چاہنے والے احباب نے مل کر میرا جشن منایا۔ یہ ان کی محبت کی سوغات ہے جو مجھے زندگی میں نصیب ہوئی۔ دوسری سوغات یہ کتاب ہے، اظہر من الشمس۔ اسے حسن چوگلے اور یعقوب راہی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں تینتالیس (۳۳) دوستوں کے مضامین ہیں، چوبیس (۲۴) احباب کے تاثرات ہیں، تین انٹرویوز ہیں۔ چودہ (۱۴) ساتھیوں کے منظوم خراج تحسین و محبت ہیں۔ ساتھ میں میرے لکھے ہوئے کئی افسانے، نظمیں، غزلیں، مضامین، پیش لفظ اور تاثرات ہیں۔ وہ تبصرے بھی شامل ہیں جو میں نے مختلف مواقع پر لکھے ہیں۔ فلمی ستاروں میں دلپ کمار، دھرمندر، راجندر کمار، امیتا بھ بچن، گلوکار غلام علی، نوشاد، مہدی حسن، ادیبوں میں ظ انصاری، عزیز قیسی، اختر الایمان، یوسف ناظم، رویندر جین اور کئی سیاست دانوں کے ہمراہ مختلف تقریبات کے مواقع پر لی گئی میری تصاویر ہیں۔ یہ کتاب میرے لئے میرے ساتھیوں کی جانب سے ایک ایسا اعزاز ہے کہ میرا سرمایہ حیات بن گئی ہے۔ میں کس کا ذکر کروں کہ کس نے میری زندگی پر کیا کیا اور کیسے کیسے نفوش ثبت کیے ہیں۔ لیکن خصوصی طور پر میں بیرسٹر عبدالرحمن انتولے کی سیاسی و سماجی حلقوں میں انقلابی و فلاحی نقطہ نظر سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ ساتھ ہی یوسف خان صاحب (دلپ کمار) کی عوام کے تئیں ان کے دل میں جو احترام و محبت ہے، وہ مجھے ہر وقت متاثر کرتا ہے۔ مولانا ضیاء الدین بخاری کی عوام میں ایک مذہبی شخص کی شناخت ہے۔ اسحاق جم خانہ والا فی الوقت مسلم معاشرے کی تعلیمی ترقی کے لئے سرگرم ہیں۔ ان کی سربراہی میں انجمن اسلام، جو ہندوستان میں دوسرا اہم تعلیمی ادارہ ہے، ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ان شخصیات سے میں نے رہنمائی حاصل کی ہے۔ ہمارے پیغمبر اعظمؐ نے بھی انسانی خدمت کے لئے زندگی وقف کی تھی۔ ان کی اقتداء ہم سب پر لازم ہے۔ سماجی خدمت کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے محنت اور استقلال کی ضرورت ہے۔“

ادیبوں کی گروہ بندی اور اردو کے مستقبل کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے



شمسی صاحب نے کہا، ”گروہ بندی و راصل مصیبت اور انتشار کا باعث بنتی ہے اور ظاہر ہے اس سے نفع نہیں نقصان ہی ہوتا ہے۔ میری رائے میں اردو کا مستقبل اس لئے تاریک ہے کہ اردو پر رونے والے بہت ہیں پر مرنے والے نایاب ہیں۔ بھارت میں فرقہ واریت نے اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر محبوس کر دیا ہے اور پاکستان میں علاقہ واریت کے اثرات نے نقصان پہنچایا ہے۔ جب تک روزی روٹی سے زبان کا تعلق قائم ہے زبان زندہ ہے ورنہ اس کا زندہ رہنا آسان نہ ہوگا۔ اب یہی رسم الخط کی بات تو رسم الخط بدلنا ولدیت بدلنے کے مترادف ہے۔ میں اس تبدیلی کا مخالف ہوں۔ صدیوں سے جو زبان اپنے رسم الخط سے پہچانی جا رہی ہے اس کا رسم الخط بدلنے کی بات محض سیاسی اغراض اور ذاتی عناد کا نتیجہ ہے۔“

شمسی صاحب اول دور میں نیاز فتح پوری، شبلی نعمانی اور بعد میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سردار جعفری اور ابوالحسن ندوی کی تحریروں سے متاثر رہے۔

اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا، ”میں آج ایک ادنیٰ مقرر ہوں اور آج یہ میری شناخت بھی ہے۔ تاہم پچیس (۲۵) برس کی عمر تک تقریر کرنا میرے لئے ناممکن بات تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ایک اہم اختلافی مسئلہ پر ممبئی میں جلسہ تھا۔ میں نے طے کر لیا جو بھی ہو اس جلسے میں اپنی بات اور نقطہ نظر پیش کروں گا۔ تقریر میں نے لکھ لی اور پھر پانچ منٹ کی تقریر کے وقت میں پسینے میں شرابور تھا۔ پورا بدن جیسے ہکلی کے تاروں میں لپٹا ہوا۔ ہاتھ کا کاغذ ابھی گرا تبھی گرا۔ میں نے کیسے پڑھ لی وہ تقریر کچھ پتا نہیں۔ لیکن عجیب بات ہوئی، کچھ لوگوں نے کہہ دیا کہ بات میں وزن ہے۔ اور پھر یہی حوصلہ افزائی میرے اگلے سفر کے لئے زادِ راہ بنی۔“

علی ایم شمسی نے جناب شفیق موڈک کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا جنہوں نے شمسی صاحب کا مجھ سے تعارف کرایا تھا۔ انہوں نے کہا، ”جناب شفیق موڈک میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ادیب نہیں ہیں، شاعر نہیں ہیں لیکن ایک شاعر جیسا حساس اور نازک دل اور احساسات رکھتے ہیں۔ ان کو مطالعے کا بے حد شوق ہے۔ خدمتِ خلق کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ نے انہیں ایک درد مند دل بھی دیا ہے اور عمدہ اخلاق سے بھی نوازا ہے۔ انڈونیشیا میں تجارت کرتے ہیں۔ سال کا بیشتر حصہ وہیں گزارتے ہیں۔ لیکن جب بھی چھٹی لے کر ممبئی آتے ہیں، اپنے وطن کو کن جاتے ہیں۔ اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں جہاں ضرورت دیکھی مسجد بنواتے ہیں اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں۔ وہ شاعر اور ادیبوں کے قدروان ہیں ان جیسا دوست میرے حلقے میں ہے مجھے اس پر ناز ہے۔“

Mr. Ali M Shamsi,

Kunj-e-Aafiyat, Atomica Co-op. Hsg. Soc. Ltd., Plot

No.209, Sector 17, Nerul, Navi Mumbai. 400 706, India





ہر سحر چہرہ بیمار کی خمی سرخی  
کہا گئی ہے مجھے بیمار کی خمی سرخی  
اسی دیوار کا اعلان ہے میرا خمی  
اور میں بھی دیوار کی خمی سرخی

ف  
1/8/2002

## ف۔س۔ اعجاز

حکمت، ہندوستان

اگر آپ اردو زبان سے واقف ہیں تو آپ نے اس صاحب طرز ادیب، نثر، شاعر اور  
جرائد مند صحافی کو بھی ضرور پڑھا ہوگا جس کا نام ف۔س۔ اعجاز ہے۔ ف۔س۔ بھی ایک کلیشہ ہے۔  
جیسے افسانہ نگار، گیت کار اور فلم ساز و ہدایت کار ”گلزار“ کا نام ایک کلیشہ ہے۔ ف۔س۔ کو آپ فتح محمد  
سالک، فتیاب سرمد، یا فاضل سعیدی، کوئی سا بھی نام دے لیں اور کہہ دیں کہ نام میں کیا رکھا ہے بابا۔  
کام دیکھیں... مگر میں کہتی ہوں نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔

اب ف۔س۔ کے ”اعجاز“ کو ہی دیکھ لیں کہ انھوں نے عام انداز میں غزلیہ شاعری کے  
بجائے بڑی معرکہ آرا نظمیں کہی ہیں۔ ۱۱ مئی ۹۸ء کے دن پوکھران میں ہندوستان کے تین نیوکلیر  
دھماکوں کے بعد ف۔س۔ اعجاز نے ایک نظم کہی۔ ”مہاتما بدھ کی مسکراہٹ“... اس میں اس نے بڑی  
فکرائی بات کہی۔

اٹھا کے جب ہاتھ اپنے بھارت کا کوئی بچہ  
ادھر بھی پھینکو  
کہ اس سے کہہ دیں  
کہے کہ روٹی کا ایک ٹکڑا  
تو ہم نے اپنی نجات کی راہ یہ نکالی  
وہ روٹیوں کی کسی بھی خواہش کو ترک کر دے



اور ایک گولی جو ہم اسے دیں وہ میں منہ میں رکھ لے

زمین کے پہلو میں لیٹ جائے

ایسی ہی ان کی ایک اور نظم میں نے پڑھی۔ ”اسامہ! مصلحت سمجھو۔“

اس فکر اور طرز کی کئی نظمیں ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی نثری و شعری تصانیف میں ”تنہائیاں“، (غزلیں/نظمیں)، مالک یوم الدین (نظمیں)، موسم بدل رہا ہے (غزلیں)، لاشریک (نظمیں)، یورپ کا سفر نامہ، خوابوں کے اسرار، صاحبِ فن (نظمیں)، اسلامی تصوف اور صوفی، ادب میں خواب کے اجزاء، نیتاجی سبھاش چندربوس، ماسکو، ناروے، ڈنمارک، لندن، پیرس کا سفر نامہ اور ازدواجی سکھ۔

اعجاز شاعر بھی ہیں ادیب بھی مترجم بھی اور صحافی بھی۔ چنانچہ ان سے ادب کے ساتھ ساتھ صحافت پر بھی بڑی فکر انگیز اور حاصل معاملات گفتگورہی۔

۲ مئی ۱۹۴۸ء ف۔س۔ اعجاز کا یوم پیدائش اور دہلی جائے پیدائش ہے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے لال کنواں اسکول اور فتح پوری اسکول سے حاصل کی۔ پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول کلکتہ سے ۱۹۶۳ء میں میٹرک کی سند لی۔ ۱۹۶۹ء میں سینٹ زیورس کالج کلکتہ سے بی اے تک ڈہرے امتیاز کے ساتھ مکمل کی۔ کلکتہ یونیورسٹی میں وکالت کے تین سال مکمل کرتے کرتے ارادہ بدل لیا اور صحافت کے کوچہ دلبراں کی خاک چھاننے نکل کھڑے ہوئے۔ انگریزی اُردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور نثر لکھنے کا ہنر بھی جانتے تھے لہذا صحافت کے خارزار میں آبلہ پا ہونے میں سرفرازی جانی۔

اپنے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے ف۔س اعجاز کہنے لگے، ”صحافت سے میری وابستگی کا پہلا دور ۶۵-۱۹۶۳ء سے شروع ہوا۔ جب میں نے اپنے برادر محترم کے ساتھ کلکتہ سے ہندوستان کا اولین اُردو ڈائجسٹ نکالا جس کا نام ”فانوس ڈائجسٹ“ تھا۔ کسی محقق نے اعلیٰ کی بناء پر اولین ہندوستان اُردو ڈائجسٹ کا سہرا کسی اور رسالے کے سر باندھ دیا ہے لیکن دراصل ملک کا پہلا اُردو ڈائجسٹ اور بنگال کا اولین فوٹو آفسٹ رسالہ اخبار ”فانوس ڈائجسٹ“ ہی تھا۔ چند شماروں کے بعد وہ بلاک اور پھر لیتھو سے چھپا۔ اس کے کل ۱۳ شمارے نکلے پھر وہ بند ہو گیا۔ اس کا پورا ادب دیکھنے کے علاوہ انگریزی سے ڈائجسٹ کے مزاج کے مضامین اکٹھا کرنا، ان کا ترجمہ کروانا اور خود ترجمہ کرنا یہ میرا کام تھا۔ پھر رسالہ ڈیپٹیج کرنا، ادبا اور اخبار فروشوں سے خط و کتابت کرنا، اشتہارات کے لیے تگ و دو کرنا یہ ساری ذمہ داریاں بھی شروع سے اپنے سر لے رکھی تھیں۔ رسالے میں میرا نام بحیثیت فیجنگ ایڈیٹر چھپتا تھا۔ ان دنوں میں سینٹ زیورس کالج میں پری یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ صحافت کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہم ایک وادی پُر خار میں قدم رکھ رہے ہیں۔ بس علم و ادب کا شوق تھا جس نے اس راہ پر لگا دیا۔

رسالہ بند ہونے کے بعد فلمی صحافت میں اچھی خاصی دلچسپی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم کے فلمی ہفت



روزہ ”عکاس“ سے وابستگی ہو گئی۔ تقریباً ایک سال اس کا ”مدیر بے قلمدان“ رہا۔ پھر اقبال اکرامی صاحب نے ایک مزاحیہ ہفتہ وار ”مابدولت“ جاری کیا۔ چند مہینوں اس سے بھی ”وابستگی“ رہے۔

اس کے بعد زندگی میں ایسی تبدیلیاں آئیں کہ سر سے صحافت کا بھوت ہی اتر گیا۔ لکھنا پڑھنا بہر حال جاری رہا۔ کبھی کبھی افسانے رسالوں میں چھپ جاتے تھے۔ پھر شاعری نے زور مارا۔ شاعر کے طور پر لوگوں نے مجھے پہچاننا شروع کر دیا اور دو شعری مجموعے بھی چھپ گئے تو ۸۶ء سے ”ماہنامہ انشاء“ نکالنا شروع کیا۔ اس بار ایسا لگتا تھا کہ اپنے صحیح ترین اظہار اور صحافت کو کچھ اپنے پسندیدہ رنگ دینے کے لیے اور کلکتہ کی سرزمین جو ادبی صحافت کے لیے سنگلاخ مشہور تھی اسے زرخیز بنانے کے لیے اس میں ہل چلانے کی ضرورت ہے۔ مصمم ارادے سے انشاء جاری کیا جواب تک جاری ہے اور ۷۷ سال تک پابندی سے شائع ہو کر کلکتہ کی ادبی صحافت میں ایک بے مثال ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔

اب جب صحافت کے حوالے سے بات چل نکلی تھی تو میں نے پوچھا ”آپ اپنے پیشرو صحافیوں سے کس طرح متاثر رہے اور کیا خود آپ نے عملی صحافت میں کسی تبدیلی میں حصہ لیا؟“

اعجاز نے خاصی تفصیل سے جواب دیا ”کسی پیشرو صحافی کے ساتھ کام کرنے کی سعادت تو نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ دہلی کے کئی رسائل اور دو تین اخبارات کے دفاتر میں کبھی کبھی میرا جانا ہوتا تھا۔ جیسے شمع، بیسویں صدی، روپی، نئی دنیا (مدیر مولانا عبدالوحید صدیقی)، دعوت، تحریک وغیرہ۔ ان کے مدیران سے کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع ملتا تھا۔ صحافت میں ان کبھی کا اپنا اپنا کنٹری بیوشن ہے۔ مجموعی طور پر نیاز فتح پوری، یوسف دہلوی، ظ انصاری، میاں محمد طفیل کو میں چند بہترین، ادبی صحافیوں میں شمار کرتا ہوں۔ جہاں تک عملی صحافت میں کسی تبدیلی میں حصہ داری کا سوال ہے تو اس بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں جس شہر میں مشغول صحافت ہوں وہ اردو صحافت کا قائد اور باجگزار ہونے کے باوجود اردو کا مرکز نشر و اشاعت کبھی نہیں رہا۔ اس لیے اخباری صحافت میں عملی تبدیلی کی ہوا میں یہاں سے نہیں چلتی۔

حالیہ برسوں میں دہلی، ممبئی اور حیدرآباد میں رونما ہوئی تکنیکی تبدیلیوں نے معمولی طور پر کلکتہ کے ایک دو اردو اخبارات کے ناشرین کو ابھی ابھی متاثر کرنا شروع کیا ہے لیکن مشرقی ہندوستان میں انشاء نے اب سے بہت پہلے اردو صحافت کو کمپیوٹرائزڈ کر دیا تھا۔ تبدیلی کے سائنسی اور تکنیکی عمل میں انشاء اپنے محدود وسائل کے باوجود پیش پیش رہا ہے۔

عملی صحافت میں تبدیلی کا ایک شعوری پہلو بھی ہے وہ ہے رجحان سازی اور نئے عصری، علمی، ادبی، سماجی اور فنی تقاضوں کی تکمیل کا۔ میں نے انشاء کی شروعات سے ادبی صحافت کے ذریعے اردو کی GLOBALISATION پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ یہ بات کم اہم نہیں ہے۔ اسی کی بدولت آج کلکتہ کی نہ صرف ادبی صحافت کی شناخت قائم ہوئی ہے بلکہ بیرون ملک بہت سے اہل ادب کلکتہ کو صرف ”انشاء“ کی وجہ سے ہی جانتے ہیں۔ دوسری طرف تارکین وطن کے اردو ادب حتیٰ کہ بعض مغربی ممالک کے مقامی (اصل) ادب سے انشاء کے ذریعے ہندوستان کے لوگ متعارف ہو پائے ہیں۔ مثلاً انشاء کا



”اسکند - نیویائی ادب نمبر ۱۱“ بخش لائل پوری نمبر ۱۱“ انور شیخ نمبر ۱۱“ اور ”ادب و تناسخ افکار نمبر ۱۱“ ملاحظہ فرمائیں۔ آج تارکین وطن کے ادبی رجحانات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں میں منجری ادب پر تحقیقی کام ہو رہے ہیں لیکن اب سے تیرہ چودہ سال قبل انڈیا میں انشاء اور صرف دو ایک رسالے ہی مختلف ممالک میں بے بند وستانی یا پاکستانی ادبا کی کسی قدر نمائندگی کرتے تھے۔ شروع میں مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ تم بیرونی ادیبوں کی چیزیں زیادہ چھاپتے ہو اس لیے ہم دلیکی شعراء ادبا کی ”انشاء“ میں دلچسپی لینے کا کیا جواز ہے؟ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ بیرونی ادیبوں کو ہندوستان میں قارئین فراہم کر کے ہم نے ادبی صحافت کی نئی صورت گری کی ہے۔“

کچھ دیر کے سکوت کے بعد انھوں نے بتایا ”عملی صحافت میں، میں نے ایک اور رجحان کی پرورش کی ہے۔ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، اردو صحافت مردہ پرستی کی رسم میں بری طرح مبتلا تھی۔ جب تک کوئی ادیب یا صحافی مر نہ جاتا اس کے گن نہیں گائے جاسکتے تھے۔ میں نے زندہ ادیبوں اور شاعروں کی حسب توفیق قدر افزائی کی اور جیتے جی پکی روشنائی سے ان کے اعتراف میں اوراق انشاء کی گلکاری کی۔ ۸۷ء میں مدیر روزنامہ آزاد ہند (کلکتہ) جناب احمد سعید علی آبادی کی خدمات کے اعتراف میں ایک خاص نمبر شائع کیا۔ بعد میں ۴ دسمبر ۹۲ء کو بابر مسجد کے انہدام کے بعد انہی کے لکھے ہوئے ان کے اخبار کے ۱۴۲ اداروں کے مخصوص میں بابر مسجد نمبر ۹۳ء میں شائع کیا تاکہ ملک و ملت میں تعمیری اور صحت مند نظریے کی تشکیل ہو۔ عموماً ادبی رسائل کو صحافت سے گہرا معنوی لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ کتاب اور نصاب کے دائرے میں چلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے طور سے صحافت میں ادب اور ادب میں صحافت کو سمونے کی شعوری کوششیں بھی کی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے لکھنے پڑھنے والوں کا بھلا ہوگا (اور ہوا بھی ہے)۔ صحافت بہت با اثر ہتھیار ہے، بڑا آلہ کار ہے۔

زندوں میں انشاء سے اردو کے معروف ترقی پسند نقاد، ادیب و شاعر قمر رئیس، نثار احمد فاروقی، برطانیہ کے ترقی پسند شاعر بخش لائل پوری اور انور شیخ کے یادگار نمبر شائع کئے۔ متعدد ادیبوں اور شاعروں پر گوشتے چھاپے اور یہ کام انشاء نے دیگر رسائل سے زیادہ اہتمام سے انجام دیا ہے۔ مردہ پرستی کی رسم سے اردو صحافت کو آزاد کرانا بھی میری نظر میں عملی صحافت میں تبدیلی کی ایک خاص مہم ہے۔ لوگ معلوم کر سکتے ہیں کہ آج بھی ہمارے ملک میں ایسے اردو سرکاری اور نجی جریدے ہیں جن کی پالیسی ہے کہ وہ صرف کسی ادیب کے مرنے کے بعد اس کے متعلق مضامین چھاپیں گے یا اگر کوئی خوش نصیب قلمکار ۸۰ سال کا ہو جائے تب چھاپیں گے۔“

”اپنے صحافتی دور میں کن ناسازگار حالات سے آپ کو واسطہ پڑا۔ آپ نے ان کا کس طرح مقابلہ کیا، کوئی واقعہ کوئی اہم بات، کوئی ملاقات کا تاثر ضرور بیان کیجئے۔“

اعجاز نے سوچ کر کہا ”فوری طور پر کوئی واقعہ یا کسی سے اچھی بری ملاقات کا تاثر تو یاد نہیں آ رہا ہے۔ رہی بات حالات کی تو وہ کبھی سازگار نہیں رہے۔ اب پہلے سے زیادہ ناسازگار ہیں۔ اس لیے



۹۸۔ میں رسالے کو دوبارہ پڑھا۔ اس کے بعد حالات پر کافی حد تک عبور پالیا۔ بڑی بات یہ ہے کہ رسالہ پابندی سے شائع کیا جاتا ہے اور اردو رسائل کی روش کے برخلاف ناسازگار حالات کا رونا نمونا رسالے کے صفحات میں نہیں رویا جاتا۔ بہر حال کام کرنے والے کو مشکلات کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“

اپنے پسندیدہ اخبارات و جرائد کے بارے میں انھوں نے کہا ”پسندیدہ اردو اخبارات میں جو اس وقت جاری ہیں حیدر آباد کا سیاست، ممبئی کا انقلاب، دہلی کا راشٹریہ سہارا، پنجاب کا ہندو سچا، ہفت روزہ اخبارات دو چار کے سوا سب بے اثر اور قوم کو گمراہ کرنے والے نظر آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے جذبات کو اپنی سنسنی خیز سرخیوں اور دیگر باتوں سے بھڑکاتے ہیں۔ غیر ملکی اردو اخبارات نظر سے نہیں گزرتے۔ رسائل میں دہلی کے ماہنامے شمع کی کمی کھٹکتی ہے۔ کئی ویسی اور بد ویسی رسائل اپنی اپنی خصوصیت کی بناء پر پسند آتے ہیں۔ لیکن پرنٹ میڈیا میں انگریزی، بنگالی، ہندی اور دیگر مقامی زبانوں میں جو طاقت ہے اس کا عشر عشر بھی اردو میں نہیں دکھائی دیتا۔ (دو چار اخباروں کی بات اور ہے) مجموعی طور پر ذرائع ابلاغ میں آج کی وی کا میڈیا سب سے زیادہ مؤثر ہے۔“

میں نے ان سے پوچھا۔ ”میری رائے میں اخبارات ایک معلم کا کردار ادا کرتے ہیں کیا آپ کے علم میں اس حوالے سے کوئی واقعہ ہے؟“

انھوں نے کہا ”بے شک اخبارات لوگوں کا کردار بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور وہ شہریوں کو ان کی سماجی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر معاشرے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ نیک نام اخبارات کی اپیل پر کسی سماجی مصیبت یا قدرتی آفت کے موقع پر لوگ رضا کارانہ مدد دے کر سامنے آتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ایک واقعہ بیان کرنے سے کیا ہوگا۔ کار خیر سے انسان متاثر ہوتے ہی ہیں یہ سب جانتے ہیں اور قلم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے یہ میں بھی مانتا ہوں۔“

انگریزی اور اردو زبان کی صحافت میں کیا کوئی نمایاں فرق ہے؟

انھوں نے کہا ”بڑا فرق ہے دونوں میں۔ کم سے کم ہندوستان میں تو Concept سے لے کر پروڈکشن اور Application تک مرحلہ وار فرق پایا جاتا ہے۔ سرمایہ اور وسائل، صلاحیت اور استعداد، پیشہ وارانہ بنیادوں کا فرق ہے۔ اولوالعزمی اور آگہی کا فرق ہے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ عام طور پر تو جھکڑے اور ہوائی جہاز کا فرق ہے۔ دو چار اردو اخباروں کی حالت اچھی دیکھ کر کوئی واضح رائے نہیں دی جاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عام اردو صحافت عظمت اور اثر کو ترس رہی ہے۔ انگریزی صحافت اس وقت فرد اور معاشرے کو زیادہ متاثر کر رہی ہے اور دونوں کے روابط کو زیادہ مستحکم، زیادہ قابل انحصار بناتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انگریزی عالمی رابطے کی زیادہ بڑی زبان ہے۔ اس لیے باخبری اور آگہی کے اُتار میں بھی یہ بہت آگے ہے۔ دیگر صنعتوں کی طرح انگریزی صحافت میں بھی محنت کی تقسیم (Division of Labour) کا چلن عام ہے جس سے پیشہ وارانہ مقاصد کی تکمیل سائنسی پیمانے پر ممکن ہے۔“



اگلا سوال تھا۔ ”کیا ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی خاص نظریے سے وابستہ رہے اور کیا نظریے کے بغیر ادب کی تخلیق سودمند ہوتی ہے؟“

اعجاز نے کہا، ”ضروری نہیں کہ ادیب کسی خاص نظریے کا پابند ہو۔ نیز جب تک ایک نظریہ سماج میں رائج رہتا ہے اس وقت تک اس نظریے کے تحت لکھا گیا ادب بھی اپنی افادیت ثابت کرتا رہتا ہے اور اس کی پذیرائی ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں بندھی ٹکی ”نظریہ بندی“ سے الگ ہر باشعور ادیب غیر شعوری طور پر بھی اپنے ادب کے ذریعے اس فطری نظریے کی پرورش اور پیروی کرتا ہے جس کے تحت انسانیت ایک مستقل قدر قرار پاتی ہے۔“

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ کیا ہندو پاک کے افسانوی ادب اور ناولوں میں کوئی مطابقت پائی جاتی ہے؟

انہوں نے کہا ”دونوں ملکوں کے افسانوی ادب میں تہذیب و ثقافت کی کئی اکائیاں مشترک ہیں۔ یہ مطابقت کی ظاہری شکل ہے۔ اسے مماثلت کہنا چاہیے، مطابقت نہیں۔ فکشن میں ”زندگی سے مطابقت“ کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ حالات کی عدم موافقت زیادہ بڑا رول انجام دیتی ہے اور اس عدم موافقت کی شکلیں دونوں ملکوں کے افسانوں میں متغیر اور برعکس بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔“

میرا آخری سوال تھا۔ ”ادب میں نئے موسم تخلیق کرنے میں ہندو پاک کے جرائد کیا کردار ادا کر رہے ہیں اور کون سے جرائد نے ادبی رجحانات کے حامل ہیں؟“

اعجاز کہنے لگے، ”سبھی جرائد میری نظر سے نہیں گزرتے۔ مگر یہ سچ ہے کہ بابصیرت رسائل کرشماتی طور پر نئے ادبی رجحانات کی پرورش کرتے ہوئے ادب کے پرانے موسموں کو بدل دیتے ہیں لیکن یہ کام بھی ”معمولاً“ ہی انجام پاتا ہے۔ اس لیے میں اپنے رسالے ”انشاء“ کے بارے میں کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

ف۔س۔ اعجاز کی فنی خدمات کے اعتراف میں ہندوستان میں کال گاؤں امراؤتی مہاراشٹرا کے سید یحییٰ فشیٹ نے تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ایک غیر جامعاتی مقالہ تیار کیا ہے جس کا عنوان ہے ”صاحب فن، ف۔س۔ اعجاز“ یہ مقالہ طباعت کے مراحل میں ہے۔

F.S.Ejaz

Editor "Insha Magazine"

25, Zakria Street

KOLKATA, 700073

INDIA.



جو جڑوں کو دائرہ ڈالنا ہے، ایک دن رہنا بھی اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ (فرید الدین مسعود گنج شکر)



فیروز الدین احمد فریدی

۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء

۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء

بدھ، کراچی

## فیروز الدین احمد فریدی

کراچی، پاکستان

کسی بھی انسان کو جاننے اور اس سے شناسائی یا واقفیت کا پیمانہ کیا ہے؟ میری رائے میں اس سے کی گئی گفتگو یا اس کی لکھی ہوئی تحریر پڑھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ انسان کن خصوصیات کا حامل ہے۔

جناب فیروز الدین احمد فریدی صاحب سے میں ملی نہیں لیکن ان کے مضامین پڑھے اور اندازہ لگایا کہ ان کی شخصیت ایک اچھے انسان کی خصوصیات سے مالا مال ہے۔ اور ایسے انسان سے کوئی بھی ملے یا اس کی کوئی تحریر بھی پڑھے تو وہ اپنے دامن میں چند نیکیاں اور کچھ اچھائیاں سمیٹ کر اٹھے گا۔ اس موقع پر مجھے خواجہ نظام الدین اولیاء کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ واقعہ میں نے ماہنامہ ”دلی“ (شمارہ اگست ۲۰۰۲ء) میں پڑھا تھا۔ اور یہ واقعہ ایک دلکش اور اثر انگیز رہنما ہے کہ اسے ہمیشہ ذہن میں (ساتھ) رکھنا چاہیے۔ واقعہ یوں ہے:

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا کوئی مرید ایک دفعہ اپنے کسی ہندو دوست کو ان کی خدمت میں لے آیا۔ حضرت نے اپنے مرید سے پوچھا کہ تم نے اپنے دوست کو اسلام کے بارے میں بھی کچھ بتایا۔ وہ بولا، بہت بتایا مگر یہ کچھ متاثر نہیں ہوا۔ حضرت آب دیدہ ہو گئے اور فرمایا، میاں وعظ اور تقریر



سے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی اچھے اور سچے مسلمان کو دکھاتے تو پھر اثر ہوتا۔“

یہ اچھا اور سچا مسلمان دکھانے اور بنانے کی ہی بات تھی جو حضرت نظام الدین اولیا ساری زندگی کرتے رہے۔

فیروز الدین احمد فریدی بھی یہ ہی کام اپنی تحریروں کے ذریعے کر رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک چار کتابیں لکھی ہیں اور بے شمار مضامین۔ اردو اور انگریزی زبانوں، دونوں میں لکھتے ہیں۔ مضامین کے علاوہ کالم نگاری بھی کرتے ہیں۔ اردو میں شائع شدہ ان کی تین کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) ”اوراق پریشاں“ طباعت اول ۱۹۹۳ء، طباعت دوم ۱۹۹۴ء، طباعت سوم ۱۹۹۵ء۔ محکمہ بلدیات سندھ نے اس کتاب کو تمام میونسپل کارپوریشنوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کیا اور پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں نے اپنے تمام کالجوں، اسکولوں اور اداروں کی لائبریریوں کے لئے منظور کیا۔

(۲) ”فرید الدین مسعود گنج شکر کی ایک جھلک“ اس کتاب کی ۱۹۹۵ء، ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸ء اور ۲۰۰۰ء میں بالترتیب پانچ اشاعتیں ہو چکی ہیں۔

(۳) ”رہے نام اللہ کا“

انگریزی زبان میں ان کے مضامین کا مجموعہ ”Adventure in Self Expression“ پہلی بار ۱۹۹۳ء میں اور دوسری بار ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

”فرید الدین مسعود گنج شکر“ کے سال وصال کی تحقیق“ کے موضوع پر تحقیقی مضمون کی تین قسطیں پہلے دسمبر ۲۰۰۱ء میں، پھر جنوری اور مارچ ۲۰۰۲ء کے ماہنامہ ”المعارف“ اعظم گڑھ، ہندوستان میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور اب یہ تحقیق ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں انشا اللہ العزیز سال رواں میں شائع ہو جائے گی۔

فیروز الدین احمد بنیادی طور پر سول سروس آفیسر تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں دہلی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جامعہ کراچی سے بی کام، ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا اور قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد سے ایم ایس سی کیا۔ ۱۹۶۲ء میں سول سروس میں آئے۔ مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ تقریباً چالیس برس سے ان کے مختلف مضامین اردو اور انگریزی میں شائع ہو رہے ہیں۔

ان کا اسلوب سادہ اور دل نشین ہے۔ اور تجربات و واقعات پر مبنی ان کی تحریریں قاری کی دل چسپی کو برقرار رکھتی ہیں۔

”گفتنی“ حصہ دوم کے لئے کیے گئے سوالوں کے جواب میں انہوں نے بتایا ان کی ادبی زندگی کی ابتدا، اردو میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی جب ماہنامہ ”نفاذ“ کراچی میں ان کا افسانہ چھپا۔ انگریزی میں آغاز کوئی دس سال بعد ۱۹۶۲ء میں ہوا جب پاکستان ٹائمز، لاہور میں ان کا مضمون سنڈے میگزین میں چھپا۔



اگلے سوال کا جواب یوں ہے۔ ”اردو ادب کو اپنا کر خسارہ نہیں ہوا۔ فائدہ ہوا جو صرف مالی نہ تھا۔ اصل نفع وہ تھا جو مالی نہ تھا۔ میں کسی نظریے کے تحت نہیں بلکہ ہرک کی وجہ سے لکھتا ہوں۔ یہ ہرک بعض اوقات ایسی مجبوری بن جاتی ہے جیسی مرغی کو انڈا دیتے وقت ہوتی ہے۔“

میں نے پوچھا تھا کہ کیا ہندو پاک کے جراند نے ادب کے نئے موسم تخلیق کیے؟ انہوں نے بتایا۔۔۔۔۔ ”جون ۱۹۹۶ء کو بی بی سی اردو سروس میں مجھ سے اسی نوعیت کا سوال کیا گیا تھا۔ میرا جواب آج بھی وہی ہے جو سات آٹھ برس پہلے تھا۔ جون ۱۹۹۶ء کو میں نے کہا تھا کہ آج کی نثر میں مجھے وہ جان نظر نہیں آتی جو چالیس برس پہلے کی نثر میں تھی۔ اب سعادت حسن منٹو کی تیکھی تحریر نظر آتی ہے نہ (مشتاق احمد یوسفی کو چھوڑ کر) پطرس جیسی شگفتگی اور بے ساختگی، نہ ابوالکلام آزاد کی پُر شکوہ تحریر نظر آتی ہے نہ وہ سادگی جس کے لئے مولوی عبدالحق نے کہا تھا، آسان نثر لکھنا سب سے مشکل کام ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم آج نثر کے ایک ایسے دور میں ہیں جس کا ماضی بہت شان دار تھا اور جس کا مستقبل اللہ نے چاہا تو بہت تابناک ہوگا لیکن جس کا حال اپنے مستقبل کے لئے میدان تیار کر رہا ہے۔“

اردو رسم الخط کے سلسلے میں کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ”اردو کا رسم الخط بنیادی طور پر قرآن کا رسم الخط ہے۔ اس بین حقیقت کے بعد کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔“

فیروز الدین احمد فریدی جن ادیبوں سے متاثر ہوئے ہیں ان کے نام ہیں:  
اردو میں: پطرس، ممتاز مفتی، سعادت حسن منٹو، مشتاق احمد یوسفی، مولوی عبدالحق  
یورپی زبانوں میں: سمرسٹ ماہم، ٹالسٹائی، میکالے، موپساں اور چرچل۔  
ان کی زندگی میں ایک دو نہیں کئے واقعات اہم ہیں جو ان کی کتاب ”اوراق پریشاں“ اور انگریزی کتاب ”Adventure in Self Expression“ میں شامل ہیں۔ ایک واقعہ، باوجود اس کی طوالت کے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں کیوں کہ یہ نہ صرف دل چسپ بلکہ اہم اور سبق آموز بھی ہے، جو مئی ۱۹۹۷ء کے ”اردو ڈائجسٹ“ میں بعنوان ”دعوت دلی جانے کی“..... ایک واقعہ ایک تاثر“ شائع ہوا تھا اور ان کے مجموعہ مضامین ”اوراق پریشاں“ میں شامل ہے۔

Mr. Firoz-ud-din Ahmed Faridi,

Khatwal House, 54-A, Street No. :15, Bath Island, Karachi,

75530, Pakistan

## دعوت دلی جانے کی..... ایک واقعہ ایک تاثر

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا مگر ان ہونی کو ہونی میں بدلنے والی ذات پر میرا اعتماد



عجب رنگ دکھاتا ہے۔

بات کوئی نصف صدی قبل کی ہے، غالباً مارچ ۱۹۵۰ء کی۔ میں ضلع ملتان کے ایک گم نام قصبے ”کبیر والا“ ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے ایک پرانی وضع کے ہائی اسکول میں آنکھیں جماعت کا طالب علم تھا۔ کلاس شروع ہونے پہلے ”ہر صبح“ سب طلبہ دعا کے لئے اسکول کے گراؤنڈ میں جمع کیئے جاتے جہاں دعا کے بعد ہینڈ ماسٹر صاحب، جنہیں شعر گوئی کا بھی ذوق تھا، کبھی کبھار ہمیں اپنے خیالات یا کلام سے نوازتے۔ ایک صبح انہوں نے اپنی گونجتی آواز میں بارہ الفاظ پر مشتمل اپنا یہ شعر سنایا۔

خدا اعتمادی و خود اعتمادی سبق دو پڑھاتا ہے بطحا کا ہادی

مارچ کی اس ابراہیم صبح کو سینکڑوں طلبہ اسکول گراؤنڈ میں حاضر تھے۔ ان میں سے نہ جانے کتنوں کو یہ شعر کتنا اور کتنے دنوں یاد رہا ہوگا۔ مگر تقریباً نصف صدی ہونے کو آئی اس شعر کا ہر حرف میرے دل اور دماغ پر ایسا مثبت ہے جیسے اللہ اور محمد کا نام پوری کائنات پر نقش ہے۔ کبیر والا سے میٹرک کرنے کے بعد میں پنجاب، کراچی، اسلام آباد اور برطانوی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا۔ سال بھر امریکہ کی مشہور عالم ہارورڈ یونیورسٹی کا طالب علم بھی رہا لیکن وہ دو سبق جو اس خشک صبح ملتان کے ایک گم نام قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھائے اور یاد کرائے گئے وہ میری زندگی کے بہترین سبق بلکہ عمر بھر کی متاع ہیں۔ اس حیات مستعار کے لمبے اور کٹھن سفر میں یہ سبق مشفق رہبر کی طرح روشن قندیلیں اٹھائے میرے آگے آگے چلتے رہے۔ میں ہر قدم پر لڑکھڑاتا رہا اور یہ مجھے سہارا دیتے رہے۔ میں ہر موز پر بھکتا رہا اور یہ مجھے صحیح راستہ دکھاتے رہے۔ جب میں اندھے کی طرح ہر گڑھے میں گرنے والا ہوتا تو یہ میری بند آنکھوں کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا کرتے۔ خدا پر اعتماد خدا کے گناہ گار ترین بندے کو بھی وہ خود اعتمادی عطا کرتا ہے جس کی قوت کا احاطہ انسان کا تخیل نہیں کر سکتا اور جس کا اظہار الفاظ میں اور جس کا ذکر زبان سے اور شکر الفاظ و اعمال سے ممکن نہیں۔ اس قوت کے ایک جمالی پہلو اور جلالی عکس کو قدسی مقال اقبال نے، جن کے بعض اشعار نصف پیسہری سے ہرگز کم نہیں، اپنی مایہ ناز تصنیف ”بال جبریل“ کے ایک الہامی شعر میں یوں آشکار کیا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر، اُٹھتے ہیں حجاب آخر  
داناے راز نے دو مصرعوں اور سادہ سے لفظوں میں پورا راز آشکار کر دیا ہے۔ غور کیجئے کہ جواب کہاں سے براہ راست چلے آ رہے ہیں؟ حجاب کس کے اٹھائے جا رہے ہیں؟ اور خطاب کرنے والا کون ہے؟ شرط صرف یہ ہے کہ سوال کرنے والے کے نالے دل سے بلند ہو رہے ہوں۔ یہ ہی وہ کیفیت ہے جسے فرید الدین مسعود شکر گنجؒ نے سوز اور درد سے تعبیر کیا ہے۔ پاک چین کا یہ شہنشاہ کسی سے بہت خوش ہوتا تو اپنے شکر جیسے بیٹھے لہجے میں دعا دیتا، ”اللہ تمہیں سوز اور درد عطا فرمائے“ کہ اس کے بعد کرتے ہیں خطاب آخر، اُٹھتے ہیں حجاب آخر۔

اب میں چونتیس (۳۳) سال بعد، مارچ ۱۹۸۳ء کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اسے بھی ایک پلک جیسے تیرہ (۱۳) برس بیت گئے، گو آج بھی یہ کل کی بات لگتی ہے۔ ہوا یہ کہ میں انگلستان سے پاکستان آ رہا تھا۔ ۱۷ / مارچ ۱۹۸۳ء کو عمرے کے لئے سعودی عرب میں رُکا۔ دو روز بعد یعنی ۱۹ / مارچ کی صبح مکے سے



مدینے پہنچا۔ پاکستان ہاؤس، مدینہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ پاکستان کے سفارت خانے سے فون آیا کہ فوراً کراچی پہنچو کیوں کہ ۲۱/ مارچ کو پاکستان کے سرکاری تجارتی وفد کے ساتھ دلی جانا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد میں دلی یا بھارت نہیں گیا تھا۔ مجھے یہ جان کر قدرتی طور پر خوشی ہوئی کہ چھتیس (۳۶) سال بعد دوبارہ اپنی جائے پیدائش دیکھ سکوں گا۔ لیکن بیچ میں صرف ایک دن تھا یعنی ۲۰/ مارچ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ایک دن میں سارے انتظامات کیسے مکمل ہو سکیں گے۔ میرے پاس جدہ سے کراچی تک کا ٹکٹ تک نہ تھا۔ کراچی سے دلی کا اور بھارت جانے کے لئے ویزا، نہ زرمبادلہ۔ تاہم میں نے اپنا مختصر سامان سفری تھیلے میں ڈالا، ٹیکسی پکڑی اور سید حامدینہ اتر پورٹ کا رخ کیا۔ سبز گنبد کے ساتھ استادہ سفید بلند مینار کے پیچھے میری چشم تصور دلی کی جامع مسجد کے سفید گنبد اور سرخ مینار دیکھ رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا..... "فیروز! یاد رکھ دلی جانے کی جو دعوت تجھے آج مدینہ میں مل رہی ہے وہ بلا مقصد نہیں ملی۔"

۱۹/ مارچ کی ساری سہ پہر مدینہ میں اس پریشانی میں گزاری تھی کہ دلی جانے کے سب مراحل ایک دن میں کیسے طے ہوں گے۔ کراچی پہنچنے کے بعد بیس مارچ کی پوری شام اس حیرانی میں گزر گئی کہ یہ سب مراحل طے کیسے ہوں گے۔ ٹکٹ، ویزا، زرمبادلہ ہر چیز بیٹھے بٹھائے مل گئے۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر بھارتی قونصل جنرل الوداع کہنے کے لئے موجود تھا۔ اور ۲۱/ مارچ کی شام، میں دلی کے ہوائی اڈے پر تھا جہاں سے چھتیس (۳۶) سال پہلے ۱۵/ نومبر ۱۹۴۷ء کو ایک دس سالہ یتیم بچے نے اپنی بیوہ دادی، ماں اور اپنے سے چھوٹی عمر کے پانچ چھوٹے چھوٹے یتیم بہن بھائیوں کے ساتھ اس عالم میں اپنے آبائی شہر اور جسے جمائے پشتینی گھر کو ہمیشہ لئے چھوڑا تھا کہ تن پر پہننے کے صرف کپڑے تھے اور باقی اللہ کا نام۔

دلی کے ہوائی اڈے پر بھارتی حکام اور تجارت کے علاوہ، جہاں میرے بچپن کی پرانی یادوں کی ایک پوری برات میرے استقبال کرنے کو کھڑی تھی، ایک زبردست خواہش ایک بہت بڑا سوال بنی ہوئی میرے دماغ میں کلبلا رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ میرے باپ کی قبر کہاں ہے؟ اور خواہش یہ تھی کہ کیا میں اس پر فاتحہ پڑھ سکوں گا؟

اگلے دن ۲۲/ مارچ ۱۹۸۴ء کو جمعہ تھا۔ دن دلی میں سرکاری مصروفیات میں گزرا۔ ظہرانے کے بعد، میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پہنچا۔ نماز شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے کہ اچانک مجھے اپنے والد کے ایک شناسا، خواجہ حسن ثانی نظامی دکھائی دیے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ حکیم عبد السلام نظامی ایک بزرگ کو جانتے ہیں جو میرے والد کی تدفین میں شریک تھے۔ اگر کسی طرح حکیم عبد السلام نظامی سے رابطہ ہو گیا تو میری دیرینہ خواہش پوری ہو جانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اگلے دو دنوں میں خواجہ حسن ثانی نظامی، حکیم عبد السلام نظامی کا سراغ لگانے اور ان سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حکیم صاحب دلی کے مشہور اردو ماہنامہ "شع" کے مالک یونس دہلوی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یونس دہلوی سے طے یہ ہوا کہ وہ حکیم عبد السلام نظامی کو ساتھ لے کر ۲۵/ مارچ کو چار بجے سہ پہر میرے ہوٹل آئیں گے اور وہاں سے ہم تینوں دلی کے قدیمی قبرستان جائیں گے جہاں میرے مرحوم والد فیض الدین احمد کو ۱۳/ جولائی ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳/ شعبان ۱۳۵۶ء کی سہ پہر، میری والدہ عزیز فاطمہ کے پہلو میں اور میری بہن فیروزہ بانو کے سر ہانے دفن کیا گیا تھا۔ میرے والد کے انتقال کے بعد جو اپنے والدین کی اکلوتی



اولاد تھے، میری ضعیف بیوہ داوی اکثر مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے بیٹے کی قبر پر قرآن خوانی کے لئے جاتی تھیں۔ وہ میرے والد کی قبر کے بالکل ساتھ زمین پر چادر ڈال کر بیٹھ جاتی تھیں اور بیچ سورہ اور قرآن کے تیسویں پارے کی تلاوت میں محو ہو جاتیں۔ اور اس دوران میں خاموشی بیچ سورہ کے پہلے اور اراق، آسمان پر اڑتی بھوری چیلوں اور قبروں پر ریگتی کالی چیونٹیوں کو تکتا رہتا۔ کبھی کبھی جب کوئی مہم جو چیونٹی ہماری چادر پر چڑھنے کی کوشش کرتی تو میں اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے ملا کر اسے پرے پھینک دیتا۔ آپ میں سے جنہیں قبرستان جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہو وہ مجھ سے بالکل اتفاق کریں گے کہ قبرستان کا ماحول بڑا گھبرایا ہوا ہے۔ گو اس وقت میری عمر صرف آٹھ نو برس کی تھی لیکن مجھے قبرستان میں غم کا احساس ہوتا نہ ڈر کا۔ ایک پراسرار خاموشی اتنی مکمل اور موثر ہوتی کہ بعض اوقات ہوا کا تیز جھونکا یا کسی بڑے سے پتے کے گرنے کی آواز بھی مجھے چونکا دیتی۔ ۲۵ / مارچ کا دن کانٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ چار بجے سے پہلے میں اپنے کمرے میں تیار اور سراپا انتظار بیٹھا تھا۔ کان فون کی گھنٹی پر تھے۔ دل میں ایک طوفان اور دماغ میں ایک محشر ہوا تھا۔ کبھی امید کے چراغ روشن ہوتے تو کبھی یاس کے سائے لمبے ہو جاتے اور کبھی امید و بیم کی درمیانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ دماغ میں بے آواز آوازیں گونج رہی تھیں..... ”حکیم صاحب آرہے ہیں، حکیم صاحب نہیں آرہے۔ حکیم صاحب تو آگئے لیکن قبر کی خبر نہیں۔“ ایک مشہور قوال کا بول ہے جس کا ترجمہ یوں ہے..... ”میرا جسم رباب کے مانند ہے۔ میرا دل مضرب کی طرح ہے۔ میرے جسم کی رگیں تار کے مانند ہیں اور میرے روئیں روئیں میں تیری ہی آواز نکل رہی ہے۔“ کچھ یہ ہی حال میرا تھا۔ آخر کار ٹیلیفون کی گھنٹی بہت زوروں سے بجی۔ یہ یونس دہلوی تھے۔ میں بھاگتا ہوا نیچے اُترا۔ ایک ضعیف العمر بزرگ سادہ اچکن، کھڑا پا جامہ، کپڑے کی سفید ٹوپی، ہاتھ میں زرد چھتری لیے ماہنامہ ”شمع“ کے یونس دہلوی صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہم فوراً قبرستان کی طرف چل پڑے۔

قبرستان پہنچتے ہی بچپن کی یادوں نے ایک لخت میرے پورے وجود کو ڈھانپ لیا۔ لگتا تھا کہ ان یادوں نے حکیم صاحب کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے رک رک کر بتانا شروع کیا..... ”میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم رہا ہے۔ جب ۱۳ / جولائی ۱۹۴۶ء کو اتوار کے روز، تمہارے چالیس سالہ جوان والد کا جنازہ یاں پہنچا تھا۔ اس روز دلی میں سخت گرمی تھی، بے پناہ جھس تھا۔ جنازے میں خاصے لوگ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی آل اولاد، خواجہ حسن نظامی، خواجہ محمد شفیع، ملا واحدی، بہت سے لوگ تھے جن میں کچھ ہندو بھی تھے۔ ہم نے تمہارے والد کو زمین کے سپرد کر دیا تو مشہور ادیب ملا واحدی جو بہت با حوصلہ اور وضع دار بزرگ تھے اور جن کی آنکھ سے اس وقت تک ایک آنسو بھی نہیں پکا تھا۔ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئے اور رندھی ہوئی آواز میں کہا..... ”فصح الدین ایہ تم نے کیا کیا؟“ ان الفاظ سے بڑے بڑوں کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ اس بات کو اب کتنا عرصہ بیت چکا ہے۔ بچے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھے نشانی کے طور پر صرف یاد رہ گیا ہے کہ تمہارے والد کی قبر علامہ راشد الغیری کی قبر کے آس پاس ہے۔“

حکیم صاحب خاصی دیر تک رک رک کر قبر کی تلاش کرتے رہے حتیٰ کہ ۲۵ / مارچ کا سورج غروب ہو گیا۔ مکمل خاموشی، مایوسی اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں، مجھے ایک ایک کر کے سب باتیں یاد آرہی تھیں۔ ۱۹ / مارچ کو مدینہ اتر پورٹ جاتے ہوئے وہ خیال کہ دلی کے سفر کا یہ پیغام جو مدینہ میں مل رہا ہے، بلا مقصد نہیں



ہوسکتا۔ ۲۰ / مارچ کو ویزا، ٹکٹ اور زر مبادلہ کا ایک دن میں مل جانا، ۲۲ / مارچ کو خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ میں خواجہ حسن ثانی نظامی سے غیر متوقع ملاقات اور آج یعنی ۲۵ / مارچ کو سہ پہر میں حکیم عبد السلام نظامی کا دیدار۔ اور اتنا سب کچھ اتنی جلدی اور خلاف امید ہونے کے بعد، کچھ نہ ہونا۔

مایوسی اور بے خیالی میں، میں یوں ہی ایک طرف چل پڑا۔ ایک دو منٹ بعد میری نظر سنگ سرخ سے بنی ایک اونچی، خوش نما، تابوت نما قبر پر ٹھہری جس کے اوپر چڑیوں کے چلنے کے لئے دانے بکھرے ہوئے تھے اور ان کے پانی پینے کے لئے مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ رکھا تھا۔ سر ہانے مٹی کا ایک دیار کھاتا تھا۔ خدا جانے یہ چیزیں وہاں کون رکھ گیا تھا۔ یہ میری والدہ عزیز فاطمہ کی خواب گاہ تھی جو تیس (۲۳) سال کی عمر میں اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملی تھیں۔ ان کی پائنتی میری چھوٹی بہن فیروزہ بانو کی چھوٹی سی شکستہ قبر تھی۔ یہ ننھی سی جان ابھی چار سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ماں باپ کو بلکتا چھوڑ کر اپنے خالق کے پاس پہنچ گئی تھی۔ میرا ماضی میرے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔ میں پیچھے مڑا۔ مہندی کی ایک سدا بہار اور خوش بودار درخت کے نیچے پچھلے سنتیس (۳۷) سال سے وہ لمبا ترنگا وجیہہ شخص لمبی تانے چھین کی نیند سو رہا تھا جس کے جسم کے جتے ہوئے خون کا ایک حقیر سا قطرہ، ایک پچاس (۳۵) سالہ مرد بن کر، آج چھتیس (۳۶) سال بعد ایک بار پھر اپنے شفیق باپ کی آرام گاہ تک پہنچ گیا تھا۔ یونس صاحب، حکیم صاحب اور میں نے خاموشی، خشوع و خضوع سے فاتحہ پڑھی۔ جب ہم واپس جانے کے لئے مڑے تو یونس صاحب نے مجھ سے پوچھا..... ”آپ نے یہ جگہ کیسے پہچان لی؟“

میں نے کہا..... ”اپنی والدہ کی قبر کے تابوت سے۔“

پھر کچھ دیر خاموشی رہی جسے توڑنے کے لئے میں ایسے ہی بول پڑا..... ”عجیب اتفاق ہے۔“

یونس صاحب نے کہا..... ”ہاں! واقعی عجیب اتفاق ہے۔“

”عجیب اتفاق ہے!“، حکیم صاحب نے آہستگی سے سوال کے انداز میں یہ فقرہ دہرایا اور پھر بہت

ہی ہو لے سے کہا ”یا شاید اتفاق نہ بھی ہو۔“

بھیننی بھیننی خوش بو کا ایک جھونکا اچانک ہمارے پاس سے گزر گیا۔ اور پھر جس طرح پرانے زمانے میں

کہار ڈولی کے چاروں طرف پردے ڈال دیتے تھے، دلی کے قدیمی تاریخی قبرستان پر خاموشی کا دبیز پردہ تن گیا۔

۲۵ / مارچ ۱۹۸۴ء بروز پیر، جب رات دن مل رہے تھے یہ آخری الفاظ تھے جو اس شہر خموشاں میں

بولے گئے۔ اس خاموشی میں اب تاریکی بھی شامل ہو چکی تھی۔ ہمارے دائیں بائیں قرونوں پرانی قبریں تھیں اور

اوپر نیچے تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی اور پھر ایسا ہوا جیسے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرنیں چاروں طرف

سے پھوٹ پڑی ہوں اور اس موت جیسی خاموشی میں ایک گھن گرج سنائی دی جو زمین سے آسمان تک، بڑے

بڑے دائروں کی صورت میں گردش کر رہی اور گونج رہی تھی۔ روشنی اور آواز کی اس بوچھاڑ میں، ایک امسی علیہ

الصلاة والسلام کی زبان سے نکلے یہ الفاظ نور کے ہالے کی طرح چمک رہے تھے اور عدد بن کر کڑک رہے تھے:

اللهم لامانع لما اعطيت

و لا معطى لما منعت



افسانہ ماروے کا کیا حال ہے  
 ”جب ماروے میں ہر طرف سے بیٹوں نے جونے لگے تو  
 جانے بیٹرا، تو پاکستان میں ماروے کو نہ مانگے جانا ہے“  
 فیصل نواز چوہدری



## فیصل نواز چوہدری

اوسلو، ناروے

ممبئی کے ماہنامہ ”شاعر“ کے مدیر جناب افتخار امام صدیقی نے اپنی زندگی اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ وہ اردو کی نئی بستیوں میں رہنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ فیصل نواز چوہدری کا افسانہ ”دور و ثیاں“ میں نے شاعر کے شمارے میں پڑھا تھا۔ افسانے نے مجھے اپیل کیا۔ فیصل نواز کا تعلق پنجاب کے نواحی علاقے سے ہے۔ افسانے میں انہوں نے وہیں کی زبان استعمال کی ہے۔ وہیں کی بولی ٹھولی اور تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ یوں افسانے کے کردار اپنی اصلی صورت میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ فیصل نواز کا اسلوب ان کا اپنا ہے اور تحریر میں روانی ہے جو قاری کو اپنے ساتھ اس طرح لے چلتی ہے کہ ”چال“ کہیں بھی مدھم نہیں پڑتی چوہدریوں کی سرزمین پر ایک ”کئی“ کی کہانی ہے جسے ایک چوہدری کے بیٹے نے زمین سے اٹھا کر اور اپنے برابر کھڑا کر کے اوروں کو بھی ”روداداری“ کا سبق سکھایا۔ اور تبلیغی انداز اختیار کیے بغیر۔

مصنف نے کہانی کا آغاز بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ”ناروے سے آئے مجھے پورے سولہ (۱۶) گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس دفعہ میرا بیٹا پہلی بار میرے ساتھ پاکستان سے آیا ہے۔ جولائی کی سخت گرمی میں میرا بیٹا نقلی سے دوڑا ہوا آیا۔ ابو جی بجلی آگئی بجلی آگئی۔ اچانک مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے



(شوں) کی آواز آئی آدمی نے اسپیکر چیک کرنے کی خاطر مائیک کے اندر پھونک ماری تھی اور وہ اتنی سخت تھی کہ میرے بھائی کا چھوٹا بچہ سو رہا تھا وہ تڑپک گیا اور ڈر کر بیٹھ گیا اور رونا شروع کر دیا۔

پھر مسجد سے اعلان شروع ہوتے ہیں جس میں لوگوں کے فوت ہونے کی خبر سے لے کر خورشید مصلح کی مرغیاں گم ہونے تک کا اعلان ہے۔ پھر لاؤڈ اسپیکر سے آدھی آدھی رات تک سیف الملوک سنانے کا ذکر ہے۔ گرمیوں میں پاکستان میں بجلی چلی جانا، مسجد سے لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال اور ”تر بک“ (اچانک ڈر کر جاگ پڑنا) جیسے الفاظ کا استعمال۔ یوں پوری کہانی ہماری خوبیوں اور خامیوں کی عکاسی کرتی جاتی ہے۔ فیصل نواز چوہدری کو میں نے سوال نامہ بھیجا تو انہوں نے بڑی اپنائیت سے جواب دیتے ہوئے لکھا کہ آپ کا نام میرے لئے اجنبی نہیں۔ آپ نے جو پروجیکٹ شروع کیا ہے اس کی کامیابی کے لئے دعائیں۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو ضرور بتائیں۔ پھر یہ بھی لکھا کہ مجھے جھوٹ بولنا پسند نہیں۔ میں جو لکھتا ہوں اس نیت سے کہ ایک تخلیق کار کو اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لانی چاہیے۔

فیصل نے اپنا سفر نامہ ”برف سے صحرائ تک“ مجھے بھیجا۔ سفر نامے کی زبان بھی بڑی سادہ اور رواں ہے۔ اپنے بارے میں انہوں نے لکھا: ”میں تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں ’مہمند چک‘ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھر ۱۹۷۵ء میں میٹرک کے فوراً بعد ناروے چلا آیا۔ اپنے بہن بھائیوں اور والدین کو بہتر سہولت زندگی دینے کی خاطر۔ میں بھول ہی گیا کہ مجھے آگے تعلیم حاصل کرنی ہے۔ پھر اللہ نے مجھے ایک موقع دیا۔ ۱۹۹۶ء میں Post Bank میں ملازمت کے دوران مجھے موقع ملا۔ اور میں نے گریجویشن اوسلو سے کیا۔ بیس سال بعد اسکول اور یونیورسٹی کی ڈسک پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ میرا ایمان ہے کہ ڈگریاں حاصل کرنے سے انسان ادیب نہیں بن سکتا۔ عملی تعلیم میں سب سے بڑا زمانہ استاد ہے۔ میں نے یورپ میں رہ کر دنیا دیکھی اور بہت کچھ سیکھا۔

میں ۱۹۸۴ء میں افریقہ تیونس گیا اور ۱۹۸۷ء میں میرا سفر نامہ ’برف سے صحرائ تک‘ شائع ہوا۔ میرا دوسرا سفر نامہ ’اپہین طارق کے وطن میں بالکل تیار ہے۔ میں آٹھ مرتبہ اپہین گیا ہوں۔ کتاب اب تک اس لئے شائع نہیں ہو سکی کہ میری گھریلو ذمہ داریاں حائل ہیں۔ حالات اجازت نہیں دیتے کہ اتنی رقم خرچ کی جائے۔ معلوم نہیں کب سفر اپہین کا موقع ملے۔ کیوں کہ میں ایک بار اور جانا چاہتا ہوں۔ وہ Alicante صوبے کا سب سے اونچا مقام ہے جہاں مسلمانوں کی عیسائیوں سے آخری لڑائی ۱۲۰۰ء میں ہوئی تھی اور مسلمانوں کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا گیا تھا۔ اب اپہین میں یہ میلہ ہر سال لگتا ہے۔ یہ میلہ مسلمانوں کو نکالنے کی خوشی میں لگتا ہے۔ بس ایک مرتبہ وہ دیکھنا ہے۔ اس کے بعد چند اضافوں کے بعد سفر نامہ مکمل ہوگا۔“

فیصل نواز کے فسانوں کی دو کتابیں ”اوسلو کا کیا حال ہے“ اور اوسلو کے آزاد قیدی“ زیر طبع ہیں۔ فیصل اپنے افسانوں کا ناروے میں زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں اور انہیں امید ہے کہ مارچ یا اپریل



تک ان کی کتاب ”آپ کہاں سے آئے ہیں“ ناروتھکین زبان میں شائع ہو جائے گی۔

اگلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فیصل نے کہا، ”میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز جنوری ۲۰۰۱ء سے کیا جب میں ’ادبی سنگت‘ کا جنرل سکریٹری بنا۔ اسلو میں ’ادبی سنگت‘ سب سے پرانی ادبی تنظیم ہے۔ پہلے کبھی کبھار ادبی لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ لیکن میں نے باقاعدہ ہر ماہ کی آخری اتوار کو میٹنگ منعقد کرنا شروع کی۔ اخبارات میں اس کا باقاعدہ اشتہار آتا ہے کہ غیر ملکی اور ناروتھکین ادیب آپس میں مل رہے ہیں، اسلو سے تمام لکھنے والے اس میں شرکت کرتے ہیں۔ پہلے حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی ہے۔ پھر افسانہ، غزل اور نظم سنائی جاتی ہے۔ ہر تین ماہ بعد ناروتھکین پروگرام ہوتا ہے جس میں صرف ناروتھکین زبان میں تخلیقات پیش کی جاتی ہیں اور ناروے کے دو یا تین ادیبوں کو دعوت دی جاتی ہے۔“

ناروے میں صرف ایک شاعر کے علاوہ سب ’ادبی سنگت‘ میں شرکت کرتے ہیں۔ وہ شاعر محض شخصی انا پرستی کی وجہ سے شریک نہیں ہوتے ورنہ ہمارے ناروے میں کسی قسم کا ادبی اختلاف یا گردپ بندی نہیں ہے۔ یہاں انڈین اور بنگلادیشی بھی شرکت کرتے ہیں۔ میری کوشش ہے کہ مستقبل میں یورپ میں رہنے والے ادیبوں کو ناروے میں مدعو کیا جائے۔ اور پھر ہر سال ادبی سنگت کے تحت بنگلادیش، ہندوستان اور پاکستان سے اردو کے شعرا کو ناروے میں بلایا جائے گا اور انہیں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔“

اردو زبان کو دوام بخشنے کے حوالے سے فیصل نواز کا مشورہ ہے کہ امریکہ اور یورپ میں بسنے والے والدین اپنے بچوں کو اردو سکھائیں۔ مسجدوں میں اردو کی کلاسوں میں اضافہ کریں تاکہ ہماری نئی نسل اردو زبان سیکھ لے۔ میری رائے میں پاکستان میں اردو کا مستقبل محفوظ ہے۔ لیکن ہندوستان کی اردو دشمنی اور مسلمانوں سے نفرت اردو کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

فیصل اردو کے رسم الخط کو بدلنے کے حق میں نہیں ہیں۔ کہتے ہیں یہ ہماری پہچان ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے درمیان آپس میں رابطے کی زبان ہے۔ یورپ میں کرنسی اور بارڈر ختم ہو رہے ہیں تو ایک دن برصغیر میں بھی تبدیلی ضرور آئے گی۔ تب اردو ہی مسلمانوں کے درمیان واحد رابطے کی زبان ہوگی۔“

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا، ”نواز شریف دور میں ایک ادیب سفارشی سفیر بن کر اسلو آئے تھے۔ تین لاکھ روپے ان کے مکان کا ہر مہینے کا کرایہ تھا جو حکومت پاکستان ادا کرتی تھی۔ جب نواز شریف نے اعلان کیا کہ بیرون ملک میں رہنے والے پاکستانی قرض ادا کرنے کے لئے حکومت پاکستان کی مدد کریں تب ناروے سے بہت سارے لوگوں نے نواز شریف کے اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کروائیں۔ میں ایک ایسے آدمی کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس نے بیس ہزار کراؤن جو کہ پاکستانی کرنسی میں ڈیڑھ لاکھ روپے بنتی تھی نواز شریف کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے



حالات کے گھریلو حالات قطعاً اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ بیس ہزار کراؤن دے۔ لیکن اس طرح کے کئی دوسرے لوگوں نے بھی بڑی بڑی رقمیں پاکستان کی خاطر دیں۔ اب سنئے آگے کیا ہوا۔

اتفاق سے میں ایک دن ضروری کام کے لئے سفارت خانے گیا۔ میں نے کاؤنٹر پر اپنے متعلق انہیں بتایا کہ میں ادیب ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ سفیر صاحب سب سے ملتے نہیں۔ انہوں نے مجھے اندر بلا لیا۔ میرے بیٹھے ہی ان کے لئے فون آگیا۔ سکرٹری نے کہا کہ فلاں حاجی صاحب کا فون ہے ان کو آپ سے کوئی بہت ضروری کام ہے۔ سفیر صاحب کہنے لگے ان سے کہو کہ ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ الو کے پٹھے ان پڑھ ہیں۔ ہزار کراؤن دے کر سمجھتے ہیں کہ سفیر کے پاس ان کے لئے وقت ہی وقت ہے۔ میں یہ جملے سن کر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے تشریف رکھیں میں آپ کے لئے چائے منگواتا ہوں۔ میں نے کہا آپ اس قابل ہی نہیں کہ آپ کے ساتھ ہاتھ ملایا جائے۔ آپ پاکستانی قوم کے لئے کینسر ہیں۔ میں غصے اور دکھ میں اٹھ کر چلا آیا۔

دو سال بعد میرے بہت قریبی دوست، مسعود ہاشمی مرحوم کی کتاب 'بیسویں صدی میں تنقید' چھپی تو سفیر صاحب کو بھی انہوں نے کتاب بھیجی۔ اس کتاب میں میری بھی دو تصویریں تھیں۔ سفیر صاحب مسعود ہاشمی سے کہنے لگے، 'شاید میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ میں تین سال ناروے میں رہ کر آیا ہوں یہ شخص فیصل نواز چوہدری مجھے ملے تک نہیں۔'

مسعود ہاشمی کہنے لگے کہ آپ جیسے لوگوں سے مل کر وہ اپنی شخصیت کو داغ دار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسعود کو معلوم تھا کہ ایک غریب ملک کا سفیر تین لاکھ روپے ماہانہ صرف اپنی رہائش پر خرچ کرے اور پھر نخوت بھرا رویہ۔ جس نے مجھے ان سے برگشتہ کر دیا تھا۔

سلطانہ صاحبہ آج بھی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بیرون ملک رہنے والے پاکستانی پاکستان کا قرض اٹار سکتے ہیں بشرطے کہ کینسر پھیلائے والے ان سفیروں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

میں نے گجرات پاکستان کے ایک اخبار کو انٹرویو دیا تھا۔ وہ چھپن (۵۶) صفحات پر مشتمل انٹرویو تھا۔ اس میں پاکستان کے قرض سے لے کر پاکستان سے باہر رہنے والے پاکستانیوں کے تمام حالات بتائے گئے تھے۔ میں نے کھری کھری باتیں کی تھیں۔ میں بک نہیں سکتا۔

آج بھی میرا دعویٰ ہے کہ اگر حکومت پاکستان میری تجویز پر عمل کرے تو بیرون ملک میں پاکستانی پاکستان کا قرض ادا کر سکتے ہیں۔'

Mr Faisal Nawaz Choudry,

Etterstadsletta 90, N-0659, Oslo, Norway



یہ آج نقابوں سے سو گھنٹن ہے ہوا میں ہے  
کہنے ہیں یہ کہناں کے لئے جسی ملکہ ہے

نور علی  
19.6.02  
ربی



## پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس

دہلی، ہندوستان

جب میں لکھنے بیٹھی تو میری نظر میز پر رکھے ہوئے کاغذ بانے کے بلوریں شیشے پر پڑی۔ میں نے اُسے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا تو اس کے کئی پہلو اور گوشے تھے اور ہر پہلو اور گوشے سے رنگ برنگ کی شعائیں فضا میں پھوٹی اور پھیلتی نظر آرہی تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس کی شخصیت بھی ”کثیر الجہات بلور“ سے کم نہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی؛ محقق و نقاد بھی ہیں اور سفر نامہ نگار بھی۔ ان کا سفر نامہ تاشقند میں نے کلکتہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ”انشا“ میں پڑھا تھا۔ تاشقند میں ان کا تقرر وزارت خارجہ حکومت ہند نے بحیثیت ڈائریکٹر سینٹر آف انڈین کلچر کیا تھا۔ وہاں ازبکستان/ہند ثقافتی تبادلے کے پروگرام کے علاوہ اس سینٹر کے نگران کے فرائض بھی پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے انجام دیئے۔ انہوں نے یہ خدمات مارچ ۱۹۹۷ء سے جون ۲۰۰۱ء تک سنبھالی تھیں۔

آج کل پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس دہلی سے ایک سہ ماہی نیا جریدہ ”آب و گل“ شائع کر رہے ہیں جس کا پہلا خصوصی شمارہ ”معاصر ادب اور حقیقت پسندی“ شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس پہلے بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور ماہنامہ ”ادیب اور



عصری آگئی“ اور ”نیا سفر“ نامی خوب صورت و اعلیٰ ادبی معیار کے جرائد کا اجرا کر چکے ہیں۔ ”نیا سفر“ کے چھ شمارے شائع ہوئے تھے کہ انہیں دل کے مرض نے آن گھیرا۔ ویسے دل کے مرض کا تجربہ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس کے لئے کوئی پہلا نیا تجربہ نہیں۔ جو پہلا تجربہ تھا وہ ان کے نام کا حصہ بن گیا۔

یقیناً یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے خود بتایا جب میں نے ان سے پوچھا تھا، ”آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ جسے آپ اب تک بھولے نہ ہوں۔“

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس کے ہونٹوں پر ایک دل کش معصوم سی مسکراہٹ ابھری اور چہرے پر دل ربایادوں کی چاندنی چمک گئی۔ کہنے لگے، ”یادگار واقعہ کے طور پر اب جب میں اس حیات فانی کے ستر سال پورے کر رہا ہوں آج پہلی بار اس راز سے پردہ اٹھا رہا ہوں کہ میرے قلمی نام کا پہلا جزو..... میرا پہلا پیار ہے (۱) جو نام کام رہا۔ دوسرا جزو میری شریک حیات ہیں۔ اور حال (یعنی ۲۰۰۲ء) ہی میں ہم نے اپنی شادی کا طلائی جشن منایا۔ اس طرح مجھے اپنے نام اور ادبی کام میں دونوں سے تحریک اور حوصلہ ملا۔“ ظاہر ہے کہ یہ شخصیت صرف نام کی رئیس نہیں دل اور کردار کی اور محبتیں بانٹنے میں بھی رئیس ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس خاموش ہو گئے تھے۔ غالباً خوش گواریادوں اور خیالوں میں گم ہو گئے ہوں گے۔ میں نے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا، ”تو پھر آپ کا ذاتی نام کیا ہے؟“

میرا اصلی نام مصاحب علی خان ہے اور قلمی نام قمر رئیس۔ ۱۲ جولائی ۱۹۳۲ء میری تاریخ پیدائش ہے اور مقام پیدائش شاہجہاں پور، یوپی ہندوستان ہے۔ آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کر کے ایل ایل بی کی سند لی۔ ۱۹۵۶ء میں اردو میں ایم اے ناگپور یونیورسٹی سے کیا۔ اور ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرار ہوا۔ تقریباً اسی سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۹۷ء میں بحیثیت پروفیسر ہٹا رہا ہوا۔

۱۹۴۵ء میں جب اسلامیہ ہائی اسکول میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا تو شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ بعد میں یعنی ۱۹۵۲ء میں جب لکھنؤ گیا اور وہاں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو نثر لکھنا شروع کی۔ عبدالحمید عدم کی شاعری اور احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ کلام ”رم جھم“ پر تنقیدی مضامین رقم کیے اور چند طبع زاد افسانے بھی۔ پھر شعر گوئی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ ویسے میری منتخب نظموں کا ایک مجموعہ سجاد ظہیر کے تعارف کے ساتھ ترجمہ ہو کر ۱۹۷۳ء میں ازبکی زبان میں تاشقند سے شائع ہوا ہے لیکن اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔“

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، ”میں نے ۱۹۵۴ء میں ڈیڑھ

۱۔ افسوس کہ یہ پہلا جزو، ان کا پہلا پیار اس دنیا میں نہیں مگر ان کے دل کے نہاں خانے اس چاند کی یادوں کے اُجالے سے اب بھی روشن ہیں۔



سال تک آبائی پیشہ وکالت میں بھی طبع آزمائی کی اور خاصا کامیاب بھی ہوا۔ لیکن پیشہ پسند نہ آیا۔ اور اردو زبان و ادب میں کچھ کرنے کی آرزو نے مجھے ایک نئی ڈگر پر لگا دیا۔ حالاں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو یہاں (ہندوستان میں) ہر طرح سے اور ہر طرف سے معتب و تہی لیکن مجھے اس میدان کو اپنا کر کبھی پشیمانی یا شکست و مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس میں مجھے عزت اور شہرت بھی ملی اور مادی آسائشیں بھی دستیاب ہوئیں۔“

میں نے ان سے ادیبوں کی گروہ بندی کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے، ”ادیبوں میں گروہ بندی، معرکے اور آپس کی جسمکس ہمیشہ ہی رہی ہیں اور ہر زبان میں ہوتی رہی ہیں چنانچہ اردو میں بھی ہیں۔ لیکن میری دانست میں اس سے اردو کی ترقی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔“

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا کہ ہندوستان اور مغربی ممالک میں تو اردو کا مستقبل بے شک تاریک ہے لیکن پاکستان میں اگر وہ متحد رہا تو مقامی زبانوں کے دباؤ کے باوجود اردو کا مستقبل روشن ہے جس طرح ہندوستان میں دوسری بے شمار ترقی یافتہ زبانوں کے باوجود ہندی کا مستقبل روشن ہے۔ اور رسم الخط کے سلسلے میں کہا، ”چوں کہ رسم الخط کسی زبان اور اس کے ثقافتی ڈھانچے کا ایک حصہ ہوتا ہے لیکن اس میں تقدس کی کوئی بات نہیں۔ حسب ضرورت اسے بدلا جاسکتا ہے۔ یورپ کی زبانوں میں، ترکی، آرمینی اور وسط ایشیائی زبانوں میں ایسا کئی بار ہوا لیکن ہندوستان کے مخصوص لسانی اور تہذیبی حالات میں اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا گیا تو یہاں اردو زبان کی جو بھی عمر باقی ہے وہ گھٹ کر نصف سے کم ہو جائے گی۔“

اپنے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں انہوں نے بتایا، ”لیونا لسانی میرا سب سے محبوب ادیب ہے۔ اس کے علاوہ گورکی اور چیخوف کو بھی پسند کرتا ہوں۔ اردو کے ادیبوں میں پریم چند، اپنے استاد رشید احمد صدیقی، سید احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی اور مشتاق احمد یوسفی کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔ پتا نہیں میں اپنے تصورات اور تحریروں میں ان سے کتنا متاثر ہوا؟ شعرا میں خواجہ حافظ کے علاوہ فیض احمد فیض اور اختر الایمان میرے پسندیدہ فن کار ہیں۔ یہ بالکل ذاتی پسند ہے۔“

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے بے تکان لکھا ہے۔ ان کی چند تصنیفات و تالیفات یہ ہیں:

- |                                       |                                       |
|---------------------------------------|---------------------------------------|
| ۱۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ          | ۲۔ پریم چند..... شخصیت اور کارنامے    |
| ۳۔ پریم چند..... فکر و فن             | ۴۔ مضامین پریم چند..... ترتیب و مقدمہ |
| ۵۔ تلاش و توازن                       | ۶۔ تنقیدی تناظر                       |
| ۷۔ ترجمہ کافن و روایت                 | ۸۔ تعبیر و تحلیل                      |
| ۹۔ اردو میں لوک ادب                   | ۱۰۔ رتن ناتھ سرشار                    |
| ۱۱۔ نیا افسانہ..... مسائل اور رجحانات | ۱۲۔ اردو کے نمائندہ افسانے (ترتیب)    |
| ۱۳۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت  | ۱۴۔ ازبکستان..... انقلاب سے انقلاب تک |



۱۵۔ ازبکستان اور علی شہر نوائی ۱۶۔ بیسویں صدی کی ازبک شاعر

۱۔ ارمغان تاشقند (ازبک شاعر غفور نلام کی نظموں کا ترجمہ)

پروفیسر ڈاکٹر رئیس قمر کو کئی اعزازات و انعامات بھی ملے ہیں گو وہ ان کی خدمات بے کراں کے لحاظ سے بہت کم ہیں۔ چند اعزازات و انعامات جو انہیں تفویض ہوئے یہ ہیں:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ (۱۹۹۴ء میں) ۲۔ امتیاز میر ایوارڈ (۱۹۸۱ء میں)

۳۔ ہندی اردو ادب ایوارڈ (۱۹۸۴ء میں) ۴۔ نیاز فتحپوری ایوارڈ، کراچی (۱۹۸۹ء میں)

۵۔ پریم چند ایوارڈ (۱۹۸۹ء میں) ۶۔ احتشام حسین ایوارڈ برائے تنقید (۱۹۸۷ء میں)

۷۔ اعزازی ڈاکٹریٹ برائے فنون لطیفہ تاشقند (۲۰۰۱ء میں)

۸۔ اعزازی ڈاکٹریٹ برائے ادبیات تاشقند (۲۰۰۱ء میں)

آج کل پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس بطور مہمان پروفیسر اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز، جامعہ اسلامیہ دہلی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اب میں پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس سے ان کی کتاب ”ازبکستان..... انقلاب سے انقلاب تک“ کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مشہور ادیب و نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے (۱):

قمر رئیس ازبکستان اور وہاں کے لوگوں سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں تاشقند، شہر افش، گرجستان، کوہ قاف کے پرستان، بابر کے فرمانہ کے ساتھ اردو اور ازبک زبانوں کے لسانی رشتے، ازبکستان میں اردو کے عالموں، طلباء، ہندو شناسوں اور اردو کی برادری سب کا فکر انگیز مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرف علمی اور ادبی اطلاعات ہیں تو دوسری طرف اہل ازبکستان کی مذہبی زندگی کا بھی دل چسپ تذکرہ ہے۔ کچھ حیرت انگیز انکشافات بھی ہیں جیسے قرآن پاک کے اس نسخہ عثمانی کی تفصیلات ہیں جس کی تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تھے۔ یہ نسخہ تاشقند میں خیابان تیمور کے پاس ایک تاریخی میوزیم میں بڑی حفاظت سے ہوا بند (air tight) شیشے کے بکس میں بند رکھا ہوا ہے۔ اس کے اوراق کھلے ہوئے ہیں جن پر خون کے وہ دھبے دیکھے جاسکتے ہیں جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت قرآن کے ان صفحات پر پڑے تھے۔

نئی تعلیمی صورت حال پر بڑے مسکرت حالات ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھے ہیں۔ وہاں تعلیم مخلوط ہے۔ سویت معاشرے میں یورپ کی طرح جنسی آزادی ہے۔ اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے:

تاشقند یونیورسٹی میں کنواری لڑکیاں حمل گرانے کے لئے چھٹی کی درخواست دیتی

۱۔ ماہی ”نیاسفر“ شمارہ ۷/ ۸۔ صفحہ ۲۵۹



ہیں۔ میرے ایک رفیق اور اردو کے استاد حاتم جان بتاتے ہیں کہ کبھی کبھی وہ صبح چار بجے ہاسٹل کے کمروں کا معائنہ کرتے تو پچاس فی صد لڑکیاں لڑکوں کے کمروں میں یا لڑکوں کے لڑکیوں کے کمروں میں ملتے۔ لیکن اتنی آزادی مسلمانوں میں نہیں ہے۔ یہاں اب بھی نوجوان شادی کے لئے کنواری، باعصمت اور گھر گرہست لڑکی کی تلاش کرتے ہیں۔

”ڈاکٹر قمر رئیس صاحب.....“ میں ان سے پوچھ رہی تھی۔ ”آپ اپنی سوانح کیوں نہیں لکھتے؟“

”چاہتا تو ہوں کہ لکھوں۔ دیکھئے کب آرزو پوری ہوتی ہے، کب وقت ملتا ہے؟ بہت سے ایسے کام اچانک سامنے آ جاتے ہیں کہ انہیں ترجیح دینی پڑتی ہے۔“

”ایک اچھی خودنوشت سوانح کی خوبیاں بتائیے“ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس سے گفتگو کرتے ہوئے یہ سوال بھی کرنے کو جی چاہا۔ انہوں نے بتایا۔

”سوانح لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اپنی سوانح میں اپنی شخصیت کے خاکوں میں کیسے رنگ بھرے، خارجی واقعات کو اہمیت دے یا داخلی معاملات کو..... مثلاً گورکی کی سوانح دیکھئے یا سارتر کی۔ یہ دونوں ہی مختلف ہیں۔ لیکن ان دونوں میں جو بات مشترک ہے اور میرے خیال میں ہر اچھی خودنوشت سوانح میں مشترک ہونا چاہئے، وہ یہ کہ لکھنے والا اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد کو دریافت کرتا ہے اور اپنے عہد کے حوالے سے اپنی ذات کو دریافت کرتا ہے۔ اچھی خودنوشت سوانح میں یہ عمل نظر آتا ہے۔ زندگی ایک پھیلا ہوا سمندر ہوتی ہے جو آدمی زندگی جینا جانتا ہے یا جس نے زندگی کو بھرپور جیا ہے اس کی زندگی میں ہزاروں طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں اور فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس واقعے کو کس انداز میں درج کرے۔ یہ عمل ایک مشکل عمل ہوتا ہے اور اسی مقام پر ہمارے سوانح نگار ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ذاتی اور جذباتی طور پر لکھنے والا جن واقعات کو اہم سمجھتا ہے اکثر وہ دوسروں کے لئے اہم نہیں ہوتے۔“

سلسلہ گفتگو جاری رہتا اگر وقت اجازت دیتا۔ لیکن امید نے کہا..... پھر سہی۔ اس دوران آپ ان کے دو شعروں سے اپنی فکر کو انگیز کریں۔

کرسیاں جن کو ملیں مسند شاہی کی طرح ہم پہ وہ ٹوٹ پڑے قہر الہی کی طرح

اور

یہ آج کی فضا میں جو گھٹن ہے جو اُمس ہے کہتے ہیں یہ طوفاں کے لئے حسن طلب ہے

Professor Dr. Qamar Rais,  
c-166 Vivek Vihar, Phase-1, Delhi, 110095, India  
e-mail:mq\_rais@yahoo.com





کرامت غوری : کم منتخب میرا  
یہ اپنے دور کا میرا کفن

۲۰۰۱  
۲۰۰۲  
۲۰۰۳  
۲۰۰۴  
۲۰۰۵  
۲۰۰۶  
۲۰۰۷  
۲۰۰۸  
۲۰۰۹  
۲۰۱۰  
۲۰۱۱  
۲۰۱۲  
۲۰۱۳  
۲۰۱۴  
۲۰۱۵  
۲۰۱۶  
۲۰۱۷  
۲۰۱۸  
۲۰۱۹  
۲۰۲۰  
۲۰۲۱  
۲۰۲۲  
۲۰۲۳  
۲۰۲۴  
۲۰۲۵  
۲۰۲۶  
۲۰۲۷  
۲۰۲۸  
۲۰۲۹  
۲۰۳۰

## کرامت غوری

رچمنڈ ہل، کنیڈا

کرامت غوری کی شخصیت کی کئی ایک جہتیں ہیں۔ وہ ایک اعتبار ادیب کی حیثیت سے افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں، تاریخ دان ہیں، کالم نویس ہیں اور بحیثیت ایک منجھے ہوئے سفیر برائے پاکستان مختلف ممالک میں رہ چکے ہیں۔ جس صنفِ سخن کے پیچھے پڑ جائیں اس میں اپنا لوہا منوا کر رہتے ہیں۔ کہانی ایسے لکھتے ہیں جیسے واردات یا حادثہ خود ان پر سے گزرا ہو یا کم از کم وہ اس کے یقینی شاہد ہوں۔ شعر ایسے کہتے ہیں کہ جیسے تجربے کی بھیٹی سے تپ کر باہر نکلے ہوں۔ ایک مشاعرے میں ان کی ایک غزل سنی۔ ہر شعر نے تلے احساسات کا حامل تھا۔ چند شعر آپ کی نذر ہیں اور دیکھیے کہ کیا تیور ہیں۔

شاخ در شاخ با شمر ہوتا اتنا آساں نہیں شجر ہوتا

میری قامت کو زیب دیتا ہے سر کشیدہ ہی دار پر ہوتا

یہ سکھایا ہے تجربوں نے مجھے سب سے بہتر ہے خود نگر ہوتا

کرامت اللہ خان غوری کو میں بحیثیت ایک افسانہ نگار جانتی تھی۔ اشعار تو ان کے ہونٹوں سے فقرہ میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے اچانک پھسلتے تھے اور بہت صحیح جگہ اپنا وزن برقرار رکھ کر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے تھے۔ پھر پتا چلا کہ کرامت نے خیر سے شاعری بھی شروع کر دی ہے۔ پناں چہ وہ خود



اپنے بارے میں کہتے ہیں، ”شاعری کے علاوہ افسانہ، رپورتاژ اور فکاہی مضامین لکھنے سے خصوصی وابستگی ہے۔ یوں میں بخار ہوں۔ میری پہلی محبت افسانہ ہے۔ اس کے بعد رپورتاژ آتا ہے۔ بدو کے اونٹ کی طرح شاعری میرے خیمہ خیال میں حاوی ہوتی گئی۔ شاعری میں اصل عشق غزل سے ہے۔ لیکن نعت، سلام، قصیدہ اور منقبت کہنے سے روح کو تازگی میسر آتی ہے۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ غزلوں اور نظموں کے مجموعہ کو مرتب کرنے سے پہلے میں نے اپنے دینی کلام کے مجموعے ’درخانہ اطہر‘ کو اولیت دی۔“

کرامت اللہ خان غوری کا تخلص کرامت ہے۔ نام کو مختصر کر کے کرامت غوری کے نام سے اب افسانے لکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ ۱۵/ فروری ۱۹۴۲ء کو دلی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں جامعہ کراچی، کراچی پاکستان سے بین الاقوامی تعلقات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں پاکستان فارن سروسز (Pakistan Foreign Services) سے وابستگی ہوئی۔ انہوں نے نیویارک (امریکہ)، بیونس آئرس (ارجینٹینا)، میلان (فلپائن)، ٹوکیو (جاپان)، بیجنگ (چین)، الجزائر (الجیریا)، انقرہ (ترکی)، کویت اور بغداد (عراق) میں سفارتی خدمات انجام دیں۔ یوں کرامت طویل مدت تک ایک بخارہ کی طرح خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے رہے ہیں کیوں کہ وہ خود کہہ چکے ہیں کہ دنیا ایک مسافر خانہ ہی تو ہے۔

میں نے ان سے پوچھا تھا کہ شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف سے وابستگی کے بنیادی محرکات کیا ہیں؟

کرامت کا جواب ہے، ”کسی فن کی تخلیق کے لئے بنیادی تحریک اپنے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ جب تک یہ آواز نہ اُکسائے نہ شعر ہوتا ہے نہ کہانی لکھی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی اور تخلیق وجود میں آتی ہے۔ افسانہ لکھنا یا شعر کہنا ایک وجدانی عمل ہے۔ اور یہ اس وقت تک ظہور میں نہیں آتا جب تک روح کے ساز خود بخود نہ بج اُٹھیں۔ اندر سے آواز بھی صرف اس وقت اُٹھتی ہے جب روح، احساس اور وجدان متاثر ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر ایک فطری عمل ہے۔ یہ عمل کسی بیٹے کی پرستگ لکھنے کے مترادف نہیں کہ پہلے اعداد و شمار جمع کیے جائیں۔ اور جو لوگ فیتہ لے کر بیٹھتے ہیں اور زبردستی ناپ تول کر شعر کہتے ہیں، ان کا کلام چیخ چیخ کر خود ہی فریاد کرتا ہے کہ یہ الفاظ جوڑے گئے ہیں، اپنے آپ ڈھل کر نہیں آئے۔ آخر اردو شاعری کے امام غالب نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔“

کرامت کی آواز مدہم نہیں ہوئی تھی کہ میں نے پوچھا، ”کس مکتبہ فکر سے آپ کی افسانہ نگاری اور شاعری متاثر ہے۔ میرا مطلب ہے ادب کو نظریاتی ہونا چاہیے یا نہیں؟“

کرامت کا کہنا ہے، ”ان کی شاعری یا افسانہ نگاری کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں ہے کیوں کہ وہ مکاتب فکر میں یقین ہی نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک مکتب فکر کی اصطلاح نقادوں اور ادب کے مورخوں نے اپنی سہولت کے لئے وضع کی ہے۔ یا پھر فی زمانہ مکاتب فکر کی ضرورت ان لنگڑے لوے شاعروں اور ادیبوں کو ہوتی ہے جن کا فن خود اپنی ناگلوں پر کھڑا رہنے سے محتاج ہوتا ہے۔ اور سہارے کے لئے اس یا



اس مکتبہ فکر کی میساکھیاں تلاش کرتا ہے اور سہارے کا محتاج ظاہر ہے صرف نادار ہی ہو سکتا ہے۔  
 نہیں ہرگز نہیں، میرے نزدیک ادب کو قطعاً نظریاتی ہونے کی ضرورت نہیں ان محدود معنوں  
 میں جن میں عام طور سے سمجھا جاتا ہے، کرامت نے اظہار خیال جاری رکھتے ہوئے کہا: ”ہمارے  
 ادب میں نظریاتی اور غیر نظریاتی کی طولانی اور لاحق حاصل بحث اس دور سے شروع ہوئی جب مغرب میں  
 اس بات پر رسد کشی ہو رہی تھی کہ کسی سیاسی نظریہ یا معاشی فکر کو بطور نظام حکومت رائج کیا جائے۔ میرے  
 نزدیک ادیب نہ تو ٹریڈ یونین کا رکن ہوتا ہے اور نہ سیاست دان۔ ویسے ہر ادیب کا اپنا ایک نظریہ ہوتا  
 ہے، ایک فکر اور ایک شعور ہوتا ہے۔ لیکن وہ سیاست دان یا ٹریڈ یونین کا رکن کی طرح اپنے نظریے کو دنیا  
 بھر پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ ادیب کا نظریہ تو کسی پیغمبر کی تعلیم کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف بیان کرنا  
 ہوتا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا، اس سے متاثر ہونا یا اسے رد کر دینا، سامع یا قاری کا فیصلہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے  
 کہ غالب نے کس نظریہ کا پرچار کیا یا میر نے کون سی تحریک چلائی تھی۔ کیا کوئی بھی نظریاتی (بزرگ خود)  
 شاعر ان کی گرد کو پہنچ سکتا ہے؟“

اگلا سوال تھا کہ کیا ادب کے لئے ابلاغ ضروری ہے؟ اور کیا اس کے لئے آسان زبان و  
 اسلوب اپنانا ضروری ہے؟ کرامت غوری نے کہا: ”فی زمانہ ادیب کے لئے ابلاغ ہمیشہ سے زیادہ  
 ضروری ہے۔ یہ دنیا جس تیزی سے ابلاغی طور پر یک رنگی ہوتی جا رہی ہے اس میں ابلاغ کی اہمیت سے  
 انکار کفر کے مترادف ہوگا۔ بلاشبہ سہل زبان اور آسان اسلوب ابلاغ عامہ کے لئے بہت ضروری ہے۔“  
 کرامت کے مزاج میں یہ خوبی بھی ہے کہ نخوت نہیں۔ ملنگ آدمی ہیں۔ خوشامد پسند نہیں۔  
 اپنی تحریر شائع کرانے کے لئے انہیں پی آر (PR) کی ضرورت نہیں۔ ان کی تحریریں خود اپنی جگہ بناتی اور  
 منواتی ہیں۔ وہ دوسروں سے تعاون بھی کرتے ہیں۔ میں ان کی ان ہی خوبیوں سے متاثر ہوں۔ چنانچہ  
 چہ میں نے ان سے چند سوالات مرتب شدہ سوال نامے سے ہٹ کر کیئے اور کرامت نے بڑے سلیقے  
 سے تفصیلاً ان کے جوابات دیئے۔

میں نے پوچھا: ”اردو افسانہ آج کل زیادہ لکھا جا رہا ہے یا پہلے کے مقابلے میں کم...؟“  
 کرامت نے جواب دیا: ”میں سمجھتا ہوں کہ افسانے نے وقت کی رفتار کا ساتھ دیا ہے۔  
 اردو ادب میں افسانہ نگاری کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ انگریزی ادب میں جو اولیت اور فوقیت  
 ناول کو حاصل رہی ہے اسی کے ہم پلہ اردو میں افسانے نے ناول کے مقابلے میں اپنی دھاک ہمیشہ زیادہ  
 بٹھائی ہے۔ افسانہ آج بھی خوب لکھا جا رہا ہے۔ اور اس میں وقت کے ہم قدم نئی جہتوں اور نئے  
 تقاضوں کا اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک موجودہ اردو افسانے کے امام تو بلاشبہ افتخار حسین ہیں یا  
 پھر حضرت احمد ندیم قاسمی ہیں۔ ان کے علاوہ بانو قدسیہ ہیں، رام لعل ہیں، اشفاق احمد ہیں۔ اور بہت  
 سے ثقہ اور معتبر نام ہیں جن سے اردو افسانے کی ساکھ ہے اور بھرم ہے۔“

علامتی افسانہ نگاری کی کامیابی اور اس کے امکان ابلاغ کے حوالے سے کرامت نے کہا،



”علامتی افسانہ بھی زندگی سے اتنا ہی قریب تر ہے جتنا کہ روایتی افسانہ۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ علامتوں کے انتخاب میں افسانہ نگار پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور وہ یوں کہ ابلاغ کے لئے ضروری ہے کہ علامت یا علامتیں زندگی کی سچائیوں سے قریب تر ہوں اور اتنی زیادہ گنجلک اور گہمیز نہ ہوں کہ قاری ان کی گتھیاں ہی سلجھاتا رہ جائے اور افسانے کے مزاج کی اصل ڈور ہی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ ویسے اچھا علامتی افسانہ لکھنا مشکل ہے۔“

”آپ نے اب تک کتنی کہانیاں لکھی ہوں گی؟“ میں نے پوچھا۔ ہنس کر بولے، ”حساب کا سوال ہے اور حساب کی کتاب میں میں سدا کا کمزور ہوں۔ بہت لکھی ہیں۔ بے شمار لکھی ہیں اور ان گنت رسائل و جرائد میں لکھی ہیں۔ سب سے زیادہ تو دلی کے ’شمع‘ اور اسی شہر منتخب روزگار کے ’میسویں صدی‘ میں اور ان کے علاوہ ’سیپ‘، ’فنون‘، ’الفاظ‘، ’رابطہ‘، ’رومان‘، ’نقاد‘، ’ماہ نو‘، ’اخبار جہاں‘ اور کئی اور جن کے نام یاد نہیں رہے کے لئے کہانیاں لکھی ہیں۔ ہاں ایسے بہت سے رسائل ہیں جو پاک و ہند کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے ہیں، جنہوں نے میری اجازت کے بغیر میرے افسانے معروف رسائل سے نقل کر کے شائع کر دیے۔ ہندوستان میں بے شمار کہانیوں کے ہندی تراجم بھی شائع ہوئے۔ بالخصوص ’شمع‘ دہلی کے ہجولی ہندی رسالے ’سشما‘ میں۔“

میرے افسانوں کا ایک مجموعہ ’اک لمحہ سچائی کا‘ کوئی دس برس پہلے سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد دوستوں نے بار بار اور مجموعے مرتب کرنے کا حوصلہ دلاتا چاہا لیکن میں مائل نہ ہوا۔ اسے عدیم الفرستی کہیں یا شوق کی کمی۔ میرے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں: (۱) حرف کرامت (۲) سفر نامہ تمام (۳) درخانہ اطہر (۴) خاک در بو تراب۔“

میرا اگلا سوال تھا، ”افسانہ لکھنا آسان ہے یا شعر کہنا؟“

”میرا سوال ہے،“ وہ سوچتے ہوئے کہنے لگے، ”نہ افسانہ لکھنا آسان ہے نہ شعر کہنا۔ دونوں کے لئے تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تحریک ہو تو پھر نہ افسانہ لکھنا مشکل ہے نہ شعر کہنا۔“

کہانی اور شعر، گواہی ہی ذہن سے اُگتے ہیں لیکن ہر کی نشو و نما کے لئے زمین اور مٹی مختلف ہوتی ہے۔ افسانہ کرداروں کے گرد گھومتا ہے، واقعات و امکانات کی زمین میں سفر کرتا ہے۔ شعر جذبے اور احساس کی پیداوار ہے۔ جذبے کی سچائی اور احساس کی گہرائی کے بغیر اچھا شعر نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح جب تک کرداروں میں جان نہ ہو کہانی کا تانا بانا بوجھل ہو جاتا ہے۔ افسانہ اپنی وسعت میں مٹی کے محل بنانا اور پھر ان میں جان ڈالنے کے مترادف ہے جب کہ شعر جذبات کے سمندر کو کوزہ میں بند کر لینے کا ہنر ہے۔“

اب ہم گفتگو کر رہے تھے اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں۔ کرامت کہنے لگے، ”اردو زبان کے لئے لاطینی رسم الخط اپنانے کا مسئلہ کسی وبائی مرض کی طرح تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھتا رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ رسم الخط بدلنے کی آخر ایسی ضرورت کیا ہے؟ کیا اردو کے موجودہ رسم الخط میں



اتنی وسعت، پک یا گنجائش نہیں کہ وہ جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ چل سکے؟ میرے خیال میں یہ استدلال قطعاً بوجہ اور بے بنیاد ہے۔ اگرچہ جاپانی زبانوں کے رسم الخط جو اردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں، اپنے آپ کو جدید ٹیکنالوجی کے لوازمات کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں تو پھر اردو میں ایسی کوئی دائمی کمزوری ہے کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ اگر عربی اور فارسی، جو اردو کی بزرگ زبانیں ہیں اور جن سے اردو کا موجودہ رسم الخط مستعار لیا گیا ہے، اپنے آپ کو جدید دور کے قدم سے ہم آہنگ اور مربوط کر سکتی ہیں تو پھر اردو کیا ازلی لتکڑی لولی ہے کہ اسے جدید دور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لئے ایک نئے رسم الخط کی بیساکھیوں کی ضرورت ہو۔

میری ناقص رائے میں کسی بھی زبان کا مروجہ رسم الخط بدلنا کسی انسان کے مذہب تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اتنا بڑا قدم کسی بڑی مجبوری یا انقلابی ضرورت کے بغیر نہیں اٹھایا جاتا۔ اور میرے نزدیک اردو کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری ہے نہ اسے ایسی کوئی ضرورت لاحق ہے کہ وہ اپنے خوب صورت اور جامع و پک دار پیرہن یعنی رسم الخط کو بدلنے کی فکر کرے۔

اردو رسم الخط کو بدلنے کے داعی اپنے استدلال کو وزن دار بنانے کے لئے اکثر ترکی زبان کی مثال پیش کرتے ہیں جو ایک اعتبار سے اردو کی معنوی ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان کا یہ استدلال دراصل بہت ہی بے وزن اور کم مایہ ہے۔ میں ترکی میں رہا ہوں اور میں نے ترکی پر اس نئے رسم الخط کے اثرات کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس جزئیاتی تجزیہ کے بعد میں افسوس کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ترکی زبان کے لاطینی رسم الخط نے، جو کمال اتاترک کی انقلابی اصلاحات کا ایک اہم ستون تھا، کلاسیکی اور اصلی ترکی زبان پر بڑا بھاری ظلم کیا ہے اور اس کے باطنی حسن کو بڑی حد تک قبیح اور مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔

زبان چاہے وہ اردو ہو یا ترکی، محض ٹائپ رائٹر یا کمپیوٹر کے کی بورڈ (key board) سے مرتب ہونے والے حروف اور الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ بلکہ زبان اپنے بطن اور ملبوس میں ایک مکمل ثقافتی وجود کی حامل ہوتی ہے۔ ہماری اردو زبان میں تو بطور خاص ثقافتی، تہذیبی اور معاشرتی عناصر بہت ہی زیادہ جامعیت اور وسعت کے آمینہ دار ہیں۔ اردو ایک مکمل تہذیب ہے اور اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ اگر پردے کے پیچھے دو افراد گفتگو کر رہے ہوں تو اردو زبان سے شناسا سامع یہ سہولت یہ بتا سکتا ہے کہ مخاطبین مرد ہیں، عورت ہیں، مرد و عورت ہیں، ان میں آپس میں رشتہ کیا ہے، ان کا سماجی رتبہ اور مرتبہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ شاید ہی کسی اور زبان میں ایسی ہمہ گیر آفاقیت اور جامعیت موجود ہو۔ یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے اس ثقافتی جامعیت کا رسم الخط سے کیا تعلق ہے؟ میں کہوں گا بہت گہرا ہے۔ اس لئے کہ رسم الخط سے تلفظ بنتا ہے اور تلفظ سے زبان کا لحن اور صوتی نقش مرتب ہوتا ہے۔ ترکی زبان کی مثال یہاں بہت صادق آتی ہے۔ جب سے لاطینی رسم الخط کو رائج کیا گیا کلاسیکی ترکی کا لحن اور صوتی تاثر ختم ہو گیا۔ اب ترکی زبان کا لب و لہجہ لاطینی زبانوں سے زیادہ مملو اور متاثر ہے بہ نسبت اس



قربت کے جو ماضی میں اسے عربی اور فارسی زبانوں سے تھی۔

اور پھر ہماری اردو میں تو وہ لجن اور صوت مضمر ہے جو لاطینی کے حروف تہجی کسی طرح سے ادا ہی نہیں کر سکتے۔ ڈ، ژ، ث وغیرہ حروف سے نکلنے والی آوازیں آپ لاطینی لائٹھی سے کس بنجر زمین میں مار کر نکالیں گے؟ اردو زبان کا سب سے بڑا حسن تو یہ ہی اس کے صوتی اثرات اتنے تنوع اور بقول کے رئیس ہیں کہ حلق سے نکلنے والی ہر آواز اور تاثر کو اپنی پونگی میں باندھ لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں جب فرانسیسی زبان سیکھ رہا تھا تو میرے استاد کو اس بات پر بہت حیرت ہوئی تھی کہ پوری کلاس میں، میں تنہا شاگرد تھا جو پیرس کے 'غ' آلود حلق سے نکلنے والے الفاظ ان کے صحیح صوتی تاثر کے ساتھ ادا کر سکتا تھا۔ یہ سب میری مادری زبان کی آفاقی ہمہ گیری کے سبب تھا۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اردو کہ بنیادی ڈھانچے میں کوئی کمزوری ہے۔ نہیں، ہر گز نہیں۔ جسدِ اردو میں بلا کی صلابت بھی ہے اور پلک بھی۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان اتنی وسیع القلب ہو جتنی اردو ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ دنیا جہاں کی زبانوں کے الفاظ اردو کے قالب میں یوں سمٹ آتے ہیں جیسے سیپ میں گہر اور یوں جاگزیں ہو جاتے ہیں جیسے انگشتری میں نگینہ۔ وہ معترض جو یہ کہتے ہیں کہ اردو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے موجودہ رسم الخط کے سبب ناکافی ہے، محض اردو سے مخلصت کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ کیا رسم الخط بدلنے سے یہ صلاحیت راتوں رات پیدا ہو جائے گی؟ ہر گز نہیں۔ ترکی زبان کا رسم الخط بدلے "چھتر (۷۵) برس سے زیادہ ہو چکے، اس میں تو یہ صلاحیت آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ اور پھر جدید سائنس اور تحقیقات و ایجادات سے مستفید ہونے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں تراجم کو اولیت دیں جو دوسری زبانیں دیتی ہیں۔ میں نے جاپان اور ترکی میں بطور خاص دیکھا کہ ترجمے کی سہولتیں اتنی عام اور وسعت کی حامل ہیں کہ ہر نئی اور ضروری کتاب کا ترجمہ انگریزی، جرمن یا فرانسیسی زبانوں سے دنوں میں ہو جاتا ہے۔ اور یہی کمپیوٹر کے دور کی اصلاحات سے استفادہ کی بات تو جس زبان کے بولنے والے ایٹمی صلاحیت میں دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے ہم عصر ہو سکتے ہیں کیا وہ کمپیوٹر کے میدان میں کسی سے پیچھے رہ سکتے ہیں؟"

کرامت جاگنگ (jogging) بھی کرتے ہیں، گھر کی صفائی بھی اور مطالعہ بھی خوب کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کن موضوعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا، "میرے مطالعے کے موضوعات بڑے متنوع ہوتے ہیں اور میں حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ موضوعات پر مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اردو اور انگریزی فکشن، دونوں پڑھتا ہوں۔ نثر اور نظم میں اعتدال قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، گو نثر نظم کے مقابلہ میں زیادہ پڑھتا ہوں اور اردو کی بہ نسبت انگریزی میں زیادہ پڑھتا ہوں۔ ویسے میرا سب سے پسندیدہ موضوع تاریخ ہے اور اسی سے منسلک تاریخ ساز شخصیات کی سوانح کا مطالعہ بھی مجھے مرغوب ہے۔ جغرافیہ اور معاشیات بھی میرے پسندیدہ موضوعات ہیں اور پھر بین الاقوامی امور اور تعلقات جو میری سفارتی زندگی کی پیشہ ورانہ اساس رہے ہیں۔ میں نئی کتابیں بھی بہت پڑھتا



ہوں اور مختلف اخبارات اور رسائل کے لئے ان پر تبصرے بھی لکھتا ہوں۔ اور جرائد، رسائل اور اخبارات بھی بے تحاشہ پڑھتا ہوں۔ کالم نویس کے لئے، جو اب افسانہ نگاری سے زیادہ میری پہچان مبنی جا رہی ہے، مطالعہ کی گہرائی اور گیرائی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ میں انٹرنیٹ سے بھی رجوع کرتا ہوں کیوں کہ یہ دور انٹرنیٹ کا ہے۔ اب رسائل و جرائد اور کتابیں بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں اور بہ کفایت پڑھی بھی جاسکتی ہیں اور اپنی سہولت کے اعتبار سے بھی۔ انٹرنیٹ سے صرف نظر نہ صرف محال ہے بلکہ اس کی اہمیت اور افادیت سے چشم پوشی میرے نزدیک اس دور میں مجرمانہ غفلت کے مترادف ہے۔

ایک سوال تنقید کے حوالے سے بھی تھا۔ کرامت نے کہا، ”تنقید لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اور اس ذمہ داری کو بطریق احسن نبھانا کوئی آسان بات نہیں۔ میرے خیال میں فی زمانہ اردو تنقید اس پل صراط سے بمشکل گزر پارہی ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں دو بڑی وجوہ یہ ہیں، پہلی یہ کہ تنقید لکھنے اور پڑھنے، دونوں کا ہی شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے تنقید کا فن صرف چند ایک ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ عام قاری اسے دشت نور دی یا کوہ پیما کی طرح خشک اور لا حاصل سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ تنقید اب صرف سنجیدہ قارئین کی بساط ہی رہ گئی ہے۔

دوسری وجہ تنقید کے غیر مقبول ہونے کی یہ ہے کہ تنقید نگار میانہ روی کو عام طور سے ترک کر دیتے ہیں۔ یا تو صاحب مضمون کی تعریف میں اس کے فنی قد کاٹھ سے بہت آگے نکل جاتے ہیں یا پھر دوسری انتہا یہ ہوتی ہے کہ تنقید کو تنقیص کا روپ دے دیا جاتا ہے جو ایک طرح سے قلم کی زور آزمائی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ میں تنقید نگار اور اس کے ہدف میں ایک طرح کا اکھاڑا کھل جاتا ہے۔

اچھی اور بامقصد تنقید لکھنا بلاشبہ ایک مشکل کام ہے اور بہت زیادہ عرق ریزی مانگتا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت مطالعے کی وسعت ہے جس کے بغیر نقاد کے بیان میں گیرائی نہیں آتی اور اس کے قلم کی کاٹ بھونڈی اور ناہموار رہتی ہے۔ شاید یہ ہی سبب ہے کہ اردو میں فی زمانہ پائے کے نقاد بس گئے چنے ہیں جن میں معتبر نام تو کلیم الدین احمد مرحوم کا ہے یا ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں اور گوپی چند نارنگ ہیں۔ ایں نے پوچھا، ”کرامت آپ خود تنقید کیوں نہیں لکھتے؟“ جواب میں کرامت نے کہا، ”میں تنقید اس لئے نہیں لکھتا کہ سچی اور اچھی تنقید لکھنے کے لئے جس مطالعہ ادب کی ضرورت ہے وہ میرے پاس نہیں۔ فکشن اور کالم نگاری میرے لئے یوں سہل ہیں کہ کہانی کے کردار میں خود ڈھالتا ہوں اور پھر اپنے قلم کی نوک سے ان میں جان ڈال دیتا ہوں۔ رہی کالم نگاری تو اس میں بھی کسی کالم کو اس وقت تک تحریر نہیں کرتا جب تک اس کے موضوع پر مجھے مکمل گرفت نہ ہو۔ اور یہاں یہ کہتا چلوں کہ اچھا کالم لکھنا بھی آسان نہیں۔ اس کے لئے مطالعہ اور تجربے کی وسعت بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کالم لکھنا خامہ فرسائی سے زیادہ کچھ نہیں۔“

Mr. Kramat-ul-lah Ghorii,

7 Cantex Court, Richmond Hill, Ontario L4S 1B1, Canada





نورانی

ایسے آئی سے مری یاد اجاڑ  
جسٹ بگڑ نہری کوئی بھڑو سے نظر  
اک گھنٹہ ماضی کے جنگل میں ملی مو

ایک کاپی من: گلزار  
20/11/2008

گلزار

ممبئی، ہندوستان

کچھ لوگوں سے مل کر ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے، ایک ایسی طمانیت کہ اسے کوئی واضح نام نہیں دیا جاسکتا۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں جیسے بھری دھوپ میں ٹھنڈے میٹھے مشروب کے پہلے گھونٹ سے جو تسکین حاصل ہوتی ہے یا جھلکتی دوپہر میں سوانیزے پر آئے ہوئے سورج کے نیچے چاندنی جیسی ٹھنڈک لینے ہوا کے ایک نرم ٹھنڈے شبنمی جھونکے سے جو راحت ملتی ہے تو بس یوں سمجھئے کہ گلزار سے مل کر بھی ویسی ہی طمانیت کا احساس اور راحت ملتی ہے۔

میں ان سے ۱۹۹۹ء میں پہلی بار ملی تھی۔ میرے ساتھ میری دوست امینہ بھی تھی جو بڑودہ (صوبہ گجرات) سے ممبئی مجھ سے ملنے آئی تھی۔ گلزار سے ڈھیر ساری باتیں بھی ہوئیں۔ چائے بھی پی اور گلزار کے گھر کی مٹھائی بھی چکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ گلزار نے دینہ، جہلم پاکستان کی مٹی سے جنم لیا ہے۔ لیکن چہرے مہرے سے گلزار مجھے بنگال کے لگے تھے یا چوں کہ ان کی بیگم راکھی کا تعلق بنگال سے ہے اس لئے میرے ذہن کے کسی تار نے ان کی ڈور بنگال سے باندھ دی ہو۔ مگر مجھے گلزار کا لہجہ بھی پنجابی نہ لگا۔ ان کا لہجہ ایک سچے شاعر اور ایک کھرے ادیب کا تھا۔ جسے دنیا کی ہر زبان سے انیت ہوتی ہے اور دنیا کے سارے انسان اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ چاہے آپ اس کی کہانیاں پڑھ لیں یا اس کے اشعار۔



گلزار نے مجھے اپنے افسانوں کا مجموعہ ”دستخط“ پر میرا نام لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے دیا۔ پھر مجھے گلزار کے کلام کا مجموعہ ”چاند پکھراج کا“ جو روپا اینڈ کمپنی نئی دہلی نے آرٹس جتن داس کے تصویری خاکوں سے سجا کر شائع کیا ہے، برطانیہ میں میرے بھانجے ڈاکٹر قمر نواز سے ملا۔ قمر، جاوید صاحب کی بہن کینز اور نواز چودہری کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے آکسفورڈ، برطانیہ سے پی ایچ ڈی کیا ہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی بے حد لگاؤ ہے۔ قمر نے بتایا کہ اس کتاب کی صرف ایک کاپی ایک کتب فروش کے پاس بچی تھی۔ میں نے قمر سے کتاب مانگ کر اس کی ورق گردانی شروع کی۔ صفحہ ۱۶ پر ایک نظم ہے ”اخبار“۔

سارا دن خون میں لت پت رہتا ہوں // سارے دن میں سوکھ سوکھ  
کے کالا پڑ جاتا ہے خون // اپڑی سی جم جاتی ہے // اکھرج کھرج کے  
ناخونوں سے // چمڑی چھلنے لگتی ہے // ناک میں خون کی کچی بو // اور  
کپڑوں پر کچھ کالے کالے چلتے سے رہ جاتے ہیں // روز صبح اخبار  
میرے گھر آتا ہے // خون میں لت پت آتا ہے۔

اسی مجموعے میں صفحہ ۲۵ پر ”دستک“ کے عنوان سے ایک نظم ہے.....  
صبح صبح اک خواب کی دستک پر دروازہ کھولا، دیکھا

اور پھر گلزار نے آگے مہمانوں کی آمد، ان کا مکی کی روٹی اور گڑ لانے کا ذکر، اور پھر خواب کا لہو لہو ہونے کو نظم کیا ہے۔، کیوں کہ.....

سرحد پر کل رات، سنا ہے // کچھ خوابوں کا خون ہوا تھا!

کے اختتام پر قاری کے خواب بھی لہو لہو ہو جاتے ہیں۔

میں نے جب بھی گلزار کی شاعری پڑھی یا اس کی نثر، مجھے غالب کا یہ شعر بے ساختہ یاد آیا جو

میں دو الفاظ کے تصرف سے لکھ رہی ہوں

دیکھنا تحریر (تقریر) کی لذت کہ حواس نے لکھا (کہا) میں نے یہ جانا کہ گویا، یہ بھی میرے دل میں ہے

گلزار کو میں ان کی فلموں کے حوالے سے تو جانتی تھی مگر ان سے ملاقات کا وسیلہ لاہور کے

ایک صحافی طفیل اختر کے توسط سے ہوا جو ایک خوب صورت جریدہ ”مسکراہٹ“ شائع کرتے ہیں۔

بالکل اپنی حسین اور کھری محبت کی طرح اپنے جریدے کو بھی سنوارتے ہیں۔ طفیل نے گلزار سے میرا

تعارف کرایا اور ”سخنور حصہ دوم“ کے لئے گلزار نے اپنا تعارف مجھے بھیج دیا۔ مگر اس تعارف سے میں

مطمئن نہ تھی۔ چنانچہ جب میں ممبئی گئی تو گلزار سے ملاقات لازمی ٹھہری۔ پھر اس کے بعد گلزار سے

ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ممبئی جائے بغیر ان کی تحریروں کے ذریعے۔

پچھلے دنوں گلزار کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”دھواں“ (۱) ملا۔ اس کی ایک کہانی کا میں حوالہ

۱۔ اس مجموعے پر جناب قیصر جمیلین کے تبصرے سے چند اقتباسات اس مضمون کے اختتام پر شامل کیے گئے ہیں۔ یہ

اقتباسات قارئین کو گلزار کے فن سے متعارف کرانے میں معاون ہوں گے۔ سلطانہ مہر



دینا چاہوں گی۔ عنوان ہے ”کس کی کہانی“ کہانی کار نے اس کا آغاز اس طرح کیا ہے۔ ”اتنا بھاری نام ہے ’انو‘ کا! تب پتا چلا جب اسکول کے میگزین میں اس کی کہانی چھپی۔ اہل کمار چنوا دھیاے! چھٹی جماعت۔ تب ہی سے افسانہ نگار بننے کا شوق تھا اسے۔ کہانیاں خوب سوچتی تھیں اور مجھے تو ہمیشہ سے یقین رہا کہ شاعر یا ادیب ہونا کسی خدائی دین کی بات ہے ورنہ ہر کوئی شاعر نہ ہو جاتا! انو میں وہ بات تھی جو بڑے بڑے فن کاروں کو پیدا کشتی ملتی ہے۔“

اب کہانی کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر میں کہانی کے آخری حصے میں آپ کو شامل کرنا چاہتی ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ کہانی کار نے جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ بات، وہ نکتہ آپ تک پہنچ جائے گا۔۔۔۔۔۔ ”اب میں اس کے بارے میں اکثر اخبار میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ جب کوئی نئی کتاب چھپتی وہ مجھے ضرور بھیجتا۔ برسوں بعد ایک بار پھر دلی جانا ہوا۔ میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ اس سے کہا تھا اپنے رائٹر دوست سے ضرور ملاؤں گا۔

اسی شام جامن کے پیڑ کے نیچے انو اپنی کھیریاں پالش کر رہا تھا گھسیٹا سے۔ اس کا اڈا اب بھی وہی تھا۔ بات پھر نکلی افسانے کی۔ ”نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور تھا۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ کہانی صرف ایک منطقی رشتے کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت کا نام ہے جو کردار کے تحت الشعور میں واقع ہو رہی ہو۔

میں منہ کھولے چپ چاپ سن رہا تھا۔ اہل کہہ رہا تھا، ”بچھلے پچاس برسوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اردو افسانے میں۔ ہماری کہانی نے ان پچاس برسوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اسے دنیا کے کسی بھی۔۔۔۔۔۔

گھسیٹا نے چمکتی کھیریاں آگے کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔ ”کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب؟ جن کی کہانی لکھتے ہو وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں اور آپ اپنے بھائی کی بیٹھک چلا رہے ہیں۔ ترقی کون سی کہانی نے کر لی۔۔۔۔۔۔؟“

کھیریاں دے کر گھسیٹا ایک چپل کے انگوٹھے کا نازکا لگانے میں مصروف ہو گیا۔۔۔۔۔۔ ”آگے کسی تبصرے کی ضرورت نہیں کہ کہانی کار نے کیا کہنا چاہا ہے۔ بہت سیدھے سادے انداز میں قاری کے سامنے بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اسی افسانوں کا مجموعہ ”دھوان“ پر گلزار کو سن ۲۰۰۲ء کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے۔

کراچی سے شائع ہونے والے ”ماہی جریدے“ ”روشنائی“ کا سالنامہ اپریل تا جولائی ۲۰۰۳ء کا شمارہ میں نے جناب قیصر تمکین کے پاس دیکھا۔ اس میں گلزار کی ایک نظم ہے ”کتابیں“۔ اس نظم کو پڑھیے۔ ایک دل گداز حقیقت کی طرف کتنا پُر اثر اشارہ ہے۔ یہ نظم مجھے ایک کہانی کا موضوع ہی نہیں ایک خوب صورت عنوان بھی دے گئی۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

”کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے // بڑی حسرت سے تکتی



ہیں // مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں // جو شاہیں ان کی صحبت میں  
کٹنا کرتی تھیں، اب اکثر گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر // بڑی  
بے چین رہتی ہیں کتابیں

پھر گلزار نے ..... ایک حساس شاعر نے کہا۔

کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے // کبھی سینے پر رکھ کر لیٹ  
جاتے تھے // کبھی گودی میں لیتے تھے // کبھی گھٹنوں کو اپنے رطل کی  
صورت بنا کر // نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے // چھوتے تھے جبیں  
سے // خدا نے چاہا تو وہ سارا علم تو ملتا رہے گا بعد میں بھی مگر وہ جو  
کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول // اور مہکے ہوئے رقعے  
// کتابیں مانگنے، گرنے، اٹھانے کے بہانے // ارشتے بنتے تھے // ان  
کا کیا ہوگا // وہ شاید اب نہیں ہوں گے۔

میں نے یہ نظم پڑھی اور گلزار کے افسانے بھی، تو انہیں خط لکھا ۱۳ / نومبر ۲۰۰۳ء کو کہ میں ان کا تعارف  
”گفتنی حصہ دوم“ میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔ معروف فلم ساز اور ڈائریکٹر نے مجھے فوراً جواب دیا کیوں  
کہ وہ ایک حساس شاعر بھی ہیں۔ خط میں لکھا تھا.....

”سلطانہ جی! آداب، حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔“

پھر انہوں نے پوچھے گئے سوالات کے جواب لکھے ہیں۔ عکس تحریر کے لئے ایک ”ترویخی“ بھیجی ہے  
جس کے بارے میں گلزار کہتے ہیں..... ”یہ میری ایجاد کردہ ایک نئی صنف شاعری (form) ہے۔ یہ  
ہائی کو بھی نہیں، مثلث بھی نہیں، یہ تین مصرعوں کی نظم بھی نہیں۔ اس میں پہلے دو مصرعے مکمل شعر ہیں۔  
خیال پہلے دو مصرعوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ تیسرا مصرعہ روشن دان کی طرح کھلتا ہے۔ اس کی روشنی میں  
پہلے شعر کا تاثر بدل جاتا ہے۔ تیسرا مصرعہ کمنٹ (comment) بھی ہو سکتا ہے اور اضافہ بھی۔ ترویخی  
میں شوخی اور حیرت کا ایک رنگ بھی ہے۔ میں نے اس کا نام ترویخی یوں رکھا ہے کہ الہ آباد میں ترویخی  
کے سنگم پر جہاں گڑگا، جمناسر سوتی، تین بہاؤ آپس میں ملتے ہیں۔ سرسوتی زمین کے نیچے ہے جس کے  
نشان پاکستان میں ٹیکسلا کے مقام پر ملتے ہیں۔ میں نے اسی کے نام پر ترویخی نام رکھ دیا۔ پہلی بار میں  
نے ترویخی ریڈیو پر اپنے انٹرویو میں سنائیں جب مجھ سے کہا گیا ’ترویخی‘ سنائیے تو مجھے تو بہت خوشی ہوئی  
کہ ریڈیو تک یہ فارم (form) پہنچی۔ دوسری بار رڈیو ٹیلی کلب کے مشاعرے میں احمد آباد گیا۔ مجھ سے کہا  
گیا کہ آپ مشاعرے کے بارے میں دو لفظ کہیے۔ اس لمحے سامعین سے آواز آئی دو نہیں تین، ترویخی  
سنائیے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ ترویخی نے سفر کیا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں نہ صرف  
جانتے ہیں بلکہ پسند بھی کرتے ہیں۔ میں نے یہ باتیں بابا کو بھی بتائیں (گلزار جناب احمد ندیم قاسمی کو  
بابا کہتے ہیں)۔ بابا نے مجھے ایک اور صنف ’تراخیلے‘ سے متعارف کرایا۔ اس میں ایک مصرعہ تین بار



کروٹ لیتا ہے۔ تراٹیلے میں سات مصرعے ہوتے ہیں۔ گلزار کی نئی ترویجی ان کے عکس تحریر میں ملاحظہ ہو۔ اور ایک یہ بھی ہے۔

اُڑ کے جاتے ہوئے پنچھی نے بس اتنا دیکھا  
دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی شاخ خفا ہو کر  
الوداع کہنے کو؟ یا پاس بلانے کو!

۱۹۳۶ء، دینہ، پاکستان میں جنم لینے والے گلزار کے بارے میں اب ہم ان ہی سے پوچھتے ہیں۔ ”پہلا سوال یہ کہ گلزار تو آپ کا ادبی نام ہے۔ والدین نے جو نام رکھا تھا وہ بھی بتا دیجئے۔“  
گلزار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور پھر اس مسکراہٹ نے ان کے چہرے کو اپنے ہالے میں لے لیا۔ ”یہ ایک کلیشے (cliche) ہے آپ اسے کیوں برباد کرنا چاہتی ہیں۔ جو کلیشے میں بند رہنا چاہتے ہیں انہیں بندھے رہنے دیں۔“

مگر چوں کہ اب یہ کلیشے نہیں رہا اس لئے میں آپ کو بتا دوں کہ..... نہیں میں نہیں بتاتی۔ ہم ان کی بھابی جی راجند کور سے پوچھتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ ”میں گلزار کو اپنی کہتی ہوں کیوں کہ یہ نام میں نے گلزار کے اصلی نام ’سمپورن سنگھ‘ سے لیا ہے۔“

وہ گلزار کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں کہ خود گلزار بھی اپنے بارے میں نہیں جانتے ہوں گے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے جو طفیل اختر کے ”مسکراہٹ“ شمارہ ”پزیرائی گلزار“ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتی ہیں۔

”پنی ہمیشہ سے خود مختار ذہن کا مالک ہے۔ اس نے اپنا پیشہ خود سے چنا۔ وہ ہمیشہ اپنی مرضی سے کام کرتا ہے اور عجیب عجیب فیصلے اپنے لئے کرتا ہے۔ جن پر آس پاس کے لوگ چونک جاتے ہیں۔ اس طرح کا ایک فیصلہ اس کا کیس اور داڑھی مونچھ منڈوانے کا تھا جس پر میں تو زیادہ پریشان نہیں ہوئی لیکن میرے سر جی بکے بکے رہ گئے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ پنی اپنے آبائی دھرم کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ پنی کس فطرت کا آدمی ہے۔ وہ مضبوط لیو (Leo) ہے لیکن ایک چیز پر میں ہرگز اعتبار نہیں کروں گی اگر کوئی کہے کہ وہ نت نئی ہیر وئن میں دل چسپی لیتا ہے۔ اگر آپ میرے سنگے بیٹے کے بارے میں کہیں تو میں یقین کر لوں گی لیکن پنی کے بارے میں نہیں۔ وہ عورتوں کے معاملے میں بڑا صاف اور شرمیلا آدمی ہے۔ وہ گڑ بڑ گھٹالا کر ہی نہیں سکتا۔“

گلزار کی ایک بیٹی ہے میگھنا جسے پیار سے وہ بوسکی کہتے ہیں۔ گلزار کے گھر کا نام ’بوسکیا نڈا‘ کے نام پر ہے۔ گلزار بیٹی کو بہت چاہتے ہیں۔ وہ اس کے لئے شعر بھی کہتے ہیں اور فلم سازی کی تربیت بھی دیتے ہیں۔ راجند کور کہتی ہیں۔ ”گلزار کپڑوں کے معاملے میں بہت سادہ اور باوقار ہے۔ صاف ستھرے چمکدار دانت اس کی کمزوری ہیں۔ گھر میں جو کچھ پکا ہو رغبت سے کھا لیتا ہے۔ ناک بھوں نہیں چڑھا تا نہ ہی نقص



نکالتا ہے۔ البتہ کھانے کے ساتھ گھر میں کچھ میٹھا موجود ہو تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔  
میں نے گلزار سے پوچھا، ”آپ کا پسندیدہ افسانہ نگار کون ہے اور کیا آپ نے کبھی سوچا کہ اردو کے بجائے آپ کسی اور زبان میں لکھتے تو زیادہ پزیرائی ہوتی؟“

کہنے لگے، ”جینوف میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ روسی زبان میں لکھتے تھے انگریزی میں نہیں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں انگریزی میں لکھنے کو ترجیح دوں؟“

گلزار اردو زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں نہیں ہیں۔ کہتے ہیں، ”اتنا خوب صورت رسم الخط گنوانے کو میں تیار نہیں۔ البتہ رسم الخط کے ساتھ ساتھ زیادہ ضروری ہے اردو زبان کو زندہ اور رائج رکھا جائے۔ ستر فی صد زبان جو ہم بولتے ہیں اور خصوصاً ہماری فلموں میں سنائی دیتی ہے وہ اردو ہے۔ وہ اگر اداکار اور اداکارائیں دیوناگری یا رومن رسم الخط میں لکھ کر بھی بولتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ موجودہ حالات کے مطابق اگر اردو دیوناگری میں بھی لکھی جائے تو کیوں اعتراض کیا جائے۔ رسم الخط سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ زبان کو صحیح تلفظ کے ساتھ زندہ رکھا جائے۔ مثال کے طور پر شبانہ اعظمی جو کیفی اعظمی کی بیٹی ہیں اور جاوید اختر (جان نثار اختر اور صفیہ اختر کے صاحب زادے) کی اہلیہ ہیں اور خوب صورت اردو بولتی ہیں لیکن اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں اور دیوناگری میں لکھتی ہیں تو کیا اس اردو کو اردو نہیں مانیں گے؟“

گلزار بہت اچھی اردو لکھتے ہیں اسی لئے بہت اچھی کہانیاں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔ تقریباً ساٹھ ستر فلموں کی کہانیاں لکھی ہوں گی۔ چند فلموں کی ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں اور وہ گلزار کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان میں ”میرے اپنے، اچانک، آندھی، موسم، خوب صورت، خوش بو، نیو، بلی ٹائمز، کنارہ، میرا، پرستے، کتاب، لیکن، اجازت، لباس اور ماچس“ وغیرہ ہیں۔ دور درشن (ٹی وی) کے لئے دو سیریل بھی بنائے ہیں، ”کردار“ اور ”مرزا غالب“۔

فلموں کے حوالے سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ان سے گفتگو کی تھی جسے انہوں نے اپنے سہ ماہی جریدے ”نیاسفر“ میں شائع کیا۔ اس گفتگو میں گلزار نے کہا کہ ان کی تعلیم کا پس منظر اردو تھا۔ مگر محض اردو کے سہارے لکھنا، پڑھنا اور جینا خاصا مشکل کام تھا اس لئے انہیں فلم کو ذریعہ روزگار بنانا پڑا۔ اور پھر اس وجہ سے بھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ گلزار اپنا (APTA) سے بھی وابستہ تھے جہاں بلراج ساہنی اور شیلندر کے ذریعے وہ اپنے بھل دا (ڈاکٹر بھک رائے) تک پہنچے۔ اور بھل رائے کی ماتحتی میں کام کر کے اس منزل تک پہنچے کہ وہ آج ہندوستان کے کہانی نویس، گیت کار اور ہدایت کاروں کی فہرست میں اہم مقام کے حامل ہیں۔

بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوگا کہ معاش کی جدوجہد میں گلزار نے ایک گیراج میں بھی کام کیا۔ بھل رائے سے ملاقات ہوئی تو ان کی ایک فلم کے لئے گلزار نے گیت لکھا۔۔۔ میرا گوارنگ لے جا مجھے شام رنگ دے جا۔۔۔ پھر بھل رائے کے اصرار پر گلزار نے گیراج چھوڑا۔ انہوں نے کہا تھا،



”گیراج تمہارے لئے مناسب جگہ نہیں۔ تم اردو جانتے ہو، بنگلہ ادب سے واقف ہو، شاعری وادبی ذوق ہے تمہارے پاس۔“ بمل رائے نے گلزار کو خوب پہچانا اور گلزار نے بمل رائے کو۔ پھر گلزار نے اپنے استاد کے نام پر ایک کہانی لکھی ”بمل دا“ جو ان کی کہانیوں کے مجموعے میں شامل ہے۔

گلزار کہتے ہیں۔ ”افسانہ لکھنے کے لئے لمبے صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ روزگار کی زندگی میں نثر اس قدر لکھی اور پڑھی کہ شاعری گوشہ نشینی کی وجہ بن گئی۔ کبھی لمبے سفر پر نکلے تو کوئی افسانہ اپنی پوری تشکیل کے ساتھ سامنے آگیا یا کبھی گاہے بگاہے لکھی ہوئی ذائری دہراتے ہوئے صفحوں میں رکھا مل گیا۔ فلم اسکرپٹ لکھتے ہوئے کوئی نیا کردار سوچا مشاہدہ میں آیا تو جی چاہا اس پر افسانہ لکھیں یا اسکرپٹ کرتے ہوئے کوئی بڑی انوکھی پیمائش پیدا ہو گئی، انسانی زندگی کی جھلک رو برو آ گئی، انسانی رشتوں کی کوئی نئی پرت کھل گئی تو اس پر افسانہ لکھ لیا۔ جو فلم میں نہیں سہا یا اسے الگ سے جمع کر لیا یا پھر کچھ افسانے یوں ہوئے کہ پھوڑوں کی طرح نکلے، وہ حالات، ماحول اور سوسائٹی کے دیئے ہوئے تھے۔ سو ہم نے کبھی نظم کہہ کے خون تھوک لیا اور کبھی افسانہ لکھ کر زخم پر پٹی باندھ لی۔“

Mr Gulzar,

Boskiyana, Pali Hill, Bandra, Mumbai, 400050. India.

دھواں ..... گلزار کے افسانوں کا مجموعہ: مبصر قیصر تمکین

دھواں، گلزار کے ستائیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کوئی افسانہ تین چار صفحات سے زائد کا نہیں ہے جس سے ایک تاثر قبیل کا بھی ہو سکتا ہے جیسے لکھنے والے نے ایک ہی نشست میں کسی خاص کیفیت میں قلم برداشتہ لکھ ڈالا ہو۔ ہر کہانی کسی اخباری روداد کی طرح کفالت لفظی کے علاوہ وحدت تاثر کی حامل بھی ہے۔ کہیں کہیں ہمیں چونکا دینا والا انداز بھی ملتا ہے اور کہیں ہم کہانی پڑھ کر ”اچھا“ اور ”بہت خوب“ کہہ کر بات ختم کر سکتے ہیں لیکن بیان واقعہ یا یہی اختصار ان کے فن کا ایک مضبوط پہلو اور ذاتی خصوصیت بھی ہے جس کی وجہ سے ہم گلزار کو ایسا کہانی کار تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جو مختصر افسانے کی تعریف سے نہ صرف یہ کہ واقف ہے بلکہ اس کو برتتے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔

فنی اور تاثراتی لحاظ سے بعض واقعی قابل مطالعہ کہانیاں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ بعض کا تاثر شدید اور تادیر قائم رہنے والا ہے۔ کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جن کو پڑھ کر بھول جانا شاید آسان ہوگا لیکن مجموعی تاثر جو اس کتاب کا ہے وہ ہمیں گلزار کی چوکس اور ہمہ وقت محتاط نگاہ کا ملتا ہے اس کی نظر آس پاس کی زندگی کے تقریباً ہر گوشے تک پہنچ جانے اور وہاں سے زندگی آمیز حقائق و نکات نکال لانے پر قادر ہے۔ گلزار کسی خاص طبقے، ادارے یا تہذیبی سیاسی پابندیوں سے وابستگی کا ادیب نہیں ہے بلکہ عربی شعر و ادب کی اصطلاح میں اس کو بدایع البیان کہا جاسکتا ہے۔





زندگانی کی حقیقت کو کہن کے دل سے بوجھ  
جوئے سیر و سیر و سنگ گراں ہے زندگی

مبارک کا پڑی

## مبارک کا پڑی

ممبئی، ہندوستان

میں داس کبیر کے دو ہے پڑھ رہی تھی۔ کیا بانی ہے ان دو ہوں کی اور کیسے کیسے اسرار چھپے ہیں ان  
اکشروں (لفظوں) میں کہ پلے پڑ جائیں اور رب میرا توفیق دے تو یہ مائی سے بنایا ہوا لہرش (انسان) ایک جگہ گاتا  
سورج بن جاتا ہے۔ اور اس کی روشنی جسے ملے اُسے بھی توانائی اور زندگی مل جاتی ہے۔

ایسے لوگ ہمارے آپ کے درمیان بھی ہیں مگر ہم انہیں دیکھتے ہوئے بھی بے خبر ہیں۔ ایسے ہی  
ایک شخص سے میں آج آپ کو ملواتی ہوں جس کا نام ہے مبارک کا پڑی۔ لیکن مبارک کا پڑی سے پہلے آپ کو  
شیق موزک سے ملواتی چلوں جو کبیر کے اس دو ہے کی تفسیر ہیں

پوتھی پڑھی جگ مو اپنڈت ہوانہ کوئے // ڈھائی اکشر پریم کا جو پڑھے سو پنڈت ہوئے

یعنی بڑی بڑی پند و نصائح کی کتابیں پڑھ کر کوئی عالم اور پنڈت نہیں بن سکتا مگر محبت اور پریم کے ڈھائی الفاظ کا  
علم حاصل ہو جائے تو ایک سچا عالم انسان کو انسان سے محبت کی ڈوری میں باندھتا چلا جاتا ہے۔

شیق موزک جنہوں نے میری کتاب ”سخنور“ حصہ دوم یا سوم میرے بھائیوں عبداللہ اور رزاق  
احمد سیانی کے پاس مشی گن امریکہ میں پڑھی۔ وہ اپنے بچوں سے ملنے امریکہ گئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ  
میں کراچی میں ہوں تو وہ پتا حاصل کر کے مجھ تک پہنچے اور وہاں میری کتابیں ”سخنور“ حصہ چہارم اور ”گفتنی“



حصہ اول دیکھیں تو اسی وقت نقد رقم دے کر وہ کتابیں خرید لیں۔ یہ ۲۰۰۰ء کی بات ہے۔ تب سے اب تک وہ گاہے بگاہے تعاون کرتے رہتے ہیں۔ کتابیں اور جرائد بھیجتے رہتے ہیں۔ احباب سے ملاتے ہیں۔ مبارک کا پڑی سے بھی انہوں نے ہی ملوایا۔

مبارک کا پڑی کوئٹہ یورہ ضلع رتنگری، مہاراشٹر، ہندوستان میں ۲/ مئی ۱۹۶۰ء کے دن پیدا ہوئے۔ ان کی مادری زبان مراٹھی ہے۔ لیکن ابتدائی تعلیم مہاراشٹر اردو ہائی اسکول، کڑوئی میں حاصل کی۔ ریاضی میں ایم ایس سی ممبئی یونیورسٹی سے کیا۔ اردو میں ان کی پہلی کتاب ”وکیشنل گائیڈ (Vocational Guide)“ کے موضوع پر شائع ہوئی۔ ان کے کالموں کا مجموعہ ”صبح“ کے عنوان سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی پشت پر معروف صحافی، کہانی نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس کی تحریر ہے۔ انہوں نے مبارک کے کالموں کے حوالے سے لکھا ہے: ”پہلا صفحہ مبارک کا پڑی صاحب نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں میں وہ چٹکیاں لی ہیں کہ موجودہ سماج، موجودہ سیاست اور اس کی لیڈر شپ کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ آخری صفحہ بھی مبارک کا پڑی صاحب نے لکھا ہے اور اس میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے دل میں ایک سوال ابھرا۔ دنیا جس وقت اتنی آگے بڑھ رہی تھی آخر اس وقت مسلمان کیا کر رہے تھے اور جو جواب دیا گیا ہے وہ ایک سچا ترقی پسند انسان، ایک سچا ہندوستانی اور ایک بہادر مسلمان ہی ہو سکتا تھا۔“

یہ جواب ہمیں مبارک کا پڑی کے کالموں کو پڑھ کر ہی مل سکتا ہے۔ لیکن مبارک نے ہمیں اس کا عملی جواب بھی دیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب ”راہ نما“ مبارک کے اصلاحی و تعلیمی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن جون ۲۰۰۰ء میں، ایڈیشن دوم جون ۲۰۰۱ء میں اور تیسرا ترمیم شدہ ایڈیشن اگست ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اور ہر ایڈیشن تین ہزار کی تعداد میں چھپا۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوگا۔

مبارک کا پڑی کے سر میں یہ سودا کیوں سمایا کہ ”تعلیم کا حصول ہر بچے کا مقدر بن جائے۔“

یہ ایک کہانی ہے اور کہانیوں میں سوائی ہوئی تہہ در تہہ کہانی اس کا بنیادی کردار مبارک کی والدہ محترمہ ہیں جنہوں نے بیٹے کو اس راہ پر لگایا اور دوسرا کردار اس شخص کا ہے جس نے ”راہ نما“ کا دروازہ ان پر بند کیا۔

مبارک نے ”راہ نما“ کا صفحہ تین میرے سامنے رکھا۔ اس پر ایک بزرگ خاتون دیا جلانے بیٹھی ہے۔ نیچے مولانا حالی کا یہ شعر درج ہے۔

سرخ رو آفاق میں وہ ”راہ نما“ مینار ہے      روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

پھر انہوں نے اس شعر کا پس منظر کچھ یوں سنایا۔

”بات شروع ہوتی ہے بڑھیا کا دیا“ سے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی یہ نظم میرے چوتھی جماعت کے نصاب میں شامل تھی۔ چوتھی جماعت تک میری ماں مجھے سارے مضامین پڑھایا کرتی تھیں، ہر روز کم از کم تین گنتے۔ ”بڑھیا کا دیا“ کے تمام اشعار کی مکمل تشریح بیان کرنے کے بعد میری ماں نے کتاب کو پلٹ کر رکھ دیا اور پھر مجھ سے کہا: ”اس بڑھیا کو پتا تھا کہ اس کے صرف ایک چراغ روشن کرنے سے پوری دنیا کا اندھیرا دور نہیں ہوگا۔ مگر بڑھیا کے بس میں صرف



یہ ہی تھا کہ وہ صرف ایک ہی چراغ روشن کر سکتی تھی سو اس نے "کر دیا"۔ بڑھیا کا وہ چراغ اور میری ماں کے وہ الفاظ آگے چل کر میرے لئے راہ نما ثابت ہوئے کہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس روئے زمین یا کسی قوم کی جہالت و پس ماندگی کو مکمل طور پر ختم کرے۔ ہاں البتہ ایک بات ہر ایک کے بس میں ہے کہ جہالت کے اندھیرے کو ختم کرنے کے لئے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ایک ایک چراغ روشن کرے۔

اور اس طرح اپنی سکت بھر ایک آدھ چراغ روشن کرنے کا جذبہ بچپن ہی سے موجود تھا۔ زمانے کے تجھیڑوں نے اس کو تقویت بخشی اور پھر شروع ہوا میرے جنون کا سفر۔ اس سفر کی اونچ نیچ کی داستان سے پہلے پہلی مرتبہ کچھ آپ بیتی ہو جائے کہ تحریک ایسی ہی آپ بیتیوں سے جنم لیتی ہے۔

میں نے آنکھ کھولی کوکن کے رتناگری ضلع کے ایک گاؤں کوئٹہ پورہ میں، ایک گچھڑا ہوا چھوٹا سا گاؤں، جہاں ساتویں جماعت کے بعد پڑھائی کا کوئی نظم نہیں تھا۔ میرے نصیب میں بھی صرف اتنی ہی تعلیم تھی کہ گھر کے حالات انتہائی نامساعد تھے۔ ابا مرحوم کی ماہانہ آمدنی سو روپے تھی اور گھر کے کل افراد چھ۔ مگر حالات جتنے بے رحم تھے، میری ماں کا عزم اس سے کہیں زیادہ بلند۔ لہذا پھر انہوں نے قدم اٹھایا وہ میری اور میرے بھائی بہنوں کی زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا۔ ۱۸ / جون ۱۹۶۷ء کو میری ماں کی قیادت میں ہم سب بچوں نے اپنا آبائی اور پرکھوں کا گاؤں چھوڑ کر ایک دوسرے گاؤں "کڑوئی" ہجرت کر لی، صرف اللہ کے بھروسے پر۔ اور پھر ہماری ماں نے اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا ہمارا حصول تعلیم اور اس خوبی سے انہوں نے یہ جہاد کیا کہ کسی پریشانی کا ہلکا سا سایہ بھی ہم بچوں پر پڑنے نہیں دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کڑوئی گاؤں بڑا پیارا تھا اور اس سے پیارا تھا وہاں کا اسکول، مہاراشٹر اردو ہائی اسکول۔ نہ جانے زندگی کے کتنے ہی اسباق اس گاؤں اور اس اسکول سے مجھے ملے۔

اس سفر کی صعوبتوں کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ہمارے گاؤں میں بجلی کے قصبے نہیں تھے۔ اور ہائی اسکول تک کی ساری پڑھائی ہم نے قندیل کی روشنی میں پوری کی۔ اس طرح کسی کوچنگ کلاس (coaching class)، گائیڈ (guide) کتاب وغیرہ کی مدد کے بغیر بھی میں نے ایس ایس سی (SSC) کے نتیجے میں خود کو کوکن اور ممبئی کے تمام مسلم طلبہ میں سرفہرست پایا جس کے لئے مجھے کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کا سو (۱۰۰) روپے کا ایک خصوصی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی شروع ہوا میری زندگی کا اصل امتحان۔ اسکول کے بعد کریئر (career) کے کون کون سے راستے کھلتے ہیں اس کا ہمیں علم نہیں تھا۔ کوئی بتانے والا بھی نہیں تھا۔ ایک جانکار شخص سے جب بار بار اس تعلق سے معلومات حاصل کرنی چاہی تو ایک دن انہوں نے مجھے آتے دیکھ کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ بس اس لمحے میں نے طے کر لیا کہ ٹالچ (knowledge) و معلومات کا ایک دروازہ مجھ پر بند ہوا ہے انشا اللہ آگے چل کر اپنی قوم کے طلبہ کے لئے ٹالچ و معلومات کے ہزاروں دروازے کھول دوں گا۔ کالج میں داخلہ لیا لیکن محرومی کا احساس مسلسل نوچتا رہا۔ اور اگرچہ ممبئی میں یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم ایس سی کا امتحان پاس کر لیا مگر ہمیشہ یہ ہی احساس رہا کہ یہ میری منزل نہیں۔ مجھے صرف اپنے لئے جینا منظور نہیں۔ لہذا دل میں دل میں یہی خواہش تھی کہ پھر کوئی مبارک کا پڑی گاؤں سے شہر میں



آ کر معلومات حاصل کرنے کے لئے در بدر نہ بٹکتے۔ پھر میری قوم کے کسی طالب علم پر معلومات کا دورہ از و بند نہ ہو۔ کالج کے دوران اور اس کے بعد نہ جانے کتنے سینکڑوں طلبہ سے سابقہ پڑا ہوگا جو واقعی ذہین تھے مگر مناسب راہ نمائی نہ ملنے کے باعث اپنی زندگی تباہ کر بیٹھے۔ قوم کے قیمتی ٹیلنٹ (talent) کو اس طرح ضائع ہوتے دیکھ کر میں نے قوم کی رہنمائی کو اپنا نصب العین بنالیا۔ لہذا ۱۹۷۹ء میں جب ماہنامہ ”نقش کوکن“ ممبئی کا اعزازی مدیر مقرر ہوا تو دوسرے ہی ماہ ایک وکیشنل گائڈنس (vocational guidance) ضمیمہ شائع کیا۔ ۱۹۸۳ء میں ہفت روزہ ”فوزان“ تھانے کے زیر اہتمام وکیشنل گائڈنس کے موضوع پر اردو کی پہلی کتاب شائع کی اور اسی سال کوکن کے کچھ گاؤں میں طلبہ کی رہنمائی کے لئے تعلیم دورے شروع کیے۔ ۲۹/ جون ۱۹۹۶ء کو ایک بڑے پیمانے پر وکیشنل گائڈنس کا پروگرام صابو صدیق پالی ٹیکنیک کے کشادہ ہال میں منعقد کیا۔ ہال میں کل دس ہزار سے زائد طلبہ تھے، لوگ گھنٹوں کھڑے رہے۔ رازنامہ ”انقلاب“ ممبئی کے مدیر مرحوم ہارون رشید (علیگ) صدر جلسہ تھے۔ انہوں نے اگلے ہفتے اس اخبار کے سرورق پر ادارہ لکھا: ”بیداری کے آثار جس میں انہوں نے لکھا: ”تو کیا مسلمانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں؟ اس جلسے سے تو کم از کم ہمیں یہ بھی احساس ہوا۔ اگر یہ مسلسل برقرار رہتا ہے، وکیشنل گائڈنس کے مزید لکچرز (lectures) کا مختلف مقامات پر اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے طلبہ دانش مندی کے ساتھ اپنے کریئر کا تعین کرتے ہیں تو وہ دن دور نہیں جب مسلمان محرومی اور مایوسی کے دلدل سے نکل کر عزم اور حوصلے کی پکی سڑک پر اپنے توانا قدموں سے رواں دواں نظر آئیں گے۔“

اس پروگرام کی رپورٹنگ (reporting) جاوید جمال الدین نے روزنامہ ”انقلاب“ میں اس طرح کی تھی: ”مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی ایک جھلک! مبارک کا پڑی نے معلومات کا خزانہ کھول دیا۔ آج ہر کسی کا رخ محمد حاجی صابو صدیق پالی ٹیکنیک کے الما لٹینی ہال کی جانب تھا۔ البتہ وہ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے نہیں جا رہے تھے نہ کسی خود ساختہ لیڈر کا کوئی سیاسی اعلان سننے جا رہے تھے بلکہ وہ وہاں اس شخص کو سننے آئے تھے جن کے بچوں کے مستقبل کے تین معلومات کا ایک خزانہ اپنے ذہن میں لیئے ہوئے تھا۔“ دوسرے ہفتے شاہد لطیف نے ”انقلاب“ کے لئے میرا ایک طویل انٹرویو لیا اور تیسرے ہفتے ہفت روزہ ”راہ نما“ شروع ہوا۔ یہ تھا آغاز اس تعلیمی تحریک کا۔

یہاں رہ رہ کر مجھے میرے مرحوم دوست ہارون رشید کی یاد آ رہی ہے جن سے میں نے ایک بار کہا تھا: ”اردو زبان مشاعروں میں نہیں بلکہ مدرسوں اور اسکولوں میں زندہ رہنی چاہیے۔ اور اردو قاری زندہ ہے مگر اسکولوں میں۔ کیوں نہ طلبہ کو اردو اخبار کا اور اردو اخبار کو تعلیم کا چسکا لگا دیا جائے۔“ وہ فوراً رضی ہوئے اور پھر شروع ہوا اردو صحافت کا ایک نیا باب، یعنی تعلیم کے موضوع پر ایک روزانہ ”کالم“ ”مشعل“ جس کے تراشوں کی فائل میں نے ہزاروں طلبہ اور سینکڑوں اساتذہ کے پاس دیکھی ہے۔ اور پھر ملک بھر کی صحافت تعلیم کے شعلوں کے لپیٹ میں آ چکی تھی۔ لہذا میرا کالم ”راہ نما“ روزنامہ ”انقلاب“ (ممبئی) کے ساتھ ساتھ اخبار ”مشرق“ (کلکتہ)، ”منصف“ (حیدرآباد اور ”راشٹریہ سہارا“ (دہلی) میں بھی شائع ہوا۔

تحریر کے ساتھ ساتھ اپنی تقریر سے طلبہ، والدین و اساتذہ کو تحریک کرنے کے لئے میں نے



مہاراشٹر بھر کے دورے شروع کیے۔ صرف شہروں اور قصبوں کے نہیں بلکہ گاؤں کے بھی کہ ہندوستان گاؤں میں رہتا ہے۔ اور پھر یہ معمول بن گیا کہ ہفتے کے پانچ روز میں ممبئی میں اپنا کاروبار کرتا اور ہر سنیچر اتوار کو نکل پڑتا تعلیمی دوروں پر۔ اور اس طرح ہر سال مہاراشٹر بھر کے سو (۱۰۰) سے زائد مقامات پر لکچرز دیتا جس سے الحمد للہ ہر سال کم از کم ایک لاکھ طلبہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اساتذہ کے لکچرز شروع کیے مثلاً گزشتہ سال پندرہ مقامات پر صرف اساتذہ کے لئے لکچرز دیئے جن سے چھ ہزار سے زائد اساتذہ نے استفادہ کیا۔ اور جب ان لکچروں کے دوران طلبہ اساتذہ کے پاس نوٹ کرنے کے لئے نوٹ بک اور قلم دیکھنے لگا تو لکچر سے آنے کے بعد ان کی ڈاک بھی میرا پیچھا کرنے لگی اور تب میں نے اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر گاؤں اور دیہاتوں میں بھی جانا شروع کیا کیوں کہ اب طلبہ، اساتذہ اور والدین کی جانب سے رسپانس (response) مل رہا تھا اور اگر میں اپنی جانب سے کوئی کوتاہی برتاؤ تو یقیناً اللہ کی بارگاہ میں گنہگار ثابت ہوتا۔

میری تعلیمی تحریک کی صرف اللہ مدد کرتا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ چند کلو میٹر کے بس سے سفر پر بلا کی تھکن محسوس کرنے والا میں آج سولہ سولہ، اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے سفر کرتا ہوں اور تھوڑی سی تھکن بھی محسوس نہیں کرتا! یہ اللہ کا فضل نہیں تو اور کیا ہے کہ میں نے آج تک کسی سے ایک روپیہ بھی مالی مدد نہیں لی، نہ لفافے قبول کیے اور اپنی چھوٹی سی آمدنی سے سارے دورے اور تعلیمی پروگرام کرتا گیا مگر کہیں کوئی رکاوٹ نہیں آئی اور اللہ کی مدد کے لئے میں اپنے ہر لکچر سے پہلے خصوصی نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرتا ہوں۔ ”اے اللہ میری بات میں اثر پیدا کر اور میری قوم کے بچوں کو یہ ساری باتیں عملی طور پر قبول کرنے کی توفیق دے، سکت دے۔ ان میں مقابلے کی اسپرٹ (spirit) پیدا کر، انہیں سرخ رو کر، احساس کمتری کو ان کے دلوں سے نکال دے اور ان کے دلوں میں یہ جذبہ بھی پیدا کر کہ وہ زندگی میں کامیاب ہونے کے بعد اپنی قوم کو نہ بھولیں۔“ آمین!

گزشتہ پانچ سالوں کے تعلیمی دوروں میں گرچہ پانچ سو (۵۰۰) سے زائد تعلیمی لکچرز دے چکا ہوں اور لگ بھگ پانچ لاکھ طلبہ کی رہنمائی ہو چکی ہے۔ جن میں مہاراشٹر پر چھا جانے والے طلبہ تنویر مینار، زرین انصاری، رضوانہ انصاری اور بلال انصاری بھی شامل ہیں جنہوں نے کامیابی کے بعد اپنے پہلے انٹرویو (interview) میں اپنی کامیابی کے لئے کالم ”راہ نما“ کو کریڈٹ (credit) دیا اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ابھی کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ ابھی مجھے میلوں دور جانا ہے، تعلیمی محاذ پر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ خصوصاً ڈراپ آؤٹ (drop-out) طلبہ کے لئے ابھی مجھے کئی صبر آزما مراحل سے گزرنا ہے۔

اس جنون میں میرا ساتھ دینے والوں میں اپنی شریک حیات اور اپنی بچیوں منڈن اور مدیحہ کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا کہ مسلسل پانچ سالوں سے ہر سنیچر اتوار کو میں تعلیمی پروگراموں کے لئے مختص کیے ہیں یعنی ہر ماہ آٹھ دن! اس کی بنا پر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ انصاف تو نہیں کر پا رہا ہوں مگر وہ سب بھی اس قربانی کو جانتے ہیں اور اس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ اور پھر میں نے ”چراغ تلے اندھیرا“ اس محاورے کو صحیح ثابت نہیں ہونے دیا اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور توجہ دیتا ہوں جس کے نتیجے میں میری بڑی بیٹی منڈن نے ایس ایس سی میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور انٹھاسی (۸۸) فی صد مارکس (marks) حاصل کیے جب کہ بارھویں (سائنس)



میں اس نے سائنس مضامین میں چھپیانوے (۹۶) فی صد نمبر حاصل کر کے نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ یہ بتی نہیں میڈیکل انٹرنس امتحان ۲۰۰۰ء میں اس نے ریاستی سطح پر میرٹ (merit) میں اکیسواں مقام حاصل کیا۔ اگر میں تعلیمی سرگرمیوں سے دور رہ کر اپنی تمام تر توجہ اپنے بچوں پر مرکوز کرتا تو غالباً وہ قابلِ تسخیر یعنی ۹۹ یا ۱۰۰ فیصد مارکس بھی حاصل کر لیتے مگر یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہم صرف اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے جیئیں۔

مجھے زیادہ خوشی اس بات کی نہیں کہ میرے بچے ۹۰-۹۵ فی صد مارکس حاصل کرتے ہیں، بلکہ اس بات کی ہے کہ وہ میرے تعلیمی مشن (mission) کو آگے بڑھانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اپنے تک محدود رکھنا نہیں چاہتے بلکہ انہیں قوم کے طلبہ میں بانٹنا چاہتے ہیں۔ لہذا اس سال سے میری جی منڈ نہ مہاراشٹر کے کئی اہم مقامات کا دورہ کر کے قوم کے طلبہ کے لئے ”بارہویں اور میڈیکل انٹرنس امتحان کی تیاری کیسے کی جائے“ کے موضوع پر لکچر دیں گی۔ اللہ اسے یہ تعلیمی مشن آگے بڑھانے کی سکت و ہمت دے۔ آمین۔

کتاب ”راہ نما“ کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کی پزیرائی مہاراشٹر بھر میں جس طرز پر ہوئی، مہاراشٹر بھر میں کئی شہروں و قصبہات میں اس کی رونمائی کی تقریبات کا اہتمام اساتذہ اور سماجی اداروں نے کیا اور کتاب کے مطالعے کے بعد طلبہ، اساتذہ اور والدین کی ڈاک جس طرح تعاقب کرتی ہے اس سے اطمینان ہو رہا ہے کہ صبح ہونے کو ہے۔ کیوں کہ اس کتاب کے مضامین ملک کے کئی (مثلاً ماینامہ ”سائنس“ نئی دہلی) اخبارات و رسائل میں قسط وار شائع ہونے شروع ہوئے اور اسکولوں (مثلاً انجمن اسلام سیف طیب جی ہائی اسکول، ممبئی) میں اخلاقی اقدار کے پیریڈ (period) میں اس کتاب کے مضامین و اقتباسات مانک پر پڑھ کر سنائے جانے لگے۔ نیز کتاب کا تیسرا ایڈیشن زیادہ تعداد میں اس لئے بھی شائع ہو رہا ہے کہ والدین و اساتذہ کی جانب سے بچوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی پوری کوشش ہوئی کہ ہر بے ”راہ نما“ ضرور ہو۔

گزشتہ سال بھی حسب سابق طلبہ، والدین و اساتذہ کے لئے مہاراشٹر بھر میں میرے چچا سی (۸۵) لکچرز ہوئے جن کے ذریعے تعلیم اور اس کے لئے نئے تقاضوں کا پیغام ایک لاکھ سے زائد افراد تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ جن میں کئی شہروں و قصبوں کے علاوہ احمد پور، ادگیر، ایسے جوگائی، راجہ پور، کڑوئی، ارن، ناگوٹھنہ جیسے تعلقے اور گاؤں میں شامل ہیں۔ ہر جگہ میں نے مثبت ماحول پایا کہ بس ہر جگہ چنگاری لگانے کی دیر ہے اور شعلے بھڑک اٹھیں۔ گزشتہ سال مجھے سب سے زیادہ اطمینان اس بات پر ہو رہا ہے کہ ”تعلیمی گشت“ کا نظریہ عام ہو رہا ہے۔ تعلیمی گشت ہی کے ذریعے ”ڈراپ آؤٹ“ طلبہ کے لئے پھری، چھوڑ، پونے میں نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول قائم ہو چکا ہے اور ہماری تعلیمی پس ماندگی کا سب سے اہم و موثر علاج تعلیمی گشت ہی ہے۔ اس کا احساس بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ ہی میں یہ لکھ دیا تھا کہ اس کتاب سے کوئی منافع مقصود نہیں۔ اس لئے اس کتاب کے لئے جولاگت آتی ہے (یعنی سوروپے فی جلد) صرف اسی قیمت میں فروخت کی جا رہی ہے تاکہ قوم کے طلبہ اس سے استفادہ کریں۔ لہذا تعلیمی محاذ کے سپاہیوں سے اب بھی درخواست ہے کہ طلبہ و والدین کی ذہن سازی کے لئے جیسے منعقد کرنے سے پہلے اس کتاب کو والدین و طلبہ تک پہنچا دیں



تا کہ آپ کا تعلیمی اجلاس یقینی طور پر کامیاب ہو جائیں کیوں کہ حسب معمول ہمیں کوئی لمبے چوڑے دعوے نہیں کرنے ہیں البتہ تعلیمی کاس (cause) کے لئے ذہن سازی کرانے میں یہ کتاب کلیدی کردار ادا کرے گی۔ اس کا اللہ کی ذات سے یقین ہے اس لئے اس کتاب اور تعلیمی بیداری کا پیغام وہاں تک پہنچائے جہاں تک یہ جہل کی سیاہ رات چلے۔ میں اسی مشن کے پیش نظر ماہنامہ "نقش کوکن" شائع کر رہا ہوں۔

ان کا جریدہ اور کتاب "راہ نما" دیکھ کر بلاشبہ میں کہوں گی کہ جو کتابیں ذہن و فکر کو زنگ آلود ہونے سے محفوظ رکھتی ہیں ان میں "راہ نما" سرفہرست ہے۔ میں نے مبارک سے پوچھا، "آپ کو اس کا ادراک کب ہوا کہ اپنے قلم کو ایک روشن دیا بنالیں؟"

مبارک نے کہا: "جب رب کائنات کے کرم سے میں نے سوچ لیا کہ صرف اپنے لئے نہیں جینا ہے تب زندگی کے اسی اصول اور اسی جذبے کے تحت میں نے قلم اٹھایا۔ اور جب اس قلم سے جراحی کرنے لگا تو یہ راز کھلا کہ رب کائنات نے سب سے پہلے قلم کیوں تخلیق کیا تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ پکی سیاہی سے لکھی جانے والی ہر شے اصول نہیں ہوتی۔ بانظر افراد ہر تحریر کی آواز، اُس کی نیت، اُس کی گہرائی و گیرائی کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لہذا میں نے قلم سے سماجی و تعلیمی بیداری کی نیت کی تو اُسے عوام و خواص کی قبولیت ملی اور توقع سے زیادہ نہ سہی توقع کے مطابق ضرور ملی۔

اردو سے اور قلم سے جب سے بیداری کا عزم کیا تو پہلی نظر پڑی فلکشن پر کہ وہ عوام میں کافی مقبول صنف ہے۔ مگر ہم نے دیکھا کہ عوام کی ایک بڑی اکثریت اسے محض ایک تفریحی ادب سمجھتی ہے اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اس لئے اصلاحی ادب کی سیدھی سادی راہ اپنائی جو اپنے مقصد میں بھی واضح تھی اور اپنی سمت کی جانب نشان دہی بھی کر رہی تھی۔ اور اس کے لئے میں نے سہارا لیا ایک ایسے ذریعے کا جو بہر حال قاری تک پہنچتا ہی ہے، اور وہ تھا اخبارات کا ذریعہ۔ روزنامہ اور ہفت روزہ کہ قاری اس کا عادی ہوتا ہے، ضرور تائید شوقیہ۔ دیگر ذرائع میں وہ یقینی بات نہیں تھی کیوں کہ خالص ادبی رسالوں کا چلن ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اور یہ ہونا بھی تھا کیوں کہ وہ اپنے مرتبے سے نیچے اترنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ ایک عالی مرتبت ادب دنیا کو دینا چاہتے تھے اچھی بات ہے۔ مگر اکثر اوقات صرف اس مقصد کے تحت کہ وہ عالی مرتبت ہو قاری تک اُس کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچے چاہے وہ کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو، بس اسی زعم میں اردو ادب اور اس کے مجلے اپنی شناخت کھونے لگے اور ادب و قاری کے رشتے میں ایسی خلیج پیدا کی کہ اس نقصان کی تلافی ابھی تک نہیں ہوئی۔ بدبختی سے ابھی تک کسی کو یہ بصیرت نصیب نہیں ہوئی کہ اردو قاری ادب سے کیوں دور ہوا اور اس کے اسباب پر غور کریں۔

اب جہاں تک آپ کا یہ سوال کہ سب سے اچھا ادب میں کسے سمجھتا ہوں؟ تو میرا جواب یہ ہی ہے کہ جس میں زندگی ہے، جو زندگی سے قریب ہے، جس میں حقیقت پنہاں ہے بس وہ ہی کھر ادب ہے۔ زندگی سے جس کی قربت نہ ہو وہ کتنا ہی شاہکار ادب کیوں نہ ہو، تخلیق کار اسے آسمانی وحی سے زیادہ اہمیت کیوں نہ دے رہا ہو مگر وہ میری نظر میں تصنع اوقات ہے۔ وہ لفاظی، لفظوں کا الٹ بھیر ہو سکتا ہے مگر ادب ہرگز نہیں۔ ادب میں زندگی کی رُمق ہونی ہی چاہیے تاکہ زندگی کے ہر درپے میں جھانکتا و کھائی دے اور بالآخر لوہ انسان کی رہنمائی بھی



کر رہا ہے۔ مگر چہ یہ بات دقتیانویسی ہی لگتی ہے مگر کیا کریں ہر بار کھری کسوٹی یہ ہی ثابت ہوتی رہی ہے۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں وہ کہہ رہے تھے۔ ”اردو ادب کی جب بات ہو رہی ہے تو چلئے یہ بھی سوچتے ہیں کہ اردو زبان کا اپنا مستقبل کیا ہے؟ اردو کی گرچہ نئی بستیاں بھی وجود میں آرہی ہیں مگر وہاں جو بھی اردو پڑھی یا بولی جا رہی ہے وہ زندگی کی کسی ضرورت کے تحت نہیں۔ صرف کلاسیکی زبان کے طور پر، کسی تفریح کی غرض سے، کچھ آباد اجداد کی یادگار کے طور پر اور کچھ دینی تعلیم سے آشنا ہونے کے لئے وہ اردو کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان نئی بستیوں میں اردو شناسائی کا کام تو ہو رہا ہے البتہ اردو کی بقا کے لئے کوئی ٹھوس کام ہو رہا ہے یہ میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لہذا اردو کی دنیا سمٹ گئی ہے برصغیر ہی میں۔ اور یہاں پر اُس کا آسان سام مقابلہ ہو رہا ہے انگریزی کے ساتھ۔ آسان ہم نے اس لئے کہا انگریزی کے ساتھ کوئی سخت مقابلہ نہیں ہو رہا ہے۔ سخت مقابلہ وہ ہوتا ہے جہاں کئی محاذ پر جنگ ہوتی ہے اور دونوں جگہ کی بٹالین (battalion) لگے رہتے ہیں، ڈنے رہتے ہیں اور دونوں جانب سے مقابلہ آرائی کا نئے کی ہوتی ہے۔ یہاں انگریزی کی ایک ایک توپ کے سامنے اردو کے بڑے بڑے قلعے ڈھیر ہو رہے ہیں۔ دراصل ہم اردو والے جو بات سمجھ نہیں رہے ہیں وہ یہ ہے کہ صرف اردو نہیں بلکہ اس روئے زمین کی لگ بھگ ہر زبان کے ساتھ انگریزی نہر دآ رہا ہے۔ دیگر زبان والوں، مثلاً چینی، روسی، جاپانی، نے اُس کی وجوہات کا پتا لگا لیا اور انگریزی سے مقابلے کے لئے کمر کس لی مگر ہم اردو والے صرف دایلا مچاتے رہے، شور و غل کرتے رہے، انگریزی نہ پڑھنے کے لئے اردو کے قاری کو اللہ رسول کا واسطہ دیتے رہے۔ جتنی مخالفت ہم انگریزی کی کرتے رہے انگریزی اتنی ہی مضبوط ہوتی گئی۔ دراصل ہمیں کرنا یہ چاہیے تھا کہ ہم انگریزی کو اردو کی بڑی بہن مان لینے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتے۔ اُس زبان نے جتنے علوم اپنے دامن میں سمیٹے ہیں ان سے استفادہ کرتے اور ان میں کچھ حصہ اردو کے آنگن میں لے آتے تاکہ اردو خدا کا واسطہ دے کر نہیں اپنے دم خم سے زندہ رہتی۔ اور اگر آج بھی اردو کو سکتے، دم توڑتے نہیں بلکہ آن بان و شان کے ساتھ زندہ رکھنا ہے تو اردو انگریزی کے درمیان ایک رشتہ قائم کرنا ہوگا اور اردو کو حقیقی معنوں میں زندہ رکھنے کی بصیرت و بصارت پیدا کرنا ہوگی۔ اگر اس میں ہم کامیاب رہے تو اردو دشمن افراد جو اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کی غیر منطقی وکالت کرتے آئے ہیں وہ اردو کا قتل کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ اردو کا رسم الخط دراصل اردو کی شان ہے۔ بالکل جس طرح مرغ کے سر پر تاج یا مور کے دل فریب پنکھ یا تلی کے ست رنگی پر۔ اس لئے اردو کا رسم الخط ختم کرنے کا مطلب ہوگا اردو کی شناخت ہی کو ختم کرنا۔“

”مبارک،! انٹرویو ختم ہونے پر میں نے کہا، ”میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے اور تعلیم کے چراغ بھلانے کا کچھ کام سرانجام دوں۔“

”آئیے، ہمیں انتظار رہے گا۔“ مبارک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

Mr. Mubarak Kapri,

Taleemi Bedari Markaz, BIT Building No. 6, Bhindi Bazar, Mumbai,

400009, India





”انسان ایک جزیرہ ہے“ جو خواہشات کے

سبزہ میں گم ہو گیا ہے۔“

مجید سلیم

مجید سلیم

دامام، سعودی عرب

ایک تخلیق کار چاہے شعر کہے، کہانی یا ناول لکھے یا صنف ادب کی دیگر اصناف پر طبع آزمائی کرے، اس کے لکھے الفاظ اور ان سے تخلیق شدہ جملے اپنا اپنا تاثر رکھتے ہیں۔

ابتداء میں جب انسان نے الفاظ سے اپنی صداؤں اور اشاروں کو ملبوس کیا تو ان الفاظ کا گہرا تعلق اس کی آواز، ادائیگی اور اظہار جذبات سے وابستہ رہا۔ آج بھی جب ہم ہر سکون انداز میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے الفاظ ان احساسات کا کردار ادا کرتے ہیں جو ہمارے دلچے میں ہوتا ہے۔ ہر جوش اور جذباتی گفتگو کے الفاظ مختلف ہوتے ہیں اور طرز ادا کے زیر و بم سے سننے والا احساسات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

شاعری یا افسانہ نگاری کے الفاظ کا انتخاب تاثرات کی صحیح ادائیگی پر قادر ہوتا ہے۔ خوب صورت جملے میں الفاظ کی مینا کاری ایک سپاٹ واقعے کے بیان کو تاثرات کے ٹکینوں سے آراستہ کر کے اسے سجا بنا دیتی ہے۔ اور قاری کے ذہن پر اپنی رنگین روشنی کے انعکاس سے خوب صورت تصویریں ابھارنے میں کامیاب رہتی ہیں۔

ناول اور افسانہ نگار مجید سلیم نے یہ ہنر سیکھا ہے۔ ان کے افسانوں سے چند سادہ مگر معنی سے بھرپور الفاظ سے جوڑے گئے چند جملے اس کی گواہی دیں گے۔



• مال و زر کی خیانت کا نقصان پھر بھی قابل تلافی ہوتا ہے لیکن زندگی کے چھوٹے بڑے رازوں میں خیانت کے نقصان کی پیمائش ممکن ہے نہ تلافی (افسانہ ”پیاسا سمندر“)

• سید فضل بخش کی راتیں بے خوابی کا شکار ہو چکی تھیں۔ زندگی کے درخت سے امن و سکون کی فاختائیں اڑ گئی تھیں۔ اب وہاں خواہشات کے بے شمار چیل اور کوائے ہر شہنی پر بیٹھے چونچ مار رہے تھے (افسانہ ”پہلا شکار“)

• بعض معصوم بندے چاہنے اور چاہے جانے کی شدید خواہش کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر کوئی دوسری حساب منہی ان کی عقل سے بالاتر ہوتی ہے (افسانہ ”کعبہ دل“)

مجید سلیم کے افسانے پڑھنے کے بعد میں نے ان سے سوال نامے سے ہٹ کر یہ سوال کرنا مناسب جانا کہ ان کی رائے میں افسانہ یا ناول ہندوستان میں بہتر لکھا جا رہا ہے یا پاکستان میں؟ اور یہ بھی کہ پچھلے چند سالوں میں کچھ اہم ناول یا کہانیاں لکھی گئی ہوں تو ان کے نام اور مصنفین کے نام بھی بتاتے چلیں۔

مجید سلیم نے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”دونوں ملکوں میں گونا گونا ب موجود ہیں۔ افسانوں کے میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک شہ سوار سامنے آئے ہیں۔ بیسویں صدی کی آخر دہائیوں میں افسانے نے اہم جہتیں سر کی ہیں۔ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ افسانہ کہاں بہتر لکھا جا رہا ہے۔ رہا ناول، تو ناول کے میدان میں سنا رہا ہے۔ آج اردو ادب میں سنجیدہ، مقصدی اور یادگار ناول کہاں لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے محض ناول نگار پر انگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔ فن کی ریاضت کے لئے ہمہ وقتی کمیٹمنٹ (commitment) کار کے انجن میں پٹرول کی طرح ہے۔ لیکن آج کا ادیب فکرِ معاش اور دیگر ذمہ داریوں میں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ اس پرستم یہ کہ خون جگر جلا کر فن پارہ بھی تخلیق کرے پھر خود ہی اس کی اشاعت کا انتظام بھی۔

اور اہم ناول یا افسانوں کے حوالے سے۔۔۔۔۔ ”نمبردار کا نیلا“ (ناولٹ) از سید محمد اشرف، ”دو گز زمین“ (ناول) از عبد الصمد، ایک اور بجو کا (افسانوں کا مجموعہ) از عبد العزیز، ”کابوس“ (ناول) از شفیق، ”کو بڑ“ (افسانہ) از شوکت حیات قابل ذکر ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ”موجودہ دور میں مطالعے کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا سی ڈی (CDs) کتابوں کا متبادل ثابت ہو سکتی ہیں؟“

مجید سلیم نے کہا۔۔۔۔۔ ”یہ صحیح ہے کہ مطالعے کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔ کتابوں کی جگہ کمپیوٹر اور ٹی وی نے لے لی ہے۔ مجھے خود یہ قبول کرنا پڑے گا کہ رات سونے سے قبل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جو مطالعے کے نذر ہوتا تھا اب وہ کبھی کبھی ٹی وی پر خبروں اور دیگر پروگراموں کو دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔ جو قارئین تھے اب وہ ناظرین بن گئے ہیں۔ جو علم کتابوں کے ذریعے سے عوام الناس تک پہنچتا تھا اب وہ ہی علم انٹرنیٹ، سی ڈی اور ٹی وی کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ یقیناً سی ڈی کتابوں کا متبادل ثابت ہو سکتی ہیں۔ یا یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سی ڈی مطالعے کے میدان میں ایک نیا ٹول (tool) یا ایک نئی جہت کا اضافہ ہے۔ لیکن فنی چابکدستی کے ساتھ انٹرنیٹ اور ٹی وی پر اس کی تشہیر کرنی ہوگی۔ کتابوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور اس کی



افادیت گونا گوں ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ اچانک بند نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کتابیں اور سی ڈی ساتھ ساتھ پیرالل (parallel متوازی) چلتی رہیں۔ نئی کتابوں کی اشاعت کے وقت یہ حکمت عملی اپنائی جاسکتی ہے کہ تعداد اشاعت کو گھٹا کر اتنا ہی سی ڈی کا اضافہ کر دیا جائے۔

اب میں نے ان سے ان ہی کے بارے میں پوچھا کہ وہ اپنا نام، جائے پیدائش اور تعلیمی حالات کے بارے میں بتائیں تاکہ ان کے پڑھنے والوں سے ان کا تعارف ہو جائے۔

انہوں نے بتایا کہ ان کا پورا نام سید عبدالمجید سلیم ہے۔ وہ جنوری ۱۹۵۳ء میں شہر حیدرآباد، دکن ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سید عبدالرزاق مرحوم لندن میں نظامس ہاؤس (Nizam's House) کے ہاؤس ہولڈ سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وہ کئی سال اس عہدے پر فائز رہے۔ لندن کے ایک میجر گراہم (Maj. Graham) نے دل کش یافت پر انہیں اپنے ہاں کام کی دعوت دی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس کا نمک کھایا ہے اس سے نمک حرامی نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنے وطن کی مٹی سے بہت محبت تھی۔ جب وطن واپس لوٹے تو بیللا وٹا (Billa Vista) کے ہاؤس ہولڈ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ ان کے والد سید حسن صاحب محکمہ صحت و طب سے وابستہ تھے۔ وہ اردو سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اپنے کالج کے دنوں میں شاعری کے میدان میں بھی کافی سرگرم رہ چکے تھے۔ مجید سلیم میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا ان ہی کی جستجو کا نتیجہ تھا حالانکہ وہ اس وقت صرف ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی رہا لیکن انہوں نے اردو کو بحیثیت ایک مضمون گریجویشن تک پڑھا۔ ۱۹۷۵ء میں انہوں نے کامرس سے گریجویشن کا امتحان پاس کیا۔ مطالعے کا شوق جو ساتویں جماعت میں شروع ہوا تھا کالج تک پہنچتے پہنچتے جنون کی سرحدوں میں داخل ہو چکا تھا۔ اردو اور انگریزی فکشن اور نان فکشن، پھر ادبیات، نفسیات، جنسیات اور اسلامیات کی بے شمار کتابیں پڑھ دالیں۔ مجید بتا رہے تھے: ”والد محترم کی رہنمائی میں میڈیکل کے چند امتحانات پاس کیے اور محکمہ صحت و طبابت، آندھرا پردیش سے منسلک ہوا۔ جہاں ہر تین سال بعد مختلف ڈسٹرکٹ کی PHCs پر تبادلہ ہوتا رہا اور میں شہری ہماہمی سے دور مختلف گاؤں اور سیدھی سادھی زندگی سے محفوظ ہوتا رہا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں سعودی عرب کی وزارتہ الصحت میں فارمسٹ کے عہدے پر فائز ہو کر دام چلا آیا۔ تا حال میں اسی عہدے پر مصروف کار ہوں۔“

”آپ کی ادبی زندگی کی ابتدا کب ہوئی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میرا پہلا افسانہ ۱۹۷۲ء میں، بیس سال کی عمر میں کالج میگزین ’شعاع‘ میں شائع ہوا“ مجید نے بتایا۔ ”بیسویں صدی (دہلی)، شاعر (ممبئی)، شمع (دہلی، ملال ہے کہ اب بند ہو چکا)، اردو میگزین (جدہ)، افکار اور رابطہ (پاکستان) اور دیگر رسائل میں نگارشات شائع ہوتی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد دکن سے افسانے سنانے کا شوق بھی رہا۔ میں نے شاعری کے میدان میں کبھی طبع آزمائی نہیں کی۔ گودور طالب علمی میں معیاری مشاعرے سننے اور اچھا کلام پڑھنے کا شوق رہا۔ میرا خیال ہے کہ



مجھ میں شاعری کے جراثیم منتقل ہیں۔ میرا پہلا ناول 'بھنور بھنور زندگی' ۱۹۸۱ء میں اردو اکیڈمی حیدرآباد کی جزوی گرانٹ سے شائع ہوا۔ پھر ۲۰۰۰ء میں پانچ افسانہ نگاروں کا افسانوی انتخاب بعنوان 'جہات' ایوان اردو، حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس میں میرے پانچ افسانے شامل ہیں۔ 'پیا سا سمندر' کے عنوان سے پچیس (۲۵) سال کے دوران لکھی گئی کہانیوں سے منتخب افسانوی مجموعہ کتابت کے مرحلے سے گزر کر اشاعت کے لئے تیار ہے۔ لیکن والد محترم کے مشورے پر مزید کچھ عرصے کے لئے اس کی اشاعت مؤخر رکھی ہے کہ جدید تجربوں کی روشنی میں لکھی ہوئی کہانیاں بھی اس میں شامل ہو جائیں۔

مجید سلیم خاموش ہوئے تو میں نے پوچھا، "ادیبوں کی گروہ بندی نے اردو زبان و ادب کو نقصان پہنچا ہے۔ کیا وہ اس خیال سے متفق ہیں؟"

مجید نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا۔ "گروہ بندی کا عمل ایسا ہی ہے جیسے شعرا حضرات ذوق و شوق سے ادب کے خوب صورت باغ میں، جو ہمارے اسلاف نے چھوڑا ہے، جوق در جوق داخل ہوئے، کچھ عرصے اپنی فنی صلاحیتوں سے اسے سیراب کیا پھر عامیانہ سوچ اور نفسیاتی کمزوریوں کے چنگل میں پھنس کر باغ کے نکلے کر دیئے۔۔۔ کسی حق پرست نے اتحاد کی راہ ہموار کرنا بھی چاہی تو اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ تم ہمارے دوست ہو یا ہمارے دشمن۔ اب جو فصل تیار ہو کر آتی ہے اس پر ان ہی چھوٹے چھوٹے گروہوں کی مہر ثبت ہے۔ ایک ہی پلیٹ فام پر انواع و اقسام کے پھولوں کی نمائش اور خوب صورتیوں کی صحت مند مسابقت دیوانے کا خواب محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایک عمومی کیفیت ہے۔ ہندو، پاک ہی نہیں بلکہ جہاں بھی اردو ادب کی تھوڑی بہت آبیاری ہو رہی ہے، وہاں گروہ بندی کے وائرس (virus) موجود ہیں۔"

اردو کی بقا کے سلسلے میں مجید سلیم کا کہنا ہے۔۔۔

"اردو کو زندہ درگور کرنے کی مسلسل جاری پروسسنگ (processing) کے جہاں مختلف علل و اسباب ہیں وہیں ایک اہم سبب والدین کی بجرمانہ غفلت بھی ہے۔ اپنی مادری زبان کے تئیں ایسی بے حسی اور بیوفائی کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اردو کی چاشنی سے اپنی نسل کو محروم رکھنا نہایت سنگ دلانہ عمل ہے۔ اردو کی بقا کے لئے اب والدین ہی پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ابتدائی مرحلوں میں اردو کی ترسیل آسان تھی کہ اساتذہ اردو اور سائل اطمینان بخش تھے اور ایک ہی غیر اردو داں نسل کو اردو سے بہرہ ور کرنے کا مسئلہ تھا۔ لیکن اب بچے ہی نہیں والدین بھی اردو سے نااہل ہیں۔ اب ہمیں جنگی خطوط پر اردو کی آبیاری کرنی ہوگی۔ ایک اردو داں فرد اپنے اطراف دس محب اردو پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے روزمرہ کی مصروفیات میں سے ایک یا دو گھنٹے بھی کشید کر لیں تو گھروں پر، دفتروں میں، ہوٹلوں میں ذرا سی جستجو سے اردو کی نئی کونپلیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ ہم اپنے حلقہ احباب میں ہر شخص سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا آپ اور آپ کے بچے اردو جانتے ہیں؟ آپ کو اردو زبان کیسی لگتی ہے؟ کیا آپ اردو زبان کا شیریں تحفہ اپنے بچوں کو دینا پسند کریں گے؟ جو افراد کمپیوٹر کا استعمال جانتے ہیں، انہیں



اردو کے سوفٹ ویئر (soft wares) اور اردو اسباق (Urdu lessons) کی سی ڈی فراہم کی جاسکتی ہے اور اردو کے ٹی وی چینلوں میں وقفے کے دوران ناظرین سے دل چسپ مکالمہ کیا جاسکتا ہے، جیسے: 'کیا آپ جانتے ہیں جس زبان میں آپ پروگرام دیکھ رہے ہیں وہ اردو ہے؟' کیا آپ کو اردو سے محبت ہے؟ کیا آپ اور آپ کے بچے اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں دنیا کی دیگر زبانوں کی بہ نسبت اردو سیکھنا زیادہ آسان ہے؟ اگر آپ اپنے بچوں کو اردو کا شیریں تحفہ دینا چاہتے ہیں تو فلاں پتے پر رابطہ پیدا کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ پیسی اور پرفیوم (perfume عطریات) کے ٹی وی اشتہارات کی طرح اردو کے لئے بھی معیاری، دل چسپ اور رومینٹک اشتہار تیار کیئے جاسکتے ہیں جیسے ایک حسین و جمیل مدبر خاتون خالص مشرقی لباس میں نوجوان نسل سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہوں: 'میں پرانی نہیں آپ کی اپنی ہوں۔ میرا نام اردو ہے۔'

پھر ہم جنگ آزادی میں اردو کے کلیدی کردار پر ایک منفرد ڈاکومنٹری (documentary) بنا سکتے ہیں۔ اردو کی جوشیلی تقاریر اور ولولہ انگیز نعروں کے سیاق و سباق میں بیک وقت گراؤنڈ آواز اور ڈرامائی موسیقی کے ساتھ روشن ڈالی جاسکتی ہے۔ ہندوپاک کے ناظرین کے لئے یہ بے حد دل چسپی کا باعث ہوگا۔ اگر ہمیں اردو کے مستقبل کو تابناک بنانا ہے تو یہ ماڈرن حربے نہایت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر نئی نسل کا شوق و جستجو انہیں اردو کے ادبی، اخلاقی، تاریخی، دینی، ثقافتی اور معاشرتی سمندر کی سحر طراز گہرائیوں میں لے جائے گا۔

اردو رسم الخط کی تبدیلی کی حمایت یا مخالفت کے سوال پر ان کا مدلل جواب ہے: 'اس مسئلے پر بحث عرصے سے چل رہی ہے لیکن نتیجہ وہ ہی ڈھاک کے تین پات۔ اردو والوں کے لئے یہ ایک دردناک، افسوس ناک اور شرم ناک پہلو ہے۔ کیا یہ ایسا نہیں کہ دو گروہوں نے ایک بھلی دلیہن کو بیچ بازار میں روک لیا اور لگے اس کی زیبائش و آرائش پر حمایت و مخالفت میں بحثیں کرنے۔ جن بچوں یا بڑوں نے اردو نہیں پڑھی ہے انہیں اردو کو اس کے اصلی رسم الخط میں ہی پڑھنا چاہیئے۔ ہم دیگر فنی علوم کو سیکھنے کے لئے وقت، پیسہ اور اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے وطن سے کوچ کر کے غیر ممالک میں طرح طرح کی صعوبتیں اٹھاتے ہیں۔ سخت امتحانات سے گزرتے ہیں۔ قدم قدم پر صبرم، تحمل اور استقامت (determination) کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن اپنی مادری زبان کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی سختی نہیں جھیلا نا چاہتے۔ حصول تعلیم کا شوق انسان میں ہمیشہ ایک نومولود بچے کی بھوک کی طرح ہوتا چاہیئے جس کے گالوں کے پاس بھی کسی کی انگلیاں چھو جائیں تو انہیں منہ میں داب کر چوسنے کی کوشش کرتا ہے۔' مجید سلیم کہہ رہے تھے ابتدائی دور میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے انہیں از حد متاثر کیا۔ انٹر کے کورس میں قرۃ العین حیدر کی 'چائے کے باغ' کے کرداروں کی تشریح کرتے کرتے ان کے طرزِ تحریر کے بھی اسیر ہوئے۔ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے فن نے بھی متاثر کیا۔ نوخیزی کی عمر



میں ابن صفی کے کرداروں کا بھی گہرا اثر رہا۔ انگریزی فکشن میں جیمس ہیڈلی چیز (James Hadley Chase)، اگاتا کرسٹی (Agatha Christy)، آر تھر ہیلی (Arthur Hailey)، اسٹیفن گنگ (Stephen King) اور رابرٹ لڈلم (Robert Ludlum) کے ناولوں کے دیوانے رہے۔ ادبیات میں جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw) اور ارنسٹ ہیمنگ وے (Ernest Hemingway) ان کے پسندیدہ ادیب ہیں۔

اب میں نے ان سے ان کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ پوچھا جو انہیں یاد ہو۔ انہوں نے کہا۔۔۔

”ویسے تو کئی یادگار واقعات ہیں لیکن فوری طور پر جو یاد آیا ہے وہ یہ ہے۔ ایک گاؤں میں، جہاں میں نئی پوسٹنگ کے بعد کچھ عرصے قبل ہی پہنچا تھا اور خود نووارد تھا، میں نے ایک ضرورت مند نو جوان کی مدد کی تھی۔ نو جوان بھی پہلی بار اپنے کسی عزیز سے ملنے کے لئے گاؤں آیا تھا۔ لیکن اس کا وہ عزیز کچھ عرصہ قبل نقل مکانی کر چکا تھا۔ ہماری ملاقات نیشنل ہائی وے پر واقع ٹی اسٹال پر ہوئی تھی۔ یہ نیشنل ہائی وے گاؤں کے قریب سے گزرتی ہے۔ وہ ٹی اسٹال میں میز پر تنہا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ پیروں کے قریب ہی اس کا ایریگ پڑا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ وہ صورت، شکل اور لباس سے تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر انسان کو خواہ مخواہ ہی ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ میں مسکراتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اپنا تعارف کرواتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُنھ کھڑا ہوا جیسے نیند سے جاگا ہو۔ لمحہ بھر کو مجھے بغور دیکھا۔ پھر اس از حد پر خلوص انداز میں میرا ہاتھ تھام کر اپنا تعارف کرانے لگا۔ ہم دونوں اسی میز پر بیٹھ گئے۔ ذرا سی دیر میں وہ مجھ سے ایسا گھل مل گیا جیسے برسوں کی پہچان ہو۔ اس کی باتوں میں سادگی اور روانی تھی۔ وہ گفتگو کے فن سے کما حقہ واقف تھا۔ جب میں کچھ کہتا وہ بغور میری باتیں سنتا۔ پھر سادگی سے ان کا جواب دیتا۔ وہ درمیان میں بات نہیں کاٹتا تھا۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ اس کی رقم دوران سفر کہیں گم ہو گئی تھی۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے شہر فوری واپسی ممکن نہیں تھی۔ گاؤں میں اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے مدد کی پیش کش کی۔ وہ حیران رہ گیا۔ بولا، میں آپ کے لئے اجنبی ہوں، اگر رقم واپس نہ کی تو؟ میں نے مسکرا کر کہا میں نے واپسی کی بات ہی کہاں کی ہے۔ وہ از حد متاثر ہو گیا۔ بولا، میں آپ کی رقم ضرور واپس کروں گا۔ آپ مجھے اپنا پتہ نوٹ کرادیں اور میرا شہر کا پتہ بھی نوٹ کر لیں۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں نہیں گھر چلتے ہیں۔ یہاں میں کرایے کے گھر میں تنہا رہتا ہوں۔ تم تھکے ہوئے لگ رہے ہو، آج آرام کر لو۔ کل سہ پہر تین بجے کی ایکسپریس بس سے شہر چلے جانا۔ ہو سکتا ہے اس اثنا میں تمہیں اپنے عزیز کا پتہ بھی چل جائے جہاں وہ منتقل ہوئے ہیں۔

ہم گھر چلے آئے۔ دوپہر کا کھانا خود بنایا جس میں اس نے میری مدد کی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے ورائنڈے میں پڑے تخت پر اس کے لئے لیٹنے کا انتظام کر دیا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ شام چار بجے میں چپ چاپ ڈیوٹی پر ڈپنری چلا گیا۔ سات بجے واپسی پر اسے تخت پر بیٹھا ہوا پایا۔ مجھے دیکھ کر



اس نے سلام کیا اور احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رات کھانے کے بعد ہم ٹہلنے کے لئے باہر نکلے اور باتیں کرتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ اس کی باتوں میں معصومیت اور سادگی کے علاوہ بھی عجیب سی بات تھی جسے کوئی نام نہ دے پایا تھا۔ واپسی پر اس نے مجھ سے کہا تھا، آپ نے ایک اجنبی پر اتنا بھروسہ کیا گھر پر اسے تنہا چھوڑ کر ڈیوٹی پر چلے گئے۔ میں نے ہنس کر کہا، اجنبی ہو تو کیا ہوا، ایک انسان ہو وہ بھی مصیبت میں گھرے انسان، بس اتنی پہچان کافی ہے۔ وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ رات سونے سے قبل اس نے کہا تھا، آپ کی ڈیوٹی سے واپسی سے قبل میں بس اسٹاپ پر گیا تھا۔ صبح چھ بجے شہر کے لئے بس مل جائے گی۔ آپ اجازت دیں تو میں صبح ہی کی بس سے چلا جاؤں گا۔ میں نے فوراً اس کی ضرورت کے مطابق پیسے دے دیئے۔ اس نے بھداصرار نہ صرف میرا شہر کا پوسٹل ایڈریس نوٹ کر لیا بلکہ اپنا پوسٹل ایڈریس بھی نوٹ کر دیا۔ صبح سات بجے جب میں جاگا تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ رات باتوں میں دیر ہو گئی تھی۔ میں نے تیزی سے ناشتہ تیار کر کے اُسے جگایا۔ اس نے کہا اب وہ سہ پہر کی تین بجے والی بس ہی سے جاسکے گا۔ میں نے مسکرا کر کہا، چلو ٹھیک ہے۔ میری ڈیوٹی سے واپسی پر دو پہر کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ جب تک تم گاؤں کا چکر لگالینا۔ ہو سکتا ہے تمہیں اپنے عزیز کا کوئی اتا پتلا مل جائے۔ دو پہر ڈیوٹی سے واپسی پر ہلکے ذہنی جھٹکوں سے دوچار ہوا۔ مکان کے بیرونی دروازے پر تالا نہ دیکھ کر سمجھا کہ وہ گاؤں کا چکر کاٹ کر آ گیا ہے۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ مکان کے اندر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ اپنے ایر بیگ سمیت غائب تھا۔ میز پر نظر پڑی تو غیر یقینی انداز میں اس خالی جگہ کو دیکھتا رہ گیا جہاں 'سونی ٹو ان ون (Sony 2 in 1)' ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔

میں نے کبھی اس شخص کو نفرت سے نہیں بلکہ اپنائیت ہی سے یاد کیا کیوں کہ اپنائیت کا جذبہ میرا اپنا تھا اور وہ بھی ایک طرف۔ اور جب ایک طرف جذبے پر چوٹ لگتی ہے تو فریق ثانی سے نفرت نہیں بلکہ اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور تجربے کی فہرست میں نئے تجربے کے اضافے پر اطمینان بھی۔ مجید سلیم کی زندگی کا واقعہ سننے کے بعد میں نے ان کا یہ افسانہ پڑھا۔ ناول میں ادیب کو بیان کی چھوٹ ملتی ہے لیکن افسانے میں ادیب پر بیان میں اختصار کی قدغن ہوتی ہے۔ اور جب بات مختصر افسانے کی ہو تو پھر افسانہ نگار کے صحیح جوہر کھلتے ہیں۔ یہاں مجید سلیم کا ایک مختصر افسانہ "مونالیزا کی واپسی" آپ کے مطالعے کے لئے ہے۔ اس کہانی میں افسانہ کافسوں موجود ہے اور معنویت بھی۔

Mr. Majeed Saleem,

P. O. Box 890, Dammam, 31421, Kingdom of Saudi Arabia.

مونالیزا کی واپسی

مسٹر اور مسز اشواق حسین "بلیو ڈائمنڈ" کلب کے ممبروں میں تھے۔ ہر دل عزیز بھی اتنے کہ



کلب ہال میں داخل ہوتے ہی کئی شناسا ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کرتے۔ شا کر بلگرامی جیسا شہرت یافتہ مصور بھی ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیتا۔

آج تک کسی ممبر نے مسٹر یا مسز اشواق حسین کو کبھی تنہا کلب میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی جواں سال جوڑی ایسی ہی خوب صورت اور مکمل تھی کہ اگر کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا جاتا تو دوسرا بے معنی نظر آتا۔ خوب صورت اشواق حسین ہنس مکھ اور پُر خلوص طبیعت کا مالک تھا جب کہ حسین مسز اشواق پھول کی مانند تروتازہ..... کسی نے اشواق حسین سے جب ان کی شاندار صحت کا راز دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا.....

”میری شاندار صحت کا راز میری بیوی کی چاہت ہے۔ میری شیریں قدرت کا انمول تحفہ ہے جو خوش قسمت لوگوں کو ہی ملتا ہے۔ شیریں اگر نہ ہوتی تو میری زندگی کے کیئوس پر اتنے دل کش رنگ بھی نہ ہوتے۔“

اسی وقت کسی نے مسکرا کر شرارتا کہا.....  
 ”لیکن آپ پر ایک الزام یہ ہے کہ آپ نے کسی وقت بھی شیریں کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو اپنی بیوی کی چاہت پر بھروسہ نہیں؟“  
 اشواق حسین کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس نے متانت سے جواب دیا.....

”شیریں پر مجھے اپنی ذات سے زیادہ بھروسہ ہے۔ اگر وہ چاہیں تو یہاں اکیلی بھی آ سکتی ہیں۔“ اس پر مسز اشواق حسین نے شکر گزار نگاہوں سے اپنے شوہر کی جانب دیکھا اور سر نیچے جھکا لیا۔  
 ایک دن ایک خبر نے کلب میں سنسنی دوڑا دی۔ اخباری خبر تھی.....

”جواں سال صنعت کار اشواق حسین نے اپنی بیوی کو گولی سے اڑا دیا اور خود بھی کپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لی۔“

اسی اخبار کے دوسرے صفحے پر ایک اور اطلاع شائع ہوئی تھی جس کے مطابق مصوری کی بین الاقوامی نمائش میں شا کر بلگرامی کی پینٹنگ ”مونالیزا کی واپسی“ کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ سرخی کے نیچے چھپی ہوئی کلفنل پینٹنگ میں بے باک مسز اشواق حسین پُر اسرار انداز میں مسکراتے ہوئے دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔





عزیز میر  
مکتب "گفتنی" شائع ہونے پر ایک نئے موضوع پر بحث کیلئے  
میر سے ملاؤں اور وہی خدمت  
ایک نئے موضوع پر ملاؤں

## محافظ حیدر مرحوم سابق مقیم ممبئی، ہندوستان

”گفتنی حصہ اول“ کا سوال نامہ دست بدست دوستاں گشت کرتا ہوا ممبئی میں جناب محافظ حیدر تک پہنچ گیا۔ پھر مجھے ان کا خط مع تعارف، سوالوں کے جواب اور انگریزی میں ٹائپ شدہ بايوڈ انا موصول ہوا۔ ان کی سوانح حیات پڑھتے ہوئے پہلے تو مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے ممبئی کی فلم نگری کی سیاحت میں اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ بہتوں کی تمنا ہوتی ہے کہ ہالی وڈ (امریکہ) کے مقابلے کی ہندوستانی فلمی دنیا جو ”ہالی وڈ“ کے نام سے مشہور ہے، اس میں کہیں قدم جمانے کا موقع مل جائے۔ جن کے قدم جم بھی جاتے ہیں تو وہ اپنے مزاج کو اس نگری سے ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور وہ اپنی راہ الگ بنا لیتے ہیں۔ جیسا محترم ظفر گورکھپوری نے اپنے تعارف میں لکھا ہے (حوالہ مخزن حصہ چہارم ص ۳۵۳ تا ۳۵۹؛ مولفہ سلطانہ مہر، ناشر مہر بک قاونڈیشن، لاس اینجلس، امریکہ، ۱۹۹۹ء)۔

مگر محافظ حیدر کے لئے یہ مشکل راہیں بھی آسان بن گئیں۔ وہ فلم نگری سے وابستہ رہے اور ٹیلی ویژن کے لئے بھی سیریز اور مکالمے لکھتے رہے۔ فلم نگری میں انہوں نے راج کپور، کیدار شرما اور مدھو بالا کی فلموں کے لئے اسکرپٹ لکھے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی ادبی حیثیت کے پیش نظر فی وی کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حالی کے لئے بنائے جانے والی ٹیلی فلم اور سیریل کے لئے اسکرپٹ



اور مکالمے لکھ کر اپنی ادبی حیثیت میں بھی خود کو مالی طور پر مستحکم کیا۔

محافظ حیدر نے ۱۹۹۲ء میں ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے مولانا آزاد پر منعقد ہونے والے سیمینار میں مولانا آزاد پر مقالہ پڑھا۔ اسی طرح ۱۹۹۷ء میں ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں شعرا کی جانب سے جان نثار اختر پر منعقد ہونے والے سیمینار میں انہوں نے ایک مقالہ بعنوان ”جان نثار اختر کی شاعری کا مطالعہ“ پڑھ کر اپنی ادبی حیثیت کا قد اور بلند کیا۔

محافظ حیدر نے ”یہ سرزمین“ کے عنوان سے کشمیر کی تاریخ بھی لکھی جسے گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارت نشریات نے فلمایا۔ وہ کئی ادبی اور فلمی انجمنوں کے ممبر بھی تھے۔ کئی فلموں کے انہوں نے منظر نامے اور مکالمے لکھے۔ تنہا زندگی گزاری۔ شادی نہیں کی۔

محافظ حیدر ۷ / اگست ۱۹۲۷ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے والدین نے سید محافظ الدین حیدر عابدی نام دیا۔ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد سے ۱۹۴۹ء میں بی کام اور ۱۹۵۲ء میں ایل ایل بی کیا۔ ۱۹۴۹ء سے یعنی بائیس برس کی عمر سے بحیثیت قلم کار آل انڈیا ریڈیو سے پروڈیوسر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ وہاں انہوں نے اردو ہندی کے لئے ڈرامے لکھنے کی خدمات انجام دیں۔ وہ بلاشبہ محنتی اور زود نویس تھے۔ انہوں نے میرے تمام سوالات کے جواب نہایت آرام سے لکھ کر مجھے روانہ کر دیئے۔ منسکر الہزاج اور خوش باش تھے۔ سوال نامہ کسی توسط سے ملنے پر اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ ”گفتنی حصہ اول“ کا سوال نامہ انہیں تاخیر سے ملا اس لئے ان کا تعارف گفتنی حصہ اول میں شائع نہ ہو سکا۔

اگست ۲۰۰۳ء میں جب میں ان کا تعارف لکھنے بیٹھی تو میں نے جناب عبدالاحد ساز کو خط لکھا کہ وہ مجھے محافظ حیدر صاحب کے حالیہ پتے سے آگاہ کریں تاکہ میں ان سے ان کی تازہ تحریروں اور ادبی کام کے حوالے سے نئی معلومات حاصل کروں۔ عبدالاحد ساز کے خط سے یہ دکھ بھری خبر پا کر کہ وہ میرے خط ملنے سے دو دن قبل، ۳۰ / اور ۳۱ / اگست کی درمیانی رات میں وفات پا گئے۔ میں افسوس میں رہ گئی کہ کاش میں ان سے جلد رابطہ کر پاتی۔

کچھ عرصے بعد ماہنامہ شاعر کا اکتوبر ۲۰۰۳ء کا شمارہ ملا۔ اس میں محافظ حیدر کے لئے ایک گوشہ مختص کیا گیا تھا۔ اس میں ان کے احباب کی جانب سے ان کی شخصیت اور فن پر مضامین لکھے گئے تھے۔ سرورق پر محافظ حیدر کی وہی تصویر تھی جو انہوں نے مجھے بھیجی تھی۔ ان کی آنکھوں سے مجھے بہ یک وقت ایک استہزائی مسکراہٹ اور چھپی ہوئی اور دلی دلی غم آمیز ہنسی جھلکتی محسوس ہوتی رہی۔ اور جب میں نے افسانہ نگار انور قمر (۱) کا مضمون پڑھا تو ان آنکھوں میں پوشیدہ دونوں منظر اُجاگر ہوتے چلے گئے۔

آپ بھی یہ مضمون ضرور پڑھیں گے تو محافظ حیدر کو اپنے سامنے بیٹھے، گفتگو کرتے پائیں گے۔ اسی شمارے میں افتخار امام، مدیر شاعر نے بھی ان کا احوال لکھا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ ساتھ ہی ان کے لئے

۱۔ بشکر یہ ماہنامہ شاعر ممبئی، انور قمر صاحب کا مضمون اس تعارف کے آخر میں شامل ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ شاعر ممبئی کے شمارے اکتوبر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ سلطانہ مہر



جناب سلام بن رزاق، جناب محمود ایوبی، جناب مقدر حمید، جناب علی امام نقوی، جناب سید سرفراز حسین مد ہوش بلگرامی، جناب وقار قادری اور جناب رحمن عباس نے نہایت محبت بھرے انداز میں ان کی شخصیت اور ان کے فن پر اظہار خیال کیا ہے۔

ایک طویل عرصے سے محافظ حیدر ”شاعر“ ممبئی میں نئی کتابوں پر بڑے پرمغز اور معلوماتی تبصرے لکھا کرتے تھے۔ ان کی کمی نہ صرف اردو ادب کی محفلوں میں محسوس ہوگی بلکہ ان کے دوست احباب میں انہیں یاد کر کے غمزدہ ہوتے رہیں گے۔

اب محافظ حیدر مرحوم کے لکھے ہوئے جواب ملاحظہ ہوں۔

جواب ۲۔ ”اردو ادب کی تاریخ میں بیسویں صدی کے موجودہ دورہ جانے والے چند ادیبوں کے نام یہ ہیں۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، فیض احمد فیض، ن م راشد، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ۔ جواب ۳۔ میری رائے میں جدیدیت نے فکشن کو مجروح کیا ہے۔

جواب ۴۔ دور حاضر میں ناولوں کے کم لکھے جانے کی تین بڑی وجوہ ہیں:

- ایک تو ناول لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ موضوع کا انتخاب، اور اس سے عہدہ براہونے والا معاملہ، ایک دل چسپ پلاٹ، کرداروں کی تخلیق، کردار نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، ان سب کے لئے غیر معمولی اہلیت اور قابلیت چاہیے۔ یہ خصوصیات بہت کم ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔

- بیسویں صدی کے نصف آخر میں زندگی بتدریج تیز رفتار ہوتی چلی گئی، اس میں ناول لکھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل ہو گیا (اہلیت اور وقت کی کمی ہی کے باعث اردو شاعری سے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ ناپید ہونے لگے)

- اس میں کوئی مالی منفعت موجود نہیں ہے۔ ناشر عام طور پر ایمان دار نہیں اس لئے ناول نگار کو اچھا معاوضہ ملتا ہے نہ رائٹی۔ تو پھر اتنی محنت کون کرے۔

جواب ۵۔ آج ادیب ہی کیا غیر ادیب بھی مادی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہیں۔ نظام فکر کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں بشرطیکہ وہ اس کی بنیاد پرستی اور سمیات کو ترک کر کے اور اُسے ڈوگما (dogma) بنائے بغیر اس کی اصل روح سے فیض یاب ہونا سکھے۔ میری رائے میں اسلام، بدھ ازم اور سوشلزم میں کچھ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، یوگ اور مراقبے سے بہت فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ رہی رہنمائی، تو کوئی ادیب انفرادیت پرستی، انا یا ایگو (ego) کے دائرے میں رہنمائی کو پہنکنے نہیں دیتا۔ اُسے اپنی دانش وری پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ اور اپنی رائے کی حد تک بڑا متعصب ہوتا ہے۔ یہ کمزوری اور ٹریجڈی اُسے بحران کے بھنور سے نکال نہیں پاتی۔

جواب ۵۔ شاعری ہو یا نثر، معیاری ادب کے پیمانے مختصر ایہ ہیں:



• موضوع میں ندرت ہو

• مواد اور اسلوب میں حیرت انگیز ہم آہنگی ہو

• صرف ونحو کے مطابق زبان صحیح ہو

• اس میں اجتہاد نظر آئے

• اصناف شعر و نثر کے زیادہ سے زیادہ محاسن اس میں موجود ہوں

• اور سب سے بڑھ کر اس میں خلافت ہوئی چاہیئے۔

تب ہی وہ تخلیقی فن پارہ معیاری ادب کے ذیل میں آئے گا۔

ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں یا غیر ممالک میں بس جانے والے ہندوستانی اور پاکستانی ہوں، شاعری ہر جگہ زیادہ ہو رہی ہے۔ ایک تو نام نہاد نثری نظم نے شاعری بڑی آسان کر دی ہے اور پھر مایئے، دو ہے،، تروینی، ثنائی، اور ہائیکو نے بھی شعرا کو سہل پسند بنا دیا ہے۔ وقت کی کمی ضرور ہے لیکن موضوعات کی کمی ہے نہ جرات کی۔ موخر الذکر کے نمائندے ساقی فاروقی، افتخار نسیم اور عذرا عباس ہیں۔ جواب ۸۔ اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز ہرگز نہیں ہو رہا ہے۔ میں ایسے کئی ادیبوں کو جانتا ہوں جو صحیح انگریزی میں تقریر و تحریر کی صلاحیت سے محروم ہیں لیکن اردو تقریر و تحریر میں انگریزی الفاظ کا بہتیرا استعمال صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو انگریزی داں ثابت کر سکیں۔ آج کل نظموں اور غزلوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال عام ہے۔

اردو زبان کی افقی ترقی تو ہو رہی ہے لیکن عمودی خطوط پر نہیں ہو رہی ہے۔

میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ عربی اور فارسی نئے علوم سے مجروح زبانیں ہیں۔ اس کا اندازہ ایران، مصر اور لبنان جا کر ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر ۹ کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا۔ ”میری زندگی کے اہم اور دل چسپ واقعات

میں سے چند یہ ہیں۔

(الف) حیدرآباد میں ایل ایل بی کا امتحان دینے کے چند روز بعد میں نے والد صاحب سے زبردست دروغ گوئی سے کام لیا۔ وہ نہایت قدامت پرست تھے۔ انہوں نے فلم دیکھی تھی نہ کبھی گانا سنا تھا۔ میں ان کی لاعلمی میں تحییر اور ریڈیو ڈراموں سے وابستہ تھا ہی لیکن فلموں کا شوق جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں نے ان سے کہا حیدرآباد میں مقدمے بہت کم ہیں اور وکیل بہت زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس بمبئی میں مقدمے زیادہ ہیں اور وکیل کم ہیں۔ وہاں میری وکالت خوب چمکے گی۔ میں وہاں جا کر دیکھنا چاہوں گا کہ کیا امکانات ہیں۔ بچارے بڑے سیدھے تھے۔ اچھی خاصی رقم دے کر انہوں نے مجھے رخصت کیا۔ اور بمبئی پہنچتے ہی میں نے فلمی دنیا میں جدوجہد شروع کر دی۔ میری جدوجہد کتنی صبر آزما رہی اور ان کو میری اس جدوجہد کا کب اور کیسے پتا چلا یہ علیحدہ کہانیاں ہیں۔

(ب) میں مدھوبالا کی ذاتی پروڈکشن فلم ”مخلوں کے خواب“ ڈائرکٹ کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کے



لئے بڑے جتن کر رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایک تو والد صاحب مجھ سے پہلے ہی سخت ناراض ہیں کہ میں انہیں فریب دے کر فلمی صنعت میں آ گیا۔ اب اگر میں، اُن کا اکلوتا بیٹا، ایک ایکٹرس اور ہیروئن سے شادی کروں گا تو وہ مجھے عاق کر دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہ صدمہ سہہ نہ پائیں۔ میرے ضد بھرے انکار کے بعد مدعو بالا نے کشور کمار کی طرف توجہ کی جو رومانی طور پر ان کے پیچھے پڑے تھے۔ نومبر یا دسمبر ۱۹۵۸ء کے ماہنامہ ”شع“ میں جو لکھا گیا کہ مدعو بالا اور چنچل، دونوں بہنوں کے ساتھ میرا معاشرہ بیک وقت چل رہا ہے وہ سراسر غلط تھا۔

(ت) میں نے کوئی پندرہ سال کی عمر میں، جب میں میٹرک کا طالب تھا، شی کا لُج (ہائی اسکول سیکشن) حیدرآباد میں سعادت حسن منٹو کی کتاب ”جنائے“ سے جس میں کئی مشابہت کی موت پر ان کے لکھے ڈرامے شائع ہوئے تھے، ٹیپو سلطان کی موت کا ڈرامہ کا لُج ڈے کے موقع پر پیش کیا تھا جو بے حد پسند کیا گیا تھا۔ کوئی پینتیس سال بعد بچے خان کے مشہور ٹی وی سیریل ”دی سورڈ آف ٹیپو سلطان“ کی اسکرپٹ لکھنے کا موقع مجھے ملا جس کی بہت تعریف ہوئی۔ یعنی ابتدا اور عروج دونوں میں ٹیپو سلطان موجود تھے۔

جواب ۱۰۔ اردو ادب میں تنقید کی صورت حال مایوس کن ہے۔ میری رائے میں اس کا سبب کنفیوژن ہے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات نے تنقید کو الجھا رکھا ہے۔ اس سے اردو کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیکن تراجم کی صورت حال اطمینان بخش ہے۔ اردو سے ہندوستان کی دوسری قومی زبانوں میں اور ان سے اردو میں پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ تراجم ہو رہے ہیں۔ اردو ادب ہندی لپی میں شائع ہو رہا ہے اور اس کی پزیرائی بھی ہو رہی ہے۔ اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہر سال اردو میں بہترین ترجمے کا بھی ایک انعام دیا جانے لگا ہے جس سے ترجمہ کرنے والوں کی ہمت افزائی ہو رہی ہے۔

ان کا سابق پتایہ تھا

The Late Mohafiz Hyder,

24/85, Swayambhu C. H. S., Sardar Vallabha Bhai Patel Nagar,

Mhada Andheri (W), Mumbai, 400 053, India

## محافظ حیدر..... ایک افسانوی شخصیت

انور قمر..... ماہنامہ شاعر، ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۰ تا ۱۳

یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں ان سے ملنے مباڈاکالونی میں جو اندھیری چار بنگلے پر واقع ہے ان کے گھر پر حاضر ہوا تو اپنے ساتھ قرۃ العین حیدر کا ناول ”آخر شب کے مسفر“ لیتا گیا۔ مصالحت کے بعد ناول ان کی طرف بڑھایا تو کہا۔ ”آپ یہ کتابیں واپس کیوں لے آتے ہیں؟ میں انہیں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ ہر دوسرے تیسرے ہر مکان بدلنا ہوتا ہے تو ان کتابوں کی منتقلی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔“ کچھ توقف کے بعد کہا، ”اس نیلیٹون کے نیچے جن پانچ ناموں کی فہرست رکھی ہے ان میں ایک نام آپ کا بھی ہے۔“



عرض کیا، ”وہ کس لئے؟“

”کہا جا کہ میری موت ہو جانے کی صورت میں آپ ان صاحبان کو اطلاع کر دی جائے۔“

عرض کیا، ”میں آپ کے دشمن۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔“

مسکرائے اور کہا، ”میں حقیقت اور عمل پسند آدمی ہوں۔ خدا نخواستہ لیٹے لیٹے ہی مر جاؤں اور پاس پڑوسیوں کو معلوم نہ ہو کہ لاش کس ٹھکانے لگائی جائے اور وہ یہیں پڑی بگڑتی رہے۔ اس سے تو اچھا ہے وہ آپ کو مطلع کر دیں۔ کفن و دفن کر دیجئے گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے وہ پرچی میری جانب بڑھادی۔ اوپر جلی حرفوں میں لکھا تھا:

In case of my death the following persons are to be informed:

اس جملے کے نیچے سلسلے وار پانچ نام اور ٹیلیفون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پھر کہا۔

”کتابیں اور کاغذات آپ اپنی تحویل میں لے لیجئے۔ مضامین کتابی شکل میں آجائیں تو بہتر، افسانے اتنے ضرور ہیں کہ ایک اور مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔“

کتابیں ان کے بستر کے سرہانے بائیں طرف ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں اور ان کے پاس ہی فائلیں اور کاغذات کے پلندے۔ چٹائی پر پتلا سا بگڑا بچھا تھا۔ اس پر دو ٹکیے رکھے تھے ایک موٹی چادر بھی تھی جسے وہ اوڑھا کرتے تھے۔ معلوم کیا، ”محافظ صاحب آپ نے شادی نہیں کی...؟ اس سے پہلے بھی دو ایک بار یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ جوابا کہا۔

”دیکھ لیجئے میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں“ یہ کہہ کر ہاتھ بڑھا دیتے پھر شادی کیوں کرتا اور مسکرائے لگتے۔ مگر اس دن بتایا، ”مدھو بالا نے کہا کہ آپ مجھ سے شادی کر لیجئے۔ میں نے عرض کیا، میں ایک روایت پسند قدیم اور مذہبی خیالات رکھنے والے کنبے کا فرد ہوں۔ گھر سے تو چلا تھا یہ کہہ کر کہ بمبئی پہنچ کر وکالت کروں گا۔ مگر یہاں پہنچ کر فلمی دنیا میں قدم رکھ چکا ہوں۔ والدین میرے طرز عمل سے سخت ناراض ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں نے ایک فلمی ہیروئن سے شادی کر لی ہے تو انہیں کتنا صدمہ ہوگا۔ اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“

”جب مدھو بالا سے شادی نہ کی تو پھر کسی اور سے شادی کیوں کرتا؟“

وہ میرے والد کے رفیق تھے اور ان سے ملنے ہمارے مکان ٹپال بلڈنگ جو باپنی روڈ اور عرب گلی کے بکسر پر واقع تھا آیا کرتے تھے۔ میں ان دنوں بارہ تیرہ برس کا رہا ہوں گا۔ وہ شراب بندی کا زمانہ تھا۔ تاہم میرے والد نے ڈاکٹر کی سفارش سے پرمٹ بنا لیا تھا جس پر انہیں دلایتی شراب مل جایا کرتی تھی۔ ان کی ملاقات آر کے (RK) اسٹوڈیوز میں آر کے کے سینئر تلے بننے والی بچوں کی فلم ”اب دلی دور نہیں“ کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ میری بہن ناظمہ اس میں کام کر رہی تھی جس میں رولٹی، امجد خان، امتیاز خان، ہومن چونی وغیرہ بحیثیت چائلڈ آرٹسٹ کام کر رہے تھے۔ محافظ صاحب نے فلم کا اسکرپٹ لکھا تھا۔ ہمارے گھر محافظ صاحب کے ساتھ ان کے ایک اور دوست جناب کوثر بھی آیا کرتے تھے۔ محافظ صاحب نے مجھے بعد میں بتایا کہ کوثر صاحب ان کے کالج کے زمانے کے دوست تھے اور غالباً دونوں نے ساتھ ہی وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ میرا کام والد کے مختصر سے کمرے میں پہلے سے نوٹشی کے تمام لوازمات پہنچانا تھا پھر کھانا۔

میرے والد نے کوثر صاحب کے سانجھے داری میں ایک موٹر ٹریننگ اسکول بھی کھولا تھا۔ کچھ برس منافع بخش



طریقے سے چلتا رہا پھر خسارہ ہونے لگا تو اسے بند کر دیا۔ چنانچہ میرے والد صاحب کی محافظ صاحب سے ملاقاتیں موقوف ہو گئیں۔ مگر جب ملاقاتیں دوبارہ ہونے لگیں اور پرانے مراسم پھر سے استوار ہوئے تو لگ بھگ بیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ محافظ صاحب وہی تھے مگر میں نے اپنے والد کی جگہ لے لی تھی۔

اس صورت میں محافظ صاحب سے پہلی ملاقات مدہوش بلگرامی کے مکان OLAR واقع بل روڈ باندہ پر ہوئی۔ عمدہ لباس پہنے ہوئے، آنکھ پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے گندمی رنگ کے خوب صورت شخص کو دیکھ کر پہلے تو میں خوش ہوا بعد ازاں ان کی باتیں، ان کا انداز، خطاب، آداب مجلس دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ مدہوش صاحب کے گھر پر ہر شام ۷ بجے کے چرانے جلتے تھے۔ چار چھ دوست جمع ہوتے کبھی کوئی اپنے ساتھ ساتھ لایا کوئی چندہ کرنے کی تجویز رکھتا۔ شیشے کے آتے ہی سے نوشی شروع ہو جاتی۔ مگر ساتھ ساتھ گفتگو ہر موضوع پر ہوتی بالخصوص سیاست، فلم اور ادب پر بات چیت یقیناً ہوتی اور ہر روز ہوتی۔ محافظ صاحب غیر اردو دان اشخاص سے انگریزی میں اور ہم اردو جاننے والوں سے اردو میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ انہیں دونوں بانوں پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ یہی عالم مدہوش صاحب کا تھا۔

محافظ صاحب نے تاریخ اور سوشل سائنسز میں گریجویشن کیا تھا۔ موت سے ایک روز پہلے یعنی ۳۰ / اگست کو انہوں نے مجھے بتایا: ”قدرتی طور پر میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔ جو پڑھتا یا سنتا ہوں یاد رہ جاتا ہے۔“ اس خوبی کے باوجود وہ مطالعہ کثرت سے کرتے تھے۔ چوں کہ کالج کے دنوں میں سسٹیمک اسنادی باقاعدگی سے مطالعے کی عادت پڑ گئی تھی اس لئے عمرانیات، نفسیات، نقد اور ادب، فلم وغیرہ شعبوں کی اصطلاحات اور ان کے کنسپٹ (concept) تصورات وہ بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ انہوں نے پانچ برس تک ممبئی میں Secretary to Regional News Paper Association کے عہدے پر ملازمت کی اور ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

انہوں نے کئی مقامی اور غیر مقامی سنیما اور ٹی وی کی جانب سے منعقد کیے گئے فلمی مقابلوں میں جج کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ ان کا ذوق کتب، مینی اور فلم، مینی بہت اعلیٰ اور نفیس تھا۔ چنانچہ سٹیج جیت رے کے انتقال کے بعد میں نے اصرار کیا کہ وہ رے کی شخصیت اور فن پر ایک مضمون ضرور لکھیں۔ اردو دانوں کے لئے آپ کی جانب سے ایک نایاب تحفہ ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ مرحوم نے میری فرمائش پوری کی۔ ان کا سٹیج جیت رے سے متعلق مضمون ”ذہن جدید“ میں شائع ہوا جس کی داوہا قلمبندی صاحب، شمس الرحمن فاروقی صاحب، شمیم حنفی صاحب اور مدیر ذہن جدید جناب زبیر رضوی کے علاوہ کئی اور صاحبان ذوق نے دی۔ انہوں نے ایک اور مضمون خاکسار کی فرمائش پر لکھا تھا اور وہ تھا انتظار حسین کے ناول ”تذکرہ“ پر تاثراتی مضمون۔ وہ ”آج کل“ میں چھپا تو چھپا ہی مگر پاکستان کے بھی دور سالوں کی زینت بنا۔ انتظار حسین نے انہیں ایک طویل خط لکھا اور مضمون کے ساتھ ساتھ ان کے نقد و نظر کی تعریف بھی کی۔

وہ محترمہ قرۃ العین حیدر کے اس خیال سے متفق تھے کہ اختر الایمان صاحب کو بلاوجہ میجر پوسٹ مان لیا گیا ہے۔ انہیں غالب، اقبال، انیس اور یاس یگانہ کا خاصا کلام ازہر تھا۔ ۳۰ / اگست کو انہوں نے ان شاعروں کے کئی اشعار غزلوں کے اور نظموں اور مرثیوں کے بند سنائے۔ وہ ماہرین فن کے قدردان تھے۔ اس ضمن میں آپ ایک واقعہ سن لیں۔ ان کا بیان کیا ہوا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب محافظ صاحب ماؤنٹ میری چرچ کے قریب رہتے تھے۔ ”شام کا دھند لگا پھیل



رہا تھا میں شغل کرنے کی غرض سے آنٹی کے اذے پر جانے کے لئے نکلا۔ بمثل رائے کے بچے تک پہنچا تو دیکھا کہ رتیوک گھٹک پھانک سے باہر نکل رہے ہیں۔ فوراً ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ اور ان کے چرن چھو لیے۔ انہوں نے آنٹی شردھا سے ملنے والے شخص کا نام اور شغل دریافت کیا اور باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد انہوں نے اپنا مدعا ان پر ظاہر کیا کہ میں بمثل واسے ملنے آیا تھا، انہوں نے ایک کام سوچ دیا۔ انہوں نے پوچھا 'وہ کیا'۔ رتیوک گھٹک نے کہا کہ بمثل واسے انہیں مدھوتی کی کہانی سنائی اور کہا کہ اس کا اسکرین پلے لکھ دو۔ محافظ صاحب نے کہا 'یہ کون سا مشکل کام ہے آپ کے لئے'۔ کہا کہ مجھے کلکتہ جلد لوٹنا ہے۔ میری شوٹنگ کا شیڈول طے ہے۔ مشکل سے ایک دن ملتا ہے۔ پرسوں روانگی ہے۔ دیکھیں کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ توقف کے بعد کہا، کیا آپ میرے لئے ایک بوتل تھڑے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے کچھ رقم نکالی جسے محافظ صاحب نے یہ کہہ کر قبول نہیں کیا کہ دادا میں لے آتا ہوں۔ اسے اپنے قدر دان کا ایک حقیر تحفہ سمجھ کر قبول کر لیجئے۔

محافظ صاحب نے بتایا کہ انہوں نے تھڑے کی بوتل انہیں مہیا کر دی۔ اگلے دن رتیوک گھٹک سے دوسری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ تمہارا تحفہ بہت کام آیا، اس کی چسکیاں لیتا رات بھر لکھتا رہا۔ اور صبح تک میں نے مدھوتی کا اسکرین پلے مکمل کر دیا۔ He was a real genius یہ کہہ کر محافظ صاحب نے واقعہ مکمل کیا۔

یہ بات کم لوگوں کے علم میں آئی ہوگی کہ محافظ صاحب کسی ماہر یوگی کی طرح یوگا اور ورزشیں کیا کرتے تھے۔ اور شیش آسن، بل آسن اور میور آسن جیسے انتہائی مشکل آسن بآسانی کر لیتے تھے۔ انہوں نے میری بیوی کی مرتب کردہ کتاب "یوگا ہزار نفعت" کے لئے جو مضمون عنایت کیا تھا اور ان کے افسانوں کے مجموعے، "کانڈ کی دیوار" میں شامل افسانے 'روح کا جگنو'، 'الم اور اوم' کے علاوہ 'بھگوان سپور ناند' اور 'کنفیویشن' کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ بعض فلسفیانہ افکار جیسے حیات و موت، عشق و خرد، جذب و جنون، جزو کل اور فنا و بقا جو مومنا بعد الطبیعات کے ذیل میں آتے ہیں اور جو اس سے پرے ہونے کے باعث عقائد، فلسفہ یا اکتشافی استدلال سے قابل فہم ہو پاتے ہیں۔ محافظ صاحب کو ان ادق موضوعات کا عمدہ شعور تھا۔ ان کی گفتگو میں بلا کی خود اعتمادی ہونے کے باوجود مزاج میں تکبر نام کو نہ تھا۔ جب ان کی شخصیت کے کسی وصف یا ان کے افسانے یا مضمون کی تعریف کرتا تو شرما کر گردن جھکا لیتے اور مسکرا کر شکر یہ کا اظہار کرتے۔ لباس ہمیشہ عمدہ صاف ستھرا اور امریکی نہیں بلکہ انگریزی وضع اور معیار کا پہنتے۔ خرچ بہت سوچ سمجھ کر کرتے کبھی کبھار ان کی جزری کو دیکھ کر میں جھنجھلا جاتا۔ مگر اس کے باوجود وہ موقع موقع سے خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ مستقبل میں مالی احتیاج کے وقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا کرتے ہوں گے۔ ان کی موت سے ہفتہ عشرہ پہلے انہوں نے مجھے ناناوتی اسپتال کا ایک بل دکھایا اور کہا یہ رقم صرف دو دن میں خرچ ہوگئی۔ وہ بل سات ہزار روپے کا تھا۔

ان پر وقت و قفے سے پیغمبری وقت پڑتا رہا تھا۔ وہ دو دن فاقے سے رہے۔ بتایا کہ ماؤنٹ میری چرچ میں جا کر ایک گوشے میں بیٹھ جاتا وہاں فاقہ بہل جایا کرتا تھا۔ ان کا افسانہ "کنفیویشن" غالباً ان دنوں کی یادگار ہے۔ یہ افسانہ گو روایتی اسلوب میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس کے باوجود اس میں گہرائی اور تہہ داری بہت ہے۔ جیسے انور ادھا کا فادر رہیلو سے جنس کے موضوع پر بے اگ اور بے لگام گفتگو کرنا، جس کے نتیجے میں فادر رہیلو کا ششدر رہ جانا پھر نام نہاد ہونا کہ



انہوں نے جس کلامی پر مشتمل کلمات آخر کیوں سنے اور اس کے بعد جوان عورت کے حسن اور اس کی ان ہی باتوں کے تصور میں گم رہنا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو قاری کے ذہن کو ان کرداروں کی روح کی گہرائیوں میں پیوست، کسی قسم کے وہم یا جذباتی صدمے کی جانب منتقل کرتی ہیں۔

محافظ صاحب نے بتایا کہ میں نے پہلی بار قادیسیشن اور مدر فیکسیشن کے موضوعات کو یک ساتھ اس افسانے میں برتا ہے۔ میرے خیال سے علم نفسیات سے واقف تنقید نگار ہی اس افسانے کے مخفی محاسن کے تجزیے کے ذریعے ہم پر ظاہر کر سکتے ہیں۔

”ایک سالگرہ“ بھی محافظ صاحب کا اس اعتبار سے منفرد افسانہ ہے کہ اس میں انہوں نے فائو اسٹار برہنہ یعنی اعلیٰ ترین قبح خانے کے ماحول کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زندگی نام کے اس نشاط گھر میں نہ صرف رؤسا بلکہ سیاست دان، بیوروکریٹ افسران، تاجر پیشہ لوگ اور فلمی شخصیتیں حسن اور شراب کا لطف لینے کے لئے آیا کرتیں۔ افسانے میں پیش کیے گئے کرداروں بالخصوص زندگی نامیکہ (جنہیں سب آنٹی کہتے) سے مل کر حیرت انگیز مسرت ہوتی اور ان کے مال دستیاب کرنے کے طریقے یعنی زندگی نامہ میں لڑکیاں فراہم کرنے کے طریقوں کی تفصیل کو پڑھ کر آدمی صورت آئینہ حیراں رہ جاتا ہے۔

”ایک سالگرہ“ گفتگو میں شائع ہوا تھا۔ جناب سردار جعفری مرحوم نے اس افسانے کی رسید ارسال کی تو یہ بھی لکھا کہ آپ نے ایک ناقابل فراموش افسانہ لکھا ہے جو دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن میں گہرے سماجی ملامت اور سروکار رکھتا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی سطح پر ہونے والے جرائم اور دہشت گردی کے موضوع پر محافظ صاحب نے ”پاسپورٹ کی شناخت“ نامی ایک عمدہ اور بے مثال افسانہ لکھا تھا جو پندرہ بیس برس گزر جانے کے بعد باوجود بالکل تازہ اور آج کے حالات سے غیر معمولی طور پر مطابقت رکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

۲۰ / اگست کی شام، میں ان سے ملنے گھر پہنچا۔ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ براؤن رنگ کے دبیز کپڑے کی بش شرٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ بے نظر آرہے تھے۔ آواز میں معمولی سی خراش محسوس ہو رہی تھی۔ بتایا کہ بائیں طرف کا مسوڑھا متاثر ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے پانچ انجکشنوں کا کورس تجویز کیا ہے۔ تفتیش کے دوران ڈاکٹر اپنے شاگردوں سے کہہ رہا تھا کہ مرض سال چھ ماہ سے پل رہا ہے۔ مگر علامات ظاہر نہیں ہوئیں۔ زخم سے خون رسنے لگا تو جانچ شروع ہوئی اور مرض کی تشخیص ہوئی۔ ”ابتدائی منزل میں ہے ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی۔ مجھے پیش کی اور خود بھی لطف اندوز ہوئے۔ جب اجازت چاہی تو گھر سے میرے ساتھ باہر آئے۔ فرمایا ”کیسی ٹھنڈی ہوا ہے۔“ اس وقت واقعی فضا میں بڑی لطیف اور فرحت بخش کیفیت تھی۔ سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ شفق میں سیاہی ملول کر گئی تھی۔

مجھے اپنی گفتگو کا آغاز رشید حسن خاں صاحب کے ان کلمات سے کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے ٹیلی فون پر محافظ حیدر صاحب کی موت کی اطلاع خاں کسار سے ملنے پر کہے تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

”محافظ صاحب ایک بے مثال مہذب، شریف، وضع دار، لڑھے ہوئے اور ترشے ترشائے شخص تھے۔ وہ قدیم اور جدید تہذیب کے درمیان آخری کڑی تھے۔ اب ان کے جانے سے وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔“





مٹی کو یہ تو فبق کہ بن جاتی ہے آدم  
کو تا ہی آدم کہ وہ انسان ہیں ہوتا

مختار الدین احمد  
۳۰ اپریل ۲۰۰۲ء  
ریون فیلڈ یارک شائر

## ڈاکٹر مختار الدین احمد

راورہم، ساوتھ یارکشائر، برطانیہ

بڑا مشکل ہے یہ فیصلہ کرنا کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد اچھے شاعر ہیں یا معتبر نقار، خطیب اچھے ہیں کہ طبیب اچھے ہیں!

جی ہاں یہ کبھی مسیحا بھی ہوتے تھے۔ اپنے والد محترم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے جامعہ کراچی سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ چند سال تک لوگوں کی بیماریوں کا علاج پاکستان میں کرتے رہے۔ لیبا گئے اور لیبا سے ۱۹۷۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان آئے۔ یہاں سے انہوں نے انس تھیسیا (anaesthesia) میں تخصیص حاصل کیا اور ضرورت پڑنے پر لوگوں کو بے ہوش کرتے رہے۔ ایرانین آئل کمپنی میں کچھ سال کام کیا اور پھر انقلاب ایران کے بعد نا بحیر یا میں میڈ و گری یونیورسٹی میں معاون انس تھیسٹ (anaesthetist) کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۸۴ء میں وہاں سے واپس برطانیہ آ گئے۔ ۱۹۹۶ء میں رائل انفرمری، بریڈ فورڈ سے ریٹائر ہوئے۔ اب بریڈ فورڈ سے پچاس میل کے فاصلے پر شیلفیلڈ کے ایک چھوٹے سے نواحی گاؤں میں بقول خود اپنا وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتے ہیں۔

مگر نہیں صرف لکھنے پڑھنے میں ہی وقت نہیں گزارتے، اب طبابت کے کام کو خیر باد کہا



اور خطابت شروع کی ہے۔ آپ کو میری بات کا یقین آجائے گا اگر آپ ایک بار ڈاکٹر مختار الدین احمد کو کسی محفل میں، کسی جلسے میں یا کسی سیمینار میں سن لیں۔ بغیر نسخہ خطابت کے یہ اپنے سامعین کو اپنے زور خطابت سے ایسا مسحور کرتے ہیں کہ وہ مدہوشی کی کیفیت کے قریب قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک سحر پوشیدہ ہے چاہے وہ کوئی شعر ہو یا کوئی جملہ۔

انہوں نے جب اپنی کتاب ”مقالات مختار“ جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی ہے، مجھے عنایت کی تو میں نے کہا، ”ڈاکٹر صاحب میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے علم کے خزانے سے نوازا۔ اب مجھے ایک بہت عمدہ شعر بھی سنا دیجئے“۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کی طرح ان کی مسکراہٹ بھی مرصع ہے۔ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھری اور ترنم جاگا۔ وہ گنگنائے۔

قطرہ ناچیز کا کیا، جزو دریا ہو نہ ہو

ہاں مگر، دریا میں اتنی سی کمی رہ جائے گی

مصرعہ ثانی میں یہ جو دو لفظ ہیں ”اتنی سی“، انہوں نے ہی اس مصرعے میں انکساری کے ساتھ شاعر کی عظمت اور اس کی قلندری کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر مختار الدین احمد شاعر ہیں اور مختار تخلص کرتے ہیں۔ ہزار ہا اشعار انہیں ازبر ہیں، اپنے بھی..... اوروں کے بھی۔

میں نے پوچھا، ”آپ کی زندگی میں بے شمار واقعات رونما ہوئے ہوں گے۔ کوئی ایسا واقعہ جو بھلایا نہ جائے..... سنائیے گا؟“

کہنے لگے، ”ایک بار ایک شعر لکھا تھا کسی کے لئے۔ اس میں ساری کہانی رقم ہے۔ ملاحظہ ہو،

حیا آتی ہے یہ لکھتے کہ تجھ پر جان دیتا ہوں

ندامت کیوں نہ ہو رقم دم تحریر زندہ ہے

تو سلطانہ صاحبہ۔ سب سے دل چسپ واقعہ یہ ہی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔“

اب مختار صاحب اپنی کہانی کی ابتدا بیان کر رہے تھے۔ وہی اپنے خوب صورت، دل موہ

لینے والے افسانوی انداز میں وہ ہمیں لیے چلتے ہیں اپنے ساتھ اور کہتے ہیں، ”تقسیم سے قبل

ہندوستان کے بالکل مرکز میں وندھیا چل کا حسین پہاڑی علاقہ تھا جہاں مسلمانوں کے اقتدار رفتہ کی

یادگار، مغل اقتدار کی پاس دار، مسلم تہذیب کی علم بردار ایک چھوٹی سی ریاست بھوپال کے نام سے تھی۔

وہ پردہ نشین بیگمات کی حکومت اور رشک فردوس قدرتی مناظر کے لئے دنیا میں مشہور تھی۔ ملکہ وکنوریہ کی

ہم عصر نواب شاہجہاں بیگم نے پرانے شہر کے شمال مغرب میں نیا شہر آباد کیا جو ان کے نام پر

”شاہجہاں آباد“ کہلایا۔ یہ فقیر پر فقیر اسی شاہجہاں آباد میں پیدا ہوا۔

دیکھئے مٹی کہاں کی کس جگہ پھولی پھولی

ہم کہ جو پیدا ہوئے ہندوستان کے بیچ میں



والد نے مختار علی نام رکھا جس سے سن پیدائش ۱۳۵۱ھ نکلتا ہے۔ انگریزی حساب سے ۱۹۳۲ء بنتا ہے۔ والد کا اسم گرامی محمد ظہیر الدین تھا۔ چنانچہ اسکول میں از خود نام مختار الدین لکھ دیا گیا۔ میٹرک کے امتحان کا فارم پُر کرتے وقت جہاں میں نے اور تبدیلیاں کیں وہاں نام میں مختار کی مناسبت سے احمد کا اضافہ کر لیا یعنی مختار الدین احمد ہو گیا۔ تعلیم کا احوال ناگفتہ بہ ہے۔ مختصر یہ کہ چار سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی لیکن میں بڑے بھائی اور بہن کے ساتھ پڑھنا پہلے ہی سیکھ چکا تھا۔ جب مولوی صاحب نے کہا: ”کہو بیٹا الف تو میں نے کہا“ بے۔ انہوں نے کہا ”بے تو میں نے کہا“ تے، یعنی

عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے

کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

اس کے باوجود غیر ضروری طور پر مکتب میں بٹھایا گیا۔ ”رفت“ گیا اور ”بود“ تھا کے سوائے کچھ نہ سیکھا۔ گھر پر قرآن ناظرہ ختم کیا۔ ایک اینگلو انڈین خاتون نے انگریزی کی الف بے پڑھائی اور اذیت پسند موذی استاد نے حساب سے دل میں نفرت پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ بھوپال میں ہنوز طالب علم تھا کہ ملک تقسیم ہوا۔ ریاست کو ختم کرنے کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جس دن ریاست کی کنجیاں سردار پٹیل کے حوالے کی جانی تھیں اس سے ایک دن پہلے وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر اپنے خوابوں کے وطن پاکستان آ گیا۔

کارواں کے میر بھی ہم کارواں بھی ہم ہی تھے

آ کے منزل پہ دیکھا بے نشان بھی ہم ہی تھے

چند سال آوارہ گردی اور صحرا نوردی میں گزارے۔ موقع پاتے ہی تعلیم کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑا اور بالآخر ڈومیسٹک لکچر، کراچی سے صرف اللہ کے فضل اور بھروسے پر ایم بی بی ایس کر لیا۔ ارادہ تھا کہ خدمتِ خلق میں عمر گزار دوں گا۔ لیکن پاکستان میں نہ خدمت کا کوئی تصور تھا نہ خلق کا۔ چند سال سرکاری ملازمت کی جس میں طرح طرح کے تعصبات کا شکار رہا۔ تنگ آ کر ارضِ نو وطن کو بھی خیر باد کہا مگر آج تک بقول اقبال، ”غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں“ کی مثال صادق ہے۔

نہ کیوں زمانے میں مختار سر اٹھا کے چلے

مری زمین سے ہے آفتاب کا رشتہ

موسم خنک پر خوش گوار تھا۔ شام سرمئی تھی اور ڈاکٹر مختار گویا تھے۔ اب وہ اپنی ادبی زندگی کے دور میں داخل ہو رہے تھے۔

”ادبی زندگی کا آغاز کہیے کہ ہوا ہی نہیں۔ بچپن میں بڑے بڑے ’کل ہند‘ مشاعرے سنے۔

۱۹۴۹ء میں کراچی میں سولہ سال کی عمر میں پہلی بار مشاعرے میں شعر سنائے۔ اسی سال حیدر آباد سندھ میں ایک ہفت روزہ رسالے ’طوفان‘ میں غزل شائع ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں کوئٹہ میں گل خان نصیر کے اخبار ’وطن‘ میں چھپتا رہا۔ پہلی غزل جو مقبول عام کی سند حاصل کر سکی ۱۹۵۲ء میں لکھی۔ ملازمت کے دوران شاعری کی جانب توجہ نہ کر سکا۔ بیس (۲۰) سال بعد اسی (۸۰) کی دہائی میں پھر لکھنا شروع



کیا۔ پہلا مضمون حلقہٴ ارباب ذوق کوئٹہ میں ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں پڑھا اور کراچی سے نکلنے والے رسالے 'نفسیات' میں شائع ہوا۔ چند غزلیں اور ان کا انگریزی ترجمہ اسلام آباد سے دس سال پہلے روشنی کا سایہ کے نام سے چھپا تھا اور اب ناپید ہے۔ تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ 'مقالات مختار پاکستان سے شائع ہوا۔ تاریخ اشاعت ۲۰۰۰ء ہے۔ اسے دوستوں میں برگ سبز کی طرح تقسیم کر دیا۔ اب اتنے ہی مضامین اور جمع ہو چکے ہیں۔ سو ڈیڑھ سو غزلیں اور نظمیں غیر مطبوعہ جمع ہو گئی ہیں۔ اللہ ہمت اور توفیق عطا فرمائے تو ان کی اشاعت کا سامان ہو۔ شہرت سے خوف آتا ہے۔ کبھی خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لکھا بھی کم۔ زندگی زیادہ تر مطالعے اور تفکر میں بسر ہوئی۔ مشکل مضامین کو آسان نثر میں لکھا پر مشکل پسندی کا الزام باقی رہا۔ شعر میں غیر شعوری گہرائی عوام تو کیا خواص تک کی سمجھ سے بالاتر رہی۔ کسی کی تتبع میں شعر نہیں کہا۔ کسی کی غزل پر غزل نہیں کہی۔ چند طرحی غزلیں کہنا پڑیں، کامیاب نہ ہو سکیں۔ بس یہ ہے ادبی زندگی کی داستان۔ پہلا شعر تو نہ جانے کب کہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بارہ تیرہ سال کی عمر میں ایک نظم کہی تھی۔ اس کے تین شعر اچانک یاد آ گئے ہیں۔

وہ ٹھنڈی ہوا اور شفق کے نظارے  
گلابی گلابی زمیں کے کنارے  
وہ چھوٹی سی ندی کا شفاف پانی  
وہ لہروں کی جھل مل زمیں پہ ستارے  
وہ تپتی مئے گل سے بدمست رقصاں  
کبھی اس کنارے کبھی اُس کنارے

غزل میرا میدان ہے اور غزل ہی میرا ایمان ہے۔ رباعی، قطعات، قصیدہ اور معرۃ نظم بھی لکھی ہے۔ نثری نظم کی تو ترکیب ہی غلط ہے۔ میری کتاب میں باصر کاظمی پر جو مضمون ہے اس میں ضمنی طور پر نثری نظم پر بحث آ گئی ہے۔ نثری غزل ہمارے احساس کمتری میں مبتلا شعرا جب انگریزی بدھنسی میں مبتلا ہوتے ہیں تو نثری نظم یا نثری غزل کہنے لگتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی سے لے کر آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، اقبال اور جوش اور ان کے بعد نام راشد، فیض اور اختر الایمان نثری نظمیں لکھتے تو شاید میں بھی تسلیم کر لیتا۔ اختر شیرانی اور میراجی نے نثری غزل کہی ہوتی تو ممکن ہے مجھے ان پر اعتبار نہ رہتا۔

اردو زبان اور ادب اور رسم الخط کے حوالے سے انہوں نے کہا، "اردو کسی غیر ترقی یافتہ بولی کا نام نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی زبان ہے اور نظام ابلاغ کا نام ہے جس کی بنیاد رسم الخط ہے۔ اردو کا موجودہ تازہ تلفظ رسم الخط کی دین ہے۔ دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تلفظ بدل جاتا ہے۔ اس طرح ہم 'ف'، 'ز'، 'ض' اور 'ظ' میں صوتی فرق قائم نہیں رکھتے لیکن معنی کے اختلاف کو قائم رکھتے ہیں یعنی 'ارض' اور 'عرض' اور 'ارز' میں معنوی فرق دیوناگری یا رومن میں باقی نہیں رہے گا۔ اردو دشمن ہی رسم الخط کی تبدیلی کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ اردو کا مستقبل اللہ کے ہاتھ میں ہے ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ سر سید احمد خان کے



زمانے سے اردو سیاست دانوں اور حاکموں کا تختہ مشق ہے مگر اب تک زندہ ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے صرف غیر دشمن تھے اب اپنے بھی دشمنوں میں شامل ہیں۔ رشک، حسد، نفرت اور تعصب اب تک اردو کو ختم نہیں کر سکے تو آئندہ بھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ جس دن اللہ ہم کو ہماری غلامانہ ذہنیت سے نجات دے گا اس دن اردو کا بول پھر بالا ہو جائے گا۔ خوش فہمی سہی لیکن میں ’’لانقنطو‘‘ کا قائل ہوں۔“

وہ کہہ رہے تھے..... ”ترکی سے لے کر افغانستان، بخارا و سمرقند سے لے کر بنگال تک غزل لکھی جا رہی ہے لیکن جس پائے کی غزل اردو میں لکھی جا رہی ہے اس کی مثال آج کل اور زبانوں میں مشکل سے ملتی ہے۔ اردو میں اصناف شاعری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہائیکو اور ماہیے لکھے جا رہے ہیں۔ نظم، قطعات، مثنوی، قصیدے اور مرثیے کی شکل ابتدا سے مروج ہے۔ پچھلی صدی سے آزاد نظم بھی مقبول صنف بن چکی ہے۔ لیکن ہماری نمائندہ صنف شعر غزل ہے۔ جو لوگ شعر کی باریکیوں اور گہرائیوں میں اترنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ بھی غزل کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں ورنہ ہندوستان میں غزل گانے والوں کے ہزاروں کیسٹ نہ بک رہے ہوتے حالانکہ اسی ہندوستان میں ہومرا اور ورجل سے پہلے کی طویل رزمیہ نظمیں رامائن اور مہا بھارت کی شکل میں موجود ہیں۔ کیا رباعی اور قطعے کا مقابلہ کر کے ایک دوسرے پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔ اصناف سخن کا مقابلہ احمقانہ فعل ہے۔ انتخاب کا سب کو اختیار ہے۔ ہاں جو لوگ غزل کے اس لئے مخالف ہیں کہ روس، امریکہ یا یورپ میں اس کا رواج نہیں تو ان کی عقل اور ضمیر کے لئے دعائے خیر کرنی چاہیے۔“

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا..... ”ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ شعری ادب میں نظم اپنی موضوعیت کی بنا پر اور غزل اپنی معروضیت کے حوالے سے اپنے عہد کی ترجمان ہیں ایک ظاہر اور دوسری باطناً۔“

انگلستان تک میں کچھ لوگوں کی معاشی اور عیاشی کی ضروریات اردو سے پوری ہو رہی ہیں۔ یہ لوگ اردو کے خادم سے ابتدا کرتے ہیں پھر مخدومی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ میری روزی کا ذریعہ میرا علم رہا ہے جو میں نے کسی اور زبان میں حاصل کیا تھا اور جس نے میری بیوی بچوں کی کفالت کی لیکن میری روح کی پرورش میں اردو کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اگر گھانا ہے تو میں چاہوں گا کہ مسلسل یہ نقصان اٹھاتا رہوں۔“

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا، ”میں سب سے متاثر رہا ہوں لیکن کسی کا تتبع نہیں کیا۔ گزشتہ صدی میں آسمان ادب کا سورج علامہ اقبالؒ تھے اور باقی سب ستارے۔ لڑکپن میں اقبالؒ سے اختر شیرانی زیادہ اچھے لگتے تھے۔“

Dr. Mukhtar-ud-din Ahmed,

Springfield House, Moor Lane North, Ravenfield, Rotherham,

S65 4LZ, South Yorkshire, UK



میری زندگی کا ہر لمحہ یادگار اور قیمتی ہے۔ اب میں بس ان یادگاروں پر غور کرتا ہوں



مشکور حسین یاد

لاہور، پاکستان

۱۹۹۷ء میں ان سے پہلی بار لندن میں سرسری سی ملاقات ہوئی۔ سحر مہدی اور بھائی رحمن مہدی نے میری دو کتابوں ”نخن وردوم“ اور میرے کلام کا مجموعہ ”حرف معتبر“ کی تعارفی تقریب منعقد کی تھی۔ مشکور حسین یاد صاحب ان دنوں لندن میں تھے۔

پھر ان سے دوسری ملاقات ٹورنٹو، کینیڈا میں ہوئی۔ یہ میرا بیس کی صد سالہ برسی پر منعقد سیمینار میں تشریف لائے تھے اور جناب سید تقی عابدی اور محترم اطہر رضوی کے مہمان تھے۔ میری گزارش پر مشکور صاحب بھائی سید افتخار حیدر کے ساتھ میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ محترم افتخار حیدر ان دنوں ”سیرت محمد بزبان قرآن جلد دوم“ کی تیاری میں مصروف تھے۔ جلد اول شائع چکی تھی جس کی ایک کاپی انھوں نے مجھے عنایت کی تھی۔ ان کا یہ قابل احترام کام اسلامی ادب میں ایک شاندار اضافہ ہے۔

مشکور یاد صاحب سے ملاقات یادگار رہی۔ اپنے بارے میں انھوں نے بتایا وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ضلع حصار مشرقی پنجاب ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں بی اے کے بعد اردو اور فارسی میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ۱۹۴۵ء میں ہی حصار کے نیم سرکاری ہفتہ وار ”پکار“ کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ان کی بیگم خدیجہ خاتون، والدہ، بھائی اظفر



حسین اور خاؤ کا پورا خاندان شہید ہو گیا۔ انھوں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب ”آزادی کے چراغ“ میں درج کی ہے۔

۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو مشکور حسین اپنا سب کچھ قربان کرنے کے بعد پاکستان پہنچے۔ یہاں سول محکمے میں ریونیو افسر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ان کا عقد ثانی سعیدہ بیگم سے ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں لیکچرار ہو گئے اور ربع صدی تک گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو زبان و ادب پڑھا کر ریٹائرڈ ہوئے۔

مشکور صاحب کے تین بیٹے اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ ڈاکٹر سید صفدر رضا جدہ میں ہیں، دوسرے بیٹے ڈاکٹر سید افسر رضا آرمی میں ہیں، تیسرے عامر رضا ہیں جنھوں نے جرمنی سے انفراسٹرکچر پلاننگ میں ایم ایس سی کیا۔ بڑی بیٹی عمدا لیب زہرا، دوسری غفرین زہرا اور تیسری درخشف نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ سب اپنے گھروں میں خوش ہیں۔

جناب مشکور بتا رہے تھے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۹ء سے ہوا جب انھوں نے غزل لکھنی شروع کی۔ پہلے پہل انھوں نے ”اشک“ تخلص اختیار کیا۔ ایک بار کسی دوست کے کہنے پر سہرا لکھنا تھا اس نے کہا کہ آپ اشک تخلص کرتے ہیں تو سہرا بھی اشکوں سے بھرا ہوگا۔ اس پر قہقہہ لگا۔ بات درست تھی لہذا انھوں نے اشک کو خیر باد کہہ کر یاد تخلص اختیار کیا اور پھر نثر بھی لکھنی شروع کی۔ تحریریں چھپنے لگیں۔ انھوں نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ یوں ان کے کلام کے چھ مجموعے کتابی شکل میں وجود میں آ گئے۔

”آپ کے لیے نثر لکھنا زیادہ دلچسپی کا باعث ہے یا شعر کہنا؟“

اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا ”میں نے خود کو کسی بھی میدان کا پابند نہیں بنایا۔ میں خود کو شاعروں کے زمرے میں شمار نہیں کرتا نہ ہی خود کو صرف نثر نگار کہتا ہوں اس لیے ڈٹ کر ہر صنف اور ہر میدان میں طبع آزمائی کرتا ہوں۔ اسی طرح ڈٹ کر بولتا بھی ہوں۔“ اس وقت انھوں نے اپنی ایک غزل سنائی اور وہ بھی ڈٹ کر۔

کیا پوچھتے ہو حال مرے اضطراب کا  
سایہ فلکن ہوئی کبھی سیراب کر گئی  
کیا جانے کب سے اس طرح مجھ سفر ہیں ہم  
شاید کہ آب و گل کی طبیعت ہے موج پر  
ہاتھوں میں آ گیا ہے ورق آفتاب کا  
آوارگی ہماری تھی آنچل سحاب کا  
پتوار ہے نفس کی سفینہ حباب کا  
شعلہ شراب کا ہے ترانہ شباب کا

مشکور حسین یاد کی نثر میں بھی خاصی کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ چند کے نام ہیں۔

۱۔ آزادی کے چراغ (تحریک پاکستان پر قربانیوں کی داستان) ۱۹۷۱ء

۲۔ جوہر اندیشہ (انشائے ۱۹۷۵ء)

۳۔ دشنام کے آئینے (طنزیہ مضامین ۱۹۷۵ء)

۴۔ اپنی صورت آپ (مزاحیہ طنزیہ مضامین ۱۹۷۷ء)



۵۔ الاحول والاقوة (مزاہدہ طنزیہ مضامین ۱۹۸۱ء)

۶۔ تماشا کہیں جسے (مزاہدہ مضامین ۱۹۷۵ء)

۷۔ ستم ظریف (مزاہدہ مضامین ۱۹۸۸ء)

۸۔ ستارے چہچہاتے ہیں (ستاروں اور زاپکے کے حوالے سے طنزیہ مضامین ۱۹۷۵ء)

۹۔ بات کی اونچی ذات (انشائیے ۱۹۸۹ء)

۱۰۔ وقت کا استعارہ (انشائیے ۱۹۹۷ء)

۱۱۔ قرآن کا فلسفہ آسان (۱۹۹۷ء)

۱۲۔ ممکنات انشائیہ (تنقیدی مضامین ۱۹۸۳ء)

۱۳۔ غالب بوطیقا (تفہیم غالب ۱۹۹۸ء)

۱۴۔ غالب کی طبع نکتہ جو

۱۵۔ مطالعہ انیس کے نازک مراحل

۱۶۔ اقبال کے عوامی افق

۱۷۔ میر بلا نوش

تقریباً چھ سات مجموعے زیر طبع ہیں جن میں نثری و شعری کے علاوہ تقریروں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔

اردو کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اردو کا مستقبل ہرگز ہرگز تاریک نہیں، لیکن امریکہ، کینیڈا، برطانیہ اور یورپ میں والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو زبان ضرور پڑھائیں اور نوجوانوں کو اردو محفلوں میں شریک کرائیں۔

وہ اردو کا رسم الخط بدلنے کے حامی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کسی بھی چیز کی تبدیلی سے قبل اس کے نفع نقصان کا جائزہ لے لیں اور پھر فیصلہ کریں۔ اردو رسم الخط کی تبدیلی میں نقصان زیادہ ہے نفع کم۔

”مشکور حسین یاد بلاشبہ بھول بھلیوں کا ایک مجموعہ ہیں۔ ان کے متعلق ایک نامور ادیب محقق و نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ (مطبوعہ چہار سو مئی جون ۱۹۹۸ء)

”مشکور حسین یاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پہلی ملاقات ہی میں بے تکلف ہو جاتا ہے اور بے تکلفی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں بلکہ بہت خطرناک قسم کی۔ وہ پہلی ملاقات میں اپنے بارے میں بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اپنی جنس کے بارے میں نہایت ہی خوفناک سی بات یوں آرام سے کر جائے گا جیسے وہ آپ کو منڈیوں کے بھاؤ سنار ہا ہو۔ ابھی آپ بھونچکا ہو کر ٹک ٹک دیم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوں گے کہ دوسرے ہی لمحے وہ آپ سے نہایت پراسیویٹ قسم کا سوال پوچھ لے گا ویسا ہی جیسا منٹو کے ایک کردار نے جاکلی سے پوچھا تھا تمھاری انگلیا کا سائز کیا ہے۔ یہ ایسا سوال ہوتا ہے جس کا صحیح جواب آپ



خود سے بھی چھپاتے ہیں اور صرف اپنے پرائیویٹ معالج کو بتاتے ہیں اگر آپ حیرت اور خفت کے یہ دونوں وار خندہ پیشانی سے سرگئے تو مشکور بلا سوچے سمجھے آپ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوست بن گیا۔ بصورت دیگر بھی وہ آپ کو دوست ہی سمجھے گا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ دوسری ملاقات میں اسے کالی بلی سمجھ کر اپنا راستہ بدل لیں۔ مجھ ایسے کم آدمی شخص کے لیے مشکور سے ملنا ایک عجیب تجربہ تھا۔ میں تعلقات کی سیڑھی کے پہلے پائیدان پر جھجکا ہوا کھڑا عمر بتا دینے والوں میں سے ہوں اور کہیں برسوں کے بعد دو چار پائیدان چڑھے ہوں گے اس لیے اکثر لوگوں کے ساتھ میں پہلے پائیدان سے اوپر نہ جا سکا مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے لیکن ہوا یوں یکہ ایک سہانی صبح مشکور سے پہلا تعارف ہوا اس نے آؤ دیکھانہ تاؤ میرا ہاتھ پکڑا اور زقند لگائی کہ میں نے خود کو آخری پائیدان پر مشکور کے ساتھ قہقہے لگاتے پایا۔ نیچے دیکھا تو بہت سے دوست پہلے پائیدان پر سے مشکور کو کم اور مجھے زیادہ حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن تعجب ہے کہ مجھے خود پر حیرت نہ تھی۔

تعلقات کا یہ انداز اور دوست بنانے کی یہ خوبی اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی تحریر کا بھی امتیازی وصف ہے۔ ایسا وصف جس نے اس کے طنز کا انداز متعین کیا ہے۔ مزاح نگار اپنے قاری کو گدگداتا ہے۔ طنز نگار چٹکی کاٹتا ہے لیکن ہر دو صورتوں میں مصنف اپنا فاصلہ برقرار رکھتا ہے لیکن مشکور کا یہ حال ہے کہ وہ عید ملنے کے انداز میں قاری سے بغل گیر ہو کر لطیفے سنا تا قہقہے لگاتا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کی کھال میں اپنے ناخن بھی اتارتا جاتا ہے۔ اب یہ قاری کی اپنی کھال کی حساسیت ہے کہ وہ اس سے کیا کچھ اور کتنا کچھ محسوس کرتا ہے۔

مشکور کا طنز تلخ تو ہے لیکن اس کی تلخی کی شدت یا سرے سے اس کی تلخی اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ وہ سب سے پہلے اپنا مذاق اڑاتا ہے عام زندگی میں بھی اس کا یہی انداز ہے میں نہیں جانتا کہ اس سے اس کی کون سی جبلت تسکین پاتی ہے لیکن فنی نقطہ نظر سے طنز کا یہ انداز بے حد اہم ہے اپنی ذات کو طنز کا مرکز بنا کر مشکور طنز کی کڑواہٹ میں بھی کمی کرتا ہے اور خود پر قاری کو ہنسنے کا موقع دے کر بعد میں اس پر دل کھول کر ہنسنے کا حق بھی محفوظ رکھتا ہے۔ اس انداز نے اس کی مختلف کتابوں میں مختلف طور پر رنگ افروزی کی ہے۔ بیگم کی ڈائری میں اگر وہ اپنی بیوی اور اس کے حوالے سے میری آپ کی بیویوں کو خود پر ہنسنے کا موقع فراہم کرتا ہے تو دشنام کے آئینے میں وہ خود کو گالی دے کر معاشرے کی گالیوں کا حساب چکاتا ہے۔ مشکور کا عوامی زندگی میں بھی یہی انداز ہے اور طنز یہ تحریروں میں بھی۔ اس کے ہاں انکسار تو ہے لیکن اس کا اظہار عجیب طریقے سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کہیں گے مشکور صاحب! آپ کی فلاں کتاب بہت اچھی ہے، خوش ہو کر کہے گا ”جی جناب! ٹو ہے وہ تو“ آپ حیران ہو کر سوچیں گے کہ ٹو کا اس مسئلے سے کیا تعلق؟... تو بھائی صاحب حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ”ٹو“ مشکور کا تکیہ کلام ہے، تکیہ کلام بھی کیا بس تکیہ ہی سمجھ لیں۔ تکیہ کلام کے لیے اپنا گئے لفظ گالی، چیز یا جانور وغیرہ سے جو نفسی تلازمات وابستہ ہوتے ہیں ان کی تحلیل نفسی کی جائے تو لاشعوری محرکات کی عجیب طلسم کاری نظر



آتی ہے میں یہ تو نہیں جانتا کہ ٹو سے مشکور کی ہم آہنگی جذباتی ہے یا نفسیاتی یا اسے ٹو کی شکل میں اپنے لیے کچھ نظر آتا ہے لیکن اتنا واضح ہے کہ ٹو دوستی نہیں مارتا تو سمجھ لیجئے مشکور کا بھی یہی عالم ہے۔ آپ اس پر جتنا بھی چاہیں بوجھ لا دیں وہ کبھی برا نہ منائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ کام محبت سے کریں۔ وہ دوست کی محبت میں ہر انتہا تک جانے کو تیار ہے اور محاورے کے برعکس کبھی اڑیل ٹو نہ ثابت ہوگا۔ یہی اس کے قلم کی کیفیت ہے جو کبھی اڑیل نہ بنا۔ نظم و نثر دونوں چراگاہیں اس کے لیے ناکافی ثابت ہوتی ہیں۔ ہر مضمون اور مسئلہ کی کیاری میں منہ مارنے کو تیار، پر کیا مجال جو قلم کی سیاہی سے کسی پر گندے چھینٹے اڑائے ہوں۔ کسی کا دل دکھایا ہو۔ چٹکی تو لی لیکن نیل نہ پڑنے دیا۔ واہ کیا ٹو طنز نگار ہے۔“

مشکور حسین یاد اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہیں کہ انہیں ایک مزاج شناس بیگم ملی ہیں۔ بیگم سعیدہ مشکور سے ان کی جھڑپیں بھی ہوتی ہیں مگر ان میں مشکور حسین یاد کا بے پناہ پیار اور اعتماد چھپا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

”وہ مجھ سے عموماً لڑتے رہتے ہیں اور جب میں پوچھتی ہوں آپ مجھ سے لڑتے کیوں ہیں؟ تو فوراً جواب دیتے ہیں ”لڑ کہاں رہا ہوں اظہار محبت کر رہا ہوں۔“ مزید صفائی پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ”دیکھو نا! اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں تمہاری ذات میں کیوں دلچسپی لیتا محبت ہے جیسی تو تم سے الجھتا ہوں، پیاری! میرے لڑنے کی قدر کرو... بلکہ لڑتے وقت میرے منہ میں مٹھائی بھر دیا کرو“ لطف کی بات یہ ہے کہ لڑنے کے باوجود انہوں نے روایتی لڑنے والوں کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ منہ سجا کر بیٹھے ہوں ادھر لڑتے ہیں اور ادھر معمول کے مطابق باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے لڑنے کا انداز بھی خوب ہے ایک تو لڑائی سے پہلے اعلان کریں گے کہ دیکھو میں لڑنے والا ہوں اور جب میں اعلان پر کوئی توجہ نہیں دیتی تو تنبیہ کے طور پر ایک دو تین بھی کہتے ہیں ”ایک... دیکھو سعیدہ! مان جاؤ، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔“ اس کے بعد دس پندرہ منٹ انتظار کریں گے میں کوئی جواب نہ دوں گی تو پھر کہیں گے ”دیکھو میں اب دو کہنے والا ہوں میرا خیال ہے تم مان ہی جاؤ۔“ اسی طرح خاصی دیر کے بعد جی کڑا کر کے تین بھی کہہ ڈالتے ہیں۔ غصے اور ناراضی میں انگریزی بولنا شروع کر دیتے ہیں جو عموماً غلط اور بے ربط ہوتی ہے۔

گریہ و زاری میرے شوہر کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان حضرات کی آنکھوں میں ایسے ایسے موقعوں پر آنسو آتے ہیں کہ آپ سنیں تو حیران رہ جائیں۔ مثال کے طور پر میرے میاں کا کہنا ہے کہ وہ ایک دفعہ ملکہ ترنم نور جہاں کے اس گانے پر بہت روئے ”منڈیا سیالکوٹیا“ میں نے پوچھا ”اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟“ بولے مجھے یوں لگا جیسے یہ تمام کائنات سیالکوٹ ہے اور میں ہی وہ ”منڈا“ ہوں جسے روح کائنات بلا رہی ہے۔“ میں نے کہا ”حضرت آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھی ہے؟“ بولے ”اسی لیے تو مجھے اور بھی رونا آیا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں لیکن پھر بھی کوئی مجھے بلا رہا ہے۔“

محفلوں اور دوستوں میں ہمیشہ ہنستے اور چہچہاتے نظر آئیں گے لیکن تنہائی میں عام طور پر ایک



بچے کی طرح رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ انھی کا کہنا ہے کہ ایک شام تنہا بیٹھا ہوا تھا گرمی کے دن تھے۔ برف میں لگے ہوئے بڑے سیاہ خوشبودار آلو بخارا کھائے تو اس شکر کے احساس سے کہ اللہ میاں نے اپنے بندوں کے لیے کیسی کیسی نعمتیں اتاری ہیں، خوب رقت طاری ہوئی۔ اس واقعے کو وہ ”معروف بذریعہ آلو بخارا“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اکثر مختصر نویسی کے مقابلے میں مختصر گوئی سے کام لیتے ہیں، اس لیے ان کے ہاں ”وہ“ کا لفظ بے شمار معانی کا حامل ہے۔ وہ لاؤ، وہ کھلاؤ، وہ بھاؤ، وہ کہاں ہے، وہ کیا ہوا، وہ میرا مطلب ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ سننے والے کے ہوش و حواس پر منحصر ہے کہ وہ غریب موقع شناسی اور سیاق و سباق سے کہاں تک کام لیتا ہے ہر صبح شیو کرتے وقت مونچھیں بنانے کے لیے قینچی مانگتے ہیں تو آواز لگائیں گے۔ ”ارے بھئی سعیدہ! کیا غضب ہے... میں کب سے چیخ رہا ہوں میری مونچھیں کہاں چلی گئیں۔ خدا کے لیے میری مونچھیں جلدی سے لے آؤ کالج جانے میں دیر ہو رہی ہے۔“ اور ساتھ ہی ساتھ دو انگلیوں سے قینچی کا اشارہ کرتے رہیں گے۔ بچے بھی ان کی قینچی کے جانی دشمن ہیں اور سچ یہ ہے کہ کبھی کبھی میں بھی انجانے طور پر یہ قینچی اٹھا لیتی ہوں اور پھر اسے کہیں رکھ کر بھول جاتی ہوں وہ غریب چیختے رہتے ہیں۔

جمیل جالبی صاحب کا کہنا ہے کہ مشکور بھائی چاہتے ہیں کہ ہر کام جلدی سے ہو جائے اور اسی عجلت کے باعث ان سے یہ لطیفے سرزد ہوتے ہیں۔ دراصل ان کی ”فی الفوریت“ انھیں تماشا بناؤالقی ہے۔ ایک دن میاں نے مجھے بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا ”سعیدہ اچھا ہی ہے کہ دوست احباب میری بدحواسیوں سے محفوظ ہو لیتے ہیں، اگر انھیں میرے درد و کرب کا اندازہ ہو جائے تو یقیناً بہت پریشان ہوں گے۔“

Syed Mashkoor Hussain Yad  
8- Zafar Colony  
Samanabad Lahore, Pakistan





زندہ ضمیروں پر مردہ ضمیروں کی حکومت۔ تعجب ہے!

17 مارچ 2003ء

## پروفیسر منیر احمد یزدانی

میرپور، آزاد کشمیر، پاکستان

بچپن میں پولیو جیسے خوف ناک مرض میں مبتلا ہو کر ایک مانگ سے محروم ہو جانے والا بچہ زندگی کی بے رحمیوں کا شکار ہو کر بھی مایوس نہ ہوا۔ اُس عمر میں اس نے اقبال کو پڑھنا نہ ہوگا مگر وہ فکر اقبال کو اپنا کراقبال کے ان اشعار کی تفسیر بن گیا۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی  
تو اسے پیانا امروز و فردا سے نہ تاپ  
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی  
جاوداں پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی  
سزا آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی  
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی  
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب

پروفیسر کے محترم درجے تک پہنچنے والا یہ بچہ منیر احمد یزدانی ہے۔ اس زیاں خانے میں منیر کو بچپن اور لڑکپن سے ہی کئی حوصلہ شکن آزمائشوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ میٹرک میں سائنس مضامین کے ساتھ انہوں نے بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی لیکن مالی پریشانیوں کی وجہ سے انہیں سائنس چھوڑ کر کامرس کے مضامین اختیار کرنا پڑے۔ پھر علمی اور ادبی ذوق نے انہیں دوسری راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ میں آپ کو اس کی مختصر تفصیل بتا دوں کہ آج کے پروفیسر یزدانی کی زندگی کے واقعات موجودہ دور کے



نوجوانوں اور طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کی جدوجہد آتش کے اس شعر کی بھی یاد دلاتی ہے۔  
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

منیر ہمیں بتاتے ہیں، وہ ۷/ جنوری ۱۹۶۰ء کے دن میر پور آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے۔ بقول سردار محمد خان، ”علامہ اقبال کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ اس حوالے سے ہم فکر اقبال کے امین ہیں۔“ منیر احمد نے ابتدائی تعلیم منڈی بہاؤ الدین سے اور میٹرک تک کی تعلیم گورنمنٹ پائلٹ ہائی اسکول نمبر ۱، میر پور سے حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء میں میٹرک میں بورڈ کا امتحان اپنے گروپ میں اول پوزیشن سے پاس کیا۔ ۱۹۷۸ء میں انٹر کا امتحان آئی کام گروپ میں تعلیمی بورڈ میر پور سے دوسری پوزیشن حاصل کر کے پاس کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ہیملی کالج آف کامرس، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی کام کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۸۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

منیر بتا رہے تھے کہ بی کام سے اردو میں ایم اے کرنے کی وجہ ان کی اردو زبان و ادب سے علمی لگن تھی۔ انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے الائیڈ بینک کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۸۴ء میں محکمہ تعلیم آزاد کشمیر میں بحیثیت لکچرار اردو گورنمنٹ کالج کھوئی رٹہ میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۸۹ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج اسلام گڑھ میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء سے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میر پور میں تعینات ہیں اور ایف اے، بی اے اور ایم اے کی اردو کلاسوں میں طالب علموں کو اپنے علم سے فیض یاب کر رہے ہیں۔

منیر احمد کے بچپن میں ہی ان کی والدہ کا انتقال ہونے کی وجہ سے ان کے ماموں محترم سلطان سکندر اور محمد غالب نے ان کی پرورش کی ذمہ داری اٹھائی۔ اس کے علاوہ ان کی ہمیشہ محترمہ رفعت سلطانہ نے ان کی تعلیم مکمل کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۰ء میں ان کی شادی ہوئی۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو اسکول کی سطح پر ہو گیا تھا جب انہوں نے ۱۹۷۶ء میں افسانہ نگاری کے مقابلے میں دوم پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسی زمانے میں ایک مزاحیہ مضمون بعنوان ”میں کسی سے ڈرتا نہیں سوائے عورت کے“ لکھا جو ماہنامہ ”سماج“ میں شائع ہوا۔

علامہ اقبال ان کے آئیڈیل تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء میں ان کی صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں مقابلہ مضمون نویسی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۷۹ء میں ادارہ قومی تشخص، لاہور کے زیر اہتمام کل پاکستان مقابلہ مضمون نویسی میں اساتذہ، صحافی اور دانشوروں کے گروپ میں انہوں نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

ڈگری کالج، میر پور آزاد کشمیر کے علمی و ادبی مجلے ”سروش“ کی مجلس ادارت میں بحیثیت طالب علم نائب مدیر کے فرائض بھی نبھائے۔ صحافت سے دل چسپی کے باعث انہوں نے ۱۹۸۷ء میں گورنمنٹ چراغ حسن حسرت کالج، کھوئی رٹہ، آزاد کشمیر کے مجلے ”حسرت“ کا اجرا کیا اور ادارت کے



فرائض بھی انجام دیے۔ ۱۹۸۴ء میں میر پور آزاد کشمیر سے عملی و ادبی جریدہ ”ارتعاش“ جاری کیا اور مدبر اعلیٰ کی حیثیت سے صحافتی خدمات انجام دیں۔

پروفیسر منیر نے ابتدا میں شعر بھی کہے۔ لیکن پھر نثر کو ذریعہ اظہار بنایا تو شعر گوئی ترک کر دی۔ نثر کے میدان میں انہوں نے دیگر مضامین تو لکھے ہی لیکن فکر اقبال کو وسعت دینے اور دوسروں کی فیض رسانی کے پیش نظر انہوں نے مختلف عنوانات کے تحت تحقیق کی اور مقالے لکھے۔ اور گیارہ مقالات پر مبنی کتاب کو ”شعور اقبال“ کا عنوان دیا۔ اس میں چار مقالات پروفیسر منیر یزدانی کے ایم فل کے مقالات کا حصہ ہیں۔ اس کتاب کی پشت کا صفحہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اور پروفیسر محمد اکرام طاہر کی آراء کے اقتباسات سے سجا ہے۔ اندرونی صفحات پر ان حضرات کے مکمل مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین اور سید مسعود اعجاز بخاری کے مضامین بھی موجود ہیں۔

پروفیسر منیر نے اس کتاب میں صفحہ ۱۷۲ پر ”علامہ اقبال کا فلسفہ سخت کوشی“ کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک سستی، کاہلی، بزدلی اور کمزوری انسانی عظمت کے خلاف ہے۔ سستی کمزوری مرگ مفاجات کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا راز حرکت اور قوت میں پوشیدہ ہے۔ وہ پہاڑوں کی سخت زندگی کو محلات کی آرام دہ زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرونگی ترے قالیں ہیں ایرینی لبو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی  
ان ہی دنوں میں جسٹس جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ”چاک گریباں اپنا“ پڑھ رہی تھی۔ اس میں انہوں نے ایک جگہ فرمایا ہے۔۔۔

”گرمیوں میں وہ (علامہ اقبال) باہر رکھے ہوئے تخت پر ہی فجر کی نماز پڑھ لیتے۔ دھوٹی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی۔ دیواریں گرد و غبار سے اُٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوٹی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے۔ اور اگر مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سست تھے اس لئے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں دیر ہو جایا کرتی۔“  
سخ میں لکھا فقرہ منقولہ علامہ کی تعلیم اور ان کی فکر کی نفی کرتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس قسم کے اظہار پر نظر ثانی کر لی جاتی۔

سوال نمبر چار کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اپنے ادبی ذوق کی تسکین ہی کے لئے انہوں نے الائیڈ بینک آف پاکستان کی آفیسری چھوڑ کر ایم اے اردو کیا اور ۱۹۸۴ء میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ اپنے اردو ادیب ہونے پر ان کا سر آج بھی فخر سے بلند ہے۔

ان کے نقطہ نظر سے ادیبوں کی گروہ بندی سے اردو زبان و ادب کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ کچھ عرصے سے کوئی اعلیٰ اور معیاری ادبی تخلیق منظر عام پر نہیں آسکی جسے ہم عالمی ادبی شہ پاروں میں شمار کر سکیں کیوں کہ ہماری توانائیاں آپس کی چپقلش پر صرف ہو رہی ہیں۔ گروہ بندی کا نقصان یہ بھی ہوا



ہے کہ اپنے اپنے گروہ کے افراد کی غیر معیاری تحریروں کو بھی ادب عالیہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے نہ صرف اردو زبان و ادب کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے بلکہ اردو کے نقادوں کی رائے بھی غیر موثر اور مشکوک ہو کر رہ گئی ہے۔

وہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا.....

”میرے خیال میں یہ مفروضہ غلط ہے کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ کیوں کہ اردو روز بروز ترقی کر رہی ہے اور دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں اردو بولی اور سمجھی نہ جا رہی ہو۔ اردو ادب اپنے اندر اتنی توانائی رکھتا ہے کہ وہ عالمی ادب میں اپنا مقام بنا سکتا ہے۔ اردو کو مزید ترقی اور ترویج دینے کے لئے ضروری ہے کہ جدید طریقے اختیار کیے جائیں۔ خاص طور پر اسے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی زبان بنانے کے لئے کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے اس سلسلے میں نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن اس کو مزید مربوط اور تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔“

ان کا کہنا ہے.....

”اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں کیوں کہ اہل زبان نے جو رسم الخط اختیار کیا اس میں اب تک ایک وسیع اور وسیع ادب تخلیق ہو چکا ہے۔ رسم الخط تبدیل کرنے سے یہ سارا سرمایہ بے وقعت ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے علاوہ اردو رسم الخط عربی اور فارسی سے مماثلت رکھنے کی بنا پر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ ہمارے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی رابطے عربی اور فارسی کے ساتھ بہت گہرے ہیں۔“

پروفیسر منیر اردو کے جن ادیبوں سے متاثر رہے ہیں ان میں ڈپٹی نذیر احمد، سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، علامہ اقبال، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، نسیم جازری، مختار مسعود، قدرت اللہ شہاب، مشتاق یوسفی، کرنل محمد خان، عطا الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ اور مسعود اعجاز بخاری کے نام سرفہرست ہیں۔

اپنی زندگی کے اہم اور یادگار واقعات کے حوالے سے وہ کہہ رہے تھے..... ”بچپن میں پولیو کی وجہ سے ایک ٹانگ سے معذور ہونا اور بچپن میں ہی والدہ کی شفقت سے محروم رہنا ایک انتہائی یادگار واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۲ء میں الائیڈ بینک آف پاکستان میں بحیثیت آفیسر تعیناتی ہوئی لیکن علمی و ادبی ذوق کی تسکین کے لئے بینک کی ملازمت چھوڑ کر ایم اے اردو کیا اور ۱۹۸۴ء میں لکچرار اردو کی ملازمت اختیار کر لی تاکہ اپنے ادبی ذوق کو نکھار سوار سکوں۔“

Professor Muneer Ahmed Yazdani,

82, Sector B/5, Mirpur, Azad Kashmir, Pakistan

e-mail: saroosh2003@yahoo.com





بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو  
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو  
ہم سے دیوانے رہیں شہر میں، سبحان اللہ  
دشت میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو  
۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

نئی دہلی، ہندوستان

میں بھولی نہ تھی کہ کراچی اور پھر دہلی میں میری ملاقات ڈاکٹر ثار احمد فاروقی سے ہو چکی ہے۔ پھر جب میں نے انہیں ”گفتنی دوم“ کا سوال نامہ اور ”سنخورد اول“ کی ایک جلد محترم حامد امرہ ہوی کے توسط سے بھجوائی تو ڈاکٹر صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا...

”میں نے کتاب آدھی سے زیادہ پڑھ لی ہے۔ آپ نے دلچسپ انداز میں ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس کتاب کے بقیہ حصے بھی ضرور بھجوائیے گا۔ یہ تو ریفرنس میں کام آنے والی کتاب ہے۔ آپ سے ملاقات تو کئی بار ہو چکی ہے۔ پہلی بار محترم شان الحق حقی صاحب کے ساتھ کراچی میں آپ کے گھر ملا تھا۔ آپ نے یاد رکھا اس سے خوشی ہوئی۔“

میں آپ کے ہر ملامتھا۔ آپ کے یاد رکھنے میں ان کا کمال علمیت شامل ہے۔ ایک ملاقات میں دوران  
ڈاکٹر شارفاروقی کو یاد رکھنے میں ان کا کمال علمیت شامل ہے۔ ایک ملاقات میں دوران  
گفتگو جب شاعری کا ذکر چھڑا تو ایک واقعے کے حوالے سے ڈاکٹر فاروقی نے اپنا ایک قطعہ سنایا۔ اب  
وہ قطعہ ماہنامہ ”انشا“ (۱) میں پڑھ کر پرانی یاد تازہ ہو گئی کہ وہ واقعہ ایک لطیفے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

وہ قطعہ ماہنامہ اشاعتیں پرچہ کرپرائز یا گوارڈ آف ہنر کے لیے منتخب کیا گیا۔

۱۔ جناب فہم اجازت، مدیر اشاعت کا یہ اقدام قابل تحسین ہے کہ انہوں نے ستمبر/ اکتوبر ۲۰۰۲ء کا ضخیم شمارہ بطور ”ڈاکٹر ثار احمد فاروقی نمبر“ ان کی ستر سالہ سال گرو سے چند ماہ قبل شائع کیا۔ فہم اجازت اردو ادب کی شخصیات پر پہلے بھی مخصوص نمبر شائع کر چکے ہیں۔ سلطانہ مہر گلشنی ... حصہ دوم



قصہ یوں ہے... علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت کی سو سالہ تقریب کے موقعہ پر خدا بخش لاہوری، پٹنہ میں ایک سیمینار ہوا۔ ۳ / دسمبر ۱۹۸۴ء کو بعض حضرات قاضی عبدالودود کی وفات پر ان کے فرزند قاضی مسعود سے ملاقات کرنے گئے۔ ان صاحبان میں سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم (ایڈیٹر معارف، اعظم گڑھ)، ڈاکٹر عابد رضا بیدار (ڈاکٹر کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ)، جناب عطا کا کوئی مرحوم، ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر نثار فاروقی شامل تھے۔ رخصت کے وقت زینے سے اترتے ہوئے صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے ایک فقرہ کہا..... ”قاضی صاحب سپرد خاک ہوئے۔“ پھر خیال آیا کہ یہ تو مصرعہ ہو گیا تو فرمائش کی اس پر کوئی مصرعہ لگایا جائے۔ نثار فاروقی نے فی البدیہہ تین مصرعے کہے اور اسے قطعہ بنادیا جس سے سب لوگ محفوظ ہوئے۔

قاضی صاحب سپرد خاک ہوئے اہل تحقیق سینہ چاک ہوئے  
ان کے ہاتھوں غنڈگان ادب ایسے دھوئے گئے کہ پاک ہوئے  
”غنڈگان ادب“ کی تشبیہ سے میری سماعت پہلی بار متعارف ہوئی تھی لہذا میں خوب محفوظ ہوئی۔ ڈاکٹر فاروقی جب بھی ملے مجھے یہ لطیفہ نما واقعہ یاد آتا رہا۔

اب ”گفتنی حصہ دوم“ کے لئے میں نے اُن سے پوچھا کہ ادب میں گروہ بندی (بشرطیکہ وہ غندہ گروی کے ضمن میں نہ آئے) کس قدر سودمند ہے یا سراسر نقصان دہ؟  
ڈاکٹر فاروقی نے کہا: ”اس میں کوئی شک یا اختلاف نہیں ہو سکتا کہ گروہ بندی خواہ وہ سیاسی ہو، مذہبی یا علاقائی بنیادوں پر ہو یا شخصی تعصبات کا نتیجہ ہو، اس سے کسی فائدے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ برصغیر میں یہ گروہ بندی موجود ہے۔ اور بعض لوگ صرف ’چودہری‘ بنے رہنے کے شوق میں اس کو باقی رکھتے ہیں۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ میں نے انگلستان اور امریکہ میں بھی اس کو شدت سے محسوس کیا ہے حالانکہ وہاں ہمارے اہل قلم تھوڑی تعداد میں ہیں اور انہیں متحد رہنا چاہیئے۔“

اب میں کیا بتاتی انہیں کہ گروہوں میں بٹ کر جوتیوں میں دال بٹنا ہم ادیبوں اور شاعروں کا ایک دل چسپ مشغلہ ہے۔ نیویارک ہو، لاس اینجلس ہو یا شکاگو، اور اب یہ ہی میں انگلستان میں دیکھ رہی ہوں کہ ایک حرف شناس ناخواندہ کی طرح دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف ہے۔ لاس اینجلس میں اس رویے سے دیکھی ہو کر میں ایک نظم کہی تو ایک انجمن کی بانی شاعرہ مجھ سے مدتوں کبیدہ خاطر رہیں۔

۲۹ / جون ۱۹۳۶ء کو امر وہ میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اُن جید عالموں اور دانشوروں میں شمار کیئے جاتے ہیں جن کی ادبی خدمات کی ایک دنیا معترف ہے۔ ڈاکٹر شان الحق حقی نے انہیں ”علم کی کان“ کہا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ فارسی اور عربی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد پچاس سے اوپر ہے۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک انہوں نے چار سو پچاس (۴۵۰) سے زیادہ مضامین لکھے ہیں جو معیاری جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ اردو، علی گڑھ سے ۱۹۶۳ء اردو میں آنرز اور پنجاب یونیورسٹی سے



فارسی آنرز اور عربی زبان میں ایم اے میں کیا۔ فن التاریخ عند المسلمین فی العصر اول (Early Muslim Historiography) میں دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض ہوئی۔ دہلی یونیورسٹی میں اول عربی کے لکچرار اور پھر جدید عربی کے ریڈر اور بعد میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر کے جون ۲۰۰۱ء میں ریٹائر ہوئے۔

انہیں ملنے والے اعزازات کی تفصیل یہ ہے۔

۱۹۹۵ء میں یوپی اردو اکادمی سے ابوالکلام آزاد ایوارڈ

۱۹۸۹ء میں قاضی عبدالودود ایوارڈ برائے تحقیق اور تنقید

۱۹۸۵ء میں صدر جمہوریہ ہند کا اعزاز برائے اسکالرشپ (فضیلت و علمیت)

۱۹۸۷ء لاہور، پاکستان سے نقوش ایوارڈ

۱۹۸۲ء دہلی اردو اکیڈمی سے تحقیق و تنقید ایوارڈ

۱۹۸۰ء میں غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی ایوارڈ

۱۹۵۹ء سے ۱۹۹۲ء کے دوران پانچ کتابوں پر یوپی اردو اکادمی کا ایوارڈ

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران دو کتابوں پر بہار اردو اکادمی ایوارڈ

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء کے دوران تین کتابوں پر آل انڈیا میر تقی میر اکادمی، لکھنؤ کا ایوارڈ

ف س اعجاز "انشاء، کلکتہ" کے فاروقی نمبر میں لکھتے ہیں: "ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ان مفکر

ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے نام کی ذیلی کبھی نہیں بجائی۔ لیکن ان کے سینکڑوں شاگرد اور ہزاروں پرستار جانتے ہیں کہ ان کے ادب کے پٹارے میں اتنا کچھ ہے جو کسی اور کے پٹارے میں نہیں۔ علامہ نیاز فتحپوری، مدیر نگار اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے جنید عالم ان کے قدردان اور مداح تھے۔ انہوں نے ادیب، شاعر، ناقد، محقق اور مترجم کی حیثیت سے دامانِ علم و ادب کو وسعت دی ہے۔ ان کی تنقید کا اسلوب منفرد ہے۔ ان کی گرج اور جوش خطابت سے عاری سبک رد الفاظ متمن کو اصلیت سے دور نہیں جانے دیتے۔"

اسی نمبر میں پروفیسر ظفر احمد نظامی، حیات لکھنوی، وقار مانوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، پروفیسر عبدالمغنی (پٹنہ)، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر تنزیل احمد، نعیم صدیقی، اکرم فاروقی اور سرور الہدی نے ڈاکٹر فاروقی کی خدمات کے اعتراف میں نثر و نظم، دونوں میں خراجِ محبت پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کے اپنے کئی مضامین اس شمارے میں موجود ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی نے لکھا ہے تحقیق و تنقید میں فاروقی صاحب کا خاص کام میر تقی میر پر ہے۔

میں نے ادب کے اس سوداگی سے پوچھا، "ایک ملویل مدت سے آپ نے خود کو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ جنون کے اس خطرہ راہ پر چلتے رہنے سے کبھی پچھتاوا بھی ہوا؟"

کہنے لگے، "پچھتاوا تو نہیں، ہاں زندگی کے ہر دور میں کم از کم مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ ہمارے



ملک اور سماج میں علم و ادب کی کوئی وقعت نہیں ہے، نہ علمی مزاج ہے، نہ علم سے مناسبت ہے۔ اگر میں طلبہ بچانے والا ہوتا، کرکٹ کھیلتا، فلم میں کام کرتا یا زمین مافیا سے جڑا ہوتا تو معاشی حالت بھی مضبوط ہوتی اور میڈیا بھی نوٹس لیتا۔ آج ہمارے شہر کے بازار میں اگر کوئی فلم اسٹار شاپنگ کرتا ہوا مل جائے تو بھیڑ کو قابو میں رکھنا دشوار ہو جاتا ہے، اس کے برعکس آئین اسٹائمن یا برٹریڈرسل جیسے کسی دانشور کو آپ سارے شہر میں گھمائیں تو کوئی نام بتانے والا بھی نہیں ملے گا۔ اگر سماج میں دانشوری کی قدر ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں ڈاکٹر فاروقی نے کہا، ”کسی زبان کے مستقبل کے بارے میں فوری طور پر دو ٹوک فیصلہ کر دینا مشکل کام ہے۔ اردو زبان اتنی منجمدی ہوئی، شائستہ اور توانا ہے کہ اسے ختم کرنا علاقائی زبانوں کے لئے دشوار ہے۔ وہ اس کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا ہیں، اسی لئے اردو کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اردو زبان سے زیادہ اس کا رسم الخط مبغوض ہے اور اسی کو زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ اردو کا رسم الخط اُس کا لباس نہیں، اُس کی کھال ہے۔ کھال کھینچ کر کیا حلیہ بنے گا یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں اردو کو اس کے رسم الخط کے ساتھ زندہ رکھنا ہوگا۔ اس کے وسیلے سے ہمارا رشتہ فارسی اور عربی زبانوں سے بھی بننا رہے گا۔“

ڈاکٹر فاروقی کے پسندیدہ ادیب اور شاعروں میں سے چند نام یہ ہیں۔ آسکر وائلڈ (انگریزی)، امیتبھنی (عربی)، حافظ (فارسی)، عبدالرحیم خان خاناں (ہندی)، میر، غالب، اقبال (اردو شاعری)، خلیفہ عبدالکلیم، ابن انشا، مشفق خواجہ اور مشتاق احمد یوسفی (اردو نثر)۔ کچھ اور نام بھی ہیں جن کا اندراج فہرست کو طویل کر دے گا۔

اپنی زندگی کا یادگار واقعہ سناتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے کہا، ”غالبا ۱۹۶۶ء کا زمانہ تھا۔ پونا میں زبردست فساد ہوا، جس کا زیادہ اثر اُس علاقے میں تھا جہاں میرا چھوٹا بھائی بھی رہتا تھا۔ مجھے اس کی سلامتی کی بہت فکر تھی اور کوئی تدبیر ایسی نہ تھی کہ اس کی خیریت کا علم ہو سکے۔ ساری رات اپنے کمرے میں جاگتا رہا اور روتا رہا۔ تڑکے میں فجر کی اذان سے پہلے مجھے اپنی کھڑکی کے نیچے ایک آواز سنائی دی کہ کوئی مجھ کو دبوکہ رہا ہے، گھبراتا کیوں ہے جسے خدا رکھے اُسے کون چلھے!“۔ نہ اس کی صورت دیکھی نہ پھر کبھی وہ آواز سنی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا بھائی بحمد اللہ خیریت سے رہا۔“

Professor Dr. Nisar Ahmad Faruqi,

1-42(FF), Batla House, 6<sup>th</sup> Street, Jamia Nagar, New Delhi, 110025,

India

(OR) P. O. Box No. 9723, New Delhi, 110025, India





آئینے عکس سے ہوئے محروم  
یہ عنایت بھی چشمِ ترکی ہے  
کس کو معلوم دیکھ کے جھٹل میں  
کون سی شاخ کس شجر کی ہے  
نجمہ عثمان  
لندن ۱۰ مارچ ۲۰۰۰

## نجمہ عثمان

ایم، سرے، انگلینڈ

شوخی آنکھوں والی نجمہ عثمان کی ادبی زندگی میں دورِ حاضر کی معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر کا بھی اہم مقام ہے۔ یعنی آپا کی میٹھی میٹھی یادوں سے نجمہ عثمان کے دل کا ایک گوشہ آباد اور سجا سجا یا ہے۔ نجمہ سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ بڑی میٹھی گفتگو کرتی ہیں۔ گفتگو کے دوران کہنے لگیں۔ ”میری زندگی کا سب سے یادگار واقعہ قرۃ العین حیدر سے ملاقات ہے۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انٹرویو بہت کم دیتی ہیں اور بہت زیادہ ملنے ملانے سے گریز کرتی ہیں۔ حمیدہ معین رضوی کے ہاں ایک نئی نشست میں ان سے ملنا ہوا۔ یہ غالباً ۱۹۹۷ء کی بات ہے۔ وہ ہم سب کے درمیان ایک پرانی ہجولی کی طرح میٹھی تھیں اور اتنے پیار اور بے تکلفی سے گفتگو کر رہی تھیں کہ بس جی چاہتا تھا وہ لمحات ابدی ہو جائیں۔ اس عمر میں بھی ان کی یادداشت غضب کی ہے۔ انہوں نے بہت ہی پرانی باتیں اور قصے سنائے اور وہاں موجود سب خواتین سے گھل مل گئیں۔ ان کے لکھنے پڑھنے کے بارے میں دلچسپی ظاہر کی۔ پھر کھانے کی میز پر اپنے لئے بے نمک پرہیزی کھانا چھوڑ کر ہر چٹ پٹی چیز چکھی اور خوب گپ شپ کی۔ ان کے ساتھ یادگار تصویر میرے لئے قیمتی اثاثہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان سے پھر ملا جائے۔ یادگار شخصیت، یادگار لمحات صرف یعنی آپا کی شخصیت سے ہی منسوب کیے جاسکتے ہیں۔“



بے حد حساس، جذباتی اور زندگی کے نرم گرم رویوں پر کھلکھلا کر ہنسنے والی نجمہ عثمان  
۲۴ / اپریل کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔

”سنہ کونسا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

ہنس کر بولیں، ”ریٹائرمنٹ کی عمر ہے“۔ اپنی تعلیم کے بارے میں کہنے لگیں، ”گورنمنٹ کالج فار ویمن، کراچی سے بی ایس سی کے بعد کراچی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا۔ کچھ عرصہ سرسید کالج میں پڑھایا۔ پھر شادی کے بعد شوہر کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں لندن آ گئی۔ پی ایچ ڈی کرنے کی دلی تمنا تھی۔ اسی کوشش میں ایک جرمن فرم میں پانچ سال ریسرچ کی۔ لیکن دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد گھریلو ریسرچ پر توجہ دی۔ میرے بیٹے زبیر اور شیراز میں صرف تیرہ ماہ کا فرق ہے۔ چھوٹے تھے تو جڑواں لگتے تھے۔ نرسری اسکول جانے کے قابل ہوئے تو ان دنوں لندن کی ایک مشہور پینٹ ریسرچ (paint research) کمپنی میں بطور ریسرچ آفیسر تقرری ہو گئی۔ وہاں میں نے تیرہ سال کام کیا۔ کئی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ میرے ریسرچ کے کام پر جو پیپر (papers) پروڈکٹ (product) پینٹ ہوئے ان کا کریڈٹ (credit مالی منافع) کمپنی والوں کو ملا اور مجھے صرف ترقی، عزت اور نام۔ اس جانبدارانہ رویہ سے کچھ دل برداشتہ ہوئی اور کچھ یہ بھی ہوا کہ مجھے چند کیمیائی محلولوں سے الرجی (allergy) کی شکایت ہو گئی، چنانچہ اتنے برسوں کی طویل ریسرچ کے بعد میں نے اس پیشے کو خیر باد کہا اور اپنے آپ کو تعلیم و تدریس میں مشغول کر لیا۔ پچھلے گیارہ سال سے لندن کے ایک مقامی کالج میں ای ایس او ایل (ESOL) جن لوگوں کی پہلی زبان انگریزی نہیں ہے ان کے لئے انگریزی زبان کا خاص کورس) اور ایشیائی بچوں کو اردو جی سی ایس ای اور اے لیول، پڑھا رہی ہوں۔ کیمیائی دنیا سے تعلق رکھنے کے لئے کبھی کبھار پرائیویٹ ٹیوشن (private tuition) دے کر طالب علموں کو کیمسٹری مضمون پڑھا دیتی ہوں۔“

”اب سنئے کہ میں نے ادبی دنیا میں داخلے کے لئے پاسپورٹ کس طرح حاصل کیا“، وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اور گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”در اصل مجھے دس گیارہ برس کی عمر سے اردو کی کتابیں اور رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں ہم کھارادر، کراچی کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہاں سے تھوڑی دور پر لکڑی کے ایک کھوکھے میں کسی نے لائبریری بنا رکھی تھی۔ میں پابندی سے چھوٹے بھائی کے ساتھ جا کر وہاں سے ناولیں اور رسالے لاتی تھی۔ ایک دن میں نے اے آر خاتون کا ناول مانگا۔ لائبریرین نے کہا کہ اے آر خاتون کا ناول ’افشاں‘ آیا ہے لیکن کوئی لے گیا ہے۔ اپنی باجی کو بتا دینا اور کل آکر لے جانا۔ کون باجی؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ یہ کتابیں تو میں اپنے لئے لے جاتی ہوں۔ تب اُس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ گھر میں جو بھی رسالے (حور، زیب النساء، عصمت وغیرہ) آتے تھے، میں چاٹ ڈالتی تھی۔ اُس زمانے میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر گھر والوں کو سناتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے شعر و شاعری سے رغبت بھی چھوٹی عمر سے ہو گئی تھی۔ گھر کے ہر



فرد پر نظم لکھ ڈالی تھی۔ پھر کچھ ایسے اشعار موزوں ہونے لگے جو میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ چھوٹی بڑی بحر میں شعر تو اتر سے اترتے لگے۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے ابا مرحوم کو سنائے۔ وہ چونک گئے۔ میری طرف اداس لیکن تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے، 'بیٹا! ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ پڑھائی پر توجہ دو۔ شاعری کے لئے عمر پڑی ہے۔ ان کی بات میں نے پلے سے صرف اس حد تک باندھی کہ خاص خاص موقعوں پر شعر کہے۔ اسکول کالج کے زمانے میں الوداعی نظمیں یا اسکول کے عملے اور بچروں اور ان کی عادات و اطوار پر کچھ نہ کچھ لکھا ضرور۔ ویمن کالج کے سائنس سیکشن سے وابستہ میں واحد طالبہ تھی جو اردو میگزین کی ایڈیٹر رہی۔ ایکشن میں سعیدہ افضل (تین عورتیں تین کہانیاں لکھنے والی مشہور شخصیت) سے بڑا سخت مقابلہ رہا۔ شاید وہ یہ سطور پڑھیں اور میں انہیں یاد آ جاؤں۔ میگزین کے شعری حصے کی انچارج وحیدہ نسیم مرحوم تھیں جو ہمیں بوٹنی (botany نباتیات) پڑھاتی تھیں۔ ان سے غزلوں پر ایڈیٹنگ (editing) کے دوران بڑی دل چسپ گفتگو رہتی تھی۔ لیکن سلطانہ! لندن آنے کے بعد زندگی اچانک ہی بہت مصروف ہو گئی۔ میری ادبی سرگرمیاں صرف شعری نشستوں تک محدود رہیں۔ شعر تو چلتے پھرتے موزوں ہو جاتے ہیں سو ہوتے رہے۔ دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، 'شاخِ حنا' ۱۹۸۹ء میں اور 'کڑے موسموں کی زد پر' ۱۹۹۹ء میں۔ دوسرے مجموعے میں 'شاخِ حنا' کا زیادہ تر کلام شامل ہے۔

”اپنے چند شعر سناؤ۔“ میری خواہش پر نجمہ گنگنانے لگیں۔

|                             |                             |
|-----------------------------|-----------------------------|
| دکھ کے لمحے گزار آئی ہوں    | قرض سارے اُتار آئی ہوں      |
| ننھے ہاتھوں نے تھامنا سیکھا | ماں کی آنکھوں میں آگئے آنسو |
| زندگی کے مکان میں اک طاق    | طاق پر یاد میرے بچپن کی     |
| جانتی ہوں جدھر سے گزروں گی  | موسموں کو ادھر ہی آتا ہے    |

نجمہ کے لہجے میں، اس کی فکر میں اعتماد کا ایک حسن رچا بسا تھا۔ میں نے پوچھا، ”نجمہ! آپ نے نثر بھی تو لکھی ہے۔ آپ کے افسانے میں نے پڑھے ہیں۔“

”جی ہاں میری نثری تخلیقات ایک طویل عرصے تک ذہن کے نہاں خانوں میں اور ادھر ادھر کاغذ کے پرزوں پر بکھری رہیں۔ ۱۹۹۰ء کے بعد مجھے خیال آیا، زندگی کے اتنے موضوعات ہیں، سچائیاں ہیں کڑوی کیسلی اور میٹھی بھی جنہیں میں غزل، نظم میں کہنے کے باوجود تشنگی محسوس کرتی ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے گرد بکھری ہوئی کہانیوں کو اکٹھا کیا۔ نئے موضوعات مستقل پیچھا کر رہے تھے اور کر رہے ہیں۔ دیار غیر ہو یا اپنی سرزمین، ہر طرف زندگی کی تلخ و شیریں سچائیاں بکھری ہوئی ہیں، اُن گنت واقعے، خوش گوار حادثے، پھٹری ہوئی شخصیات۔ ذہن کے جس گوشے میں جھانک کر دیکھو کوئی نہ کوئی سرگوشیاں کرتا دکھائی دیتا ہے، کہاتا ہے ہمیں لکھو، ہمارے بارے میں لکھو۔ تصویریں حرف کی شکل میں ڈھلنے کو تیار تھیں، بے قرار تھیں۔ میری لکھی کہانیاں، اوراق، تخلیق، سیپ اور شاعر میں چھپتی رہی ہیں۔“



مقصود الہی شیخ کی ادارت میں ہفت روزہ 'راوی' میں 'میں دل میں کیوں رکھوں' کے عنوان سے کالم بھی لکھے۔ افسانوں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے اور عنوان ابھی زیر غور ہے۔

پھر اگلا سوال سُن کر ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔ "مالی خسارے کی بھی خوب رہی۔ قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ ہر لکھنے والا مالی طور پر قلاش ہوتا ہے اور کم از کم اپنے ادبی شہ پاروں کے ذریعے رزق حلال کمانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ شہرت اور وہ بھی بن مانگے مل جاتی ہے۔ خاص طور پر خواتین لکھنے والیوں کے لئے یہ بن مانگی شہرت 'بدنامی' میں شمار ہونے لگتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی یہ بڑی بد نصیبی ہے کہ عورت کو گھر کے اندر باہر بھی کسی قسم کے رول (role) کردار میں بغیر نکتہ چینی کے قبول نہیں کرتے۔ عورت ڈوئی کی جگہ قلم اٹھالے تو اس زندگی کے باروچی خانے میں بغیر اجازت گھس کر اس کے سلیقے سے الگ الگ رکھے ہوئے مرج مسالوں میں وہ گڑ بڑ پھیلاتے ہیں کہ اس غریب کی پکائی ہوئی ہر ہانڈی میں سے شکوک و شبہات کی بو اڑاؤ کر گھر والوں کے ذائقے کو کڑوا کیلا بنا دیتا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اردو ادب کو اپنا کر صرف ادبی شہرت ملتی۔"

ادیبوں کی گروہ بندی کے متعلق نجمہ نے کہا۔ "اس گروہ بندی نے اردو ادب کو صرف اور صرف نقصان پہنچایا ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو نیچا دکھانے کے لئے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ پاکستان سے برطانیہ اور امریکہ تک ایک ہی صورت حال ہے۔ حوالے تو اتنے ہیں کہ لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب مکمل ہو جائے لیکن میں کسی ایک گروپ کی طرف اشارہ کر کے اُن جیسا بننا بھی نہیں چاہتی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں یہ صورت حال تشویش ناک حد تک بڑھ گئی اور بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہر لکھنے والا اپنے گروہ میں 'پھنے خان' ہے اور گروہ سے باہر کچھ بھی نہیں۔ صحت مند ادبی فضا کو سنجیدہ ادیب، قاری اور سامعین سب ہی ترستے ہیں۔ میں نے ہفت روزہ 'راوی'، بریڈ فورڈ کے لئے کالم لکھے اور 'دل میں نہ رکھنے' کی پاداش میں بہت کچھ سنا اور بہت کچھ سہا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ عالمی ریکارڈ توڑنے کے لئے ہی تمام لکھنے والی خواتین ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور فراخ دلی سے ایک دوسرے کے لکھے ہوئے شہ پاروں پر صحت مند تبصرہ کریں، مفید رائے دیں اور اسی خوش دلی سے انہیں قبول کریں۔ گم نام خط بازی اور ایک دوسرے پر کچھڑا اچھالنے سے صرف ادبی غنڈہ گردی، کوفروغ ملے گا اور اردو ادب کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

اردو کی بقا کے حوالے سے نجمہ کہہ رہی تھیں۔ "ایک تجویز یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آئندہ ہر لکھنے والا، نئی نسل کی ضروریات اور حدود کو سامنے رکھ کر کچھ نہ کچھ لکھے اور اُسے کسی نہ کسی طرح اُن تک پہنچائے۔ جیسا میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یورپ امریکہ میں جو اردو کی بقا کے لئے ہو رہا ہے اس کی درخشاں مثال آپ خود ہیں، آپ نے آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل دستاویز 'سخنور' اور 'گفتنی' کے نام سے مرتب کی ہے۔ یہ دستاویزی کام نہ صرف اردو ادب کے حوالے سے ہر اُس نام کو یادگار شناخت دے گا جو ان کتابوں میں موجود ہیں بلکہ نئی نسل کو اپنی گزری ہوئی نسل کو ڈھونڈنے، کھوجنے اور اپنے ادبی



ورثہ کو پہنچانے میں بھی مدد دے گا۔“

اردو رسم الخط بدلنے کے بارے میں نجمہ نے کہا: ”اس کے حامی وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اردو زبان کی شناخت کو ختم کرنے کے درپے ہوں۔ یہ جو ہم نے کئی سو سالوں سے ادبی ورثہ جمع کر رکھا ہے یہ سب بے کاد ہو جائے گا۔ پچھلے دنوں اردو اکیڈمی، لندن کے تعاون سے ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ عنوان تھا ’اردو اور رومن رسم الخط‘۔ اس میں حصہ لینے والے مقررین نے اپنے طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر نئی نسل کے لئے آسانیاں پیدا کرنی ہیں اور اگر آنے والی نسل اردو زبان کو کسی اور رسم الخط میں پڑھ سکتی ہے تو کیوں نہ ہم رومن رسم الخط کے ذریعہ اپنی زبان کو نئی نسل تک پہنچائیں اور محفوظ کر لیں۔ کسی بھی چیز کی ساخت یا شکل بگاڑ دیں تو وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہے۔ اس میں معمولی رد و بدل کر کے اسے پھر سے جوڑ دیں وہ شاید پھر بھی پہچان لی جائے لیکن اگر نئی شکل میں ڈھال کر اسے پرانے نام سے وابستہ کریں گے تو صرف نام ہی رہ جائے گا، خصوصیات بالکل مختلف ہوں گی۔ نئی نسل کی آسانیاں کے لئے تو رومن رسم الخط والی بات حلق سے اترتی ہے مگر یہ کہنا کہ ہم یہ طریقہ اپنا کر اپنا جمع شدہ اردو ادب کا اثاثہ محفوظ کر لیں گے قطعی خوش فہمی اور اردو زبان سے دشمنی ہے۔ مقصود الہی شیخ نے بڑی اچھی بات کہی ہے، اردو سے محرومی کا احساس دوسری نسل کے ساتھ پیدا ہوا یعنی اس نسل میں ادبی ذوق نہیں ہوگا۔ پھر یہ بھی فرمایا، اردو پر پیہری وقت آیا ہے اور سب اقدامات جائز ہیں۔ ان کی اسی بے بسی کو میں شناخت کھو جانے کے خوف سے تعبیر کرتی ہوں۔ اور اس سوچ سے میں متفق بھی نہیں کیوں کہ غزل، نظم، مکالمے، تشبیہات، محاورے، افسانے یا کہانی کے جوڑ توڑ، اتار چڑھاؤ کو ایک اجنبی زبان کے حروف کے شکنجے میں جڑ کر ادا کرنا، نہ صرف ظلم ہے بلکہ سراسر اردو زبان سے بددیانتی ہے۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو رومن رسم الخط میں لکھ کر پڑھنے کی کوشش کریں۔ منہ کا ذائقہ ہی بدل جائے گا۔ اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اپنی شکل میں یہ تروتازہ رہے گی۔“

نجمہ نے اردو ادب کو کئی خوب صورت افسانے دیئے ہیں۔ ان میں ”سیٹا کا بن باس“، ”مجو میاں“، ”کلاسی فی کیشن“ وغیرہ نقادوں سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اگاتھا کرسٹی، ایملی برائٹ، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ، غلام عباس، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی اور عصمت چغتائی وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے: ”عم عصر ادیبوں میں سب ہی اچھا لکھ رہے ہیں۔ کسی نہ کسی کی کوئی تحریر ایسی ہوتی ہے جو ذہن و دل پر نقش کر جاتی ہے۔ خواتین لکھنے والیوں میں صفیہ صدیقی، شاہدہ احمد، حمیدہ معین رضوی، فردوس حیدر، زاہدہ حنا اور نعیمہ ضیا الدین کے کچھ افسانے مجھے بہت اچھے لگے اور میں نے انہیں کئی بار پڑھا ہے۔ آپ کے افسانے اور کالم میں ۱۹۶۹ء تک، یعنی جب تک میں پاکستان میں تھی، باقاعدگی سے پڑھتی رہی تھی۔ پھر رپا ٹوٹ گیا۔ لیکن جو بھی پڑھا دل کو لگا۔“

Mrs. Najma Usman,

57 Rosendale Road, Epsom, Surrey, KT17 2JH UK



زندہ سچی مجھ میں آج بھی اک سنت آدمی  
میں آج بھی کبیر کے دوستوں کے ساتھ ہوں  
نذیر فتح پوری



## نذیر فتح پوری

پونے، ہندوستان

بس اتفاق ہے کہ میری ان سے ملاقات پونے میں ہوئی۔ میں مالیگاؤں کے ادب دوست جناب سیٹھ جلال کے ساتھ ۱۹۹۹ء میں پونے گئی تھی۔ خواہش تھی کہ دیوالی جا کر والد صاحب مرحوم کے مزار پر فاتحہ خوانی کروں۔ میں چودہ سال کی تھی کہ والد صاحب راہی عدم ہو گئے۔ مگر وہاں نہ جا سکی۔

پونے جا کر معلوم ہوا کہ نذیر احمد خان جوڈ جوڈ نذیر فتح پوری کے نام سے مشہور ہیں اپنا سہ ماہی جریدہ ”اسباق“ پچھلے بائیس (۲۲) سال سے شائع کر رہے ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ اور اس سے بڑھ کر شاعروں اور ادیبوں کے قدردان ہیں۔ اپنا کلام چھپوانے میں اتنی پھرتی نہیں دکھاتے جتنے شعرا اور ادبا کے نمبر اور گوشے شائع کرنے میں اپنا ہنر صرف کرتے ہیں۔ اب تک ”اسباق“ کے کئی خصوصی نمبر شائع کر چکے ہیں جن میں ”جگن ناتھ آزاد“ ایک مستقل ادارہ ۱۹۹۸ء میں، ”جہان گیتا رضا“ ۱۹۹۹ء میں، ”کوثر صدیقی“ فن اور شخصیت ۲۰۰۰ء میں، علامہ کالی داس گیتا رضا نمبر ۲۰۰۲ء میں، ”غالب، گیتا اور سنجے“ ۲۰۰۰ء میں، ”دلدار ہاشمی“ فن اور شخصیت ۲۰۰۰ء میں، ”حیدر قریشی“ فن اور شخصیت ۲۰۰۲ء میں، ”تحریک و تذکرہ فتح پور شیخاواہی“ ۲۰۰۳ء میں اور ”قاسمی مشتاق احمد“ فن اور شخصیت کا بھی اس میں اضافہ کر لیں ہے۔



انہوں نے دو ناول بھی لکھے ہیں (۱) کتھاؤں کے بیچ اور (۲) زخم اور آہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ”لفظوں کے سائے تلے“، نعتیہ کلام کا مجموعہ ”اکرم“، پانچ شعری مجموعے (۱) غزل اور غزل (۲) تیسرا سفر (۳) یہ زمین میری ہے (۴) سفر تا سفر اور (۵) لمحوں کا سفر، ماہیوں کے دو مجموعے (۱) ریگ رواں اور (۲) مٹھی بھر مائیں کے علاوہ بچوں کی نظموں کا مجموعہ علیحدہ ہے۔

راجستھان اسٹیٹ اسکولوں کی چوتھی اور چھٹی جماعتوں کے نصاب میں ان کی منتخب نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ ان کا حمد و ثنا کا مجموعہ ”ثنائے جلیل“ بھی طباعت کا منتظر ہے۔ اور طنز و مزاح سے متعلق مضامین کی ایک کتاب ”غالب اور ہم“ کا مسودہ تیار ہے۔ ”یہ زمین میری ہے“ ہندی لپی میں بھی شائع ہوئی ہے۔ شبیر فراز فتح پوری نے ان کے کلام کا مجموعہ بعنوان ”نذیر فتح پوری کی ہنگامی شاعری“ مرتب کیا ہے۔

ان کے علاوہ بھی ان کے پاس ان کی اپنی اتنی تحریریں ہیں کہ وہ کتابی صورت میں ان کے قد کے برابر بلکہ ان سے کچھ اوپر نکلیں گی۔

وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے.....

”میری زندگی خود ایک ادبی واقعہ سے کم نہیں۔ آپ نے پوچھا ہے کہ میری زندگی کا کوئی یادگار واقعہ تو آپ اسے حیرت انگیز واقعہ بھی کہہ سکتی ہیں۔ میں نے اب تک چالیس (۴۰) سے زائد مسودے لکھے ہیں جن میں بائیس (۲۲) کی اشاعت ہوئی ہے۔ باقی غیر مطبوعہ ہیں۔ تبصرے ہیں، تجزیے ہیں، خاکے ہیں، طنزیہ اور مزاحیہ کالم ہیں، اسباق کے ادارے ہیں، اخباری تحریریں ہیں، تہنیتی، توصیفی اور تعارفی نظمیں ہیں، مثنویاں ہیں، ڈرامے ہیں، فلمی مکالمے ہیں، فلمی گیت ہیں، قوالیاں ہیں..... خدا جانے کیا کیا ہیں کوئی گنتی نہیں، شمار نہیں اور پچھلے پچیس (۲۵) سال میں کتنے خطوط لکھے ہیں، کتنے سوالوں کے جواب لکھے ہیں، کتنے اعتراضات کے جوابات لکھے ہیں..... سارا منظر نامہ طلسماتی لگتا ہے حاتم طائی کے قصے کی طرح۔ ایک قصے کے بطن سے دوسرا قصہ، ایک کہانی کی پرت سے دوسری کہانی جھانکتی ہوئی۔ یہ سب کچھ میرے لئے یادگار ہی تو ہے۔“

نذیر فتح پوری نے ادب کے دشت کی سیاحت میں ایک عمر گزار دی ہے۔ وہ یکم دسمبر ۱۹۴۲ء کو فتح پور شیخاوائی ضلع سیکر، راجستھان کے ایک مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نو عمری ہی سے ادب کی چھاؤں ڈھونڈی۔ نذیر کہتے ہیں.....

”ادب کے میدان میں جتنی مشقت میں نے کی، گو اس سے مجھے زر و دولت تو نہ ملی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سے شہرت، عزت اور وقار ملا۔ بائیس (۲۲) سال سے اسباق شائع کر رہا ہوں اور مالی نقصان اٹھا رہا ہوں مگر اب اس کی عادت سی پڑ گئی ہے۔“

”نقصان تو میں نے تعلیم کے حصول میں بھی اٹھایا“، انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا..... ”میرے حصول تعلیم کی داستان بھی دل چسپ ہے۔ صرف تین سال پابندی کے ساتھ اسلامیہ اسکول عید گاہ میں حاضری دی۔ میری ذہانت کو دیکھتے ہوئے براہ راست مجھے تیسری جماعت



میں داخلہ ملا۔ درجہ پنجم کے بعد آگے تعلیم جاری رکھنے کے لئے راج اسکول میں داخلہ لینا پڑتا تھا۔ داخلے کی فیس صرف سات روپے تھی لیکن یہ رقم بھی ادا نہ کی جاسکتی۔ لہذا اسکول میں داخلہ نہیں ملا۔ مجبوراً بچہ مزدوری میں لگ گیا۔ پہلے دن کی مزدوری دس آنے کی صورت میں جب والدہ کی ہتھیلی پر رکھی تو خوشی کے مارے ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ گھر کے حالات بہت کمزور تھے۔ کام کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ گاؤں میں رہ کر دو سال بوجھ ڈھویا۔ اس کے بعد والد صاحب کے پاس پونے آ گیا۔ یہاں راج مستری کے کام میں لگ گیا۔ برسوں ہاتھ سے کام کیا۔ پونے کے شاندار دکن کالج میں نئی عمارت زیر تعمیر تھی۔ ابتدا اس عمارت سے ہوئی۔ پھر ۱۹۶۴ء میں میری شاعری کی ابتدا ہوئی۔ شادی ہوئی، دس بچے جن میں سات بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ پھر کام ٹھیکے پر لینے لگا۔ جھونپڑے سے فلیٹ میں آیا۔ فلیٹ سے اب اللہ نے بنگلہ عطا کر دیا۔ لیکن بینک بیلنس کبھی قابل فخر نہیں رہا۔ چھ بیٹیوں اور ایک بیٹے کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

انہیں مطالعے کا بے حد شوق ہے۔ کہنے لگے.....

”میں تحقیق و تنقید سے متعلق مضامین دل چسپی سے پڑھتا ہوں ابتدا میں ابن صفی اور اکرم الہ آبادی کو بہت پڑھا۔ جاسوسی ادب کے مطالعے کی دیوانگی تھی۔ اور ہاں سب سے بڑی کتاب قرآن کریم کا مطالعہ کرتا ہوں۔ حرف و صوف کے سارے جہر نے اسی کتاب سے بہتے ہیں۔ مشفق خواجہ کا طنز و مزاح بھی پڑھتا ہوں۔ ان کی تقلید میں طنز و مزاح لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے کہنے کو میں نے ایک ہزار غزلیں کہی ہیں لیکن دیگر اصناف میں نظم، آزاد نظم، نثری نظم، مختصر نظم، گیت، دوہا، ماہیہ، کہہ مکرنی، سہ سطر، نظم، قطعہ اور ٹکونی بھی لکھی ہیں۔ اور یہ سب نہایت سنجیدگی سے لکھا ہے۔ آزاد غزلیں بھی کہی ہیں۔ آزاد غزل پر پہلی آزاد تضمین میں نے کی تھی۔ ادب، تخلیق ادب اور ترسیل ادب کو میں نے بڑی سنجیدگی سے لیا ہے۔ نثری غزل کوئی چیز نہیں پر نثری نظم میں بڑی قوت ہے۔ لیکن ایک شعر میں ایک داستان بیان کرنے کی طاقت صرف غزل ہی میں ہے۔

ہو ا میں کھا کے زندہ ہو گیا ہے ہمارا دل پرندہ ہو گیا ہے

اور اگرچہ مشاعرے خالص تجارت بن چکے ہیں پھر بھی مشاعروں کی وجہ سے شاعری کا شوق عوام میں موجود ہے۔ مشاعرے کے توسط سے شعر جہاں تک پہنچتا ہے اردو وہاں تک رسائی کرتی ہے۔ تخلیقی نشستیں اب گھروں میں ہونے لگی ہیں، یہ دانشور سے دانشور کا مکالمہ جیسی بات ہے۔ یہ بھی ادب کی تخلیق اور فروغ کے لئے مفید ہے۔

دوسری اہم بات ہے کہ کتابیں پہلے سے زیادہ شائع ہونے لگی ہیں۔ پوری اردو دنیا میں کتابوں کی چھپائی کا بازار گرم ہے۔ خوب صورت، دیدہ زیب، مجلد، بچی سجائی دہنوں کی طرح کتابیں دیکھ کر کون یہ کہنے کی ہمت کرے گا کہ اردو مر رہی ہے۔ میرے پاس ہر ماہ کم از کم بیس (۲۰) کتابیں آتی ہیں جن میں دو ایک افسانے، دو ایک تنقید و تحقیق سے متعلق ہوتی ہیں۔ باقی شعری مجموعے ہوتے ہیں۔ ناول تو کبھی بکھار



دکھائی دیتا ہے۔ میں شعری مجموعوں کا مخالف نہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے ہم سب ایک استاد کے شاگرد ہوں۔ نظریہ اقبال اور مظفر حسنی جیسے لہجے ہم کثرت سے نہیں بنایا رہے ہیں۔ فیض کے بعد نظم کی دل کشی کم ہو گئی ہے۔ صلاح الدین پرویز کی نظموں کا الگ انداز ہے لیکن اس کی طویل نظموں سے کبھی کبھی کتابت ہوتی ہے۔

ایلیکٹرونک میڈیا کے باوجود پرنٹ میڈیا کو میں پہلا نمبر دوں گا۔ جہاں تک رسائل کی بقا کا سوال ہے، کروڑوں اردو والے اگر سالانہ خریداری پابندی سے ادا کر دیں تو رسائل آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ میں اپنا تجربہ بیان کرتا ہوں۔ اگر ایک ہزار خریداروں کا سالانہ زر تعاون پابندی سے بروقت ملتا رہے تو میں آسانی سے 'اسباق' چلا سکتا ہوں۔ لیکن ایسا ہوتا کہاں ہے۔ ایک شمارے سے دوسرے شمارے تک چار چھ خریداروں کی رقم ہاتھ لگتی ہے جو صرف ڈاک خرچ میں لگ جاتی ہے۔

نذیر فتح پوری بھی ادبی گروہ بندیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ کہنے لگے.....  
 ”میں نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ بہت سے حوالے ہیں۔ علاقائی عصبيت کا شکار بھی ہوا ہوں۔ میں اپنی ادبی سوانح لکھ رہا ہوں 'بیٹے کل کا ایک ایک پل'۔ اس میں تمام باتیں کھل کر لکھوں گا۔ کسی کا خوف نہیں۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے دوبار میری کتابوں پر انعامات دینا طے کیا لیکن ہر بار وہ مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ اور میں نے سفارش ان تک نہ پہنچانے کی قسم کھا رکھی ہے۔“  
 انہوں نے کہا.....

”ہندوپاک میں اردو کا مستقبل مجھے تو کہیں بھی اندھیروں میں ڈوبا دکھائی نہیں دیا۔ اردو اتنی سخت جان ہے کہ آسانی سے مرنے والی نہیں۔ یہ اپنے اندر زندہ رہنے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے۔ دوسری طرف اردو کے قلم کار خود زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے تخلیقی طور پر ہی سہی وہ اردو کو بھی زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے اور اردو زندہ رہے گی۔ یہاں مہاراشٹر میں اردو کثرت سے اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم کا تناسب کم ہے۔ اسے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ تمام کام شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے۔ وہ اپنا کام کر رہے ہیں۔ آپ تصور کریں اگر ہم اور آپ نے شعر کہنا بند کر دیا یا کتب کی اشاعت روک دی تو اردو کتنی اور کہاں رہ جائے گی۔ اردو کے جلوے شعر و ادب کی بدولت ہی نظر آتے ہیں۔ رسائل کے مدیران نے اگر منصوبہ بند طریقے سے بیک وقت تمام رسائل بند کر دیئے تو اردو کا کیا حال ہوگا۔ یہ تصویر کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر اردو ہم سے چھین گئی تو ہم کہاں نظر آئیں گے۔ ہم سبھوں کی شناخت اردو سے ہے، ہماری انفرادیت اردو سے ہے، ہمارا وجود اردو سے ہے۔ عرصہ ہوا بھرے جلسے میں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ منوہر جوشی کے سامنے آنجھانی کالی داس گپتا رضانا نے اقرار کیا تھا.....

’اردو مجھ سے نہیں ہے میں اردو سے ہوں‘۔ اس لئے رضا صاحب آخری سانس تک اردو کے لئے جیتے رہے۔ آپ کا اور ہمارا تعلق اردو ہی کی وجہ سے ہے۔ اب رہی رسم الخط کی بات۔ کسی بھی



زبان کا رسم الخط تبدیل کر دینا اس زبان کو زندہ درگور کرنے کے مترادف ہے۔ میں رسم الخط کی تبدیلی کی سختی سے مخالفت کرتا ہوں۔ اس میں دلیلیں دی جاسکتی ہیں۔ اردو میں 'جلیل' اور 'ذلیل' دو لفظ ہیں۔ املا اور تلفظ کے لحاظ سے دونوں الگ ہیں اور معنی کے اعتبار سے تو بہت ہی الگ۔ اب آپ ہندی رسم الخط میں دونوں کا فرق کیسے بتائیں گے؟

اگلے سوال کے جواب میں نذیر فتح پوری نے کہا۔

”یورپی زبانوں سے تو میں ناواقف ہوں۔ اردو میں ہر صحت مند تحریر کو میں پسند کرتا ہوں۔ میر تقی میر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ غالب کو پڑھتے وقت اپنی علمی مائیگی کے سبب الجھن کا شکار ہو جاتا ہوں۔ اقبال کو پڑھتے ہوئے بہت سی اٹھل پٹھل اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ ابن صفی کی نثر سے میں نے لکھنا سیکھا ہے۔ آج بھی برسوں میں ایک جاسوسی ناول ضرور پڑھتا لیتا ہوں۔ کرشن چندر کو بھی کثرت سے پڑھا ہے۔ لکھنے کے بعد جب نظر ثانی کرتا ہوں تو میری اپنی نثر بھی مجھے پسند آتی ہے۔ میرے استاد مکرمی عتیق احمد عتیق، مدیر سہ ماہی 'توازن' مالیکاؤں، کے خطوط پڑھ کر دل عیش عیش کرا اٹھتا ہے۔ دس صفحے کا مضمون ایک پوسٹ کارڈ میں لکھنے کا ہنر ان کے سوا کسی کو نہیں آتا۔“

اب نذیر فتح پوری کے دو ماہے ملاحظہ ہوں جن سے نہ صرف ان کی شاعری کی خوش سلیقہ شعاری نمایاں ہے بلکہ یہ بھی کہ جب فن پر مکمل دسترس ہو تو خوب صورت مضمون تین مصرعوں میں کس طرح خوب صورتی سے باندھتے ہیں۔

سایہ بھی دے گا // اس کی حفاظت کر // یہ پیر ہے رشتوں کا

اور

امکان کو روشن رکھ // گھوڑا ندھیروں میں // ایمان کو روشن رکھ

۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۳ء تک نذیر فتح پوری نے کئی انعامات حاصل کیئے ہیں۔ ان میں راجستھان اردو اکیڈمی ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، چراغ غزل ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکیڈمی ایوارڈ، خواجہ احمد عباس ایوارڈ، غالب ایوارڈ جیسے قابل ذکر نام بھی شامل ہیں جو ادبی خدمات کی قدر شناسی پر ان کو دیئے گئے ہیں۔ صحافتی اور سماجی خدمات کے سلسلے میں انعامات و اسناد ان کے علاوہ ہیں۔

Mr. Nazir Fatehpuri,

Editor Asbaque, Saira Manzil, 230/B/102 Vimandarshan, Lohgaon Road, Pune, 411032 M S., India





شعلہ فشان نہ کیوں مرا لہجہ ہو اے دل  
دینا نے ہر قدم پر شرارت دیئے مجھے

نور عظیم  
۱۴۔۳۔۵۱

## ڈاکٹر نگار عظیم

دہلی، ہندوستان

اداجعفری سے لے کر نگار عظیم تک خواتین کے ساتھ کم و بیش یہ ہی حالات رہے ہیں کہ ان کے لکھنے پر باپندی رہی۔ شعر و سخن کی باتیں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ حالانکہ اداجعفری بیسویں صدی کی تیسری دہائی (۱۹۲۶ء) میں پیدا ہوئی تھیں اور نگار چھٹی دہائی کی پیداوار ہیں مگر تیس (۳۰) برسوں میں بھی خاندانی روایات کی تبدیلی میں ست رفتاری ہی گامزن رہی۔ پھر تو لڑکیاں یا تو اپنے باپ کے نام سے پہچانی جاتی تھیں (اور آج بھی ہیں) یا شوہر کے نام یا اس کی عرفیت کا لالچہ لگا کر جانی جاتی تھیں (اور آج بھی جانی جاتی ہیں)۔

جی ہاں، ۱۹۵۱ء میں میرٹھ، ہندوستان میں پیدا ہونے والی لڑکی کا نام والدین نے ملکہ مہر نگار رکھا جو بعد میں مہر نگار اور پھر عبد العظیم صدیقی کی شریک حیات بننے پر نگار عظیم کہلاتی ہیں۔ مہر نگار کو تعلیم کا بے حد شوق تھا چنانچہ فائن آرٹس میں ایم اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اردو میں ایم اے کی ڈگری لی اور پھر ان کے تحقیقی مقالے ”منشوی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ“ پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے انہیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض ہوئی۔ علمی و ادبی ذوق انہیں ورثے میں ملا۔ والد محترم ثروت حسین ثروت نہ صرف ایک کامیاب معلم تھے بلکہ ایک مشہور شاعر اور ماہر عروض



بھی تھے۔ نگار نے باپ سے شعر و سخن اور سچائی و خود داری کا ہم پایا تو ماں سے ایثار و محبت کا درس لیا۔ ۱۹۷۱ء میں دہلی کے ایک معزز گھر آنے کے فرد عبدالعظیم صدیقی کی خاتون اول بنیں۔ عظیم صاحب کا تعلق سائنس اور ٹیکنیکل ادب سے ہے۔ وہ کمرشیل آرٹسٹ بھی ہیں اور طنز و مزاح ان کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ نگار کے مزاج میں لچک بہت ہے۔ وہ شخصیات کا مطالعہ کرتی ہیں اور پھر ان کے ساتھ رہنے بسنے کی اپنی صلاحیت کو پیش کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ بہت اچھی استاد بھی ہیں۔ اور ۱۹۸۲ء سے درس و تدریس کے پیشے سے جڑی ہوئی ہیں۔ تخلیقی کاموں کے ساتھ پانچ بیٹیوں کی نگہ بانی اور گھر کی ذمہ داریوں کو حسن و خوبی سے نبھا رہی ہیں۔ فوٹو گرافی اور باغبانی ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

ادبی زندگی کا آغاز اسکول کے زمانے سے ہو گیا تھا لیکن ۱۹۷۱ء میں دہلی کے جریدے ”شان ہند“ میں ان کی پہلی کہانی ”عقیدت کے آنسو“ کی اشاعت سے ان میں لکھنے کا حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوا۔ نگار نے بتایا: ”شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواتین کا شعر و سخن سے شغف اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لہذا میرے یہاں بھی جواں عمری میں پیدا ہونے والے شعر کو کسی ناجائز بچے کی طرح دفن کر دیا گیا کہ یہ ذوق سخن لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا۔ اب باقاعدہ نظم اور غزل کہتی ہوں لیکن شعری مجموعہ کوئی شائع نہیں ہوا۔ ہاں ”نکس“ کے نام سے ۱۹۹۰ء میں پہلا اور ۱۹۹۹ء میں ”گہن“ کے نام سے دوسرا افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔“

نگار ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں یہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

|                                     |                                       |
|-------------------------------------|---------------------------------------|
| محرومی نظر نے دلا سے دیئے بہت       | یوں ہم نے آنندھیوں میں جلائے دیئے بہت |
| فصل بہار پر میں بھروسہ کروں تو کیوں | مجھ کو اسی بہار نے کانٹے دیئے بہت     |
| دیدہ وری پہ اپنی بہت تھا گماں تمہیں | دیدہ وری نے ہی تمہیں دھوکے دیئے بہت   |
| وہ سلسلے وفاؤں کے سب رائگاں گئے     | اس نے مجھے بساط کے طعنے دیئے بہت      |
| غم مستقل مزاج تھا اس سے نہ مس ہوا   | میں نے اسے فرار کے رستے دیئے بہت      |
| اللہ میری سادگی خود میں نے ہی اسے   | غیروں سے رسم و راہ کے موقعے دیئے بہت  |

نگار کہتی ہیں: ”میں اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ ادیبوں کی گروہ بندی نہ صرف قلم

کار کو بلکہ اردو زبان و ادب کو بھی کھن کی طرح چاٹ رہی ہے۔ یہ اردو ادب کا زبردست نقصان ہے۔

حوالے لکھی ہیں لیکن میں نام گنوانے سے صرف نظر کروں گی کیوں کہ میں اس عتاب کا پہلے ہی شکار ہوں۔“

نگار کا مشورہ ہے کہ ہندو پاک میں اردو کے تابناک مستقبل کے لئے دونوں ملکوں کے

ادیبوں کا کسی پلیٹ فارم پر جمع ہوتے رہنا بہت ضروری ہے۔ اس سے ضرور مثبت اور ٹھوس نتائج برآمد

ہوں گے۔ وہ رسم الخط بدلنے کی بھی حامی نہیں ہیں۔ ان کی رائے میں اردو کا موجودہ رسم الخط سب سے

زیادہ ترقی یافتہ اور مکمل رسم الخط ہے۔ اس سے زیادہ بہتر تلفظ، اس سے زیادہ مختصر، اس سے زیادہ سہل اور

صحت مندر رسم الخط کوئی دوسرا ہو، ناممکن ہے۔ حروف تہجی کے چھوٹے چھوٹے حصوں کے ذریعہ اردو میں



جس طرح بڑے الفاظ مکمل کر لیے جاتے ہیں کسی اور رسم الخط میں ممکن نہیں۔

نگار گوارہ میں سعادت حسن منٹو پسند ہیں۔ دیگر زبانوں میں چیخوف، دویاساں اور میکسم گورکی سے متاثر ہیں۔

ازبکی قلم کاروں سے ایک یادگاری ملاقات ان کی زندگی کا اہم واقعہ ہے جن میں محترم عبداللہ عاریفوف اہم شخصیت ہیں۔ نگار بتا رہی تھیں یہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۶ء کی بات ہے کہ برقی چار باغ، تاشقند میں ایک بہت دل نواز واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ عظیم صاحب اور میں پروفیسر قمر رئیس کے ہمراہ ممبر پارلیمنٹ اور یونین آف ازبیک رائٹرز کے صدر محترم عبداللہ عاریفوف کی دعوت پر ایک ادبی نشست اور لنچ پر مدعو تھے۔ تقریباً پندرہ ازبکی قلم کار اور اسٹاف کی معزز خواتین و حضرات اس موقع پر موجود تھے۔ بہت پرجوش طریقے سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ عظیم صاحب کا ایک جرنلسٹ اور میرا ایک قلم کار کی حیثیت سے تعارف ہوا۔ دونوں ملکوں کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بات چیت ہوئی۔ خیر گالی اور آپس کے تعلقات کی پائنداری کے لئے تبادلہ خیال کے بعد دعائیں کی گئیں۔ چیرمین عبداللہ عاریفوف نے بتایا کہ بہت پہلے سے وہاں اردو کے قلم کار آتے رہے ہیں جن میں خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، ملک راج آنند اور علی سردار جعفری کے نام نمایاں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا دونوں ملکوں کے قلم کاروں کی ملاقاتیں زیادہ سے زیادہ ہونی چاہئیں تاکہ تعلقات اور مضبوط ہوں کیوں کہ ہندوستانی ادیبوں سے ان کی صدیوں پرانی رشتہ داری ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں لگ رہا ہے کہ ایک بکھرا ہوا خاندان جمع ہو گیا ہے اور ان کی صدیوں کی کھوئی ہوئی بہن جس کی انہیں تلاش تھی انہیں مل گئی ہے۔ محفل اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ محبت بھری ان باتوں کے دوران عظیم صاحب نے چیرمین عبداللہ عاریفوف سے کہا کہ وہ ایک ایسا ہتھیار بطور تحفہ ان کو پیش کرنا چاہتے ہیں جس کی طاقت دنیا کے تمام ہتھیاروں سے بڑھ کر ہے۔ عاریفوف صاحب نے عظیم صاحب کے جذبے کا احترام کیا اور عظیم صاحب نے اپنے شہر جے پور کے بنائے گئے لاکھ کے شیشے جڑے قلم ان کی خدمت میں پیش کیے جو انہوں نے تمام قلم کاروں اور ممبران میں کسی تبرک کی طرح تقسیم کیے اور بے انتہا شکر یہ ادا کیا۔ وہ قلم بظاہر بہت معمولی تحفہ تھے لیکن اس تحفے نے نہ صرف محفل کا رنگ بدل دیا بلکہ آپس میں کچھ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور کچھ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ دن کے گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک اس طویل ملاقات کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اٹھ کر جانے والے حضرات پھر واپس آ گئے تحفوں کے ساتھ۔ عاریفوف صاحب نے اپنے دست مبارک سے عظیم صاحب کو بہت قیمتی اور بہت خوب صورت فرغل پہنایا اور قمر رئیس صاحب کو شہرے کام کا کاغذ اور شادی ٹوپی پہنائی گئی اور مجھے نرم و نازک اطلس سے نوازا گیا۔ حالانکہ نہایت اہتمام سے کی گئی پر تکلف دعوت اور لذیذ مختلف اقسام کے کھانوں کے باوجود وہ بھی کسی سرکاری ادارے میں تحفوں کی قطعی ضرورت نہ تھی، لیکن انہوں نے اپنی تہذیبی روایت کو برقرار رکھا اور اتنا ہی نہیں اس کے بعد عاریفوف صاحب ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے گئے اور



اپنے خاندان کے تمام افراد سے ملاقات کرائی۔ بہت پر تکلف چائے اور لوازمات سے خاطر مدارات کی اور چلتے وقت پھولوں کے تحفے دیئے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قلم کے ایک چھوٹے سے تحفے نے بغیر کوئی لفظ لکھے دل جیت لیے تھے اور محفل کا رنگ ہزار رنگ ہو گیا تھا۔ یہ یادگار ملاقات ہمیشہ میرے دل میں میٹھا میٹھا رس گھولتی رہتی ہے اور انشا اللہ رہے گی۔ اپنی تہذیب سے جڑے رہنا کس قدر خوش گوار احساس ہے۔ شاید اسی لئے حضورؐ نے بھی تحفے دینے کی رسم کو بہت اہمیت دی ہے۔ مجھے احساس ہوا تحفہ دیتے وقت قیمت نہیں جذبات کی قدر کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر لکھا ہے۔ نگار نے بتایا جناب علی سردار جعفری نے منٹو پر ان کی ریسرچ سن کر کہا تھا کہ چغندر کے دوسرے ایڈیشن سے منٹو کا لکھا دیباچہ نکال دیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے علی سردار جعفری سے اپنی کئی ملاقاتوں کے واقعات سنائے جو انہوں نے سہ ماہی ”نیا سفر“ کے علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری نمبر میں ”میں مر کر امر ہو جاؤں گا“ کے عنوان سے لکھے ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں..... ”ایک بار وہ اور عظیم صاحب ان سے ملنے گئے۔ میں نے دیکھا کہ علی سردار جعفری کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں۔ ان کی انگلیوں کی جنبش سے ترنم کا ایک احساس جاگتا تھا اور کیوں نہ جاگتا کہ ان کے ہاتھوں کی انگلیوں سے تخلیق کی وہ گزگا بھی جس نے کئی نسلوں کو سیراب کیا۔ یہ جعفری صاحب کے ہی اشعار ہیں۔

لکھو کہ پانی کی آنکھ اشکوں سے تر نہ ہوگی      لکھو کہ انساں کے خوں میں بھیگی سحر نہ ہوگی  
لکھو کہ تن کو لباس، سینہ کو علم، ہاتھوں کا کام ہوگا      لکھو کہ ہاتھوں کو حسن رنگ شفق ہوگا  
لکھو محبت کے دل کو پاکیزگی نگاہوں کو نور      باہوں کو رقص کی زر خوشی ملے گی

نگار نے یہ واقعہ بھی بتایا کہ جعفری صاحب عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات پر نگار سے کہا، ”میں تمہارے لئے اہل تحفہ لایا ہوں“ نگار نے کہا، ”آپ نے تکلف کیا۔“ کہنے لگے، ”یاد رکھو جب کسی بادشاہ سے، کسی بچے سے یا کسی خوب صورت عورت سے ملتے ہیں تو کوئی تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ اور یہ شاعرانہ بات نہیں، تمہارا دل بہت خوب صورت ہے۔“

نگار کہتی ہیں کہ جعفری صاحب ہم میں نہ ہو کر بھی ہم میں موجود ہیں۔ وہ اردو ادب کو اتنا کچھ دے گئے ہیں کہ ہماری کئی نسلیں اس سے استفادہ کرتی رہیں گی۔ وہ کہہ گئے ہیں:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا / بچوں کے ذہن سے بولوں گا / چڑیوں کی زبان سے  
گاؤں گا / صدیوں کا پرانا کھیل کھیلوں گا / میں مر کر امر ہو جاؤں گا۔

Dr. Nigar Azim,

H-3 Batla House, Jamia Nagar, Okhla, Delhi, 110025, India





سر مکان سے آیا ، زمین میں رتر گیا  
وہ کیا شخص تھا ، خاموشوں میں رتر گیا  
ظہر کے کو ازمایا نہ نور ، رتر گیا  
وہ کسا شخص تھا ، غلامیہوں میں رتر گیا

نور

## نور شہزادی عالم

پیشبرو، انگلینڈ

کہا جاتا ہے کہ جہاں علم کا فقدان ہو وہاں ادب کے فروغ پانے کے لئے خواب دیکھنا خود کو دھوکے میں رکھنے کے مترادف ہے۔ اب بالعموم اور خصوصاً برصغیر ہندو پاک سے باہر وہ زمانہ بھی رخصت ہو رہا ہے جب بچے اپنے گھر کے ماحول سے اپنے ادبی ذوق کی آبیاری کر سکتے تھے۔ حصول روزگار کی تلک و دو میں سرگرداں مغرب میں بسنے والے یہ مہاجر خاندان جب اپنی نئی نسل کو ان کی مادری زبان سے واقف ہی نہیں کر پار ہے ہیں تو وہ ان کا رشتہ اس زبان کے ادب سے جوڑنے میں کوئی پیش رفت کیا اور کیسے کریں گے۔

زبان اور ادب کا پہلا گہوارہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے بعد دیگر اہل خاندان اور جائے سکونت کا نمبر آتا ہے۔ پہلے نانیاں اور دایاں بچوں کو کہانی سناتی تھیں۔ بعد میں اسکول، کالج اور قصبہ یا شہر کا ادبی ماحول بچے کو متاثر کرتا تھا۔ برطانیہ کے ماحول میں اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے بزرگوں سے کہانیاں سن کر اور ادبی نشستوں میں آ جا کر اپنے اندر اردو ادبی رجحان کی پرورش کرے تو یقیناً اس کا یہ رویہ، اس کی یہ کاوش قابل تسمین ٹھہرنی چاہیے۔

نور شہزادی عالم کا شمار بھی ایسے ہی نوجوانوں میں کیا جائے گا جنہوں نے اپنے آبائی دیس



سے باہر جنم لیا لیکن زبان و ثقافت کے آبائی ورثے سے جڑا رہے۔ نور نے صرف اس ورثے سے جڑی رہیں بلکہ اپنے ادبی ذوق کو نکھارنے سنوارنے کی کوشش بھی کرتی رہیں۔ اپنی منزل کی تلاش میں انہیں دشواری تو ہوئی مگر ناکامی نہیں ہوئی۔

انگلستان کے شہر پیٹربرو میں ۳۰/ مئی ۱۹۶۹ء کو جنم لینے والی بچی کا نام والدین نے شہزادی عالم رکھا۔ ان کی بہن غزالہ عالم<sup>(۱)</sup> شاعرہ ہیں۔ شہزادی عالم نے بھی اپنے ادبی سفر کی ابتدا شاعری سے کی تھی مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے احساسات کی ترجمانی نثر میں بہتر انداز میں کر سکتی ہیں۔ لہذا انہوں نے ۱۹۹۰ء سے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ان کا پہلا ناولٹ ”نوشین کی کہانی“ لاہور سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ادبی دنیا کے محلات میں نور شہزادی کی پہلی اینٹ تھی۔ ان کے ارد گرد انگریزی زبان و ادب ہی کی نہیں انگریزوں کی دنیا بھی آباد تھی۔ آس پاس کوئی ایشیائی نہیں تھا۔ ان کے لئے یہ بھی ایک چیلنج تھا۔ گوان کی تعلیم انگریزی میں ہوئی لیکن شہزادی کا محبوب مضمون اردو ہی رہا۔

پہلے ناولٹ کی مقبولیت کے بعد ان کے قلم کی رفتار تیز ہو گئی۔ چنانچہ بعد کے ناول ”ترنم، منزل کے آس پاس، میت میرے من کی، سویرا“ اور پھر ”چاہ“ چھپا۔ یہاں ان کے ناولوں کے معیار پر تبصرہ مقصود نہیں کیوں کہ شہزادی عالم کا مشن تھا کہ وہ ان جیسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک مثال قائم کریں کہ اپنی آبائی ثقافتی زبان کی ترویج میں حصہ لینے کے لئے کسی عذر اور رکاوٹ کا گزر نہیں۔ میں نے پوچھا، ”شہزادی عالم، آپ انگریزی میں لکھ کر تو زیادہ شہرت اور دولت حاصل کر سکتی تھیں لیکن آپ نے اردو ادب کو اپنایا۔ اس طرح کسی خسارے کا احساس تو نہیں ہوا؟“

شہزادی نے بڑے اعتماد سے کہا، ”ایسا کبھی بھی محسوس نہیں ہوا۔ ہاں یہ خسارہ ان معنوں میں محسوس ہوا کہ میں اردو زبان کو اتنا وقت نہیں دے پائی جتنا دینا چاہئے تھا کیوں کہ ہمیں اپنے روزگار کے لئے بہت وقت دینا پڑتا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ مطالعے سے میرا ناتانہ نہیں ٹوٹا کیوں کہ یہاں لاہوری میں ہمیں اردو کی بہت سی کتابیں دستیاب ہیں۔ پھر بھی میں اپنے ملک میں نہیں جہاں اردو زبان و ادب سے قربت کے بڑے وسائل دستیاب ہیں۔ وطن کی دوری ہماری منزلوں کے حصول میں اکثر رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ سو یہ خسارہ تو ہے۔“

”اردو زبان کے مستقبل“ کے تعلق سے انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”آج برطانیہ میں بھی اردو کے لئے بہت کام ہو رہا ہے۔ پاکستان کی تو قومی زبان ہے ہی اردو۔۔۔۔۔ اردو ادب کا ہندوستان کی سرزمین سے بہت گہرا تعلق ہے۔ علوم و فنون کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ غالباً اس کا سبب ہمارے بزرگوں کی اس مٹی سے وابستگی بھی ہے۔ ہمارے بہترین شعرا کا تعلق لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد جمعی جگہوں کی تہذیب اور مٹی کی خوشبو سے تھا اور اب بھی ہے۔ بیشتر کلاسیک حصہ وہیں کا مرہون منت ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بنجیدگی سے اس پر کام کریں تو اردو برسراِ زندہ رہے گی۔“

۱۔ غزالہ عالم کا تعارف سنہ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۳ء تک ملاحظہ ہو۔



ادیبوں کی گروہ بندی کے مسئلے سے نور بھی متاثر ہیں۔ ان ضمن میں ان کا کہنا ہے، ”ادیبوں کی گروہ بندی نے اردو ادب اور زبان کو ایک طرح سے نقصان پہنچایا ہے۔۔ اس حوالے سے میں کہوں گی کہ اس کا فائدہ خصوصاً ان لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے جو خود گروہ بندی کو جنم دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں نقصان اردو زبان و ادب ہی کو پہنچتا ہے۔ بہر کیف ذاتی طور پر میں کسی بھی گروہ کی پابند نہیں ہوں اور پھر قدرتی طور پر اس روایتی ماحول سے دور ہوں۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اس گروہ بندی کی وجہ سے اردو زبان کے ادیبوں میں نمایاں طور پر انتشار پایا جاتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہیں جو نئی فکر کا راستہ محدود کر دیتی ہیں۔ کچھ یہ بھی ہے کہ سینئر قلم کار مخلصانہ طور پر نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ یہ صورت حال حوصلہ شکن تو ہے لیکن میں ناامید نہیں۔“

Ms Noor Shahzadi Alam,

55 Russell Street, Peterborough, PE1 QBJ, UK



مائے ری میں کائے ہوں بے سیر  
بچے جیاگی ۔ مائے ری  
( امیر خسرو )

نیلیم احمد بشیر  
20 اکتوبر 2003



نیلیم احمد بشیر

لاہور، پاکستان

نیلیم کی پھوپھی پروین عاطف نے خود کو ”پیر واسنی“ لکھا ہے یعنی خانہ بدوش۔ لیکن پروین کا سفر نامہ ”پیر واسنی“ پڑھ کر مجھے بخارن ”نیلیم“ یاد آتی گئی۔ ابھی لاہور میں ہے تو دوسری صبح اُسے نیوجرسی میں پایا گیا۔ اور ابھی نیوجرسی کے فون پر اس کی آواز کے سُرمدم نہیں پڑے کہ وہ شکاگو سے گنگنائی ہوئی کہتی ہے، ”جہاں جائے گا ہمیں پائیے گا“۔ وہ حرکت میں برکت والے مقولے پر یقین رکھتی ہے۔ اسی لئے اپنی آمد کی برکتوں سے اپنے تمام دوست احباب اور پڑھنے والوں کو نوازتی ہے۔ نیلیم کی صرف ایک یا تر اس کے ادبی خزانے میں کئی نیلیم اور یکھراج کا اضافہ کر دیتی ہے۔ چاہے وہ ”گلابوں والی گلی“ میں تنہا گھومے یا ”جگنوؤں کے قافلے“ کے ہمراہ چلے، اس کے قلم سے لکھے فقرے ہمیں اس محفل میں لے جاتے ہیں جہاں سے علم کی روشنی پھوٹتی ہے اور کئی منور چہرے نظر آتے ہیں۔ جن کے مدھم لہجے اور میٹھے بول ذہن کو سرشار کرتے ہیں۔ ان میں نیلیم کے دادا اور دادی بھی ہیں جنہیں پڑھتے لکھتے دیکھ کر نیلیم کے دل میں حرف کی محبت جاگی ہے۔ وہاں احمد بشیر بھی ہیں جن کے سایہ عاطفت میں حرف کا جاوہر چڑھ کر بولتا ہے۔

پھر جب یہ پیر واسنی نیلیم نیپال کی سیر کو نکلتی ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی شناخت بنا چکی



ہے۔ اب لوگ اسے ”گاہیوں والی گلی“ کی نیلم کے نام سے پہچانتے ہیں۔ خانہ بدوشی کی زندگی کے دوران اس پر کھلا کہ ”لے سانس بھی آہستہ“ کیوں کہ آفاق کی اس کارگاہ شیشہ گری کا کام بہت نازک ہے۔ نیلم نے اس نکتے کو جانا۔ اس نے جانا کہ کون اس کے کان میں یہ منتر پھونک رہا ہے۔

”لے سانس بھی آہستہ“ کے ساتھ نیلم نے اور کئی کہانیاں بھی تخلیق کر ڈالیں۔ پھر انہیں جمع کر کے اسی مصرعے کے زیر سایہ ۱۹۹۹ء میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ ہم تک لے آئیں۔ ”ستم گرتمبر“ نے جو ستم ڈھائے اس کی گواہ تو میں بھی ہوں کیوں کہ میں بھی امریکہ ہی میں تھی۔ لیکن مصدقہ یعنی گواہ نیلم احمد بشیر ہے جو ان دنوں نیویارک میں تھی جب کہ میں اس انجیلس میں تھی۔ ۱۱/ ستمبر ۲۰۰۱ء کی صبح کتنی خوف ناک تھی۔ صبح ہی صبح ٹی وی بار بار دو ہوائی جہازوں کا نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون سے ٹکرانے اور دھوکیں اور گردوغبار میں ٹاوروں کو خاک زمین چومتے ہوئے دکھا رہے تھے۔ ہم نے یہ منظر ٹی وی پر دیکھا اور نیلم نے فیری ٹرمینل اسٹیشن (Ferry Terminal Station) نیویارک سے باہر آکر ان دیو قامت عمارتوں کو شعلے اگلتے اور زمیں بوس ہوتے دیکھا۔ پھر اس نے ”ستم گرتمبر“ کی کہانی لکھی اور سال رواں یعنی ۲۰۰۳ء میں یہ کہانی کتابی شکل میں سامنے آئی۔

۱۷/ جنوری ۱۹۵۰ء کو ملتان میں پیدا ہونے والی بخارن نیلم کی خانہ بدوشی کی ابتدا ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔ نیلم نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں نفسیات میں ایم اے کیا اور اس کی شادی ہو گئی۔ ان کے شریک سفر امریکہ میں تھے۔ اس لئے نیلم نیویارک آ گئی۔ تیرہ چودہ سال اس نے وہاں گزارے۔ تین بچوں کو جنم دیا، غبر، کاشف اور سمیرا۔ پھر ۱۹۸۵ء میں پاکستان واپس لوٹ گئی۔ ان چودہ پندرہ برسوں میں اس نے قلم کو بن باس دے رکھا تھا۔ پھر ۱۹۸۷ء میں اس کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ تب سے نیلم نے قلم کو نچلا نہیں بیٹھنے دیا۔ کہانی اگر وارد نہ ہو تو نظم کہنے بیٹھ جاتی ہے۔ غرض لکھنا ہے اور کچھ نہ کچھ لکھنا ہے۔ چنانچہ یہ بھی نیلم کی کھوج کا نتیجہ ہے ملاحظہ ہو بعنوان ”پناہ گاہیں“۔

ہم سب نے سرتنگیں کھود رکھی ہیں  
تاریک، ٹھنڈی محبوب سرتنگیں، آغوشِ مادر کے مانند  
محفوظ سرتنگیں

آندھیوں، طوفانوں، جھکڑوں // بے مہر آشنائیوں  
لا تعلقی کے موسموں // زمانے کے سرد و گرم سے بچانے والی  
کمر کی بٹکل جیسی // دوست سرتنگیں  
ان میں سرچھپا لو تو پناہ ملے // سانس لینے کو بھی کچھ ہوا ملے  
گہرائیوں میں ان کی // دن ڈھلتا نہیں // چاند گھٹتا نہیں  
اندھیرا اترتا نہیں // ان سرتنگوں کے باہر ہم  
بے رنگ و نام // بے یار و مددگار // اپنے ہاتھوں خود سنگسار



کھلے آسمان تلے غیر محفوظ موبسوں کی تختی کے

رجم و کرم پر پڑے سسکتے رہتے ہیں

اب نیلم کے ادبی خزانے میں اس کے تین افسانوں کے مجموعے، ”گلابوں والی گلی“ (اشاعت ۱۹۹۱ء)، ”جگنوؤں کے قافلے“ (اشاعت ۱۹۹۲ء)، ”لے سانس بھی آہستہ“ (اشاعت ۱۹۹۹ء)؛ سفرنامہ ”نیلہ نیالہ میں“ (اشاعت ۱۹۹۶ء) کے علاوہ اور ادھر ادھر بکھری نظمیں اور غزلیں ہیں جنہیں اسے کتابی شکل دینا چاہیے۔ مگر نیلم اپنی شاعری کو معنوی اولاد میں شمار کرنے پر ابھی تیار نہیں۔

”نیلم! تم پندرہ سال امریکہ میں رہیں۔ جی نہیں چاہا کہ انگریزی میں لکھ کر نام کماؤ، پیسہ کماؤ۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“ نیلم کی تیوریاں چڑھ گئیں، ”جی نہیں۔ اردو ادب نے مجھے اپنایا ہے۔ اردو ادب کا شکر یہ۔ میں پیدا ہی اس زبان کے لئے ہوئی ہوں۔ لوریاں بھی اسی زبان میں سنی ہیں۔ نال بھی وہیں گڑی ہے جہاں کی یہ زبان ہے۔ ورنہ تو میں۔۔۔ شاید جنگل کی لکڑیاں چستے چستے خود بھی ایک درخت بن چکی ہوتی۔۔۔“ اس کی تیوریوں کے بل مدھم پڑنے لگے۔

اگلے سوال کے جواب میں نیلم نے کہا، ”گروہ بندی وہی کرتے ہیں جن کا مقصد ادب نہیں اپنی ذاتی انا کی پرورش ہے۔ پھر بھی یہ وقتی چیزیں ہیں۔ زمانے میں ٹھہرنے والی چیز خود ادب ہے جو باقی رہتا ہے اس کے علاوہ سب منافقتیں، رنجشیں پلوں کے نیچے سے بہہ جانے والا پانی بن کر کہیں اور چلی جاتی ہیں۔“

یورپ یا امریکہ میں اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں نیلم پر امید نہیں۔ انہوں نے کہا، ”ان ممالک میں ادب کی بقات ہی تک ہے جب تک ہماری نسل زندہ ہے۔ ہماری اگلی نسل اس کی بقا کے لئے کچھ نہیں کرے گی۔ افسوس، پر یہ ایک حقیقت ہے۔ صرف پاکستان ہی اس کا ایک وطن رہ جائے گا۔ اور میں اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں قطعی نہیں۔ آخر موجودہ رسم الخط میں کیا خرابی ہے۔ اسے تبدیل کرنے کی کیا وجہ ہے۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔“

نیلم کے پسندیدہ ادیبوں میں ممتاز مفتی، احمد بشیر، پروین عارف (یہ اقربا پروری ہرگز نہیں)، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، عصمت چغتائی، تھامس ہارڈے (Thomas Hardy)، مو پاساں (Guy de Maupassant) اور شکسپیئر (William Shakespeare) شامل ہیں۔ کہنے لگیں، ”میں نے سب ہی کو حسب توفیق پڑھا ہے۔ اور ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کرتی رہتی ہوں۔“

اپنی زندگی کا یادگار واقعہ یاد کرتے ہوئے نیلم نے کہا، ”میری بہن بشری انصاری پاکستان کی مایہ ناز فن کارہ ہیں۔ ان کا ایک پروگرام لاہور میں تھا۔ میں اور وہ الگ الگ کاروں میں اپنی فیملی کے بچوں کو لا کر جھانہ جا رہے تھے جہاں پروگرام تھا۔ پہلے میں گیٹ پر پہنچی تو دربان نے بڑی عزت سے مسکرا کر مجھے اندر جانے کا اذن دیا۔ اس کے بعد پچھلی گاڑی میں جب بشری آئی تو اسے اس نے روک دیا۔ اور کہا کہ آپ کے پاس کارڈ نہیں ہے۔ بشری نے لاکھ سمجھایا کہ اسے پروگرام کرنا ہے اور وہ ہی



بشری انصاری ہے مگر وہ یہ ہی کہتا رہا کہ بشری تو اگلی گاڑی میں اندر چلی گئیں ہیں۔ آپ کون ہیں؟۔ بہر حال ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن سے ہم چاروں کہیں اکثر لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔

نیلیم "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔ جب وہ نیپال میں تھیں تو وہاں بنگال کے ایک رائٹر (writer) قلم کار) نے انگریزی میں ایک نظم پڑھی۔ نیلیم نے اس کا بڑا خوب صورت آزاد ترجمہ کیا۔ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ عنوان ہے "مسافر"

دور تک سفر کرتے کرتے وہ پانچوں  
ایک پرانے قدیم درخت کے نیچے آکر رُک گئے  
پل بھر کو سستانے کے لئے

تب درخت پر بیٹھی ایک چڑیا نے پوچھا  
بتاؤ تو سہی تم ہو کون؟

یہ سن کر // مسافروں نے اپنے شعور کی گہرائیوں میں جھانکا  
ایک بولا // میں جنم سے ہندو ازم سے جڑا ہوا ہوں، اس کی سب سے اونچی ذات  
دوسرا بائسری کے بیٹھے سر کی طرح گانے لگا // میں بدھ کا پیروکار ہوں  
تیسرے نے کہا // میں تو عیسائیت کا ایک ادنیٰ خادم ہوں  
چوتھے نے کہا // الحمد للہ، میں مسلمان ہوں  
اللہ کی یاد شاہت، یہ میرا یقین ہے  
بھر پور تجسس سے پانچویں مسافر نے  
ایک ننھا سا کیڑا زمین سے اٹھایا  
اور مسکراتی ہوتی آواز میں بولا  
میں اک انسان کا بچہ ہوں

ہم یہاں نیلیم کی ایک کہانی "فن کی خدمت" تہرک کے طور پر آپ کے پڑھنے کے لئے  
پیش کر رہے ہیں۔ یہ مختصر کہانی نیلیم کے فن کی منہ بولتی تصویر ہے۔

## فن کی خدمت

ریکارڈنگ کا وقت صبح گیارہ بجے تھا۔ دوپہر کے اڑھائی بجنے کو آئے تھے اور ابھی تک ہیروئن  
ساحبہ تشریف نہیں لائی تھیں۔ مَنا چائے اسٹار ٹکیل اپنی بہترین قمیص پہنے، خاموش نظروں سے اسٹوڈیو  
میں موجود لوگوں اور سیٹ کو نکلے چلے جا رہا تھا۔ اس کی امی نے اسے بڑے چاؤ سے صبح نو بجے ہی تیار



کرا کے کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے دوسرے بہن بھائی حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کیوں کہ اس کی اس دن اسکول سے بھی چھٹی کروالی گئی تھی۔

ابا خود بھی کبھی کبھار فی وی ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول کر لیا کرتے تھے۔ پروڈیوسر کے اسٹنٹ لڑکوں سے ان کی شناسائی تھی بس یہ ہی واقعیت ان کے کام آتی تھی۔ مین رول کرنے کی حسرت کا دیا البتہ ان کے دل میں ہمیشہ جلتا رہتا تھا اور وہ اس اُمید سے جڑے ہوئے تھے کہ ایک دن وہ ملک کے نامور فنکار کہلا سکیں گے۔

”سر آپ تو جانتے ہیں مجھے اس دشت کی سیاحی، یعنی فن کی خدمت کا جنون کی حد تک شوق رہا ہے۔ مگر حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میرا بیٹا بھی اپنے باپ کے ہی نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ مجھ سے کئی بار کہتا ہے کہ میں اسے بھی فی وی اسٹیشن لے جاؤں فن کی دنیا سے روشناس کراؤں، مگر بس اب آپ نے بلایا تو آج اسے میں لے آیا ہوں۔ بڑا شوق ہے اسے ایکٹنگ کرنے کا جی۔“

چائلڈ اسٹار کے باپ نے فخر یہ انداز میں ڈرامے کے پروڈیوسر کو بتایا۔ ریکارڈنگ کا دورانیہ لمبا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ننھے شکیل کی باری ہی نہیں آرہی تھی۔ وہ بار بار کسمسا کر اپنے باپ کی گود میں جا گھستا، جھانکیاں لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔

”ابو کب گھر جائیں گے؟“

”ابو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

ابو مجھے نیند آرہی ہے۔“ اب اس سے مزید انتظار نہیں ہو رہا تھا

”کیا ہوا ابھی شکیل میاں؟“ پروڈیوسر نے ہیروئن کے گریبان سے نظریں اٹھائے بغیر

پوچھا۔

”کچھ نہیں جی! اپنے سین کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ بڑا شوق ہے، اسے کام کرنے کا۔“

آپ سے سیکھنا چاہتا ہے نا۔“ باپ نے ہنس کر شکیل کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

پروڈیوسر مطمئن ہو کر ہیروئن کو ہدایت دینے لگا۔

”ابو چلیں نا! میں تھک گیا ہوں!“ شکیل نے پھر منہ بسورا۔

”چپکا بیٹھا رہتا ہے یا نہیں! الو کا پٹھا! گھر جانا ہے۔ چار پیسے کمالے گا تو تیرا کچھ گھس جائے گا

کیا؟ ارے گھر جا کر کیا کرے گا، ہاں؟ گھر میں بجلی کئی ہوئی ہے۔ چائے کی پتی نہیں ہے۔ ماں اُمید

لگائے بیٹھی ہے اور یہ نواب کا بچہ تھک گیا ہے۔“

باپ کی آنکھیں آگ برسائے لگیں۔

Mrs Neelam Ahmed Bashir,

30 E-1, Gulberg, Lahore, 54680, Pakistan





میں خطوں سے رہی سرمدہ  
مقدری زمی مناب میں رکنا  
والہندہ  
۵ اربوہ

## واجدندیم

شکاگو، امریکہ

”ہیت کی حیثیت ادب کے لہادے کی سی ہے جس کی نفاست و خوش نمائی قاری کی توجہ جذب کر کے اس کے لئے باعث مسرت ثابت ہوتی ہے لیکن واضح رہے کہ ادیب کی تمام تر لفظی مرصع سازی اور ہیت اپنی کلی کشش سمیت ایک بالغ نظر قاری کے لئے بے معنی ہوگی تا آنکہ ان عناصر میں ادیب کی دانش و بصیرت کی گھاوٹ نہ ہو۔ مؤخر الذکر عناصر کی عدم موجودگی میں ادب ایک ایسی شاندار عمارت کے مصداق ہوگا جس کی ظاہری چکاچوند کسی بھی راہ چلتے کو اپنی جانب متوجہ تو کر لے گی لیکن بنیادوں کی کمزوری، اندرونی خالی پن اور ویرانی کے سبب راہ گیر جلد ہی ادب کی عمارت کی خارجی کشش کو یکسر نظر انداز کرتا ہوا اپنی راہ لے گا“

راضیہ شمشیر کا مضمون ”ادب کے کردار کی تہہ داری“ (۱) جہاں سے یہ اقتباس لیا گیا ہے، بڑا پر مغز ہے۔ اس تحریر کے حوالے سے جناب واجدندیم کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ واجدندیم نے جملوں اور بیان کی مرصع سازی سے ہٹ کر اپنے افسانوں کی عمارت کی بنیاد زندگی کی گونا گوں مسائل پر رکھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں حقائق کی عکاسی ملتی ہے جن سے ہمارا صبح و شام

۱۔ سہ ماہی ”ادیب انٹرنیشنل“ برطانیہ/پاکستان، جلد ۱، شمارہ ۲، ص ۳۷، مدیر جمید قیسر۔ م م



کا واسطے ہے۔ ان کی ایک کہانی ”پیاملن“ میں نے پڑھی۔ کہانی کا موضوع اور مقصد دیکھتے ہوئے عنوان سے مجھے اتفاق نہیں۔ کہانی کا پہلا تعارف میرے کلیہ نظر سے عنوان ہی ہوتا ہے۔ میں جب کسی جریدے میں افسانوں کی فہرست پر نظر ڈالتی ہوں تو سب سے پہلے جس افسانے کا عنوان مجھے اپنی طرف زیادہ راغب کرتا ہے میں اسے ہی پہلے پڑھتی ہوں۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر قاری ایسا ہی کرتا ہو اور میری رائے سے متفق بھی ہو۔

بہر حال بات ہو رہی تھی واجد ندیم کی کہانی ”پیاملن“ کی۔ کیا دل پزیر کہانی ہے جسے واجد ندیم نے بڑے سیدھے سادھے اور دل نشین پیرائے میں لکھا ہے۔

افریقن امریکی فرانسوا ملک بیٹی (۱) کا رہنے والا بیس پچیس برس کا جوان ہے۔ چند برسوں سے شکاگو میں مقیم ہے۔ وہ کہانی کار کے ساتھ ایک فرم میں ملازم ہے۔ فرانسوا کے خلوص، ہمدردی، پیار و محبت نے دونوں کے میل جول کو دوستی میں تبدیل کر دیا ہے۔ بیس اکیس سالہ ماریہ فرانسوا کی محبوبہ ہے جو اس کے وطن بیٹی میں مقیم ہے۔ فرانسوا اسے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے۔ مگر وہ خود بھی امریکہ میں غیر قانونی طور پر مقیم ہے۔ وہ ماریہ کو جائز طریقے سے بلانے کے لئے اسٹوڈنٹ ویزا اور ریزنگ ویزا کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے مگر اسے ناکامی ہوتی ہے۔ ایک طویل انتظار کے بعد اسے خبر ملتی ہے کہ ماریہ آرہی ہے۔ کہانی کار اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کب آرہی ہے تو فرانسوا کو حیرت ہوتی ہے۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“ وہ اپنے کہانی کار دوست سے پوچھتا ہے۔

”ماریہ نے، جو سرت بن کر تمہارے چہرے پر پھیل رہی ہے۔“ کہانی کار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر فرانسوا تفصیل بتاتے ہوئے کہتا ہے، ”بیٹی سے کشتیوں کے ذریعے لوگ میامی (۲) کے ساحل پر اترتے ہیں۔ اور یہ کاروبار کرنے والے ایجنٹ انہیں امریکہ کے مختلف شہروں میں پہنچا دیتے ہیں۔“ انتظار کے دو ماہ فرانسوا نے بڑی بے چینی سے کاٹے۔ اس نے ماریہ کے لئے ڈھیروں شاپنگ کی۔ وہ کہانی کار دوست کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ خوش ہے کہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ماریہ آجائے گی اور وہ اس کے ساتھ مل کر کرسمس منائے گا۔ راستے بھر وہ ماریہ کی باتیں کرتا رہا اور بتاتا رہا کہ اس نے فرقت کے یہ چار سال کس طرح بسر کیئے۔ ماریہ نے اسے وداع کرتے وقت وعدہ لیا تھا کہ وہ امریکہ میں کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا کیوں کہ امریکہ پہنچ کر مرد امریکی عورتوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔

پھر لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوتا ہے کہ بیٹی سے آنے والی کشتی ساحل سے چند میل کے فاصلے پر ٹوٹ: بیٹی (Haiti) میامی (Miami) سے جنوب مشرق میں چھ سو سات سو میل کے فاصلے پر بحر اوقیانوس کے کریبین سی (Caribbean Sea) میں جزیرہ ہسپانیولا (Hispaniola) کے ایک تہائی حصے میں جاپ مغرب واقع ہے اس جزیرے پر اس سے متصل دو سرابڑا حصہ مشرق میں ڈومینیکن ری پبلک (Dominican Republic) کے نام سے موسوم ہے۔ ۲۔ میامی (Miami) امریکہ میں فلوریڈا اسٹیٹ کا مشرقی ساحلی شہر۔



الٹ گئی۔ کشتی کے سارے مسافر ڈوب جاتے ہیں۔ فرانسوا اجڑ جاتا ہے۔ دوسرے دن سہ پہر کو تمام مسافروں کے ساتھ ماریہ کی لاش ملتی ہے۔ کہانی کا اختتام یہ یہاں آپ کے لئے نقل کیا جا رہا ہے کہ آپ بھی کہانی کی گیمبرتا میں شریک ہو سکیں.....

”ایک ایک کر کے جب ہم نے ماریہ کی لاش سے چادر ہٹائی تو میں ماریہ کا چہرہ دیکھ کر مہبت رہ گیا۔ وہ کالی کھوئی چھٹی ناک موٹے موٹے ہونٹوں اور گھٹکھریالے بالوں والی لڑکی اس قدر حسین لگ رہی تھی جیسے ساری دنیا کا حسن اور سارے عالم کا پیار اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا اور کیوں نہ ہو، وہ ”پیا ملن“ کی آس لے کر گھر سے چلی تھی۔ فرانسوا کہتے کے عالم میں کھڑا ماریہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اور ہمارے لائے ہوئے پھولوں کے گلدستے ماریہ کے دائیں بائیں پڑے تھے۔“

میں افسانے کے آخری پیرا گراف کی گیمبرتا سے نکلی تو واجد ندیم سے مخاطب ہوئی۔ میں نے بس یوں ہی ان سے پوچھ لیا کہ وہ اپنی کہانیوں اور اسلوب پر کس کہانی نویس کا اثر محسوس کرتے ہیں؟ کہنے لگے۔ ”کسی کا بھی نہیں۔ میری اپنی جدا گانہ راہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کسی سے ایسے متاثر نہ ہوں کہ اس کے اسلوب کے تحت لکھوں۔ ویسے میرے پسندیدہ لکھنے والوں کی فہرست میں دو چار نام نہیں بلکہ کئی نام ہیں۔ میں بڑے شوق سے محترمہ قرۃ العین حیدر، مستنصر حسین تارڑ، جیلانی بانو، م م ک مہتاب، سلطانہ مہر، مختار مسعود، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، رام لعل، رتن سنگھ، قدرت اللہ شہاب، اور اظہار اثر کی تحریروں کو پڑھتا ہوں۔ شعرا کی فہرست لمبی ہے۔ دینی نثر نگاروں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا وحید الدین خان ہیں۔ مفسروں میں مفتی محمد شفیع ہیں۔ اور... اور... طنز و مزاح میں مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور کرنل محمد خان شامل ہیں۔“

کیا آپ نے خود طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی؟

ہنس کر بولے۔ ”میں نے طنز و مزاح پر مبنی مضامین لکھے جو ”شکوہ“ حیدر آباد میں شائع ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں طنز و مزاح بڑا نازک فن ہے۔ دوسروں کو ہدف بنا کر لکھنا آسان کام نہیں اس لئے طنز و مزاح نویس خود کو ہی ہدف بناتے اور سولی پر چڑھاتے ہیں۔ اس ضمن میں جناب رشید احمد صدیقی نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ ”طنز و ظرافت اس سفلی عمل کی طرح ہے کہ اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ بعض دانشوروں نے طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب کہا ہے۔ اس پر یوسف ناظم کہتے ہیں۔ ”ہاں یہ صحیح ہے، کیوں کہ اردو میں ابھی پہلے درجے کا ادب پیدا ہی نہیں ہوا۔“ اور ناظم صاحب کی رائے یوں درست ہے کہ اردو ادب میں طنز و مزاح نگار انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے ایک دو انگلیاں ہی کافی ہوں گی۔“ واجد مسکرا رہے تھے۔

اب میں آپ کو واجد ندیم کے بارے میں مختصر ابتداؤں کہ یہ حیدر آباد، دکن کے ایک سادات گھرانے میں ۶ / جون ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ امی ابو نے ان کا نام سید واجد حسینی رکھا۔ ان کے والد بزرگوار محترم سید رضا حسینی مرحوم ہیں۔ ان کی اہلیہ، فرخ سلطانہ حسینی ایم اے، بی ایڈ ہیں اور درس و



تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ ان کے دولڑکے کمپیوٹر انجینئر ہیں اور بی وکیل ہے۔

واجد ندیم نے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے بی ایس سی اور ایل ایل بی کیا ہے طالب علمی کے دوران اسپورٹس (sports) اور گیمس (games) سے بڑی تہذیب سے وابستہ رہے۔ فٹ بال، باسکٹ بال جیسے کھیلوں میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نمائندگی سارے ہندوستان میں کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے ریلویز (Railways) پھر آندھرا پردیش پولیس میں برسر روزگار رہے۔ دوران ملازمت آندھرا پردیش اسٹیٹ اور پولیس کی نمائندگی والی بال کے کھیل میں سارے ہندوستان میں کی اور کئی تمغے حاصل کیے۔ انہیں ایک انٹرنیشنل میچ میں، جو روسی والی بال ٹیم کے خلاف کھیلا گیا تھا، حصہ لینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ انہوں نے آندھرا پردیش اسٹیٹ کی والی بال ٹیم کی کپتانی بھی دو سال کی۔

یہ تو تھا ان کا شوق اور دوسرا جنون تھا شعر و ادب سے وابستگی کا۔ شام کا وقت کھیل کے میدانوں میں گزرتا اور راتیں کورس کی کتابوں پر کم اور ناولوں، افسانوی مجموعوں، سوانح حیات، طنز و مزاح پر مضامین اور شعری مجموعوں کے پڑھنے میں زیادہ گزرتیں۔ ۱۹۷۲ء میں آب و دانہ انہیں امریکہ لے آیا۔ اور تب سے شکاگو میں قیام پزیر ہیں۔ انہوں نے شکاگو میں کمپیوٹر پروگرامنگ (computer programming) کا کورس مکمل کیا اور بیس سال سٹی کالج آف شکاگو میں بحیثیت آڈیٹر (auditor) کار گزار رہ کر وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے ہیں۔

ادب سے دل چسپی انہیں یوں ہوئی کہ بقول خود ان کے، ”ہمارے دوست احباب میں جہاں کھلاڑی شامل تھے وہیں شاعر و ادیب بھی شامل تھے۔ ان میں ٹمس نیازی اب پاکستان میں ہیں، عاصم موسوی لندن میں تھے جہاں ان کا حال ہی میں انتقال ہو گیا، صادق نقوی اور صلاح الدین نیر حیدرآباد میں ہیں۔ طالب علمی اور دوران ملازمت کبھی لکھنے کی کوشش سنجیدگی سے نہیں کی۔ چند ایک مضامین اور افسانے لکھے۔ دو ایک جگہ بھیجے لیکن ایک انجان اور گرم نام لکھنے والے کی پزیرائی مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن یہ جنون پھر بھی سر سے نہ اُترا۔ ساتھ ہی ملازمت کی مصروفیت اور وہ بھی پولیس کی ملازمت نے اتنی فرصت نہیں لینے دی کہ سنجیدگی سے کچھ لکھتا۔ امریکہ آنے کے بعد چند سال تو تشمکش روزگار اور پڑھائی کے نذر ہو گئے پھر آہستہ آہستہ میں نے ادب لکھنے پڑھنے کا وقت نکال لیا۔ میرے افسانے دہلی سے نکلنے والے رسالے ’شمع‘ (افسوس جواب بند ہو گیا) ’ہانوا‘ ’بیسویں صدی‘ میں چھپنے لگے اور مضامین حیدرآباد سے شائع ہونے والے جریدے ’سیاست‘ اور ’منصف‘ میں شائع ہوئے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین ماہنامہ ’شگوفہ‘ نے شائع کیے۔ مقامی اور عالمی مشاعروں میں شعری تخلیقات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۹۶ء میں شکاگو کی ایک معروف تنظیم ’دی عثمانین‘ نے بہترین اسپورٹس من (Sportsman) اور ادیب کے تمغے سے نوازا۔ ۲۰۰۲ء کا رسالہ ’بیسویں صدی‘ نے افسانہ نمبر کے مقابلے میں میرا افسانہ ’پیاملن‘ کو بہترین افسانے کا تمغہ انعام دیا۔“

انہوں نے بتایا..... ”میری اب تک کی لکھی ہوئی کہانیاں اور افسانے زیادہ تر سماجی مسائل کا



احاطہ کرتے ہیں۔ چوں کہ پولیس کی ملازمت میں قتل، ڈاکہ، دھوکہ دہی جیسے جرائم کی تفتیش کا تجربہ رہا ہے اس لئے بعض کہانیوں میں وہ پس منظر بھی ملے گا، خاص طور سے 'قاتل کی تلاش' قابل ذکر ہے۔ میری ایک کہانی 'پانچواں آدمی' کلوننگ (cloning) کے پس منظر میں ہے۔ غالباً اس موضوع پر میرا ہی افسانہ ہے واللہ اعلم (۱)۔ میں نے کبھی سیاست کو موضوع نہیں بنایا حالانکہ 'پانچواں آدمی' کا پس منظر سیاسی لگتا ہے لیکن میرا اصل مقصد کلوننگ کی قباحت کو اجاگر کرنا ہے۔ یہ بات افسانے کے اختتام اور کلائمکس (climax) پر واضح ہو جاتی ہے۔

میں ترقی پسند تحریک کو جزوی طور پر اہم اور ضروری سمجھتا ہوں لیکن میں کبھی بھی اس کے زیر اثر نہیں رہا۔ میں نے خود کو کسی تحریک سے وابستہ کیے بغیر لکھا ہے اور کیا ضروری ہے کہ کوئی ادیب کسی تحریک سے ہی وابستہ ہو؟ میں نے اپنے قاری کو کسی انجان موڑ پر لا کر نہیں چھوڑ دیا اور کوئی بھی کہانی یا افسانہ بے مقصد نہیں لکھا۔ کہانی کا سسپنس (suspense) برقرار رکھتے ہوئے قاری کو ایک چوڑا دینے والے موڑ تک لے جا کر منزل کا راستہ دکھایا۔ ورنہ میری رائے میں لڑکے لڑکی کی محبت کی داستان کسی مقصد کے بغیر بیان کی جائے تو قاری اس کا کوئی تاثر نہیں لیتا۔

”واجد صاحب آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ اپنا کوئی شعر سنائیں۔“

واجد ندیم کہنے لگے، ”میں تو بس اس بات کا قائل ہوں کہ۔“

جو کہ آجائے سب کی سمجھ میں

بات ایسی کرو شاعری میں

ویسے میرا شعری مجموعہ 'بہاروں کے سپنے'، افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ 'ادھورے خواب'، طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'دو تو لے زبان' اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں مذہبی اور دینی اداروں سے بھی وابستہ ہوں۔ مسلم کمیونٹی سنٹر، شکاگو کا پچھلے پچیس (۲۵) سال سے رکن ہوں۔ سنٹرل عید کمیٹی آف گریٹر شکاگو کا پانچ (۵) سال چیئرمین رہا۔ اسلامک سنٹر آف شکاگو میں تجوید کا درس دیتا ہوں۔“

میں نے پوچھا، ”عید کمیٹی کے ممبر ہیں پھر بھی ہر سال رمضان کے موقع پر دو وعیدیں ہوتی ہیں۔“ کہنے لگے، ”ہماری تو پوری کوشش یہ ہی ہوتی ہے کہ ایسا نہ ہو اور میں تو ویسے بھی صلح کل آدمی ہوں۔ میرا ایک شعر ہے۔“

پھولوں میں رکھ کے پیش کی اپنی ندیم بات

اپنے سخن کو خار مغیلاں نہ کر سکے

اردو کے مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کہا، ”اردو کا مستقبل ایسا تباہناک نہیں جیسا

۱۔ کلوننگ کے موضوع پر اب کئی افسانے لکھے گئے ہیں۔ اس وقت اس موضوع پر جناب ملی عرفان عابدی کا افسانہ یاد آرہا ہے جو ان کی افسانوں کے مجموعہ ”انسانوں کی تازہ فصل“ میں شامل ہے۔ موصوف کا تعارف گفتنی حصہ اول، ص ۳۰۰ پر موجود ہے۔ مگر اس میں افسانے کے حوالے سے کوئی سوال جواب نہیں۔ سلطانہ مہر



کہ کہا اور سمجھا جا رہا ہے۔ میرا ایک شعر عرض ہے۔

جنم جس دیس میں اس نے لیا تھا

وہیں اب ہو گئی مہمان اردو

ہندوستان میں حکومت کی عدم سرپرستی کی وجہ سے اردو کی جڑیں کمزور ہو رہی ہیں کیوں کہ اس کے ساتھ معاش کے مسائل جڑے ہوئے ہیں۔ اور پاکستان میں اردو بچوں کہ کسی بھی صوبے کی زبان نہیں اس لئے عمومی طور پر عوام میں اس کے لئے دل چسپی اور ہمدردی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس طرح دن بدن اس کی جڑیں کمزور ہوتی چلی جائیں تو اس درخت کے برگ و بار جو کہ دیار غیر یعنی مغرب میں پھیلے ہیں ان پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اس لئے اردو زبان کی بقا کے لئے چند تجاویز مختصر اور ج ذیل ہیں۔

• گھروں میں اردو تعلیم کا لزوم

• بچوں کے لئے ہلکی پھلکی کہانیوں اور نظموں کی کتابوں کی فراہمی

• مراکز میں دینی تعلیم کے ساتھ اردو تعلیم کا انتظام

• ہر مرکز میں اردو لائبریری مع ایک گوشہ اطفال کا قیام

• مغربی ممالک میں رہنے والے لازمی طور پر اپنے گھروں میں اردو میں بات چیت کریں

• اردو سیکھنے کے لئے ویڈیو کیسٹوں کی تیاری اور فراہمی

• انٹرنٹ پر والدین بچوں کو آن اردو ویب سائٹوں سے متعارف کرائیں جہاں اردو

اخبارات اور خبروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور اردو کے سافٹ ویئر فراہم کرنے کی سعی کریں۔

در اصل ہم چاہتے ہیں کہ بغیر محنت کیے سب کام ہو جائیں۔ مثلاً میرا یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

کہنے کو تو ہم سب کو ہے اردو سے بڑا پیار

پر مفت جو مل لیتا ہے تو پڑھ لیتے ہیں اخبار

ہے پیار کا دعویٰ تو کریں ستنس کم از کم

اردو کے جریدوں کے نہیں ہم بھی خریدار

واجد ندیم دوستوں کے دوست ہیں۔ بہت با اصول اور وضع دار انسان ہیں اور کوشش کرتے

ہیں کہ احباب کا دل نہ دکھے کیوں کہ بقول ان کے۔

بدگمانی بھی عجب شے ہے کہ بیٹھے بیٹھے

دل کے آئینے میں تصویر بدل جاتی ہے

Mr. Wajid Nadeem,

2528 W Berteau, Chicago, IL. 60618, USA





سارے نظام تعلیم میں درجہ اول کی کمی ہے اللہ اعلم  
اور دوسرے تعلیم کا

صالح

## یوسف ناظم

ممبئی، ہندوستان

مزاج نگار دکھوں اور آنسوؤں کی پیداوار نہیں۔ سارے ہی انسان پیدا ہوتے ہی چیخ چیخ کر روتے ہیں، شور مچاتے ہیں مگر کچھ کے رونے میں بھی ترنم ہوتا ہے۔ اور روتے ہیں ہونٹ مسکرانے لگتے ہیں۔ میں یوسف ناظم کا شمار بھی ان ہی بچوں میں کرتی ہوں۔ میں نے ان کی پیدائش پر انہیں نوٹ کیا۔ انٹرویو میرے تخیل کی پرواز کا مظہر ہے۔ میرے بیچے ہوئے سوال نامے کے جواب میں جناب یوسف ناظم صاحب نے ممبئی سے اور معاونت کے طور پر جناب حسن چشتی نے شکاگو سے رسالہ ”شکوفا“ اور دیگر متعلقہ مضامین ارسال کیئے۔ یوسف ناظم صاحب نے اپنے جوابات کے ہمراہ حسن چشتی کو ایک ذاتی خط بھی لکھا جس کی کاپی حسن صاحب نے مجھے دی۔ یوسف صاحب نے خط میں لکھا تھا: ”محترمہ سلطانہ مہر کے سوال نامے کے جوابات بھیج رہا ہوں۔ ان سے آپ نے اس وقت ملاقات نہیں کروائی جب میں شکاگو میں مقیم تھا۔ ارشد (اپنے بیٹے) کے ساتھ ہم لوگ اس طرف گئے بھی تھے۔ آپ ہمارے ساتھ ہی چلے چلتے تو ہر سہیل سفر محترمہ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ ان کے حالات زندگی اور ان کی مصروفیات کا تفصیل نامہ سن سن کر خوش ہوتا ہوں اور آپ کو دعاؤں دیتا ہوں۔“

طاوہ ازین اس تعارف میں ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے مضمون ”علامہ یوسف ناظم“، ڈاکٹر محمد حسن کے تبصرے (مطبوعہ عصری ادب)، ماہنامہ ”شکوفا“ ستمبر ۲۰۰۳ء اور ناظم یوسف صاحب کی مختصر سوانح سے استفادہ کیا گیا ہے۔ سلطانہ مہر



روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس میں غلطی میری نہیں تھی۔ ان کی اپنی تھی۔ یہ مجھ سے کئی سال پہلے پیدا ہو گئے یعنی ۱۹۲۱ء کے دن۔ ویسے سرکاری ریکارڈ میں بزبان ممبئی گھنٹا لایا گھپا کر گئے۔ وہاں سن پیداؤں ۱۹۱۸ء درج ہے۔ اب آپ مجھ سے میری تاریخ پیدائش جاننا چاہیں گے تاکہ اندازہ لگا سکیں کہ یوسف ناظم صاحب مجھ سے کتنے بڑے ہیں۔ سو وہ آپ میری تاریخ پیدائش جاننے بغیر بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یوسف ناظم کی تحریری ہنر تک پہنچنے کے لئے میں ابھی گھنٹیوں چل رہی ہوں۔

یوسف ناظم کی تصویر دیکھیے، کیسی معصوم صورت ہے لیکن طنز آمیز کٹیلی ہنسی جو ان کے ہونٹوں پر ہے جیسے سارا چہرہ اس دنیا پر ریش خند ہو اور کہہ رہا ہو۔

ہم کے بنتے ہیں ارفع و اعلیٰ لیکن ہم سے اس دور میں تردید ستم ہو نہ سکی  
اتنے مصروف رہے زیست کے ہنگاموں میں قتل دیکھا کئے اور آنکھ بھی نم نہ ہوئی  
ظلم تحریک کی صورت میں نمودار ہوا ہم سے شکوہ نہ ہوا کوئی شکایت نہ ہوئی  
ظلم اب عیب نہیں رسم جہاں ہے شاید قتل تہذیب میں اک طرز بیاں ہے شاید

”حضور یوسف صاحب!“ میں نے انہیں مخاطب کیا، ”آپ تو اچھے بھلے شاعر تھے پھر نثر نگاری اور وہ بھی ناگنگ کھینچنے کا ہنر کیوں اپنایا اور کیسے؟“

”ہو ایوں کہ.....“ یوسف ناظم صاحب گلا صاف کرتے ہوئے کھنکھتے لہجے میں بولے۔ ”ہم تو ویسے ہی مضامین لکھتے تھے۔ تب ایک دن ڈاکٹر محمد حسن نے ہمارے بارے میں لکھا اور ہم نے پڑھا۔ ان کے (یعنی ہمارے، یوسف ناظم کے، وہ ہمیں سمجھانے کے انداز میں کہہ رہے تھے) ایک ایسے خوش دل انسان کا پتا دیتے ہیں جس نے زندگی کے نشیب و فراز سے سمجھوتا کر لیا ہے اور ستم ظریفی کو زندگی کا قانون مان کر سرد و گرم عالم سے لطف لے لے کر گزرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ان کا تبسم طنز یہ نہیں عارفانہ ہے۔ سو ہمیں عارف بننا بھا گیا۔ مگر اب بھی جب کبھی ہماری رگ جارحیت ہمیں اُکساتی ہے تو شعر کہہ لیتے ہیں۔“

”اب کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔“

”خاتون یہ حقیر پر تقصیر جس کا نام یوسف ناظم ہے.....“ ہم نے ان کے جملے کو درمیان سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”آپ خود کو علامہ یوسف ناظم کہیے کہ آپ کے دوست ڈاکٹر صفی الدین صدیقی نے آپ کو اسی خطاب کے ساتھ یاد کیا ہے اور ثابت بھی کیا ہے کہ آپ کو جس طرح زبان و بیان پر دسترس ہے اور املا کا خاص خیال رکھتے ہیں تو یہ خطاب آپ کے شایان شان ہے۔“

انہوں نے انکساری سے کہا۔

”یہ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کی محبت ہے۔ تو میں عرض کر رہا تھا..... میں جالہ میں پیدا ہوا۔ جالہ سابق ریاست حیدر آباد کا ایک تعلقہ تھا اور اب ریاست مہاراشٹر کا ضلع ہے۔ جالہ ہائی اسکول سے میٹرک اور اورنگ آباد کالج سے انٹر میڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں جامعہ عثمانیہ،



حیدرآباد سے ایم اے کی سند لی۔ اور ریاست کے محکمہ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔  
دسمبر ۱۹۷۱ء میں بحیثیت اسٹنٹ کمشنر آف لیبر و ٹریفک حسن خدمت پر سبکدوشی حاصل کی۔

شاعری کا آغاز میں نے طالب علمی کے زمانے میں کیا۔ مزاج نگاری (نثر) ۱۹۴۴ء میں  
اپنائی۔ کالم نگاری اور ترجمے کے علاوہ تبصرہ نگاری، تالیفی اور ادارتی فرائض بھی انجام دیئے۔

مجھے ۱۹۴۲ء میں بزم اقبال حیدرآباد دکن کی جانب سے نکل ریاستی مضمون نگاری میں اول  
انعام ملا۔ اور پھر ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ کے محکمہ تعلیم کا، آندھرا پردیش اور پھر مغربی بنگال،

مہاراشٹر اسٹیٹ اور ریاست بہار کی اردو اکیڈمیوں کے انعامات میری مختلف تصانیف پر ملے۔  
۱۹۸۴ء میں غالب ایوارڈ برائے طنز و مزاح غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی جانب سے اور ہریانہ اردو اکیڈمی

کی جانب سے کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ ۱۹۸۹ء میں ملا۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال کا جوہر  
قریشی ایوارڈ ۱۹۹۸-۱۹۹۹ء میں ملا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی کا ایوارڈ اس کے علاوہ ہے۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۹۸ء تک میری سترہ (۱۷) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے نام ہیں:

- |              |                        |                         |
|--------------|------------------------|-------------------------|
| ۱۔ کیف و کم  | ۲۔ فٹ نوٹ              | ۳۔ دیواریے              |
| ۴۔ زیر غور   | ۵۔ سائے ہم سائے (خاکے) | ۶۔ فقط                  |
| ۷۔ البتہ     | ۸۔ ذکر خیر             | ۹۔ بالکلیات             |
| ۱۰۔ فی الحال | ۱۱۔ فی الفور           | ۱۲۔ فی الحقیقت          |
| ۱۳۔ فی زمانہ | ۱۴۔ فی البدیہہ         | ۱۵۔ امریکہ میری عینک سے |
| ۱۶۔ منجملہ   | ۱۷۔ ورنہ               |                         |

بچوں کے لئے میری کتابیں ہیں:

- ۱۔ پلک نہ مارو (۱۹۷۴)؛ ۲۔ مرغی کی چار ٹانگیں (۱۹۸۲)؛
- ۳۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ میں (۱۹۸۳)؛ ۴۔ بکرے کی تعریف میں (۱۹۹۲)
- ۵۔ الف سے ی تک (۱۹۹۲)

میرے منظوم ترجمے بھی ہیں:

- ۱۔ ارمغان سنسکرت (۱۹۵۸)، یہ بھرتری ہری کی سنسکرت نظموں کا منظوم ترجمہ ہے
  - ۲۔ نوائے کبیر (۱۹۹۷)، یہ کبیر کے دو ہے اور گیت ہیں
- میرے مضامین کا انتخاب کراچی سے بعنوان "زیر غور" محترمہ رعنا فاروقی نے شائع کیا۔  
میری تین کتابیں زیر طبع ہیں (۱) لہذا (۲) علیک سلیک... خاکے (۳) برائے نام۔

یہ نئی تالیفات یہ ہیں:

- شگوفہ، ۱۰ جلد نمبر (۱۹۸۴)؛ شگوفہ، ہندوستانی مزاج نمبر (۱۹۸۵)؛ سہ ماہی تکمیل، شاز تہمکت نمبر
- (۱۹۸۹)؛ سہ ماہی تکمیل، عزیز قیسی نمبر (۱۹۳۹)۔



”اب تھوڑا سا وقفہ ہونا چاہیئے۔ ہم چائے پیٹتے ہیں۔ آپ کافی پینا پسند کریں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم ہندوستانی ہیں۔ چائے پسند کرتے ہیں۔ کافی کی علت تو امریکیوں نے پالی ہے۔“

وہ مدحہم لہجے میں بولے۔

میں امریکی نہ تھی لیکن امریکہ میں رہتی ہوں۔ ان کے جملے سے لطف اندوز ہوتے رہی۔

چائے مزید اترتی یوسف ناظم صاحب کی گفتگو کی طرح۔ میں نے گھونٹ لیتے ہوئے

پوچھا، ”ادیبوں کی گروہ بندی نقصان دہ ہے یا۔۔۔“

میں سمجھ گیا۔ ”وہ پیالی رکھتے ہوئے بولے۔“ میری رائے میں گروہ بندی سے ادب کو

نقصان نہیں پہنچایا ادبی دنیا میں اگر جمود آجائے تو ادبی معرکوں سے وہ پانی پانی ہو جاتا ہے اور خود وہ

ادیب جو غیر ضروری طور پر نظریات پیش کرتے رہتے ہیں چند دن میں خود پکچھتاتے ہیں اور آب دیدہ

ہو جاتے ہیں۔“

”یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترقی پسندی نے ادیبوں کو ایک خاص آئیڈیالوجی (ideology فکر)

میں مقید کر رکھا ہے۔۔۔۔۔“ اب کے انہوں نے میرا جملہ پورا نہ ہونے دیا اور بولے۔ ”بی بی! ہم پس

ماندہ یا ترقی پذیر دنیا میں رہتے ہیں۔ دراصل ترقی پزیر ملکوں کو پس ماندہ اور ترقی یافتہ ملکوں کے درمیانی

کڑی کہا جاتا ہے۔ اور اسی لئے ان ملکوں کے رہنے والوں پر بھی کڑا وقت ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے

۔ پس ماندہ اور ترقی پزیر ملکوں میں ایک قباحت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ رقبے میں بہت بڑے ہوتے ہیں۔

اس لئے ان میں ترقی پزیری بھی اس پودے کی طرح ہوتی ہے جسے ’چھوٹی موٹی‘ کہا جاتا ہے۔ اس

پودے میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ لگاتے ہی شرما جاتا ہے اور اس کی کھلی ہوئی پتھڑیاں لب بند ہو جاتی

ہیں۔ ترقی پزیری بھی اسی طرز کی ہوتی ہے۔ ہوتی ہے اور رک جاتی ہے۔“

یوسف ناظم صاحب غالباً میرے سوال کے جواب میں اپنا کوئی مضمون پڑھنا چاہتے تھے۔

میں نے تھوڑی سی دخل اندازی مناسب جانتے ہوئے کہا،

”اردو ادب کو اپنا کر آپ ضرور گھانے میں رہے ہیں۔ ورنہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے فوراً جواب دیا۔۔۔۔۔

”ادب میرے لئے پیشہ نہیں بنا لیکن اس کے ذریعے مجھے کچھ پیسہ ضرور ملا ہے۔ لیکن جنہیں

زیادہ ملا ہے وہ بھی اسے کم سمجھتے ہیں۔“

”اردو کی بقا کے لئے کیا مشورہ ہے؟“

کہنے لگے، ”ایک ہی تجویز ہے کہ اردو کو اردو رسم الخط میں پڑھا جائے اور ادیبوں کے مقابلے

میں قاری زیادہ تعداد میں پیدا کیئے جائیں۔“

”اب یہ بتائیے کہ ۱۹۶۲ء سے آپ کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جب کہ ’غالب ایوارڈ‘ آپ

کو ۱۹۸۴ء میں دیا گیا۔ کیا یہ زیادتی نہیں؟“









## محبتوں کا سفیر محمد شفیق موڑک

تعارف: مبارک کا پڑی، ممبئی

آج بھی کئی لوگ زندگی کے اصل مقصد ہی سے ناواقف ہیں اور اپنی شناخت کی خاطر جیتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا محور ہوتا ہے خود ان کی زندگی اور اُس کی آسائشیں۔ لیکن انہی لوگوں میں زندگی کو پرکھنے و برتنے کی بصیرت و بصارت ہوتی ہے جو اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے نافع بناتے ہیں کیوں کہ انہیں رب کائنات کی ذات سے یقین کامل ہوتا ہے کہ محبت بصری نیکیوں کے خزانے سے دم آخر تک ان کے ہاتھ بھرے رہیں گے۔

محمد شفیق موڑک ایسے ہی خوش بخت انسان ہیں جن کے شب و روز محض دوسروں کی اندھیری راتوں میں اُجالے بانٹنے میں صرف ہوتے ہیں۔ جو باثروت ہیں اور بااخلاق بھی۔ علم کی ترویج سے انہیں گہری محبت ہے، کتابیں ان کی رفیق ہیں۔ اُردو اُن کی معشوقہ ہے۔ بلکہ ان کا اڑھنا بچھونا اُردو ہے۔ وہ اُن چند یوانوں میں سے ہیں جو اُردو کو جنوں کی حد سے زیادہ چاہتے ہیں۔

محمد شفیق موڑک صوبہ مہاراشٹر کے ضلع رتناگری کے ایک چھوٹے سے گاؤں کڑوئی (kadwai) میں ۲۵ جنوری ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنا بچپن بے سرومانی کے عالم میں گزارا۔ بالآخر اُجالوں کی تلاش میں ۱۹۵۷ء میں کاروبار کے سلسلے میں انڈونیشیا کی طرف ہجرت کر لی۔ ۱۹۶۱ء میں رشتہ ازدواج میں ایک نیک، خلیق، ملنسار اور وفا شعار خاتون زبیدہ کے ساتھ بندھ گئے۔ ایک ایسی خاتون کے ساتھ جو ہر بار اُن کی صرف زینت بازو نہیں بنی اُن کی خود ایک بازو بنی، اُن کی قوت بنی، توانائی بنی اور اسی لیے زندگی کے ہر طوفان میں اُن کا ساتھ دیا۔ اُن سے دو بیٹے، اسلم، ندیم اور دو بیٹیاں اسما اور فردوس ہیں۔ اسلم امریکہ میں جب کہ ندیم، بہونورین اور داماد امتیاز انڈونیشیا میں ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہیں۔ زندگی بڑی خوشگوار تھی کہ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اُن کی شریک سفر زبیدہ کار کے حادثے میں انتقال کر گئیں اور ان کی زندگی بکھر کر رہ گئی۔ کچھ اس طرح کہ شفیق موڑک کی زندگی کے اُجالوں کا سورج



بس غروب سا ہو گیا۔ وہ بالکل ٹوٹ گئے اور ٹوٹ کر رہ گئے۔ عرصہ دراز تک آپ اس صدمے سے باہر نہیں آئے البتہ ان کی دوسری بیگم وحیدہ اور ان سے بیٹی زلیخا نے زندگی کو ان سے گویا پھر متعارف کرایا۔ وہ زندگی سے پھر آشنا ہوئے۔

شفیق موڑک نے بتایا۔ انہیں اردو سے دلچسپی ۱۹۷۰ء میں جناب ادریس دہلوی سے مل کر ہوئی۔ ادریس دہلوی (مرحوم) کی خواہش پر وہ ان کے ماہنامہ شمع دہلی کے لیے اکثر نامور فلمی ستاروں سے ملاقات اور تقریبات کی رپورٹیں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ”شمع دہلی“ نے اردو ادب اور فلمی صحافت میں غیر ممالک میں بھی ایک سفیر کا کام انجام دیا۔ ادریس جب کبھی ممبئی آتے شفیق کے ہاں قیام کرتے۔ ان کے برادرانہ تعلقات کی یادیں آج بھی شفیق کے الہم میں تصویروں کی صورت میں موجود ہیں۔ شفیق کو فوٹو گرافی کا شوق ہے۔ انہوں نے کئی فلمی ستاروں کی تصویریں شمع کے لیے بنائیں تھیں۔

شفیق موڑک کئی زبانیں بھی جانتے ہیں۔ اردو اور انگریزی تو ان کی بچپن کی ساتھی ہیں۔ انڈونیشی، چینی اور ملائی (ملائیشیا کی زبان) سے بھی انہوں نے دوستی رچائی ہے۔ انڈونیشی زبان پر انہیں عبور حاصل ہے۔ انڈونیشیا کی علاقائی زبانیں بھی انہوں نے سیکھیں کیوں کہ یہ ان کے کاروبار کی بھی ضرورت ہے۔

عمر کی اس منزل میں شفیق چاہتے ہیں کہ اپنی مرحومہ بیوی کی خواہش کے مطابق اپنا کاروبار اپنے بچوں اور داماد کو سونپ کر اپنے وطن لوٹیں اور اپنے لوگوں اور منشی کی خدمت کا حق ادا کریں۔ انہوں نے زبیدہ مرحومہ کی یاد میں کوکن کے دیہاتی علاقوں میں پانچ مسجدیں ”مسجد زبیدہ“ کے نام سے بنوائیں۔ مرحومہ کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل کی اور بعد میں حج اور کئی عمرے کر چکے ہیں۔ ہر سال کسی نہ کسی خواہش مند کو حج پر بھیجتے ہیں۔ بشرطیکہ خواہش مند ان سے رجوع کرے۔ آج بھی نیکی کا یہ عمل جاری ہے کہ جہاں بھی مسجد کی ضرورت دیکھی اور لوگوں نے خواہش ظاہر کی شفیق موڑک اس کا رخیہ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ درج ذیل قطعہ انہوں نے اپنی مرحومہ شریک حیات زبیدہ کی نذر کیا ہے۔

مری زندگی کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں  
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی  
تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں  
تری یاد شاخ گلاب ہے جو ہوا چلی تو پک گئی

M. Shfiq Modak  
402, Red Gates,  
St. Alexious Road  
Bandra (West)  
Mumbai 400050  
INDIA.

Add. Indonesia  
Plaza Textile,  
Jalan Pandansari  
No: XX/14-A,  
Balikpapan (Kal-Tim)  
INDONESIA.





## یہ گفتنی کا چمن ضیاء خان، لاس اینجلس

فلک پہ اردو کے تابندہ اک ستارہ نو  
ہے وسعتوں میں جہاں کی ترا مقام نو

ترے وجود سے قائم ہے رونق اردو  
فروغ شعر و ادب ہے ترا پیام نو

خن ور کے بہت تذکرے ہوئے پہلے  
یہ ”گفتنی“ کا چمن اور یہ اہتمام نو



## آج کی شاعرات

اس عنوان سے ۱۹۷۳ء میں، میں نے کتاب شائع کی تھی، جس میں ایک سو تین شاعرات کا تعارف تھا۔ یہ تعارف بھی میں نے شاعرات سے اس وقت لیا تھا، جب میں روزنامہ ”جنگ“ میں ہر ہفتے ایک شاعر یا شاعرہ کا تعارف شائع کرتی تھی۔ ان شاعرات کے نام کی فہرست درج ذیل ہے۔ (سلطانہ مہر)

## فہرست بوئے گل

|                    |                         |                     |
|--------------------|-------------------------|---------------------|
| ۱۔ راجیل اختر      | ۱۷۔ عشرت جہاں آفرین     | ۳۳۔ پروین شاکر      |
| ۲۔ اختر بیگانہ     | ۱۸۔ خورشید اعظم پروانہ  | ۳۴۔ خاتون حجاب      |
| ۳۔ خلیق تبسم       | ۱۹۔ ریحانہ رضوی         | ۳۵۔ خورشید فاطمہ    |
| ۴۔ ثریا حیا        | ۲۰۔ سکندر حیا بریلوی    | ۳۶۔ آل زہرہ نقوی    |
| ۵۔ رئیس بانو نقوی  | ۲۱۔ زہرہ اشتیاق         | ۳۷۔ سردار بانو      |
| ۶۔ زیب النساء زہبی | ۲۲۔ سحر مبین            | ۳۸۔ بشری شمس        |
| ۷۔ حسینہ شفق       | ۲۳۔ شفیق بانو بریلوی    | ۳۹۔ شمیم اختر شمیم  |
| ۸۔ خورشید بانو شمع | ۲۴۔ نور شمع             | ۴۰۔ صائمہ خیری      |
| ۹۔ عسکری شہناز     | ۲۵۔ شہناز وحسی          | ۴۱۔ عظمت عزیزی      |
| ۱۰۔ صنوبر مصور     | ۲۶۔ ضمیر فاطمہ جعفری    | ۴۲۔ محترم عشرت جہاں |
| ۱۱۔ عظمیٰ ناہید    | ۲۷۔ عشرت جہاں پشاوری    | ۴۳۔ مہر نگار تیموری |
| ۱۲۔ شوکت فرخ       | ۲۸۔ مہجہ جمیں فاطمہ ماہ | ۴۴۔ عابدہ ناز       |
| ۱۳۔ سعیدہ ناز      | ۲۹۔ شاہدہ سلطانہ ناز    | ۴۵۔ نسیم ہدیٰ نسیم  |
| ۱۴۔ فہمیدہ نسرین   | ۳۰۔ نسیم قمر            | ۴۶۔ عذرا ہما        |
| ۱۵۔ نعیم حسین نگار | ۳۱۔ نگار حفیظ نگار      | ۴۷۔ انوپا           |
| ۱۶۔ محمودہ ہیر     | ۳۲۔ گلنار آفرین         | ۴۸۔ آنسہ پنہاں      |



|                    |                     |                     |
|--------------------|---------------------|---------------------|
| ۴۹۔ حسنہ زیدی      | ۵۳۔ شمس صدیقی       | ۵۷۔ فائزہ صدیقی     |
| ۵۰۔ رضیہ ابو جعفر  | ۵۴۔ شمیم رحمان شمیم | ۵۸۔ رحمت النساء ناز |
| ۵۱۔ زیب گلشن مولوی | ۵۵۔ عابدہ بانو صبا  | ۵۹۔ نصیرہ ملک       |
| ۵۲۔ سعدیہ روشن     | ۵۶۔ عزیز بدایونی    | ۶۰۔ فریدہ ہما       |

## نالہ بول

|                       |                        |                      |
|-----------------------|------------------------|----------------------|
| ۶۱۔ ادا جعفری         | ۶۹۔ طلعت اشارت         | ۷۷۔ کشور ناہید       |
| ۶۲۔ شہاب قزلباش       | ۷۰۔ فہمیدہ ریاض        | ۷۸۔ رابعہ نہاں       |
| ۶۳۔ شائستہ زیدی       | ۷۱۔ منور سلطانہ لکھنوی | ۷۹۔ ثریا زیبا        |
| ۶۴۔ پروین سید فنا     | ۷۲۔ زہرہ نگاہ          | ۸۰۔ رشیدہ سلیم سیمیں |
| ۶۵۔ معینہ انور معین   | ۷۳۔ ربیعہ فخری رزمی    | ۸۱۔ میمونہ غزل       |
| ۶۶۔ وحیدہ نسیم        | ۷۴۔ محمودہ جہیں سوز    | ۸۲۔ سعیدہ عروج مظہر  |
| ۶۷۔ سیدہ حنا          | ۷۵۔ عرفانہ عزیز        | ۸۳۔ ثریا محمود ندرت  |
| ۶۸۔ ڈاکٹر سرور سلطانہ | ۷۶۔ نور بانو محبوب     |                      |

## دو چراغ محفل

|                            |                                  |                        |
|----------------------------|----------------------------------|------------------------|
| ۸۴۔ زاہد انجمن             | ۹۱۔ سروری عرفان اللہ روحی        | ۹۸۔ نور جہاں           |
| ۸۵۔ بلقیس جمال بریلوی      | ۹۲۔ میمونہ غزالہ بریلوی          | ۹۹۔ رابعہ پنہاں        |
| ۸۶۔ تراب النساء علوی       | ۹۳۔ نور الصباح بیگم              | ۱۰۱۔ خیاب علوی         |
| ۸۷۔ رشیدہ بیگم عیاں        | ۹۴۔ بغدادی بیگم                  | ۱۰۱۔ عذرا عزمی         |
| ۸۸۔ سیدہ نسیم فاطمہ بریلوی | ۹۵۔ بیگم خورشید آرا صدیق علی خاں | ۱۰۲۔ قمر جہاں چند وسوی |
| ۸۹۔ رضیہ انور امروہوی      | ۹۶۔ صفیہ شمیم طلیح آبادی         | ۱۰۳۔ نور بدایونی       |
| ۹۰۔ کثیرہ فاطمہ حیا        | ۹۷۔ بیگم قمر القادری             |                        |



## نخن ور حصہ اول

نخن ور حصہ اول میں ساٹھ پاکستانی شعراء کا تذکرہ تھا۔ سن ۲۰۰۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مزید شعراء کا تعارف شامل کیا گیا ہے۔ اس کی فہرست درج ذیل ہے۔

- |                           |                        |                             |
|---------------------------|------------------------|-----------------------------|
| ۱۔ احسان دانش             | ۲۶۔ سعید رضا سعید      | ۵۱۔ محسن احسان              |
| ۲۔ اطہر نفیس              | ۲۷۔ سلیم احمد          | ۵۲۔ محسن بھوپالی            |
| ۳۔ اقبال عظیم             | ۲۸۔ حمایت علی شاعر     | ۵۳۔ محشر بدایونی            |
| ۴۔ انجم اعظمی             | ۲۹۔ شاعر لکھنؤی        | ۵۴۔ عزیز حامد مدنی          |
| ۵۔ ابن انشاء              | ۳۰۔ شبثم رومانی        | ۵۵۔ مصطفیٰ زیدی             |
| ۶۔ ذوالفقار علی بخاری     | ۳۱۔ شکیب جلالی         | ۵۶۔ منظر ایوبی              |
| ۷۔ بہار کوئی              | ۳۲۔ منظور حسین شور     | ۵۷۔ منظر صدیقی              |
| ۸۔ بہراؤ لکھنؤی           | ۳۳۔ شورش کاشمیری       | ۵۸۔ ناصر کاظمی              |
| ۹۔ تابش دہلوی             | ۳۴۔ صہبا اختر          | ۵۹۔ احمد ندیم قاسمی         |
| ۱۰۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم | ۳۵۔ سید ضمیر جعفری     | ۶۰۔ وزیر آغا                |
| ۱۱۔ تحسین سروری           | ۳۶۔ سراج الدین ظفر     | تیسرے ایڈیشن میں ان         |
| ۱۲۔ حبیب جالب             | ۳۷۔ ظہیر کاشمیری       | شعراء کا اضافہ کیا گیا ہے۔  |
| ۱۳۔ سید محمد جعفری        | ۳۸۔ سید عابد علی عابد  | ۶۱۔ مخمور اکبر آبادی        |
| ۱۴۔ جوش ملیح آبادی ۳۸     | ۳۹۔ عارف عبد المتین    | ۶۲۔ رعنا اکبر آبادی         |
| ۱۵۔ جون ایلیا             | ۴۰۔ جمیل الدین عالی    | ۶۳۔ صبا اکبر آبادی          |
| ۱۶۔ حفیظ جالندھری         | ۴۱۔ عظیم عباسی         | ۶۴۔ نعیم تقویٰ              |
| ۱۷۔ حفیظ ہوشیار پوری      | ۴۲۔ عبید اللہ علیم     | ۶۵۔ نسیم امروہوی            |
| ۱۸۔ شان الحق حقی          | ۴۳۔ عندلیب شادانی      | ۶۶۔ دلاور فگار              |
| ۱۹۔ عبد العزیز خالد       | ۴۴۔ احمد فراز          | ۶۷۔ کرار نوری               |
| ۲۰۔ خالد علیگ             | ۴۵۔ فضل احمد کریم فضلی | ۶۸۔ اقبال صفی پوری          |
| ۲۱۔ راغب مراد آبادی       | ۴۶۔ فیض احمد فیض       | ۶۹۔ ساقی جاوید              |
| ۲۲۔ سید آل رضا            | ۴۷۔ قابل اجیری         | ۷۰۔ احسن احمد اشک           |
| ۲۳۔ رئیس امروہوی          | ۴۸۔ قتیل شفائی         | ۷۱۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری |
| ۲۴۔ سحر انصاری            | ۴۹۔ قمر جلالوی         | ۷۲۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین     |
| ۲۵۔ سرور بارہ بٹکوی       | ۵۰۔ ماہر القادری       |                             |



## تذکرہ شعراء و شاعرات، سخن ور حصہ دوم ۱۹۹۶ء

- ۱۔ تاریخ طبع سخن ور، حصہ دوم
- ۲۔ سلطانہ مہر سخن شناسی کی بے تاب لہر
- ۳۔ حرفے چند
- ۴۔ گہر ہونے تک
- رائف مراد آبادی
- ڈاکٹر فرمان فتح پوری
- مشفق خواجہ
- سلطانہ مہر

- ۱۔ اظہار اثر
- ۲۔ اختر سعید خان
- ۳۔ سید حنیف اختر
- ۴۔ ارشد عثمانی
- ۵۔ ارم انصاری
- ۶۔ سید اسد اللہ حسین ی
- ۷۔ افضل فرووس
- ۸۔ اکبر حیدر آبادی
- ۹۔ عتیق النظر
- ۱۰۔ باقر زیدی
- ۱۱۔ تجل فاروقی بانی
- ۱۲۔ بشر صہبائی
- ۱۳۔ سیکندہ ساجد پنہاں
- ۱۴۔ یعقوب تصور
- ۱۵۔ جاوید اختر
- ۱۶۔ حسن چشتی
- ۱۷۔ حمیدہ معین رضوی
- ۱۸۔ حمیرا رحمن
- ۱۹۔ ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی
- ۲۰۔ حیدر اعظمی
- ۲۱۔ حیدر قریشی
- ۲۲۔ ڈاکٹر خالد سہیل
- دہلی
- بھوپال
- نیویارک
- کنیڈا
- مشئی گن
- لاس اینجلس
- ہیوسٹن
- لندن
- دوحہ قطر
- میری لینڈ
- کنیڈا
- بھوپال
- ٹیکساس
- ابوظہبی
- ممبئی
- شکاگو
- لندن
- نیویارک
- سعودی عرب
- دوحہ قطر
- جرمنی
- کنیڈا
- ۲۳۔ عقیل دانش
- ۲۴۔ اطہر راز
- ۲۵۔ علی طباطبائی راز لکھنؤی
- ۲۶۔ محمد ممتاز راشد
- ۲۷۔ راہی شہابی
- ۲۸۔ سید شمیم رجز
- ۲۹۔ رحمت قرنی
- ۳۰۔ رحمن صدیقی
- ۳۱۔ رشی خان
- ۳۲۔ رئیس الدین رئیس
- ۳۳۔ تسلیم الہی زلفی
- ۳۴۔ ساحل صدیقی
- ۳۵۔ رحمن والگے ساز
- ۳۶۔ سحر مہدی
- ۳۷۔ امجد علی سرور
- ۳۸۔ رفعت سروش
- ۳۹۔ سلطان الحسن فاروقی
- ۴۰۔ اشرف شاہ
- ۴۱۔ شاہد علی خان شاہد
- ۴۲۔ ڈاکٹر شہانہ نذیر
- ۴۳۔ مرتضیٰ شبلی
- ۴۴۔ ڈاکٹر شبیر احمد
- لندن
- لاس اینجلس
- دوحہ قطر
- جے پور
- لاس اینجلس
- لندن
- لاس اینجلس
- جرمنی
- علی گڑھ
- کنیڈا
- ساؤتھ افریقہ
- لاس اینجلس
- لندن
- دوحہ قطر
- دہلی
- انگلینڈ
- آسٹریا
- بحرین
- دہلی
- سری نگر
- فلوریڈا



|                                |                 |                                   |             |
|--------------------------------|-----------------|-----------------------------------|-------------|
| ۴۵۔ رخسانہ شمیم                | جرمنی           | ۷۶۔ افتخار نسیم                   | شکاگو       |
| ۴۶۔ فرحت شہزاد                 | لاس اینجلس      | ۷۷۔ نسیم سید                      | کنیڈا       |
| ۴۷۔ شمشیر سنگھ شیر             | ڈنمارک          | ۷۸۔ نسیمہ کلثوم                   | الے نائے    |
| ۴۸۔ ضیاء خان                   | سعودی عرب       | ۷۹۔ آصفہ نشاط                     | لاس اینجلس  |
| ۴۹۔ سید مظفر احمد ضیاء         | شکاگو           | ۸۰۔ نعیمہ ضیاء الدین              | جرمنی       |
| ۵۰۔ طہ آفندی                   | بحرین           | ۸۱۔ سرفراز نواز اعظمی             | مدینہ منورہ |
| ۵۱۔ ظفر عظیمی                  | دوحہ۔ قطر       | ۸۲۔ نور جہاں نوری                 | لندن        |
| ۵۲۔ عبد الحمید سوکھر ظہور      | مسقط۔ عمان      | ۸۳۔ نوشاد                         | ممبئی       |
| ۵۳۔ عابد جعفری                 | کنیڈا           | ۸۴۔ نیر جہاں                      | لاس اینجلس  |
| ۵۴۔ عابدہ کرامت                | کویت            | ۸۵۔ نیاز جیراج پوری               | ممبئی       |
| ۵۵۔ عبد الرحمن عبد             | نیویارک         | ۸۶۔ رشید نیاز                     | دوحہ، قطر   |
| ۵۶۔ خواجہ ریاض الدین عطش       | اسکول، الے نائے | ۸۷۔ نیاز گلبرگوی                  | شکاگو       |
| ۵۷۔ عطیہ نیازی                 | لاس اینجلس      | ۸۸۔ سیدہ حسن جہانگیر ہدم          | سان فرانسکو |
| ۵۸۔ استاد ابراہیم العریض عنایت | بحرین           | تخرن و رسوم۔ تذکرہ شعراء و شاعرات |             |
| ۵۹۔ غوثیہ سلطانہ               | الے نائے۔       | ۱۔ اعزاز احمد آذر                 | لاہور       |
| ۶۰۔ سعید قیس                   | بحرین           | ۲۔ مجید اختر                      | لاس اینجلس  |
| ۶۱۔ کرامت غوری                 | کویت            | ۳۔ ہمایوں اختر                    | کراچی       |
| ۶۲۔ سیدہ کنیز فاطمہ کرن        | آسٹریلیا        | ۳۔ سلطانہ ذاکرہ انقوی             | سان فرانسکو |
| ۶۳۔ بلراج کول                  | دہلی            | ۵۔ محمد آفاق صدیقی                | کراچی       |
| ۶۴۔ گلزار                      | ممبئی           | ۶۔ اسد محمد خان                   | کراچی       |
| ۶۵۔ گلشن کھنہ                  | برطانیہ         | ۷۔ اسلم کولسری                    | لاہور       |
| ۶۶۔ مرزا محبوب بیگ             | لاس اینجلس      | ۸۔ محمد اشرف شاہین                | کراچی       |
| ۶۷۔ عبد الطیف خان محفوظ        | سوئیڈن          | ۹۔ محمد کمال انظہر                | کویت        |
| ۶۸۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد     | برطانیہ         | ۱۰۔ اقبال مجیدی                   | کراچی       |
| ۶۹۔ مخمور سعیدی                | دہلی            | ۱۱۔ امجد اسلام امجد               | لاہور       |
| ۷۰۔ جمشید مسرور                | اوسلو۔ ناروے    | ۱۲۔ امداد نظامی                   | کوئٹہ       |
| ۷۱۔ خضر مسیحا                  | لاس اینجلس      | ۱۳۔ ثاقب انجان                    | کراچی       |
| ۷۲۔ مونا شہاب                  | میری لینڈ       | ۱۴۔ انور مسعود                    | اسلام آباد  |
| ۷۳۔ افشاں مہرین                | سعودی عرب       | ۵۱۔ سید صابر علی جعفری بدر        | کراچی       |
| ۷۴۔ ناصر نظامی                 | ہالینڈ          | ۶۱۔ ثروت سلطانہ ثروت              | کراچی       |
| ۷۵۔ واجد ندیم                  | شکاگو           | ۷۱۔ شربانو ہاشمی                  | ماتان       |



|                           |                |                             |              |
|---------------------------|----------------|-----------------------------|--------------|
| ۱۸۔ جاوید آفتاب           | لاہور          | ۴۹۔ عظمیٰ جون               | بی۔ بلوچستان |
| ۱۹۔ مسعود جاوید           | کراچی          | ۵۰۔ عمر شریف                | کراچی        |
| ۲۰۔ جمال نقوی             | کراچی          | ۵۱۔ عقیل عباس جعفری         | اسلام آباد   |
| ۲۱۔ جوہری غوری            | لاس انجلس      | ۵۲۔ رشیدہ عیاں              | نیوجرسی      |
| ۲۲۔ اقبال حیدر            | کراچی          | ۵۳۔ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی     | ملتان        |
| ۲۳۔ امین خیال             | گجراتوالہ      | ۵۴۔ ذکیہ غزل                | کراچی        |
| ۲۴۔ رفیع الدین راز        | کراچی          | ۵۵۔ غوث متھراوی             | کراچی        |
| ۲۵۔ زین صدیقی             | دہران          | ۵۶۔ فاطمہ حسن               | کراچی        |
| ۲۶۔ امتیاز ساغر           | کراچی          | ۵۷۔ کاوش عباسی              | ریاض         |
| ۲۷۔ سکندر سالم            | بریڈ فورڈ      | ۵۸۔ پیرزادہ قاسم            | کراچی        |
| ۲۸۔ سرشار صدیقی           | کراچی          | ۵۹۔ ڈاکٹر قمر آرا قمر       | لاہور        |
| ۲۹۔ سعدیہ روشن            | ابوظہبی        | ۶۰۔ قمر جمیل                | کراچی        |
| ۳۰۔ محمود شام             | کراچی          | ۶۱۔ ریحانہ قمر چودھری       | لاس انجلس    |
| ۳۱۔ محمد ہارون صدیقی شاہد | کراچی          | ۶۲۔ لیث قریشی               | کراچی        |
| ۳۲۔ شاہدہ حسن             | کراچی          | ۶۳۔ مقصد الہ آبادی          | مشئی گن      |
| ۳۳۔ شعاع درانی            | حیدرآباد۔ سندھ | ۶۴۔ منصور ملتانی            | کراچی        |
| ۳۴۔ انور شعور             | کراچی          | ۶۵۔ جاوید منظر              | کراچی        |
| ۳۵۔ شمس وارثی             | کراچی          | ۶۶۔ ڈاکٹر فہیمہ باٹلانا دان | لاس انجلس    |
| ۳۶۔ عبدالعلی شوکت         | کراچی          | ۶۷۔ رحمت النساء ناز         | کراچی        |
| ۳۷۔ شہاب کاظمی            | نیوجرسی        | ۶۸۔ ناہید ورک               | مشئی گن      |
| ۳۸۔ محمد سبکگلین صبا      | کراچی          | ۶۹۔ اصغر ندیم سید           | لاہور        |
| ۳۹۔ عبدالقوی ضیاء         | کنیڈا          | ۷۰۔ روشن آراء نزہت          | لاہور        |
| ۴۰۔ ضیاء الحق قاسمی       | کراچی          | ۷۱۔ نقاش کاظمی              | کراچی        |
| ۴۱۔ سعید الطغر            | اوکلاہاما      | ۷۲۔ نگار سجاد               | کراچی        |
| ۴۲۔ افتخار عارف           | اسلام آباد     | ۷۳۔ نگار صہبائی             | کراچی        |
| ۴۳۔ عارف شفیق             | کراچی          | ۷۴۔ رخسانہ نور              | لاہور        |
| ۴۴۔ لیاقت علی عاصم        | کراچی          | ۷۵۔ شہناز نور               | کراچی        |
| ۴۵۔ عاصی کرنالی           | ملتان          | ۷۶۔ احمد نوید               | کراچی        |
| ۴۶۔ ہذرا عباس             | کراچی          | ۷۸۔ وکیل انصاری             | نیویارک      |
| ۴۷۔ الیاس غشتی            | حیدرآباد۔ سندھ | ۷۹۔ ڈاکٹر بلال نقوی         | کراچی        |
| ۴۸۔ مرزا عظیم بیگ         | مشئی گن        | ۸۰۔ احمد ہمیش               | کراچی        |
|                           |                | ۸۱۔ یاسمین                  | لاہور        |
|                           |                | ۸۲۔ یونس جاوید              | لاہور        |



سخن و رخصہ چہارم تذکرہ شعراء اور شاعره

|                           |                      |                                       |                    |
|---------------------------|----------------------|---------------------------------------|--------------------|
| ۱۔ آباد جعفری             | نئی تال ہندوستان     | ۲۸۔ خالد خواجہ                        | کیلی فورنیا امریکا |
| ۲۔ ابراہیم اشک            | ممبئی ہندوستان       | ۲۹۔ خالد یوسف                         | برطانیہ            |
| ۳۔ ڈاکٹر محمد علی اثر     | حیدرآباد ہندوستان    | ۳۰۔ ڈاکٹر سید خورشید خاں امرہ ہوی     | کراچی پاکستان      |
| ۴۔ احسان بہگل             | بالینڈ               | ۳۱۔ ڈاکٹر وائو از صدیقی               | پنسلوانیا امریکا   |
| ۵۔ ملک ارشد اقبال آرش     | اٹلی                 | ۳۲۔ اوم کرشن راحت                     | سڈنی آسٹریلیا      |
| ۶۔ اشفاق حسین             | کنیڈا                | ۳۳۔ محمد نقیب اللہ رازی               | چترال پاکستان      |
| ۷۔ ف۔ س۔ اعجاز            | نکلکٹ ہندوستان       | ۳۴۔ رخسارناظم آبادی                   | بحرین عربین کلف    |
| ۸۔ افتخار امام صدیقی      | ممبئی ہندوستان       | ۳۵۔ رسا چغتائی                        | کراچی پاکستان      |
| ۹۔ سہیل اقبال             | کنیڈا                | ۳۶۔ رشی بادشاہ                        | کانپور ہندوستان    |
| ۱۰۔ اکبر حمیدی            | اسلام آباد پاکستان   | ۳۷۔ کالی داس گپتا رضا                 | ممبئی ہندوستان     |
| ۱۱۔ سید جعفر امیر         | امریلو ہیوسٹن امریکا | ۳۸۔ رفیق احمد رفیق                    | کیلی فورنیا امریکا |
| ۱۲۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند   | واشنگٹن امریکا       | ۳۹۔ رؤف خیر                           | حیدرآباد ہندوستان  |
| ۱۳۔ سید انور کمال رضوی    | کنیڈا                | ۴۰۔ رئیس وارثی                        | نیویارک امریکا     |
| ۱۴۔ مامون ایمین           | نیویارک امریکا       | ۴۱۔ ریحانہ روجی                       | کراچی پاکستان      |
| ۱۵۔ باقر نقوی             | برطانیہ              | ۴۲۔ ساحر شیوی                         | برطانیہ            |
| ۱۶۔ بخش اکمل پوری         | برطانیہ              | ۴۳۔ عبد الاحد ساز                     | ممبئی ہندوستان     |
| ۱۷۔ جاوید اختر بیدی       | برطانیہ              | ۴۴۔ ساقی فاروقی                       | برطانیہ            |
| ۱۸۔ تاجدار عادل           | کراچی پاکستان        | ۴۵۔ پروفیسر خادم حسین سحر             | ریاض سعودی عرب     |
| ۱۹۔ صاحبزادہ جمیل علی خان | کراچی پاکستان        | ۴۶۔ پروفیسر فرید قریشی سحر اکبر آبادی | کیلیفورنیا امریکا  |
| ۲۰۔ تسنیم عابدی           | ابوظہبی، یو۔ اے۔ ای  | ۴۷۔ ابو الفیض سحر                     | دہلی ہندوستان      |
| ۲۱۔ توفیق احمد انصاری     | الے ٹائے امریکا      | ۴۸۔ سعید شرعی                         | دوحہ قطر           |
| ۲۲۔ توفیق محمد خان        | جارجیا امریکا        | ۴۹۔ ڈاکٹر شاہد الوری                  | کراچی پاکستان      |
| ۲۳۔ تمکیل جاوید           | کراچی پاکستان        | ۵۰۔ شاہد مانگی                        | دہلی ہندوستان      |
| ۲۴۔ جاوید زیدی            | ہیوسٹن امریکا        | ۵۱۔ شاہین صدیقی                       | برطانیہ            |
| ۲۵۔ حامد امرہ ہوی         | شکاگو امریکا         | ۵۲۔ ڈاکٹر شباب للیت                   | شملہ ہندوستان      |
| ۲۶۔ افتخار حیدر           | کنیڈا                | ۵۳۔ شہلا فیضی                         | کیلیفورنیا امریکا  |
| ۲۷۔ سید ولی حیدر          | کراچی پاکستان        | ۵۴۔ ڈاکٹر شہلا نقوی                   | نیویارک امریکا     |



|                      |                         |                                       |                        |
|----------------------|-------------------------|---------------------------------------|------------------------|
| ۵۵۔ ڈاکٹر صابر آفاقی | منظف آباد کشمیر پاکستان | ۷۳۔ قمر نقوی                          | تلسا، امریکا           |
| ۵۶۔ صفوت علی صفوت    | کنگڈی کٹ امریکا         | ۷۴۔ علی کمیل قزلباش                   | کوئٹہ پاکستان          |
| ۵۷۔ ضیا جلال پوری    | برطانیہ                 | ۷۵۔ محشی امروہوی                      | شیکاگو امریکا          |
| ۵۸۔ طاہر سلطانی      | کراچی پاکستان           | ۷۶۔ سلیمہ سلامت علی عرف فریدہاٹی محشی | سان فرانسسکو امریکا    |
| ۵۹۔ ظفر گورکھپوری    | ممبئی ہندوستان          | ۷۷۔ مظفر حنفی                         | کلکتہ ہندوستان         |
| ۶۰۔ ایرار عابد       | کراچی پاکستان           | ۷۸۔ مظہر امام                         | دہلی ہندوستان          |
| ۶۱۔ عرفان علوی عابد  | انڈیا ناپولیس امریکا    | ۷۹۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی          | بھانگلپور، ہندوستان    |
| ۶۲۔ فیاض عادل فاروقی | برطانیہ                 | ۸۰۔ رشید منظر                         | برطانیہ                |
| ۶۳۔ عبید الرحمن عارف | وسکاؤنس امریکا          | ۸۱۔ حکیم منظور                        | سری نگر کشمیر ہندوستان |
| ۶۴۔ عاشور کاظمی      | برطانیہ                 | ۸۲۔ منیر حیدر                         | کویت                   |
| ۶۵۔ انتخاب عالم      | چین                     | ۸۳۔ ڈاکٹر منیر الزماں منیر            | الے مائے امریکا        |
| ۶۶۔ عرفان مرتضیٰ     | لاس اینجلس امریکا       | ۸۴۔ شوکت علی ناز                      | دوحہ قطر               |
| ۶۷۔ عروج ملک         | سان فرانسسکو امریکا     | ۸۵۔ صلاح الدین ناصر                   | نیویارک امریکا         |
| ۶۸۔ عزیز الحسن       | نیویارک امریکا          | ۸۶۔ شاہد نسیم سالک                    | ادہائیو امریکا         |
| ۶۹۔ عطاء الحق قاسمی  | لاہور پاکستان           | ۸۷۔ فرحت ہمایوں ندیم                  | کراچی پاکستان          |
| ۷۰۔ غزالہ عالم       | برطانیہ                 | ۸۸۔ نزہت صدیقی                        | کنیڈا                  |
| ۷۱۔ ملک فضل حسین     | برطانیہ                 | ۸۹۔ سید و نسرت نقاش                   | سری نگر ہندوستان       |
| ۷۲۔ عارف فرہاد       | راولپنڈی پاکستان        | ۹۰۔ نوشاد نوری                        | ڈھاکہ بنگلہ دیش        |



# گفتنی اول، نثر نگاروں کا تذکرہ ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

حمایت علی شاعر

ابراہیم جلیس

سلطانہ مہر

گفتنی اول

بزرگان شاعر

بقلم حمایت

نیابت

میں سرخوردہ ہی

|                       |             |                           |               |
|-----------------------|-------------|---------------------------|---------------|
| ۱۔ احمد خان           | شکاگو       | ۲۲۔ ثریا شہاب             | جرمنی         |
| ۲۔ احمد سہیل خان      | ٹیکساس      | ۲۳۔ جاوید اختر چودہری     | برطانیہ       |
| ۳۔ اختر جمال          | کنیڈا       | ۲۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی      | کراچی         |
| ۴۔ ارشاد احمد صدیقی   | کیلیفورنیا  | ۲۵۔ جمیل زبیری            | کراچی         |
| ۵۔ ارمان شمس          | ڈھاکہ       | ۲۶۔ جوگندر پال            | دہلی          |
| ۶۔ آصف الرحمن طارق    | نیوجرسی     | ۲۷۔ جیتندر بلو            | برطانیہ       |
| ۷۔ امراؤ طارق         | کراچی       | ۲۸۔ جیلانی بانو           | حیدرآباد، دکن |
| ۸۔ پروفیسر آفاق احمد  | بھوپال      | ۲۹۔ چاند کرن شرما         | برطانیہ       |
| ۹۔ اکرام بریلوی       | کنیڈا       | ۳۰۔ حسن ہاشمی             | کراچی         |
| ۱۰۔ انور خواجہ        | کیلیفورنیا  | ۳۱۔ ڈاکٹر شان الحق حقی    | کنیڈا         |
| ۱۱۔ انور سلیمی        | کیلیفورنیا  | ۳۲۔ سیدہ حنا              | پشاور         |
| ۱۲۔ انور شیخ          | برطانیہ     | ۳۳۔ حیدر طہا طہائی        | برطانیہ       |
| ۱۳۔ انور زہت          | دہلی        | ۳۴۔ حیدر قریشی            | جرمنی         |
| ۱۴۔ ایوب جوہر         | ڈھاکہ       | ۳۵۔ ڈاکٹر خاور جمیل       | کراچی         |
| ۱۵۔ بانو ارشد         | برطانیہ     | ۳۶۔ ڈاکٹر خلیق انجم       | دہلی          |
| ۱۶۔ بشری رحمان        | لاہور       | ۳۷۔ خورشید عالم           | کنیڈا         |
| ۱۷۔ بشیر مالیر کوٹلوی | مالیڈ کوئلہ | ۳۸۔ خورشید علی خان        | کراچی         |
| ۱۸۔ پروین کمال        | جرمنی       | ۳۹۔ ڈاکٹر خیر النساء مہدی | ممبئی         |
| ۱۹۔ تسنیم شاخان       | کیلیفورنیا  | ۴۰۔ ذکیہ مشہدی            | پٹنہ          |
| ۲۰۔ تصدق سہیل         | برطانیہ     | ۴۱۔ رالف رسل              | برطانیہ       |
| ۲۱۔ تقی عابدی         | کنیڈا       | ۴۲۔ رحیم انجان            | کنیڈا         |



|                           |               |                              |                 |
|---------------------------|---------------|------------------------------|-----------------|
| ۴۳۔ ڈاکٹر رشید امجد       | راولپنڈی      | ۷۱۔ فردوس حیدر               | کراچی           |
| ۴۴۔ رشید مظفر حسین        | کنیڈا         | ۷۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری     | کراچی           |
| ۴۵۔ رضاء الجبار           | کنیڈا         | ۷۳۔ ڈاکٹر فیروز عالم         | کیلیفورنیا      |
| ۴۶۔ رضیہ فصیح احمد        | شکاگو         | ۷۴۔ فیروز مکر جی             | برطانیہ         |
| ۴۷۔ رفیعہ منظور الامین    | حیدر آباد دکن | ۷۵۔ قرۃ العین حیدر           | نویڈا، ہندوستان |
| ۴۸۔ ریحان اظہر            | ریاض          | ۷۶۔ قمر علی عباسی            | نیویارک         |
| ۴۹۔ سائیں سچا             | سویڈن         | ۷۷۔ قیصر تمکین               | برطانیہ         |
| ۵۰۔ سجاد حیدر             | انڈیانا       | ۷۸۔ کنول نمین پرواز          | برطانیہ         |
| ۵۱۔ سعید انجمن            | ناروے         | ۷۹۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ     | دہلی            |
| ۵۲۔ سعیدہ افضل            | ڈیرہ غازی خان | ۸۰۔ ڈاکٹر گیان چند جین       | کیلیفورنیا      |
| ۵۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر       | لاہور         | ۸۱۔ لطف اللہ خان             | کراچی           |
| ۵۴۔ سلیم شہزاد            | مالیگاؤں      | ۸۲۔ محبتی حسین               | دہلی            |
| ۵۵۔ سیدہ جعفر             | بھوپال        | ۸۳۔ محسنہ جیلانی             | برطانیہ         |
| ۵۶۔ ش۔ صغیر ادیب          | برطانیہ       | ۸۴۔ ڈاکٹر محمد حسن           | دہلی            |
| ۵۷۔ شفیقہ فرحت            | بھوپال        | ۸۵۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی     | کراچی           |
| ۵۸۔ شکیل عادل زادہ        | کراچی         | ۸۶۔ محمود ہاشمی              | برطانیہ         |
| ۵۹۔ شکیلہ رفیق            | کنیڈا         | ۸۷۔ مختار زمن                | کراچی           |
| ۶۰۔ سباحۃ مشتاق           | ملتان         | ۸۸۔ قاضی مشتاق               | پونے            |
| ۶۱۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی      | دہلی          | ۸۹۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کریم        | برطانیہ         |
| ۶۲۔ صفیہ صدیقی            | برطانیہ       | ۹۰۔ ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی  | شکاگو           |
| ۶۳۔ صہبا لکھنوی           | کراچی         | ۹۱۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی | کراچی           |
| ۶۴۔ طلعت سلیم             | برطانیہ       | ۹۲۔ مقصود الہی شیخ           | برطانیہ         |
| ۶۵۔ طہ آفندی              | بحرین         | ۹۳۔ منظور الامین             | حیدر آباد دکن   |
| ۶۶۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان | پشاور         | ۹۴۔ ڈاکٹر نعیم چودھری        | شکاگو           |
| ۶۷۔ عبدالغنی شیخ          | لداخ          | ۹۵۔ نعیمہ ضیاء الدین         | جرمنی           |
| ۶۸۔ عذرا اصغر             | راولپنڈی      | ۹۶۔ ڈاکٹر ابوسعید نور الدین  | ڈھاکا           |
| ۶۹۔ سید عرفان علی عابدی   | کراچی         | ۹۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا           | سرگودھا         |
| ۷۰۔ عطیہ خان              | برطانیہ       | ۹۸۔ ہرچند چاؤلہ              | ناروے           |
|                           |               | ۹۹۔ سید محمد یعقوب نظامی     | برطانیہ         |



## رو میں ہے رخش عمر.....

|             |  |
|-------------|--|
| خاندانی نام | فاطمہ  |
| قلمی نام    | سلطانہ مہر   |
| مقام پیدائش | ممبئی ہندوستان   |
| تعلیم       | ایم۔ اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی 1971ء  |
| پہلا افسانہ | 6 ستمبر 1953ء میں روزنامہ ”انقلاب“ ممبئی میں شائع ہوا۔   |
| صحافت       | روزنامہ ”انجام“ کراچی 1965ء تا 1967ء<br>روزنامہ ”جنگ“ کراچی 1967ء تا 1979ء<br>مدیرہ اعلیٰ ماہنامہ ”روپ“ کراچی 1980ء تا 1990ء   |
| تصانیف      | 1۔ ”داغ دل“ (ناول 1962ء)<br>2۔ ”تاجور“ (ناول 1966ء)<br>3۔ ”ایک کرن اُجالے کی“ (ناول 1969ء)<br>4۔ ”جب بسنت رت آئی“ (ناول 1972ء)<br>5۔ ”آج کی شاعرات“ (تذکرہ 1973ء)<br>6۔ ”بند سپیاں“ (افسانے 1976ء)<br>7۔ ”اقبال دور جدید کی آواز“ (تالیف۔ 1977ء)<br>8۔ ”نخن ور“ حصہ اول (تذکرہ شعراء 1978ء)، دوسرا ایڈیشن 1979ء<br>تیسرا ایڈیشن 2000ء<br>9۔ ”دھوپ اور سائبان“ (افسانے 1980ء)<br>10۔ ”دل کی آبروریزی“ (افسانے 1988ء)<br>11۔ ”ساحر کافن اور شخصیت“ (تالیف 1989ء)<br>12۔ ”نخن ور“ حصہ دوم (بیرون پاکستان بسنے والے شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1996ء)<br>13۔ حرفِ معتبر۔ کلام کا مجموعہ (1996ء)<br>14۔ ”نخن ور“ حصہ سوم (پاکستانی شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1998ء)<br>15۔ نخن ور چہارم (شعراء و شاعرات کا تذکرہ 2000ء)<br>16۔ ”گفتنی اول“ (نثر نگاروں کا تذکرہ 2000ء)<br>17۔ نخن ور پنجم 2004ء<br>18۔ گفتنی دوم 2004ء |

زیر تصنیف:





”جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، وہ لوگ اگر خدا کی ایک چھوٹی سی، بے ضرری، معصوم سی ہستی  
سلطان مہر کو اسنے کام کرتے اور سلیقے سے ان کاموں کو سنبھالتے رہنے کا انداز دیکھ لیں  
تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے پایاں قدرتوں، ندرتوں اور عطاؤں پر یقین لے آئیں گے۔“  
(رشیدہ عیال - سخن ورنہ خیم)

Published by  
**MEHER BOOK FOUNDATION**  
U.S.A.